بسم اللہ

نگار

جلد (۲۰) فہرست مضامین ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۱ء شمار (۱)

نگار

ایڈیٹر نیاز فتحپوری

جلد (۲۰) | جولائی سنہ ۱۹۳۱ء | شمار (۱)

ملاحظات

اگر آپ نے کبھی سمندر کے ساحل پر کھڑے ہو کر طوفانی حالت مین پانی کے تموج کو دیکھا ہے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ تلاطم نام ہے سطح آب کے اس ارتفاع کا جو انتہائی حضیض کے بعد دفعتہ رونما ہوتا ہے اور لہرون کا سلسلہ عبارت ہے اسی نشیب و فراز سے، اسی صعود و ہبوط سے اور اسی اُبھر کر گرنے اور گر کر ابھرنے سے —— بالکل یہی حالت ملکون اور قومون کے عروج و زوال کی ہے، اگر آج کوئی قوم انتہائی زوال کی حالت مین ہے تو سمجھ لو کہ اس کے مستقبل مین بلندی پنہان ہے اور اگر کسی کو بلند ترین نقطۂ عروج پر دیکھو تو جان لو کہ اس کا زوال دور نہین —— فرق اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ موجون کا نشیب و فراز ہم کو جلد جلد نظر آجاتا ہے اور قومون کے عروج و زوال کے لیے قرنون اور صدیون کا انتظار کرنا پڑتا ہے —— ملکون کے جغرافیے اسی طرح بدلے ہین اور بدلتے رہین گے قومون کی تاریخین اسی طرح بنی ہین اور بنتی رہین گی اور آج دنیا کے تمام آثار حقیقۃً زندہ شہادتین ہین فطرت کے اسی انقلاب پسند ذوق کی جو ذرّے سے لے کر آفتاب تک ہر جگہ ہر چیز مین اور ہر وقت یکسان طور پر موثر نظر آتا ہے —— البتہ غائر نگاہین آنے والے انقلاب کو بہت پہلے سے دیکھ لیتی ہین اور جن کی نظر بالغ و دوررس نہین ہے وہ سب آخری پردے کے اٹھنے کی منتظر رہتی ہین ——

روس کی اشتراکیت، جرمنی کی رجعت، اطالیہ کا انقلاب اور بالکل تازہ چیز ہسپانیہ کے دور ملوکیت کا خاتمہ یہ سب وہ آثار و مناظر ہیں جن کا علم ہمیں اس وقت ہوا جب یہ رونما ہو کر واقعۂ حقیقت میں تبدیل ہو گئے، لیکن جاننے والے پہلے ہی جان چکے تھے کہ زار روس کے دور قہرمانیت کو فطرت اس سے زیادہ برداشت نہ کر سکتی تھی قیصر جرمنی کے پیمانۂ کبر و غرور کا چھلک پڑنا ناگزیر تھا، اٹلی کی دشمن انسانیت، سیادت مذہبی کا ختم ہو جانا ضروری اور اسپین کے دور امارت کا مٹ جانا بالکل اٹل اور یقینی تھا۔

پھر جو کچھ گذر چکا اس کو گذر جانے دو۔ آؤ دیکھو کہ موجودہ فضا میں بھی تمھیں کوئی آثار اضطراب نظر آتے ہیں، کیا آج کی ساعتوں میں آنے والے کل کے نشانات کا کچھ پتہ چلتا ہے

مغرب کی علمی و اقتصادی، سیاسی و تجارتی تفوق کی داستانوں میں مشرق نے اپنی اہلیت، اپنی استعداد ترقی اور اپنی اخلاقی برتری کی خصوصیات کو ہمیشہ نظر انداز کیا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا نگاہوں کی خیرگی کے اسباب اب بھی اسی طرح قائم ہیں، کیا ظاہری نقش و نگار کی خوبیوں سے گزر کر بطون کی حقیقت کو ہماری نظروں نے اب بھی نہیں پہچانا؟ ———— وہ چیز جو ہمیں مغرب میں جاہ و ثروت نظر آتی تھی آج اس کے استعماری خط و خال بے نقاب ہیں وہ دل یورپ کے اقبال و دولت کے ترانے جن سازوں کے ذریعہ سے ہم تک پہنچائے جاتے تھے ان کی بے آہنگی آج کسی سے مخفی نہیں اور اس سرزمین ایجاد و اختراع کے مصالح و معامل جن کا نصب العین صرف رہزنی و قزاقی تھا، آج ویران و برباد نظر آتے ہیں ———— وہ ایوان ہائے تجارت جن کا گوشہ گوشہ ہر وقت روپے کی جھنکار سے گونجتا رہتا تھا اب سنسان ہیں ———— وہ کارخانے جہاں عفریت پیکر مشینیں ہر وقت رعد آسا آوازیں بلند کرتی رہتی تھیں ویران و برباد ہیں ———— اور وہ ٹکسالیں وہ بنک جہاں دولت ہر وقت پانی کی طرح بہتی نظر آتی تھی خاموش و غیر آباد ہیں ———— وہی یورپ جس کے تمول کے افسانوں نے ہم کو مرعوب بنا رکھا تھا آج اسی کے دولت مند فرزندوں کا یہ حال ہے کہ افلاس سے پریشان ہیں، خود کشی کیلئے آمادہ ہیں بے روزگاری نے انھیں دیوانہ بنا رکھا ہے اور اسوقت وہاں کا بڑے سے بڑا حکیم و فیلسوف چارۂ کار کی جستجو میں ناکام نظر آتا ہے

اگر ایشیا تباہ و ویران ہے تو جائے شکایت نہیں کیونکہ وہ جاہل ہے نا تراشیدہ ہے، اگر مشرق ادبار تنزل میں مبتلا ہے تو کس کو مجال گفتگو ہو سکتی ہے، کیونکہ وہ سیاہ فام ہے غیر مہذب ہے، دیوانۂ مذہب ہے

لیکن خدارا کوئی بتائے کہ آج یورپ جو اپنے آپ کو مخزن علم جانتا ہے جو تہذیب و شائستگی کا موجد و مخترع ہے جو مذہب و جذبات کی لعنت سے آزاد ہو چکا ہے، جو سفید رنگ رکھتا ہے جو حسین ہے، قوی ہے، محنتی ہے اور وہ سب کچھ رکھتا ہے جو ایک خدا کے بیٹے کی نسل سے چلنے والی مخلوق میں پایا جاتا چاہیے ———— ہاں کوئی بتائے کہ آج وہ کیوں

سوگوار ہے۔ اس کا آرام کس نے کھویا، اُس کی نیند کس نے اُچاٹ کی اور اس کے بنائے ہوئے "برج مشید" کہاں گئے؟ —— واقعہ یہ ہے کہ انسان صرف اعتبارات و مفروضات پر زندہ رہنا جانتا ہے اور جب حقیقتون سے پردہ اٹھتا ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے کہ کتنے زمانے تک اس نے اپنے آپ کو مکر و فریب مین مبتلا رکھا —— قدرت مسکرا کر پھر دوسرا پردہ ڈالتی ہے اور وہ پھر اسی تار و پود مین الجھ جاتا ہے جو اس سے قبل اس نے قائم کیا تھا —— پھر اگر غور کیجیے تو یہ زمانہ وہی ہے۔ جب حقیقتین یکے بعد دیگرے بے نقاب ہوتی جا رہی ہین اور نہایت واضح طور پر سرکش انسان کو بتایا جا رہا ہے کہ اگر واقعی وہ امن و سکون کا خواہان ہے تو اس کو استعمار مین ڈھونڈھنا چاہیے بلکہ استہلاک مین تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ تجارت و دولت کی ترقی اس حصول کی ضامن نہین بلکہ یہ جنس نایاب صرف اخوت انسانی اور ایثار و رواداری سے مل سکتی ہے جو نہ کرپ کے کارخانے کی چیز ہے نہ مانچسٹر اور لنکاشائر کے صنعت گاہون کی۔

آج ایشیا اگر بیدار ہو رہا ہے تو اس کو پہلے ہی سے یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ کیا وہ مغرب کے انھین نقوش قدم پر چلے گا جو انسان کو دولت مند تو بنا سکتے ہین لیکن اسی ساتھ انسانیت بھی چھین لیتے ہین یا وہ اپنی انھین دیرینہ خصوصیات کو قائم رکھے گا جو زمانہ "نامعلوم" سے لے کر اس وقت تک برابر انبیاؑ، رسلؑ، اولیاؒ، اکابر کے ذریعہ سے ان کے دردمند دلون مین ودیعت کی گئی ہین

اس وقت دنیا اقتصادی مشکلات مین کیون مبتلا ہے، کیا سبب ہے کہ ہر ملک ہر قوم اپنی اپنی جگہ پریشان نظر آتی ہے؟ یہ ایک سوال ہے جو اس زمانے مین ہر شخص کی زبان پر ہے —— یقیناً ایک غیبی قوت ایسی ہے جو تمام نظام عالم پر موثر ہے لیکن وہ قوت پہلے چند اسباب پیدا کر دیتی ہے اور پھر انھین کے مطابق نتائج ظاہر کرتی ہے۔ آئیے آج کی صحبت مین مختصراً ان اسباب پر بھی غور کر لین۔

تجارت و کاروبار کی دنیا کا مشہور نظریہ ہے کہ ہر چیز کی فراہمی اس کی مانگ یا طلب پر منحصر ہے، یعنی ایک چیز اسی وقت بازار مین آتی ہے جب لوگون کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ جب ایک چیز کی مانگ زیادہ ہوگی تو اس کی قیمت بھی بڑھے گی اور جب زیادتی قیمت کی طمع سے لوگ اس چیز کو زیادہ فراہم کرینگے تو قیمت بھی گھٹے گی اور اس کی فراہمی بھی کم ہو جائے گی۔ الغرض فراہمی کی زیادتی کے لیے قیمت کی کمی ایک روک ہے جو توازن کو قائم رکھتی ہے اور اگر بدقسمتی سے کسی چیز کی فراہمی بہت زیادہ ہو جاتی ہے تو پھر ایک زمانے تک اقتصادی مشکلات دور نہین ہوتے اور مصالح و معامل کے تعطل سے مزدورون اور کام کرنے والون کی معاش پر جو اثر پڑتا ہے وہ ساری دنیا مین ہیجان برپا کر دیتا ہے۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ فراہمی کے مقابلہ مین اس وقت مانگ کیون کم ہے اور یورپ کے اقتصادی مشکلات کا سررشتہ کس کے ہاتھ مین ہے، اس کے متعدد اسباب ہین

۱۔ ایک سبب تو یہ ہے کہ پیدائش کی نسبت اب اموالی شرح زیادہ ہے دران حالیکہ مصنوعات ضرورت سے زیادہ بازار مین آگئی ہین۔

۲۔ دوسرے یہ کہ نوجون مین تخفیف ہو رہی ہے جن کے مصارف و ضروریات مختلف اشیاء کی صورت مین بہ نسبت دوسرے محکمون یا طبقون کے بہت زیادہ فراہم کیے جاتے تھے،

۳۔ تیسرے یہ کہ جنگ کے بعد زیادہ تر سوشیل نظام حکومت قائم ہوتا جا رہا ہے اور معاشرت کا معیار گھٹ رہا ہے

۴۔ چوتھے روس و چین مین جدید تہذیب و تمدن کی شکست اور ہندوستان مصر و جنوبی امریکہ مین سیاسی انقلابات کا نشو و نما۔

۵۔ زیادتی ٹیکس اور قانونی ضبطی کے نفاذ کی وجہ سے جائداد اور دولت کے تمام لوگون کا عدم اعتماد

۶۔ جنگ کے بعد اسباب تجارت پر محصول اور ٹیکس کی زیادتی نے نوعیت و تعداد دونون حیثیت سے قیمتون کو بہت گران کر دیا۔

۷۔ قرضۂ جنگ کی وجہ سے تبادلۂ زر کا مکانکی نظام خراب ہو گیا،

۸۔ مسابقت (Competition) کے سلسلے مین نئی نئی اشیاء بازار مین آئین اور اسی نسبت سے فیشن اور معاشری خصائل مین جلد جلد تغیر ہونے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرسون کی بنی ہوئی چیزین کل اور کل کی بنی ہوئی آج بیکار ہو گئین۔

اس سلسلے مین پیداوار غلہ کی زیادتی کو بھی شامل کرنا چاہیے جس کا ایک سبب تو خود مہذب ممالک کا (EXPLOITATION) ہے کہ انھون نے غیر مہذب ممالک (مثلاً افریقہ) مین پہنچ کر تمام ناقابل زراعت حصۂ زمین کو ... کر کے قابل کاشت بنا دیا اور ان ممالک کے باشندون مین زراعت کی صلاحیت پیدا کر دی ——— دوسرا سبب زراعت و صناعت کی وہ سریع ترقی ہے جو ہر ملک مین رونما ہوئی خصوصاً روس جس نے سب سے پہلے خالص زراعتی اسکیم کو سامنے رکھ کر پوری جد و جہد شروع کی یہان تک کہ سال گزشتہ وہ اسکیم پوری ہو کر رہی اور اس قدر کثرت سے غلہ پیدا ہوا کہ تمام دنیا کی منڈیون پر اس کا زبردست اثر پڑا۔

اب غور کیجیے کہ کیا یہ تمام اسباب ایسے ہین جن کو انسان اپنے اختیار سے دور کر سکتا ہے، مصیبت کا بلانا تو اپنے اختیار مین ضرور ہے، لیکن اس کو دفع کرنا اپنے بس کی بات نہین ——— پھر وہ لوگ جو سال حال کی شدتون کو صرف اس امید پر بسر کر رہے ہین کہ ممکن ہے سال آیندہ ان کے لیے باعث فلاح ثابت ہو، ان کو معلوم

ہو جانا چاہیے کہ اب ہر آئندہ سال سخت سے سخت تر ہوتا جائے گا اور روے زمین کا یہ بحران اُس وقت تک دور نہیں ہو سکتا جب تک ایشیا کا انقلاب پورا نہ ہو جاے اور انقلاب کے بعد وہ دور بھی ختم نہ ہو جائے جو یقیناً خانہ جنگیون کی نہایت ہولناک و مہلک یادگار ثابت ہونے والا ہے۔

تاریخ اسپین مین ۱۵؍اپریل ۱۹۳۱ء وہ تاریخ ہے جس کو دنیا کبھی فراموش نہین کر سکتی، کیونکہ یہ وہ دن تھا جب یورپ کے ایک گوشے مین پورے پندرہ سو سال تک مسلسل قائم رہنے والے دور ملوکیت کا خاتمہ ہوا اور دو کروڑ بیس لاکھ نفوس انسانی نے پنجۂ استبداد سے چھوٹ کر سب سے پہلی سانس آزادی کی لی، درانحالیکہ خون کا ایک قطرہ بھی نہین بہایا گیا۔

اسپین زمانۂ حال کی تین لعنتون مین گرفتار تھا۔ سب سے پہلی لعنت تو کلیسا کی تھی جسنے ترقی کے راستے مین کوہ گران حائل کر رکھا تھا، دوسری لعنت فوج کی تھی جس کے بڑھے ہوے مصارف ملک کو کسی طرح پنپنے نہ دیتے تھے اور تیسری لعنت طبقۂ امرا کی تھی جو کلیسا اور فوج کی اعانت کرکے غریبون کا خون چوس رہا تھا۔

شاہ اسپین "الفانسو" ملک سے باہر کر دیا گیا اور زمام حکومت پریسیڈنٹ "زمورا" کے سپرد کی گئی جو اصل بانی اس تحریک کا ہے اور جس کی جد وجہد نے ملک کو اس زبردست اقدام کے لیے تیار کیا تھا لیکن مجھے اس کے ماننے مین تامل ہے کہ اسپین کا انقلاب ختم ہو گیا، کیونکہ جن حالات کے ماتحت وہان تغیر ہوا ہے وہ بتا رہے ہین کہ بغیر اشتراکیت کے قیام کے ملک کو سکون حاصل ہونا دشوار ہے۔

ہم کو بتایا جاتا ہے کہ برما کی بغاوت کا سبب یہ ہے کہ ہندوستان کے تاجرون نے وہان ہیچ کرانے کاروبار پر قبضہ کر لیا اور اس لیے اب وہ اپنے ملک کو ہندوستانیون سے پاک کر دینا چاہتے ہین۔ اگر واقعی سبب یہی ہے تو پھر سمجھ مین نہین آتا کہ وہ کیون چن چن کر انگریزون کو ہلاک کر رہے ہین اور کیون ان کو زیادہ مشتعل کرنے کے لیے ہندی فوجون کو اُن کے مقابلے مین روانہ کیا جاتا ہے۔

ایک طرف تو یہ تجویز ہے کہ برما کو ہندوستان سے علحدہ کر دیا جاے اور دوسری طرف ہندوستان کی دولت اور ہندوستان کی فوج وہان پر تسلط قائم رکھنے کے لیے قربان کی جا رہی ہے۔ کیا حکومت برطانیہ موٗبی نظام حکومت اس قدر ضعیف و کمزور ہو گیا ہے کہ وہ برما کے مقابلے مین انگلستان کا کوئی ایک سو اور وہان کا کوئی ایک پیسہ بھی صرف کرنے کا اہل نہین رہا ——— یہ ہے موجودہ زمانہ مین انی بربست سلطنت۔

حال جس کی سرزمین حکومت پر آفتاب کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی نہین ڈوبتا — کیا اہل ہند کے بیدار کرنے کیلیے اب اس سے زیادہ کسی اور کھلی ہوئی نشانی کے لاے جانے کی ضرورت ہے

حکومت صوبۂ متحدہ کی تاریخ مین جولائی ۱۹۳۱ء کا مہینہ بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا جب اُسنے تمام محکمون مین تخفیف کا اعلان کرکے اپنی بیکسی و بے چارگی کا اعتراف صاف الفاظ مین کرلیا ——— یقیناً آمدنی کی کمی کا اثر مصارف پر ہونا چاہیے خاص کر ایک آئینی حکومت مین جہان حکومت بالکل بجٹ کی پابند ہے اور بجٹ آمدنی کا، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر بیس بیس روپیہ پانے والے سو کلرکون کو تخفیف کرکے سویلین حکام کی تنخواہ مین اضافہ کر دیا جاے گا تو کیا اس کو حسن انتظام سے تعبیر کیا جائے گا — ایک طرف اگر ہم یہ دیکھتے ہین کہ پٹواریون کو علیحدہ کیا جارہا ہے تو دوسری طرف یہ منظر بھی سامنے ہے کہ ڈپٹی سکرٹریون کی تنخواہ بجاے ۱۵۰۰ کے ۲۷۰۰ کی جارہی ہے ——— موجودہ اقتصادی مشکلات کے دور مین چھوٹی چھوٹی تنخواہ پانے والون کو بیکار کر دینا اتنی زبردست غلطی حکومت کی ہے کہ شاید ہی اس کے نتائج کو برداشت کیا جاسکے۔ کیا حکومت نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ ملک کے جب اتنے آدمی دفعتہً محروم معاش کر دیے جائین گے تو اس کا اثر ملک کے امن وسکون پر کیا ہوگا اور موجودہ اضطراب مین اس سے کسقدر اضافہ ہوگا،

اس وقت ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ جس اختلاف آرا کی وجہ سے دشوار ہورہا ہے وہ کوئی نئی بات نہین اور پھر ایسے ملک مین جہان فکر وخیال معیشت ومعاشرت، مذہب ورسوم کا اس قدر تنوع ہو، یہ نزاع وتصادم بالکل قدرتی امر ہے، لیکن سب سے زیادہ تکلیف اس وقت ہوتی ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک فریق تو سفید کو سفید کہہ رہا ہے اور دوسرا علی الاعلان کھلا اس کی تکذیب کرکے کہہ رہا ہے کہ نہین یہ تو سیاہ ہے۔ یہی وہ صورتین ہین جب نیتون کی صداقت بھی مشتبہ ہوجاتی ہے اور گفتگو وطن کی حمایت وغداری کے باب مین ہونے لگتی ہے — چنانچہ اس وقت مسئلہ انتخاب کے مخلوط وغیر مخلوط قرار دیے جانے پر جو کشمکش جاری ہے ٹھیک اسی نقطے پر پہنچ گئی ہے۔ ملک کو سب سے پہلے یہ فیصلہ کرلینا چاہیے کہ ان مین سے کس فریق کو وطن کا دوست اور کس کو دشمن سمجھنا چاہیے۔

ہم اس سے قبل کئی بار ملاحظات کے صفحات مین اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کرکے ظاہر کرچکے ہین کہ ملک کی نجات اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانون کی فلاح صرف اسی فیصلے پر منحصر ہے کہ مخلوط انتخاب پر رضامندی کا اظہار کیا جائے لیکن ہمارے بعض نادان دوستون نے ابھی تک اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہین کیا اور وہ ابھی تک اسی سررشتہ کی

جنبش پر کام کر رہے ہیں جو اس سے قبل بارہا اسی نوع کی ترکیبوں سے کام لے کر ملک کو تباہ کر چکا ہے۔ فرمان روائے بھوپال نے ایک سے زائد بار مخالف عناصر کو جمع کر کے ان میں صلح و آشتی پیدا کرنے کی سعی بلیغ کی اور خیال کیا جاتا تھا کہ شاید سب سے آخری مرتبہ شملہ میں کوئی صورت مفاہمت کی پیدا ہو جائے گی لیکن نتیجہ وہی ناکامی رہا اور اب حالات ایسے ہیں کہ آئندہ بھی کوئی توقع کامیابی کی قائم نہیں کی جا سکتی

مہاتما گاندھی نے اس دوران میں اظہار خیال سے باز رہ کر بہت دانشمندانہ سکوت سے کام لیا ہے اور شاید ابھی تک یہ بھی صحیح طور پر نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ موجودہ اختلافات کو دیکھتے ہوئے ولایت جا کر گول میز کانفرنس میں شرکت کریں گے یا نہیں۔ لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ اگر یہ گتھی یہاں نہ سلجھی تو ولایت میں سلجھے گی، اور شاید مسلمانوں کی مخالفت کا پہلو لیے ہوگی۔ کیونکہ جس قوت نے حکومت کو اس حد تک جھکا دیا ہے وہ اس سے بھی زیادہ جھکا سکتی ہے اور اقتصادی مشکلات کا مقابلہ اس سے زیادہ دنیا کی کسی سلطنت سے ممکن نہیں۔

سرحدی آفریدیوں کے ساتھ ابھی تک حکومت برطانیہ کوئی صورت مفاہمت کی پیدا نہیں کر سکی کھجوری کے میدان پر انگریزی قبضہ ہو چکا ہے اور جہاں جہاں فوجی استحکامات اور حفاظتی چوکیاں قائم ہونا تھیں قائم ہو چکی ہیں، لیکن آفریدی ضد اور برہمی کا وہی عالم ہے وہ کسی طرح کسی قسم کا وعدہ یا عہد و پیمان کرنے کے لیے تیار نہیں جب تک کھجوری میدان کو خالی نہ کر دیا جائے اور اسطرف یہ ضد ہے کہ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن یہی ممکن نہیں۔

ہر گرمی میں یہ توقع کی جاتی ہے کہ جب پہاڑوں میں برف باری ہوگی تو آفریدی اپنے غاروں کو چھوڑ کر باہر نکلنے اور کسب معاش کے لیے ذرایع ڈھونڈھنے کے لیے بے تاب ہوں گے تو صلح کرنے پر مجبور ہو جائیں گے، لیکن جب ایام سرما بغیر کسی نتیجے کے ختم ہونے والے ہوتے ہیں تو یہ کہا جاتا ہے کہ جب گرمی ہوگی تو شدت حرارت سے مجبور ہو کر وہ شرائط ماننے پر تیار ہوں گے اسی امید میں کئی سال گذر گئے ہیں لیکن نہ گرمی اُن کے عزائم کے تنزل کرتی ہے اور نہ سردی اُن کے جذبات کو افسردہ۔

حیرت ہے کہ باوجود تمام موجودہ اقتصادی مشکلات و سیاسی اضطرابات کے حکومت اب بھی اپنی آمدنی کا بڑا حصہ آفریدی عفریت پر بھینٹ چڑھانے کیلیے طیار رہے اور کبھی ایک لمحہ کے لیے وہ اصول جنگ کے اُس پہلو کو اختیار نہیں کرتی جب سپر ڈال دینا ہی عین فتح مندی خیال کیا جاتا ہے۔

نیاز

علم فراست التحریر حصہ دوم

متعلق بہ انگریزی رسم الخط

تمہید

ہر چند عہد قدیم کے اہل دانش کو ہر چیز کی تہ تک پہونچنے میں بدرجہ غایت انہماک ہوجاتا تھا لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی توجہ اسطرف کبھی مایل نہیں ہوئی کہ انسان کی شخصیت اور اس کے طرز تحریر میں جو تعلق پایا جاتا ہے۔ اسے بھی معلوم کیا جائے۔ اس راز کا انکشاف کہ ہر تحریر میں لکھنے والے کے چال چلن اور اوضاع و اطوار کے آثار نمایاں ہوتے ہیں اور جس طرح اس کا قلم حرکت کرتا جاتا ہے ساتھ ساتھ اپنا "نقش قدم" بھی چھوڑتا جاتا ہے۔ یہ دریافت قرون وسطیٰ کی دنیا کے لئے مقدر ہوئی تھی۔ قدیم زمانہ کی تحریروں میں اگر اس قسم کے امکان کی طرف کوئی اشارہ پایا جاتا ہے تو وہ سوٹونیس کی تحریروں میں ہے۔ اگرچہ ان تحریروں سے بھی کافی وضاحت نہیں ہوتی۔ لیکن اس قدر ضرور مترشح ہوتا ہے کہ واقعات اور اشیاء کا بہ نظر غائر مشاہدہ کرنے والا یہ شخص اس قدر ضرور آگاہی رکھتا تھا کہ انسان کے کردار اور اسکی تحریر میں کوئی واقعی لگاؤ ہے۔ اس شخص نے شہنشاہ آکٹولیس آغسطس کی نسبت لکھا ہے کہ "میں نے اس کی تحریر میں یہ بات دیکھی ہے کہ وہ الفاظ کو الگ الگ نہیں لکھتا۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ایک سطر کے اختتام پر کسی لفظ کا کوئی حصہ ضبط تحریر میں آنے سے باقی رہجاتا ہے تو وہ اسے دوسری سطر کی ابتدا میں نہیں لیجاتا بلکہ اول حصہ کے نیچے لکھ کر ایک حلقہ کھینچ دیتا ہے۔"

مندرجہ بالا ریمارک سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس رومی شہنشاہ کا اس میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں تکمیل خیالات کا زبردست مادّہ تھا یعنی وہ اپنے خیالات کا تسلسل ابتدا سے انتہا تک قائم رکھتا تھا۔ معلوم نہیں کہ جو کچھ نتیجہ ہم نے نکالا ہے وہی سوٹونیس کے بھی دل میں تھا یا نہیں۔ بہرحال اس نے ایک واقعہ بیان کردیا ہے جو اسکے

نزدیک خاص طور پر دلچسپ اور معنی خیز تھا۔ اس لئے اس کے آگے مصنف مذکور نے کوئی رائے زنی یا قیاس آرائی نہیں کی۔

قدیم سلطنت روم کو جب زوال ہوا اور بربریت کی لہر نے ایک طرف سے اٹھکر دوسری طرف تباہی اور بربادی کا عالم برپا کر دیا تو جنوبی یورپ کی تہذیب و تمدن کا چراغ گل ہونے کے علاوہ وہاں کے علوم و فنون کو بھی سخت صدمہ پہونچا اور نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ معدودے چند خانقاہ نشین راہبوں یا پادریوں کے سوا لکھنا پڑھنا کوئی شخص نہیں جانتا تھا۔ حتیٰ کہ مشہور و معروف شہنشاہ شارلمین جو مقدس سلطنت روم کا اولین سالار تھا اور جس کی سنہ ۸۰۰ء میں خاص کرسمس کے روز تاجپوشی اور تخت نشینی ہوئی تھی، اپنے نام کے دستخط بھی نہ کر سکتا تھا۔

لیکن اس زمانہ میں کوہستان گراؤبنڈن میں ایک قدیم سوئس گرجا بمقام کوائرے واقع تھا جس میں بعض عجیب اور نادر تاریخی یادگاریں محفوظ تھیں۔ منجملہ ان کے چرمی کاغذ پر ایک سرکاری تحریر تھی جس پر شہنشاہ شارلمین کے دستخط تھے دستخط کا ہر ایک حرف پورا ایک انچ لمبا تھا۔ کیرولس اور مگنس دونوں لفظوں کو ایک چھوٹا سا خط کھینچکر ملا دیا گیا تھا۔ اسی طرح رومی شہنشاہ جوٹینین بھی ایک چھوٹی سی لکیر کھینچکر اپنے دستخط کیا کرتا تھا۔

اگرچہ صدیوں تک یہی عالم ظلمت و جہالت طاری رہا کہ راہبوں اور گرجا والوں کے سوائے کوئی اور شخص لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ لیکن یہ بات ایک اطالوی پروفیسر اور مسمی بالڈو کے ہاتھ پر مقدر ہو چکی تھی کہ ایک شخص کے کردار اور تحریر میں ربط معلوم کیا جائے۔ اس موضوع پر شخص مذکور کی پہلی تصنیف سنہ ۱۶۰۲ء میں شائع ہوئی۔ بالڈو کی حجت یہ تھی کہ چونکہ ایک شخص کی تحریر اس کی شخصیت کی مظہر ہوتی ہے لہذا اس کے ذریعہ سے شخص مذکور کے کردار اور اوضاع و اطوار کا بھی پتہ چلنا چاہیئے۔

بالڈو کے نظریات سے اس زمانہ کے علمی حلقوں میں دلچسپی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور ہر شخص فراست التحریر کے موضوع پر غور کرنے لگا۔ بالڈو کی کتاب کو دیگر ممالک میں اشاعت دینے کی غرض سے اس کا ترجمہ لاطینی زبان میں ایک شخص مسمی پیٹروس ویلیس نے کیا۔ چالیس برس بعد یہ اڈیشن فرانس کے مشہور شہر بولونیا میں شائع ہوا۔

اگرچہ عام طور پر یہی مشہور ہے کہ فراست التحریر کے ذریعہ سے کسی شخص کے کردار کا حال معلوم کرنا بالڈو نے ایجاد کیا تھا۔ لیکن دو صدی بعد اس فن کو باقاعدگی حاصل ہوئی تو اسکا نام "گرافولوجی" (Graphology) رکھا گیا۔ اسی سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جب بالڈو نے یہ فن ایجاد کیا اسی زمانہ میں ایک دوسرا فاضل شخص مارکس آریلیس سیویرینس (جو شہر نیپلز میں جراحی کا پروفیسر تھا) اسی قسم کے کام میں مشغول تھا۔ کہتے ہیں کہ فاضل موصوف نے اس فن کے متعلق بہت عالمانہ نتائج اخذ کئے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ وہ تمام تحریر

ضائع ہو گئی۔ لیکن بالڈو کی کتاب کا لاطینی ترجمہ جب دنیا بھر میں پھیلا تو اس کا نام روشن ہو گیا۔ مگر افسوس ہے کہ رفتہ رفتہ امتداد زمانہ کے باعث بالڈو کا نام اور اس کے نظریات بھی لوگوں کی طبیعت سے محو ہو گئے۔ لیکن ۱۸۷۵ء میں بالڈو کا پھر احیاء ثانیہ ہوا۔ یعنی ایک فرانسیسی فاضل آیبے میشون نے ٹڈیکل کالج مونٹ پیلیر کے کتبخانہ میں بالڈو کی کتاب کا لاطینی ترجمہ دیکھا اور اس نے ان نظریوں کی وسعت کے ساتھ اشاعت کی۔

اگرچہ بالڈو اور ایبے میشون کے نام فن فراست التحریر کے بارہ میں بیحد مشہور ہیں۔ مگر اسی موضوع پر وقتاً فوقتاً بہت سے مشہور سائنسدانوں نے بھی اظہار خیال کیا تھا مثلاً لیبنز (Leibnitz) نے اس موضوع پر خصوصیت کے ساتھ بحث کی کہ ہر شخص جب وہ لکھنے بیٹھتا ہے تو ہر جنبش قلم کے ساتھ اس صفحۂ قرطاس پر جو اس کے سامنے کھلا ہوتا ہے اپنی شخصیت کے پورے اثرات چھوڑتا ہے۔ اسی زبردست معلم اخلاق نے اپنی کتاب (Doctrina De mor B) میں لکھا ہے کہ:۔

”ہر شخص کی تحریر بھی تاوقتیکہ وہ کسی پیشہ ور خطاط کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نہ ہو تقریباً ہمیشہ کسی نہ کسی صورت صاحب تحریر کی طبیعت اور فطری رجحان کا اظہار کرتی ہے۔“

۱۷۹۲ء میں گروہمان نامی ایک جرمن فاضل نے چند نظریات اس بارہ میں پیش کئے کہ ہر شخص کی تحریر اور اس کے قیافہ میں ایک خاص تعلق موجود ہوتا ہے۔ اس کا قول تھا کہ تحریر کے ذریعہ سے صاحب تحریر کی ظاہری و باطنی تمام کیفیتیں معلوم کی جاسکتی ہیں۔ یعنی یہاں تک معلوم ہو سکتا ہے کہ کاتب کے بال کیسے ہیں۔ اس کی آنکھیں کس وضع کی ہیں اسکے چہرے کا رنگ کیسا ہے۔ قد و قامت کیا ہے۔ فربہ و توانا ہے یا لاغر و کمزور وغیرہ وغیرہ۔ الغرض اس شخص کے اخذ کردہ نتائج نہایت عجیب و غریب اور بعض اوقات بعید از فہم بھی ہوتے تھے۔

کچھ عرصہ بعد یعنی ۱۸۶۳ء میں ایک دوسرے جرمن فاضل ہرایم ہنزے نے جو فن فراست التحریر کا عامل تھا ایک کتاب تصنیف کی جس میں اُس نے ان لوگوں کی تحریروں سے جنہوں نے اسکی طرف رجوع کیا تھا مختلف نتائج اخذ کرکے مختصراً اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا۔ اس کتاب کا نام بھی عجیب و غریب تھا یعنی ......
(Shirogrammatomancy)

اسی موضوع پر گیٹے اور لافیٹر کے درمیان بھی کسی قدر خط و کتابت ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں موخر الذکر فلسفی اپنی شاہکار تصنیف ”علم قیافہ“ کے لکھنے میں مصروف تھا۔ اس کتاب میں اس نے کسی قدر توجہ فراست التحریر پر بھی صرف کی ہے۔ اور ایک ہی شخص کی مختلف تحریروں کے فرق دکھا کر بحث کی ہے۔ کہ قلم کے ذریعہ سے

انسان کی وہ طبعی کیفیتیں معلوم ہو سکتی ہیں جو بوقت تحریر اُس پر طاری تھیں۔ علاوہ ازیں فلسفی مذکور نے یہ بھی لکھا ہے کہ جس طرح ہر قوم میں کوئی نہ کوئی نسلی خصوصیت ہوتی ہے اسی طرح اس میں طرز تحریر کی بھی کوئی خصوصیت ضرور ہوتی ہے۔

۱۸۰۶ء میں "ایکولے ڈی مڈلین پیرس" کے پروفیسر موسیو موریو کی زیر ادارت لافیٹر کی کتاب کا تازہ اڈیشن شائع ہوا۔ جس میں مدیر مذکور نے اس باب میں جو فراست التحریر کے متعلق تھا نہایت قیمتی اضافہ کردیا تھا۔ اس میں یہ بحث کی گئی تھی کہ تمام تحریروں میں کسی قدر اختلافات ہوتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے ایک شخص کی ذہنیت اور خطاطی کے تعلقات معلوم کئے جاسکتے ہیں۔

اسی موضوع کی طرف اڈگر ایلن پو کو بھی توجہ ہوئی جس نے بعض تحریروں کے ذریعہ سے صاحبان تحریر کے کردار اور اوضاع و اطوار پر بحث کی لیکن یہ سب قیاس آرائی تھی اور دلائل کسی خاص اصول پر مبنی نہیں تھے۔

۱۸۲۳ء میں اسٹیفن کولیٹ نامی ایک انگریز نے لوگوں کے دستخطوں پر چند دلچسپ مضامین لکھے لیکن اس بات کا سہرا فرانس کے سر ہے کہ اس نے اس فن کو علمی حیثیت دیکر اُسے کافی نشو و نما دی۔ موسیو بوڈینے اسقف امینس، کارڈنل ریجنبر اسقف اعظم کامبرے اور آبے فلانڈرین کے زیر اہتمام ایک مدرسۂ فراست التحریر قائم کیا گیا۔ سلویو پیلیکو کے کردار اور اوضاع و اطوار پر موخر الذکر عالم نے ایک مضمون لکھا جسے ڈاکٹر ولسیکرے نے بھی اپنی کتاب الموسوم بہ medicine De Passions میں نقل کیا ہے۔

سب سے پہلے اس فن کے قواعد بصورت کتاب ۱۸۷۲ء میں شائع ہوئے اور اس کا نام "اسرار التحریر" (Mysteries of Handwriting) تھا اگرچہ اس کتاب کا دیباچہ موسیو دیبارولیس کا لکھا ہوا تھا مگر کتاب کے اصلی مصنف آبے میشون تھے۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو لوگ اسے ایک الہامی کتاب سمجھنے لگے۔ اس کتاب میں آبے میشون نے لکھا ہے کہ مجھے سب سے پہلے تحریر کے اسرار میرے استاد آبے فلانڈرین نے بتائے تھے۔ جس پر میں ۱۸۳۰ء تک محنت کرتا رہا۔

آبے میشون ہی نے اس فن کا نام "فراست التحریر" (Graphology) رکھا۔ لیکن اس اصطلاح کی ایجاد پر آبے میشون اور موسیو دیبارولیس کے درمیان اس قدر جھگڑا ہوا کہ عرصہ دراز تک دونوں میں بدمزگی رہی۔ دونوں اصطلاح مذکور کی ایجاد کے دعویدار تھے۔ اس جھگڑے کے بعد سے آبے میشون نے کسی شخص کو اپنا معاون نہ بنایا۔ اس کے بعد آبے مذکور نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں خاص خاص حسب ذیل ہیں:۔

"طریقہ فراست التحریر" "تاریخ نپولین اول جو اس کی تحریروں سے معلوم کی گئی" "اصول مطالعہ تحریر" "تاریخ تحریر دستی" لغت مشاہیر فرانس جن کے حالات انکی تحریر سے اخذ کئے گئے" "عہد میرو ونجی میں فرانس کی تحریر"

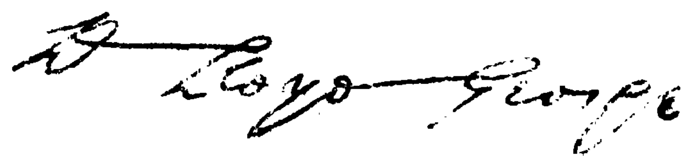
اگرچہ ایبے میشون نے اس مضمون کو علم کے درجہ تک پہونچایا۔ مگر ہنوز ایک وسیع میدان باقی تھا جو طے نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد ایک اور لائق فرانسیسی موسیو کریپیو یامین نے مزید تحقیق وتدقیق کرکے اس فن پر ایک جدید کتاب لکھی۔ اس کتاب کا نہایت قابلیت کے ساتھ مسٹر جان ہولٹ اسکولنگ نے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا اور اس میں بعض اپنے تجربات کا بھی اضافہ کیا۔

کردار خوانی قبل اس کے کہ تحریر کے ذریعہ سے کسی کی سیرت کے متعلق حکم لگایا جائے۔ یہ ضروری ہے کہ کسی شخص کی کوئی مستند تحریر سامنے رکھی جائے۔ اس مقصد کے لئے ایک دوست کا اپنے کسی دوسرے دوست کے نام بھیجا ہوا خط یا رقعہ بہت موزوں ہوگا۔ کیونکہ اس قسم کی تحریریں ہمیشہ فوری اور اضطراری ہوتی ہیں اور بغیر سوچے سمجھے لکھی جاتی ہیں۔ اور وہ خط جو کسی اجنبی کے نام لکھا جائے یا کوئی ایسی تحریر جو کاروبار کے متعلق ہو وہ ہمیشہ بعد غور و فکر ضبط تحریر میں لائی جاتی ہے۔ اس میں ایک قسم کا تصنع ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے وہ مطالعہ کردار کے لئے مناسب نہیں ہوتیں۔

اسی سلسلہ میں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ لکھنے والے کے قلم میں روانی تھی یا نہیں۔ یعنی نب ٹوٹا ہوا نہ تھا۔ کاغذ تو خراب نہ تھا۔ سیاہی زیادہ گاڑھی تو نہ تھی۔ یا زیادہ پتلی تو نہ تھی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ لکھتے وقت کاتب کی حالت بالکل طبعی ہو، جوش، غصہ، خستگی، نشۂ شراب، وغیرہ تمام باتوں کا انسان کی تحریر پر بڑا اثر پڑتا ہے مثلاً انسان بحالت خستگی قوت عمل اور جوش کے آثار بہت کم ظاہر کرے گا۔ اسی طرح بوجہ علالت انسان کی حالت بہت بدل جاتی ہے۔

الغرض اگر کاغذ، قلم، روشنائی درست ہوں اور کاتب کی ذہنی وجسمانی حالت بھی طبعی ہو تو مطالعۂ کردار کے لئے اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط اور اس کا لفافہ بہت کافی ہے، تفصیلی حالات کے لئے متعدد اور مختلف اوقات اور زمانہ کی تحریروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایسے خط کے ذریعہ سے کاتب کی ذہنی اور اخلاقی حالت کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اس کا دلچسپ نمونہ نپولین اعظم کے دستخطوں میں پایا جاتا ہے جو اس نے اپنی مصروف زندگی میں باوقات مختلف کئے تھے۔ ان دستخطوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ حیرت انگیز ہستی زمانہ کے ساتھ مختلف رنگ بدلتی تھی تو اس کے طرز تحریر میں کس قدر تغیر واقع ہو جاتا تھا۔

عکس تحریر دستخط لائڈ جارج



"یہ ایک باہمت اور پُر حوصلہ شخص کی تحریر کا نمونہ ہے۔ ایک لفظ کا دوسرے لفظ سے جوڑ ظاہر کرتا ہے کہ صاحب دستخط نہایت راسخ المقصد ہے۔ علاوہ ازیں مختلف حروف کے درمیان جو کہیں کہیں فصل پایا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر بہت آزاد خیال آدمی ہے۔ دستخط میں تین لفظ ہیں اور تینوں کے درمیان بہت فصل دیا گیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والا ملنسار آدمی ہے۔ حروف کا میلان جو جانب راست ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا دردمند دل کا مالک ہے۔ اور اثر قبول کر سکتا ہے۔ خصوصاً جبکہ اس کے جذبات رحم و محبت میں اشتعال ہو۔ لمبے لمبے خط جو جانب راست مائل معلوم ہوتے ہیں ان سے مروت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور دستخط کے نیچے جو ایک سیدھا خط کھینچ دیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاف تحریر کو خود اعتمادی بھی حاصل ہے۔

شہنشاہیت تک پہونچنے سے قبل نپولین سے دستخطوں سے تیزی حوصلہ، بلند، عزم صمیم، ڈپلومیسی، طبع رسا، اور خود اعتمادی ظاہر ہوتی تھی۔ لیکن جوں جوں اسکی اہمیت و شان بڑھتی گئی۔ اس کے دستخط بھی مختصر ہونے لگے اور ان سے رازداری کا اظہار ہونے لگا۔ سنہ ۱۷۹۶ء میں جوش فرانسیسیت کے ماتحت اس نے اطالوی حروف "ں" لکھنا چھوڑ دیا اور اس کے بعد سے اپنے نام کے حروف (Bonaparte) لکھنے لگا۔ سنہ ۱۸۰۴ء کے بعد سے وہ اپنا نام (Napolean) لکھا کرتا تھا۔ اس کے دستخط میں حروف کی گوناگونی یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ محیر العقول طور پر چست و چالاک اور طبیعت کے لحاظ سے بوقلمون تھا۔ اس کے دو دستخط کبھی یکساں نہیں ہوئے۔ وہ ہمیشہ اپنے نام کے نیچے خط کھینچ دیا کرتا تھا۔ بعض اوقات یہ خط اسقدر جلی اور بھدا ہوتا تھا جس سے اسکے مزاج کی سفاکی ظاہر ہوتی تھی۔ آسٹرلٹز کی فتح کے بعد جو دستخط اس نے کرنا شروع کئے۔ ان میں یہ خصوصیت پیدا ہو گئی کہ دستخط کے حروف کا میلان داہنی جانب اوپر کی طرف

اس قدر ہو گیا کہ حرف اول یعنی (N) سے ۴۵ درجہ کا زاویہ بنجاتا تھا۔ یہ نپولین کے اس زمانہ کی تحریر تھی جب اس کا آفتاب اقبال نصف النہار تک پہونچ گیا تھا۔ ابھی تک کوئی مدمقابل اس کا پیدا نہ ہوا تھا۔ اسنے یورپ میں ترک اُٹھائی تھی۔ اور اسکندر اعظم کی طرح ٹھنڈی سانسیں بھر کر کہتا تھا کہ اور دو چار دنیائیں ہوتیں تو انکو بھی فتح کر لیتا۔ اس کے بعد جب اس کے زوال کا زمانہ آیا تو اس کے دستخط کے حروف چھوٹے ہونے لگے اور ان کا میل بھی بجائے بلندی کے پستی کی طرف ہوتا تھا۔ اس کے یہ معنی تھے کہ اب اس طاقتور اور خونخوار شخص کے دل کی امنگیں بجھ گئی تھیں اور وہ سخت مایوس اور دل شکستہ ہو گیا تھا۔ اگرچہ دستخط کے نیچے اب بھی خط ہوتا تھا۔ لیکن وہ اعتماد بالنفس کا مایوسانہ اظہار لئے ہوتا تھا۔ وہ بات نہیں رہی تھی جو پہلے تھی۔ یعنی پہلے اس کے خط سے زبردست اعتماد بالنفس ظاہر ہوتا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا صاحب امضاء خود کو طاقت کا ناقابل تسخیر دیوتا سمجھتا ہے۔

کسی شخص کی تحریر سے نتائج اخذ کرنے سے قبل طالب کو لازم ہے کہ وہ اس تحریر کی مجموعی ہیئت پر غور کرکے کوئی عام رائے قائم کرے۔

اعلےٰ تحریر بآسانی معلوم ہو جاتی ہے یعنی اس قسم کی تحریر میں صفائی، روانی، پختگی ہوتی ہے۔ اور حروف میں ہلکے ہلکے زاوئے بھی ہوتے ہیں۔ یہ تحریر نمائش اور تصنع سے معرا ہوتی ہے۔ اس کے حروف میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں ہوتی اور نہ سطروں کی روانی سے کسی قسم کے پس وپیش کا اظہار ہوتا ہے۔ تحریر کے اندر جتنی مرتبہ حرف "ٹی" (t) ہو کٹا ہوا ہوتا ہے۔ کاما (،) سمی کولن (؛) اور اسٹاپ (۔) صحیح ہوتے ہیں اور بائیں جانب کافی حاشیہ چھوٹا ہوا ہوتا ہے۔ کل تحریر میں خوشگوار ترتیب ہوتی ہے اور بعض بعض حروف میں خاص قسم کی جدت پائی جاتی ہے۔ الغرض بحیثیت مجموعی تمام اثر خوش آیند ہوتا ہے۔

درجہ اوسط کی تحریریں مختلف اقسام کی ہوتی ہیں۔ اوسط درجہ کی تحریر اگر کسی کوتاہ عقل شخص کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہو تو اس میں بیک وقت تیزی خیال اور صفائی حروف کا ہونا دشوار ہے اگر اوسط درجہ کا شخص جلد جلد غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے تو اس کے خیالات میں ہمیشہ انتشار اور پریشانی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ بیک وقت اپنے دل میں مختلف خیالات قائم کرتا ہے جو باہم متصادم ہو جاتے ہیں۔ یہ بات اس واقعہ سے ظاہر ہو سکتی ہے کہ اگر ایسی تحریر کے اوپر یا نیچے کوئی خط مستقیم کھینچدیا جائے تو کوئی کوئی حرف اس خط سے نیچے یا اوپر بہٹو گی کے ساتھ بڑھا ہوا دکھائی دے گا۔ ایسی تحریر بعض اوقات پڑھی بھی نہیں جاتی، کاما یا اسٹاپ کا بھی اہتمام نہیں ہوتا۔ قلم کی جنبش کہیں کم کہیں بہت زیادہ ہوتی ہے۔ نہ ہم آہنگی ہوتی ہے نہ خوبصورتی۔ الغرض یہ ہیں وہ باتیں جو اوسط درجہ والی تحریر کی خصوصیات سمجھی جاتی ہیں۔

ادنےٰ درجہ کی تحریریں عموماً ایک خاص قسم کی باقاعدگی ہوتی ہے تمام حروف سیدھے یا تقریباً استادہ ہوتے ہیں۔ لفظ کے آخر حرف کا آخری حصہ چھوٹا کر دیا جاتا ہے۔ حروف اور الفاظ کے درمیان فصل بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس قسم کی تحریریں تصنع سے خالی نہیں ہوتیں۔ سوچ سمجھ کر لکھی جاتی ہیں۔ اور ان میں اضطراری کیفیت مطلق نہیں ہوتی۔ بہت باریک اور اینٹھی ہوئی تحریر بھی دنائت کی مظہر ہوتی ہے۔ ایسی تحریر ہمیشہ ایسے شخص کی ہوتی ہے جسکی تمام زندگی ایک شغل بے معنی کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہاتھ سنبھال کر غور و تامل سے لکھی ہوئی تحریر۔ قلم کی ناخوشگوار جنبشیں جیسی کہ عموماً غیر تعلیم یافتہ اشخاص کی ہوتی ہیں مزید ثبوت ہیں دنائت تحریر کا۔

عکس دستخط ٹامس لپٹن



"ماہرانہ تحریر ہے۔ جس سے مروت اور کاروباری حوصلہ مندی کے علاوہ ڈپلومیسی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ صاحب تحریر اگرچہ متہور ہے مگر صاحب استقلال ہے۔ اگر اس سے اضطراری طور پر کوئی ناخوشگوار حرکت سرزد ہو جاتی ہے تو اسے اس کا افسوس ہوتا ہے اور وہ اس معاملہ پر پوری طرح سے غور کرتا ہے۔"

خوشنویسی ایک فن اکتسابی ہے لہذا کردار خوانی کے لئے بیکار ہے۔ انگریزی میں ایسی تحریر کو Copper plate Handwriting کہتے ہیں۔

الغرض تحریر زیر غور کی نسبت یہ رائے قائم کر کے کہ وہ اعلےٰ، اوسط یا ادنےٰ درجہ کی ہے، یہ بات دیکھنا ضروری ہے کہ تحریر مذکور پر عقل و فہم، قوت ارادی یا قوت اخلاقی میں سے کس کا اثر نسبتاً زیادہ ہے مثلاً کیا صاحب تحریر فرض کو سب سے زیادہ اہم چیز سمجھتا ہے، کیا وہ سخن پرور اور خودسر ہے، یا اس کا امتیاز اخلاقی اور قوت ارادی دونوں عقلیت کے ماتحت رہتے ہیں۔

جب تحریر کے متعلق عقل و فہم، قوت ارادی اور قوت اخلاقی کا نسبتی اثر معلوم کر لیا گیا تو اس کے

بعد اس امر کی ضرورت ہے کہ نشانات عمومی پر غور کیا جائے اس کے بعد نشانات خصوصی کا نمبر آتا ہے۔ اور سب سے آخر میں خصوصیات منتج شدہ کا۔

اعادہ یا تکرار سے کسی خاص نشان یا علامت کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک علامت دوسری کا ردعمل کرتی ہے یا اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص میں خود غرضی اور مروت دونوں باتیں ظاہر ہوتی ہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ کبھی کوئی اچھا کام بھی کر گذریگا۔ بشرطیکہ اس کام سے اسے کوئی ذاتی تکلیف نہ ہو۔ ایک ہی شخص میں اکثر بخل و اسراف دونوں شریک پائے جاتے ہیں۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے اوپر تو خوب دریا دلی سے دولت خرچ کرتا ہے۔ لیکن جہاں دوسروں کا تعلق ہوتا ہے بہت بخل سے کام لیتا ہے۔

جو حضرات فن فراست التحریر سے محض شوقیہ تعلق رکھتے ہیں انھیں کردار خوانی کی تصنیف میں پڑنے سے محترز رہنا چاہیئے۔ ابتداً تو وہ محض عام خاکہ کسی کے کردار کا کھینچا کریں۔ مثلاً تحریر زیر غور اعلےٰ درجہ کی تحریر نظر آتی ہے صاحب تحریر سادہ مزاج اور بلا تصنع آدمی ہے اس کے خیالات صاف اور اس کا ذوق سلیم ہے۔ تیز فکر ہے۔ عادتاً سرگرمی عمل نکلتا ہے۔ چست و چالاک ہے اور امیدوں بھرے دل کا مالک ہے۔ وہ حوصلہ مند ہے مگر کسی کام میں تعجیل سے کام نہیں لیتا۔ وہ شخص اعتماد کے قابل ہے۔ اپنا یا دوسروں کا راز ہرگز فاش نہ کرے گا۔ اس کا دماغ اسکے دل پر حکومت کرتا ہے۔ اس کی قوت ارادی اوسط درجہ کی ہے۔ اور اسکی اخلاقی حالت بہت اچھی ہے۔

اگر تحریر کسی غیر ملک کی ہو تو اسکے مطالعہ میں اس خاص ملک کی حالت، زبان، اور صاحب تحریر ماحول کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ کسی قدیم تحریر پر غور کرتے وقت بھی انہی باتوں کا خیال ہو گا۔ مثلاً سولہویں اور سترہویں صدیوں کی زندگی آج کل کی زندگی سے بہت زیادہ پیچیدہ تھی۔ اس زمانہ کا نصب العین بھی اس زمانہ سے بہت زیادہ مختلف تھا۔ اس زمانہ میں جس قدر رسمی تکلفات۔ آداب مجلس اور تہذیب کا خیال رکھا جاتا تھا۔ اس قدر آج کل نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص ذرا سی بات سے بھی انحراف کرتا تھا تو اس کی شامت آجاتی تھی۔ تقریر و تحریر کے دستور العمل مقرر تھے۔ جن سے انحراف کرنا قابل مواخذہ سمجھا جاتا تھا۔ یہی تمام باتیں اس زمانہ کی تحریروں سے نمایاں ہیں۔ نہایت شائستہ اور عمدہ دستخط کرنے میں کم از کم نصف گھنٹہ صرف ہوتا تھا۔ تمام تحریر پیچیدہ حروف اور نقوش نمائشی کا گلدستہ ہوتی تھی۔

اپنے زمانہ میں ملکہ الزبتھ بہت بڑی ہوشیار اور چالاک سمجھی جاتی تھی۔ لیکن آج اگر آپ اس کے دستخط دیکھیں اور یہ نہ معلوم ہو کہ وہ تحریر کس زمانہ کی ہے تو آپ وہ تحریر دیکھتے ہی فوراً کہہ اٹھیں گے کہ لکھنے والا شخص کوئی پاگل تھا۔

ملکہ وکٹوریا کے ابتدائی زمانہ میں انگریز عورتوں کے درمیان خوبصورت اطالوی طرز کی تحریر رائج

تھی جبکہ حروف داہنی طرف بہت زیادہ جھکے ہوتے تھے۔ یہ زمانہ انتہا درجہ کی نسائیت کا زمانہ تھا۔ عورتوں پر ذراسی بات میں غشی طاری ہو جاتی تھی۔ اظہار جذبات کا فیشن اپیل طریقہ عشق کا آنا سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانہ کی تحریریں اگر آج دیکھی جائیں تو نہایت کمزور اور اظہار کردار میں قاصر پائی جائیں گی۔

علامات عمومی

(۱) صاف، یکساں، اور ہم آہنگ حرف والی تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والے کا ذہن روشن ہے۔ خیالات واضح ہیں اور وہ اوسط سے زیادہ دماغی قابلیت رکھتا ہے۔

(۲) پیچیدہ اور گنجلک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا تشویش ذہنی میں مبتلا رہتا ہے۔

(۳) جوش میں آکر لکھی ہوئی تحریر جس کے حروف چھوٹے بڑے ہوں اس امر کی مظہر ہے کہ لکھنے والے کے نظام عصبی میں سکون نہیں ہے۔

(۴) پختہ تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والی کی صحت اچھی ہے۔ اور اس کے کردار واطوار میں بھی استواری و پختگی ہے۔

(۵) یکساں تحریر سے فقدان انفرادیت کا اظہار ہوتا ہے۔ روکھے پھیکے اور غیر دلچسپ آدمیوں کی تحریر ہمیشہ ایسی ہی ہوتی ہے۔

(۶) بہت سست اور محنت سے لکھی ہوئی تحریر اس بات کا ثبوت ہے کہ لکھنے والے کے دماغ میں شئے لطیف کی کمی ہے۔ اور اس کے خیالات و محسوسات بھی بحیثیت مجموعی دھندلے ہیں۔

(۷) تیزی کے ساتھ لکھی ہوئی تحریر اس امر کی مظہر ہے کہ لکھنے والے کے خیالات میں بھی تیزی ہے۔ عین وقت پر کام کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ قوت فیصلہ بھی حاصل ہے۔ اور اس کی عادت میں یہ داخل ہے کہ وہ بہت جلد نتائج نکالنے لگتا ہے۔

(۸) اعلیٰ قسم کی تیز اور غیر واضح تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والا عمل تحریر میں مسلسل مصروف رہتا ہے اور وہ اپنا کام حتی الامکان بہت جلد ختم کرتا ہے اور اس بات کی پروا نہیں کرتا ہے کہ اس کی تحریر سے پڑھنے والوں کو کس قدر تکلیف ہوگی۔ اس قسم کا آدمی اپنے وقت کی قدر و قیمت بہت زیادہ سمجھتا ہے اور دوسروں کے وقت کی پروا نہیں کرتا۔

(۹) مربع تحریر صحیح الدماغی کی علامت ہے۔ ایسی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والا فکر و استدلال میں سست ہے اور کوئی فیصلہ کرنے سے بیشتر معاملہ پر خوب غور کر لیتا ہے۔ اس قسم کے آدمی جو کام کرتے ہیں سستی کے ساتھ کرتے ہیں۔ مگر ان کا ہر کام یقینی ہوتا ہے۔

(۱۰) گول تحریر جس کے حروف زاویوں سے معرا ہوں یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ لکھنے والا بہت با اخلاق

اور پُرمروت آدمی ہے۔ وہ ہر بات گوارا کرے گا مگر کسی سے جھگڑا مول نہ لے گا۔ اگرچہ یہ لوگ کسی قدر سست اور کاہل ہوتے ہیں۔ مگر عموماً صاحب سلیقہ اور ہردلعزیز ہوتے ہیں۔ اجنبیوں سے بات چیت کرنے میں وہ ڈپلومیسی سے کام لیتے ہیں۔ اور جب کبھی اپنے افسروں سے بات چیت کرتے ہیں تو گفتگو میں عموماً کسی قدر خوشامد بھی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اس مقولہ کے معتقد ہوتے ہیں کہ ”بمقابلہ سرکہ کے شہد سے زیادہ مکھیاں پکڑی جاسکتی ہیں۔“

(۱۱) اعلیٰ قسم کی تحریر جس کے حروف زاویہ دار ہوں یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ صاحب تحریر قوت ارادی اور قوت مزاحمت کا مالک ہے۔ اور اگر یہی بات کسی اوسط یا ادنےٰ قسم کی تحریر میں نمایاں ہو تو سمجھنا چاہیے کہ صاحب تحریر کو سخن پروری کی عادت ہے اور اگر اس سے کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے تو تسلیم نہیں کرتا۔

(۱۲) خوبصورت اور خوش اسلوبی سے لکھی ہوئی تحریر نازک خیال اور صاحب ذوق سلیم ہے۔

عکس دستخط



”اس تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر دھن کا پکا۔ پُرحوصلہ اور اپنی ذات پر اعتماد رکھنے والا شخص ہے۔ وہ ملنسار، کشادہ دل اور صاحب مہر و مروت ہے۔ وہ بڑے بڑے منصوبے قائم کرسکتا ہے۔ لیکن تفصیلات پر توجہ نہیں کرتا۔“

(۱۳) اعلیٰ قسم کی تحریر جس کے حروف بہت چھوٹے چھوٹے مگر صاف پڑھے جاتے ہوں یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ لکھنے والے کو تفصیلات کا شوق ہے، باریک بینی اور نزاکت پسندی عادت میں داخل ہے اور ایک بات کو سمجھنے کی خوب قابلیت رکھتا ہے۔

(۱۴) اوسط درجہ کی تحریر جس کے حروف چھوٹے چھوٹے مگر صاف ہوں یہ ظاہر کرتی ہے کہ لکھنے والا رسم و رواج دنیوی کا بہت پابند ہے۔ زندگی کے متعلق اس کا مطمح نظر تنگ اور معمولی باتوں تک محدود ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا شخص پوری طرح سمجھدار ہو لیکن وہ وسیع الخیالی کی اہلیت نہیں رکھتا۔ ایسے شخص کو صدمہ یا رنج پہونچا دینا نہایت آسان ہے۔

(۱۵) چھوٹے حروف والی مہمل تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ [illegible]الا شخص کچھ نہیں ہے۔

(۱۶) بڑے حروف کی تحریر اگر وہ قسم اعلےٰ میں ہو ظاہر کرتی ہے کہ صاحب تحریر کی تمنائیں بلند ہیں وہ فیاض طبع اور کشادہ دل ہے۔ اپنی ذات پر اعتماد کامل رکھتا ہے اور اسکے مزاج میں کسی قدر غرور و نخوت بھی ہے۔ غیر تعلیم یافتہ لوگ اور بچے بھی بڑے بڑے حروف لکھا کرتے ہیں۔ اور ایسی ہی تحریر ان لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو ضعف بصر میں مبتلا ہیں۔ اگر وہ شخص بھی جس کی بصارت درست ہے کمزور روشنی میں خط لکھنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے حروف غیر شعوری طور پر پھیل جاتے ہیں حتیٰ کہ قد و قامت میں ان حروف سے دُگنے ہو جاتے ہیں۔ جو وہ بحالت طبعی لکھتا ہے۔

(۱۷) اعلےٰ قسم کی تحریر جس کے حروف کا رخ بلندی کی جانب ہو یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ لکھنے والے میں شوق عمل، حوصلہ، سرگرمی اور شگفتہ مزاجی ہے۔ اور زندگی کے متعلق اس کا مطمح نظر بڑا امید افزا ہے اگر یہ تحریر ادنےٰ قسم کی ہے تو سمجھ لیا جائے کہ صاحب تحریر میں تصنع، شیخی اور بیہودہ غرور و نخوت ہے۔

(۱۸) وہ تحریر جسکے حروف کا رُخ جانب پستی ہو مظہر ہے دل شکستگی، حزن و ملال، تن آسانی، مایوسی اور اکثر خرابی صحت کی۔

(۱۹) عمودی تحریر ظاہر کرتی ہے کہ صاحب تحریر کے مزاج میں سرد مہری ہے مگر اس کے ساتھ اس میں قوت استدلال اور کسی قدر قوت تخئیل بھی موجود ہے۔ اس قسم کا شخص صرف اپنے ہی کو دیکھتا ہے۔ اسے دوسروں سے صرف اسی قدر دلچسپی ہوتی ہے جس قدر وہ اس کی خدمت کرتے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگ اس سے ملاقات کرنے آئیں اور متنظر توجہ رہیں۔ اگر کوئی شخص اس کی ذات یا اس کے کاروبار میں کسی قسم کا بھی دخل دیتا ہے تو اسے ناگوار گذرتا ہے۔

(۲۰) ایسی تحریر جس کے حروف کا رخ عقب کی طرف جھکا ہوا ہو بے اعتمادی ظاہر کرتی ہے۔ ایسی تحریر سے ایسے شخص کے کردار کا اظہار ہوتا ہے جس میں اوائل عمر ہی سے خرابیاں واقع ہو گئی تھیں۔ جس کا باعث غالباً صحبت نا اہلاں یا بچپن کی غلط فہمیاں ہوئی ہوں گی۔ غنچہ دل کھلنے نہ پایا تھا کہ مرجھا کر رہ گیا۔ رفتہ رفتہ طبیعت میں خلوت گزینی کی عادت پیدا ہو گئی۔ علاوہ ازیں جذبات و محسوسات کو دبانے کی عادت پڑ گئی۔ اس قسم کے اوضاع و اطوار کا شخص اپنی فکر تو کر سکتا ہے۔ لیکن اس میں حقیقی ہمدردی نہیں ہوتی اور وہ ہمیشہ اعتماد باہمی، ایثار نفسی اور کھلے ہوئے خلوص کی لذت سے محروم رہتا ہے۔

جن لوگوں کی تحریر کے حروف عقب کی طرف کھلے ہوئے ہوتے ہیں وہ عموماً زندگی کی خصوصیات ظاہری کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ ان لوگوں میں اکثر ذوق سلیم بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن جس قدر وہ فنون لطیفہ

کے دلدادہ ہوتے ہیں، اس قدر وہ مناظر قدرت سے لطف نہیں اٹھاتے۔ وہ ہمیشہ زمانہ کے ساتھ چلتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ان کا ماحول اور لباس وغیرہ زمانۂ حال کے مطابق ہو۔ اگرچہ ان کے احباب اور شناساؤں کی تعداد بہت کثیر ہوتی ہے۔ لیکن وہ غالباً زندگی بھر میں یہ دعوےٰ نہیں کر سکتے کہ ان کا کوئی ایک شخص بھی گہرا دوست ہے۔

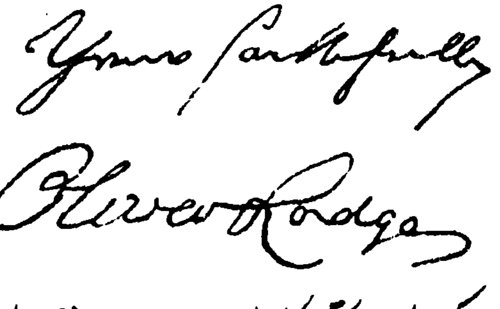
(۲۱) جس تحریر کے حروف داہنی طرف میل رکھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والا قوتِ تخیل کا مالک ہے۔ اور اسکی طبیعت ہمدردانہ، محبت شعار اور حساس واقع ہوئی ہے۔

(۲۲) اعلیٰ قسم کی تحریر جس کے حروف بے ترتیب ہوں، مگر باوجود بے ترتیبی کے خوش نما اور ہم آہنگ، ہوں یہ ظاہر کرتی ہے کہ لکھنے والے میں زندہ دلی، چستی چالاکی، تنوع اور سلیقہ موجود ہے۔ صاحب التحریر خود کو زندگی کی ہر حالت اور ہر پوزیشن کے مطابق کر لیتا ہے۔ اور اس سے پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔

اگر ادنےٰ قسم کی تحریر کے حروف بے ترتیب ہیں، یعنی ایک حرف ایک طرف کو جاتا ہے اور دوسرا طرف کو علاوہ ازیں حروف بھی بے ڈھنگے پن سے ثبت ہوں۔ حروف کے قد و قامت میں بھی فرق ہو تو اس سے تلون مزاجی، عدم استقلال۔ اور بے اعتباری کا اظہار ہوتا ہے۔ ایسا شخص دعوےٰ تو یہ کرتا ہے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے مگر فی الحقیقت جانتا کچھ نہیں۔

(۲۳) بے ربط اور پریشاں حروف کی تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر کی طبیعت میں کسی قسم کا نظم نہیں ہے۔ دل میں خیالات آتے ہیں مگر بے نتیجہ رہ جاتے ہیں۔ اس کا دل ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف دوڑتا ہے۔ لیکن کبھی ایک جگہ قائم نہیں رہتا۔

عکس دستخط



"یہ نمونہ ظاہر کرتا ہے کہ صاحب تحریر کا دل امیدوں سے معمور اور پُر از حوصلہ ہے۔ حروف کی زیر و بالکشش سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والے میں جسمانی اور دماغی سرگرمی بہت زیادہ ہے۔ جنبش قلم کے ساتھ ساتھ تیزیِ فکر بھی موجود ہے۔ حروف کا جو میلان

جانب راست ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والا صاحب شعور آدمی ہے۔"

(۲۴) گندہ تحریر اگر اعلیٰ قسم کی ہے تو صاحب تحریر کی عیش پسندی اور اگر ادنیٰ قسم کی ہے تو لکھنے والے کی سفاکی اور شقاوت قلبی ظاہر کرتی ہے۔

(۲۵) بھدی اور غیر معمولی تحریر تصنع کا اظہار کرتی ہے۔

(۲۶) جس تحریر سے ارتعاش ظاہر ہوتا ہو وہ کبر سنی، اشتعال طبع یا خرابی صحت کا اظہار کرتی ہے۔

(۲۷) ٹوٹی ٹوٹی تحریر یعنی جس کے حروف کی کشش جگہ جگہ سے جدا ہو، عوارض قلب کا اظہار کرتی ہے اور یہ بھی خبر دیتی ہے کہ لکھنے والے پر فالج کا حملہ ہونیوالا ہے۔

(۲۸) پھیلی ہوئی تحریر جس کے آخری حروف داہنی طرف کو بڑھے ہوئے ہوں تن آسانی، خوش پسندی اور اسراف کا اظہار کرتی ہے۔

(۲۹) بہت گنجان یعنی "پچ پچ" تحریر سے حرص و آز کا اظہار ہوتا ہے۔

(۳۰) تیز تحریر جس میں حروف کی کشش بہت بڑی اور بہت زیادہ ہو، فکر اور اظہار خیال کی تیزی پر دال ہے۔ اگر ایسا شخص کبھی کبھی اس اصول پر عمل کیا کرے کہ خاموشی بہت اچھی چیز ہے تو بہت اچھا ہوگا۔

(۳۱) ایسی تحریر جس کے حروف میں تمام زاویے ہوں۔ پیچ و خم کہیں نہ ہو، یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ صاحب تحریر نہایت سرکش ہے۔ کسی کی نہیں مانتا اور مزاج بھی غیر مطبوع رکھتا ہے۔ جو لوگ اس طرح لکھتے ہیں وہ ہرگز ملنسار اور محبت شعار نہیں ہوتے، وہ ہمیشہ جلی کٹی سنانا اور سخت جواب دینا پسند کرتے ہیں یہ بہتر ہوگا کہ ایسے لوگوں سے دور رہا جائے۔ ایسے لوگ ظالم بھی ہو سکتے ہیں۔

(۳۲) اینٹھی ہوئی تحریر جس میں حروف ایک، دوسرے سے بہت زیادہ ملے ہوئے ہوں بشرطیکہ وہ قسم اعلیٰ میں داخل ہو، یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ صاحب تحریر سے میل جول پیدا کرنا بہت مشکل ہے۔ اسکے مزاج میں بھی خبل ہے۔ اگر تحریر قسم ادنیٰ کی ہے تو لکھنے والے کے ابتذال و دنائت پر دال ہے۔

(۳۳) کھلی ہوئی تحریر یعنی جس کے حروف کے مابین بہت زیادہ فصل ہو، فضول خرچی، یار باشی اور مخلوق کے آرام و راحت کا خیال ظاہر کرتی ہے۔ اگر ایسی تحریر میں قسم ادنیٰ کے علامات پائے جاتے ہیں تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والے میں ہر جگہ دخور حاصل کرنے کا ملکہ ہے۔ ہر جگہ میل ملاقات اور ربط ضبط پیدا کر لیتا ہے۔ اور اگر اسے اپنی کوششوں میں کبھی ناکامی ہوتی ہے تو مطلق پروا نہیں کرتا۔

(۳۴) تحریر جو لفافہ کے قد و قامت اور کاغذ خط کے مطابق ہوتی ہے وہ ظاہر کرتی ہے کہ صاحب تحریر سلیقہ شعار اور صاحب ذوق سلیم ہے۔ عقیل و فہیم ہے اور طبیعت میں بھی لوچ رکھتا ہے۔

(۳۵) ایسی تحریر جس میں سانپ کی طرح لہریا تموج ہو اگر وہ قسم اعلیٰ کی ہے تو ڈپلومیسی کا اظہار کرتی ہے اگر تحریر قسم ادنیٰ کی ہے تو اس سے ریا، خدع اور مکر و فریب کا اظہار ہوتا ہے۔

(۳۶) ایسی تحریر جس کے الفاظ کے آخری حروف صحیح طور پر پڑھے نہ جاتے ہوں اور وہ باریک خط کی صورت میں مختتم ہوتے ہوں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والے کی طبیعت میں دخل پانا بہت مشکل ہے۔ اس قسم کے لوگ وضاحت مطلب اور صفائی بیان سے گریز کرتے ہیں۔ یہ لوگ عموماً ذکی، مکار اور چالاک ہوتے ہیں۔

(۳۷) ایسی تحریر جس میں الفاظ کے آخری حروف قد میں بڑھ جاتے ہوں، صاف گوئی، پاکیزگی خیال، استقلال مزاج، اور سادگی طبع کا اظہار کرتے ہیں۔ کیونکہ ایسے لوگ عموماً سریع الاعتقاد ہوتے، لہذا بہت آسانی سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔

(۳۸) اگر تحریر میں ہم آہنگی اور خوشنمائی ہے، لیکن کہیں کہیں کوئی حرف یا لفظ بھدا داخل ہو جاتا ہے یا کوئی حرف زاویہ دار پڑ جاتا ہے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر کی زندگی کسی ناگوار اور غیر مطبوع اثر کی وجہ سے بدمزہ ہو گئی ہے۔

(۳۹) ایسی تحریر جس کے حروف ٹائپ جیسے معلوم ہوتے ہوں حسن مذاق اور فنون لطیفہ کے شوق پر دال ہو۔ نقاش اور مصوروں کی تحریر میں عموماً اسی قسم کی صفائی اور خوش نمائی پائی جاتی ہے۔

(۴۰) بائیں ہاتھ کا صاف اور عمدہ حاشیہ مذاق سلیم پر دلالت کرتا ہے۔

(۴۱) اگر صفحہ کے دونوں طرف حاشیہ چھوڑا جائے تو اس سے تنک مزاجی اور عالی دماغی کا اظہار ہوتا ہے۔

(۴۲) اگر تحریر میں جگہ جگہ عبارت کے نیچے خط کھینچے جائیں تو اس سے امر کا اظہار ہوتا ہے کہ صاحب تحریر کی طبیعت جلد اشتعال پذیر ہو جاتی ہے۔ مبالغہ پسند واقع ہوئی ہے اور اس میں احساس تناسب کا فقدان ہے۔ جو لوگ اس قسم کی تحریر لکھتے ہیں وہ "کوہ کندن وکاہ برآوردن" کے عمل سے بہت خوش ہوتے ہیں۔

(۴۳) جس تحریر میں قلم کی لپیٹ اور ضرورت سے زیادہ نمائش قلم نمایاں ہو اس سے زعم و ادعا کا اظہار ہوتا ہے

عکس دستخط



"صاحب تحریر کی فکر عمیق اور منصوبے وسیع ہیں۔ قدرت نے اسے بہت بڑی دماغی اور جسمانی طاقتیں عطا فرمائی ہیں، اور جس قدر اعتماد بالنفس اور استقلال کی خیالات کو صورت عمل دینے کے لئے ضرورت ہے اس قدر اس میں موجود ہے۔"

capital letter (بڑے حروف) اگر زیادہ واضح و نمایاں ہوں تو

(۴۴) حسن تخیل پر دلالت کرتے ہیں۔

(۴۵) چھوٹے اور پست حروف مکاری کا اظہار کرتے ہیں۔

(۴۶) خوبصورت اور دیدہ زیب حروف سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والے جمالیات صوری سے کافی مذاق حاصل ہے۔

(۴۷) گھٹے ہوئے دیدہ زیب حروف یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ صاحب تحریر ایک متکبر و متمرد شخص ہے۔

(۴۸) تحریر میں ایسے حروف کلاں لکھنا جن کی کرسی بقیہ لفظ سے پست ہو، جذبۂ تحفظ کا اظہار کرتا ہے اور اس میں کسی قدر حصہ خود پسندی کا بھی پایا جاتا ہے۔

(۴۹) تحریر میں ایسے حروف کلاں لکھنا جن کا بقیہ حروف تحریر سے کوئی تناسب نہ ہو ہسٹیریا اور دیوانگی کو ظاہر کرتا ہے۔

(۵۰) اگر تحریر میں حروف کلاں کو لفظ مابعد کے حرف ابتدائی سے جوڑ دیا جائے تو اس سے ایثار، سخاوت اور پرانے دوستوں اور مشاغل سے محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

(۵۱) اگر بقیہ لفظ میں شامل ہونے سے قبل کسی حرف کلاں میں حلقہ بنایا جائے تو اس سے جماعتی اسپرٹ، حجابندی، محبت اہل و عیال اور دوستوں سے وفاداری کا اظہار ہوتا ہے۔

(۵۲) اگر کسی لفظ کا ابتدائی حرف کلاں بقیہ لفظ سے الگ تھلگ کسی قدر فصل کے ساتھ لکھا جائے اور اس کا بقیہ لفظ سے کسی طرح بھی میل نہ ہو تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر کی طبیعت آزادی پسند واقع ہوئی ہے۔ ایسا شخص بال بچوں یا تعلقات دوستانہ کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ وہ پرانے احباب کے مقابلہ نئے دوستوں کو پسند کرتا ہے۔

(۵۳) اگر تحریر میں علامات وقف (Punctuation) صحیح ہیں تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر تفصیلات پر خوب نگاہ رکھتا ہے اور اسے صحت کا بہت شوق ہے۔

(۵۴) اگر تحریر میں صحیح علامات وقف نہیں ہیں تو اس سے لکھنے والے کی نسبت یہ ظاہر ہوتا ہے

کہ وہ خالی الذہن اور بے پرواہ ہے۔ اور اس میں نظم و ترتیب کا فقدان ہے۔ ایسے لوگوں کے خیال میں چھوٹی چھوٹی معمولی باتیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ مگر وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کامیابی اور ناکامی کے درمیان کتنا فرق ہے۔

(۵۵) ایک ذرا سا خط یا کشش جو دو لفظوں کو جدا کر دے دور اندیشی کا مظہر ہے۔ اگر یہ خط مستقیم ہے تو انصاف پسندی ظاہر کرتا ہے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ لوگ دیانت اور انصاف سے کام کریں اگر یہ خط لہردار ہے تو اس سے سلیقہ اور شوق نمائش کا اظہار ہوتا ہے۔

(۵۶) تحریر کے اندر علامات وقف کا بیجا استعمال (اگر تحریر قسم اعلیٰ کی ہے) ظاہر کرتا ہے کہ لکھنے والا جوشیلا آدمی ہے۔ اگر تحریر قسم اوسط کی ہے تو اس سے قوت تمیز کے فقدان کا اظہار ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی نسبت یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں مسلسل خیال آرائیوں کے باعث ان کا دماغ نہ چل جائے۔

(۵۷) اگر لفظ کے اندر تمام حروف مسلسل یعنی جڑے ہوئے ہیں تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر کی طبیعت عقلیت پسند ہے اس کا استدلال مسلسل ہوتا ہے۔ لیکن مقررہ اصول سے باہر نہیں ہوتا۔ ایسی تحریر لکھنے والے لوگ کورانہ تقلید پر مائل ہو جاتے ہیں۔ اپنے لیڈر کے پیچھے بھیڑوں کی طرح چلتے ہیں۔ اگر قسم اعلیٰ کی تحریر میں یہ بات پائی جاتی ہے تو اس سے تسلسل خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر کسی تدبیر کو شروع سے آخر تک پوری طرح جزرسی کے ساتھ سوچ لیتا ہے۔

(۵۸) جدا جدا حروف جو پہلو بہ پہلو ثبت ہوں یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ صاحب تحریر میں ایک قوت خلاق موجود ہے، صاحب بصیرت ہے اور عقل و فہم رکھتا ہے۔ بقول آیب میشون یہ بات علامت عقم ہے۔ یہ خصوصیت ہم نے ایک خاتون میں دیکھی تھی۔ جنھوں نے ریاضیات میں اعلیٰ اعزاز حاصل کیا تھا اور دو بچوں کی ماں بھی تھیں۔ یہ ایسی مثال ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "استثناء سے کلیہ ثابت ہوتا ہے"۔

(۵۹) اگر تحریر کے اندر دو دو، تین تین حروف ایک جگہ جمع ہوں تو اس سے قوت تقابل، و انتخاب اور ہمہ دان ذہنیت کا اظہار ہوتا ہے۔ جو لوگ ایسی تحریر لکھتے ہیں۔ ان کا حافظہ بہت تیز ہوتا ہے اور وہ یہ سلیقہ رکھتے ہیں کہ وہ اپنے مبلغ معلومات سے بہترین کام لیں۔ ایسے لوگ بہترین مورخ ہوتے ہیں اور انھیں تدبیر و سیاسیات میں بھی کچھ کم دخل نہیں ہوتا۔

(۶۰) اگر تحریر میں کسی لفظ کا آخری حرف بڑھ کر دوسرے لفظ کے حرف اول سے ملجاتا ہے تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ صاحب تحریر کے وعدہ کا اعتبار کرنا چاہئے۔ ایسا شخص بغیر پورا کئے کسی کام سے دستبردار نہیں ہوتا۔ ڈیوٹی چھوڑنے پر مرجانے کو ترجیح دیتا ہے۔ ایسے شخص میں انتہا درجہ کا ثبات و پامردی ہوتی ہے۔ بلکہ اس جذبہ سے بعض اوقات وہ خود بھی نقصان اٹھالیتا ہے۔

(۶۱) حروف کے اندر حلقے، پیچ وخم، اور آخری حروف کا ضرورت سے زیادہ بڑا ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ صاحب تحریر معمولی واقعات میں بھی مبالغہ سے کام لیتا ہے۔ اس قسم کے لوگ چار پانچ آدمیوں کے مجمع کا حال بیان کرتے ہوئے اسے "انبوہ کثیر" اور "جم غفیر" سے تعبیر کرینگے۔

(۶۲) حروف کی زیر و بالا کشش جو بیک جنبش قلم واقع ہوئی ہو اور جس میں کسی قسم کا پیچ وخم یا حلقہ نہ ہو یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ صاحب تحریر کا ذہن بہت شائستہ ہے۔ اس میں شرم وحیا، عزت اور استقلال کا احساس موجود ہے۔ اسکا دماغ پریشان نہیں ہوتا۔



"جس شخص کی تحریر کا یہ نمونہ ہے وہ محض اپنی شخصیت کے زور سے ہر طبقہ پر اثر ڈال سکتا ہے۔"

(۶۳) موٹی موٹی اور پھیلی ہوئی کششوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر عیش طلب اور شہوت پرست ہے۔

(۶۴) اگر تحریر میں لفظ کے آخری حروف داہنی جانب پھیلے ہوئے ہوں تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر محبت کا بھوکا ہے۔ فیاض ہے اور چاہتا ہے کہ لوگ اسکے کام کی داد دیں۔ لیکن اگر آخری حروف ضرورت سے زیادہ بڑھ جائیں اور اس علامت کی تکرار بار بار ہوئی ہو تو یہ ظاہر ہوگا کہ لکھنے والا خطرناک جذبۂ رشک و حسد رکھتا ہے اور وہ ایسا شخص ہے جو انتقام لینے سے بھی نہ چوکے گا۔

(۶۵) لفظوں کے آخری حروف اگر چھوٹے چھوٹے ہوں تو اس سے کفایت شعاری کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر تحریر قسم اعلےٰ سے تعلق رکھتی ہے تو دور اندیشی کی علامت ہے۔ اور اگر قسم ادنےٰ میں داخل ہے تو بے اعتمادی سمجھنا چاہیئے۔

(۶۶) الفاظ کے آخری حروف اگر بائیں طرف کو خم کھا جائیں تو اس سے خودغرضی ظاہر ہوتی ہے۔

(۶۷) الفاظ کے آخری حروف اگر بالکل مستقیم ہوں تو اظہار ثبات و پامردی کرتے ہیں۔

(۶۸) اگر الفاظ کے آخری حروف زاویہ دار ہوں تو صاحب تحریر مستقل مزاج آدمی ہے۔

(۶۹) اگر الفاظ کے آخری حروف گولائی لئے ہوں تو نیک مزاجی، حسن اخلاق اور احساس حسن ظاہر ہوتا ہے۔

(۷۰) اگر الفاظ کے آخری حروف کانٹے جیسی صورت رکھتے ہوں تو اس سے طبیعت کا ضدی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

(۱۷) اگر لفظ کا آخری حرف اوپر کی طرف نمایاں طور سے بڑھ جائے تو اس سے توہم پرستی، تصوف پسندی اور علم روحانیات سے دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر یہ علامت تحریر کے اندر متواتر نمایاں ہو اور مبالغہ کے درجہ تک پہونچ جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ صاحب تحریر کسی خیالی یا حقیقی رنج والم میں مبتلا ہے۔ ایسی علامتیں ان لوگوں کی تحریروں میں عموماً پائی گئی ہیں، جنھوں نے بذریعۂ خودکشی جان دی۔ یہ علامت سب سے زیادہ تجربہ میں آچکی ہے۔

(۲۷) اگر تحریر میں الفاظ کے آخری حروف میں سے بعض جانب راست بڑھ جاتے ہوں اور دوسرے حروف لفظ کے قریب ہی ختم ہو جائیں تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر کو دنیا کا بہت تلخ تجربہ ہوا جس کے باعث اب اسکی طبیعت میں انسانیت اور فیاضی پیدا ہو گئی ہے۔

(۳۷) اگر تحریر میں ایک دو حروف غیر معمولی طور پر زاویہ دار واقع ہوں تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر کے دل میں بعض ایسے خیالات پیدا ہوتے ہیں جنکی وجہ سے اُس کی موافقت دوسرے لوگوں سے نہیں ہوتی۔

(۴۷) اگر ایک قد و قامت کے حروف کے درمیان کوئی حرف صورت سے زیادہ چھوٹا یا مسخ شدہ معلوم ہو تو خیال گذرتا ہے کہ صاحب تحریر سے غیر متوقع طور پر خفیف الحرکاتی سرزد ہو گی۔

(۵۷) اگر آخری لفظ یا الفاظ سطر کے آخری حصہ میں گھٹے ہوئے لکھے جائیں اور صفحہ میں جانب پستی مائل ہوں تو ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والے میں کاروباری مادہ نہیں ہے۔ اور مالی معاملات میں دوراندیشی سے کام نہیں لیتا۔ اور چونکہ اپنی آمدنی کو طریقہ کے ساتھ صرف نہیں کیا اسلئے تو اب وہ بھدے اور ناخوشگوار طور پر کفایت شعاری کرنا چاہتا ہے۔

(۶۷) جو حروف حلقہ یا پھندے سے شروع ہوتے ہیں وہ لکھنے والے کی انانیت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ صاحب تحریر کچھ فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والا تحائف قبول کرنیکا بہت شوق رکھتا ہے اور اپنے دنیوی مقبوضات سے اسے بہت محبت ہے۔

(۷۷) ڈورے کی طرح حروف سے مکاری اور سازش ظاہر ہوتی ہے۔ ایسا شخص اپنا کام چلانے کے لئے سازش کرنا بہت پسند کرتا ہے۔ الغرض یہ شخص دھوکے باز اور مکار ہوتا ہے۔

(۸۷) جو حروف عام طور سے بند کر دئے جائیں وہ قوت تمیز، صحت پسندی اور خودداری ظاہر کرتے ہیں۔

(۹۷) اگر حروف اوپر سے کھلے ہوئے ہوں تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر بہت صاف گو اور نڈر ہے۔ رازداری کا مادہ رکھتا ہے اور اس کا دل بھی صاف ہے۔ اگر تحریر اوسط درجہ کی ہے یا ادنےٰ درجہ کی تو سمجھنا چاہیئے کہ لکھنے والا باتونی ہے۔ ایسے لوگ اپنا اور اپنے دوستوں کا راز بلا پس و پیش کھولدیتے ہیں۔ لیکن نیت انکی نیک ہوتی ہے۔

(۸۰) جو حروف نیچے سے کھلے ہوئے ہوں وہ دروغبافی اور نفاق کو ظاہر کرتے ہیں۔

(۸۱) جن حروف کے آخری حصے موٹے ہوں (اگر تحریر قسم اعلےٰ کی ہے) ان سے ثبات و استقلال کا اظہار ہوتا ہے لیکن

اگر تحریر ادنیٰ ہو تو سفاکی اور شقاوت قلبی ظاہر کرتے ہیں۔
(۴۲) تنوع حروف (یعنی جن میں کوئی عمودی ہو کوئی جھکا ہوا وغیرہ) وہ قوت عصبی، حساسی اور اثر پذیری ظاہر کرتے ہیں۔



"نمونہ مندرجہ بالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر ہمدرد، فیاض، ذکی، ہے، بہت بڑی ذہنی قوت رکھتا ہے اور محبت شعار ہے۔ بے غرض اور حساس ہے۔"

علامات خصوصی A

چھوٹا اے (a) اوپر سے کھلا ہوا ہو تو صاف دلی اور لسانی ظاہر کرتا ہے اگر بند ہو تو قوت امتیازی کا مظہر ہے۔
اگر نیچے سے کھلا ہوا ہو تو ظاہر کرتا ہے کہ لکھنے والا قابل اعتبار اور راستگو آدمی نہیں ہے۔
اگر گاہے کھلا اور گاہے بند ہو تو ظاہر کرتا ہے کہ لکھنے والا بظاہر صاف گو اور باتیں بنانیوالا ہے۔ لیکن اس میں یہ مادہ بھی ہے کہ اگر وہ مناسب نہ سمجھے تو کسی وقت اپنی رائے کو محفوظ بھی رکھ سکتا ہے۔
اگر نیچے سے کھلا ہوا ہو تو ظاہر کرتا ہے کہ لکھنے والا قابل اعتبار اور راستگو آدمی نہیں ہے۔
اگر یونانی حرف الفا (Alpha) کی صورت کا ہو تو ظاہر کرتا ہے کہ صاحب تحریر مہذب اور صحبت یافتہ آدمی ہے لیکن اپنے علم وفضل کو ظاہر کرنے کا بھی شوق رکھتا ہے۔
اگر تاگے کی طرح باریک ہو تو یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ لکھنے والے کو سازشیں کرنے کا بہت شوق ہے۔

B

چھوٹی (b) میں اگر نیچے کا حلقہ پھیلا ہوا ہو تو روشن خیالات کا اظہار کرتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ شخص مذکور کی طبیعت مائل بہ مبالغہ رہتی ہے۔
اگر یہ حلقہ طویل بنایا جائے تو استقامت، سادگی، اور بلا تصنع متانت وسنجیدگی کا اظہار کرتا ہے۔

C

اگر بڑا (C) اس طرح لکھا جائے کہ اس کا حصۂ زیریں پورے لفظ کے نیچے بطور خطِ مستقیم پہونچ جائے تو اس سے جذبۂ تحفظ کا اظہار ہوتا ہے جس میں کسی قدر غرور و نخوت اور خود پسندی بھی شامل ہے۔

چھوٹا (c) جس کا بالائی حصہ گھونگھے کی طرح خمیدہ ہو یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ لکھنے والے میں مالی انتظام کا بہت سلیقہ ہے اور اسے انتظام امور سے فطری قابلیت حاصل ہے۔

اگر بے پروائی سے بنایا جائے جس کے اوپر والے سرے میں ذرا سا خم ہو یا بالکل نہ ہو تو وہ اپنے کاروبار کی طرف زیادہ متوجہ ہوگا۔

D

چھوٹا (d) جس کی بالائی کشش سیدھی ہو سادگی کا اظہار کرتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ لکھنے والے میں مادہ اختراع نہیں ہے۔ وقت پر دوسروں سے دب جاتا ہے۔ اور "مرنجان و مرنج" قسم کی طبیعت کا آدمی ہے۔

اگر عقب کی طرف خم کھا کر وہیں ختم ہو جاتا ہے تو انانیت اور مسدود شدہ ترقی کا مظہر ہے۔

چھوٹا (d) پھیلتا ہوا اگلے حرف سے مل جائے تو تجسس خیالات اور استقرائی نتائج پر دلالت کرتا ہے۔

اگر اس میں دوہرا پن پیدا ہو تو افراط پسندی، روشن تخیل اور فقدان ضبط نفس کا اظہار کرتا ہے۔

اگر بالائی کشش پیچ و خم کھا کر بصورت حلقہ بن جائے تو غرور و نخوت اور تصنع کی علامت ہے۔

اگر چھوٹا (d) لفظ کے آخر میں ہو اور اس کی بالائی کشش اوپر کے سرے پر جا کر خمیدہ ہو جائے اور اس کا میلان آگے کی جانب ہو تو یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ لکھنے والے میں نتائج و عواقب کی طرف سے بے پروائی ہے۔

E

چھوٹا یونانی وضع کا (e)، روشن دماغی، علمی قابلیت اور ذوق ادب کا اظہار کرتا ہے۔

اگر وہ دو خمیدہ خطوط کی لپیٹ سے فلکہ کی طرح بنایا جائے اور وہ دونوں خطوط منحنی اوپر جا کر اس طرح ملیں کہ پھندا سا بن جائے تو اس امر کی دلیل ہے کہ لکھنے والے کی طبیعت میں فطری فیاضی تو نہیں تھی مگر لوگوں کی دیکھا دیکھی دریا دلی پیدا ہو گئی ہے۔ اس قسم کا حرف اکثر ان اہل ثروت لوگوں کی تحریروں میں پایا جاتا ہے جو مخیر بن جاتے ہیں۔

G

چھوٹا (g) جو آٹھ کے لمبوترے عدد (8) کی طرح بنایا جائے یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ لکھنے والا اگرچہ خود دنیادار آدمی نہیں ہے لیکن اس میں امور دنیوی کے اہتمام و انصرام کا زبردست سلیقہ حاصل ہے۔

I

بڑا (I) اگر ٹائپ کی وضع کا لکھا جائے تو ذوق فنون لطیفہ پر دلالت کرتا ہے۔

چھوٹا (i) جس پر بہت بلند نقطہ لگایا گیا ہو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر علوم باطنی کا شوق رکھتا ہے اور امکنۂ مقدسہ کی بھی بہت عزت و حرمت کرتا ہے۔

اگر نقطہ زیادہ آگے بڑھا ہوا ہو تو مادۂ اختراع، جودت طبع، زندہ دلی اور مستعدیٔ عمل ظاہر کرتا ہے۔

اگر نقطہ حرف سے پیچھے رہ گیا ہو تو عدم استقلال اور فقدان جوش ظاہر کرتا ہے۔

اگر نقطے کہیں ہلکے اور کہیں گہرے ہوں تو ان سے چستی و چالاکی مگر کسی قدر بے پروائی ظاہر ہوتی ہے۔

اگر نقطہ بہت کمزور ہو تو صاحب تحریر کی کمزوری اور بزدلی پر دلالت کرتا ہے

اگر نقطہ بھاری ہو تو لکھنے والے میں عزم و استقلال اور شوق نشاط کا اظہار کرتا ہے۔

اگر تحریر میں اس حرف کے نقطے صفحہ بھر میں ادھر ادھر پریشان ہوں تو وہ یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ لکھنے والے کو کسی عارضہ کے باعث سانس لینے میں کسی قدر دقت محسوس ہوتی ہے۔

دستخط کے بعد اگر نقطہ لگا دیا جائے تو اس سے صاحب تحریر کا حزم و احتیاط ظاہر ہوتا ہے۔

L

بڑا حرف (L) اگر اس طرح لکھا جائے کہ اسکی کرسی کے مقام پر ایک پھیلا ہوا سا بڑا پھندا بنا ہے۔ (جیسے L) تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر اپنے مقام و مرتبہ کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

M

اگر بڑے (M) میں پہلی کشش دوسری سے بلند ہو تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر خود کو بہت کچھ سمجھتا ہے۔ اگر وہ کسی بات میں اپنی کسر شان دیکھتا ہے تو اسے سخت ناگوار گذرتا ہے۔

اگر بڑے (M) میں دوسری کشش پہلی سے بلند ہو تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر اپنی موجودہ حالت زندگی سے غیر مطمئن ہے۔ اور جن لوگوں میں وہ معاشرتی زینہ پر خود سے بلند مقام سمجھتا ہے ان سے حسد کرنے لگتا ہے۔

اگر بڑے (M) میں دونوں کششیں بلندی میں برابر ہوں تو اس سے قناعت اور منطقی ذہنیت کا اظہار ہوتا ہے۔

اگر بڑا (M) خط کرسی سے شروع کرنے کے بجائے ایک بڑے (m) کی صورت میں لکھا جائے تو اس سے فقدان ذکاوت وجودت کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر اس وضع سے لکھے ہو (m) درمیانی کشش اور پہلی اور آخری سے بلند ہے تو ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والا حصول عزت وجاہ کا آرزومند ہے۔ اور وہ دنیائے فانی کی نمائشی مسرتوں کا بہت دلدادہ ہے۔

اگر حرف (M) کی دونوں کششوں میں بہت زیادہ فصل ہو تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر اس قسم کے بیہودہ اور گستاخ لوگوں میں ہے جو انگلی پکڑ کر پہونچا پکڑنا چاہتے ہیں۔

اگر بڑا (M) پھندیدار باریک خط سے شروع ہو تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر خود غرض آدمی ہے۔ اور اسے مال ومتاع دنیوی کے حصول کا بہت شوق ہے۔ اس قسم کے لوگوں کو تحفہ تحائف اور نذر وپیشکش قبول کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ اگر تحریر عمدہ اور دیدہ زیب ہو لیکن اس میں بھی یہی عیب پایا جاتا ہو تو صاحب تحریر کو لازم ہے کہ وہ فکر وتامل اور سوچ بچار میں کم منہمک رہا کرے اسے چاہیئے کہ اپنی فکر زیادہ نہ کرے۔ بلکہ دوسروں کا خیال رکھا کرے اور حصول کے مقابلہ میں بخشش کا زیادہ خیال رکھے۔

اگر حرف (M) کی دونوں کششیں بہت متصل اور اینٹھی ہوئی ہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب تحریر بخیل، اور بزدل اور ضیق میں مبتلا ہے۔

N

چھوٹا (n) اگر تحریر میں بشکل (u) لکھنے میں آئے تو اس سے مہر ومروت اور نیک طبعی کا اظہار ہوتا ہے۔

P

اگر حرف (P) بڑا، نمایاں اور ایسا لکھا جائے کہ اوپر کا حصہ بہت زیادہ نمایاں ہو تو اس کبر ونخوت کا اظہار ہوتا ہے۔

اگر چھوٹا (p) اس طرح لکھا جائے کہ ابتدا سے انتہا تک کاغذ پر سے قلم نہ اٹھے تو یہ علامت فوقیت وعلوئے مرتبہ کی ہے۔

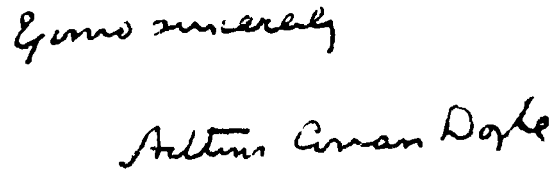
Q

اگر بڑا حرف (Q) اسطرح لکھا جائے جیسے ایک بڑا خوبصورت عدد (2) تو اس سے ذہنی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے۔

R

اگر چھوٹا (r) بشکل (r) لکھا جائے تو یہ علامت ہے اس بات کی کہ صاحب تحریر کاہل تن آسان اور بے پروا شخص ہے۔ مگر تکلفات ظاہری اور عیش پرستی پر مرتا ہے۔

اگر چھوٹا (r) خوش وضع لکھا جائے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حرف کی تسوید میں دوبارہ قلم لگایا گیا ہے۔ تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر کو ترقی کرنے کی خواہش ہے اور اس کا خیال عموماً افکار اولین کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔



''اس نمونہ میں حرف (t) کے خط تقاطع سے کاروباری حوصلہ اور شوق سیر و سیاحت ظاہر ہوتا ہے۔ اور حرف (i) کا جو نقطہ کسی قدر بلندی سے دیا گیا ہے تو اس سے علو تخیل کا اظہار ہوتا ہے۔

T

فن فراست التحریر میں یہ امر بہت اہم ہے کہ لکھنے والا حرف (t) کو کس طرح کاٹتا ہے۔ کیونکہ اسی واقعہ سے صاحب تحریر کی قوت ارادی کا اظہار ہوتا ہے۔

چھوٹا حرف (t) اگر اس طرح کاٹا جائے کہ خط قاطع اصلی حرف سے اوپر ہو تو اس سے خودسری اور کسی کی ماتحتی سے بیقراری کا اظہار ہوتا ہے اور صاحب تحریر حصول اقتدار کا شائق معلوم ہوتا ہے۔

اگر خط قاطع بہت نیچا ہے تو اس سے لکھنے والے کی حلیم الطبعی بلکہ ''کمزوری'' کا اظہار ہوتا ہے۔

اگر اس طرح کاٹا جائے کہ خط قاطع اصلی حرف کے آگے ہو تو اس سے شوق سیاحت کاروباری حوصلہ مندی اور جودت طبع کا اظہار ہوتا ہے۔ اس قسم کے آدمی کی طبیعت میں پیش روی کا شوق ہوتا ہے۔ ضرورت کے وقت ایسا آدمی بہت کام آتا ہے۔ کیونکہ وہ عین وقت پر کچھ نہ کچھ فکر و تدبیر کرکے کام نکال لیتا ہے۔

اگر حرف (t) میں خط قاطع اصلی حرف سے پیچھے ہو تو اس سے اظہار پس و پیش کمزوری طبع اور قوت

فیصلہ کے فقدان کا اظہار ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو زندگی بھر ناقابل عبور مشکلات کا سامنا رہتا ہے۔ اور جو کام وہ کرتا ہے اس پر اعتراضات ضرور ہوتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ ہمیشہ کام خراب کرتے ہیں۔ اس لئے انھیں کبھی کوئی اہم عہدہ نہ دینا چاہیئے۔

اگر حرف (ٹ) کا خط تقاطع لمبا ہے تو اس سے فصاحت و بلاغت کسی قدر تہور، اور جودت طبع کا اظہار ہوتا ہے۔ تیز لکھنے والے لوگ عادتاً اس قسم کا تقاطع کرتے جاتے ہیں۔

چھوٹا خط تقاطع مسدود قوت عمل کا مظہر ہے۔ صاحب تحریر اپنی طاقت اور اپنا وقت بغیر سوچے سمجھے ضائع نہیں کرتا ہے۔

ایک قوی اور طاقتور خط تقاطع، قوت عمل اور عزم و استقلال کا اظہار کرتا ہے۔

کمزور خط تقاطع بے پروا طبیعت ظاہر کرتا ہے۔

اوسط درجہ کا خط تقاطع جبکا حصہ آخری نوکدار ہو۔ قابلیت تنقید پر دلالت کرتا ہے۔ ایسا شخص لوگوں کے کردار و اطوار کا اندازہ خوب کرتا ہے۔ اور جس طرح وہ دوسروں کے عیوب دیکھتا ہے۔ اسی طرح وہ احتساب نفس کرکے اپنے عیوب بھی دیکھ لیتا ہے۔

اگر خط تقاطع ابتدا میں موٹا اور آخر میں نوکدار ہے تو اس سے بغض و حسد ظاہر ہوتا ہے۔

ہلکا اور غیر واضح خط تقاطع جو کسی قدر پست ہو علامت ابتذال و دنائت ہے۔ ایسا شخص اپنی قابلیت کے زور پر کبھی دنیا میں ترقی نہیں کرسکتا اور نہ وہ شخص کبھی تنہا بغیر کسی کی مدد کے مسلسل کام کرسکتا ہے۔ اسے نہ اپنے قوائے عمل پر اعتماد ہے نہ اپنی قابلیت پر بھروسہ۔ اسلئے وہ کسی اور کی ذہن و دولت و شہرت سے وابستہ ہو جاتا ہے۔

اگر خط تقاطع کے آخری سرے پر مچھلی پکڑنے کے کانٹے کی صورت بنجائے تو اس سے کام میں استقلال دپامردی ظاہر ہوتی ہے۔

اگر خط تقاطع کے ابتدائی سرے میں مندرجہ بالا صورت ہو تو اس سے پختگی خیال کا اظہار ہوتا ہے۔ ایسا آدمی ذہن کا پکا ہوتا ہے۔

اگر خط تقاطع آخر میں آکر زیادہ جلی ہو جائے تو اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ صاحب تحریر مشکلات پر عبور کرنیکا عزم صمیم رکھتا ہے۔ اور اگر اسکے عزائم کی مخالفت ہوتی ہے تو ارادوں میں اور زیادہ تقویت پیدا ہو جاتی ہے۔

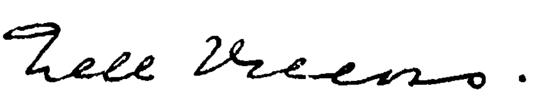
مساوی طول کے خطوط تقاطع ایک پر سکون منطقی طبیعت کی علامت ہیں۔ جو لوگ اپنے حروف (ٹ) اس طرح کاٹتے ہیں وہ بہت سمجھدار کہلاتے ہیں۔ انکی قوت فیصلہ متوازن ہوتی ہے اور وہ اظہار خیال میں کبھی عجلت نہیں کرتے۔

ایک ہی شخص کے خط میں مختلف قسم کے خطوط تقاطع یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ لکھنے والے کی طبیعت میں اعتدال نہیں ہے اور اس میں تنوع اور اثر پذیری کا مادہ ہے۔ اس قسم کے لوگ اپنے مزاج کے تابع ہیں اور مقامی فضا و ماحول سے اثر پذیر ہو جاتے ہیں۔ ان میں فخریہ جذبات بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان کا فیصلہ حیرت انگیز طور پر صحیح ہوتا ہے اور بعض اوقات انتہا درجہ کا غلط۔ اگر تحریر قسم اعلیٰ کی ہے تو اس سے اظہار تنوع ہوتا ہے۔ اگر تحریر ادنےٰ درجہ کی ہے تو عدم استقلال اور تلون ظاہر کرتی ہے۔

اگر خط تقاطع کا رخ جانب بلندی ہے تو اس سے تردید کرنے کا شوق ظاہر ہوتا ہے۔

اگر خط تقاطع غائب ہو اور حرف کو زاویہ دار اور کشش کے ساتھ کرسی پر ختم کر دیا جائے تو اس سے کمزوردلی اور فقدان جودت ظاہر ہوتی ہے۔ ایسے شخص کی صحبت ہمیشہ بے مزہ بلکہ ناگوار ہوتی ہے۔ اگر آپ سیاحت کا ارادہ رکھتے ہوں تو ایسے شخص کو کبھی ساتھ نہ لیجئے۔

اگر خط تقاطع مائل بہ پستی ہو تو اس سے عیب بینی اور ظاہر ہوتی ہے۔



”یہ دستخط مشہور کتاب (Coming through the Rye) کی مصنفہ کے ہیں۔ جن کا فرضی نام ہیلن ماتھرس ہے۔“

اگر اس حرف کی آخری کشش مائل بہ دست راست ہو تو اس سے ایثار نفس اور لوگوں کی مصیبتوں میں کام آنے کا شوق ظاہر ہوتا ہے۔

اگر اس حرف کی آخری کشش مائل بہ جانب چپ ہے تو اظہار خود غرضی ہوتا ہے۔ ایسے شخص میں لوچ نہیں ہوتا۔ اگر ایسے شخص کی راہ میں روڑا اٹک جائے تو اسے سخت غصہ آتا ہے۔

دستخط صاحب تحریر کے دستخط سے بھی اس کے کردار و اطوار کی شناخت ہو سکتی ہے۔ مثلاً اگر بقیہ تحریر سے دستخط بڑے ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صاحب تحریر خود کو بہت بڑی چیز سمجھتا ہے اور دوسروں کو ہیچ جانتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے گویا تمام دنیا و ما فیہا صرف اسی کی ذات کے لئے عالم تکوین میں آئی ہے۔

(۲) اگر دستخط بقیہ تحریر سے چھوٹے ہیں تو اعلےٰ قسم کی تحریر میں یہ اس امر کی علامت ہے کہ صاحب

تحریر دنیوی عزت و شہرت کو وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔

اگر ایسی تحریر ادنے قسم کی ہے تو اس سے فقدان خود اعتمادی ظاہر ہوتا ہے۔

(۳) اگر دستخط میں اصلی نام کے نیچے خط کھینچا گیا ہے تو اس سے خود پرستی و خودستائی اور انانیت ظاہر ہوتی ہے۔

(۴) اگر اپنے عرفی یا خاندانی نام کے نیچے خط ہے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر کو اپنے حسب نسب پر فخر ہے۔

(۵) اگر پورے دستخط کے نیچے خط کشیدہ ہے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر لوگوں پر اپنی اہمیت ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اس کی خواہش یہ ہے کہ وہ دنیا میں کچھ ہو کر رہے اور کوئی کارنامہ انجام دے۔

(۶) اگر دستخط کے نیچے لہردار خط ہے تو اس سے لکھنے والے کی خوش طبعی اور شوق نمائش کا اظہار ہوتا ہے۔

(۷) دستخط کے آگے نقطہ (اسٹاپ) لگادینا دور اندیشی پر دال ہے۔

(۸) دستخط کے بعد نقطہ اور خط اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ صاحب تحریر ہمیشہ پہلوئے دفاع اختیار کرتا ہے۔ اسے کسی شخص کا اعتبار نہیں ہے۔

(۹) اگر دستخط کے آخری حرف کا لاحقہ کھینچکر طویل ہو جائے اور مائل بہ وست راست ہو تو یہ صاحب تحریر کی جارحانہ کیفیت کی علامت ہے۔

(۱۰) اگر دستخط کا آخری حرف ایک عقبی کشش میں ختم ہوتا ہے تو اس سے صاحب تحریر کی خودغرضی اور بے اعتمادی کا اظہار ہوتا ہے۔ ایسا شخص ہمیشہ فتنہ و فساد برپا کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔

(۱۱) اگر دستخط کا آخری حرف دستخط کے اوپر آجائے تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ صاحب تحریر اپنی تمام قوت تخیل اسی فکر میں صرف کرتا ہے کہ ہر موقعہ سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ اس کی خودغرضی کا رنگ بالکل باقاعدہ اور منظم ہوتا ہے۔

(۱۲) اگر دستخط کا آخری حرف نیچے کی طرف پیچ کی شکل میں ختم ہو تو اس سے صاحب تحریر کی ذکاوت اور ہوشیاری ظاہر ہوتی ہے۔ ایسا شخص معاملات کا انتظام خوب کرتا ہے۔

(۱۳) اگر دستخط کا آخری حرف اس طرح ختم ہو کہ اس کا آخری سرا ایک طویل عقبی خط مائل دست چپ بنجائے اور پھر وہیں سے وہ خط جانب راست گھوم جائے تو اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ صاحب تحریر ایسا شخص نہیں ہے جس سے مذاق کیا جائے۔

(۱۴) اگر دستخط میں کوئی روانی نہ ہو یا خط زیریں یا آگے کی طرف کشش نہ ہو تو اگر وہ دستخط قسم اعلےٰ میں داخل ہیں تو اس سے سادگی اور غرور ظاہر ہوتا ہے اگر تحریر قسم ادنےٰ کی ہو تو اہمال و لغویت پر دلالت کرتی ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ تحریر اور دستخط میں اس قدر فرق ہوتا ہے کہ یہ تمیز نہیں کی جاسکتی کہ دونوں چیزیں شخص واحد کی ہیں۔ ایسی صورت میں صرف دستخط کا مطالعہ کرنا زیادہ مفید ہوگا کیونکہ صاحب تحریر کی شخصیت زیادہ تر دستخط ہی میں نظر آتی ہے۔ ایک وکیل کی مثال لیجئے جس کی تحریر عمودی ہے، زاویہ دار ہے۔ یا مسلسل اور یکساں ہے۔ لیکن برعکس اس کے دستخط کی وضع یہ ہے کہ وہ داہنی طرف کو مائل ہوجاتے ہیں۔ جس سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ صاحب تحریر کی قوت شعوری بہت بڑھی ہوئی ہے۔ محبت شعار ہے نیز آنکہ اس کا دل اسکے دماغ کے ماتحت ہے۔ اس کی توجیہ بہت آسان ہے۔ تحریر سے تو وکیل صاحب کی وہ شخصیت ظاہر ہوتی ہے جو انھوں نے ایکٹروں کی طرح دنیا کے اسٹیج پر اختیار کر رکھی ہے۔ لیکن دستخط انکی اس شخصیت کے مظہر ہیں، جس سے ان کی بیوی، اہل خاندان یا دوست واقف ہیں۔

خصوصیات مستخرجہ

علامت خصوصی وعمومی اور ان کے نسبتی تعلقات درج کرنیکے بعد اب ہم مقصد اصلی یعنی۔ اطوار خوانی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ لیکن اس کام کے لئے تجربہ اور کسی قدر مناسبت فطری کی ضرورت ہے۔ نیز آنکہ یہ کام اسقدر زیادہ آسان نہیں ہے جس قدر کہ بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے۔

ہم یہ فرض کئے لیتے ہیں کہ طالب علم فراست التحریر نے اُن نظریات پر عبور حاصل کرلیا ہے جو ہم اس سے قبل درج کرچکے ہیں۔ اسکے بعد کوئی تحریر لیجئے اور اسکے محاسن ومعائب پر نظر ڈالئے۔ پھر موٹی موٹی باتوں پر غور کیجئے۔ مثلاً نیک طبعی، خواہش ترقی، کاروباری حوصلہ کا فقدان، خود غرضی وغیرہ۔

واضح ہو کہ علامات عمومی وخصوصی کی فہرست فراست التحریر کے لئے اسی قدر ضروری ہے جیسے زباندانی کے لئے لغت کی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی واضح ہو کہ ممکن ہے کسی شخص کے قبضہ میں بہترین لغت موجود ہو اور وہ پھر بھی زباندان نہ ہوسکے۔

یہ بھی یاد رہے کہ اطوار خوانی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کسی شخص کے محاسن ومعائب کی فہرست تیار کرلی جائے۔ کیونکہ فطرت انسانی ہرگز خود کو اس غرض سے پیش نہیں کرتی کہ اس کا اس طرح سیاہ وسفید میں تجزیہ کیا جائے۔ عالم انسانی کی موجودہ ابتدائی منزل ارتقاء میں معمولی انسان کا کام نہیں ہے کہ وہ جامع ومانع طور پر ہمیشہ کے لئے اس قسم کا کوئی حکم لگاسکے کہ بھیڑ کون ہے اور بکری کون۔

کسی شخص کی صحیح کردار خوانی کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اطوار کے متعلق مدلل طور پر نتائج اخذ کئے جائیں یعنی مختصر پیمانہ پر کسی خاص فرد کی شخصیت تعمیر کیجائے۔

ہر علامت کے لئے اس کا مناسب مقام قائم کیا گیا ہے۔ اور حسب قانون استقراء خصوصیات مستخرجہ

مرتب کی جاتی ہیں۔ اور معتدل طور پر نہایت وضاحت وصفائی کے ساتھ پیش کر دیجاتی ہیں۔
اگر ان قواعد و ضوابط کا خیال نہ رکھا گیا تو کردار خوانی کی حالت بھی ویسی ہی پریشان اور عجیب و غریب ہو گی جیسے اس تصویر کی جس میں مصور نے کانوں کی جگہ آنکھیں اور ٹھوڑی کے مقام پر ناک بنا دی ہو۔ ایسی تصویر میں اگرچہ ہر چیز کی ہیئت صحیح ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی تصویر قطعی غلط ہے۔ ہمارے خیال میں اس فن کے طالب کے لئے یہ مثال بہت کافی ہو گی۔ اور وہ بخوبی سمجھ جائے گا کہ کردار خوانی کے لئے صحیح سلسلۂ نظر قائم کرنا کس قدر اہم بات ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ بات بھی واضح رہے کہ علامات جامع و مانع حکم نہیں رکھتے بلکہ اکثریت کا حکم رکھتے ہیں مثلاً ایک صاف اور واضح تحریر ایک طرف تو اس امر کا ثبوت ہے کہ لکھنے والا طبقہ اعلیٰ سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسی تحریر کسی معمولی محرر یا ایسے ہی کسی اور بے حقیقت آدمی کی ہو۔ اس بات کا حکم لگانا کہ تحریر قسم اعلیٰ کی ہے یا اوسط کی یا ادنیٰ کی۔ حروف کی شکل پر منحصر ہے۔ اسی طرح الفاظ کے مابین وسیع فصل کے یہ معنی ہیں کہ لکھنے والا فیاض طبیعت کا آدمی ہے۔ بشرطیکہ اس کے ساتھ دیگر علامات بھی موافقت کریں۔ اگر دیگر مناسب علامتیں موجود نہیں ہیں یا دیگر علامات خلاف قسم کی ہیں تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر اس قسم کا آدمی ہے جس کا ذہن سستی کے ساتھ کام کرتا ہے مگر وہ محنت سے کام لیتا ہے۔
الغرض دو یا زیادہ علامتوں کا ملا کر مطالعہ کرنے سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ یہی علم فراست التحریر کا نہایت دلچسپ ہے۔ لیکن طالب کو لازم ہے کہ اس میدان میں بہت احتیاط کے ساتھ قدم اٹھائے۔ عطائی ادیبوں کو بعض مشکلات پیش آتی ہیں۔ جن کی وضاحت ہم دو چار مثالوں سے کرتے ہیں۔ سانپ کی طرح لہریا لکھنے والی تحریر کی نسبت یہ حکم لگایا جاتا ہے کہ لکھنے والا بہت بڑا مدبر اور ڈپلومیٹ ہے۔ اگر تحریر قسم اعلیٰ کی ہے تو واقعی یہ حکم صحیح ہے۔ اگر تحریر اوسط درجہ کی ہے تو یہ حکم لگایا جائے گا کہ صاحب تحریر کی ذہنیت میں لوچ ہے۔ جس کا اظہار بسا اوقات اس صورت میں ہوتا ہے کہ وہ بہانے بہت بناتا ہے اور اس طرح خود کو ایک ناگوار صورت حال سے نکال لیجاتا ہے۔ اگر تحریر ادنیٰ قسم کی ہے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والے کو جھوٹ بولنے کی عادت ہے۔
ایسی ہی ایک دوسری مثال ان حروف سے پیدا ہوتی ہے جو اختتام کے لفظ کے قریب پہونچکر قد و قامت میں بڑھ جاتے ہیں۔ اس علامت سے لکھنے والے کی سریع الاعتقادی اور فطری سادگی کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ یہی بات بعض ایسے ممتاز سائنسدانوں میں پائی جاتی ہے۔ جو اپنے نتائج کی صحت اور استقرار صحیح کے لئے مشہور ہیں اس لئے ایسی علامت پر کوئی جامع و مانع حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ جہاں کسی کے طرز تحریر سے علویت اور تربیت ذہنی کا اظہار ہوتا ہو تو لفظ کے آخری حروف کا ابتدائی حروف سے بڑا ہونا اس امر پر دلالت کرسکتا ہے کہ صاحب تحریر صاف گو اور کشادہ دل آدمی ہے۔ تیسری مثال "حروف خنجری" سے پیدا ہوتی۔ یعنی وہ حروف جن کے آخری حصے خنجر

کی نوک کے مانند ختم ہوں۔ ایسے حروف نفاست طبع پر دلالت کرتے ہیں۔ لیکن اگر تحریر متوسط درجہ کی ہے تو اسی علامت کے معنی یہ ہیں کہ لکھنے والا باتیں چھپاتا ہے اور اسے پر اسرار طور پر کام کرنے کا شوق ہے۔ اس قسم کے لوگ نوکروں یا بچوں کے سامنے غیر زبانوں میں باتیں کیا کرتے ہیں تاکہ بات راز میں رہے۔ لیکن اگر یہی تحریر ادنیٰ درجہ کی ہے تو "نوکیلے حروف" سے دغا و فریب ظاہر ہوتا ہے۔ اس قسم کا آدمی اکثر دھوکے باز ہوتا ہے۔

جس شخص میں علم فراست التحریر سمجھنے کی اہلیت ہے اور وہ شوق بھی رکھتا ہے اسکی رہنمائی کیلئے ہم چند مثالیں پیش کرینگے جن میں بعض علامات کو ملا کر نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔ یہی علم فراست التحریر کا وہ اہم حصہ ہے جسے بہت زیادہ ترقی دی جاسکتی ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم مثالیں پیش کریں یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذہنی واخلاقی حیثیت سے صاحب تحریر کا پورا مطالعہ کر لیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ہم بلند اور ادنیٰ قسم کی تحریر کو تین اقسام میں تقسیم کرتے ہیں۔

بلند تحریر

قسم اوّل اس قسم میں اولوالعزم لوگ شامل ہیں جو ملہم بالغیب ہوتے ہیں یا جنھیں فطرت نے مادہ ایجاد و ولعیت فرمایا ہے۔ جس طرح برقی طاقت کی تحصیل کرنے سے ہم قاصر ہیں۔ اسی طرح ہم ان برگزیدہ لوگوں کی قوت کو بھی تحلیل نہیں کرسکتے۔ جس طرح برقی قوت کے مظاہر مرئی کے سوائے ہم اور کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیا چیز ہے۔ اسی طرح ان بزرگ لوگوں کی پُر اسرار ذہنی و روحانی قوتیں بھی ہمارے خیال کی رسائی سے باہر ہیں۔

قسم دوم اس قسم میں وہ لوگ داخل ہیں جن میں کسی بات کے سمجھنے اور اس سے فائدہ اُٹھانے کا مادہ ہے۔ ایسے لوگ دوسروں کی ایجاد و اختراع کو ترقی دیکر چار چاند لگا دیتے ہیں۔ ان لوگوں کے کام قابل تعریف اور فن مکانکی کا مکمل نمونہ ہوتے ہیں۔ ان کا کام اہل نظر سے اپیل کرتا ہے۔ مگر یہ اپیل دل سے نہیں بلکہ دماغ سے ہوتی ہے۔ ایسا شخص ہزار کوشش کرے مگر وہ ہوشیار نہیں ہوتا۔

قسم سوم اس قسم میں اہل فہم و ذکا شامل ہیں۔ یہ لوگ ہوشیار ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کے کاموں کو پسند کرتے ہیں اور مکالمہ کرکے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ایسے لوگ موضوع کو بآسانی سمجھ جاتے ہیں۔ وہ تحصیل علم تو بآسانی کر لیتے ہیں لیکن ان میں ترقی دینے کا مادہ نہیں ہوتا۔ مثلاً اس زمانہ کا ہوشیار مکانیک بمقابلہ جیمس واٹ (موجد اسٹیم انجن) یا آئزک نیوٹن سے زیادہ حقائق علیہ جانتا ہے۔ لیکن اس علم کے باعث سے ان دونوں بزرگوں پر ترجیح دینا تو درکنار ان کی برابری کا بھی درجہ نہیں دے سکتے۔



"یہ نمونہ ایسی قوت تخیل ظاہر کرتا ہے جو شعر وسخن یا اسی قسم کی خیال آرائیوں میں زیادہ کمال دکھاتی ہے۔ اگر صاحب دستخط ایک شاعر ہونیکے بجائے کوئی مصور ہوتا تو اس کے کام غیر معمولی اور عجیب ہوتے۔

ادنیٰ التحریر

قسم اول اس میں وہ لوگ داخل ہیں جو عموماً لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔ رسم ورواج کی پابندی کے علاوہ کوئی قوت اجتہاد نہیں رکھتے۔ ان میں عقل وفہم اور ہنرمندی کمی ہوتی ہے۔ قدرت نے ان کے لئے معمولی زندگی مقدر کی ہے۔ ایسے لوگوں کو کسی بڑے عہدہ پر ممتاز کر دیا جاتا ہے تو وہ اپنے فرائض انجام تو دے لیتے ہیں۔ مگر کوئی خصوصیت پیدا نہیں کرتے۔ ان کے محاسن ومعائب بھی اوسط درجہ کے ہوتے ہیں۔ الغرض شروع سے آخر تک ان کی شخصیت اوسط درجہ کی ہے۔ عموماً یہ لوگ اچھے خاصے قابل عزت وتکریم ہوتے ہیں۔ وہ انتہائی بلندی وپستی سے ناواقف ہیں۔ ایسے لوگ معاشرت کے ہر مقام پر پائے جاتے ہیں۔ وہ بعض مقررہ خیالات کے مالک ہوتے ہیں جن میں عمر بھر تغیر واقع نہیں ہوتا۔

قسم دوم۔ اس قسم میں لوگوں کو داخل سمجھنا چاہئے۔ جن کی شخصیت لاشئے محض ہے۔ یعنی ان میں کوئی بھی خصوصیت نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کی طبیعت بحد بے رنگ ہوتی ہے۔

قسم سوم۔ اس قسم میں وہ لوگ داخل ہیں جو بہ لحاظ عقل وفہم ادنیٰ درجہ کے ہوتے ہیں۔

اس موقعہ پر اعلیٰ وادنیٰ اقسام تحریر کے درمیان تمیز کرنے کے لئے بعض علامات خصوصی کا درج کرنا بھی غالباً بے محل نہ ہوگا۔

اعلے التحریر کے علامات عمومی

(۱) اگر تحریر فطری اور اضطراری طور پر لکھی گئی ہے تو وہ سادہ ہے۔
(۲) حرفوں کا میلان کسقدر جانب راست ہے، اور حروف کے لاحقہ اور قلم کی جنبش بھی بحد اعتدال ہو تو تحریر معتدل کہلاتی ہے۔
(۳) حروف صاف اور واضح ہوں اور کہیں بے ڈھنگی کشش یا نمائش نہ ہو تو اسے تحریر امتیازی کہتے ہیں اسمیں ٹائپ جیسے حروف بھی داخل ہیں۔

(۴) تیز تحریر جسکی سطروں کا میلان جانب بلندی۔ زیر و بالا کی کششیں طبعی ہوں۔ حروف (ٹ) کے خطوط تقاطع اور حروف (ن) کے نقطے آگے بڑھے ہوئے ہوں۔ تو ایسی تحریر سے قوت عمل ظاہر ہوتی ہے۔

(۵) قلم کی جنبشیں بڑھی ہوں۔ حروف کے قد و قامت میں فرق ہو۔ حروف (ٹ) کے خطوط تقاطع بڑے ہوں تو اس سے قوت تخیل کا اظہار ہوتا ہے۔

(۶) اگر علامات وقف صحیح ہیں، حروف کے لاحقہ سنبھال کر لکھے گئے ہیں، قلم کی جنبشیں بھی حد اعتدال کے اندر ہیں۔ تحریر میں پختگی پائی جاتی ہے۔ اور حروف (ٹ) کے خطوط تقاطع ہمواری میں نمایاں ہیں تو اس سے قوت فکر ظاہر ہوتی ہے۔

(۷) تحریر صاف پڑھی جاتی ہو۔ حروف صاف اور واضح ہوں، نوک پلک درست ہو، الفاظ اور سطور کے درمیان فاصلہ کافی ہو تو علامت صفائی و وضاحت ہے۔

(۸) اگر سطور میں تموج ہے اور حروف کے قد و قامت اور ڈھلاؤ بھی مختلف ہیں تو اس سے ذہنی لچک ظاہر ہوتی ہے۔

(۹) اگر تحریر ہموار ہے سطریں سیدھی ہیں، اور ہر حرف کرسی پر ٹھیک اور بلندی میں برابر ہے تو اس سے صحیح نویسی کا اظہار ہوتا ہے۔

(۱۰) اگر حروف (ع) اور (ج) وغیرہ کی کششیں لمبی ہیں اور ان میں جانب راست انحناء پیدا ہو جاتا ہے۔ حروف کلاں بقیہ حروف لفظ متعلقہ سے ملتے ہیں۔ حرف (ن) بغیر پھندے کے قلا کوہ کی وضع کا بنایا جاتا ہے۔ حروف (م) اور (۲) ایسی وضع کے لکھے جاتے ہیں جیسے (م) اور سطور کا ڈھلاؤ داہنی طرف کو ہے تو ایسی تحریر ایثار نفس ظاہر کرتی ہے۔

(۱۱) اگر تحریر کا ڈھلاؤ داہنی طرف کو ہے۔ حروف کا ڈھلاؤ اور قد و قامت مختلف ہے۔ الفاظ توڑ کر دو دو تین تین حرفوں کے مجموعہ میں لکھے جاتے ہیں۔ علیحدہ علیحدہ حروف برابر برابر لکھ کر لفظ بنایا جاتا ہے۔ لفظ کے آخری حرف کا لاحقہ جانب راست بڑھ جاتا ہے تو ایسی تحریر سے قوت شعوری ظاہر ہوتی ہے۔

I have got true
Copies of your book
from Machelas I am

اعلے التحریر

(۱۲) اگر خط میں پختگی ہے، حروف خفیف طور پر زاویہ دار ہیں۔ حروف (ٹ) کے خطوط تقاطع اچھے اور باقاعدہ ہیں۔ اور رخ کا مستقل طور پر یکساں ہے تو ایسی تحریر سے طاقت اور قوت عمل کا اظہار ہوتا ہے۔

ادنیٰ تحریر کی علامات عمومی

(۱۳) اگر تحریر بھدی ہے، کششیں اور حروف کے دائرے مصنوعی پیچ و خم دکھاتے ہیں تو ایسی تحریر بدمذاقی پر دلالت کرتی ہے۔

(۱۴) تحریر موٹی ہے، دائیں طرف کو ضرورت سے زیادہ میلان ہے، جنبش قلم سے بہت زیادہ کام لیا گیا ہے۔ جگہ جگہ الفاظ کے نیچے خط کھینچ دیے گئے ہیں۔ نامناسب جوش، اور بے ڈھنگی سرگرمی دکھائی دیتی ہے تو اس سے لکھنے والے کی نفس پرستی ظاہر ہوتی ہے۔

(۱۵) اگر تحریر میں یکے بعد دیگرے خطوط منحنی ہوں، تحریر بتدریج مائل بہ پستی ہوتی ہو، حروف (ت) پر خطوط تقاطع اور حروف (ز) پر نقطے نہ ہوں تو یہ کاہلی اور تن آسانی علامت ہے۔

(۱۶) اگر تحریر پریشان ہے، حروف کی زیر و بالا کشش اس قدر طویل ہے کہ سطریں اوپر نیچے کے لفظوں میں گھس جاتی ہیں، جنبش قلم غیر طبعی ہے۔ حرفوں کے پھندے اور لاحقہ بڑے اور پھیلے ہوئے ہیں، چھوٹے حروف اس قدر بڑے بنائے گئے ہوں جیسے بڑے حروف ہوتے ہیں، الغرض تحریر سے عام بے پروائی کا اظہار ہوتا ہے تو یہ علامت ہے ایسی تخیل کی جو قابو سے باہر ہو۔

(۱۷) اگر تحریر صاف نہ پڑھی جاتی ہو، حروف کی ترتیب سطح قرطاس پر بے ڈھنگی ہو اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ تحریر بحالت اشتعال لکھی گئی ہے تو یہ پریشانی ذہن کی علامت ہے۔

(۱۸) سخت اور زاویہ دار تحریر جس میں حرف (ت) کے حصہ زیریں اس طرح مروڑا جائے جس سے اس کی صورت کانٹے دار بن جائے تو اس صاحب تحریر کی ضدی طبیعت کا اظہار ہوتا ہے۔

(۱۹) اگر سطریں ناہموار ہوں، الفاظ جانب عقب بائیں ہاتھ کی طرف مائل ہوتے ہوں۔ الفاظ کے حروف آخر کا لاحقہ تاگے کی طرح باریک ہو کر غائب ہو جائے، علاوہ ازیں جگہ جگہ بھدی اور ناقابل فہم عبارت ہو تو ایسی تحریر سے لکھنے والے کی غلط نویسی کا اظہار ہوتا ہے اور اس شخص کا مزاج صحت پسند نہیں ہے۔

(۲۰) اگر تحریر میں حروف کی کشش زیریں جانب عقب گھوم کر بائیں طرف مائل ہوتی ہو، حروف کلاں کی ابتدا تاگے جیسے باریک خط کے پھندے سے ہوتی ہو اگر تحریر "پیچ پیچ" ہو۔ یا حروف بہت زیادہ زاویہ دار ہوں، یا دستخط کا حرف آخر لکیر کی مانند ختم ہو کر نیچے کی طرف جانب چپ کھنچ جاتا ہو، تو ایسی تحریر سے خود غرضی کا اظہار ہوتا ہے۔

(۲۱) اگر تحریر عمودی ہو، روانی نہ ہو، حروف آخر منقطع ہو جاتے ہوں تو ایسی تحریر سے سرد مہری اور بے مروتی کا اظہار ہوتا ہے۔

(۲۲) اگر تحریر کمزور اور ناہموار ہو۔ حروف (ت) جگہ جگہ بغیر خط تقاطع کچھوڑ دیا جائے تو ایسی تحریر سے عدم استقلال ظاہر ہوتا ہے۔

(۲۳) اگر تحریر بہایت کمزور ہو، خطوط باریک ہوں، حرف (ت) کا خط تقاطع اکثر غائب رہتا ہو تو ایسی تحریر سے کمزوری کا اظہار ہوتا ہے۔

اب ہم اس طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ مقررہ علامات کے اجتماع سے کیا کیا نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ یہی وہ میدان ہے جہاں ماہر فن فراست التحریر اپنی عقل و فہم اور اپنی قوت مشاہدہ و تخلیل سے بہت کام لے سکتا ہے مثلاً حوصلہ، قوت عمل اور خواہش ترقی تینوں باتیں اگر ایک جگہ جمع ہو جائیں تو ان کا نتیجہ زندگی میں کامیاب ہونے کا عزم بالجزم ہوتا ہے۔ اگر کسی خاص طور پر ہموار تحریر میں شعور و تخیل کا اجتماع ہو جائے تو نتیجہ الہام ہوتا ہے۔ فراست و تخیل کا اجتماع کسی وضع کی قدر دانی پر دال ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جس شخص میں یہ باتیں ہوں وہ ہمیشہ عمدہ اور خوبصورت چیزوں کی قدر دانی کرے۔ مثلاً کسی بدمذاق اور عیاش آدمی میں یہ دونوں باتیں پائی جائیں تو کسی مکروہ اور ناخوشگوار چیز کا مداح ہوگا۔ اگر ایسے شخص سے مشاہیر پرستی کے لئے کہا جائے تو غالباً وہ اپنا ہیرو کسی "بانکے" کو یا انعامی مقابلہ کرنیوالے جنگجو" کو پسند کرے گا۔ اگر یہی باتیں کسی خوش مذاق اور شائستہ فطرت شخص میں جمع ہو جائیں تو وہ شعر و سخن، جمالیات اور فنون لطیفہ کا دلدادہ ہوگا۔

فراست کا ثبوت نہ صرف ڈھلواں تحریر سے ملتا ہے بلکہ مختلف قد و قامت اور ڈھلاؤ کے حروف بھی اسی خصوصیت کا اظہار کرتے ہیں۔ اگر علامات میں سے کوئی علامت خودغرضی کی ایک یا دو علامتوں کے ساتھ جمع ہو جائے تو نتیجہ مستخرجہ رشک و حسد ہوگا۔ ایک انانیت پسند اور خودپرست شخص کی خواہش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ سب آدمیوں کی توجہ اسی کی طرف مائل ہو۔ اگر کسی کی توجہ کسی دوسرے شخص کی طرف منعطف ہو جاتی ہے تو وہ جلتا ہے، یہی باعث ہے کہ ایسا شخص حاسد ہوتا ہے اگر وہ علامتیں مظہر حسد کے ساتھ کوئی علامت مظہر تخئیل جمع ہو جائے تو نتیجہ نفسانیت ہوتا ہے۔ اگر ان علامتوں میں کوئی علامت متعلقہ غیظ و غضب یا بغض و کینہ یا عدم ضبط نفس بھی شامل ہو جائے تو نتیجہ جذبۂ انتقام ہوتا ہے۔

اگر فراست، عقل و فہم، اور مہر و مروت کا اجتماع ہو تو نتیجہ محبت و شفقت ہوتا ہے۔ اور اگر ان میں خصوصیات میں وہ علامتیں بھی شامل ہو جائیں جو علوم باطنی یا عزت و حرمت اسکنۂ مقدسہ سے تعلق رکھتی ہیں تو وہ شخص ایسے مادہ کا بنا ہوا ہے جس سے مظلومین و شہداء بنے ہوئے تھے۔

ذیل میں چند اجتماعات اور انکے نتائج مستخرجہ درج کئے جاتے ہیں:۔

قدرے فراست و خودغرضی — سرد مہری۔ بے مروتی

غرور و نخوت - قدرے فراست	نفرت کرنیوالی طبیعت
دنائیت - نمایاں فراست	ایسا شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ مجھ پر چوٹ کی گئی - حالانکہ یہ بات نہیں ہوتی
تخیل - جانداری	جوش
بے پروائی - تخیل	خفیف الحرکاتی
حوصلہ - جانداری - جودت -	کاروباری حوصلہ
تخیل - خود غرضی - دروغگوئی	دھوکا دیکر ٹھگ لینا
تخیل - سریع الاعتقادی	توہم پرستی
تخیل - کاروباری حوصلہ - مصلحت اندیشی	دور اندیشی
کمزور طبیعت - ذہنی لچک	مکر و فریب
قوت جاذبہ (assimilation) سرگرمی -	ذہنی مشاغل کا شوق
قوت جاذبہ - سرگرمی - دنائت	عامیانہ مشاغل کا شوق
تخیل - استقامت - استقلال	جرأت و دلیری
شوق نمائش - ذہنیت نقاد	مسخراپن
شوق نمائش - احساس جمالیات - زندہ دلی	حاضر جوابی

نتائج مستخرجہ قائم کرتے ہوئے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ صاحب تحریر کی فراست، علویت یا دنائت کے مدارج کا خیال رکھا جائے - اگر عقل و فہم بدرجہ نمایاں موجود نہیں ہے تو مناسب ہوگا کہ شخص زیر بحث کو وہ خصوصیات بدرجہ اوسط دی جائیں جو اس میں ظاہر ہوتی ہیں - ایسی صورت میں اگر اسکی تحریر سانپ کی طرح سے لہردار ہے تو اس کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ڈپلومیٹ ہے - ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ وہ صاحب سلیقہ ہو - الغرض ایسے شخص کی نسبت یہ حکم لگانا زیادہ اچھا ہوگا کہ اسکی ذہنیت لچکدار ہے -

یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ادنےٰ قسم کی تحریر میں صفائی ہو یا نہ ہو - یہ بات اعلےٰ تحریر کے لئے مخصوص ہے تحریر کی پریشانی کا تعلق ذہانت سے کبھی نہیں ہوتا -

تحریر و تقدیر

اگرچہ مادہ پرستان فرنگ کا قول یہ ہے کہ "انسان اپنا کاتب تقدیر آپ ہے" لیکن زندگی کے تلخ و شیریں تجربات سے اس قول کا ثبوت بہم نہیں پہنچتا - جس قدر زیادہ انسان جیتا ہے اسی قدر زیادہ اسے اسرار حیات کے مخفی ترین گوشوں تک رسائی حاصل ہوتی جاتی ہے - الغرض جسقدر زیادہ ادراک اسے حیات بشری کا ہوتا جاتا ہے اسی قدر زیادہ احساس اسے اس امر کا ہوتا جاتا ہے کہ کوئی مخفی اور پُراسرار

ہاتھ ایسا ضرور ہے جو دنیا میں ہماری رہنمائی کرتا ہے اور اسی ہاتھ میں تشکیل تدبیر ہے انسان ہزاروں قسم کے منصوبے باندھتا ہے اور ہزاروں قسم کے ارادے کرتا ہے۔ لیکن ایک پراسرار ہاتھ انھیں مٹا دیتا ہے اور تمام منصوبے خاک میں ملجاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ دنیاوکاروبار میں اسباب وعلل کا بہت بڑا حصہ ہے۔ لیکن ہر بات اسباب وعلل کے ماتحت معلوم نہیں ہوتی۔ یہ بھی سچ ہے کہ اگر ہم کسی خاص سمت کا سفر کرنے پر مجبور ہوں، اثناء راہ میں بعض خاص آدمیوں سے دوچار ہونا پڑے اور قسمت کے بہت سے نشیب وفراز دیکھنا پڑیں۔ لیکن جو نقصان یا منافع اس سفر میں ہم کو ہوگا اسکی مقدار کا انحصار زیادہ تر خود ہماری ذات پر ہے۔ الغرض اس طرح سے کسی شخص کے کردار واطوار کا حال معلوم کرکے اسکے مستقبل پر حکم لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً جو ناکامی کسی کمزور شخص کی کمر توڑ دے وہی اکثر ایک طاقتور شخص کے لئے ذریعہ نجات بنجاتی ہے۔ یعنی موخرالذکر شخص اس ناکامی کے بعد زیادہ طاقتور عزم صمیم لیکر اٹھتا ہے۔ اس کی قوت عمل میں جوش آجاتا ہے اور شاہد مقصود اس کے سامنے آغوش طلب ہوکر حاضر ہوجاتا ہے۔ ایمرسن نے اسی وجہ سے یہ کہا تھا کہ "جس شخص نے کوئی غلطی نہیں کی اس نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔"

دنیا ایک معمورۂ امکانات ہے۔ اب یہ کام انسان کا ہے کہ موقعہ ڈھونڈے اور ہاتھ سے نہ جانے دے۔ لیکن یہ بات بعض آدمیوں کے احاطۂ امکان سے باہر ہے۔ اور بعض ایسا کرتے نہیں۔ جو معدودے چند اس اصول پر عمل کرتے ہیں وہی عروس مقصد سے ہمکنار ہوجاتے ہیں۔ زندگی کی ناکامیوں سے بچتے رہنا۔ ایک اصول دانشمندانہ ہے۔ لیکن نفع بخش نہیں۔ جو لوگ اس اصول پر عمل کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی مدد کے طالب ہوتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اپنی مدد آپ نہ کرسکیں ان کی مدد کوئی دوسرا شخص کیونکر کرسکتا ہے۔ ان لوگوں کی امداد واعانت کی حد بس یہاں تک ہوتی ہے گویا انھوں نے کسی شخص کی ٹانگ گھسیٹ کر اسے غار میں گرنے سے روکدیا۔

تحریر وتقدیر کا معاملہ دوسرا ہے۔ یہاں یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ جتنا اثر تحریر کا انسان کی تقدیر یا مستقبل پر پڑتا ہے اتنا اثر تقدیر کا انسان کی تحریر پر نہیں پڑتا۔ مثلاً ایک ایسا شخص ہے جس کی تحریر سے قوت عمل اور جودت طبع ظاہر ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ بڑی قسمت اسے کسی سخت مصیبت میں مبتلا کردے لیکن اسکی قوت عمل اور تدبیر اسے فوراً پنجہ بلا سے نجات دیگی۔ اور جب وہ اس آگ سے نکلیگا تو کندن بنکر نکلیگا۔ یعنی اسکے تجربات میں مزید اضافہ ہوجائیگا۔

Hoping to see you shortly
Look after yourself. Warm
nothing like India. Muor
[signature]

"یہ نمونہ گول یا مدور تحریر کا ہے۔ جس سے صاحب تحریر کی خوش اخلاقی اور ملنساری اور فطری طور پر پاکیزہ طبعی ظاہر ہوتی ہے۔ دستخط کے نیچے جو موج دار خط ہے اس سے لکھنے والے کا انبساط ظاہر ہوتا ہے۔"

واضح ہو کہ کوئی ماہر فراست التحریر رمال یا پیشین گوئی کرنیوالا نہیں ہوتا۔ جس طرح ایک طبیب حاذق کسی مرض کی تشخیص کر کے یہ پیشین گوئی کر سکتا ہے کہ عارضۂ مذکور کی آیندہ حالت کیا ہوگی اسی طرح ایک ماہر فراست التحریر بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ کسی شخص کی تحریر میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں وہ صاحب تحریر کو کہاں لے جائیں گی۔ اسی طرح وہ بھی یہ بتا سکتا ہے کہ صاحب تحریر کی قسمت میں کس قدر مسرت اور کس قدر مصیبت ہے نیز یہ کہ مستقبل میں اسے کامیابی سے دوچار ہونا پڑے گا یا ناکامی سے۔

عیش و مسرت کی کمی یا زیادتی کا انحصار زیادہ تر انسان کے مزاج اور خصلت پر ہے۔ بعض آدمیوں کے نزدیک جسقدر ضروری سانس لینا ہے اسی قدر وہ زندگی کے روشن پہلو پر نظر رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ مصیبت و اوبار کی کتنی ہی سیاہ اور گھنگھور گھٹائیں چھائی رہیں مگر وہ ان کے اندر سے بھی مطلع امید پر روشنی دیکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تحریر میں امید انبساط، مہر و مروت اور صبر و قناعت پائے جاتے ہیں۔

حوصلہ عیش و مسرت کا دشمن ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمت و حوصلہ بھی وہ چیز ہے جسکا انسان کی ترقی میں بہت بڑا حصہ ہے۔ اور دنیا جو اپنی موجودہ مادی ترقی کی حد تک پہونچ گئی ہے اس میں قوت محرکہ حوصلہ و ہمت ہی ہے۔ لیکن اکثر دیکھا گیا کہ یہی چیز انفرادی عیش و مسرت کے لئے مہلک چیز ثابت ہوتی ہے۔ یہ چیز عظیم الشان ذاتی قربانیوں کا تقاضا کرتی ہے جن میں اطمینان قلب بھی شامل ہے۔ جس شخص کا دل حوصلہ و ہمت سے معمور ہوتا ہے اسکے سینہ میں ایک آگ روشن ہوتی ہے جو نہ چین لینے دیتی ہے نہ آرام۔ اس کا سفر حیات مراحل و منازل مختلفہ کا ایک طویل سلسلہ ہوتا ہے۔ جب وہ منزل مقصود تک پہونچتا ہے اور حسب دلخواہ معراج ترقی حاصل کر لیتا ہے تو بھی وہ یہی سمجھتا ہے کہ اس کی موجودہ ترقی بھی سفر حیات کی ایک منزل ہے جہاں کچھ دیر آرام لیکر آگے چلنا پڑے گا۔ گویا موجودہ کامیابی اس کے سفر حیات کا ایک یادگاری نشان ہے۔ جو محض اس امر کا مظہر ہے کہ کوئی جانیوالا یہاں سے بھی گذرا ہے۔

بعض حضرات یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ کیا کسی شخص کی تحریر سے اوسکی تقدیر یا مستقبل پر حکم لگایا جا سکتا ہے؟

اس کا جواب "ہاں" اور "نہیں" دونوں ہیں۔ علم فراست التحریر کے ذریعہ سے جو کچھ اندازہ کسی شخص کے کردار و اطوار کا کیا جا سکتا ہے اس سے اس بات میں نسبتاً آسانی پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کے مستقبل کے بارہ میں کوئی پیشنگوئی کی جائے۔ یہ حکم تو نہیں لگایا جا سکتا کہ ایک شخص کی قسمت بری ہے یا بھلی اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے کہیں سے

غیر متوقع طور پر دولت یا خزانہ ملنے والا ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ شخص مذکور نشانۂ واقعات و حوادث نہ بنے گا۔ یا ان سب پر حاوی رہیگا۔ اس بارہ میں ہر بات شخص مذکور کی قوت ارادی، قوت اخلاقی اور درجۂ اثر پذیری پر منحصر ہے۔ مثلاً جب لکھنے والے کی تحریر کسی قدر جانب دست راست مائل ہوتی ہے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب تحریر کی طبیعت سیمابانہ طور پر مادۂ اثر پذیری رکھتی ہے۔ لیکن یہ نتیجہ بھی صاف نہیں بلکہ مغالطہ انگیز ہے۔ کیونکہ ایسے شخص کی طبیعت پر اشیا و اشخاص کا غیر معمولی اثر ہو سکتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر اسکی قوت ارادی کمزور ہے تو وہ اپنے اس میلانِ طبع کی کوئی اصلاح نہیں کر سکتا۔ اسکی غیر معمولی قوت شعور اسے ع دماغ بیہدہ پخت و خیال باطل بست کا مصداق کردیگی یعنی وہ "شیخ چلی" بنجائے گا اور چونکہ اس میں فقدانِ قوت ارادی بھی ہے اسلئے اسکی حالت مائل بہ جمود رہے گی۔ اور یہ دونوں خصوصیات ملکر کاہلی و تن آسانی میں منتج ہونگی۔ اسکے جذبات کی جولانیوں کیلئے وسیع میدان کھلا ہوگا۔ کردار یا اطوار کوئی چیز اسے مسرور و خوش نہیں کر سکے گی۔

تحریر دیکھ کر کسی شخص کے مستقبل پر حکم لگانے میں جس دوسری بات کا زیادہ حصہ ہے وہ یہ ہے کہ اسکی تحریر سطح قرطاس پر جانب پستی مائل ہے۔ یہ علامت منحوس ہے۔ کیونکہ اس سے حزن و ملال اور اعتماد بالنفس کے فقدان کا اظہار ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ تقدیر بھی انھیں لوگوں کی دلدادہ ہوتی ہے جو بہادر اور شجاع ہوتے ہیں۔ جس شخص کو اپنی ذات پر اعتماد نہیں۔ قسمت بھی اسکی بات نہیں پوچھتی۔ اور اسی افسردگی کا بھی لوگوں کے کردار پر مضر اثر پڑتا ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کی زندگی خراب ہو جاتی ہے۔ اترا ہوا چہرہ دیکھکر لوگ کنارہ کر جاتے ہیں، وہ حزن و ملال، اداسی و افسردگی کو ایک قسم کی متعدی بیماری سمجھتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ ع افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را۔ ایسے لوگوں کو دنیا ہمیشہ تنہا چھوڑ دیتی ہے۔ اور یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ کیونکہ دنیا میں کوئی شخص بے یار و مددگار رہنا پسند نہیں کرتا۔

اگر مائل بہ پستی تحریر کا باعث عارضی افسردگیٔ خاطر یا چند روزہ علالت ہو تو ایسی تحریر کی علامات خصوصی دیکھکر مستقبل پر حکم نہ لگانا چاہیئے۔ کیونکہ وہ علامات مستقل نہیں بلکہ عارضی ہوتی ہیں۔ دنیا میں کوئی شخص خوشی و غم سے خالی نہیں۔ خوشی و غم توام ہیں۔ اور یہ دونوں باتیں تحریر سے ظاہر ہو جاتی ہیں۔

We shall have pleasure in paying
the second instalment of your
New Shares in the Bank when due.

(یہ متنوع تحریر کا نمونہ ہے)

خود غرضی، رشک و حسد، کمزوری طبیعت، تخیل کی مطلق العنانی کاہلی و تن آسانی، بے اعتمادی، فقدان

جودت، اشتعال پذیری، بےصبری اور فقدان ضبط نفس یہ ایسی چیزیں ہیں کہ جس شخص میں بھی ہونگی اس کے لئے حزن و ملال اور غم و رنج کی کوئی کمی نہ ہوگی۔ طبیعت غیر ضابط اپنی دشمن آپ ہوتی ہے۔ اور نفس امارہ وہ چھوٹا سا دیوتا ہے جس کا مذہب و مشرب "انانیت" کے سوائے اور کچھ نہیں۔ رشک و حسد کی نسبت انگلستان کے ملک الشعراء شکسپیر نے خوب کہا ہے کہ "یہی شاہراہ منزل جنون ہے۔" کاہل اور تن آسان آدمی اپنے سوائے اور کسی کا دشمن نہیں ہوتا۔ اور بے صبر آدمی کی غرض کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ کاش ایسا شخص اس مقولہ پر عمل کرے "جو شخص انتظار کرنا جانتا ہے اس کے پاس ہر چیز خود بخود آجاتی ہے۔"

جس قدر کسی شخص میں شدت خواہش ہوگی اور اسی کے ساتھ قوت ارادی بھی معقول درجہ تک ہوگی تو وہ شخص عموماً کامیاب ہوگا۔ قوت ارادی ہی وہ طاقت ہے کہ اس کے بغیر میدان ترقی میں کوئی اقدام نہیں ہو سکتا۔ عقل و فہم بھی ضروری چیزیں ہیں۔ یہی انسانی کی خضر راہ ہیں۔ یہی وہ ناخدا ہیں جو کشتی حیات کو ساحل مراد تک پہونچا دیتے ہیں۔

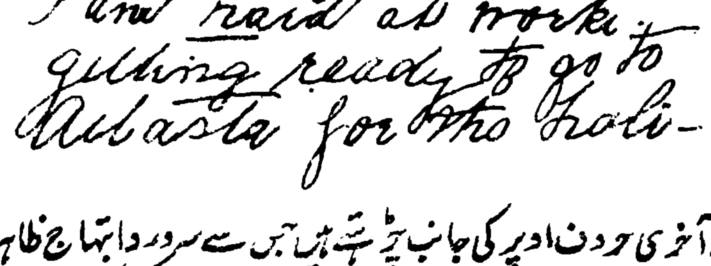
یہ بھی یاد رہے کہ کامیابی کا درجہ بھی یکساں نہیں ہوتا۔ ہر شخص کو برابر کامیابی نہیں ہوتی۔ بعض آدمی تھوڑی سی ہی کامیابی پر پھول جاتے ہیں اور بعض آدمی ایک کامیابی کے بعد اسکندر اعظم کی طرح افسوس کرتے ہیں کہ "کوئی نئی دنیا فتح کرنیکو نہیں رہی" علاوہ ازیں ہر شخص کی ہمت اور سب کا حوصلہ یکساں نہیں ہوتا۔ کوئی دولت کا خواہشمند ہے تو کوئی عزت کا، کوئی سیاسی عزتوں کا آرزو مند ہے تو کوئی فوجی عظمتوں کا۔ کوئی اقلیم میں کوس لمن الملک بجانا چاہتا ہے تو کوئی فنون لطیفہ میں شان یکتائی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ الغرض ع ہر کس بخیال خویش خبطے دارد۔

یہ کتنا فضول ہے کہ جو لوگ اچھے ہوتے ہیں وہی خوش و مسرور رہتے ہیں۔ مگر باینہمہ کسی قسم کا حکم لگانے کیلئے مبادیات قائم کرنا محال ہے تاکہ وقتاً فوقتاً غلطی میں پڑنے کا احتمال نہ رہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی آسان نہیں کہ انسان نیک بھی ہو اور احمق بھی۔ کیونکہ بچپن سے لیکر بڑھاپے تک کے تجربات یہ کہتے ہیں کہ احمق وہی جو برا ہو۔

کم عقل آدمی کے لئے واقعی دنیا میں عیش و مسرت یا دنیا کی دیگر مطلب و پسندیدہ باتوں کے حصول میں کامیابی کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔ ایسے اور اسی قبیل کے دیگر آدمی عموماً معاشرتی زینہ کی زیریں سیڑھی پر پائے جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں چند خصوصیات مشترکہ ہوتی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ جب کبھی ان لوگوں سے کوئی سوال کیا جاتا ہے تو وہ کوئی قابل اطمینان اور واضح بیان نہیں دے سکتے۔ ان لوگوں میں ذہنی صحت و تدقیق کا فقدان ہوتا ہے۔ تخیل کا تسلسل وہ نعمت ہے جو ان لوگوں کے حصہ میں نہیں آیا۔

ان کا ذہن آہستہ مگر محنت سے کام کرتا ہے اور وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں ایک ہی ڈھرے پر کرتے ہیں۔ لکیر کے فقیر ہوتے ہیں اور ان کے دل میں یہ خیال کبھی نہیں آتا کہ پرانے اصولوں میں ترقی یا کوئی اضافہ کیا جائے۔

ایسے لوگ عموماً زود رنج ہوتے ہیں۔ سالہاسال تک دل میں کینہ رکھتے ہیں۔ اور جب کبھی فرصت ہوتی ہے تو اپنے طور پر اسی ایک بات میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ایسے لوگوں میں بطور نعم البدل بعض محاسن بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ اپنے آقا کے بڑے جان نثار اور فداکار ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ محنتی، کفایت شعار اور خوش مزاج بھی ہوتے ہیں مگر چونکہ ان کی ذہنیت ایسی قوت تمیز سے عاری ہوتی ہے کہ وہ صحیح و غلط یا خیر و شر میں فرق کر سکیں اسلئے ذہنی لحاظ سے وہ زیادہ صفات پسندیدہ اور اوصاف حمیدہ کے مالک نہیں ہو سکتے۔ علاوہ ازیں وہ زیادہ تر اپنی فطرت حیوانی کے غلام ہوتے ہیں۔ جس کے باعث ان میں حرص و آز، دروغگوئی، سرقہ اور شقاوت جیسے عیوب ذمیمہ پڑ جاتے ہیں۔ یہ لوگ ایک دوسرے سے بھی بیحد حسد کرتے ہیں اگر کسی دوست نے ذرا سی بھی ترقی یا کامیابی حاصل کر لی تو ان کے جذبات بغض و حسد فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس غریب کو نقصان پہونچانے میں ہرگز دریغ نہ کریں گے۔ جہانتک خارجی باتوں کا تعلق ہے جن لوگوں کو ازروئے علم فراست التحریر لاشئے محض سمجھا جاتا ہے۔ وہی اس بارہ میں سب سے اچھے نکلتے ہیں۔ کوئی شخص ان کی نسبت کچھ نہیں جانتا کیونکہ ان میں کوئی ایسی بات ہی نہیں ہوتی جسے جاننے کی ضرورت پڑے۔ علامات خارجیہ سب انکے موافق ہوتے ہیں۔ وہ چپ رہتے ہیں تو لوگ ع
خموشی معنئی دارد کہ در گفتن نمی آید۔ کا خیال کرتے ہیں۔ ان کو متین اور سنجیدہ سمجھتے ہیں۔ ورنہ ان کی خاموشی ہی ان کی دانشمندی ہے۔ بقول حکیم شیراز ؎ تا مرد سخن نہ گفتہ باشد۔ عیب و ہنرش نہفتہ باشد۔ جب تک وہ کوئی بات زبان سے نہیں نکالتے تب تک انکی حماقت پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ ان میں جودت طبع نہیں ہوتی۔ مگر لوگ اس نقص کو ان کی دانشمندی اور دوراندیشی پر معمول کرتے ہیں۔ لوگ ان کی نسبت یہ بھی خیال رکھتے ہیں کہ ان کی سیرت نہایت طاقتور اور عمیق ہے۔ لوگ ان کو صاحب شعور بھی سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ایسے لوگ وہی کام کرتے ہیں۔ جن کی ان سے توقع ہوتی ہے۔ وہ بہت ہی کم گو اور کم سخن ہوتے ہیں۔ اور جو کوئی بات انکی زبان سے نکلتی بھی ہے تو وہ سنی سنائی ہوتی ہے جو انھوں نے ادھر ادھر سے یاد کر لی ہے۔ یہی باتیں زندگی بھر



"الفاظ کے آخری حروف اوپر کی جانب چڑھتے ہیں جس سے سرور و ابتہاج ظاہر ہوتا ہے"۔

ان کے کام آتی رہتی ہیں۔ یہ لوگ "مرنجان و مرنج" قسم کی مخلوق ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس سے زیادہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ خموشی انکی پردہ دار ہوتی ہے اور لوگ اسی ایک صفت کے باعث انھیں نہایت متین و سنجیدہ اور دانشمندانہ و فہمیدہ سمجھنے لگتے ہیں۔

جن لوگوں کی تحریروں سے اونکا درمیانی درجہ میں ہونا ظاہر ہوتا ہے وہ اگر خوش قسمت نہیں ہوتے تو ضرور ہوتا ہے کہ وہ کبھی کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور اس طبقہ کے بعض لوگ کسی قدر ہوشیاری اور ہنرمندی سے بھی خالی نہیں رہتے۔ اور بعض واقعی صاحب سلیقہ اور ذکی ہوتے ہیں لیکن آخری حکم یہ ہے کہ یہ سب ایک عامیانہ اور بھدے سانچہ میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ جسکے باعث انھیں درجۂ بلندی نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ انکی تعلیم و تربیت اور دیگر محاسن محض سطحی ہوتے ہیں۔ وہ پالش شدہ بت ہیں۔ باہر سے چمکدار لیکن اندر سے پتھر - ہیں۔ ان کی فطرت ادنےٰ درجہ کی ہوتی ہے۔ وہ تنگدل اور متعصب ہوتے ہیں اسی لئے کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ اگر اس قماش کے کسی آدمی میں کافی قوت ارادی ہو، تو ممکن ہے کہ وہ بسلسلہ تجارت دولتمند ہو جائے۔ الغرض ازروئے علم فراست التحریر ایسے لوگوں کے لئے صرف یہی حکم لگایا جاسکتا ہے۔

اوسط درجہ کے لوگوں میں بعض دیگر آدنی بھی کامیابی حاصل کر لیتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو لسّان، ہوشیار و چالاک، باہمت صاحب حوصلہ ہوتے ہیں۔ اسی قسم کے لوگ عموماً میدان سیاسیات میں کود پڑتے ہیں اور بعض اوقات سیاسیات ملکی میں معراج ترقی حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جسقدر ملک انکی خدمت کرتا ہے اسقدر وہ ملک کا کام نہیں کرتے۔

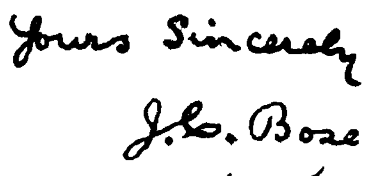
اعلےٰ قسم کی مسرتیں اور ارفع قسم کے محاسن اس شخص کا حق ہیں جو درجۂ عالی رکھتا ہے۔ اگر ایسے شخص میں عقل و فہم کا مادہ زیادہ ہے تو وہ یہ دونوں نعمتیں حاصل کر سکتا ہے۔ اسکی عقل و فہم اس قدر ترقی یافتہ ہوتی ہے کہ وہ ہر بات سے بآسانی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ وہ لوگوں کے خیالات عالی منتخب کر کے انھیں اپنا بنا لیتے ہیں۔ اور چونکہ وہ طریقۂ تقابل سے نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ اسلئے انمیں قوت اجتہاد پیدا ہو جاتی ہے اور وہ کسی خاص مذہب کے مقلد نہیں ہوتے۔ اور چونکہ انکے طبائع عالی پر تعصبات کا کوئی اثر نہیں ہوتا اسلئے وہ بہت جلد درجہ اعلےٰ تک پہونچ جاتے ہیں۔

سب سے زیادہ خوش نصیب وہ صاحب ذکا شخص ہوتا ہے جسکا دماغ روشن ہو اور علم و فضل میں بھی تبحر رکھتا ہو۔ دنیا اسکا عیش خانہ ہو وہ اپنے اس گھر کو جب چاہے اور جسطرح چاہے ترقی دے سکتا ہے۔ وہ جو قدم اٹھاتا ہے ناپ تول کر اٹھاتا ہے اور ایسے مقامات سے صاف گذر جاتا ہے جہاں دوسرے طبقہ کے لوگ ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ ایسا شخص بنی نوع انسان کا محسن ہوتا ہے۔ اور اگر ایسا شخص کسی ملکی عہدہ پر فائز ہوتا ہے تو نوع بشری کو بیحد فائدہ پہونچتا ہے۔

جن لوگوں کو مرتبۂ نبوغ حاصل ہوتا ہے انکی بات ہی دوسری ہے۔ بعض اوقات ایسے لوگوں کے محاسن ہی ان کے لئے معائب بنجاتے ہیں۔ اسی لئے وہ ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھوں ستائے جاتے ہیں جو ان سے اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ انکی ذہانت کی انفرادیت ہی ایک ایسی چیز ہے جسکے باعث اکثر لوگ انکی شخصیت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ وہ ابنائے زمانہ سے آگے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور مشعل راہ کا کام دیتے ہیں۔ اور جبتک دنیا انھیں سمجھنے کے قابل ہو وہ دنیا سے گذر جاتے ہیں۔

عام خیال یہ ہے کہ نابغہ کا وجود شاذ و نادر ہوتا ہے۔ مگر یہ خیال غلط ہے۔ ایسے لوگ اعلےٰ عہدوں پر ممتاز ہوتے ہیں۔ کیونکہ جن کے ہاتھوں میں دنیوی عزت و جاہ ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک نابغہ لائق ترین شخص ہوتے ہیں۔ نابغہ اپنے عمل میں نظائر سابقہ کی پروا نہیں کرتے

اور نہ وہ روایات قدیمہ کی کوئی حقیقت سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی ذات سے حکومت کے کل پرزوں میں بھی فرق پڑجاتا ہے۔



"نمونہ تحریر سے لکھنے والے کی وقت نظر اور اسکی صفائی ظاہر ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ تفصیل پسند ہے۔"

عیش و مسرت اور وہ کامیابی جسکا نتیجہ عیش و مسرت ہوتی ہے۔ ادنیٰ لوگوں کا حصہ ہیں نہ نابغہ کا۔ یہ برکتیں ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہیں۔ جنکی تحریر صاف، ہموار، خوش نما، قدرے زاویہ دار، اعتدال کے ساتھ مائل بہ عروج، غیر پیچیدہ ہو، اور جن کے حروف (ٹ) کے خطوط تقاطع ہمواری کے ساتھ حرف اصلی سے آگے بڑھے ہوئے ہوں۔ اگر کوئی ماہر فراست التحریر ایسا خط دیکھے تو وہ اطمینان کے ساتھ یہ حکم لگا سکتا ہے کہ لکھنے والا خوش قسمت و مسرور اور ممتاز شخصیت کا آدمی ہے۔ ایسے لوگ دنیا میں کچھ کر گذرتے ہیں۔ اور دوسروں کی رہنمائی کے لئے اپنا نقش قدم چھوڑ جاتے ہیں۔

تحریر اور شخصیت

فطرت نے ہر شخص کو کم و بیش ماہر علم فراست التحریر بنایا ہے۔ مثلاً جب کبھی ہمارے پاس کوئی خط کسی اجنبی کے پاس سے آتا ہے تو ہم فطرتاً اس خط کے طرز تحریر پر بار بار الٹ پلٹ کر غور کرتے ہیں، نقد و نظر کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ الغرض لفافہ کھولنے بھی نہیں پاتے کہ لفافہ پر کا پتہ لکھا ہوا دیکھ کر ہمارے دل میں صاحب تحریر کی نسبت بھلا یا برا خیال پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کہیں وہ نوبت آتی ہے جس کی طرف کسی شاعر نے اس مصرعہ میں اشارہ کیا ہے کہ ع خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھکر

اگر لفافہ پر لکھا ہوا پتہ صاف، خوشخط اور بلحاظ نشست کشش و دوائر عمدہ ہے تو ہم سمجھ لیتے ہیں کہ لکھنے والا مختتی اور صاحب سلیقہ شخص ہے اسکے عادات و اطوار سب منظم و باقاعدہ ہیں۔

اسکے بعد اگر ہمارے نتائج غلط ثابت ہوں، یعنی وہ شخص فی الحقیقت کاہل و آرام طلب نکلے۔ جیسے نہ لباس پہننے کا سلیقہ ہو نہ رفتار و گفتار کا۔ اسکے کردار میں بے پروائی اور اطوار میں بے ڈھنگا پن ظاہر ہو اور صورت شکل کے لحاظ سے بھی قابل توجہ نہ ہو۔ تو ہمیں سخت حیرت ہوتی ہے۔

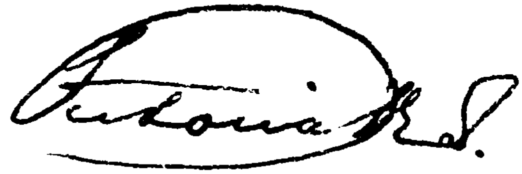
اسیطرح جب ہم کسی شخص کی تحریر "پیچ پیچ" ناہموار، گندہ اور اسقدر خراب دیکھتے ہیں کہ اسکے پڑھنے میں بھی تکلف ہوتا ہو تو ہمارے دل میں صاحب تحریر کی نسبت کوئی اچھا خیال پیدا نہیں ہوتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ صاحب تحریر ایک لاپروا، غیر منضبط اور بے ڈھنگا آدمی ہے اور ہرگز اس قابل نہیں کہ اسے کوئی ذمہ داری کا عہدہ سپرد کیا جا سکے۔

الغرض اس میں شک نہیں کہ کسی کی تحریر اور اس کی شخصیت کے درمیان نہایت گہرا تعلق ہے۔ زبردست فلسفی گیٹے جس نے فطرت انسانی کا اسقدر وسیع و عمیق مطالعہ کیا تھا لکھتا ہے کہ "اس میں ذرہ بھر بھی شبہ نہیں کہ طرز تحریر کا کچھ نہ کچھ تعلق

انسان کے کردار اور ذہنیت سے ضرور ہوتا ہے۔"

اور موسیو لافنیٹر نے تو اس سے بھی زیادہ دعویٰ کیا ہے وہ کہتا ہے: "میں اکثر صورتوں میں دیکھتا ہوں کہ انسان کے طرز گفتار و رفتار اور تحریر میں بہت نمایاں تعلق ہوتا ہے۔"

اگر علم قیافہ پر کسی شخص کی کردار خوانی کے لئے بھروسہ کیا جا سکتا ہے تو اس معاملہ میں علم فراست التحریر اس سے بھی زیادہ زبردست خضر راہ ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کی روشنی میں شخصیت انسانی کے طلسم اسرار میں گوشہ گوشہ کی سیر کی جا سکتی ہے۔ یعنی اگر علم قیافہ کے ذریعہ سے کسی انسان کی صورت شکل اور خط و خال دیکھ کر اس کے رازہائے سربستہ کو معلوم کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس قماش اور کس شعار کا آدمی ہے تو جو حروف اپنے ہاتھ سے بناتا ہے انکی نوک پلک اس کے کردار کا ایک مستقل فوٹو ہوتی ہے۔ اور یہی وہ باتیں ہیں جن کا مطالعہ کرنا ایک ماہر علم فراست التحریر کا کام ہے۔ انسان خواہ کتنا ہی عیار و طرار ہو وہ اور دنیا بھر کو دھوکا دے لیکن جوں ہی وہ شخص اضطراری طور پر اپنے ہاتھ کی کوئی تحریر سطح قرطاس پر نقش کرے گا تو ایک ماہر علم فراست التحریر کی نظروں میں اس کا تمام رنگ روغن عیاری دھل جائے گا۔

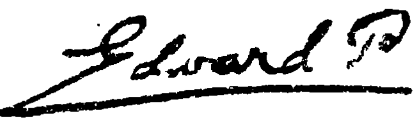


"اس نمونہ سے فراست، شعور، کاروباری حوصلہ، استقلال فی العمل اور ملنساری ظاہر ہوتی ہے۔"

علم فراست التحریر کے معترضین کی ایک بڑی حجت یہ ہے کہ چونکہ انسان کی تحریر کا رنگ وقتاً فوقتاً متغیر ہوتا رہتا ہے اسلئے اسکی رو سے کردار انسانی پر لگایا ہوا کوئی حکم قابل اعتبار اور جامع و مانع نہیں ہو سکتا۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہی اعتراض اس علم کی صداقت کا بہترین ثبوت ہے چونکہ انسان کا مزاج وقتاً فوقتاً بدلتا رہتا ہے۔ اسلئے انسان کی تحریر میں بھی اسکے تغیرات مزاج کا جلوہ اسی طرح نظر آتا ہے۔ جیسے اسکے خط و خال کا عکس آئینہ میں دکھائی دیتا ہے۔ اب خواہ وہ شگفتہ ہو یا ملول انسان کا چہرہ وہی رہتا ہے اور فوراً پہچان لیا جا سکتا ہے۔ اسیطرح کوئی شخص اگر کتنی عجلت کے ساتھ کسی دوست کے نام رقعہ لکھے۔ مگر مکتوب الیہ فوراً کاتب کی شخصیت کو پہچان جاتا ہے۔

تحریر کے ذریعہ سے نہ صرف انسان کی شخصیت ہی معلوم کی جا سکتی ہے بلکہ اس سے اس کی عمر، جنس (مذکر یا مونث) اور قومیت بھی ظاہر ہو جاتی ہے، یہاں بھی گویا علم قیافہ اور علم فراست التحریر دونوں میں بہت گہرا تعلق ہے۔ مثلاً از روئے علم قیافہ ہم کسی شخص کے چہرہ میں بعض مخصوص کیفیت دیکھ کر پہچان جاتے ہیں کہ وہ شخص فرانسیسی ہے یا جرمن، روسی ہے یا اطالوی، گویا ہر انسان کے چہرہ پر اسکی قومیت برستی ہے۔ اسیطرح ہر قوم کے افراد کی تحریر میں بھی بعض خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جن سے اسکی قومیت کا اظہار ہو جاتا ہے۔ اگر مختلف ممالک سے موصول شدہ خطوط کا ایک گٹھا سامنے موجود ہو تو معمولی سی عقل و فہم کا آدمی بھی ہر خط کا طرز تحریر دیکھ کر ان خطوط کو الگ الگ کر دیگا اور بآسانی بتا دیگا

کہ راقم الحروف انگریز ہے یا جرمن، روسی ہے یا اطالوی، فرانسیسی ہے یا یونانی۔
الغرض یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کی تحریر اسکی قومیت کا بھی آئینہ ہوتی ہے۔ اور جسطرح مختلف افراد کے چہرہ کے خط و خال دیکھکر یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ انکا تعلق کس خاندان سے ہے اسی طرح حروف تحریر کی نوک پلک دیکھکر انسان کی قومیت کا پتہ چلجاتا ہے۔
تحریروں کی قومی خصوصیات یہ ہیں کہ فرانسیسی قوم کا شخص صاف ستھرا، صفائی پسند، کفایت شعار، محنتی، شان و شوکت اور نفاست و لطافت کا دلدادہ ہوتا ہے۔ یہی خصوصیات اسکی تحریر میں بھی ہوتے ہیں جو عموماً نہایت ہموار اور صاف ہوتی ہے۔ چونکہ تمام وہ قومیں جو فنون لطیفہ کی دلدادہ ہوتی ہیں حسن و صورت سے زیادہ حساس ہوتی ہیں۔ صورت، شکل، وضع، قطع، رنگ، روپ اور لب و لہجہ سے بہت جلد متاثر ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح اطالوی قوم کے آدمی بھی ان خصوصیات سے متصف ہوتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ انکے حروف کا جھکاؤ جانب دست راست بہت زیادہ ہوتا ہے، حروف میں پھندے لمبے اور نمایاں ہوتے ہیں اور حروف کلان خوبصورت اور مرصع ہوتے ہیں امریکہ کے لوگ بحیثیت القوم کاروباری اور عملی آدمی ہیں، انکے فیصلے بھی کاروباری رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ ذہنی طور پر وہ نہایت سرگرم اور بیقرار ہوتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ انکی تحریریں بہت باریک ہوتی ہیں۔ حروف بھی کسی قدر زاویہ دار ہوتے ہیں، فضول اور نمائشی کششیں نہیں ہوتیں۔ تحریریں عموماً صاف، سادہ اور اسقدر واضح ہوتی ہیں کہ بآسانی پڑھی جاسکتی ہیں۔



"اس نمونہ سے حفاظت کی اسپرٹ، ہمدردی، حسیتی چالاکی اور امید ظاہر ہوتی ہے، یہ دستخط ولیعہد تاج برطانیہ کے ہیں"۔
انسان کے کردار و اطوار معلوم کرنے کے لئے علم فراست التحریر کی طرف فی زمانا ہر ملک میں توجہ کیجارہی ہے لیکن جسقدر دلچسپی اس علم سے فرانس کو ہے اسقدر کسی دوسرے ملک کو نہیں ہے۔ فرانس کے سائنسدانوں نے اس علم پر نہایت جوش و خروش کے ساتھ توجہ کی ہے اور یہ قرار دیا ہے کہ علم فراست التحریر علوم قیافہ و نفسیات کے مابین ایک درمیانی کڑی ہے۔
اسی سلسلہ میں ایک نوعمر آدمی پر تجربے کئے گئے۔ پہلے اس شخص پر عمل تنویم کیا گیا۔ بعدازاں اسے یہ یقین دلایا گیا کہ اسکی شخصیت بدل گئی ہے یعنی ایک ذات میں اتنی شخصیتیں تھیں جو پہلے اس سے کہا گیا کہ وہ ایک چالاک و مکار کسان ہے۔ پھر یہ جتایا گیا کہ وہ پیرس کے ڈرامہ "لاالونیں" کا بخیل مسمی ہارپگون ہے اور تیسری بار یہ بتایا گیا کہ وہ ایک بوڑھا آدمی ہے۔ جوں ہی اسکی شخصیت اس نوجوان کو جتائی گئی۔ اسکے چہرے نے فوراً اس شخصیت کی ظاہری خصوصیات قبول کرلیں اور آواز میں بھی ویسا ہی تغیر واقع ہوگیا۔ الغرض اسکا تمام رنگ ڈھنگ بالکل ویسا ہی ہوگیا جیسا وہ خود کو سمجھتا تھا۔ یہی تغیرات اسکے طرز تحریر میں بھی نمایاں ہوگئے۔ یعنی پہلے کسان کا طرز تحریر نمایاں ہوا، اور پھر ایک کنجوس اور بخیل شخص اور پھر ایک ہشتاد سالہ بوڑھے کا۔

کلام (بی۔ اے)

مطالعۂ حدیث تنقید صحیح کی روشنی میں

(۵)

غلامی

(گذشتہ سے پیوستہ)

گذشتہ اشاعت میں مینے دکھلایا تھا کہ قرآن کریم نے دنیا کے تمام مذاہب سے علیحدہ یہ عجیب وغریب اصول پیش کیا تھا کہ مذہب میں کوئی جبر نہیں۔ اور انسان اپنی رائے میں آزاد ہے اور اپنے ذاتی اعتقاد میں سوائے خدا کے کسی کا مسئول اور جواب دہ نہیں۔ پھر مینے دکھلایا تھا کہ حدیث نے کس طرح اس زرین اصول کو پامال کر کے قرآن کا سب سے بڑا انقلاب چھین لیا آج ہم حریت انسان پر بحث کرین گے اور یہ دکھلائین گے کہ قرآن اس اصول مین بھی تمام مذاہب سے جدا نظریہ پیش کرتا ہے مگر حدیث نے اس اصول کی بھی مخالفت کی۔

پہلے یہ سمجھ لو کہ غلامی کیا چیز ہے اگر غلامی سے ایک انسان کا دوسرے انسان کا دست نگر اور خدمت گذار ہونا مراد ہو تو غلامی دنیا کی ایک اقتصادی اور معاشرتی بلکہ فطری ضرورت ہے اور اس سے دنیا کا کوئی زمانہ نہ گذشتہ نہ آئندہ مستغنی ہو سکتا ہے اور نہ کوئی مذہب وشریعت اس مین مداخلت کر سکتی ہے۔ پھر وہ کونسی غلامی ہے جو مذموم ہے اور قرآن کو اسکے لیے عتاق کتابت کی صورتین وتدابیر اختیار کرنا پڑین، تم کہو گے کہ مذموم یوں ہے کہ غلام کی ذات سے ایک تیسرا شخص مالی فائدہ اٹھاتا ہے جس مین خود اس کی رائے کا کوئی دخل نہین، بہت اچھا، لیکن کیا ایسی صورت مین نکاح بھی ایک قسم کی غلامی نہین، ہی وہ بھی انسانی بیع وشرا ہے وہبہ کا دوسرا نام ہے مگر میرا مطلب یہان غلامی کے فلسفہ اور تاریخ سے بحث کرنا نہین ہے، صرف اس قدر بتانا ہے کہ وہ کونسی غلامی ہے جو مذموم قرار دی گئی ہے۔ اس کو مین مختصراً بتانا چاہتا ہون۔

"جورڈس پرڈونس" میں انسان کی تعریف کی گئی ہے کہ انسان فطرتاً ایک لڑاکو جانور ہے اور خود قرآن نے بھی یہی تعریف انسان کی کی ہے "وکان الانسان اکثر شیء جدلا" یعنی تنازع للبقا انسان کی فطرت ہے اور جد وجہد کا نتیجہ دو ہی صورتون مین نکلتا ہے، غالب اور مغلوب، اور یہ غالب کے اختیار مین ہے کہ مغلوب کو معدوم کر دے یا زندہ رہنے دے بس معدوم کرنے کے علاوہ اور جو برتاؤ غالب کا مغلوب کے ساتھ ہوگا وہ سب غلامی کی صورتین ہین۔ جنگ خواہ جائز ہو یا

ناجائز لیکن غلامی کے سدباب کے لیے مذاہب کو کئی مراحل طے کرنے پڑین گے ایک یہ کہ جنگ کو بند کیا جائے دوم مغلوب کو قتل کرنا ممنوع قرار دیا جائے سوم یہ بھی ممنوع ہو کہ مغلوب کو اسیر و زندانی نہ کیا جائے چہارم اس کو حرام ٹھہرایا جائے کہ مغلوب کو اسیر کرنے کے بعد اس سے فدیہ نہ لیا جائے یا اس کو فروخت کرکے روپیہ وصول کیا جائے پنجم خریدارون کو منع کر دیا جائے کہ وہ مغلوبون کو نہ خریدین ششم لوگون کو آمادہ کیا جائے کہ مغلوبون کو خرید کرکے بلا شرط کے آزاد کر دین
ان صورتون پر غور کرو۔ کیا تم کہہ سکتے ہو کہ کسی مذہب نے کسی ایک صورت کو اختیار کیا اور کامیابی حاصل کی اب دیکھو قرآن نے کیا اسکیم پیش کی ہے جو ..... قابل عمل بھی ہے اور اصول فطرت انسانیت کے مخالف بھی نہین،
سب سے پہلے تو قرآن نے ایک مسلم کو دوسرے مسلم کا بھائی تسلیم کیا یعنی ایک مغلوب کے لیے آزادی حاصل کرنے کی سب سے بہتر صورت تو یہ ہے کہ وہ اسلام قبول کرلے اور مسلمانون کے ساتھ دوش بدوش کھڑا ہو جائے۔ اگر وہ اسکو قبول نہین کرتا تو مسلمانون کو یہ حکم ہے کہ وہ فدیہ لے کر یا احسان رکھ کر چھوڑ دین، اگر یہ نہ کرین یا ان کے اختیار مین نہ ہو تو غلامون کو آزاد کرکے اپنے گناہون کا کفارہ دین، اگر مسلمانون کو اس مین بھی تامل ہو تو پھر مغلوب جس وقت اپنی قیمت ادا کردے آزاد ہے اور مسلمانون کا فرض ہے کہ وہ غلامون کی ایسی شرط سے ہرگز انکار نہ کرین۔
اس لیے اس سلسلے مین تین عنوان بحث طلب ہین (۱) حریت مسلم از روے قرآن وحدیث (۲) اعتاق قرآن وحدیث (۳) کتابت قرآن اور حدیث مین

(۱) حریت مسلم (از روے قرآن وحدیث)

سورۂ حجرات مین دو آتیین ہین جو اسلامی اخوت ومساوات کی ضمانت ہین

اول انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم	اور مسلمان آپس مین بھائی ہین اس لیے اپنے بھائیون مین صلح کراؤ
واتقوا اللہ لعلکم ترحمون ط آیت ۱۰	اور اللہ سے ڈرتے رہو شاید تم فلاح پاؤ
دوم یا ایھا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثیٰ	اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا
وجعلنکم شعوبا وقبائل لتعارفوا	اور تمھارے لیے خاندان اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایکدوسرے کو
ان اکرمکم عند اللہ اتقکم	پہچان سکو، خدا کے نزدیک تم مین وہی سب سے زیادہ عزت والا
ان اللہ علیم خبیر۔ آیت ۱۳	ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے اور اللہ علیم وخبیر ہے،

کس کی مجال ہے کہ ان دو آیتون کے ہوتے ہوے ایک مومن کو عبد قرار دے اور دوسرے کو معبود۔ خدا کے نزدیک دونون کے حقوق برابر ہین۔ اور اگر یہ آتیین ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے برابر کرنے مین کافی نہین ہین تو قرآن سے اس کو بھی سمجھو کہ مسلمانون پر جبر کرنیوالے کا کیا حشر ہوگا۔ سورۂ بروج مین ارشاد ہوتا ہے
ان الذین فتنوا المومنین والمومنت ثم لم یتوبوا اور یقیناً جو لوگ مسلمان مردون اور مسلمان عورتون کو مبتلائے تکلیف

فلهم عذاب جهنم ولهم عذاب الحريق (آیت ۱۰)

رکھتے ہین (یا ان پر جبر کرتے ہین یا انکو آزمایش مین ڈالتے ہین) اور اپنے کام سے توبہ نہین کرتے تو ان کے لیے عذاب جہنم ہے اور ان کے لیے جلنے کا عذاب ہے۔

اگر مسلمانون کو غلام بنانا فتنوا المومنین مین ہے تو خیر ورنہ اس آیت سے مسلمانون کو غلام بنانا بدترین گناہ ہے جس کی پاداش مین عذاب جہنم ہے لیکن فرض کرو کہ مسلمانون کے قبضے مین ایک ایسا اسیر ہے جس کا کوئی وارث نہین اور وہ مسلمان ہو جاتا ہے کیا اسکو فوراً خدمت سے علیحدہ کر دیا جاے مین پہلے کہہ چکا ہون کہ خدمت کرنا غلامی نہین ہے اگر ایسے مسلمان کا ذریعہ معاش اپنے مالک کی رفاقت مین ہے اور اس کی خدمت کرنے مین بہترین طریقے سے میسر ہوتا ہے تو اسکا نام غلامی نہ ہوگا اور اس طرح کی خدمت گذاری ناجائز نہین البتہ اسکی حیثیت غلام کی نہ رہے گی۔ وہ تمھارے خاندان کا ایک فرد ہے اور جس طرح تم کو اپنے اولاد کی خانہ آبادی کی فکر کرنی چاہیے ایسے ہی اپنے اس خدمت گار کی چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

وانكحوا الايامى منكم والصالحين من عبادكم وامائكم ان يكونوا فقراء يغنهم الله من فضله والله واسع عليم (نور ع ۴)

اور مجردون کا اپنے لوگون مین سے نکاح کردو اور جو تمھارے خدمت گار مرد و عورت مین مسلمان ہون اگر یہ لوگ محتاج ہونگے تو اللہ اپنے فضل سے انکو غنی کر دیگا اور اللہ واسع وعلیم ہے

یہ واقعہ ہے کہ مسلمانون نے اس حکم کی تعمیل مین بسا اوقات ایسے غلامون کو دامادی کا رتبہ دیا ہے

ابتدائے اسلام مین یہ تو ممکن نہ تھا کہ مسلمانون کی جماعت سے مقابلہ کیا جاے اور مسلمان گرفتار کر کے اسیر و غلام بنائے جائین اس لیے قرآن نے کبھی فرض نہ کیا تھا کہ مسلمان کا مسلمان کی غلامی کرنا ممکن ہے البتہ ایسا تھا کہ مسلمان کفار کے ہاتھون اسیر ہو گئے اور کفار نے اُن کو غلام بنا لیا ایسے لوگون کو چھڑانا مسلمانون کا ایک فرض تھا، چنانچہ قتل اتفاقی کے کفارے مین مسلمان غلام کو آزاد کرنا ضروری کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے،

وما كان لمؤمن ان يقتل مؤمنا الا خطأ ومن قتل مؤمنا خطأ فتحرير رقبة مؤمنة ودية مسلمة الى اهله وتحرير رقبة مؤمنة فمن لم يجد فصيام شهرين متتابعين توبة من الله وكان الله عليما حكيما

(۴ - ۹۲)

اور مومن کے لیے جائز نہین کہ ایک مومن کو قتل کرے مگر غلطی سے اور جو مومن کو غلطی سے قتل کرے تو اسکو چاہیے کہ ایک مومن کی گردن کو (کفارے سے) آزاد کرائے، اور مقتول کے وارثون کو خون بہا دے تا وقتیکہ خون بہا وارثین معاف نہ کردین، اور جو شخص غلطی سے ایسے شخص کو قتل کرے جو مسلمان نہین لیکن ان سے صلح کا قول و قرار ہے تو وہ مقتول کے وارث کو خون بہا دے اور ایک مسلمان اسیر کی گردن کو چھڑائے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو دو ماہ تک لگاتار روزے رکھے بطور توبہ کی خدا کے حضور مین، اور اللہ علیم و حکیم ہے

تم سارے قرآن کو پڑھ جاؤ اور اس کے ساتھ رسول صلعم اور خلفائے راشدین کے زمانے کی تاریخ کو دیکھو تم کوئی ایسا واقعہ نظر نہ آئے گا کہ مسلمان کو مسلمان نے غلام بنایا، اب حدیث کو دیکھو، حدیث نے غلام کے بارے میں مسلم و غیر مسلم میں کوئی تفریق نہیں رکھی نہ صرف یہ بلکہ اس کے ساتھ خدا کو غلاموں کے خلاف مالکوں کا طرفدار بنا دیا ہے جو بھاگے ہوئے غلام کی نماز قبول نہیں کرتا۔ اور غیر آزاد شدہ مسلمانوں نماز کی زیادہ جزا دیتا ہے تاکہ اس طرح ان کے آنسو پونچھ جائیں غلاموں کو کوئی حق نہیں وہ محض جانور ہیں اگر ان کا مالک ان کو قتل کر ڈالے تو یہ اس کا مال ہے اس نے اپنا نقصان کیا صرف تھوڑی گوشمالی کافی ہے۔

(۱) منصور بن عبد الرحمٰن نے شعبی سے سنا اور شعبی نے جریر سے وہ کہتے تھے جو غلام اپنے مالکوں کے پاس سے بھاگ جاوے وہ کافر ہو گیا، جب تک لوٹ کر نہ آئے منصور نے کہا قسم خدا کی حدیث تو مرفوعاً رسول اللہ صلعم سے مروی ہے لیکن مجھے برا معلوم ہوا کہ میں اس طرح اور اس جگہ بصرے میں کیوں (کیونکہ بصرے میں خوارج کا زور تھا) (مسلم)

(مسلم کے حاشیہ میں ہے ابو حاتم نے کہا منصور ضعیف الروایت ہے۔ جریر کی دوسری روایت میں ہے جب غلام بھاگ جاوے تو اس کی نماز قبول نہ ہوگی چونکہ خوارج کا اعتقاد تھا کہ کبائر کا مرتکب کافر ہوتا ہے خوف تھا کہ اس حدیث سے سند پکڑیں گے حالانکہ کفر ناشکری کے معنی بھی آتا ہے) واضح ہو کہ جریر خود معاویہ کے غلام تھے

(۲) ایک شخص نے اپنے غلام کو قصداً مار ڈالا تو آن حضرت نے اس کو سو کوڑے لگائے اور ایک سال کیلئے اسکو جلا وطن کر دیا اور اس کا حصہ مسلمانوں کے حصے سے نکال دیا (ابن ماجہ)

(مگر یہ حدیث ضعیف ہے)

(۳) ابراہیم نے اپنے باپ سے روایت کی کہ ہم پر علی ابن ابی طالب نے خطبہ پڑھا اور فرمایا کہ جو دعویٰ کرے کہ ہمارے پاس کوئی اور چیز ہے سوائے کتاب اللہ کے اور اس صحیفے کے۔ راوی نے کہا ایک صحیفہ لٹکا ہوا تھا انکی تلوار کے میان میں تو اس نے جھوٹ کہا اور اس صحیفے میں اونٹوں کی عمریں اور کچھ زخموں کا بیان تھا اور اس صحیفے میں یہ بھی ہے کہ جناب رسول اللہ صلعم نے فرمایا مدینہ حرم ہے عیر اور ثور کے بیچ میں سو جو شخص کہ کوئی نئی بات نکالے اس جگہ یا جگہ دے کسی نئی بات نکالنے والے کو اس پر لعنت ہے اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں اور سب لوگوں کی نہ قبول کرے گا اللہ تعالے اس کا کوئی فرض نہ سنت۔ اور امان دینا ہر مسلمان کا برابر ہے کہ اختیار کیا جاتا ہے ادنے مسلمان کا۔ اور جس نے اپنے آقاؤں کے سوا کسی دوسرے کا غلام اپنے کو قرار دیا اس پر اللہ تعالیٰ نے اور فرشتوں اور سب لوگوں نے لعنت کی ہے اور نہ قبول کرے گا اللہ تعالے اس سے قیامت کے دن نہ فرض اور نہ سنت، (مسلم)

(سنی مسلمان غالباً اس صحیفے سے کان کھڑے کرین گے کہ یہ کیا بات ہی لہذا ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ صرف شیعون کا قول نہیں ہے کہ قرآن کا بڑا حصہ حضرت علی کے بارے مین نازل ہوا تھا جو گم کر دیا گیا بلکہ یہ عقیدہ حدیث کا بنایا جاتا ہے حدیث مین قرآن کے تحریف تبدیل و تنسیخ کی تقریباً اتنی ہی روایتین ہین جتنی شیعون مین پائی جاتی ہین اسی سلسلہ مین میسرا ایک مضمون مخالفت و معاندت قرآن" بھی ہے جس کا انکار کرنا چاہیے اس صحیفے کا ذکر مسلم کی ایک اور روایت مین اسطرح ہی

ابن صحیفہ نے کہا مینے حضرت علی سے پوچھا کیا تمہارے پاس کوئی ایسا علم ہے جو اور لوگون کے پاس نہین ہے - انھون نے کہا نہین خدا کی قسم ہمارے پاس وہی علم ہے جو اور لوگون کے پاس ہے صرف اتنی بات ہے کہ اللہ تعالی نے اپنے بعض بندون کو قرآن مین ایک سمجھ دی ہے اور چند باتین ہین جو اس کتاب مین ہین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص مجکو بتائین اس کتاب مین دیتون کا بیان تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امر یہ تھا کہ مسلمان کافر کے بدل نہ مارا جا دے"

یہ روایت ابن ماجہ مین بھی ہے -

(۴) ابو موسی اشعری کی روایت ہے رسول اللہ صلعم نے فرمایا تین آدمیون کو دوہرا ثواب ملے گا ایک تو اس شخص کو جو اہل کتاب مین سے ہو ایمان لایا ہو اپنے پیغمبر پر پھر میرا زمانہ پاوے اور مجھ پر بھی ایمان لاوے اور میری پیروی کرے اور مجھ کو سچا جانے تو اس کو دوہرا ثواب ہے اور ایک اس غلام کو جو اللہ کا حق بھی ادا کرے اور اپنے مالک کا بھی اس کو دوہرا ثواب ہے اور ایک اس شخص کو جس کے پاس ایک لونڈی ہو پھر اچھی طرح اس کو کھلاوے اور پلاوے بعد اس کے اچھی طرح تعلیم و تربیت کرے پھر اس کو آزاد کرے اور اس سے نکاح کر لیوے تو اس کو بھی دوہرا ثواب ہے (مسلم ابن ماجہ)

(۵) عبد اللہ ابن عمر کی روایت ہے رسول اللہ صلعم نے فرمایا جب کوئی تم مین سے حاصل کرے جورو یا غلام یا لونڈی تو اس کی پیشانی پکڑے اور کہے اللھم انی اسئلک من خیرھا وخیر ما جبلت علیہ واعوذ بک من شرھا وشر ما جبلت (ابن ماجہ)۔

(اونٹ کی خریداری مین کوہان پکڑ کر یہی دعا کرے)

ابن ماجہ کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عورت سے کئی آدمی نکاح کر سکتے ہین اس کا مطلب سوا اسکے کیا ہو سکتا ہے کہ لونڈیون کو یہ حق بھی نہین دیا گیا کہ وہ باعصمت ہی رہین چنانچہ عبد اللہ بن عمرو کی حدیث ابن ماجہ مین ہے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس عورت کا مالک ایک آدمی نہین ہے وہ آدمی اس کو طلاق نہین دے سکتا" یعنی جس طرح ایک غلام کے کئی مالک ہو سکتے ہین اور ایسے غلام کو آزادی اس وقت مل سکتی ہے جب سب مالک راضی ہون اسی طرح ایک لونڈی کئی آدمیون کی ملکیت ہو سکتی ہے اور ہر شخص اس سے متمتع ہو سکتا ہے -

ایام خلافت مین غیر عرب باوجودیکہ وہ مسلمان ہوگئے تھے عربون کے غلام سمجھے جاتے تھے اور ان کا لقب موالی ہوتا تھا - یہ موالی باوجودیکہ ان کی پوزیشن وہی ہوتی تھی جیسے آریاؤن نے شودرکی کر رکھی ہے

نہایت ذہین ہوتے تھے اور اپنے علم فراست سے بہت بڑے مفتی اور مجتہد ہوے ہین۔ عربون کو یہ بھی پسند نہ تھا۔ چنانچہ یہ حدیث اس ذہنیت کا پتہ دے رہی ہے۔ عبداللہ ابن عمر کا قول ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے بخو بی چلتا رہا کام بنی اسرائیل کا یہان تک کہ پیدا ہوے ان مین مولا لوگ اولاد ان قیدی عورتون کی جو اور قومون سے لوٹ کر آتی تھین مولاؤن نے فتوے دینا شروع کیا اپنی راے سے اور لوگون کو بھی گمراہ کیا۔" (ابن ماجہ)

(٦) رسول اللہ صلعم نے فرمایا جو غلام نیک ہو اس کو دوہرا ثواب ملتا ہے قسم اس کی جس کے ہاتھ مین ابوہریرہ کی جان ہے اگر جہاد نہ ہوتا اور حج اور ماں کے ساتھ سلوک کرتا تو مین یہ خواہش کرتا کہ غلام ہو کر مرون اور ابوہریرہ نے حج نہین کیا اپنی ماں کی خدمت مین رہے جب تک وہ مر نہ لین (مسلم)

حجاج کے زمانے مین قوم زط (جاٹ) اور حبشون نے جو عراق مین تھے غلامی کے خلاف سخت احتجاج کیا اور سخت غدر مچایا ان کا قول تھا کہ مسلمان غلام ہو کر نہین رہ سکتا بہت سخت کشت وخون غلامون اور ان کے مالکون مین ہوا آخر مین قوم زط خارج البلد کی گئی۔ ضرورت تھی کہ ایک ایسی حدیث شایع کی جاے جس سے غلامون کو اپنی حالت پر قانع وخوش رہنے کی تلقین ہو اور ابوہریرہ ایسے پروپگنڈے کے لیے ہر وقت تیار رہتے۔ ایک دوسری روایت مین ہے وہ غلام جو مر جاے اور اپنے مالک کی خدمت اچھی طرح کرتا ہو کیا اچھا ہے وہ"

غرض کہ حدیث اور اس سے زیادہ فقہ نے غلامی کو ایک باقاعدہ اسلامی انسٹیٹیوشن تسلیم کیا ہے اور غلام کے شکنجہ کو بجاے ڈھیلا کرنے کے اور سخت کرنے کے لیے طرح طرح کے اقوال اور اجتہاد اور قیاس اور راے اور روایت سب سے کام لیا گیا ہے۔

ممکن ہے کوئی جوشیلا اہل حدیث یہ سوال کر بیٹھے کہ تمھارے اس قول کی کیا سند ہے کہ مسلمان غلام نہین ہو سکتا ہے کیا قرآن کی آیت موجود نہین ہے جس کے رو سے مسلمانون کا غلام ہونا تسلیم کیا گیا ہے۔

وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَٰتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ
وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ
وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا
وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ
أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ
وَاللَّهُ يَدْعُوا إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ
وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ
(سورۃ البقر ٢٢١)

اور مشرک عورت سے نکاح مت کرو تا وقتیکہ وہ ایمان لا وین ایک مومنہ لونڈی ایک مشرک عورت سے بہتر ہے چاہے مشرک عورت تم کو مرغوب ہو اور مت نکاح کرو مشرک مرد سے جب تک ایمان نہ لا وین اور ایک غلام مومن مشرک سے بہتر ہے خواہ وہ تم کو مرغوب ہو۔ وہ لوگ تم کو جہنم کی طرف بلائینگے اور یہ لوگ جنت اور مغفرت کی طرف اسکی مرضی سے۔ اور اللہ اپنی آیات کو انسانون کے سمجھنے کے لیے صاف صاف بتا دیتا ہے۔

پہلے اس کو سمجھ لو کہ یہ مومن غلام اور لونڈیان کون تھین جس وقت قران نازل ہو رہا تھا عرب مین بردہ فروشی کی رسم جاری تھی ہزارون انسان غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے جب عربون نے اسلام کو قبول کیا توان کے غلامون نے بھی اسلام قبول کیا ایسے غلامون کو فوراً اپنے اپنے مالکون کی خدمت سے آزاد کرانا کسی طرح نہ مالک کے حق مین مفید تھا نہ غلام کے اور ان کی آزادی کی دوسری صورتین تدریجاً پیدا کی گئین اگر ایک دم سے سارے غلام آزاد کر دیے جاتے تو عرب کی سوسائٹی کو سخت صدمہ پہنچتا اور اس سے تبلیغ اسلام کی دقت پڑتی از بسکہ یہ غلام غیر عرب تھے اور عرب کو اپنے نسب وشرافت پر ناز تھا اور کفو کا ان کو بے حد خیال تھا۔ وہ اس کفو اور نسب کی خاطر سے عرب کو خواہ وہ مشرک ہی کیون نہین مومن غلام پر ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ قرآن نے کہا ہے خواہ تم کو عرب کی شرافت اور نجابت پر بٹہ لگانا پڑے مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ تم مشرک کو اپنا داماد خسر بناؤ۔ ان سے بہتر غلام عجمی ہے اگر وہ مسلمان ہے ورنہ اگر عرب کا مسلم عبد مومنۃ اور امۃ مومنۃ سے مراد لی جائے تو قران کو اس کے لکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی وہ تو بدا ہتہ مشرک عرب سے بہتر ہے۔ غرض کہ قرآن کے نزدیک نہ کوئی مسلم غلام بنایا جاسکتا ہے اور نہ فروخت کیا جاسکتا ہے اس سے خدمت لی جاسکتی ہے۔ گر وہ اسی حیثیت سے گویا وہ خاندان کا ایک ہی فرد ہے۔

۴- اعتاق کتاب قرآنؑ حدیث مین

اعتاق قرآن کی کوئی خصوصیت نہین بنی اسرائیل کی شریعت مین بھی اعتاق تھا۔ چنانچہ یہودیون مین غلام ساتوین سال خود بخود آزاد ہو جاتا تھا قرآن کی جو خصوصیت ہے وہ یہ ہے کہ اس نے جنگ کے قیدیون کو غلام بنانے سے منع کیا ہے اور یہ وہ خصوصیت ہے جو اور مذہب مین نہیں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ سورہ محمد مین ارشاد ہوتا ہے۔

فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰۤی اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا	پس جب لڑائی مین کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان کی گردن مارو یہانتک کہ تم ان پر غالب آجاؤ اور اس کے بعد یا تو اسیرونکو احسان رکھکر چھوڑ دو اور یا ان سے فدیہ لیلو یعنی تا اختتام جنگ

اگر یہ قرآن کی آیت ہے اور حسب معمول اس مین کوئی پیچ نہین ہے تو معنی بالکل صاف ہین یعنی اسیرون کو نہ قتل کر سکتے ہو اور نہ فروخت کر سکتے ہو اور نہ اپنا غلام بنا سکتے ہو۔ ان کو رہا کر دو احسان رکھکر یا فدیہ لے کر قیدیون کے لیے اور کوئی صورت نہین ہے پس جہان تک مسلمانون کی جنگ کا تعلق تھا غلامی کا بالکل سد باب قرآن شریف نے کر دیا البتہ اسلام کے باہر جو جنگین تو مون مین جاری تھین اور اس کا نتیجہ غلامون کی خرید و فروخت مین پیدا ہوا تھا اس کے لیے مسلمانون کو ہدایت ہے کہ

۱- غلامون کو آزاد کر دین اور عند اللہ ماجور ہون۔

۲- اپنی بدیون کے کفارے مین غلام کو آزاد کر دین۔

۲۔ غلام سے کتابت کرلین۔

پہلی صورت

۱۔ فك رقبة او اطعام فی یوم ذی مسغبة یتیما ذا مقربة او مسکینا ذا متربة (البلد)

گردن کا غلامی سے چھڑانا یا بھوک کے دن خصوصاً جبکہ وہ اپنا رشتے دار ہو یا محتاج خاک نشین کو کھلانا

۲۔ واتی المال علی حبه ذوی القربی والیتمی والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب (بقرآیت ۱۷۷)

اور اپنے مال کو اس کی رضامندی کیلیے دیتے ہین رشتہ دارون کو یتیمون کو مساکین کو فقرا کو اور قیدیون کو چھڑانے کو

دوسری صورت

۱۔ لایواخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم ولکن یواخذکم بما عقدتم الایمان فکفارته اطعام عشرة مسٰکین من اوسط ما تطعمون اهلیکم او کسوتهم او تحریر رقبه (المائدہ)

تمھاری قسمون مین جو بے پردہ ہین ان پر تو خدا تم سے کچھ مواخذہ نہین کرتا، ہان پکی قسم کے توڑنے پر خدا تم سے مواخذہ کریگا تو اسکا کفارہ دس مسکینون کو متوسط درجے کا کھانا کھلا دینا ہے جیسا تم اپنے اہل وعیال کو کھلایا کرتے ہو یا ایک بردہ کو آزاد کردینا۔

۲ والذین یظاهرون من نسائهم ثم یعودون لما قالوا فتحریر رقبة من قبل ان یتماسا ذلکم توعظون به واللہ بما تعملون خبیر (المجادلہ)

اور جو لوگ اپنی بیویون سے ظہار کرتے ہین پھر لوٹ کر وہی کام کرنا چاہتے ہین جس کو کہہ چکے ہین تو ایک دوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے مرد کو ایک بردہ آزاد کرنا چاہیے تم کو نصیحت کی جاتی ہے اور جو اللہ ہی تم کرتے ہو اللہ کو اس کی سب خبر ہے۔

اس سے کہ خدائے تعالےٰ نے غلام کے آزاد کرنے کو ایک جرم کا کفارہ یعنی جرمانہ قرار دیا ایک ادنا شناس سمجھ سکتا ہے کہ لونڈی غلامون کے بارے مین خدا کو کیا منظور رہے اور وہ سوائے اسکے نہین ہے کہ خدا اپنے بندون مین سے کسی کو قید غلامی مین رکھنا پسند نہین کرتا۔

تیسری صورت

والذین یبتغون الکتاب مما ملکت ایمانکم فکاتبوهم ان علمتم فیهم خیرا واتوهم من مال اللہ الذی اتٰکم به (نور)

اور تمھارے غلامون مین سے جو مکاتبت کے خواہان ہون تو تم ان سے مکاتبت کرلیا کرو بشرطیکہ تم ان مین بہتری کے آثار پاؤ اور مال خدا مین سے جو اس نے تم کو دے رکھا ہے انکو دیتے رہو

قرآن کے الفاظ صاف وصریح ہین یعنی غلام کا حق ہے کہ وہ آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنے مالک کو اپنی قیمت ادا کردے مالک انکار نہین کرسکتا بلکہ اس پر فرض ہے کہ ایسے غلامون کی مالی مدد بھی کرے۔

کیا تم کہہ سکتے ہو کہ قرآن پر عمل کرنے والا غلامی کے قریب بھی جاسکتا ہے مگر افسوس کہ مسلمانون نے قرآن پر عمل کرنا

نبوت سے سو برس کے اندر ہی ترک کر دیا فقیہ اور فریسیون کا زمانہ آیا اور انھون نے قران کے ساری زرین اصول پر پانی پھیر دیا۔ حدیث و فقہ مین غلامی ایک باضابطہ مضمون ہے اور اس مین طرح طرح کے نکات حل کئے گئے ہیں مگر اس حقیقت پر کہ بردہ فروشی جائز ہے یا نہین اس پر ایک لفظ نہین کہا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک عالم اسلام خصوصاً عرب اور حجاز اس لعنت سے سبکدوش نہین ہوا۔ آخری صدی کا عربون کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ افریقہ مین غلامون کو جانورون کی طرح گرفتار کرتے ہین ڈاکے سے یا چوری سے اور جہازون مین بھر کر عرب میں لے آتے ہین اور وہان ان کو بیچ ڈالتے ہین اور یہ عین رسول اللہ صلعم کے مزار اقدس اور کعبہ کے سایہ میں ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ ہماری بدبختی اور کیا ہوسکتی ہے۔ آج جو ہم سے سلطنت چھین گئی ہے تو اس لیے نہین کہ خدا کا فرمودہ ان الارض یرثہا عبادی الصالحین غلط ہے نعوذ باللہ بلکہ صالحین ہمارے حاجی اور نمازی نہین ہین بلکہ وہ قومین ہین جو آج زمین کی وارث ہین۔ جن کی وجہ سے غلامی کی لعنت بند ہوئی ہے۔ مین چند حدیثون پر اکتفا کرون گا جو قلب مسلم کو بریان کرنے کے لیے کافی ہین۔

۱۔ عبداللہ بن عمر نے کہا رسول اللہ صلعم نے فرمایا جو غلام مکاتب کیا جائے سو اوقیہ پر پھر وہ سب ادا کردے مگر ایک اوقیہ اس کے ذمے رہ جائے تو وہ غلام ہی رہے گا۔ (ابن ماجہ)

اپنے پاس سے غلام کو مال دینے کا کیا سوال!

۲۔ اسماء بنت ابی بکر کی روایت ہے مین زبیر کے گھر مین کام کرتی تھی ان کا ایک گھوڑا تھا تو اُس کی بھی خدمت کرتی پھر مجکو ایک لونڈی ملی رسول اللہ صلعم کے پاس قیدی آئے آپ نے مجھ کو بھی ایک لونڈی دی وہ گھوڑے کا سارا کام کرنے لگی اور یہ محنت میرے اوپر سے اس نے اٹھائی۔ پھر میرے پاس ایک آدمی آیا اور کہنے لگا اے ام عبداللہ مین ایک محتاج آدمی ہون میرا یہ ارادہ ہے کہ تمھارے دیوار کے سایے مین دوکان لگاؤن مین نے کہا اگر مین تم کو اجازت دون تو ایسا نہ ہو کہ زبیر خفا ہون، تو ایسا کر جب زبیر موجود ہون تو انکے سامنے مجھ سے کہہ وہ آیا اور کہنے لگا۔ اے ام عبداللہ مین ایک محتاج آدمی ہون مین چاہتا ہون تمھارے سایے مین دوکان کرون۔ مین نے کہا تجھے مدینے بھر مین کوئی اور گھر نہین ملتا۔ سوائے میرے گھر کے۔ زبیر نے کہا اسما تم کو کیا ہوا تم فقیر کو منع کرتی ہو۔ بیچنے سے پھر وہ دوکان کرنے لگا یہان تک کہ اس نے روپیہ کمایا وہ لونڈی مین نے اس کے ہاتھ بیچ ڈالی جس وقت زبیر میرے پاس آئے تو اس کی قیمت کے پیسے میری گود مین تھے۔ زبیر نے کہا پیسے مجھے ہبہ کر دو۔ مین نے کہا مین فدیہ دے چکی ہون (مسلم)

۳۔ رسول اللہ صلعم نے   کے دن ایک لشکر روانہ کیا اور وہ لوگ دشمن سے مقابل ہوے اور انسے لڑے اور غالب آئے اور ان کی عورتین قید کرلائے۔ بعض یارون نے رسول اللہ صلعم کے اُن سے صحبت کرنے کو برا جانا

اس وجہ سے کہ ان کے شوہر مشرک بھی موجود تھے سو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری والمحصنات من النساء الا ما ملکت ایمانکم۔ (مسلم روایت ابوسعید خدری)

نوٹ:۔ یہ آیت سورہ نساء کی ہے اور مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ سورہ جنگ احد کے بعد نازل ہوئی ہے، خود سورہ نساء میں جنگ احد کا ذکر اس طرح ہے کہ اس سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے مگر مین نے اپنی کتاب تجزیۃ القرآن مین دکھلایا ہے کہ یہ سورہ مختلف زمانے کی سورتوں کا مجموعہ ہے یعنی وہ رکوع جس مین تعداد ازدواج کی تحدید ہے وہ تو یقیناً فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی ہے ورنہ رسول اللہ صلعم کا چار سے زائد نکاح کرنا خلاف امر قرآن ہوتا رکوع ۷ مین تیمم کا ذکر ہے اور تیمم کی اجازت ۵ہجری مین ہوئی ہے اسی طرح رکوع ۳ مین زانیہ عورت کے قید کرنیکا ذکر ہے جو سورہ نور کے حکم کے قبل کا حکم ہے رکوع ۲ مین میراث کا حکم ہے وہ بھی تیسری ہجری کا حکم ہے آیت جس کا حوالہ دیا گیا ہے سیاق عبارت سے جنگ احد کے بعد کا حکم ہے اور یہ ہی رائے نولدکی کی ہے تو یہ غلط ہوا کہ اوپر کی آیت جنگ حنین مین نازل ہوئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس آیت مین کہین اسکا اشارہ بھی نہین پایا جاتا کہ جو عورتین جنگ مین گرفتار ہون ان سے بدفعلی مباح ہے کیونکہ اس آیت کے بعد ہی اس کی پوری صراحت اسطرح ہے

ومن لم یستطع منکم طولا ان ینکح المحصنت المومنت فمن ما ملکت ایمانکم من فتیتکم المومنت واللہ اعلم بایمانکم بعضکم من بعض فانکحوھن باذن اھلھن واتوھن اجورھن فریضۃ الخ

یعنی شادی شدہ عورتین جو تمھارے قبضے مین آگئی ہین اگر وہ خوشی سے مسلمان ہو جائین تو وہ ان کے کافر شوہرون کو واپس نہ ہونگی بلکہ ان کا نکاح اپنے شوہرون سے ساقط ہو جائیگا اور مسلمان ان کے وارثون کی اجازت سے ان سے نکاح کر سکتے ہین مگر دیکھو تو قرآن پر کتنا بڑا اتہام اس حدیث نے لگایا ہے

۴۔ جابر کی روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بردے کو بعوض قرض بیچا جس کو اسکا مالک اپنے مرتے وقت آزاد کر گیا تھا۔ (مسلم ابن ماجہ)

دوسری روایت مین ہے کہ ایک شخص نے ہم مین سے ایک غلام کو مُدبّر کیا اور اس کے پاس کچھ دوسرا مال نہ تھا آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کو بیچا، ابن جو بنی عدی مین سے ایک شخص تھا اس نے خریدا اسکے اسناد میں علی بن الحیان ضعیف ہے۔ نووی نے کہا جمہور علما کا قول یہ ہے کہ مدبر بیچا نہ جائیگا اور اسکی بیع جائز نہین اور یہ قول امام ابوحنیفہ اور مالک ابن انس کا بھی ہے۔ شافعی نے جابر کی اسی سند سے مُدبّر کا بیچا جانا جائز ٹھہرایا ہو جبکہ اسکا مالک بالکل محتاج پڑا ہو۔

۵۔ جابر کی روایت ہے، ہم اپنی لونڈیون کو اور ام ولد کو بیچا کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم مین موجود تھے اور ہم کوئی قباحت اس مین نہین پاتے تھے۔ (ابن ماجہ)

۶۔ جابر کی روایت ہے ایک غلام آیا اس نے آنحضرت صلعم سے بیعت کی ہجرت پر اور آپکو معلوم نہ ہوا کہ یہ غلام ہے پھر اس کا مالک آیا اس کو ڈھونڈھتا ہوا آپ نے اس سے فرمایا اس غلام کو میرے ہاتھ بیچ ڈال۔ پھر آپ نے اس غلام کو خرید ا دو کالے غلام دے کر بعد اس کے آپ نے کسی سے بیعت نہ لی جبتک آپ دریافت نہ فرما لیتے کیا وہ غلام ہے

وَعَلیٰ ھٰذَ الْقِیَاسْ (حق گو)

دو نئی کتابین

نقاب اٹھ جانیکے بعد حضرت نیاز فتحپوری کے ان افسانون کا مجموعہ جن مین بتایا گیا ہے کہ ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہین، حضرت نیاز کا مخصوص انداز تحریر اور رندرو قلم ان افسانون مین بدرجہ کمال نظر آتا ہے جا بجا وہ مزاحیہ رنگ جو جناب نیاز کی تحریر کی خصوصیت ہے عجیب لطف دیتا ہے قیمت مع محصول ۸/

لالہ رخ طامس مور کی اس معرکتہ الآرا مثنوی کا ترجمہ نگار کے اول سال اشاعت مین بالاقساط شایع ہو کر جستنی قبولیت حاصل کر چکا ہے وہ کسی سے مخفی نہین ایک تو طامس مور کی نزاکت خیال اور اسپر ملک کے ادیب جلیل جناب لطیف احمد اکبر آبادی کا ترجمہ جتنی بھی تعریف کی جاے کم ہے اس کتاب مین چار افسانے ہین (۱) ابن مقنع (۲) بہشت اور پری (۳) آتش پرستاران فارس (۴) نور محل۔ اور ہر افسانہ اپنی جگہ نزاکت خیال اور شاعرانہ تخیل کا ایک ایسا بے مثل نمونہ ہے کہ مشکل ہی سے اسکی نظیر مل سکتی ہے اور جسکو پڑھ کر انسان پر سکر کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے قیمت مع محصول ۱۲/

نوٹ:۔ دونون کتابین ایک ساتھ طلب کرنے پر مع محصول ۱۲/ مین مل سکتی ہین **مینجر نگار لکھنؤ**

ضرورتِ عقد

ایک ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے سنی المذہب زمیندار کو جس کی عمر تقریبًا چالیس سال و آمدنی دو ہزار روپیہ سالانہ ہے کسی سنی المذہب بیوہ سے جس کی عمر پچیس ۲۵ سال سے کم نہو اور جو دیہات کی زندگی کی عادی ہو رشتہ عقد کی ضرورت ہے۔ خط و کتابت بصیغہ راز رہے گی

ح۔ معرفت ایڈیٹر صاحب نگار لکھنؤ

ایثار

سلیمہ میں بظاہر نہ کوئی حسن و جمال تھا نہ کوئی خاص ادا ایسی جو کسی کو اپنی طرف متوجہ کر سکے لیکن جعفر کی گرویدگی اس کی طرف برابر بڑھتی جاتی تھی اور اس قدر سکون و خاموشی کے ساتھ کہ غریب سلیمہ کو بھی اس کی خبر نہ تھی

سلیمہ اور جعفر دونوں کے خاندان ایک دوسرے سے بالکل علٰحدہ تھے اور جب تک جعفر کے بڑے بھائی احمد کی شادی سلیمہ کی بہن سے نہ ہوئی تھی کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کبھی یہ دونوں خاندان اس طرح باہم مل جائیں گے شادی کے بعد عرصے تک جعفر کو سلیمہ کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ اول تو سلیمہ بورڈنگ میں رہتی تھی اور اگر کبھی تعطیل کے زمانے میں گھر آتی تھی تو قصداً ایسے موقعوں کو بچا جاتی کہ جعفر کا اور اس کا سامنا ہو ——— آنچل کی اوٹ برقع کا نقاب کواڑ کی آڑ، چلمن کا پردہ، یہ وہ تمام ذرائع تھے جن سے سلیمہ اپنے آپ کو چھپانے میں کامیاب ہو جاتی لیکن آنچل کی اوٹ کرتے ہوئے کہنی تک کھلے ہوئے ہاتھوں کا نظر آجانا یا ان دو نازک نخیلی انگلیوں کا جن سے آنچل کی گرفت کی جاتی ہے نگاہوں کے سامنے آجانا یا برقعہ کے اندر ہی چلتے پھرتے اس کے سڈول چھریرے بدن کا ایک مجسمہ کی طرح بے اختیارانہ ذہن میں مرتسم ہو جانا یہ وہ تمام باتیں تھیں جو بغیر سلیمہ کے علم کے جعفر کے دل میں آہستہ آہستہ گھر کرتی جا رہی تھیں اور وہ بعض اوقات بے اختیار ہو جاتا تھا کہ کیونکر وہ اس چیز کو بے نقاب دیکھے جس نے پردے ہی پردے میں اس کی زندگی کا ایک نیا ورق الٹ دیا تھا۔

وہ کبھی کبھی دور سے اس کی آواز سنتا اور بے چین ہو جاتا۔ کیونکہ اس میں وہ ایک خاص نرمی اور لچک محسوس کرتا عجیب تبسم کی موسیقی اس میں پنہاں نظر آتی اور وہ سوچا کرتا کہ اگر سلیمہ نے کبھی اس آواز کے ساتھ اس سے خطاب کیا تو اس کی کیا حالت ہو گی۔ وہ صحن میں یا ادھر سے ادھر گذرتے دور سے اسے چلتا پھرتا دیکھتا تو کلیجہ مسوس کر رہ جاتا کہ ہائے یہ کشیدہ قامتی یہ سانچے میں ڈھلی ہوئی رعنائی یہ ہنس کی سی لانبی گردن جو باوجود چھپائے جانے کے ہر ہر قدم پر کھلی پڑتی ہے کیا واقعی میں اس کا مطالعہ کبھی قریب سے نہیں کر سکتا اور اگر کوئی صورت ایسی پیدا ہو گئی تو میں کس طرح اپنے جسم کی تھرتھری کو چھپا سکوں گا

ادھر جعفر کی یہ کیفیت ادھر سلیمہ کا یہ حال تھا کہ یوں چاہے وہ کتنی ہی آزادی کے ساتھ گفتگو کر رہی ہو مگر جوں ہی جعفر آیا اور وہ خاموش ہوئی۔ جہاں اس نے جعفر کے آنے کی آہٹ سنی اور اس نے کسی نہ کسی صورت سے اپنے آپ کو چھپایا، اگر بیٹھی ہوئی کرسی پر کتاب دیکھ رہی ہے تو کتاب کو چہرے کے سامنے کر لیا۔ کتاب نہیں تو آنچل ہی کی آڑ کر لی اور پھر فوراً اٹھ کر اندر چلی گئی۔

جعفر رات رات بھر آنکھ بند کیے اس صورت سے کاٹ دیتا کہ سلیمہ اس کے سامنے کھڑی ہے اور یہ اسس کو غور سے دیکھ رہا ہے وہ بیٹھی ہوئی ہنس رہی ہے اور یہ اس کے جسم کی جنبش کا مطالعہ کر رہا ہے وہ باتین کر رہی ہے اور یہ اس کی حلاوت سے لطف اٹھا رہا ہے ـــــ اس کی یہ کیفیت سلیمہ کی ادائے احتراز کی نسبت سے برابر بڑھتی جارہی تھی اور کبھی کبھی وہ اس اندیشے سے کانپ اٹھتا تھا کہ کہین سلیمہ کو اس سے نفرت تو نہین ہے۔

سلیمہ کی عمر اس وقت اٹھارہ سال کی تھی اور زنانہ مشن کالج مین ایف۔ اے کی تعلیم حاصل کر رہی تھی بورڈنگ ہو مین رہتی تھی اور ایام تعطیل بسر کرنے اپنی بہن کے پاس آجاتی کیونکہ والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور سوائے بہن کے کوئی گھر ایسا نہ تھا جہان وہ زمانۂ فرصت بسر کرتی۔ یہی وجہ تھی کہ سال مین کئی بار جعفر کو اس کی معیت کا موقعہ ملتا اور ہر بار سلیمہ پر دستے ہائے پردے مین اس کی آگ کو اور زیادہ بھڑکا جاتی۔

ہر چند یہ بات جعفر کے کانون مین پڑ چکی تھی کہ سلیمہ حسن وجمال سے عاری ہے اس کے نقشہ مین کوئی بات دلکشی کی نہین اور اس حد تک تو خود اس کا بھی مشاہدہ تھا کہ اس کا رنگ کافی سے زیادہ سانولا تھا لیکن بااین ہمہ جعفر کا تعلق خاطر برابر بڑھتا ہی جارہا تھا اور ایک بے جانی بوجھی عالم خیال کی دیوی کی طرح اس کی پرستش کیا کرتا تھا،

ایک زمانہ اسی حال مین گذر گیا نہ جعفر کو کوئی موقعہ اس سے گفتگو کرنے کا ملا اور نہ وہ کبھی اس کے سامنے بیحجاب ہوئی دسمبر کا مہینہ تھا اور کرسمس کی تعطیلون مین سلیمہ کو آئے ہوئے ابھی صرف دو دن ہوئے تھے کہ شاہدہ اسکی بہن دفعۃً تپ مین مبتلا ہوئی اور ۴۸ گھنٹے کے اندر اس کی حالت اس قدر ردی ہوگئی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ اس اضطراب اور تیمارداری کے سلسلہ مین اس طرف سلیمہ کو یہ ہوش نہ تھا کہ جعفر کب آتا ہے اور کس حال مین اسے دیکھ جاتا ہے اور ادھر جعفر کو موقعہ مل گیا کہ وہ اسے قریب سے دیکھے اور بے حجاب دیکھے کیونکہ یہ دونون تیمارداری مین مصروف تھے اور اگر شاہد سلیمہ کی بہن تھی تو جعفر کی بھاوج تھی اسلیے کسی کو یہ کہنے کا موقع تھا کہ ان دونون کا اجتماع مناسب نہین۔

جعفر اپنی بھاوج کو دوا پلا رہا ہے اور سلیمہ پان لیے کھڑی ہے سلیمہ اپنی بہن کو سہارا دے کر اٹھا رہی ہے اور جعفر سامنے پانی کا گلاس لیے ہوئے موجود ہے۔ وہ سر داب رہا ہے اور یہ تلوے سہلا رہی ہے یہ جسم کا پسینہ پوچھ رہی ہے اور وہ کلائی پر ہاتھ رکھے نبض دیکھ رہا ہے، الغرض شاہدہ کی بیماری مین سلیمہ کا پردہ ٹوٹ کر رہا گو حجاب واحتراز اپنی حالت پر قائم تھا اول تو جعفر مین یہ جرأت نہ تھی کہ وہ اسے مخاطب کرتا لیکن اگر کبھی مجبوراً یا بے اختیارانہ طور پر تیمارداری کی ضرورت سے کوئی بات کرتا بھی تو ادھر سے جواب نہ ملتا اور یہ اپنی جگہ شرمندہ ہو کر رہجاتا۔

اس سے سلیمہ کی صورت کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا تھا وہ اسے بالکل غلط نظر آتا تھا۔ یقیناً اس کا رنگ سانولا تھا۔ لیکن اس کے خد وخال، چشم وابرو مین خاص قسم کی کشش پائی جاتی تھی اور رعنائی تو اس کے ہر ہر عضو اور ایک ایک ادا سے اسطرح ظاہر ہوتی تھی گویا اس کی ہستی کا خمیر ہی اس سے ہوا ہے، اگر کبھی دونون کی نگاہون کا اتفاقیہ تصادم ہوجاتا تو سلیمہ فوراً

نگاہیں نیچی کرلیتی۔ اور گردن موڑ کر وہ کسی اور ایسے شغلہ میں لگ جاتی کہ یہ روگردانی بالکل فطری اور ناگزیر معلوم ہوتی۔
ایک ہفتہ مسلسل شاہدہ کی علالت کو ہو گیا اور روزانہ اس کی حالت ابتر ہونے لگی۔ سلیمہ حد درجہ ملول رہتی اور واقعہ یہ ہے کہ اس حزن و ملال نے اس کی دلکشی میں اور اضافہ کر دیا تھا جو نہایت شدت کے ساتھ جعفر کو بے تاب بنائے ہوئے تھا۔ آخرکار وہ وقت آیا جس کے خیال سے ہر شخص کانپ رہا تھا اور شاہدہ چھ ماہ کی ایک بچی چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ سب سے آخری الفاظ جو اس کے منہ سے نکلے یہ تھے کہ ـــــ سلیمہ میری بچی اب تمہارے سپرد ہے۔

گذشتہ واقعہ کو دو ماہ کا زمانہ گذر گیا ہے اور سلیمہ بورڈنگ چھوڑ کر جعفر ہی کے مکان میں آگئی ہے اور اپنے اوقات کا اکثر حصہ شاہدہ کی معصوم بچی کی پرورش میں صرف کر رہی ہے ہر چند ایک دایہ ملازم رکھ لی گئی ہے جو سلیمہ کے اوقات کالج میں بچی کی نگرانی کرتی ہے۔ لیکن سلیمہ پوری طرح مطمئن نہیں ہے اور وہ حیران ہے کہ کیونکر اپنا سارا وقت اس پر صرف کر سکے۔ لیکن سب سے زیادہ خیال اسے یہ ہے کہ جعفر کے گھر میں یوں رہنا اور اپنے مصارف کا بار اس پر ڈالنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دنیا اور اس کی رائے زنی کی تو خیر اسے چنداں پرواہ نہ تھی لیکن خود اس کی غیور طبیعت اسکو گوارا نہ کرتی تھی کہ آخر کب تک یہ صورت یونہی قائم رہ سکتی ہے جب کہ بچی کی پرورش کے لیے مستقلاً برسوں کا زمانہ درکار تھا ـــــ ایک دن وہ انھیں معاملات پر غور کر رہی تھی کہ آخرکار اس نے آخری فیصلہ کرکے جعفر کو خط لکھا:۔

"بھائی صاحب ـ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو اس ناگہانی جدائی کا سخت صدمہ ہوا ہے اور یقیناً آپ جتنا بھی سوگ کریں کم ہے لیکن اب غالباً اس سے زیادہ اہم سوال اس امانت کی حفاظت کا ہے جو مرحومہ سپرد کر گئی ہیں۔
اس میں شک نہیں کہ آپ اپنی ساری کوشش بچی کی پرورش کے لیے کر رہے ہیں۔ لیکن جہاں تک اولاد کی ابتدائی پرورش و تربیت کا تعلق ہے مرد بڑی حد تک مجبور ہے اور اس کے ایسے ہاتھوں کی ضرورت ہے جو نسبتاً زیادہ نرم ہوں میں گذشتہ دو ماہ میں اپنی ساری کوشش صرف کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ شاید یہ فرض مجھ سے پوری طرح ادا نہو کیونکہ اول تو میرے وقت کا کافی حصہ تعلیم میں بسر ہو جاتا ہے اور علاوہ اس کے یوں بھی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میرا مستقلاً آپ کے یہاں قیام کرنا اب کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بہرحال اب زیادہ انتظار مناسب نہیں اور میں آپکو مشورہ دونگی کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس اجڑے ہوئے گھر کو آباد کیجیے اور میرے ضمیر پر جو غیر معمولی بار ہے ہلکا کرکے ممنون فرمایئے

سلیمہ

یہ خط لکھ کر وہ تو کالج چلی گئی اور ادھر احمد اس خط کو پڑھ کر عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا اس نے خیال کیا کہ سلیمہ کا مقصود اس سے غالباً خود اپنے آپ کو پیش کرنا ہے اور یقیناً ایک بھانجی کی پرورش کے لیے خالہ سے زیادہ موزوں ہستی اور کون ہو سکتی ہے لیکن وہ سلیمہ کے ساتھ نکاح کرنے پر مشکل ہی سے اپنے آپ کو آمادہ پاتا تھا کیونکہ اسے کوئی لگاؤ اسکی ساتھ

نہ تھا اور وہ ڈرتا تھا کہ مبادا اس ازدواج کا انجام اچھا نہ ہو اور امن و سکون کی تلاش میں اور زیادہ اضطراب بڑھ جائے
وہ دیر تک سوچتا رہا اور اپنے بھائی جعفر کو بلا کر سلیمہ کا خط دیا اور بولا کیوں جعفر تمھاری کیا رائے ہے
اس خط کو دیکھ کر جعفر کی جو کیفیت ہوئی اس کا اندازہ مشکل ہے۔ اس نے ایسا محسوس کیا گویا گرم لوہے سے کسی نے اس کے قلب کو داغ دیا ہے اور آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹا کر کوئی نہایت ہی مہیب منظر پیش نظر کر دیا ہے ——— وہ خط واپس دے کر وہاں سے اٹھا گویا اس جذبہ کے ساتھ کہ جا کر اس کی سہری سے سر ٹکرا کر مر جائے جس پر سلیمہ رات کو سوتی ہے۔ احمد نے اس کو روک کر دریافت کیا کیوں تم نے اپنی رائے نہیں بتائی ———
اس نے کہا کہ میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ لیکن کیا آپ کو یقین ہے کہ سلیمہ نے اپنے ہی آپ کو پیش کرنا چاہا ہے

احمد "یقیناً، کیا تمھیں اس سے اختلاف ہے"

جعفر "ممکن ہے ایسا ہی ہو مگر ہاں آپ نے تو ہمیشہ یہی کہا ہے کہ وہ صورت شکل کے لحاظ سے سارے خاندان سے اتری ہوئی ہے پھر آپ اس تعلق کو کس طرح گوارا کریں گے"

احمد یہ سچ ہے کہ مجھے سلیمہ سے کوئی رغبت نہیں لیکن اب تو بڑا سوال بچی کی پرورش کا ہے اور ظاہر ہے کہ سلیمہ سے بہتر اس خدمت کو کون انجام دے سکتا ہے

جعفر یہ سنکر بغیر کوئی جواب دیے ہوئے احمد کو اپنی جگہ خیالات میں غرق چھوڑ کر وہاں سے ہٹ گیا۔

سلیمہ کا یہ معمول تھا کہ زیادہ سے زیادہ پانچ بجے شام تک گھر آجاتی اور دیر ہوجائے نہیں آکر رہتی لیکن آج اس کو غیر معمولی دیر ہو گئی ہے۔ احمد اور جعفر دونوں انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں لیکن بالکل خاموش۔
اس وقت احمد اور جعفر دونوں کے سامنے سلیمہ کی تصویر ہے لیکن احمد اس میں محاسن کی جستجو کر رہا ہے تاکہ وہ اسے قبول کرنے کے لیے دل کو رضامند کر سکے اور جعفر کوشش کر کے اس کی برائیاں ڈھونڈھ رہا ہے کہ کسی طرح دل اس سے متنفر ہو جائے

جب شام کو ۶ بجے تک سلیمہ نہ آئی تو احمد سمجھ گیا کہ وہ غالباً اب نہ آئے گی جب تک اس خط کا جواب نہ پہنچ جائیگا اور وہ اسی خیال میں محو تھا کہ اندر سے بچی کے رونے چیخنے کی آواز آئی اور تھوڑی دیر کے لیے وہ اپنے تمام مصالح اور رجحانات قلب و دماغ کو بھول گیا۔ اس نے اسی وقت سلیمہ کو خط لکھا :۔

آپ کا خط ملا اور میں بھی غور کرنے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا کہ جلد سے جلد اس گھر کی ملکہ کسی کو بنا دینا ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ آپ سے بہتر اس خدمت کو اور کون انجام دے سکتا ہے۔ تاریخ و وقت کی تعیین بھی اب آپ ہی کے سپرد ہے جس طرح میں اور میرا سب کچھ ——— آج آپ اس وقت تک نہیں آئیں حالانکہ بچیہ دیر سے رو رہی ہے اور کسی طرح خاموش نہیں ہوتی،

سلیمہ کے نہ آنے کا سبب صرف یہ تھا کہ شام کو کالج میں کوئی جلسہ ہونے والا تھا اور اس میں اس کی شرکت ضروری تھی وہ فارغ ہونے کے بعد واپس جانا ہی چاہتی تھی کہ احمد کا یہ خط اسے ملا اور دیکھتے ہی وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ جس وقت اس نے احمد کو خط لکھا تھا اس کے ذہن میں بھی یہ بات نہ تھی کہ معاملہ یہ صورت اختیار کرلے گا، اس نے نہایت ہی سادگی سے اپنے کسی ذاتی جذبہ کو شامل کیے ہوئے بغیر مشورہ احمد کو دیا تھا اور اب وہ اس خیال سے عرق عرق ہوئی جارہی تھی کہ اس کی تحریر کو خود اس کی خواہش سمجھا گیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ احمد اپنے دل میں اس کو کس قدر بے باک سمجھتا ہوگا اور اس کا یہ فعل کس قدر نسوانی غیرت و شرم کے خلاف خیال کیا گیا ہوگا۔ جس وقت اس نے اپنی تحریر کے الفاظ پر غور کیا تو وہ سمجھی کہ احمد کو واقعی یہی نتیجہ اس سے نکالنا چاہیے تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کیوں اس پر راضی ہوگیا۔ کیا اس لیے کہ مجھ سے اس کو محبت ہے نہیں یہ تو ممکن نہیں غالباً صرف زکیہ کے خیال سے یقیناً یہ وجہ کافی ہے کہ وہ بغیر محبت کیے ہوئے بھی مجھے گوارا کرسکے ـــــ مگر سوال یہ ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے ـــــ کیا نکاح کا تعلق صرف حبت جنسی سے ہے اور اس میں کوئی انسانی ہمدردی شامل نہیں۔ اگر یہ سوسائٹی کا کوئی قانون ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی بنیاد انسانیت و نظام تمدن کے علاوہ کسی ایسے جذبہ پر قائم کیجائے جو بالکل عارضی چیز ہے۔ ہر چند احمد سے مجھے محبت نہیں لیکن ہمدردی تو ہے پھر ممکن ہے کہ وہ بھی مجھ سے ہمدردی رکھتا ہو اور کیا نکاح کے لیے اس سے زیادہ کسی اور چیز کی ضرورت ہے ـــ پھر اس کے علاوہ یہاں تو سوال ایک اور معصوم جان کا بھی ہے جس کی حفاظت میرے سپرد کی گئی ہے۔ یقیناً مجھ سے زیادہ شفقت اور کون اس پر صرف کرسکتا ہے بلکہ اگر میرے علاوہ کسی اور کو یہ خدمت سپرد کی گئی تو اندیشہ ہے کہ وہ اس کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آئے اُسے کیا غرض ہے کہ اس سے محبت کرے

سلیمہ نے آخر کو جواب میں لکھدیا کہ

"گو میرے پہلے خط کا یہ منشا نہ تھا لیکن اب غور کرنے کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ زکیہ کو کسی اور کی آغوش میں سونپنا مناسب نہیں ہے"

سلیمہ کو احمد کے عقد میں آئے ہوئے کئی مہینے گذر چکے ہیں اور دونوں امن و سکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں گو شوق و ولولہ کی نہیں ـــــ سلیمہ نے اپنی تعلیم کا سلسلہ ختم کرکے زکیہ کی پرورش کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے لیا ہے اور احمد بھی اس طرف سے مطمئن ہو کر گھر سے باہر پوری داد عیش دے رہا ہے وہ اگر کبھی رات رات بھر نہیں آتا تو سلیمہ کو اس سے شکایت نہیں ہوتی اور اگر کبھی دن دن بھر گھر ہی میں گذار دیتا ہے تو شکریہ ادا نہیں کرتی۔ اسکی خانگی زندگی بالکل مشین کی سی زندگی ہے جس کو ادائے فرض کے علاوہ کسی اور چیز سے واسطہ نہیں

جعفر شادی کے دوسرے ہی دن اپنے بھائی کے مکان سے چلا گیا تھا۔ جب وہ جانے لگا تو سلیمہ نے اُسے رُوکا

اور غالباً اس کی زندگی کا یہ پہلا واقعہ تھا سلیمہ نے آنکھ سے آنکھ ملا کر اس سے گفتگو کی مگر چونکہ صدمہ غیر معمولی تھا اس لیے وہ صرف یہ کہہ کر خاموش ہو گیا کہ "اب آپ کیوں رہ رہی ہیں" سلیمہ نے لفظ آپ پر غور کیا نہ اس کی برہمی کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کی بلکہ جب وہ جانے پر آمادہ ہی ہو گیا تو اس نے اس کا اسباب باندھنے میں مدد دی اور چلتے وقت "خدا حافظ" کہکر پھر اسی طرح اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئی گویا کہ جعفر کبھی یہاں رہتا ہی نہ تھا اور اس کا چلا جانا کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا جعفر چلتے وقت احمد کو ایک خط کے ذریعے سے اپنی تمام داستان عشق و محبت سنا گیا تھا لیکن نہ احمد نے اس کا ذکر کبھی سلیمہ سے کیا اور نہ سلیمہ نے اس سے دریافت کیا کہ جعفر کی برہمی کا کیا سبب تھا۔

جب ایک ماہ کے بعد جعفر کا خط سلیمہ کے نام آیا اور اس میں اس نے اپنی تمام داستان محبت دہرا کر اپنے چلے آنیکے اسباب ظاہر کیے تو سلیمہ کو سب سے پہلی مرتبہ تمام واقعات کا علم ہوا۔ خط پڑھ کر پہلے تو وہ دیر تک دل ہی دل میں ہنستی رہی اور پھر اس خیال سے ملول سی ہو گئی کہ جعفر کو محض اس کی وجہ سے خانمان برباد ہونا پڑا اور رفتہ رفتہ یہ ملال اس کا اسقدر بڑھا کہ جب احمد شام کو واپس آیا تو اس نے جعفر کا خط اس کے سامنے رکھ دیا اور بولی کہ "بتائیے میں کیا کر سکتی ہوں کیا کوئی صورت نہیں کہ آپ جعفر کو واپس بلالیں مجھے سخت تکلیف ہے کہ میری وجہ سے ان کو یہ مصیبت برداشت کرنا پڑ رہی ہے"

احمد چونکہ سلیمہ سے واقعی کوئی محبت نہ تھی جعفر کی اس تحریر کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے ہنسی ہنسی میں نہایت ہی بے تعلقانہ طریقے سے کہہ دیا کہ یوں جعفر کو بلانے سے کیا فائدہ جب تک آپ نکاح پر آمادہ نہ ہوں ——— سلیمہ یہ سن کر خاموشی سے اٹھ گئی لیکن اس کو اب پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ احمد کو اس کے ساتھ صرف بے تعلقی ہی نہیں ہے بلکہ شاید نفرت بھی ہو اور وہ ایک عجیب قسم کی وحشت محسوس کرنے لگی ——— اس نے جعفر کو جواب میں لکھ دیا۔

مجھے سخت افسوس ہے کہ میں آپ کی تمام مشکلات کا باعث ہوئی لیکن اطمینان صرف اس قدر ہے کہ میرا ضمیر گنہگار نہیں میں یقین دلاتی ہوں کہ آپ کی تمام وہ آرزوئیں مجھے نہایت عزیز ہیں جنھیں افسوس ہے کہ میں پورا نہیں کر سکتی ——— کیا آپ کبھی کبھی اپنی خیریت سے آگاہ کرتے رہیں گے ———

اس واقعے کے بعد سے سلیمہ کی زندگی میں ایک ایسا داغ شامل ہو گیا تھا کہ باوجود ضبط کے بھی کبھی کبھی اس کا تاثر ظاہر ہو ہی جاتا تھا۔ ہفتوں ہو جاتے تھے کہ احمد سے گفتگو کرنے کا کوئی موقعہ نہ ملتا تھا اور اگر کبھی کوئی ضرورت بھی اس کی پیدا ہوتی تو قصداً بچا جاتی۔ الغرض دونوں کی بے تعلقی بڑی حد تک بڑھ گئی تھی اور ایک خاموش قسم کی سوگواری اس پر طاری ہو گئی تھی۔

ایک ایک دن کرکے پورا سال گذر گیا ہے اور گرما کی شدت سے گھبرا کر احمد پہاڑ پر جانے کی تیاریاں کر رہا ہے کہ

دفعتہً زکیہ پر اسہال کا دورہ پڑتا ہے اور شام ہونے سے قبل وہ ہیضے کی صورت اختیار کر کے اسے بھی ماں کے پہلو مین لے جا کر ہمیشہ کے لیے سلا دیتا ہے۔

اس اچانک حادثے نے سلیمہ پر جو اثر کیا اس کا ذکر فضول ہے کیونکہ زکیہ سے وہ حد درجہ مانوس تھی اور صرف اسکی وجہ اپنی زندگی کے ایام تلخ بسر کر رہی تھی احمد جس کو اب زکیہ سے بھی زیادہ تعلق باقی نہ رہا تھا بظاہر ملول معلوم ہوتا تھا۔ لیکن بباطن وہ خوش تھا کہ اچھا ہوا یہ زنجیر بھی کٹ گئی اور اب سلیمہ کو علٰحدہ کر دینے کے لیے کوئی چیز مانع نہین ہوسکتی دوسرے ہی دن وہ میسوری چلا گیا اور چلتے وقت سلیمہ سے ظاہری تصنع کے طور پر بھی یہ نہین پوچھا کہ "تم چلوگی یا نہین"

یہ آخری لیکن نہایت ہی سخت ضرب تھی جو احمد کی طرف سے اس کو پہنچی۔ اس نے ایک ہفتے تک تو کسی نہ کسی طرح اس سنسان گھر مین بسر کر دیا لیکن جب یہ زندگی اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی تو اس نے خادم کو جواب دے کر مکان مین قفل ڈالا۔ کنجی ایک لفافے مین رکھ کر اختر کے نام رجسٹری کر دی اور خود پھر کالج مین داخل ہو کر بورڈنگ مین رہنے لگی۔ اس کے چوتھے دن سلیمہ کے نام احمد کا خط آیا کہ اس نے دوسری شادی کر لی ہے اور اب وہ بھی آزاد ہو

سلیمہ کو دوبارہ کالج مین داخل ہوئے دو سال کا زمانہ گزر گیا ہے بی اے کے امتحان کا زمانہ قریب ہے اور وہ پوری کوشش کے ساتھ مطالعہ مین مصروف ہے

ایک دن شام کو ٹینس کھیلنے کے بعد بیٹھی ہوئی اپنے کمرے مین کپڑے بدل رہی تھی کہ جعفر کا خط اسے ملا۔ لکھا تھا

> مین نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اس آگ کو دبائے رکھون جس سے تنہا جلتے رہنا بھی لطف سے خالی نہین لیکن اس مین کامیاب نہ ہوا اب سے دو سال قبل جب آپ نے بالکل آزاد ہو کر پھر اسی زندگی کو شروع کیا جس نے مجھے تباہ کیا تھا تو پھر میرے دل مین ولولہ پیدا ہوا کہ کم از کم ایک بار اور آپ کو دیکھ لون لیکن مین نے ضبط کیا اور خدا ہی بہتر جاننے والا ہے کہ اس دو سال کے اندر مجھ پر کیسی کیسی نازک ساعتین آئین اور کس کس طرح مین نے ان کا خاموشی سے مقابلہ کر کے خود اپنے آپ کو ہلاک کرنا مناسب سمجھا بجائے اس کے کہ آپ کو آگاہ کر کے آپ کی خوشگوار تعلیمی زندگی کو منغص کرتا لیکن اب کہ مصائب نے مجھے اور میری تمناؤن کو بالکل پامال کر دیا ہے، شاید غیر مناسب نہین کہ آپ سے خطاب کرون اور ایک امر خاص مین آپ سے دوستانہ مشورہ طلب کرون
>
> آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ چند ماہ سے مین بنارس لیبوریٹری مین کام کر رہا تھا اور شاد و ناشاد جی رہا تھا۔ پرسون دفعتاً ایک حادثہ کی وجہ سے جسکا ذمہ دار صرف مین ہون

میری دونوں آنکھوں کو سخت صدمہ پہنچا اور ۲۴ گھنٹے کے اندر بینائی بالکل جاتی رہی ——— احمد نے عرصے سے خط وکتابت بند کر دی ہے لیکن میں نے انھیں تار دیا نتیجہ وہی نکلا جو میں جانتا تھا آپ کو تار اس لیے نہیں دیا کہ تفصیلی گفتگو کی ضرورت تھی بہر حال اب میں اپنے تمام گزشتہ خیالات سے بالکل تائب ہو کر آپ کو یہ اطلاع دے رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ جو خطائیں مجھ سے صاحب بصارت ہونے کی حالت میں سرزد ہوئی ہیں ان کو آپ میری بے بصری کے زمانہ میں فراموش کر دیں گی۔ کیونکہ اب تو مجھے یہ حق بھی حاصل نہیں کہ عہد ناکامی کی یاد بھی دل میں باقی رہنے دوں چہ جائیکہ کوئی امید قائم کرنا۔

ایک دوست کے مکان پر عارضی طور سے مقیم ہوں اور انھیں سے یہ خط لکھوا رہا ہوں خدا کرے آپ کو مل جائے اور آپ اسے پڑھ لیں کہ اب یہی میری انتہائی آرزو ہے۔

آپ کا گنہگار
جعفر

سلیمہ نے یہ خط پڑھنے کو تو پڑھ لیا لیکن ایک ایسی کیفیت کے ساتھ جو اس سے قبل کبھی اس پر طاری نہیں ہوئی تھی وہ ایسا محسوس کر رہی تھی کہ اس کے دل میں جذبۂ ہمدردی کے علاوہ کوئی اور نئی کیفیت کام کر رہی ہے۔ اور وہ بے اختیار رو دینا چاہتی ہے۔ اُس نے پھر اس خط کو پڑھا اور رکھ دیا پھر اٹھایا اور پڑھا۔ وہ حیران تھی کہ اب کیا کرے اور کس طرح اس اضطراب کو دور کر سکے جو ہر لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ ایسا محسوس کر رہی تھی کہ اس نے کوئی شدید جرم جعفر کے خلاف کیا ہے اور بیتاب ہے کہ کس طرح اس کی تلافی کر سکے ——— اس نے ٹائم ٹیبل اٹھا کر دیکھا اور پھر گھڑی پر نگاہ ڈال کر فوراً ہی ایک سوٹ کیس اور ہینڈ بیگ لے کر اسٹیشن چل دی

سلیمہ کو بنارس آئے ہوئے دو دن ہو گئے ہیں اور اس دوران میں مشکل ہی سے شاید اسنے چند گھنٹوں کیلیے آرام کیا ہو جس وقت وہ یہاں پہنچی تو جعفر شدید تپ میں مبتلا تھا اور اسے مطلق ہوش نہ تھا کہ کون آتا ہے اور کون جاتا ہے ڈاکٹر نے ممانعت کر دی تھی کہ کسی قسم کا دماغی ہیجان یا اضطراب اس میں پیدا نہ کیا جائے ورنہ سرسام ہو جانے کا اندیشہ ہے اس لیے وہ سلیمہ کی آمد سے بالکل بے خبر ہو گیا اور جب تیسرے دن تپ میں کچھ کمی ہوئی تو سب سے پہلے اس نے اپنے چاروں طرف ٹٹولا اور یہ محسوس کر کے کہ کمرہ خالی ہے نہایت ہی مایوسی کے ساتھ آپ ہی آپ کہنے لگا کہ "آہ، کون مصیبت میں ساتھ دیتا ہے" اور یہ کہکر آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ سلیمہ جو ان تمام کیفیات کا مطالعہ کر رہی تھی بے قابو ہو گئی

اور پلنگ پر بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ مین لے کر بولی کہ "آپ کیون گھبراتے ہین مین آگئی ہون" جعفر جس نے کبھی یہ توقع قائم نہ کی تھی کہ سلیمہ یون آمنے سامنے ہو کر اس سے گفتگو کرے گی اس کے ہاتھ مین اپنا ہاتھ دیکھ کر کانپنے لگا اور پلنگ سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن سلیمہ نے اس کو اس کی اجازت نہ دی اور بولی کہ "جعفر اب تعظیم و احترام کا زمانہ گذر گیا - مین تمھاری مجرم ہون اور ایک مجرم ہی کی حیثیت سے حاضر ہوئی ہون تاکہ جو سزا میرے لیے تجویز کیجائے اس کو خوشی سے برداشت کرون"

جعفر کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا ہاتھ پانون کی سکت جاتی رہی تھی اور چہرہ کبھی زرد ہو جاتا تھا اور کبھی سُرخ ——— تھوڑی دیر کے بعد بولا "سلیمہ خدا کے لیے مجھے دھوکا نہ دو مین اس سے قبل بھی بارہا اسی طرح کے الفاظ ہمدردی تمھاری طرف سے خواب مین سن چکا ہون اور مین نے ہمیشہ ہر ایسے خیال کو واقعہ سمجھ کر آنکھ کھولی تو سوا ے دل کی دھڑکن کے اپنے پاس تمھاری کوئی نشانی نہ پائی - پھر جب آنکھین کھلین تو خواب و بیداری کی فرق کے ساتھ واہمہ و حقیقت کا امتیاز بھی مین کر سکتا تھا لیکن اب جبکہ میری ساری زندگی صرف ایک خواب مین تبدیل ہو گئی - ہے مجھے کیون اس طرح ستایا جاتا ہے" یہ کہہ کر جعفر نے اپنا ہاتھ سلیمہ کے ہاتھ سے چھڑا کر پٹیون سے بندھی ہوئی آنکھون پر رکھ لیا اور کروٹ لے کر پھر رونے لگا -

سلیمہ وہان سے اٹھ کر چلی گئی اور کونے مین بیٹھ کر خوب پھوٹ کر رو لینے کے بعد جب دل کی بھڑاس اچھی طرح نکل گئی تو پھر واپس آئی اور جعفر کو آواز دے کر بولی کہ "دوا کا وقت آگیا ہے آپ سو تو نہین رہے"

جعفر جو واقعی یہی سمجھ رہا تھا کہ سلیمہ نے خواب مین آکر اس سے گفتگو کی تھی پھر چونکا لیکن اس مرتبہ وہ اچھی طرح اپنی بیداری کو محسوس کر رہا تھا اس لیے اسے فورًا اپنے خط لکھوانے کا خیال آیا اور اسی کے ساتھ یہ یقین کہ سلیمہ ضرور آگئی ہو گی اور یقینا یہ اسی کی آواز ہے ——— یہ سمجھتے ہی وہ بے تاب ہو کر اٹھ بیٹھا اور بولا کون "سلیمہ سلیمہ! کیا واقعی تم آگئین" وہ یہ کہتا جاتا تھا اور اس کی سانس کے لیے سینہ تنگ ہوتا جا رہا تھا ——— وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور اگر سلیمہ فورًا آکر اسے نہ سنبھال لیتی تو شاید وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑتا

سلیمہ بولی "آخر یہ اسقدر اضطراب آپ کو کیون ہے"

جعفر - "تم اور مجھ سے یہ سوال کرو! کیا شمع کبھی پروانے سے یہ سوال کر سکتی ہے، کیا چاندنی سمندر کے مد و جزر سے کبھی یہ دریافت کر سکتی ہے، کیا کبھی پھول نے بلبل سے یہ استفسار کیا ہے، کیا کبھی سرو نے قمری سے اس کی بے تابی کا سبب معلوم کیا ہے ——— آہ سلیمہ تمکو نہین معلوم کہ میری تمام زندگی صرف اسی ایک تمنا مین گذر رہی کہ کاش کبھی تم میرے پاس ہوتین - میری ساری عمر اسی ایک خواب مین بسر ہوئی پھر مین اسے قدرت کی کس نوع کی مہربانی سے تعبیر کرون کہ آج جب کہ مرادہ خواب حقیقت مین تبدیل ہو رہا ہے خود میری زندگی ایک تاریک خواب

ہو کر رہ گئی ہے اور دنیا کی ساری حقیقتیں وہم و خیال۔ آہ یہ وہ ساعت تھی کہ مین تمھاری رعنائیون کو دیکھتا تمھاری بڑی بڑی ساحر آنکھون کو دیکھتا، تمھارے ملیح رنگ کو دیکھتا تمھارے جسم کے لوچ، تمھارے ہاتھون کی نرمی تمھارے قامت کے تناسب کو دیکھتا اور پھر دفعتاً تمھارے قدمون پر گر کر جان دے دیتا لیکن اسدرجہ میری بدنصیبی کہ تمام وہ چیزین جن کا مطالعہ دوری سے کرنے کے لیے مین ترستا رہتا تھا آج مجھ سے اس قدر نزدیک ہین اور مین ان کے لطف سے محروم ہون باوجود اس قدر قربت کے اتنی دوری باوجود اس اتصال کے ایسی ہجوری، حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے شاید ہی کبھی یہ ظلم کسی کے ساتھ روا رکھا ہو ——— سلیمہ اگر کوئی نامناسب بات میری زبان سے نکلے تو معاف کر دینا کیونکہ مین صرف اندھا ہی نہین بلکہ دیوانہ بھی ہو گیا ہون۔ آہ کیا اگر یون مجھ سے اس خوش بختی کے عوض بینائی طلب کی جاتی تو کیا مجھے انکار ہوتا ہرگز نہین، لیکن اسدرجہ ستم ظریفی کہ رسم قبول سے پہلے ہی میرے ہدایا مجھسے چھین لیے گئے۔ "دہند شوق دلے رخصت نظر ندہند"

سلیمہ کی زندگی مین اس نوع کی گفتگو، اس انداز کا تخاطبہ، بالکل پہلی چیز تھی وہ غریب بالکل ناواقف تھی کہ محبت کرنے والے لوگ آپس مین کس قسم کی گفتگو کیا کرتے ہین اور اس کی سمجھ مین نہ آتا تھا کہ جعفر کے ان جذبات کا جواب کن الفاظ مین دے۔ وہ خاموش بت کی طرح کھڑی تھی اور آہستہ آہستہ موتی کی طرح آنسو ڈھلکا رہی تھی۔ جعفر دیر تک اپنا سر کڑے بیٹھا رہا اور پھر دونون ہاتھ آگے بڑھا کر بولا "سلیمہ ادھر آؤ، اپنے ہاتھ مجھے دو کہ اپنی آنکھوں سے انھین لگاؤن، سینہ پر رکھون، کیونکہ کسے خبر ہے خدا اس کی بھی فرصت مجھے دیتا ہے یا نہین"

سلیمہ جو دیر سے کھڑی اپنے امنڈ پڑنے والے جذبات کا مقابلہ کر رہی تھی آگے بڑھی اور جب جعفر کے ہاتھ مین اس کا ہاتھ پہنچا تو وہ اس طرح بے قابو ہو گئی جیسے سیلاب مین کسی کے پاؤن اکھڑ جائین اور پھر وہ اپنے آپ کو بالکل سیلاب کے رحم پر چھوڑ دے

سلیمہ کو آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا ہے اور اس عرصے مین جعفر کی تپ تو جاتی رہی لیکن آنکھون کا علاج بدستور جاری ہے ہرچند ڈاکٹر اعادۂ بینائی کی طرف سے مایوس ہین لیکن سلیمہ کو ابھی تک اس کی صحت کا یقین ہے اور وہ چاہتی ہے کہ لکھنؤ لے جا کر وہان ڈاکٹرون سے مشورہ کرے۔ شام کا وقت ہے اور سلیمہ جعفر کی آنکھون کی پٹیان بدل کر ابھی بیٹھی ہے کہ جعفر لکھنؤ جانے کا ذکر پھر چھیڑ دیتا ہے۔

سلیمہ "مین نے پرسون کی تاریخ مقرر کر کے تار دے دیا ہے لیکن جعفر مین پھر تم سے کہتی ہون کہ میری اُن ہمدردیون کو میرا ادائے فرض کر دینے کے لیے جس رسم کی ضرورت ہے اسے پھر پورا ہو جانا چاہیے"

جعفر "سلیمہ یہ ناممکن ہے کہ جان بوجھ کر تمھاری زندگی کو تباہ و برباد کر دون۔ تمھاری انھین عنایات کا شکریہ مجھ سے ادا نہین ہو سکتا چہ جائیکہ ان مین کسی ایسے لطف و کرم کا اضافہ جسکا کافی معاوضہ میری جان بھی نہین ہو سکتی"

سلیمہ "تو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں ہمیشہ ملول زندگی بسر کروں اور خوشی کا کوئی لمحہ مجھے نصیب نہ ہو"
جعفر۔ "سلیمہ یہ باتیں تم جن جذبات کے ماتحت کر رہی ہو وہ اس قدر معصومانہ ہیں کہ مجھ ایسے گناہ گار انسان کے پاس کوئی ذریعہ ان کے اعتراف کا نہیں۔ میں اور تم کو ملول دیکھوں! کیسے ممکن ہے لیکن کیا شادی ہو جانے سے تمہارے دل سے اُس سوگواری کا خیال کس طرح نکل سکتا ہے جو ایک نابینا کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے خیال سے قدرتاً جلد یا بدیر تم میں پیدا ہو جانا چاہیے"
سلیمہ۔ خیر یہ بحث فضول ہے۔ میرے نزدیک نکاح کا اصل مقصود صرف ہمدردی و ایثار ہے اور شاید اس سے زیادہ بہتر صورت اس مقصد کے پورا کرنے کی میرے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتی

جعفر کو چونکہ بالکل یقین ہو گیا تھا کہ سلیمہ اپنی ضد سے کسی طرح باز نہیں آ سکتی اس لیے وہ دیر تک سوچنے کے بعد بولا کہ بہتر ہے جو آپ کی مرضی کل صبح کو مناسب ہو گا۔

سلیمہ یہ سن کر اس قدر مسرور ہوئی کہ شاید ہی کبھی پہلے ہوئی ہو ـــــ اس نے بے تاب ہو کر جعفر کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چومے اور چونکہ رات زیادہ ہو گئی تھی اس لیے "خدا حافظ" کہتی ہوئی رخصت ہو گئی

رات بھر سلیمہ بے قرار رہی کہ کسی طرح صبح ہو اور وہ رسم نکاح کو پورا کر کے اس نقصان کی تلافی کرے جو اس کی طرف سے جعفر کو پہنچا تھا۔ صبح ہوتے ہی جلدی جلدی اٹھی اور جعفر کے کمرے میں گئی کہ اس کا ہاتھ منھ دھلائے لیکن اسکو بدستور سوتا ہوا دیکھ کر واپس آ گئی۔ اسے حیرت تھی کہ آج خلاف معمول وہ کیوں ابھی تک نہیں اٹھا۔ پندرہ منٹ انتظار کرنے کے بعد وہ پھر گئی اور آہستہ آہستہ چادر ہٹا کر اس کو جگانا چاہتی تھی کہ دفعتاً اس کی نگاہ ایک شیشی پر پڑی جو بستر پر الٹی پڑی تھی اور چند قطرے اسکے اندر سے بہ کر چادر پر دھبہ چھوڑ گئے تھے۔ اس نے شیشی اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ آنکھ میں ڈالنے کی دوا تھی جو جعفر کے پلنگ ہی کے پاس منھ پر رکھی رہتی تھی ـــــ تکیے کی طرف نگاہ گئی تو وہاں ایک پرزہ کاغذ کا رکھا ہوا تھا جس پر پنسل سے ٹوٹے ٹوٹے حروف میں "خدا حافظ سلیمہ" لکھا تھا۔ اور جعفر کا جسم سرد ہو کر بالکل نیل گون ہو گیا تھا۔

نیاز

لاسلکی کا مستقبل

سنہ ۱۸۹۵ء میں ——— مارکونی نے لاسلکی ٹیلی گراف کا آلہ ایجاد کیا،
سنہ ۱۸۹۷ء میں ——— مارکونی نے پہلا لاسلکی پیغام چار میل کے فاصلے پر ارسال کیا،
سنہ ۱۸۹۹ء میں ——— پہلے لاسلکی پیغام کا فرانس و انگلستان کے درمیان تبادلہ کیا گیا،
سنہ ۱۹۰۱ء میں ——— پہلا لاسلکی پیغام یورپ سے بحر اٹلانٹک کے اس پار امریکہ بھیجا گیا،
سنہ ....ء میں ——— عنقریب لاسلکی کے ذریعے سے "عالم بالا" کے ساتھ گفتگو کی جائیگی،

نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوا کہ دنیا ایتھر کی موجوں ۔ ۔ یا لاسلکی کے ذریعے سے تخاطب کی ایجاد پر غور کر رہی ہے۔ جب ہم ایتھر کی موجوں کا نام اپنی زبان سے نکالتے ہیں تو پہلے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ایتھر کا وجود صحیح ہے یا کم سے کم لاسلکی کی موجوں کا ایک ایسی قسم کے مادے میں سے گزرنا تسلیم کرنا پڑے گا جس کی حقیقت سے تو ہم پورے طور پر واقف نہیں ہیں لیکن آثار و علامات سے ان کے وجود پر یقین کر لیتے ہیں۔

جب مارکونی نے لاسلکی کے متعلق تجربات شروع کیے تو اس فعل کو تمام دنیا نے حیرت و استعجاب کی نظروں سے دیکھا اور یہ خیال کیا گیا کہ اس کی تمام محنت یقیناً ضائع جائے گی۔ لیکن ادھر سنہ ۱۸۹۵ء کی ابتدا ہوئی ادھر مارکونی لاسلکی بجلی کا پہلا شرارہ چند گز کے فاصلہ پر بھیجنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر پورے دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ باقاعدہ اعلان کر دیا گیا کہ لاسلکی پیغام نے چار میل کا فاصلہ طے کر لیا!

اس دن سے آج تک دنیا دیکھ رہی ہے کہ لاسلکی نہایت تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے اور خیال ہے کہ اسکے پیش نظر وہ بعید ترین منزل مقصود ہے جس کی جانب انسان ابتدائے آفرینش سے سرگرم سفر ہے یعنی "عالم بالا" کیساتھ گفتگو کر سکنا!

اس مخاطبت کی کیا صورت ہوگی؟

اب ہم اس جگہ نہیں ہیں کہ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کے متعلق صرف قیاس آرائی پر اکتفا کریں جس طرح جول ورن وغیرہ نے مستقبل میں ہونے والی ایجادات کے متعلق پیشین گوئی کو صحیح کر دکھایا۔ بلکہ ہم تو ایسے امور کا تذکرہ کر رہے ہیں جو قریب قریب متحقق ہو چکے ہیں

کیونکہ موجودہ معلومات کی بنا پر علما یقین کے ساتھ کہتے ہین کہ مستقبل قریب مین ان کی تکمیل ہو جائے گی حقیقت مین ان اختراعات کا ایک بڑا حصہ اب تحقیق کے مرتبے مین ہے اور اس مین تنقیح و تعدیل کے سوا کوئی ایسا نقص باقی نہین ہے جو منزل مقصود تک پہنچنے مین مانع ہو

اگرچہ اکثر علما کو یقین ہے کہ جب انسان فن پرواز مین کمال حاصل کرلے گا تو اجرام علویہ تک پہنچنا یا وہان سے تعلقات قائم کرنا کوئی مشکل امر نہین رہے گا لیکن ان علما، کی ایک بہت بڑی اکثریت کا اعتقاد ہے کہ طیارون کے ذریعے سے اجرام علویہ کے ساتھ تعلقات قائم کرنے سے پہلے لاسلکی بجلی کے ذریعے سے تعلقات قائم ہو جائین گے، اس کی تشریح کیلیے بیان کیا جاتا ہے کہ ٹیلیو ویژن (Television) ——— یعنی دور دراز فاصلے پر تصاویر وغیرہ منتقل کرنے کا آلہ ——— اتنا مکمل ہو جائے گا کہ اس کے ذریعے سے کائنات بعیدہ کا معائنہ ممکن ہو گا اور غیر معمولی فاصلہ وہان کے حالات کے معائنہ مین مانع نہین ہو سکے گا۔

جب ہم علمی ایجادات کی تاریخ کی طرف رجوع کرتے ہین اور ان کی ابتدائی حالت کا موجودہ حالت سے موازنہ کرتے ہین تو ہمین یقین ہو جاتا ہے کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب ٹیلی ویژن (یعنی آلۂ انتقال عکس) اتنا مکمل ہو جائے گا کہ اُس کے توسط سے انسان دور افتادہ کواکب کے حالات کا بخوبی اندازہ کر سکے گا،

یہ کہنے کی ضرورت نہین کہ اس قسم کی پیشین گوئی محض جولانی طبع کی حیثیت نہین رکھتی بلکہ وہ ایک خالص علمی نظریہ ہے جس کی تکمیل کے لیے صرف حالات اور وقت کی مناسب رفتار کی ضرورت ہے، قابل اعتماد اور صائب الرائے علما، کا پختہ فیصلہ ہے کہ موجودہ دور گذرنے کے قبل مشاہدہ بالفصل کی مشکل پوری طرح حل ہو جائے گی اور انسان کیلیے ممکن ہو جائیگا کہ کواکب بعیدہ کے ساتھ تعلقات قائم کرلے اور وہان کے کوہ و دشت اور بحر و بر کا بآسانی مشاہدہ کرنے لگے۔

اگرچہ فضا کی لطافت ان اجرام تک طیارون کے ذریعے سے پہنچنے مین حارج ہوتی ہے لیکن بعینہ یہی لطافت ان اجرام کے ساتھ تعلقات قائم کرنے مین ٹیلی ویژن کے آلات کی ممد و معاون ثابت ہو گی یہان تک کہ عقل انسانی کوئی ایسا طریقہ ایجاد کرلے جس کے ذریعے سے فضائے بسیط کی لطافت پر غلبہ اور زمین اور دوسرے اجرام کے درمیانی خلا مین سفر کرنیکا امکان پیدا ہو جائے۔

جب ہم عقل انسانی کے گزشتہ عظیم الشان کارنامون پر نظر ڈالتے ہین اور گذشتہ صدی کی اہم معلومات کو دیکھتے ہوے اُن وسائل پر غور کرتے ہین جن کے ذریعے سے عناصر طبعی کو اطاعت و انقیاد پر مجبور کیا گیا ہے تو اس امر مین کوئی شک باقی نہین رہتا کہ عقلی طور پر دنیا مین کوئی کام "محال" نہین ہے اور اگر کوئی امر محال ہے تو وہ اس لفظ کا شرمندۂ معنی ہونا!

حال اور مستقبل قریب جن باتون کا مستقبل بعید مین وقوع ہو سکتا ہے اُن سے قطع نظر کرکے ایسے امور پر غور کرنا مناسب ہو گا جن کی نسبت خیال ہے کہ مستقبل قریب مین ——— بلکہ دس سال کا عرصہ منقضی ہونیسے قبل

ان کی تکمیل ہو جائے گی۔ ہمارے خیال میں یہاں اس خیال کا خلاصہ کرنا بہت موزوں ہوگا جو آلۂ لاسلکی کے موجد سنیور مارکونی نے ایک انگریزی رسالہ کے نمائندہ کو دیا۔ لاسلکی کے متعلق ان سے زیادہ اور کس کی رائے قابل وثوق ہو سکتی ہے؟

رسالۂ مذکورہ کے نمائندے نے سنیور مارکونی سے ان کی بحری قیام گاہ واقع اطالیہ میں ملاقات کی جہاں موصوف نے مخاطبات لاسلکیہ کی اصلاح اور اختلاف "طول موج" کی خصوصیتوں کے تجربات کا وسیع پیمانے پر انتظام کیا ہے مارکونی کا بیان حسب ذیل ہے۔

۳۵ سال پہلے جب میں نے اپنے تجربات شروع کیے تو مجھے ان مقاصد تک پہنچنے کا پورا یقین تھا جن تک میں پہنچ چکا ہوں، مگر ٹیلی ویژن (آلۂ انتقال عکس) کے متعلق کبھی بھولے سے بھی میرے دل میں خطرہ نہیں گزرا تھا۔

جس دن میں نے سنہ ۱۹۰۱ء میں لاسلکی پر کارنوال سے امریکہ کو مخاطب کیا اس دن مجھے کامل یقین ہو گیا کہ لاسلکی عنقریب دنیا کے مختلف گوشوں کو ایک دوسرے سے متصل کر دے گی، مجھے پوری طرح معلوم ہے کہ یہ کیونکر ہوگا کچھ عرصے کے بعد ہم تقریریں، خبریں، اور موسیقی کے نغمے اسی طرح شائع کرنے لگے جس طرح اب شائع کرتے ہیں، یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہم جنگ عظیم سے پہلے سمندروں میں مسافر جہازوں سے گفتگو کرنے لگے تھے یہ صحیح ہے کہ لاسلکی آلات اور نظام تخاطب میں بہت سی اصلاحات نافذ کر دی گئی ہیں، لیکن نفس ایجاد جنگ سے پہلے موجود تھی۔

غالباً لاسلکی کے رواج عام کے راستے میں ذیل کی دو مشکلات سب سے زیادہ حارج ہو رہی ہیں

(۱) انتقال اخبار کے مصارف کثیرہ،

(۲) گفتگو کی رازداری کا نقدان،

روشنی ایک قسم کی موجی حرکت ہے جسے پانی کی موجوں پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ جب ساکن پانی میں پتھر گراتے ہیں تو اس مقام پر جہاں پتھر گرتا ہے پانی میں ایک حرکت پیدا ہوتی ہے جو موجوں کی صورت میں اس مقام کے گرد ہر طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ اس واقعہ میں جو چیز منتقل ہوتی ہے وہ پانی نہیں بلکہ محض حرکت ہے پانی کے ذرات فقط اوپر نیچے حرکت کرتے ہیں لیکن ان کی یہ حرکت ایک ذرہ سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں منتقل ہوتی رہتی ہے اسکا نتیجہ ایک موج یا لہر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ موج کے ایک اوج سے دوسرے اوج تک جو فاصلہ ہوتا ہے اسکو "طول موج" Wave lenght کہتے ہیں روشنی کی شعاع بھی اسی قسم کی موجوں پر مشتمل ہوتی ہے جسطرح پتھر کی ضرب سے پانی میں موجیں پیدا ہوتی ہیں۔ انکا طول موج ذرات کے ارتعاش پر موقوف ہے جسقدر ارتعاش تیز ہوگا اسی قدر طول موج کم ہوگا مختلف رنگوں کی روشنی میں جو فرق ہے وہ محض طول موج کا فرق ہے بنفشی کا طول موج سب سے کم اور سرخ کا سب سے زیادہ ہے۔ (رسالہ سائنس جلد (۱) حصہ (۲) صفحہ ۱۴۱ و ۱۴۲) —— مدیر وش

مجھے یقین ہے کہ دس سال گذرنے سے قبل ہم کوئی ایسا طریقہ دریافت کرنے کے قابل ہو جائین گے جس کے ذریعے سے لاسلکی برقی موجون کو مخصوص سمت مین ارسال کر سکین اس طرح کہ اس کی موجین پانی کی دھار کے مانند معینہ سمت مین روانہ کی جائین گی۔ ایسا نہ ہوگا جیسا اب ہوتا ہے کہ یہ موجین بے قید چھوڑ دی جاتی ہین اور تمام فضا مین منتشر ہو جاتی ہین جس کی وجہ سے مخاطب کی رازداری قائم رکھنا غیر ممکن ہو جاتا ہے صرف یہی نہین بلکہ فضا مین موجون کا انتشار و تشتت ایک ایسی فضول خرچی ہے جو کسی طرح گوارا نہین کی جا سکتی کیونکہ اس کے لیے بہت زیادہ قوت صرف کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ گمان غالب ہے کہ کم طول کی موجونکے استعمال، اور انھین منتشر چھوڑ دینے کی بجائے ایک خاص سمت مین بھیجنے کے طریقے کی دریافت اس مشکل کو جزوی طور پر حل کر دے گی جب علم ان دو مشکلات پر غالب آجائے گا تو لوگ آلات لاسلکی کو اسی کثرت سے استعمال کرنے لگین گے جس طرح ٹیلیفون وغیرہ دوسری اختراعات کو بے تکلف استعمال کر کے اپنی ضروریات زندگی مین شامل کر چکے ہین

یقیناً اطراف عالم کو ایک دوسرے سے مربوط کرنے اور انسانون مین حسن اعتماد اور رواداری کے جذبات کی نشو و نما مین لاسلکی کی تعمیم بہت زیادہ امداد دے گی۔ عنقریب ایک دن ایسا آنے والا ہے جب ایتھر لاسلکی پیغامات و رسائل کا زیادہ سے زیادہ تعداد مین حامل نظر آئے گا،

اب تک ہم نے اس پر کفایت کی ہے کہ فضا مین پیغام ارسال کر دیا جائے جو منتشر ہو کر اپنی موجون سے تمام فضا کو مملو کر دے جیسا کہ عرض کیا گیا۔ اس مین حد درجہ اسراف کی شان پائی جاتی ہے اسی لیے علماء کوشش کر رہے ہین کہ ہر ایک پیغام محدود سمت مین خاص خطوط پر ارسال کیا جائے اس طرح دو خطرناک امور سے تحفظ ہو جائے گا یعنی اسراف اور فضا مین بھیجی ہوئی چیزون کی غیر ضروری اشاعت عامہ!

یہ کہنے کی ضرورت نہین ہے کہ پیغامات کی رازداری محفوظ رکھنے کا مسئلہ نہایت اہمیت رکھتا ہے صرف سیاسی اور حربی امور مین نہین بلکہ تجارتی امور مین بھی کیونکہ تاجرین عادتاً اپنے اسرار کی رازداری کے ایسے ہی خواہش مند ہوتے ہین جیسے ایک سپہ سالار خطوط جنگ کی رازداری کا خواہان ہوتا ہے۔ غالباً دس سال نہین گذرین گے کہ انسان ہزارون میل کے فاصلے پر بیٹھ کر اپنے احباب اور اپنے شرکاء کار سے گفتگو کر سکے گا اور کسی غیر متعلق شخص کو پتہ بھی نہین چلے گا کہ ایتھر کی موجون پر ان مین کیا تبادلۂ خیال ہو گیا جس دن یہ ہو گیا تو سمجھ لینا چاہیے کہ لاسلکی کمال معراج کو پہنچ گئی۔

ظاہر ہے کہ آجکل لاسلکی کے رواج مین جو سب سے بڑی مشکل حائل ہے وہ اسکے آلات کی غیر معمولی گرانی ہے۔ جب موجدین لاسلکی کے سادہ و ارزان آلات ایجاد کر لین گے اور موجون کی فضا مین

انتشار سے تحفظ کا طریقہ دریافت ہو جائے گا تو دنیا میں ہر خاندان لاسلکی استعمال کرنے لگے گا اور غریب وامیر سب کے لیے آلات لاسلکی کے طفیل میں وسائل تخاطب کا استعمال اور دور کے نغمات موسیقی سے مسرت اندوز ہونا سہل الحصول ہو جائے گا۔

یہاں سے مارکونی اور رسالہ کے نمایندہ میں ٹیلی ویژن (آلۂ انتقال عکس) کی ایجاد پر گفتگو ہونے لگی اسکے متعلق مارکونی نے جو اظہار رائے کیا اسکا خلاصہ حسب ذیل ہے
اس اختراع کی تکمیل اور عوام کے لیے قابل استعمال ہونے کے واسطے کچھ عرصہ درکار ہے اس میں شک نہیں کہ جب وہ اس حد کو پہنچ جائے گی تو ہمارے اقتصادی نظام میں غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوگی کیونکہ جس شخص کے قبضے میں لاسلکی آلہ انتقال عکس ہوگا وہ ہر قسم کے تفریحی جلسوں وغیرہ کی شرکت سے بے نیاز ہو جائیگا نہ اسے گھوڑ دوڑ جانے کی حاجت ہوگی نہ تھیٹر اور سینما میں، نہ وہ مجالس رقص وسرود میں شریک ہونے پر مجبور ہوگا نہ اسے کرکٹ اور فٹ بال کے میچ دیکھنے کیلیے جانے کی ضرورت پیش آئے گی ایسی صورت میں اس وقت سینما ہاؤسوں اور رقص گاہوں کی کیا حالت ہوگی؟ اور کون احمق ہوگا جو ایسے مقامات میں جاکر اپنا روپیہ برباد کرے گا اور آمد ورفت کی تکلیف اٹھائے گا دراں حالیکہ وہ گھر بیٹھے ان تمام مناظر سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

اس ایجاد سے جو انقلاب عظیم رونما ہوگا ہم اس کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتے لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس سے ہمارا مالی اقتصادی، اور اجتماعی نظام بہ شدت متاثر ہوگا بولنے والے سینما نے رواج عام نہونے کے باوجود ابھی سے تھیٹر پر ناخوشگوار اثر ڈالنا شروع کر دیا ہے جو مرور ایام کے ساتھ تیز تر ہوتا جائیگا پھر اس وقت کیا حالت ہوگی جب آلہ انتقال عکس تمام حقائق کو جملہ تفصیلات اور باریکیوں کے ساتھ فی الوقت ہمارے سامنے پیش کر دیا کرے گا؟

لاسلکی اور جنگ

یہ کہنا لاحاصل ہے کہ لاسلکی اپنی تمام اقسام کے ساتھ آیندہ ہونے والی جنگوں میں غیر معمولی طور پر موثر ہوگی، گزشتہ جنگ عظیم میں اس کے اثرات نمایاں نہونے کی وجہ جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں یہ ہے کہ مخاطبات کی رازداری غیر ممکن تھی اور لاسلکی امواج پر جو پیغامات واشارات منتقل ہوتے تھے وہ فضا کے ہر حصے میں منتشر ہو جاتے تھے اور ان کا کسی خاص سمت میں اس طرح ارسال کرنا ممکن نہ تھا کہ مخالفین کی دست برد سے محفوظ رہ سکیں اس لیے جب علما کوئی ایسا طریقہ ایجاد کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ مخاطبات کی رازداری قائم رکھنا ممکن ہو تو جنگ کے مواقع پر لاسلکی کے اثرات بہت کافی اور نمایاں ہوں گے اس وقت میدان جنگ کا نقشہ شطرنج کی بساط سے مشابہ ہو جائیگا کیونکہ قائد اعظم اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے آلۂ انتقال عکس (ٹیلیویژن) کی مدد سے تمام خطوط جنگ پر فوجوں کی نقل وحرکت کی نگرانی کرسکے گا، اور اسکے بعد وہیں بیٹھے بیٹھے لاسلکی ٹیلیفون سے ماتحت افسران کو مناسب ہدایات جاری کرسکے گا

غالباً اس وقت خونریزی میں معتدبہ کمی ہو جائے گی کیونکہ مثلاً سپہ سالار حریف کی فوج کے ایک حصے پر حملہ کرنیکا ارادہ کرتا ہو لیکن جب اسے دشمن کی "امونیت" (Immunity) اور تیاری کا علم ہو گا تو وہ یقیناً حملے کے ارادے سے باز آجائیگا اور اس طرح بہت سی جانیں ضائع ہونے سے محفوظ رہ سکیں گی

لیکن دوسری طرف آلۂ انتقال مستقبل میں وہ فرائض بھی انجام دے گا جو آج کل مخبر انجام دیتے ہیں۔ مخصوص حالات کے سوا مثلاً جب کسی اہم دستاویز وغیرہ کا غائب کر دینا مقصود ہو عام طور پر جاسوسوں اور مخبروں سے حکومتیں بےنیاز ہو جائینگی گو جو موجدین لاسلکی کی اصلاح و تکمیل کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں ان کا مقصد محض مفاد عامہ ہے اور انھیں فاتحین اور ہوس ملک گیری رکھنے والے اشخاص کی طمع پرستی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کی حالت بھی دوسرے مخترعین کی حالت سے مختلف نہیں ہے جنھوں نے اپنی ایجادات سے خدمت خلق کا ارادہ کیا لیکن رجال حرب نے ان کی اصلی غرض سے قطع نظر کرکے انھیں ہلاکت و بربادی اور خونریزی کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اگر مستقبل میں خود غرض اور مطلب پرست اشخاص لاسلکی کو اپنی غیر شریفانہ اور ذلیل و پست خواہشات کی تکمیل کیلیے استعمال کرینگے تو اس سے مخترعین پر کوئی حرف نہیں آتا بلکہ حقیقت میں یہ ان مطلبی اشخاص کی طمع پرستی اور ہوس کا نتیجہ ہو گا۔

یہ ہے اس شخص کی آرا کا خلاصہ جس نے لاسلکی کے اسرار و خواص کے اکتشاف کے لیے اور خدمت نوع انسان کے مقصد سے تسخیر کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ مارکونی نے چالیس سال سے زیادہ اپنے اس خواب کی تعبیر حاصل کرنے میں صرف کیے ہیں جو اس نے اوائل عمر میں دیکھنا شروع کیا تھا ——— یعنی مختلف اطراف عالم کو لاسلکی کے رابطے سے باہم مربوط و متصل کر دینے کا خواب! ابتدا کار میں لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ فضول اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ لیکن اس زمانے نے اس خوشگوار خواب کو ایک حقیقت ثابتہ کی صورت میں تبدیل کر دیا اور اسکے نظریہ کی تصدیق کرکے ایک مرتبہ اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ بڑی بڑی اختراعات کی ابتدا خیالی نظریات ہی سے ہوئی ہے اور بعد میں وہ نشو و نما پاکر حد کمال کو پہنچی ہیں۔

یقیناً لاسلکی برقی وہ سب سے بڑی قوت ہے جسے عقل نے خدمت انسان کے لیے مسخر کیا ہے، ہمارے نزدیک اس سے زیادہ بڑی کوئی ایسی قوت نہیں ہے جس سے انسان نے استفادہ کیا ہو، اس کے باوجود علماء یقین دلاتے ہیں کہ اس نادیدہ قوت کے متعلق ہماری معلومات ابھی تک بالکل ابتدائی حالت میں ہیں اور عنقریب ایک ایسا دن آنیوالا ہے جب لاسلکی آلات و اختراعات کی کثرت ہو جائے گی اور اس پیچیدہ قوت کی تسخیر کامل ہی پر انسان کی زندگی کا دار و مدار ہو گا،

لیکن اصول نشو و ارتقا؟

یقیناً لاسلکی عنقریب اس اصول کو ایک دوسرے راستے پر ڈال دیگی اور فضاء انسانکے نشو و ارتقا میں اثرانداز ہوتی رہیگی

رفتار واقعات کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ نظام معاشرت و تمدن عنقریب آلات پر منحصر ہو جائے گا اور انسان اپنی تمام حرکات و سکنات مین ان آلات سے امداد لے گا جو اسے چارون طرف سے گھیرے ہوئے ہون گے۔

اور اس کی عقل ؟

علماء کا خیال ہے کہ اس کی عقل بھی بہت زیادہ ترقی یافتہ ہو جائے گی البتہ وہ ان آلات کو استعمال کرنے کے لیے کسی غیر معمولی فہم و فراست کا محتاج نہ ہو گا ـــــ جس طرح ایک معمولی مزدور کو برقی آلات سے کام لینے مین کسی خاص ذکاوت و ذہانت کی ضرورت نہین ہوتی ـــــ تاہم ان اختراعات مین اضافے اور ان کی تکمیل کے واسطے غالباً اُسے بہت زیادہ عقل و دانائی درکار ہو گی !

منظور سرورش بھوپالی

آیندہ جنوری ۳۲ء کا نگار

تقریباً دوسو ۲۰۰ صفحات پر شایع ہوگا

اور

مخصوص ہوگا **مطائبات غالب** کے لیے۔ اس وقت تک غالب پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اسکی فلسفہ طرازی، معنی آفرینی علو ے خیال، بلندی مفہوم اور دشوار پسندی سے متعلق تھا لیکن یہ راز اب تک سربستہ ہے کہ غالب کی شہرت و کامیابی کا حقیقی راز ان سب سے علٰحدہ صرف اس کی شوخی، شوخ نگاری، بذلہ سنجی اور مطائبات پسندی مین نہان ہے جنہون نے اس کے سارے کلام کو خواہ وہ نظم ہو یا نثر، فارسی ہو یا اردو ایک نہایت ہی اچھوتی قسم کی تنقید ملیح (Witty Criticism) مین تبدیل کر دیا ہے۔

یہ مضمون ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے جس مین برسون کی محنت و کاوش کے بعد اس کے اردو کلام سے اسکی فارسی تصانیف سے اس کے رقعات سے اور تمام ان واقعات و حالات سے جو تذکرون اور خود اس کی تصانیف مین ملتے ہین **غالب** کی شوخی و شوخ نگاری پر تمام پہلوؤن سے نہایت ہی مکمل بحث کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ غالب کی شہرت و کامیابی کا تنہا راز صرف یہ تھا کہ وہ قدرت کی طرف سے نہایت شوخ و بذلہ سنج طبیعت لے کر آیا تھا۔ اور اسکی ساری زندگی اس کی جملہ تصانیف مین یہی وہ رنگ ہے جو تمام شعرا سے اسے ممتاز بناتا ہے۔

سب سے پہلے ایک بسیط مقدمہ کے ذریعے سے مثالین دے دے کر بتایا جائے گا کہ شوخی و ظرافت کی دنیا مین کتنی قسمین ہین غالب سے قبل کن کن شعرا نے اسے اختیار کیا ہندوستان مین اس رنگ نے کتنا نوع اختیار کیا۔ اور پھر غالب کے اردو فارسی کلام اور اس کے حالات و کوائف زندگی کا استقصا کر کے بتایا جائے گا کہ غالب حقیقتاً کسقدر دلچسپ انسان تھا اور کیسے کیسے نوادر ادب اور لطائف انشا، وہ اپنے بعد چھوڑ گیا ہے۔

یہ کتاب اگر ایک طرف فن تنقید کی بہترین مثال ہے تو دوسری طرف ایسا مجموعہ لطائف ہے کہ شاید ہی اس سے بہتر ذریعہ تفریح و دلچسپی کا کوئی اور ہو۔ یہ تصنیف **غالب** کے متعلق بالکل اچھوتی چیز ہوگی اور ہر شخص کے ذوق کو آسودہ کرنے والی۔ وہ حضرات جو غالب کا صحیح مطالعہ کرنا چاہتے ہین ان کے لیے اس کتاب کا دیکھنا ایک فریضہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے

یہ کتاب صرف نگار کے جنوری نمبر میں شائع ہوگی اور اس لیے اس کے حاصل کرنے کا تنہا ذریعہ یہی ہے کہ نگار کی خریداری کو جاری رکھیے اور آپ کے حلقۂ احباب میں جو حضرات اس کتاب کو حاصل کرنا چاہتے ہیں انھیں نگار کی خریداری پر آمادہ کیجیے۔

نیاز

اُردو املا پر ایک سرسری نظر

ہندوستانی اکیڈمی کے سہ ماہی رسالہ بابت ماہ جنوری ۱۹۳۱ء موسوم بہ تماہی رسالہ مین جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی نے ایک مضمون اردو املا پر تحریر فرمایا ہے اس مین یون تو زبان کی بہت سی غلطیان ہین لیکن یہان میرا مدعا زبان کی غلطیان ظاہر کرنا نہین ہے بلکہ نفس مضمون پر اظہار خیال کرنا ہے اس لیے مین زبان کی غلطیون کو نظرانداز کرکے صرف "اُرُدُو املا" کے متعلق اپنی راے ظاہر کر رہا ہون -

ہر زبان کے املا کی علتِ غائی صرف یہ ہوا کرتی ہے کہ اس کے صحیح تلفظ کو کاغذ پر حرف کے ذریعے سے ادا کر دیا جائے چونکہ ہر ملک کے تلفظ کا دار و مدار وہان کے باشندون کے اعضاے تکلم کی ساخت پر ہوتا ہے اس لیے ہر ملک مین مختلف حرف مختلف تلفظ ادا کرنے کے لیے رائج ہو گئے - اہل عرب کے مخارج آواز کی خصوصیت کی وجہ سے ح - ع - ص - ض - ط وغیرہ عالم وجود مین آئے اور اسی طرح دیگر ممالک کی ضرورت کے موافق حرف بنے -

مختلف ممالک کے حروف پر غور کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعض حرف تو ایسے ہین جن کی آواز دو ملکون مین مشترک ہے مثلاً P اور پ اور بعض حرف ایسے ہین جو ایک ملک کے واسطے مخصوص ہین مثلاً ع ح وغیرہ

مرور ایام کے ساتھ ممالک کی نظام حکومت مین تبدیلیان ہوتی رہین - ایک ملک کے لوگ دوسرے ملکون مین جاکر ایک دوسرے مین کچھ اس طرح گھل مل گئے کہ اب اس کا جاننا دشوار ہو گیا کہ کون لفظ کس زبان کا ہے

ایک زبان کے الفاظ جو دوسری زبان مین داخل ہوے ہین ان مین سے بعض تو ہو بہو داخل ہو گئے ہین اور بعض مین کچھ تصرف ہوا ہے چونکہ ہر ملک کے باشندون کا طرزِ تخیل، طرز ادا، طرز بود و باش اس ملک کے لیے مخصوص ہوتا ہے اس لیے ہر نئے لفظ کا مفہوم جو دوسری زبان مین داخل ہوا مختلف وجوہ کی بنا پر بدل گیا، جتنا زمانہ گذرتا جاتا ہے لفظون کے مفہوم مین تبدیلی ہوتی جاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ مختلف ممالک کے باشندون کے مخارج آواز مین بھی تبدیلیان ہو رہی ہین جس کا اثر الفاظ کے تلفظ پر پڑ رہا ہے - حتیٰ کہ اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ بعض زبانون مین کسی مخصوص آواز کے ادا کرنے کے لیے حرف تو موجود ہے مگر وہ آواز مفقود ہو چکی ہے - البتہ الفاظ کا املا پہلی طرح رائج ہے -

چونکہ اردو زبان اور زبانون کے مقابلے مین بہت نئی ہے اور اس مین تریب قریب ہر مخرج کی آوازین موجود ہین

لہذا ایک اردو بولنے والا ہر زبان کا تلفظ با آسانی ادا کر سکتا ہے جس کی وجہ سے زبان اردو مین دوسری زبانون کے الفاظ جذب کرنے کی قوت یعنی ان کو اپنا بنا لینے کی قابلیت موجود ہے اور اس حیثیت سے زبان اردو دنیا کی ہر زبان پر فضیلت رکھتی ہے ۔

عربی فارسی اور اردو کا رسم خط ایک سا ہے اس لیے جو عربی اور فارسی الفاظ اردو مین داخل ہوئے ان کا املا قریب قریب وہی رہا جو پہلے تھا البتہ ان کا مفہوم مرور ایام کے ساتھ بدلتا رہا ۔ وہ تمام الفاظ جو اب زبان اردو مین شامل ہین اپنے مفہوم کی بنا پر اردو ہین ایک اردو دان شخص جب اردو بولتا ہے تو اسے اسکی بالکل خبر نہین ہوتی کہ وہ فارسی الفاظ استعمال کر رہا ہے یا عربی ، وہ ہر لفظ کو اردو سمجھ کر بولتا ہے اور اس کے دل مین ان الفاظ کا وہی مفہوم ہوتا ہے جو زبان اردو مین ہے ایک اردو بولنے والا شخص جب لفظ خندق استعمال کرتا ہے تو اس پر قطعاً نہین غور کرتا ہے کہ یہ لفظ کندک سے مشتق ہے وہ تو لفظ خندق سے اس چیز کا تصور کرتا ہے جس پر لفظ خندق کا اطلاق ہوتا ہے ۔ البتہ جب ہم یہ الفاظ کاغذ پر لکھتے ہین تو ان کے املا مین دو خصوصیات نظر آتی ہین

(۱) املا سے الفاظ کا تلفظ ادا کرنے مین مدد ملتی ہے ۔

(۲) املا سے اکثر الفاظ کی فیلولوجی کا پتہ چلتا ہے ۔

جس طرح دنیا کی دیگر زبانون مین اکثر الفاظ کے تلفظ اور املا مین اختلاف ہے اسی طرح اردو مین بھی بعض الفاظ کا املا کچھ ہے اور تلفظ کچھ ۔ اس اختلاف کی وجہ صرف یہی ہے کہ جب ایک زبان کا لفظ دوسری زبان مین شامل ہو جاتا ہے تو تلفظ تو آسانی سے بدل سکتا ہے مگر املا کا دار و مدار تحریر پر ہے اس لیے اس کے بدلنے مین دشواری ہوتی ہے مثلاً انگریزی لفظ Know مین حرف K تلفظ مین نہین آتا ہے مگر اس K کی وجہ سے اسباب کا پتہ چلتا ہے کہ انگریزی لفظ Know فرانسیسی لفظ Connaitre لاطینی Cognoscere سنسکرت لفظ گیان ज्ञान فارسی لفظ دانستن سب ایک ہی مخزن سے مستخرج ہین ۔ اسی طرح لفظ Knee جس کا پہلا حرف K تلفظ مین نہین آتا فرانسیسی لفظ Genou (تلفظ ژنو) لاطینی لفظ Genu فارسی زانو ہندی جانو سے ہم آہنگ نظر آتا ہے

اس لیے اردو دان حضرات کا یہ فرض منصبی ہے کہ اردو الفاظ کے املا کو جہان تک ممکن ہو دست برد زمانہ سے محفوظ رکھین ۔ کسی زبان کی فیلولوجی مین جتنی مدد املا سے ملتی ہے اتنی اور کسی چیز سے نہین ملتی ۔

اس مضمون مین جس کا مین نے شروع مین حوالہ دیا ہے جناب ڈاکٹر صاحب موصوف نے املے مین کچھ تبدیلیان کرنے کے تجاویز پیش کیے ہین ۔ اور پہلا حرف جس پر انھون نے بہت کچھ لکھا ہے وہ ہائے مختفی ہے ۔ ان کا خیال ہے کہ یہ حرف زبان عربی اور زبان فارسی کیلیے مخصوص ہے اور اس کا وجود زبان اردو یا ہندی یا سنسکرت مین نہین ہے ۔

اس مین جناب ڈاکٹر صاحب موصوف نے ایک آواز اور ایک مخصوص حرف مین خلط مبحث کر دیا۔ حرف بالذات خود کوئی چیز نہین ہے وہ صرف ایک مخصوص آواز ادا کرنے کے لیے لکھا جاتا ہے جب ہم چند حرفون کو کسی زبان کیلیے مخصوص کرتے ہین تو اس سے ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جن مخصوص آوازون کے ادا کرنے کے لیے وہ حرف وضع کیے گئے تھے وہ آوازین اس زبان کے لیے مخصوص ہین (یا کبھی مخصوص تھین)

اب ہمین دیکھنا یہ ہے کہ وہ آواز جس کے ادا کرنے کے لیے ہائے مختفی وضع کی گئی تھی وہ اردو و ہندی یا سنسکرت مین موجود ہے یا نہین اگر نہین موجود ہے تو واقعی مین ڈاکٹر صاحب کا فرمانا صحیح ہے اور اگر وہ آواز موجود ہے تو یقیناً ڈاکٹر صاحب کی رائے غلط ہے۔

زبان سنسکرت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ہزارون الفاظ سنسکرت مین موجود ہین جنکے آخری حرف स اور र کو حذف کر دینے سے ایک ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جو ہائے مختفی سے ملتی جلتی ہوا سے سنسکرت مین بسرگ विसर्ग کہتے ہین

مثلاً	प्रातर काल	(صبح) کا	र	حذف کرنے سے	प्रातः काल	بنا
	हरिस	(فاعل) کا	स	حذف کرنے سے	हरि	بنا
	स्वयमस	(از خود) کا	स	حذف کرنے سے	स्वयमः	بنا
	स्पदस	(یہ) کا	स	حذف کرنے سے	स्पद	بنا
	धनुस	(کمان) کا	स	حذف کرنے سے	धनु	بنا

اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ سنسکرت کا विसर्ग قریب قریب وہی طریقہ ہے جو ڈاکٹر صاحب نے بندہ وغیرہ کی نسبت تحریر فرمایا ہے جس طرح بندک کا آخری حرف ساقط ہو جانے سے ایک نئی آواز پیدا ہوئی جو الف اور فتحہ کے بین بین تھی اسی طرح स्पदस کے آخری حرف स کے ساقط ہو جانے سے ایک لفظ स्पद بنا جس کے آخری آواز الف اور فتحہ کے بین بین ہے۔

سنسکرت کے مندرجۂ بالا الفاظ پر غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان مین تین طرح کی آوازین حرف علت اور حرکت کے بین بین موجود ہین۔

(۱) فتحہ اور الف کے بین بین مثلاً स्पद

(۲) کسرہ اور ی کے بین بین مثلاً हरि

(۳) ضمہ اور واؤ کے بین بین مثلاً धनु

یہ ممکن ہے کہ ان آوازون کا تلفظ فارسی کے ہائے مختفی کے تلفظ سے کچھ خفیف سا مختلف ہو مگر یہ خفیف اختلاف محض

خصوصیات زبان کی وجہ سے ہے۔

اگر غور کیا جاے تو سنسکرت کی یہ تینون آوازین عربی الفاظ غز الۃ۔ غز الہ غز الۃؐ سے ملتی جلتی ہین، اب جو حرف اُس آواز کے ادا کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جو فتحہ اور الف کے بین بین ہے اس کو ہم ہائے مختفی کہین یا (ا) विसर्ग یا اس کے لیے کوئی اور نام قرار دے دین مگر اصلیت وہی رہے گی، اصلیت کا دار و مدار ہمارے خود ساختہ نام پر نہین ہے

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ آواز کیونکر پیدا ہوسکتی ہے۔ ہمارے معزز ڈاکٹر صاحب نے ہائے مختفی کی وجہ صرف ایک قرار دی ہے وہ یہ کہ بعض فارسی قدیم کے آخری الفاظ کا آخری حرف ک تھا جو مرور ایام کی وجہ سے بدل کر ک سے گ ہوگیا اسکے بعد ساقط ہوگیا ساقط ہونے سے اس کے حرف ماقبل کی حرکت اسی طرح قائم رہی جیسی پہلے تھی۔ اس کے بعد معزز ڈاکٹر صاحب نے ایک عجیب استدلال پیش کیا ہے وہ یہ ہے، چونکہ سنسکرت ہندی اور اردو کا کوئی لفظ حرکت پر نہین ختم ہوتا ہے اسلیے اہل فارس کو ایک حرف ساکن کی ضرورت ہوئی جو ایسے لفظ کے آخر مین چپکا دیا جاے تاکہ وہ لفظ بھی سکون پر ختم ہو۔ یہ حرف ہائے مختفی کہلاتا ہے

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اس نام ہائے مختفی کی یون تشریح کی ہے۔ فرماتے ہین عربی زبان مین یہ لفظ پہلے سے موجود تھا اور چونکہ اس کی آواز مین ہ کی آواز مستتر تھی اس لیے اس کو ہائے مختفی کہتے تھے۔ جب اہل فارس کو ایک ساکن حرف کی ضرورت ہوئی تو انھون نے یہ حرف موزون سمجھ کر آخر مین چسپان کر دیا

اس مین معزز ڈاکٹر صاحب نے دو غلطیان کی ہین

(۱) ڈاکٹر صاحب کا یہ دعوے سراسر غلط ہے کہ سنسکرت اور ہندی مین کوئی لفظ حرکت پر نہین ختم ہوتا ہے اصلیت یہ ہے کہ سنسکرت اور ہندی مین ایسے الفاظ بہت کم ہین جو سکون پر ختم ہوے ہون یعنی جنکے آخر مین हलन्त ہو سنسکرت اور ہندی کا ہر لفظ اصولاً حرکت پر ختم ہوتا ہے، البتہ اردو کے اثر سے بعض ہندی الفاظ سکون پر ختم ہونے لگے ہین اور سنسکرت مین تو اب بھی قریب ہر لفظ کے آخر مین حرکت ہے اور ایسے الفاظ بہت کم ہین جنکے آخر مین हलन्त ہو

(۲) دوسری غلطی جو جناب ڈاکٹر صاحب موصوف نے کی ہے وہ یہ ہے کہ انھون نے فتحہ اور ہائے مختفی کی آواز ایک قرار دے دی ہے۔ اُن کا منشا اس ساری تحریر سے یہ ہے کہ ہائے مختفی اور فتحہ کی آواز ایک ہے مگر تو اعدان حضرت نے یہ دیکھ کر کہ کسی لفظ کے آخر مین حرکت نہین ہوسکتی ایک نیا حرف ہائے مختفی جوڑ دیا۔ اگر فی الحقیقت آخری حرف کی حرکت کی آواز وہی تھی جو فتحہ کی ہوتی ہے تو ایک نیا حرف ہائے مختفی جوڑنا سراسر غلطی تھی عربی مین زیادہ تر الفاظ کے آخر مین حرکت ہے اور پھر بھی اہل عرب نے کوئی نیا حرف نہ جوڑا، البتہ اہل عرب نے صرف ان لفظون کے آخر مین ہائے مختفی بڑھائی جن کے حرف آخر کی حرکت کی آواز فتحہ اور الف کے درمیان تھی۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اہل فارس نے ہائے مختفی اس لیے نہین شامل کی تھی کہ ان کو آخر کے حرف کی حرکت ناگوار تھی بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ آخری حرف کی حرکت الف اور فتحہ کے بین بین تھی اور اہل فارس اس حرکت کو علاوہ عربی کی ہائے مختفی کے اور کسی حرف کے توسط سے

نہین ظاہر کرسکتے تھے - سنسکرت کے الفاظ جو مین پہلے لکھ چکا ہون ان پر غور کرنے سے یہ صاف نظر آتا ہے کہ سنسکرت الفاظ کا حال ادا [illegible] کی حالت مین بعینہ یہی ہے لہذا ڈاکٹر صاحب نے اس مسئلہ کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ قابل یقین نہین ہے -

علاوہ برین ڈاکٹر صاحب نے جو یہ فرمایا ہے کہ اردو زبان مین کوئی لفظ حرکت ختم پر نہین ہوتا تو یہ سراسر غلطی ہے اگر ہم ہر اس لفظ پر غور کرین جس کے آخر مین حرف علت ہے جیسے کتا، لڑکی وغیرہ تو یہ واضح ہو جائیگا کہ حرف علت کا ماقبل متحرک ہے اور وہ حرف علت صرف اس کی پر زور حرکت کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے، ایسے الفاظ مین حرف علت کی بذات خود کوئی آواز نہین ہوتی ہے اور ان کا وجود صرف اس امر کی دلیل ہوتا ہے کہ حرف ماقبل کی حرکت پر خاص طریقے سے زور دیا گیا ہے - اگر ہم اس حیثیت سے دیکھین تو اردو کا ہر وہ لفظ جس کے آخر مین حرف علت ہے حرکت پر ختم ہوتا ہے اور یہ حرکت اس کے آخری حرف علت سے ظاہر کی گئی ہے -

اصل مین ہاے مختفی کی آواز دو وجوہ سے پیدا ہو سکتی ہے

(۱) کسی حرف آخر کے ساقط ہو جانے سے جس کا ماقبل متحرک بہ فتحہ تھا - ڈاکٹر صاحب نے اس کی متعدد مثالین دی ہین - سنسکرت مین ایسی ہزارون مثالین مل سکتی ہین

(۲) چونکہ ہاے مختفی ایک آواز ہے درمیان فتحہ اور الف کے اس لیے اگر اس آواز پر جو ہاے مختفی سے پیدا ہوتی ہے زور دیے دیا جاے تو الف کی آواز نکلے گی، اسی طرح اگر اس آواز کا جو الف کے توسط سے نکالی جاتی ہے زور کم کر لیا جائے تو ہاے مختفی کی آواز نکلے گی، چنانچہ اگر کوئی لفظ الف پر ختم ہوتا آخری حرکت سے پہلے کی حرکت پر زور دے دیا جائے جس کو زبان انگریزی مین - accent کہتے ہین تو لا محالہ آخری حرکت ضعیف ہو جاے گی اور ایسی آواز پیدا ہوگی جس کو ہم ہاے مختفی سے ادا کرتے ہین مثلاً اگر ہم لفظ مارکہ کے آخر کے ماقبل کے ٹکڑے یعنی مار پر زیادہ زور دے دین تو اس لفظ کا تلفظ اردو مین مارکہ لکھا جائے گا - اسی طرح لفظ گھنٹہ مین زیادہ زور لفظ گھن پر ہے اس لیے آخری حرف کی حرکت کی آواز کو ہاے مختفی سے ظاہر کرنا پڑا،

اردو فارسی اور عربی کے تمام الفاظ پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہاے مختفی محض ان الفاظ مین موجود ہے جن کے آخری ٹکڑے کے ماقبل پر آواز کا زور دیا جاتا ہے -

فارسی درمعرکہ این تفنگ فریادرس است -

چونکہ لفظ تپنچہ مین پن پر زور ہے اس لیے آخر مین ہاے مختفی لکھنی پڑی اسی طرح جن اردو لفظ کے تلفظ مین آخری ٹکڑے کے ماقبل پر زور ہے وہ لا محالہ ہاے مختفی سے لکھا جائیگا، اردو زبان مین اس خاص آواز کے ظاہر کرنے کا کوئی اور طریقہ نہین ہے - یہ مسئلہ اس بات سے اور بھی صاف ہو جاتا ہے کہ ضرورت قافیہ کی وجہ سے ہاے مختفی کو الف سے

بدل دیتے ہین۔ اس لیے اس کو الف سے لکھتے ہین۔ ڈاکٹر صاحب نے جتنے تجاویز اس ضمن مین پیش کیے ہین وہ سب فضول معلوم ہوتے ہین۔

اتنا بیان کرنا بہت ضروری ہے کہ اردو اور فارسی زبانون مین ایسے چند الفاظ بھی مل جائین گے جن کے آخری ٹکڑے پر زور ہے مگر وہ متذکرۂ بالا قاعدے کے خلاف (ہ) سے لکھے جاتے ہین۔ اس کی وجہ مختصراً یہ ہے کہ ابتدائی زمانے مین جب وہ الفاظ عالم وجود مین آئے تو اس کا تلفظ وہی تھا جس طرح وہ اب لکھے جاتے ہین مرور ایام کی وجہ سے اس تلفظ مین فرق آگیا ہے۔ ایسے الفاظ کی تعداد بہت کم ہے انکو ہم مستثنیٰ سمجھ کر الگ کر دیتے ہین۔ اب مین صرف چند الفاظ کا ذکر کرونگا،

(۱) اکہ۔ اس مین ڈاکٹر صاحب نے عجیب طریقے سے تین مختلف الفاظ کا خلط مبحث کر دیا ہے

(الف) یکہ۔ جس کا اطلاق ایک سواری پر ہوتا ہے جسے ایک گھوڑا کھینچتا ہے، اور اس کی طرف یکہ اُسے کہتے ہین جسے ایک بیل کھینچے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے دو اعتراض کیے ہین،

(۱) یہ لفظ ایک سے نکلا ہے لہذا الف سے شروع کیا جاے،

(۲) چونکہ اُردو لفظ ہے لہذا الف پر ختم کیا جاے،

ڈاکٹر صاحب کا پہلا دعوی صرف اس بنیاد پر ہے کہ فارسی مین یکہ نہین ہوتا کیا یہ ممکن نہین ہے کہ ہندوستان مین کسی فارسی خاندان کے شخص نے یہ نام وضع کیا ہو اور وہ مقبول عام ہو کر زبان مین داخل ہو گیا ہو علاوہ برین فیلولوجی کا پہلا اصول یہ ہے کہ سب سے پہلے الفاظ کے قدیم املے پر غور کرنا چاہیے تاکہ املے سے اس کے استخراج کا پتہ چل سکے مگر یہان تو ڈاکٹر صاحب نے ایک معمولی تاریخ سے لفظ کی فیلولوجی نکالی ہے، ممکن ہے کہ فارس مین یکہ ایجاد ہوا ہو مگر وہان نہ چل سکا۔ ہندوستان کی سڑکین زیادہ مسطح تھین یہان چل گیا۔ علاوہ برین ایک مدت دراز سے اہل ہند یکہ کو "ی" سے لکھتے چلے آئے ہین جس سے یہ صاف نمایان ہے کہ اس کا املا شروع ہی سے یونہی ہے

دوسری تجویز کہ یکہ کا آخری حرف الف ہونا چاہیے اس لیے بیکار ہے کہ جناب ڈاکٹر صاحب نے اپنا اصول بناتے وقت ACCENT پر بالکل غور نہین کیا۔ اس لفظ مین بھی آخر کے ماقبل ٹکڑے پر زور ہے اسلیے اسکو ہاے مختفی سے لکھنا چاہیے۔

(ب) تاش کا اکہ۔ یہ لفظ الف سے شروع ہوتا ہے اور ہاے مختفی پر ختم ہوتا ہے اس مین بھی آخر کے ماقبل ٹکڑے پر زور ہے اس لیے آخر کی آواز ضعیف ہے لہذا ہاے مختفی سے لکھنا ضروری ہے،

(ج) موم بتی کا اکا، عورتون کا زیور اکا۔ اکا دکا یہ سب الفاظ اردو زبان مین الف سے شروع ہوتے ہین اور الف ہی پر ختم ہوے ہین۔ ان مین آخر کے ٹکڑے پر زور ہے اس لیے الف سے لکھے جاتے ہین۔ ڈاکٹر صاحب نے

اپنا مضمون غالباً اس انداز سے لکھا ہے کہ بجائے اصول سمجھانے کے ان کو اور پیچیدہ کر دیا ہے

جو الفاظ ڈاکٹر صاحب نے اس ضمن مین بیان کیے ہیں ان سب مین سب سے زیادہ لفظ گرم مصالحہ پر بحث کی گنجایش ہے اس لفظ پر اکثر بحث ہو چکی ہے اور استاد الشعرا امیر احمد صاحب مینائی نے بھی اس لفظ کے متعلق اپنی راے دی ہے

جیسا مین پہلے عرض کر چکا ہون زبانون مین بعض الفاظ کا املا کچھ ہے اور تلفظ کچھ، یہ لفظ بھی انھین الفاظ مین سے ہے بظاہر تو اس کا املا عجیب معلوم ہوتا ہے مگر غور کرنے سے اس کے املا سے اس لفظ کی فیلولوجی کا پتہ چل سکتا ہے۔ گرم مصالحہ کے اجزا عموماً لونگ، سیاہ مرچ، بڑی الایچی ہین اب اگر آپ کسی قرابادین مین ان مفردات کے افعال و خواص دیکھین تو معلوم ہو گا کہ یہ سب کے سب گوشت کے مصلح ہین اور انکا مزاج گرم ہے غالباً اس وجہ سے انکا نام ابتدا مین گرم مصالح یا گرم مصلحات پڑ گیا ہو کثرت استعمال سے جاہل باورچیون اور خدمتگارون کے ہاتھون اس کا تلفظ بدل کر گرم مصالح ہو گیا جس کو بعض لوگ گرم مصالح اور بعض گرم مصالحہ لکھتے ہین۔

قاضی خورشید احمد (ایم، ایس، سی)

موج کوثر و تسنیم

جدون کے نگار مین آپنے جن تعریفی الفاظ کے ساتھ میرے کلام کو پبلک کے روبرو پیش کیا ہے وہ میرے لیے باعث فخر بھی ہین اور وجہ انفعال بھی۔ وہ اس لیے کہ آپکی پسندیدگی کوئی معمولی بات نہین اور یہ اس بنا پر کہ کاش کہ مین اسکی مستحق ثابت ہوتی مین نے چاہا تھا کہ ان "اوراق پریشان" کو تلاش کر کے آپ کے پاس بھیج دین لیکن پھر اس اندیشے سے کہ کہین آپ بنا تو نہین رہے اس خیال کو ترک کر دیا اگر آپ پھر اصرار کرینگے تو مین پھر غور کرونگی کہ تعمیل ارشاد ضروری ہے یا نہین۔ آج ہی صبح کو یہ چند شعر گنگناتے ہوئے ورانحالیکہ خود ان مین کوئی موسیقیت نہین،

آخر کار مجھے ضبط کا یارا نہ رہا　　یعنی امید کا بھی کوئی سہارا نہ رہا
سیکڑون بار مرا ہاتھ سے چھوٹا دامن　　سیکڑون بار مجھے ضبط کا یارا نہ رہا
کبھی آجاتے تھے ہنسنے کو مرے رونے پر　　میرا یہ عیش بھی اب تم کو گوارا نہ رہا
منہ پتنگے شمع کا چوما کیے　　اور یونہی تا صبح ہم دیکھا کیے

(نگار) یہ شاعری اور اس پر یہ انکسار، سواے اسکے کیا عرض کرون

چشم اگر این ست و ابرو این و ناز و عشوہ این　　الفراق اے ہوش و تقوےٰ، الوداع اے عقل و دین

انوارِ مستقبل

مرے حبیب وطن اے مرے حبیب وطن
مرے حبیب وطن

قریب جلوہ گری ہے شعاعِ مہرِ مراد
نظامِ تیرگیِ یاس ہو چلا برباد
پیام لائے گا خورشیدِ ہند زندہ باد
اٹھی ہے بامِ سما سے روشنی کی کرن
مرے حبیب وطن
پہونچ گئی تری آواز تا بہ عرشِ مجید!
دعا ہوئی تری مقبولِ بارگاہِ حمید!
قریب ہے ترے دورِ عظیم کی تجدید!
بھرے گا صدق کے پھولوں سے پھر ترا دامن
مرے حبیب وطن
ملے گی تیرے غریبوں کو دولتِ یزدان!
کہ پھوٹنے کو ہیں انوارِ برکتِ یزدان!
جھکی ہے تیری طرف چشمِ رحمتِ یزدان!
ہنسیں گی تیرے لیے راحتوں کی گنگ و جمن
مرے حبیب وطن

اب ایک صف مین کھڑے ہونگے قیصر و مزدور
اساسِ دہر بنے گا "ادارۂ جمہور"
کہ صبح امن و مساوات ہے قریب ظہور
بنے گا گھر ترا انوارِ قدس کا مسکن

مرے حبیب وطن

پیامِ روح سنائیگا ہر پیام ترا
دلوں کو نور سے روشن کریگا جام ترا
فرشتے دہر مین پھیلائینگے نظام ترا
پھر آستان ترا ہو گا امیدگاہ زمن

مرے حبیب وطن

تو ہی خدا کی محبت کے گیت گائے گا!
رہِ نجات زمانے کو تو بتائے گا!
چراغ معبدِ مشرق مین تو جلائے گا!
کرے گا شمعِ ھُدیٰ تو ہی دہر مین روشن

مرے حبیب وطن

تو شمعِ نور ہے مغرب کی رہبری کیلیے
تو ہی دلیل ہے مشرق کی برتری کیلیے
بنا ہے تاجِ وفا تیری سروری کیلیے
طواف زن ہے ترے آسمان کا چرخ کہن

مرے حبیب وطن

بہین گے دہر مین صدق و صفا کے چشمے پھر
اُٹھین گے ہند سے عشقِ خدا کے نغمے پھر
خدا کے گھر پہ جھکین گے خدا کے بندے پھر
رموزِ الفتِ یزدان تو ہی کرے گا علن

مرے حبیب وطن　　　　　روش صدیقی

نمودِ حسن

وہ ساعتِ شبِ آخر، وہ بارشِ انوار
وہ فرطِ کیف، وہ شانِ کمال جلوہ گری
خلا بسیط، نظر کامیابِ نظارہ
نشاطِ روح بہارِ لطافتِ سحری
تصورات میں مخمور و مست دیدہ و دل
تجلیات سے معمور فطرتِ بشری
نمودِ صبح نے توڑا طلسم شبِ آخر
حواسِ خمسہ سے زائل ہوئی وہ بیخبری

جو یک بیک نگہ شوق اٹھ گئی سوئے شرق
افق سے جھانک رہا تھا ستارۂ سحری

نشاطِ ذوقِ نظر، دل فروز، روح فزا
نمودِ حسن سرِ بامِ چرخ نیلو فری
نسیم وجد میں گلہائے باغ قہقہہ زن
طیور مستِ مئے شوقِ نغمۂ سحری
وہ دُر فشانیٔ شبنم بسبزۂ گلزار
وہ موجِ نکہتِ گل رشکِ نافۂ تتری
وہ خوش خرامیٔ دریا، وہ نزہتِ صحرا
وہ غم رُبا، وہ طرب زا تبسمِ سحری
وہ آمد آمدِ مہرِ مبین، وہ جلوۂ نور
وہ دل فریبیٔ منظر، وہ جنت نظری

نمودِ حسن بہر کیف ہے نقاب کشا،
اگر حجابِ حقیقت نہ ہو یہ بے بصری

کوکب شاہجہان پوری

رات

جاگ اٹھی انجمن ستارون کی — سج گئی بزم ماہ پارون کی
ٹھنڈی ٹھنڈی ضیائین پھیل گئین — چاندنی کی قبائین پھیل گئین
سو گئی کائنات کی شورش — عالم بے ثبات کی شورش
نیند کی سحر کار خاموشی — رات کی شاندار خاموشی
چھا گئی شش جہاتِ عالم پر — دار و گیرِ حیاتِ عالم پر
جذب ہین مستیان ہواؤن مین — کیف مستور ہے فضاؤن مین
خامشی مین سرود کی لے ہے — زمزمہ پیرا سکوت کی نے ہے
چاند سے سیلِ نور جاری ہے — راحتون کا سرور طاری ہے
جگنوون کی فضائین سوئی ہین — طائرون کی نوائین سوئی ہین
کشتیان چپ ہین بادبان چپ ہین — صاف بے داغ آسمان چپ ہین
باغ سنسان ہین شجر چپ ہین — کوہ بے جان ہین حجر چپ ہین
غم کی جان سوز آگ سوئی ہے — رشک سویا ہے لاگ سوئی ہے
جوشش ہنگامۂ خوشی چپ ہے — شور بیکار زندگی چپ ہے

الغرض سب جہان سویا ہے
نیند کی مستیون مین کھویا ہے

عدم

غزلیات

(طالب باغپتی)

جستجو میں ہر قدم پر ایک مشکل چاہیے — شوق تجدید خلش منزل بمنزل چاہیے
اور کچھ بیتاب سا، مضطرب سا اک دل چاہیے — دل تو ہے لیکن تری نظروں کے قابل چاہیے
میکدہ ہو، باغ جنت ہو، ہجوم حشر ہو — تیری محفل سے غرض ہے تیری محفل چاہیے
دل کی بیتابی پہ اف آداب زندان کی یہ قید — یعنی نالہ بھی ہم آواز سلاسل چاہیے
نجد کا ہر ذرۂ تاباں ہے نظارہ فروش — قیس لیلیٰ کیلیے اب اور محمل چاہیے
ہو گئے بیہوش موسیٰ، یہ بھی کوئی عشق تھا — آرزو دل میں بقدر ہمت دل چاہیے
آخری منزل پہ اف یہ شوق کی بیتابیاں — اور اس منزل سے آگے ایک منزل چاہیے
اب حقیقت کو سمجھتا ہوں تو جینا ہے وبال — یعنی پھر کوئی فریب نقش باطل چاہیے

ایک آنسو آنکھ سے طالبؔ نکل کر بہ گیا
یہ کہا تھا "عمر رفتہ تیرا حاصل چاہیے"

باسط بسوانی

جس کو عزیز جان ہو، تجھ سے وہ کیوں لگائے دل — لب پہ ہر جان نثار کے، ہائے جگر نہ ہائے دل
اس کی خطا ضرور ہے، جان کے جو لگائے دل — اس کا علاج کیا کرے، خود جو کسی کا آئے دل
اور کسی سے کیوں کہوں، اور کسی سے کیا غرض — آپ اگر سنیں کبھی، قصۂ غم سنائے دل
آتش غم سے آپ نے، دل کو مرے جلا دیا — آپ تو یہی خدا کرے، یونہی کوئی جلائے دل
دل کا میں حال کیا کہوں، دل کا نہ حال پوچھیے — سینے میں دل کہاں رہا، درد ہے اب بجائے دل

باسطؔ زار نے کہا، دشمن جاں سے رو کے یوں
تیری طرح نہ خاک میں، ہنس کے کوئی ملائے دل

(کوکب شاہجہان پوری)

آئینہ دار عکس تجلی لیے ہوئے
ہے ذرہ ذرہ حسن کی دنیا لیے ہوئے

جلوے ہیں بے قرار نمود آج کس لیے
پہنچا ہے کون دیدۂ بینا لیے ہوئے

کیا پوچھتے ہو کیفیتِ لذتِ خلش
جیتا ہوں دل میں خارِ تمنا لیے ہوئے

اللہ ری بے خودیِ محبت کہ دربدر
پھرتا ہے مجھ کو ذوقِ تماشا لیے ہوئے

یہ اور بات ہے کہ نہ ہو جراتِ سوال
جاتا تو ہوں ہجومِ تمنا لیے ہوئے

نظارۂ چمن ہی ہے کتنا نظر نواز
ہر گل ہے ایک جلوۂ رعنا لیے ہوئے

اک نشترِ نگاہ کی امید پر کوئی
بیٹھا ہے دل میں داغِ تمنا لیے ہوئے

کرنے لگا ہے حسن بھی اب احترامِ عشق
رہتا ہوں اپنے آپ کو آتنا لیے ہوئے

اصلِ حیاتِ عشق ہے رعنائیِ خیال
کوکب تصوراتِ دل آرا لیے ہوئے

(دل شاہجہانپوری)

جور و جفائے یار کا شکوہ نہ کیجیے
عشق وفا سرشت کو رسوا نہ کیجیے

یہ بھی ہے اک کرشمۂ حسنِ ستم ظریف
وعدہ تو کیجیے مگر ایفا نہ کیجیے

راہِ طلب میں ٹھوکریں کھا نیکے بعد بھی
کہتا ہے عشق ترکِ تمنا نہ کیجیے

رخصت ہوئے حواس یہ کہہ کر دمِ نگاہ
جانِ عزیز پر بھی بھروسا نہ کیجیے

حاصل تلاش دل کا ہے یہ کوئے عشق میں
جو کھو گیا پھر اس کی تمنا نہ کیجیے

مصروف جور آپ نہیں ہیں تو کون ہے
یہ کیا کہا کہ شکوۂ بیجا نہ کیجیے

کچھ تو ہو میری نامہ سیاہی پر التفات
اتنا نیازِ عشق کو رسوا نہ کیجیے

ان کی نظر اٹھے گی کبھی تو بے کرم!
حسنِ طلب یہی ہے تقاضا نہ کیجیے

خنداں ہے عشق دامنِ تر پر حیات دل
یوں اپنے حالِ زار پہ رویا نہ کیجیے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

جلد (۲۰) فہرست مضامین ماہ اگست ۱۹۳۱ء شمار (۲)

نگار

ایڈیٹر نیاز فتحپوری

جلد ۲۰ — اگست ۱۹۳۱ء — شمارہ ۲

ملاحظات

اصحاب علم و فضل ہمیشہ سے دو قسموں میں منقسم رہے ہیں اور رہیں گے ایک وہ جو کسی علم کی بنیاد ڈالتے ہیں جدید اصول بناتے ہیں اور اپنے اختراعات سے تربیت ذہن و دماغ کے لیے نئی راہیں نکالتے ہیں دوسری جماعت وہ جو صرف اسلاف کے چراغ سے اپنا چراغ روشن کرتی ہے مقررہ تصانیف و معینہ اصول کے مطالعہ ہی کو انتہائی کارنامہ اکتساب علم کا جانتی ہے اور جو سمجھتی ہے کہ تحقیق و تنقید اجتہاد و ابداع کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے اور علم کی تکمیل جو ہونا تھی ہو چکی ——— اول الذکر جماعت کی حالت یہ ہے کہ اگر اس کے نتائج تحقیق پر تنقید کی جاتی ہے تو وہ سکون دل کے ساتھ اسے سنتی ہے غور کرتی ہے اور پھر از سر نو سعی و عمل، جد و جہد میں مصروف ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ دنیا کو اس کی صحت و تکمیل پر ایمان لے آنا پڑتا ہے لیکن برخلاف اس کے دوسری جماعت کی حالت یہ ہے کہ جب اس کے معروضات پر گفتگو کی جاتی ہے تو وہ برہم ہو جاتی ہے اور اساطیر الاولین کی تمام حکایتیں منطق و فلسفہ کے تمام مغالطے، خرافیات تاریخی کے جملہ واقعات سامنے رکھ کر جواب دیتی ہے کہ کیا ان کے مقابلے میں کس کو دم مارنے کی مجال ہو سکتی ہے کیا کوئی انسان اس ذہن و دماغ کا پیدا ہو سکتا ہے جو تحقیقات ماضیہ کے سامنے سابقون الاولون کے علی الرغم لب کھول سکے ؟ کیونکہ نہ اب روح القدس باقی ہے نہ اُس کا فیض، اور اس لیے کس کو یہ کہنے کی جرأت ہو سکتی ہے کہ

دگیران ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

اس وقت اگر ان دونوں جماعتوں کا صریح و واضح مطالعہ کرنا ہے تو مغرب و مشرق کے علماء کا مطالعہ کیجیے اور اپنی بے بصری و بیچارگی پر جتنا ماتم بھی ہو سکتا ہو کر لیجیے کیونکہ اب اس کے بعد کوئی درجہ منزل فنا تک پہونچنے کیلیے ہم کو طے کرنا نہین ہے۔

اب سے چند سال قبل تک اہل مغرب کا ایمان تھا کہ ایتھر تمام فضا مین پایا جاتا ہے اور زمین کی کشش ہر وقت کارفرما ہے لیکن ایک شخص انیشتین نامی اُٹھتا ہے اور تمام گذشتہ تحقیقات کو باطل کرکے ایتھر کے وجود کو مہمل اور زمین کی کشش کو لغو قرار دیتا ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ اعوجاج زمان (Curvature of time) کا عجیب و غریب نظریہ پیش کرتا ہے لیکن نہ کوئی شخص اسے مردود و ملعون قرار دیتا ہے نہ اس پر مضحکہ اڑاتا ہے بلکہ ہر شخص غور کرتا ہے، سمجھتا ہے حتیٰ کہ اس کا جدید نظریۂ اضافیت (Relativity) مسلمات مین داخل ہو جاتا ہے۔

اس کے مقابلے مین ہمارے یہان کے علماء کو دیکھیے کہ اگر ان سے کہا جائے کہ "ہدیۂ سعیدیہ" مین جو دلائل گردش زمین کے ابطال مین پیش کیے جاتے ہین وہ لغو ہین "شرح چغمینی" مین جو مسائل ہیئت کے بتلائے جاتے ہین وہ تقویم پارینہ سے زیادہ حیثیت نہین رکھتے تو آستین چڑھا لیتے ہین اور اس کو کفر و الحاد قرار دے کر مذہب و سوسائٹی سے علٰحدہ کر دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہین کیونکہ ان کے نزدیک اب انسان سے غور و فکر، اختراع و ابداع، تحقیق و اجتہاد کی قوت چھین لی گئی ہے اور وہ مجبور ہے کہ اس سے قبل جو کچھ قدما لکھ گئے ہین، اُن پر بے چون و چرا ایمان لے آئے

حال ہی مین اس ذہنیت کا نہایت پر لطف منظر دیکھنا ہو تو اس بحث کو دیکھیے جو جناب ابوہریرہؓ کی موافقت قتل مرتد کی حمایت اور نگار کے مسلسل مضمون "مطالعۂ حدیث" کی مخالفت مین معارف اور سچ کے صفحات مین نظر آ رہی ہے

صفحے کے صفحے اس تحقیق مین صرف کر دیے گئے ہین کہ جناب ابوہریرہ نہایت ذی فہم و ذی ہوش تھے عہد نبوی مین وہ عاقل و بالغ کی حیثیت رکھتے تھے، رجال مین بڑے پایے کے ثقہ راوی مانے جاتے تھے، قدمائے اُن کے اقوال کو ہمیشہ صحیح باور کیا وغیرہ وغیرہ لیکن کسی ایک جگہ بھی مضمون کی اصل روح سے بحث نہین کی گئی جو ابوہریرہ پر جرح کی باعث ہے اور کوئی ضعیف سی کوشش بھی ان الزامات کے دور کرنے کی نہین کی گئی جو ابوہریرہ پر اصولاً و درایتہً روایات و احادیث کی نوعیت کو دیکھ کر وارد ہوتے ہین گویا بالفاظ دیگر یون سمجھیے کہ وہ رسول اللہ کو صرف ابوہریرہ کے ذریعے سے سمجھنا چاہتے ہین اور اس سلسلہ مین اگر رسول اللہ کے اخلاق پر کوئی حرف آئے یا ان کی تعلیمات پر اعتراض وارد ہو تو اس کے تسلیم کرنے پر مجبور ہین ۔ یہ انتہائی حد ہے اس کورانہ تقلید اسلاف پرستی کی

جس مین آج کل خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کا مولوی مبتلا نظر آتا ہے، وہ یہ گوارا کر سکتا ہے کہ رسول کی تنقیص ہو جائے، اسے یہ تسلیم ہے کہ تعلیمات اسلامی مسخ نظر آئین، وہ یہ منظور کر سکتا ہے کہ مذہب کا تعلق عقل و فہم سے بالکل نہ رہے لیکن ابو ہریرہ کو کوئی ٹوکے تو یہ اس کی برداشت سے باہر ہے کیونکہ اسکے نزدیک یہی اک شہر مین قابل رہا ہے

مولویون کی وہ جماعت جو تصنیف و تالیف سے کوئی تعلق نہین رکھتی اور صرف تقریر و مواعظ سے جاہل مسلمانون کو تباہ و برباد کر رہی ہے۔ یقیناً بڑی خطرناک چیز ہے لیکن میرے نزدیک اس سے زیادہ مہلک وہ جماعت ہے جو بدقسمتی سے تصنیف و تالیف کا بھی کچھ ذوق رکھتی ہے اور جو خدا معلوم کب سے غیر صالح ذخیرہ اپنی تحقیقات باطلہ کا فراہم کرتی چلی آ رہی ہے۔ ہر چند اس کے اثرات عوام پر تو زیادہ نہین ہین لیکن متوسط طبقہ جو کچھ لکھنا پڑھنا جانتا ہے ان کے تصانیف سے بری طرح اثر پذیر ہوتا ہے اور خود چونکہ اس طبقے مین کوئی اہلیت تنقید و تفتیش کی نہین ہوتی اس لیے وہ اُن موٹی موٹی کتابون سے جس مین ہر چار سطر کے بعد ایک سطر عربی کی ضرور نظر آتی ہے اور جن کے فٹ نوٹ مین بیسیون حوالے خدا معلوم کن کن قدیم و عجیب و غریب کتابونکے درج ہوتے ہین مرعوب ہو جاتا ہے، حالانکہ مذہب کو کتابون سے کیا واسطہ، اطمینان نفس کے لیے اس دفتر بے معنی کی کیا حاجت!

مولوی آج سے نہین بلکہ ہمیشہ سے نام ہے اس مخلوق کا جس نے صرف پرانی لکیر کو پیٹا اور خود سمجھ کر کبھی مذہب کو اختیار نہین کیا، وہ اگر مسلمان ہے تو صرف اسلیے کہ اس کا باپ مسلمان تھا اور اگر اسلام کو وہ سچا مذہب جانتا ہے تو محض اس بنا پر کہ اس کے اسلاف ایسا کہہ گئے ہین اسی لیے جب کوئی دوسرا اس سے کچھ دریافت کرتا ہے تو وہ تاریخ کی ورق گردانیان شروع کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھو فلان فلان اکابر و اعاظم یہی کہتے چلے آئے ہین اس لیے کوئی وجہ نہین کہ اس صورت مین ہم اپنی عقل سے کام لیں

بالکل یہی صورت ابو ہریرہ کے مسئلے مین پیش آ رہی ہے کہ وہ نہ تو اس حقیقت پر غور کرین گے کہ ابو ہریرہ سے جو احادیث مروی ہین وہ واقعی رسول اللہ سے منسوب کی جا سکتی ہین یا نہین، اگر منسوب نہین کی جا سکتین تو پھر دو ہی صورتین ہین یا تو اس سے انکار کیا جائے کہ ابو ہریرہ ان کے راوی ہین یا خود ابو ہریرہ کو غیر ثقہ راوی قرار دے کر ان احادیث کی صحت سے انکار کیا جائے مگر مولوی اس اصل چیز کو ہاتھ نہین لگاتا اور جواب مین وہ جو کچھ کہتا ہے اس کی نوعیت اس سے زیادہ نہین ہوتی کہ ابو ہریرہ کی دیانت پر شک کرنا جائز نہین کیونکہ وہ تو ابو ہریرہ ہین گویا ان کا صرف ابو ہریرہ ہونا کافی دلیل اس امر کی ہے کہ جو کچھ وہ کہین گے بالکل صحیح و درست ہو گا، خواہ اس دلیل کی بناء پر رسول کی رسالت ہی کو کیون نہ مجروح کرنا پڑے۔

انسان جب بہت زیادہ جاہل تھا تو اس نے دوسرے انسان کو خدا کہنے مین بھی تامل نہ کیا

اس کے بعد جب اس جہل مین کمی ہوئی تو نبی و رسول کہ کر اس کی پرستش کی لیکن غیر معمولی معجزات منسوب کر کے نبی آخر الزمان نے یہ کہہ کر کہ مین تمہاری ہی طرح ایک انسان ہون اور کوئی معجزہ اپنے ساتھ نہین لایا حقیقت کو ہمیشہ کیلیے بے نقاب کر دیا، لیکن انسان جو غلامانہ انقیاد و اطاعت اور مقلد ذہنیت کا عادی چلا آرہا تھا اس نے پھر بھی اپنی اس مکروہ عادت کو نہین چھوڑا اور اسلام کی اس غیر معمولی تعلیم کو جو انسان کو حریت فکر آزادی ضمیر کا درس دینے والی تھی نظر انداز کر کے سیکڑون خدا و رسول ایسے بنائے کہ ان کے مقابلے مین وہ سچے خدا و رسول کو بھی چھوڑنے کے لیے آمادہ ہے۔

ایک شخص کہتا ہے کہ ابو ہریرہ سے جو احادیث روایت کی جاتی ہین وہ یکسر رسول کی شان کے منافی ہین اس لیے ابو ہریرہ کو ساقط الاعتبار سمجھو یا رسول کو غیر صادق مدعی رسالت، اس کا جواب مولوی جماعت کی طرف سے صرف یہ دیا جاتا ہے کہ ابو ہریرہ کی ذات طعن و جرح سے بہت بلند ہے مدعا یہ کہ رسول کو خواہ کوئی رسول مانے یا نہ مانے لیکن ابو ہریرہ کے ثقہ ہونے مین کسی کو مجال گفتگو نہین ہو سکتی،

کیا اس سے زیادہ مکروہ مثال شخص پرستی کی کوئی اور ہو سکتی ہے، کیا اس سے زیادہ سخت لعنت تقلید کی کوئی اور پیش کی جا سکتی ہے۔

چشم اگر این است و ابرو این و ناز و عشوہ این
الفراق اے ہوش و تقوی الوداع اے عقل و دین

گذشتہ ماہ مین متعدد رسول نمبر مختلف رسالون کے موصول ہوے اور ہر سال ربیع الاول مین اس نوع کے مخصوص اڈیشن شایع کرنا بعض رسائل و اخبارات کی سنت دیرینہ ہے ممکن ہے بعض حضرات اسکو اشاعت مذہب و ترقی اسلام سے تعبیر کرین لیکن مین یہ سمجھتا ہون کہ جس قدر کمی صحیح جذبۂ دینی مین پیدا ہوتی جا رہی ہے اتنی ہی زیادتی ان نمبرون مین پیدا ہو رہی ہے،

اس نوع کے لٹریچر کی کثیر اشاعت مذہب کو عمل کے دائرے سے ہٹا کر صرف مقالی حدود کا پابند بنانا چاہتی ہے جو یقیناً ایک مذہب کی توہین ہے۔ یہ نکتہ ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ درس عمل ہمیشہ عمل کے ذریعے سے کامیاب ہوا کرتا ہے اور وہ لوگ جو رسول نمبر صرف ثواب آخرت اور حصول حور و قصور کی توقع پر نہین نکالتے بلکہ واقعی اس کو کوئی خدمت دینی سمجھتے ہین ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اس طرح کے رسائل نکالکر مذہب کے وزن کو کم کر رہے ہین۔ اور ان کی یہ سطحی خدمت اسلام کو جس انداز مین پیش کر رہی ہے وہ اسے صرف حکایات و روایات کا مجموعہ بنا دینے والا ہے یا رسم و رواج کا پابند،

علاوہ اس کے یون بھی اصولاً ایک ہی بحث و موضوع پر ہمیشہ غیر متنوع لٹریچر پیش کرتے رہنا طبائع انسانی پر بار ہو جاتا ہے اور بجائے دلچسپی کے ایک قسم کا احتراز و گریز پیدا ہونے لگتا ہے

مذہب مین قسم کھانے کو اسی لیے منع کیا گیا ہے کہ یو ہین ہر وقت اور بلا ضرورت خدا کا نام بار بار لینا خدا کی عظمت و اہمیت کے خیال کو کم کر دیتا ہے کیونکہ فطرت انسانی یہی ہے، کیا بالکل یہی حکم ان رسول نمبرون پر منطبق نہین ہوتا کہ اس طرح ان کی عمومیت و سطحیت پیغمبر کی عظمت کو کم اور غور و فکر کی عادت کو لوگون سے محو کر دینے والی ہے۔

اس کے ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہین کہ ان اشاعتون مین رسول کے متعلق جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ بڑی حد تک غیر صحیح ہوتا ہے تو اور زیادہ افسوس کرنا پڑتا ہے کہ جس چیز کو خدمت سمجھ کر پیش کیا جاتا ہے وہ دراصل دشمنی و بیخ کنی ہے

بہر حال میرے نزدیک یہ طریق کار مستحسن نہین ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ مالکان اخبار و رسائل جو پابندی کے ساتھ ہر سال اس طرح کے مخصوص نمبر شایع کرتے ہین خود بھی غور کرین گے کہ جو کچھ مین نے عرض کیا اس مین کوئی حقیقت ہے یا نہین

یہ خدا کی عنایت ہے جس کو چاہے جس خدمت کیلیے چن لے اور اس سے کام لے، ایسے ہی لوگون مین سے ایک ہستی سید مبارک شاہ جیلانی کی ہے جنھون نے کئی سال ہوئے ریاست بھاولپور سے دور ایک مقام سنجر پور مین لائبریری قائم کی محض اس لیے کہ وہ اپنے وطن کے لوگون مین ذوق علم و ادب پیدا کرین۔ ہمین معلوم ہے کہ سید مبارک شاہ نے اس مقصد کے لیے کتنا ایثار کیا اور کر رہے ہین وہ نگارستان کے نام سے ایک رسالہ بھی اس لائبریری سے شایع کرنا چاہتے ہین آرزو مند ہین کہ ارباب علم و قلم ان کی اعانت کرین باشندگان بھاولپور اور حکومت بھاولپور پر جتنے حقوق ان کے ہوسکتے ہین ظاہر ہین اور ہمین امید ہے کہ وہ ان کو ادا کرنے کی پوری سعی کرینگے لیکن ضرورت ہے کہ ملک کے اور افراد بھی سید صاحب موصوف کی اس شفتگی علم و ادب کی قدر کرین اور جو امداد ان کے امکان مین ہو اس سے دریغ نہ فرمائین

اب سے تقریباً سات سال قبل جب مین کشمیر گیا تھا تو وہان کے مسلمانون کی بے حس زندگی اور شدت نکبت و افلاس کو دیکھ کر مین نے یقین کر لیا تھا کہ یہان کے مسلمانون مین کوئی جنبش پیدا ہونا محال ہے کیونکہ اول تو یہان حکومت غیر مسلم ہے جسے کوئی خاص ہمدردی ان کے ساتھ نہین ہوسکتی اور اگر غیر مسلم نہ ہو تو بھی ان کا دماغی انحطاط

ان کی واہمہ پرستی اور ان کی پابندی رسم و رواج اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ مشکل سے کبھی ان کو اپنی ذلت و خواری کا احساس ہو سکتا ہے۔ اسی لیے جس وقت یہ خبرین میرے کانون تک پہونچین کر وہان کے مسلمانون نے جیل پر حملہ کر دیا، دوکانین لوٹ لین، فوج و پولیس کا مقابلہ کیا تو مین حیران و ششدر رہ گیا کہ ایسی سوئی ہوئی قوم مین یہ بیداری اور بیداری بھی اس خطرناک حد تک کیونکر پیدا ہوئی۔ اگر وہ تمام بیانات صحیح ہین جو ان کے متعلق حکومت کشمیر کی طرف سے شایع کیے جا رہے ہین تو شاید ہی کوئی سنجیدہ مسلمان ایسا ہوگا جو ان کے امن شکن حرکات کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے۔ لیکن اس سے بہرحال کسی طرح انکار نہین ہو سکتا کہ اہل کشمیر اب خواب غفلت سے چونک پڑے ہین اور اگر ایسے وقت مین ان کی اس بیداری سے صحیح معنی مین مفید کام لینے والا کوئی شخص اٹھ کھڑا ہوا تو اس قوم کا مستقبل خدا جانے کیا ہو جائے، چونکہ پبلک کی طرف سے ابھی تک کوئی بیان وہان کے حالات کے متعلق شایع نہین ہو سکا، اور نہ کمیٹی نے واقعات کی تحقیق شروع کی ہے اس لیے اس برہمی کے اسباب ابھی تک معلوم نہین ہو سکے لیکن یہ یقین ہے کہ وہ اسباب جو کچھ بھی ہون اور ان مین خواہ کتنی ہی غلط فہمی اہل کشمیر کی کیون نہ شامل ہو لیکن یہ یقینی ہے کہ تحریک تھی نہایت زبردست ورنہ یہ فاقے کر کرکے خوشی سے زندگی بسر کرتے رہنے والی قوم کیا یون آسانی سے چونک سکتی تھی۔

پھر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی تیاریان ہو رہی ہین اور پھر لوگ اسی قبلۂ مقصود کے لیے رخت سفر باندھ رہے ہین جہان سے ایک بار وعدۂ فردا کا نوید مسرت لے کر واپس آئے تھے۔

اگر سعی و عمل اور اصرار جد و جہد کا کوئی نہ کوئی نتیجہ اسی دنیا مین پیدا ہونا قانون فطرت ہے تو کوئی وجہ نہین کہ یہ تگ و دو بیکار ثابت ہو اور ہندوستان اپنی غلامی کی لعنت کو زیادہ عرصے تک گوارا کرتا رہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جس وقت عمل کے لحاظ سے تقسیم برکات کا سوال پیدا ہوگا اس وقت مسلمانون کو سوراج کی طرف سے کوئی عطیہ پیش کیا جائے گا، یا حکومت برطانیہ کی جانب سے، شوکت علی اینڈ کمپنی کا اصرار یہ ہے کہ وہ حکومت ہی کے سامنے دست سوال پھیلائین، کیونکہ بہرحال وہ اہل کتاب مین سے ہین اور ہندو کافر و بت پرست ہین جن سے اتحاد عمل مذہباً و شرعاً ممنوع ہے لیکن ڈاکٹر انصاری کی جماعت کہتی ہے کہ اگر سوراج سے مراد واقعی ہندو راج ہے اور مسلمانون کیلیے ہلاکت ہی مقسوم ہو چکی ہے تو وہ اپنے اہل ملک کے ہاتھ سے ذبح ہو جانا زیادہ پسند کرتے ہین بہ نسبت اس کے کہ غیر ملک و قوم والون کی غلامی مین انھین زندگی بسر کرنا پڑے

ہر شخص کا نظریہ جدا ہوتا ہے اور اس کا ذوق علیحدہ اس لیے کس کو حق حاصل ہے کہ وہ جناب شوکت علی کے دل سے ان کے جذبۂ محبت کو نکال دے لیکن اگر چارہ کار اب کوئی باقی نہین رہا ہے تو مین ڈاکٹر انصاری کو

مشورہ دون گا کہ وہ فریق مخالف کی تمام شرائط کو بلا استثنا تسلیم کرلین اور خود بالکل نیوٹرل ہو کر اس کو اسی کے حال پر چھوڑ دین کیونکہ جب خود غرضی و بے عقلی خود رائی و نفسانیت کی حد تک پہونچ جاے تو پھر اس کا علاج یہی ہوا کرتا ہے

بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

اگر ان کی سمجھ مین نہین آتا کہ جداگانہ انتخاب مسلمانون کے لیے کس قدر نقصان رسان ہے تو وہ شوق سے اس کا تجربہ کرلین اور اگر زمانے کو بہترین درس ادب دینے والا کہنا غلط نہین تو خود انکو معلوم ہو جائے گا کہ انھون نے کس کے پاؤن پر کلھاڑی ماری تھی اور یہ کہ ایک احمق ضدی کا آل کیا ہوا کرتا ہے

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس مین کنسرویٹو جماعت پورا فائدہ اس اختلاف سے اٹھانا چاہیگی اور کہدیگی کہ جب ملک کے تمام افراد کسی ایک مطالبے پر متفق نہین ہین تو فیصلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے اس لیے اسکا جواب اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ اختلافی صورت باقی نہ رکھی جاتے اور تھوڑی دیر کے لیے دو دشمنون مین سے ایک ضعیف دشمن کو برقرار رکھنے پر رضامندی ظاہر کرکے آیندہ کے لیے محاذ کی پراگندگی کو دور کر دیا جائے،

بعض اخبارات لکھ رہے ہین کہ تمام ہندو مسلمانون کے دشمن ہین اور وہ یہان صرف ہندو راج قائم کرنا چاہتے ہین یہان تک کہ مہاتما گاندھی بھی اسی مقصد کو لیے ہوے کام کر رہے ہین۔ ہم تھوڑی دیر کیلیے تسلیم کرلیتے ہین کہ یہ بدگمانی بالکل درست ہے اور ہندو یہان خالص اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہین لیکن مسلمانون کیلیے سوال یہ ہے کہ اگر وہ ہندو راج کو پسند نہین کرتے تو کیا وہ راج جس مین زندگی بسر ہو رہی ہے غیر مسلم راج نہین۔ یقیناً وہ نہ صرف غیر مسلم بلکہ غیر ملکی بھی ہے۔ پھر اگر موجودہ اختلاف سے واقعی صحیح معنی مین کوئی مسلم حکومت یہان قائم ہو سکتی ہے تو ہر مسلمان ساتھ دینے کیلیے آمادہ ہو سکتا ہے لیکن جب اسکی توقع نہین اسکا امکان نہین، تو پھر میری سمجھ مین نہین آتا کہ کیون دو صورتون مین سے اس ایک صورت کو اختیار نہین کیا جاتا جس کا مقابلہ زیادہ آسان ہے۔

مذاکرات نیاز کے نام سے میری ڈائری کے منتشر اوراق یکجائی کتابی صورت مین پریس جا چکے ہین اور کچھ اجزا چھپ بھی گئے ہین ——— اس ڈائری کے بعض حصے ایسی مخصوص کیفیات کے ماتحت قلمبند ہو گئے ہین کہ اب کوشش کے بعد بھی مشکل ہی سے انکو دوبارہ طاری کیا جا سکتا ہے ——مین بے انتہا شکر گذار ہون ان حضرات کا جو لالہ رخ اور نقاب اٹھ جانیکے بعد طلب فرما رہے ہین اور وی پی پارسل قبول کر رہے ہین۔ یقیناً ایک رسالے کی بہترین امداد یہی ہے کہ آپ اسکے مطبوعات کو شرف قبولیت عطا فرمائین، اگر آپ نے اس ڈائری کو بھی اس عزت سے سرفراز فرمایا تو نگار آپکے اس کرم سے کبھی سبکدوش نہین ہو سکتا

——— نیاز ———

مطالعۂ حدیث تنقید صحیح کی روشنی مین

اوقات صلوٰۃ

نماز اسلام کی ویسی ہی علامت ہے جیسے ہندون مین گائے کا احترام اور یہودیون مین سبت اور عیسائیون مین صلیب۔ یہ ہی ایک چیز ہے جس سے ایک مسلم کی غیر مسلم سے تمیز ہو سکتی ہے اس لیے عملی اسلام مین ما راز و رنماز پر ہے، نماز کئی چیزون کا مجموعہ ہے، خدا کی تقدیس و تسبیح و تکبیر کے ساتھ سیدھے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا، جھکنا، سجدہ کرنا طہارت لباس و بدن کے ساتھ، اصل نماز تو یہ ہے کہ خدا کی تقدیس و تسبیح کی جائے کھڑے ہو کر سر جھکا کر اور سجدے مین اور جس نماز مین یہ باتین شامل نہ ہون وہ نماز نہین ہے مگر مسلمانون مین نماز کے ساتھ ابراہیم اور حضرت محمدؐ پر درود بھیجنا اور پھر دونو طرف کراما کاتبین کو سلام کرنا اور دعا مانگنا بھی ضروری ہے اگرچہ قرآن سے یہ باتین ثابت نہین۔ بنی اسرائیل کے انبیاء تقدیس و تہلیل کو قبل طلوع آفتاب و قبل غروب آفتاب[۵۱] اور رات کے وقت فرض جانتے تھے اور نماز کے اندر وہ ہیکل یروشلم کیطرف رخ کرتے تھے چنانچہ دانیال کی کتاب[۵۲] مین دانیال نبی کا ان اوقات مین مشرق کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے کا ذکر ہے۔ لیکن جو چیز غیر خدا کے لیے کی جائے وہ نماز مین شامل نہ سمجھی جائے گی۔ یہودیون مین سخت ممنوع تھا کہ خدا کی تہلیل و تسبیح کے ساتھ کسی انسان کا ذکر بھی ہو حتی کہ موسیٰ اور عُزیر کا نام بھی نہ لیا جاتا تھا۔ جب خدا کی تکبیر کے بعد نمازیون کی جماعت کھڑی ہوتی تھی تو بالعموم اس مین وحی یا الہام کے چند مخصوص جملے خصوصاً زبور اور شریعت موسے کے احکام پڑھے جاتے تھے۔ یہود سجدہ[۵۳] کرتے تھے مگر سامری یہودیون مین سجدہ کیا جاتا تھا فی زمانا یہود نماز کے وقت کھڑے نہین ہوتے بلکہ ننگے سر ہو کر بیٹھتے ہین اور نوشتہ جات کو اپنے سامنے کھول لیتے ہین۔ یہودیون مین یہی فرض تھا کہ جہان نماز پڑھی جائے اور جس لباس مین نماز پڑھی جائے وہ طاہر[۵۴] ہو۔

---

۵۱ Gemara Berachoth سوائے صابیون کے تمام مذاہب سامیہ مین نماز کے اوقات یہی تھے، صابیون نے نماز کے سات اوقات مقرر کیے تھے (یہود کے اوقات صلوٰۃ کے بارے مین دیکھو قرآن فخرج علی قومہ من المحراب فاوحی الیھم ان سبحوا بکرۃ و اصیلا (مریم ۱۱) واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغداوۃ والعشی (کیف)۔ ۵۲ کتاب دانیال باب ۶ آیت ۱۰

۵۳ گربی پاک کا قول ہے کہ یہود اپنے خاص عبادت مین پیشانی زمین پر رکھتے تھے ۵۴ Halachoth Tefhile ابن میمون

صلوٰۃ عربی مین نماز کو کہتے ہین، نماز عجمی لفظ ہے اور اس کی اصلیت اور سنسکرت کے لفظ نمسکار کی ایک ہی ہے، صلوٰۃ کے لفظی معنی کیا ہین اس کے معنی مین بہت اختلاف ہے بعضون کی رائے ہے کہ صلوٰۃ صلوین یعنی جوتڑ دن کے ہلانے کے معنی مین آیا ہے بعضون نے کہا ہے کہ صلاۃ کے معنی دعا اور درود کے ہین بعضون نے کہا ہے کہ صلوٰۃ کے معنی کسی طرف جھکنا ہے یا اونٹ کی نشست ہے لیکن درحقیقت یہ لفظ عربی کا نہین بلکہ اسوری لفظ ہے جس کے معنی بھیک مانگنا ہو اور عبرانی مین بھی جیسا مصنف تاریخ فقہ اسلامی کا قول ہے صلوٰۃ کی اصطلاح نماز کے لیے ہے گو کہ موجودہ یہود مین یہ لفظ استعمال نہین قرآن مین نماز کی ترکیب و ترتیب کا ذکر نہین البتہ صلوۃ کے لفظ سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ نماز مین پہلے کھڑے ہوتے تھے اور سجدے کے بعد نماز کو ختم کر دیتے تھے اور التحیات وسلام وغیرہ کا کوئی اشارہ نہین پایا جاتا، قرآن کی دوسری آیتون سے بھی رکوع، سجدہ، قیام ثابت ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے جس ترکیب و تعدیل سے نماز پڑھی تھی وہی طریقہ مسلمانون کی نماز کا ہے صرف چند فروعی باتون مین اختلاف ہو تو ہو کیونکہ یہ ایسا مشہور و ظاہر فعل تھا کہ کثرت سے لوگون نے رسول اللہ کی نماز مین اقتدا کی پھر اخلاف نے اسلاف کو دیکھا اور یہ ناممکن ہے کہ سلسلہ بہ سلسلہ وہ طریقہ جاری نہ رہتا اور بھلا دیا جاتا قرآن شریف نے اس واسطے نماز کے طریقہ و ترکیب و ترتیب سے اعراض کیا ہے کہ اس کی ضرورت رسول کے خود عمل سے باقی نہ رہتی تھی اور اس مین یہ بھی مصلحت تھی کہ قومون کے اختلاف عادت و معاشرت مین قرآن کا ایک خاص طریقے پر اصرار کرنا یا اس کو فرض کر دینا مناسب نہ تھا البتہ قرآن نے اوقات کی صراحت پر زیادہ زور دیا ہے اور یہ صرف اس لیے کہ بغیر وقت کی پابندی کے نماز کی تشکیل ہو ہی نہین سکتی، قرآن نے اوقات صلوٰۃ مین مذاہب سامیہ قدیم کی تعیین کو مناسب سمجھا اور ان اوقات مین انسان کی ان آسانیون کا لحاظ رکھا گیا ہے جب کہ انسان فی الواقع نماز کے لیے رجوع قلب سے حاضر ہو سکتا ہے یہ وہی اوقات ہین جب آدمی اپنے مشاغل کاروباری زندگی سے فرصت پاتا ہے۔ یعنے جب وہ سو کر اٹھتا ہے، یا جب سونے کے لیے بستر پر جاتا ہے اور جب شام کو فارغ ہو کر اپنے گھر کو لوٹتا ہے، قرآن نے اکثر سورتون مین وقت کی تعیین کی ہے مثلاً۔

سو تکیہ (۱) وسبح بحمد ربك حین تقوم ومن اللیل فسبحہ وادبار النجوم (الطور ۴۸-۴۹) — (۱) اور خدا کی تسبیح کرو جب کہ تم اٹھتے ہو اور رات کو اس کی تسبیح کرو اور ستارون کے چھپ جانے کے بعد

(۲) وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس وقبل الغروب ومن اللیل فسبحہ وادبار السجود (ق ۳۹-۴۰) — (۲) اور خدا کی تسبیح کرو قبل طلوع آفتاب و قبل غروب آفتاب اور نماز دن کے بعد بھی۔

(۳) وتسبحوہ بکرۃ واصیلا (فتح ۹ الاحزاب ۴۱) — (۳) اور صبح و شام خدا کی تقدیس کرو۔

(۴) واقم الصلوۃ طرفی النھار وزلفا من اللیل (ھود ۱۱۴) — (۴) اور نماز پڑھو دن کے دونون کنارے پر اور رات کے پہلے حصہ مین

(۵) واذکر ربک فی نفسک تضرعا وخیفة ودون الجهر من القول بالغدو والاصال (الاعراف ۲۰۵)

(۵) اور اپنے رب کا ذکر چپکے چپکے عاجزی اور گڑگڑا کر صبح و شام کرو اور غافلون مین مت ہو۔

(۶) فاصبر علی ما یقولون وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل غروبها ومن اناء اللیل فسبح واطراف النهار لعلک ترضیٰ (طٰه ۱۳۰)

(۶) اور صبر کر ان باتون پر جو یہ لوگ کہتے ہین اور اپنے رب کی تسبیح کرو ساتھ حمد کے قبل طلوع آفتاب و قبل غروب آفتاب اور رات کے تھوڑے حصہ مین تسبیح کرو اور دن کے دونون طرف شاید تو راضی ہو،

(۷) واقم الصلوٰة لدلوک الشمس الی غسق اللیل وقرآن الفجر ان قرآن الفجر کان مشهودا ومن اللیل فتهجد به نافلة لک عسیٰ ان یبعثک ربک مقاما محمودا (بنی اسرائیل ۷۸، ۷۹)

(۷) اور نماز پڑھو آفتاب کے ڈھلنے سے جب تک کہ وہ رات مین چھپ جائے اور صبح کا قرآن بیشک صبح کا قرآن دیکھا جاتا ہے اور رات کی تہجد تو تیرے لیے نفل ہے۔ شاید اس وجہ سے تیرا خدا تجھے مقام محمود تک بلند کر دے۔

(۸) حافظوا علی الصلوات والصلوٰة الوسطیٰ وقوموا لله قانتین (بقرہ ۲۳۸)

(۸) اور نمازون کی حفاظت کرو خصوصاً نماز وسطیٰ کی اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو۔

قرآن کے اوقات نماز مین اوپر کی آیت پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ قرآن سے جو اوقات نماز واضح ہین وہ صرف فجر، عصر اور عشا کی نماز کے ہین۔ ظہر اور مغرب کی نماز کا کہین ذکر نہین اور یون بھی درحقیقت ظہر اور مغرب کوئی وقت نہین بلکہ بعض اوقات عصر و عشا مین تقدیم و تاخیر سے پیدا ہو جاتے ہین۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کبھی عشاء کی نماز جلدی پڑھ لی کبھی دیر کر کے اسی طرح ظہر کی نماز کبھی دن ڈھلنے کے اول وقت پڑھ لی اور کبھی دن ڈھلنے کے آخر وقت۔ دیکھنے والون نے یہ سمجھا کہ آپ نے دو علیحدہ اوقات مین نماز ادا کی اور چونکہ آپ فرض نمازون کے علاوہ نوافل کثرت سے پڑھتے تھے لوگون نے گمان کیا کہ آپ نے دو وقت کی نماز ادا کی، لیکن ایسا بھی ہوا کہ آپ نے ادا کی اور بعضون نے یہ گمان کیا کہ آپ نے دو وقتون کی نماز جمع کر لی۔ ہم روایات حدیث کی جانچ پرتال اسی روشنی مین کرین گے کیونکہ میرا اپنا خیال ہے کہ فرقہ مانویہ زنادقہ کے لوگ جو پانچ وقت کی نماز پڑھا کرتے تھے انھون نے حدیث مین خصوصاً حدیث معراج مین بہت کچھ تدلیس کی ہے اس کی بھی تحقیق حدیث کی روشنی مین ضروری ہے، کیونکہ یہ منافقین اسلام پر عجیب طرح سے حملے کرتے تھے ظاہراً وہ اسلام کی طرف داری کرتے تھے مگر باطناً وہ اسلام اور مسلمانون کی جڑ کاٹنے کی فکر مین رہتے تھے اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اوقات صلوٰة مین قرآن سے زائد اوقات زنادقہ کی وجہ سے پیدا ہوئے تو اس کا یہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ وہ مسلمانون کو معاشرتی و کاروباری ترقی سے عاری کرنا چاہتے تھے اور اس کے ساتھ اسلام کو ایک سخت و ناقابل عمل مذہب دکھلا کر عوام کو اس سے برگشتہ کرنا چاہتے تھے مجھے یہان اس بات کا بھی اعتراف کر دینا چاہیے کہ ہر چند یہ تحقیق فون کریمر و گولڈزیہر جرمن مستشرقین کی ہے۔ مگر مین

ان کے خیالات کو ان صفحات پر نہ لاؤں گا۔ اوقات صلوٰۃ پر گو لاذ زہر ایک مستقل مضمون کتاب "مطالعۂ علوم اسلامی" میں ہے اور اسپوزمانے انگریزی میں اس کی زیادہ وضاحت کرکے ایک علیحدہ رسالہ ترتیب دیا ہے اور ولہاسن نے بھی اس مضمون پر اپنی رائے ظاہر کی ہے، البتہ یہاں پر ایک عجیب و دلچسپ نکتہ قارئین سے معذرت کرتے ہوئے بیان کرنا چاہتا ہوں نہ اس لیے کہ میں اس پر استناد صدقتا کہتا ہوں بلکہ اس لیے کہ اس میں ایک تاریخی تحقیق بھی ہے عیسائیوں میں بھی نماز کے یہی اوقات تھے۔

ماٹن Matten صبح کی نماز، وجل Vigils رات کی نماز اور ایک عصر کی نماز نسطوری فرقہ جب ایران میں پہنچا تو اس وقت مانوی فرقہ کا وہاں زور تھا اور اس فرقے نے نسطوری فرقے سے مل کر مذہب کی ایک عجیب ہیئت پیش کی نسطوری فرقہ سے ایک فرقہ Manichaeans پیدا ہوا جس نے دن رات میں دس وقت کی نماز اپنے اوپر فرض کر لی یعنی پانچ دن میں اور پانچ رات میں۔ ایشیائے کوچک میں ایک اور فرقہ عیسائیوں کا تھا جو مجوس کے زیر اثر تھا اس نے بھی پانچ وقت کی نمازیں اپنے اوپر فرض کر لیں Manichaeans فرقہ زمانۂ وسطے تک یورپ میں پایا جاتا تھا اور اس کے پیرو خصوصاً سرویا اور بوسینہ میں تھے۔ پاپائے روم نے ان پر سختیاں کیں تو وہ سب مسلمان ہوگئے۔ کہتے ہیں کہ ان کے مسلمان ہونے میں اوقات صلوٰۃ جو مسلمانوں کی طرح تھے زیادہ موثر ہوئے بالکل ایسا ہی ایک دوسرا نکتہ رجم زانیہ کے بارے میں ہے۔ توریت میں زناکاروں کے لیے رجم کا حکم نہ تھا مگر یہود عمل کرتے تھے۔ جب حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ آیا تو یہود ایک زانیہ کو حضرت مسیحؑ کے سامنے آزمائشاً لائے کہ دیکھیں آپ اس کو سنگسار کرتے ہیں یا نہیں مگر حضرت مسیحؑ نے اس کا یہ جواب دیا کہ زانیہ پر پہلا پتھر وہ مارے جو بالکل اس گناہ سے صاف ہو یہود اپنا سا منہ لے کر چلے گئے موجودہ محققین اناجیل کی رائے ہے کہ یہ واقعہ جو یوحنا کی انجیل میں پایا جاتا ہے الحاقی ہے مگر بالکل یہی بات یہود نے آنحضرت کے سامنے بھی کی اور آپ نے اسکے جواب میں فرمایا کہ کتاب اللہ میں رجم کا حکم نہیں اور میں رجم کا حکم دیتا ہوں۔ مسلم بن عبداللہ بن اوفی کی ایک روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلعم کو رجم کا حکم دیتے ہوئے سنا ہے، راوی نے دریافت کیا کہ کیا یہ حکم سورۂ توبہ کے پہلے دیا تھا یا بعد کو عبداللہ ابن ادریس نے کہا کہ مجھے علم نہیں۔

فقہ و حدیث کی تدوین سے قبل مسلمانوں کا ایک فرقہ نہایت سختی سے قرآن پر عمل کرتا تھا اور یہ لوگ جو تاریخ میں خوارج کے نام سے مشہور رہیں درحقیقت اصل اہل قرآن تھے اور صرف اسی تصور میں وہ مارے گئے کہ وہ قرآن کے آگے کسی زید و عمر کی رائے قبول نہ کرتے تھے خوارج اپنے کو اباضیہ کہا کرتے تھے اور یہاں بھی ایک دلچسپ تاریخی نکتہ یہ ہے کہ نصرانیوں کا ابتدائی فرقہ بھی اباضیہ کہلاتا تھا یعنی . . . . جو اباضیہ کا ہم معنے و مترادف ہے خیر۔ خوارج کو اطرافیہ بھی کہتے ہیں اس واسطے کہ ان کی نمازیں تین وقت ہوا کرتی تھیں۔ اور وہ

اطراف النہار والی آیتوں سے نماز کے اوقات کی تعیین کرتے تھے فون کریمر نے اس فرقے کی تاریخ اپنے تمدن اسلام میں لکھی ہے مگر ہمارے سامنے حدیث میں بھی بہت کچھ مواد اس فرقے کے بارے میں ملتا ہے جو آگے بیان ہوگا۔ باطنیہ کا ایک فرقہ جس کے پیرو سمرقند و بخارا میں اب بھی پائے جاتے ہیں وہ بھی تین وقت کی نماز پڑھتے تھے اور یہاں ایک مزیدار بات یہ ہے کہ خلافت مہدی میں خوزستان کے ایک عرب نے جس کا نام طاہر تھا اپنے اوپر پچاس اوقات کی نماز فرض کر لی تھی اس کے پیرو اپنا تمام کاروبار چھوڑ کر لگے ہر وقت نماز پڑھنے اس سے سخت اختلاف پیدا ہوا اور خانہ جنگی کی نوبت آئی بالآخر یہ فرقہ تباہ ہوا اور اسی فرقہ سے بعد کو باطنیہ فرقہ نکلا ہے کیا عجب کہ ظاہریت کا Reaction باطنیت میں ہو اور ان کے بعض فرقوں نے نماز کے اوقات گھٹا کر وہی کر لیے ہوں جو مسلمانوں پر قرآن میں فرض کیے گئے تھے۔

ابن عباس کی روایتیں گو بالعموم مستند نہیں ہیں کیونکہ اول تو وہ آنحضرت صلعم کے زمانۂ مبارک میں بالکل کم سن بچے تھے۔ دوسرے وہ حضرت علیؓ کے طرفداروں میں تھے اور بنی امیہ حضرت علی اور ان کے طرفداروں کے سخت دشمن تھے اور ان کی کوئی بات سننا نہ چاہتے تھے اور اگر حدیثوں کی روایتیں بنی امیہ کے زمانے میں شروع ہوئیں تو وہ مخصوص ان ہی لوگوں سے تھیں جو بنی امیہ کے وظیفہ خوار تھے۔ ابن عباس حضرت علی کے ساتھ کوفے میں تھے اور جب حضرت علی کو ابن ملجم نے شہید کیا تو ابن عباس بیت المال سے روپیہ نکال کر حجاز کو چلے گئے امام حسن نے اس روپئے کا دعوے کیا اور کریمر کا خیال یہ ہے کہ ابن عباس نے امام حسن اور عبداللہ بن زبیر والوں کے خلاف بنی امیہ کے ساتھ مل کر سازش کی میں اس قیاس کو صحیح تسلیم نہیں کرتا اور میرا خیال ہے کہ بنی امیہ کے دربار میں ابن عباس کی رسائی کبھی نہیں ہوئی اور اس لیے ان کی روایتوں کی کسی نے پرواہ نہ کی۔ ہاں جب ابن عباس کا زمانہ آیا اور حدیث گوئی کا مرض ترقی کرتا گیا تو ابن عباس یاد آئے امام مالک نے اپنی موطا پر ایکبار نظر ثانی کی اور سلسلۂ اسناد میں ابن عباس بھی شامل کیے گئے ادھر ابن عباس کے غلام موجود تھے انھوں نے اپنے آقا سے روایتیں بیان کرنا شروع کر دیں چنانچہ ابن عباس کی حدیثوں میں تم کو زیادہ تر ایسی حدیثیں ملیں گی جو ابن عباس کے غلاموں کی بیان کردہ ہیں۔ بہرحال میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ گو ابن عباس کی حدیثیں ابوہریرہ سے زیادہ مشتبہ ہیں مگر انھوں نے ایک روایت ایسی بیان کی ہے جس سے اوقات صلوٰۃ پر بڑی زبردست روشنی پڑتی ہے۔ یہ روایت مسلم کی ہے۔ بخاری میں ہے یا نہیں مجھے خیال نہیں رہا۔ اور مسلم نے اپنی کتاب کا جو مقدمہ لکھا ہے اس سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ مسلم بخاری کی طرح صرف جامعین احادیث میں سے نہ تھے بلکہ ناقدین میں سے بھی تھے گو کہ ان کے نقد و تبصرہ کا معیار کچھ اچھا نہ تھا۔ بہرحال مسلم کی ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ظہر اور عصر ملا کر پڑھی اور مغرب اور عشاء ملا کر پڑھی بغیر خوف اور بغیر سفر کے۔ دوسری روایت میں ہے

جمع کیا نمازون کو غزوۂ تبوک مین ابن عباس سے پوچھا گیا کہ آن حضرتؐ نے ایسا کیون کیا۔ انھون نے کہا تاکہ آپ کی امت کو تکلیف نہ ہو۔ تیسری روایت مین ہے مدینے مین آپ نے نماز پڑھی بغیر خوف اور مینھ کے۔ چوتھی روایت مین ہے مین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آٹھ رکعتین اکٹھا کر کے (یعنی ظہر اور عصر) اور سات رکعتین (عشاء و مغرب) اکٹھا کر کے پڑھین۔ راوی نے کہا میرا گمان ہے کہ آپ نے ظہر مین تاخیر کی اور عصر اول وقت پڑھی اور مغرب مین تاخیر کی اور عشاء اول وقت پڑھی۔ انھون نے کہا مین ایسا گمان نہین کرتا ہون۔ پانچوین روایت مین ہے ایک شخص قبیلۂ بنی تمیم کا آیا وہ نہ دم لیتا تھا نہ باز رہتا تھا برابر کہے جاتا تھا نماز نماز۔ جب آفتاب ڈوب گیا اور تارے نکل آئے تب ابن عباس نے کہا تیری مان مرے کیا تو مجھے سنت سکھانے آیا ہے پھر کہا کہ مین نے دیکھا رسول اللہ صلعم کو کہ جمع کیا آپ نے ظہر اور عصر کو اور مغرب اور عشاء کو عبداللہ ابن شقیق نے کہا کہ میرے دل مین خلش رہی تو مین ابوہریرہ کے پاس آیا اُن سے پوچھا انھون نے کہا کہ قول ابن عباس کا سچا ہے نوودی نے کہا یہ سب روایتین صحیح ہین اور ترمذی نے کہا ہے کہ میری کتاب مین کوئی حدیث صحیح ایسی نہین جس کو ساری امت نے چھوڑ دیا ہو مگر حدیث ابن عباس کی مدینے مین دو نمازین جمع کرنے کی بغیر خوف و سفر و مینھ کے۔ مین بھی اس حدیث کو صحیح مانتا ہون صرف اس شرط کے ساتھ کہ رسول اللہ صلعم نے درحقیقت نمازین جمع نہین کین۔ بلکہ مطابق اوقات صلوٰۃ قرآن کے نمازین پڑھین۔ چونکہ آپ کو کبھی ظہر کے اول وقت اور کبھی ظہر کے آخر وقت اور اسیطرح کبھی عشاء کے اول وقت اور کبھی عشاء کے آخر وقت نماز پڑھتے ہوے دیکھا۔ انھون نے غلطی سے یہ گمان کر لیا کہ آپ نے نمازین جمع کی ہین۔ ورنہ ان روایتون سے صاف ظاہر ہے کہ ظہر اور عصر کے اوقات اور عشاء و مغرب کے اوقات درحقیقت ایک ہین غلطی کی وجہ یہ ہوئی کہ آپ کو نماز سب سے زیادہ محبوب تھی اور اوقات معینہ اور فرض نمازون کے علاوہ آپ کثرت سے نوافل پڑھا کرتے تھے۔ لوگون نے اس کو کبھی پچاس کبھی دس کبھی پانچ نماز تصور کر لیا۔ اول اس کو دیکھنا ہے کہ رسول اللہ صلعم اوقات معینہ کے علاوہ بھی نماز پڑھتے تھے یا نہین

انس کی روایت ہے۔

ہماری دادی نے جن کا نام ملیکہ تھا بلایا رسول اللہ صلعم کو ایک کھانے کے لیے جو انھون نے پکایا تھا۔ پھر حضرت نے اس مین سے کھایا اور فرمایا کھڑے ہو مین تمھاری خیر و برکت کے لیے نماز پڑھون۔ انس نے کہا کہ مین ایک بوریا لے کر کھڑا ہوا جو بہت بچھانے سے کالا ہو گیا تھا اور اس پر مین نے پانی چھڑکا اور آنحضرتؐ اس پر کھڑے ہوے اور مین نے اور ایک یتیم نے آپ کے پیچھے صف باندھی اور بوڑھی دادی بھی ہمارے پیچھے کھڑی ہوئی۔ پھر نماز پڑھائی آپ نے دو رکعتین پڑھین اور سلام پھیرا۔

دوسری روایت مین ہے رسول اللہ صلعم ہمارے گھر مین آئے۔ گھر مین مین تھا اور میری خالہ۔ آپنے فرمایا

کھڑے ہو مین تمھارے لیے نماز پڑھون اور اس وقت کسی نماز فرض کا وقت نہ تھا پھر آپ نے نماز پڑھی پھر دعا سے خیر کی ہم سب گھر والون کے لیے سب بہتریون کی خواہ دنیا کی ہو یا آخرت کی ۔ پھر عرض کیا میری مان نے اے رسول اللہ صلعم یہ آپکا چھوٹا خادم ہے اس کے لیے آپ دعا فرما دین سو آپ نے میرے لیے ہر چیز کی دعا مانگی اور اخیر مین دعا کی کہ یا اللہ اس کا مال زیادہ کر اور اولاد زیادہ دے پھر اس مین برکت عنایت فرما ۔ تیسری روایت مین ہے آپنے مجھے یا میری مان اور یا میری خالہ کو نماز پڑھائی اور مجھے اپنے داہنی طرف کھڑا کیا اور عورت کو پیچھے ۔ ایک اور روایت مین ہے میرے چچا نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے کھانا تیار کیا وغیرہ اور اس مین عورتون کی نماز پڑھنے کا ذکر نہین ۔

اختلافات کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نوافل کو بھی جماعت کے ساتھ پڑھتے تھے، اور اس واسطے لوگون کا اوقات نماز مین مغالطہ بالکل قرین قیاس ہے ۔ ظہر و عصر کے اوقات مین یہ حدیثین ملاحظہ ہون

انس بن سیرین کے بیٹے نے کہا ہم ملے انس بن مالک سے جب وہ شام سے آئے تو ملاقات کی ہم نے عین التمر مین اور دیکھا ان کو کہ نماز پڑھتے تھے اپنے گدھے پر اور منھ اس کا اس طرف تھا اور اشارہ کیا ہمام نے قبلے کے بائین طرف ۔ تب مین نے ان سے کہا کہ تم قبلے کے سوا دوسری طرف نماز پڑھتے ہو انھون نے کہا کہ اگر مین رسول اللہ صلعم کو ایسا کرتے نہ دیکھتا تو کبھی ایسا نہ کرتا ۔

۱۔ رسول اللہ صلعم عصر کی نماز پڑھتے تھے اور سورج بلند رہتا تھا ۔ اور اس مین گرمی ہوتی تھی اور جانے والا جاتا تھا عوالی مدینہ تک (مدینے سے آٹھ میل دور بلندی پر مکان) اور وہان پہنچ جاتا تھا اور آفتاب بلند رہتا تھا
(انس مسلم ۔ ابن ماجہ ۔ ابو داؤد)

۲۔ انس نے کہا ہم نماز عصر پڑھ کر قبا کو جاتے تھے (مدینے سے تین میل تک) اور وہان پہونچکر بھی آفتاب بلند رہتا تھا ۔

۳۔ آدمی جاتا تھا بنی عمرو بن عوف کے محلے تک اور ان کو نماز پڑھتے ہوئے پاتا ۔

۴۔ علاء کہتے ہین وہ انس بن مالک کے گھر گئے ظہر پڑھ کر اور انس کا گھر مسجد کے پاس تھا ۔ پھر جب ہم لوگ گئے ان کے یہان تو انھون نے کہا تم عصر پڑھ چکے ہم نے کہا ہم تو ابھی ظہر پڑھ کر آئے ہین تو انھون نے کہا عصر پڑھ لو پھر جب عصر پڑھ چکے تو انھون نے کہا مین نے سنا ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہ فرماتے تھے کہ یہ نماز منافق کی ہے کہ بیٹھا سورج کو دیکھتا ہے ۔ پھر جب وہ دونون سینگون مین شیطان کے ہو جاتا ہے اٹھکر چار چونچین مارتا ہے ۔ خدا کو یاد نہین کرتا مگر تھوڑا ،

۵۔ ابن اسامہ نے کہا ہم نے عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی پھر انس بن مالک کے پاس گئے اور ان کو دیکھا کہ وہ نماز پڑھتے ہیں عصر کی تو میں نے کہا اے میرے چچا یہ کون سی نماز ہے" انھوں نے فرمایا عصر کی اور یہ وہ نماز ہے کہ ہم رسول اللہ صلعم کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

۶۔ نماز پڑھائی رسول اللہ صلعم نے ہم کو عصر کی پھر جب فارغ ہو چکے بنی سلمہ کا ایک آدمی آیا اور اس نے عرض کیا اے رسول اللہ صلعم ہم چاہتے ہیں کہ اپنا ایک اونٹ ذبح کریں اور آرزو رکھتے ہیں کہ آپ بھی تشریف لائیں آپ نے فرمایا اچھا۔ پھر آپ چلے اور ہم بھی گئے آپ کے ساتھ اور اونٹ بھی ابھی ذبح نہیں ہوا تھا۔ اور وہ کاٹا گیا اور پکایا گیا۔ اور کھایا ہم نے اس سے قبل غروب آفتاب کے (مسلم)

۷۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا دن کی گرمی آتش دوزخ کے سبب سے ہے اپنی نماز ٹھنڈے وقت میں پڑھا کرو (مسلم)

۸۔ ہم نماز پڑھتے تھے رسول اللہ صلعم کے ساتھ گرمی کی شدت میں پھر جب کسی سے پیشانی سجدے میں نہ رکھی جاتی تو اپنا کپڑا بچھا کر اس کے اوپر سجدہ کرتا تھا (مسلم)

اسی طرح شب کی نماز دن میں مغرب وعشاء کے اوقات ایک دوسرے کے معنے میں سمجھے گئے ہیں مثلاً حضرت علی کا قول ہے کہ نماز کو اول شب میں پڑھ لینا چاہیے اور سونے سے پہلے ایک رکعت وتر کی پڑھ لیا کرے ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا تم اپنی نماز کو عتمہ مت کرو یعنی جس وقت اندھیرے میں عرب اونٹ کا دودھ دوہا کرتے ہیں اور جو وقت مغرب کا ہوتا ہے۔ اس وقت نماز کو نہ پڑھو۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ہم نے انتظار کیا رسول اللہ صلعم کا ایک شب یہاں تک کہ آدھی رات کے قریب ہو گئی پھر آپ تشریف لائے اور نماز ادا کی اور ہماری طرف متوجہ ہوئے گویا کہ میں اب نظر کر رہا ہوں ان کی انگوٹھی کی چمک کو جو ان کے ہاتھ میں ندی کی تھی۔ اسی طرح انس کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا جب رات کا کھانا سامنے آوے اور ادھر نماز کھڑی ہو تو پہلے کھانا کھالو۔ دوسری روایت میں ہے جب رات کا کھانا آوے اور نماز بھی قریب ہو تو کھالو مغرب کی نماز سے پہلے اور مت جلدی کرو نماز کی طرف کھانا چھوڑ کر (مسلم وابن ماجہ) اور یہ واقعہ ہے کہ اہل عرب جب کھانا کھانے بیٹھتے یا افطار کرتے تو جلد فارغ نہ ہوتے تھے۔ حدیث سے بھی یہ ثابت ہے کہ عرب رات کے کھانے کو بہت طول دیتے تھے اور اسی وقت وہ اپنے قصے، داستانیں، اور روایتیں بیان کرتے تھے۔

میں نے ان حدیثوں کو اس لیے نقل نہیں کیا کہ میں قرآن کی تائید روایتوں سے کرنے کا عادی ہوں اس لیے قرآن کے صریح الفاظ کے آگے کسی روایت وقیاس واجماع کی ضرورت باقی ہی نہیں۔ میں صرف یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ حدیث سے بھی اوقات کی تعیین صاف نہیں پائی جاتی اور نہ گھڑی کی ایجاد سے پہلے

ممکن ہی ہے۔ یورپ اور انگلستان میں جاڑے کے دنوں میں ظہر اور عصر میں کوئی فرق ہی نہیں رہا اور نہ وہاں کوئی آدمی دن کو ظہر کی نماز ادا کر سکتا ہے۔ اگر قرآن ایک ملک و قوم کے لیے اترتا تو یقیناً قرآن اوقات صلوٰۃ میں ایسی عمدہ تصریح یعنی اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ اللَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ کی ضرورت نہ سمجھتا اور صاف فجر، عصر، ظہر اور مغرب کے اوقات کو بتا دیتا۔ گر فی الحقیقت یہ بہترین تفسیر ہے اطراف النہار اور قبل غروب شمس، طرفی النہار، بکرۃ واصیلا، غدوا وعشیا کی۔

پنج گانہ نماز اسلام میں کیونکر پیدا ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی ابتدا معراج کی اس رات سے شروع ہوئی ہے جس سے اپنے پچھلے مطالعہ میں بحث کر چکا ہوں اور اسی روایت کی بنا پر علمائے اسلام متفق ہیں کہ صلوٰۃ خمسہ معراج میں فرض ہوئی ہے حدیث کی بعض روایتوں میں یہ بھی ذکر ہے کہ نمازیں پانچ ہیں مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس کی تائید میں قرآن شریف کی کون سی آیت ہے۔ میں قصداً یہاں اس بحث کو یہاں نہ اٹھاؤنگا کہ پنج گانہ اور سہ گانہ میں سام وارج کی جو خصوصیتیں ہیں وہ کہاں تک اسلامی فقہ میں اوقات کی تعیین پر موثر ہیں میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میں اس مضمون میں کسی مستشرق کی تحقیق پیش نہ کروں گا جن کو اس باب میں زیادہ جستجو ہو وہ خود ان کتابوں کو دیکھیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے یا پھر (COMRARATIYE RELIGION) کا مطالعہ کریں

مجھے صرف اس مضمون میں حدیث و فقہ سے مطلب ہے حدیث کے لیے میری صرف ایک تاویل ہے اور وہ یہ کہ جو بات قرآن سے ثابت نہیں وہ قابل قبول نہیں اور فقہ تو کوئی چیز نہیں ہے۔ ابو یوسف اگر ہارون رشید کیلیے فقہ تیار کر سکتے تھے تو آج ہمارا مولوی لارڈ ولنگڈن کے لیے ان سے بہتر فقہ اسلامی تیار کر سکتا ہے۔ ابو یوسف نے اگر ہارون رشید کے لیے ان کے باپ کی منکوحہ لونڈی حلال کر دی اور اپنے لیے نصاب زکوٰۃ میں حیل شرعی پیدا کر لیے تو ہمارا مولوی نکاح صغیرہ کا پورا فتویٰ لیے ہر قسم کی کھینچا تانی سے دے سکتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ رسول اللہ کی سنت ثابت کر سکتا ہے تو فقہ اس قدر قابل اعتبار نہیں۔ البتہ صاحب ہدایہ معلوم نہیں کیا سمجھ کر پانچ وقت کی نماز ثابت کرنے کے لیے قرآن کی دلیل لائے ہیں جو فقہا کی عادت کے خلاف ہے فرماتے ہیں اس آیت سے پانچ وقت کی نماز ثابت ہے۔

اللہ حین تمسون وحین تصبحون ۰ ولہ الحمد فی السموات والارض وعشیا وحین تظہرون (روم ۱۷)

میں نے ایک ندوی عالم سے جو تاریخ فقہ کے مصنف ہیں دریافت کیا کہ سورہ روم اور سورۂ بنی اسرائیل ایسی دو سورتیں ہیں جن کی تاریخ نزول میں کسی قسم کی رد و کد نہیں ہو سکتی کیونکہ ان میں ایسے تاریخی واقعات کا ذکر ہے کہ یقیناً ان میں سے ایک یعنی سورہ روم پانچ سال قبل نازل ہوئی اور دوسری پانچ سال بعد۔ پھر میری سمجھ میں نہ آیا کہ اگر اس آیت میں نماز کا اشارہ ہے تو حدیث کا یہ قول غلط ہو گا کہ نماز پنج گانہ معراج میں فرض ہوئی حالانکہ نماز پنجگانہ کا ذکر سورہ روم میں ہے۔ انھوں نے اس کا وہی مولویانہ جواب دیا میں نے انھیں لکھا کہ میں اس قدر ناداں نہیں ہوں

جیسا آپ سمجھتے ہین محض اس آیت کو نکال کر سورۂ روم کو بعد کی سورہ بتانا بالکل خلاف ہے خود سورۂ روم ایک بحر مین ہے اور اسی بحر مین یہ آیت بھی ہے انھون نے اس کے جواب مین کہا ہے کہ ان کو مذہبی مناظرے سے سخت نفرت ہے ۔ اچھا اس کو ان لوگ کہ سبحان اللہ کے معنی نماز پڑھنے کے ہین اور جہان جہان قرآن شریف مین سبحان الذی وغیرہ آیا ہے سب جگہ نماز پڑھنے کے معنی ہین ۔ تو میری سمجھ مین نہین آیا کہ سوائے ظہر کے وقت کے اور کون سی زیادہ نماز اس آیت سے ثابت ہوتی ہے ۔ اگر ہوتی ہے تو چار ہی وقت کی ۔ انھین مولوی صاحب نے فرمایا کہ تمسون مین مغرب وعشا کا اشارہ ہے بہت خوب پھر تو یقیناً پانچ ہی پر کیون اکتفا کیا جائے ۔ مولوی حمید الدین صاحب مرحوم کی طرح اقم الصلوۃ لدلوک الشمس سے ہر پانچ منٹ کے بعد نماز فرض کیون نہ سمجھی جائے ۔ اور اس طرح معراج کی بجائے اس وقت کی نماز بالکل ثابت ہو جاوے گی پس اگر اس آیت سے چار وقت کی نماز ظاہر ہے تو پھر مین پوچھتا ہون کہ نماز وسطے کس کو کہین گے کیونکہ وسطی تو وہی ہو گی جس کے دونون طرف ایک یا دو دو باتین ہو حالانکہ وسطی در حقیقت تین ہی نماز دن کے درمیانی نماز ہو سکتی ہے ۔ لیکن کیا ظہر کی نماز کا کہین کنایۃً بھی قرآن شریف مین ذکر ہے ۔ سورۂ نور کی آیت پڑھو ۔

یا ایها الذین امنوا لیستاذنکم الذین ملکت ایمانکم والذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلث مرات من قبل صلوۃ الفجر وحین تضعون ثیابکم من الظهیرۃ ومن بعد صلوۃ العشاء ثلث عورات لکم (نور ۸ ع)

اگر ظہر کی نماز نہ تھی تو اس جگہ سے بڑھ کر اور کہان موقع اس کے اظہار کا ہو سکتا ہے ۔ پس کو بھی جانے دو نماز جمعہ کا ذکر قرآن شریف مین ہے اور یہ قطعی ثابت ہے کہ اس کا وقت اور ظہر کی نماز کا ایک ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اگر ظہر کی نماز مراد ہوتی تو کیا وہ جمعہ کی نماز کے قائم مقام نہ سمجھ لی جاتی مگر جمعہ کی نماز ایک علحدہ وقت مین ایک خاص وا... کی گئی اور ظاہر ہے کہ یہ وہ وقت ہوگا جبکہ اس وقت کوئی نماز نہ پڑھی جاتی ہوگی ۔ جو لوگ یہ کہتے ہین [illegible] نماز ظہر ساقط ہو جاتی ہے وہ اس کا خیال نہین کرتے کہ یہ اصول صحیح نہین نماز تو صرف ایک ہی صورت مین [illegible] مانی ہے اور وہ عورتون کا زمانہ حیض ہے مگر اس کی بھی قضا واجب ہے حالانکہ اس ظہر کی کوئی قضا نہین ۔

بعض لوگ شاید یہ کہین کہ اطراف النہار کے معنی ظہر کے سیاق عبارت سے معلوم ہوتے ہین کیونکہ اگر اطراف النہار کے معنی دن کے دونون کنارے مراد ہون تو اس کا ذکر پہلے ہی جملہ مین آگیا ہے ۔ مگر خود قرآن اس قیاس کے خلاف ہے دوسری آیت مین طرفی النہار دن کے دونون کنارون کے معنی مین آیا ہے اور قرآن کا قاعدہ ہے کہ جس امر [illegible] دیا ہوتا ہے اس کو شانی کر دیتا ہے دیکھو پہلی آیت مین وسبح بحمد ربک حین تقوم ومن [illegible] فسبحہ وادبار النجوم مین بالکل اسی طرح ہے ۔ بہر حال یہ بالکل غلط ہے اور خلاف [illegible] لکھے گئے ہین ۔ گو بعض اردو کے مترجمین قرآن نے یہ معنی لکھے ہین ۔

نماز دن کے پانچ وقت ہونے میں میں یہ تو نہ کہوں گا کہ مجوس سے لیا گیا۔ البتہ خلافت کی تاریخ پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ جوشیلے مسلمان اس کو پسند نہ کرتے تھے کہ وہ خدا کی بندگی میں نصاریٰ کے رہبانیوں اور مجوس کے موبدان سے کم بندگی کریں اور اسی واسطے یہ حدیث نظر آتی ہے کہ ہماری نمازیں ایک ہی وقت پچاس کے برابر ہے ....

.... یا پھر زنادقہ کا مغالطہ ہے کہ وہ اسلام کو متشدد دکھلا کر عوام کے قلوب کو برگشتہ کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ اغلال شریعت کا نتیجہ اچھی طرح جانتے تھے قرآن کے پیش نظر صرف تمھاری ذات تمھارا زمانہ، تمھارا ماحول نہ تھا۔ اس کی نظر کی وسعت تمھارے وہم و گمان میں نہیں۔ وہ ایسا جنچا تلا حکم دیتا ہے کہ اگر اس حکم سے ایک انچ آگے یا پیچھے بڑھو تو یقیناً تنگی بر باد گناہ لازم کا مصداق ہو گے۔ قرآن اپنے اوامر و مناہی میں تمام دنیا تمام زمانے اور تمام معاشرت و عادت پر یکساں عمل کرانا پسند کرتا ہے۔ اگر تم اس حکم سے زیادہ کرنے کی توفیق رکھتے ہو۔ تمھاری خوشی۔ لیکن تم کو کوئی حق نہیں کہ تم تمام دنیا کے آدمیوں کو اپنا ہی سا سمجھ لو۔ اس لیے قرآن کے عمومی اوامر و مناہی اور اصول کو اپنے قیاس سے ایک خاص زمانہ و ملک و معاشرت میں محدود کر دینا درحقیقت قرآن کے منشا کے خلاف ہی نہیں بلکہ ناروا جسارت ہے اور قرآن کی حکمت بالغہ و وسعت نظری کا اپنی بے عقلی اور کم نظری سے مقابلہ اگر تم اس لیے پیچ و تاب کھاتے ہو کہ غیر مسلم کی عبادت، شریعت کے مقابلے میں قرآن کی آسانیاں بچوں کا کھیل ہیں۔ اور تم سے غیر مذہب کے طعنے سنے نہیں جاتے تو یہ تمھاری سمجھ کا قصور ہے۔ تم قرآن کو محرف کہو، ناقص کہو، منسوخ کہو مگر اہل ذکر کے سامنے یہ سب تمھاری بکواس ہے۔ تمھارے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ ان آسانیوں میں کتنی مصلحتیں مضمر ہیں۔ اور کتنی قومیں اپنی معاشرت و عادت کو تبدیل کیے بغیر اسلام کی طرف مائل ہوں گی۔ تم ایک خاص ماحول سے متاثر ہو رہے ہو مگر تمھارے بعد ایسا زمانہ آوے گا جن کی حالتوں میں اور تمھاری حالتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہو گا۔ حتیٰ کہ تم اگر زمین پر لیٹنا اور سونا ایک فطری بات جانتے ہو گے تو دوسری قومیں اس کو بالکل انسانی فطرت و عادت کے خلاف پائیں گی یقیناً تمھاری خود ساختہ شریعت تمھارے لیے بیکار ہو گی لہذا انسانی قیاسات و شریعتیں ایک محدود قوم و زمانے میں کارآمد ہو سکتی ہیں۔ خصوصاً جب کہ قوم میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ البتہ مسلمانوں پر آفریں ہے کہ اس کلیہ کو انھوں نے عجیب طریقے سے نبھایا ہے یعنی بجائے شریعتوں کے تبدیل کرنے کے انھوں نے اپنی حالت کو بدلنا گوارا نہ کیا تاکہ شریعت قدیم قابل عمل ہو سکے۔ وہ شام کے وقت تفریح گاہ میں نہ جائیں گے کہ کہیں مغرب کی نماز قضا نہ ہو۔ وہ دن کو کارخانوں میں اور کچہریوں اور مدرسوں میں نہ جائیں گے کہ کہیں ظہر کی نماز قضا نہ ہو۔ لیکن قرآن نے کبھی انھیں کہا قرآن کے ملہم غیب ہونے کا سب سے زبردست ثبوت میرے نزدیک یہی ہے کہ اسکے اوامر ونواہی ہر زمانہ و وقت و ملک کے لیے قابل عمل ہیں۔

حق گو

مصحفی اور داغ

داغ کا کلام بظاہر دلی کے رنگ سے بالکل الگ نظر آتا ہے اس لیے بعض لوگ ان کی شاعری کا سلسلہ جرأت سے ملاتے ہین اور ان کی شاعری کی تاریخ جرأت کے زمانے سے شروع کرتے ہین لیکن ان کے نزدیک بھی با وجود اس اشتراک کے داغ اور جرأت کے رنگ مین نمایان فرق و امتیاز موجود ہے

حقیقت یہ ہے کہ جرأت اور انشا سے پہلے غزل گوئی کے دو مختلف رنگ قائم ہو چکے تھے ایک خواجہ میر درد میر اثر اور راسخ کا رنگ تھا جس مین محبت حقیقی کے پاک جذبات نہایت مہذب الفاظ مین ادا کیے جاتے تھے اس لیے اس رنگ کو تصوف و معرفت سے گہرا تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ دوسرا رنگ میر تقی میر کا تھا جس مین عشق حقیقی کے ساتھ عشق مجازی کے پاک جذبات بھی شامل ہو گئے تھے اور سودا، قائم، یقین، میر حسن اور بیان وغیرہ کا بھی قریب قریب یہی انداز تھا، قدما کے تیسرے دور مین مصحفی نے بھی یہی روش اختیار کی تھی اور تغزل کا بہترین نمونہ قائم کر دیا تھا لیکن جرأت اور انشا نے اس سے آگے قدم بڑھایا اور شاعری مین رندی و ہوسناکی کے جذبات کا عنصر شامل کر دیا اور یہین سے اس معاملہ بندی کی بنیاد قائم ہوئی جس پر متاخرین شعرائے لکھنؤ نے بلند عمارتین کھڑی کر دیں۔ (گل رعنا)

لیکن با این ہمہ اب تک میر کے تغزل کا اثر باقی تھا اس لیے جرأت کے کلام مین بھی میر کے تغزل کا ایک حصہ شامل ہے۔ خصوصاً عاشق و معشوق کے باہمی تعلقات کو جس خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ مسلسل غزلون میں ادا کیا گیا وہ جرأت ہی کا حصہ ہے۔ ان کے مقلدین یہ کیفیت پیدا کرنے مین کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ سچ ہے کہ جرأت کے یہان چند عریان شعر بھی پائے جاتے ہین لیکن اس قسم کے اشعار بھی داغ کے رنگ سے بالکل الگ ہین۔ اس بنا پر داغ کا سلسلہ جرأت اور انشا سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے اور وہ بظاہر آتش کے تلامذہ سے جا کر ملتا ہے۔ جنھون نے عشق و محبت کے آداب کو بالائے طاق رکھ کر معشوق سے بے محابا گفتگو کرنے سے پرہیز نہین کیا۔

جو باتین داغ کے خوشنما کلام مین بدنمائی کا پیوند لگاتی ہین وہ تمام تلامذۂ آتش کے یہان موجود ہین لیکن رنگ اس قدر شوخ اور ہموار نہین ہے اور رعایت لفظی کے گورکھ دھندے اور کنگھی چوٹی کے الجھاؤ سے بھی

مبتذل اشعار کی کثیر تعداد بھی موجود ہے۔ البتہ داغ نے اس دریا کو اس قسم کے خس و خاشاک سے اسقدر پاک کر دیا ہے کہ یہ تنکے ان کی کشتی کی روانی میں مطلق رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتے۔

یہ کتنا بعید از حقیقت ہے کہ داغ کا کلام تمام و کمال دلی کے رنگ سے علیحدہ ہو گیا کیونکہ اس میں جا بجا متغزلانہ اور صوفیانہ رنگ کے بلند پایہ اشعار بھی نظر آتے ہیں اور متوسطین کے دور میں دلی کے شاعروں نے شعرائے فارسی کی تقلید میں جو انداز بیان اختیار کیا تھا داغ نے بھی صفائی و برجستگی کے اضافہ کے ساتھ اسی کو قائم و برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

معاملات عاشقانہ کے اظہار میں مرزا داغ کا نام حد سے زیادہ بدنام ہے اور اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں کہ اردو کے کسی شاعر نے اس کثرت کے ساتھ مضامین عشقیہ کو اپنے کلام کا مقصود حقیقی نہیں گردانا۔ داغ کے تمام دیوانوں کی پڑتال کی جائے تو کم سے کم سیکڑوں اشعار ایسے نکلیں گے جن میں وصل و ہجر، شکوہ و شکایت اور رشک و رقابت کے نہایت کھلے کھلے نقشے کھینچے گئے ہوں۔ حتیٰ کہ جلی کٹی، طعن و تشنیع، چھیڑ چھاڑ، لاگ ڈانٹ، چھین جھپٹ وغیرہ رکیک مضامین سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔ انتہا یہ ہے کہ بعض بعض مقامات پر معشوق کو ایسی کھری کھری سنائی گئی ہیں جن کا بار سچی عاشقانہ شاعری کے کاندھوں سے نہیں اٹھ سکتا۔ ایسے تمام اشعار کا طرز بیان نہایت ہلکا، خارج از تہذیب اور غیر سنجیدہ ہے جو تعلیم یافتہ گروہ میں لائق پذیرائی نہیں اور مہذب سامعین اپنے گوش شنوا کو تکلیف شنوائی اٹھانے کے لیے مجبور نہیں کرتیں۔

داغ کی نگاہ میں معشوق کی کوئی حیثیت اور عشق کا کوئی مرتبہ نہ تھا وہ محبت کو تفریح کا ایک شغلہ اور شاعری کو تفنن طبع کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ شاید ایسا شعر داغ کے سوا کوئی شاعر نہیں کہہ سکتا ؎

تم کہتے ہو معشوق اطاعت نہیں کرتے عاشق بھی تو معشوق کا نوکر نہیں ہوتا

دنیائے عشق میں غیر اور رقیب کا وجود ویسے ہی ناقابل برداشت سمجھا جاتا ہے چہ جائیکہ معشوق کے ساتھ اسکا خلا ملا لیکن مرزا داغ کا ظرف عشق اس کو ٹھنڈے دل سے گوارا کرنے کے لیے تیار رہے اور اس واقعہ سے تیور پر بل آنے کے بدلے صرف تیکھے پن کے ساتھ شکوہ کر دینا کافی ہے ؎

تم کو ہے وصل غیر سے انکار اور اگر ہم نے آکے دیکھ لیا

اس لحاظ سے مرزا داغ کے کلام کو کسی ایسے شاعر کے کلام کے سامنے لانا جس کے درد انگیز خیالات لذت روح کا کافی سامان رکھتے ہوں صرف ناموزوں ہی نہیں بلکہ قابل اعتراض بھی ہے۔ البتہ صفائی، روانی، شوخی، برجستگی اور لطف زبان میں نواب مرزا خان داغ نے اس قدر ناموری حاصل کی کہ متاخرین کے دور میں ان کا یہ رنگ مخصوص رنگ قرار پایا اور صرف ان کے مقبول عام کلام پر دلی کی شاعری کا انحصار رہ گیا۔ قدرن کا موسیقیت آمیز توازن

جیسا داغ کے یہان ہے اردو شعرا مین شاید ہی کسی کو نصیب ہوا در پھر شاذ و نادر نہین بلکہ اکثر محاورات کا استعمال جس خوبصورتی کے ساتھ ان کے یہان ہوا ہے اس کی نظیر ملنا دشوار ہے لطف زبان اور حسن بیان کے زور سے معمولی سے معمولی بات کو بڑی بات بنا کر پیش کر دینا کہ سننے والا یک لخت تڑپ اُٹھے صرف داغ کے عام فہم کلام کی خصوصیات مین داخل ہے۔ حسن بندش سے پامال اور غیر مانوس طرحون کو چمکا دینا داغ کا حصہ تھا اور ان کا دعویٰ بالکل حق بجانب معلوم ہوتا ہے کہ ؎

اُردو ہے جس کا نام ہمین جانتے ہین داغ　　　ہندوستان مین دھوم ہماری زبان کی ہے

مصحفی مرحوم کا معاملہ داغ سے بالکل برعکس ہے وہ معاملات عاشقانہ کو پورے جوش کے ساتھ بیان کرتے ہین۔ لیکن احتیاط کے ساتھ کہ سننے والون کے دل مزا لیتے ہین اور پڑھنے والون کی زبان ہر ہر لفظ پر بے ساختہ تحسین و آفرین کے پھول برساتی ہے۔

مصحفی مرحوم کی نگاہ مین عشق عشق ہے بوالہوسی نہین ہے۔ اس لیے ان کے خیال مین نہ معشوق اتنا ذلیل ہے کہ ہر کس و ناکس مقابلہ کا دعویٰ کر بیٹھے نہ عاشق اتنا کم ظرف کہ جا دبے جا معشوق کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جائے فرماتے ہین

کیا برا ہے کہ رہے مصحفی اب یان وہ ذات　　　تم یہی جانیو دربان ہے در پر رکھا

یون دیکھتا ہون دیدۂ حسرت سے اسکو مین　　　جیسے نظر گدا کی رخ بادشاہ پر

معشوق اسکو سے ہین بعد از ہزار سال　　　آئے بھی خواب مین تو نہ بولے حجاب سے

تم ہم کو اپنا منھ نہ دکھاؤ تو خوب ہے　　　پردہ مین اور چاہ بڑھاؤ تو خوب ہے

مصحفی کی آنکھ اول تو محفل دوست مین غیر کو دیکھنا گوارا نہین کرتی اور اگر بفرض محال ایسا ہوتا بھی ہے تو ... مستحسن طریقہ یہ ہے ؎

غیر سے گرم ملو، ہم پہ یہ بیداد رہے　　　اور تو کیا کہین ہم تم سے مگر یاد رہے

ملاپ غیرون سے ہے ہم سے بیوفائی ہے　　　یہ کون شیوہ ہے کیا رسم آشنائی ہے

مصحفی مرحوم اور مرزا داغ کے شاعرانہ کارنامون مین بعینہ وہ نسبت ہے جو روح اور مادے ... شیخ مرحوم جب عاشقانہ شعر کہتے ہین تو اپنی شاعری کو بوالہوسی کے داغ سے پاک صاف رکھتے ہین بھی ان حدود سے باہر نہین نکلنے دیتے جو حقیقی شاعری کے چہرے کے لیے آرائش و زیبایش کا کا... قصداً کارہا د تا سامعین کے منھ سے واہ واہ حاصل کرنے کے لیے آن خار دار جھاڑیون مین ہو کر نکلتے ہین ...

دامن شاعری کو پُرزے پُرزے کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ ذیل کے دو شعرون سے دونون کا رنگ نمایان ہو سکتا ہے
مصحفی مرحوم کا شعر ہے ؎

لطف تب ہے کہ ہوا کھولتی جائے اسکو اور تم پردے مین منھ اپنا چھپاتے جاؤ

مرزا داغ اسی مضمون کو ان الفاظ مین ادا کرتے ہین۔ ؎

یہ سیر ہے کہ دوپٹہ اڑا رہی ہے ہوا چھپاتے ہین جو وہ سینہ کر نہین چھپتی

دونون شعرون مین معشوق کی کیفیت پردہ پوشی اور ہوا کی پردہ دری کا بیان ہے فرق صرف یہ ہے کہ مرزا داغ نے پردے کے بجائے دوپٹہ اور منھ کے بجائے سینہ کہہ کر شعر کو روحانیت کے درجے سے مادیت کے درجہ مین تبدیل کر دیا ہے اور اس تغیر کے بعد وہی مضمون جو اصل حالت مین کوئی چیز تھا اس قدر عریان اور بد نما ہو گیا ہے کہ طبیعت کو انبساط کے بجائے انقباض ہوتا ہے۔

مصحفی مرحوم کی شاعری کا دائرہ اس قدر مختصر ہے کہ ہم چند اوراق مین احاطہ کرلین نہ ایسی کوئی خاص ضرورت ہے، کہ یہان درج کرنا پڑے لیکن اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ انھون نے عاشقانہ شاعری کو شاعری کی حیثیت سے اختیار کیا ہے اور جذبات و واردات کے اظہار کے ساتھ اپنی ثقاہت و متانت کے دامن کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہنے مین اس استقلال و پامردی کا ثبوت دیا ہے جس کی نظیر دستیاب ہونا مشکل ہے۔ محققین کی شہادتین ان کے اوصاف کمال کی دستاویز پر مہرین ہین جن کو زمین و آسمان کی گردش قیامت تک صفحۂ دہر سے محو نہین کر سکتی۔ مولانا عبد السلام کا یہ قول رہتی دنیا تک قائم رہے گا کہ "مصحفی بلا شبہ اپنے دور کے شعرا مین سب سے زیادہ متین سب سے زیادہ مہذب اور سب سے زیادہ سنجیدہ ہین اور مولانا عبد الحی کے اس مقولہ کی صداقت روز روشن کی طرح آشکارا رہے گی کہ "مصحفی نے بھی یہی (میر تقی وغیرہ کی) روش اختیار کی تھی اور تغزل کا بہترین نمونہ قائم کر دیا تھا"

معنویت سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو الفاظ کی سلاست اور زبان کی نفاست مین بھی ان کے کلام کو معاصرین کے مقابلے مین خاص تفوق و برتری حاصل ہے۔ شستگی و نفاست جس کلام کو چھو کر نہ نکلی ہو اس کے اچھا ہونے مین کس کو کلام [illegible] سکتا ہے۔

مصحفی مرحوم [illegible] الفاظ کے نشیب و فراز فقرون کے جوڑ توڑ اور جملون کی تراش خراش سے بے خبر نہ تھے وہ مصلح زبان بھی [illegible] کا صحیح راستہ بتانے والے بھی اس لیے اگر ان کا کلام چستی و بلندی کے [illegible] عیب سے مبرا و منزہ ہے [illegible] نہین ہے۔

[illegible] نہین کرتا کہ مصحفی [illegible] کے کلام و دواوین صفائی و برجستگی [illegible] یکسان ہین اور ان [illegible] شعر بھی ایسا [illegible] [illegible] سکے۔ میر تقی میر، میرزا غالب، میر درد وغیرہ جس قدر [illegible] اپنی بلند پایہ شاعری کیلئے مشہور ہین

ان مین سے کوئی بھی ایسا نہین جس کے کلام کی یکسانیت معترضین کو زبان کھولنے سے باز رکھ سکے تو پھر مصحفی اس اصول سے کیسے باہر جا سکتے ہین۔ البتہ دیکھنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ آج زبان کی جس سلاست و روانی کے طفیل مرزا داغ کی شاعری فصیح الملک اور بلبل ہندوستان کے زرین تاج زیب سر کرنے کا استحقاق رکھتی ہے اس کے نہایت دلکش نمونے اب سے ڈیڑھ سو برس پیشتر ایک استاد کے قلم معجز رقم سے نکل چکے ہین یہ دوسری بات ہے کہ نامساعدت روزگار نے ان جواہر پارون کو ناقدری و کساد بازاری کے گرد و غبار سے بے آب کر کے اصل قیمت سے گرا دیا ہے اپنی نگاہ سے تعصب، ہٹ دھرمی اور طرفداری کا پردہ اٹھا کر دیکھو کہ میرے بیان مین کس قدر صداقت ہے تم خود کہہ دوگے کہ جہان مصحفی مرحوم نے سلاست و روانی اور برجستگی و بے ساختگی کے جوہر دکھائے ہین وہان اشعار کو ایک گلدستہ رنگارنگ بنا کر رکھ دیا ہے۔ جس مین نقرون کا توازن، اداے مطلب کا سکھاپن، بندش کی چستی زبان و محاورے کی درستی، گلہاے سدا بہار کی طرح بے نقاب ہو کر دیکھنے والون کی نگاہون کو اپنی طرف کھینچے لیتی ہے۔ اس مختصر تمہید کے بعد ہر عنوان کے تحت مین چند اشعار درج کیے جاتے ہین۔

نقرون کا موسیقیت آمیز توازن مصحفی مرحوم کے کلام مین اس قدر ہے کہ انتخاب کرنا مشکل ہے، مرحوم نے اول تو غزلون کے لیے بہت سی بحرین اور زمینین ایسی استعمال کی ہین جن مین خواہ مخواہ موسیقیت ہے۔ اور جب اسکے ساتھ نقرون کا توازن بھی موجود ہو تو کیفیت اور بھی دوبالا ہو جاتی ہے۔ میر تقی میر کے انداز بیان مین ہمنے کافی تشریح سے کام لیے یہان چند اور مثالون کا اضافہ کرتے ہین۔

مین اک دم چین سے رستے مین اس بت کے کہان بیٹھا　　کبھی اُٹھ کر یہان بیٹھا کبھی اُٹھ کر وہان بیٹھا

ترے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا　　کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اس سے بات کرنا

اپنی تو اس چمن مین عمر اس طرح سے گذری　　یان آشیان بنایا، وان آشیان بنایا

اے مصحفی کھول آنکھین پیری مین تغافل سے　　وہ صبح ہوئی پیدا [illegible]

ساقی شراب لایا، مطرب رباب لایا　　مجھ پر تو اک قیامت [illegible]

تیرون پہ تیر کھا کر زخموں پہ زخم کھا کر اس کی گلی سے آئے ہم خون مین نہا کر

دیکھا جو اس کو غش کھا اب کیا مرے دلکو خبر ساقی کجا، مے کس طرف، مجلس کدھر، جانان کہان

نہ نسیم نامہ بر ہو، نہ صبا پیام بر ہو مجھے کس طرح سے یارب مرے حال کی خبر ہو

کس ناز کا آنا ہے، کس غمزہ کا جانا ہے قربان ترے آنے کے صدقے ترے جانیکے

وعدے کی شب جو کل تھی کیا بیقرار تھے ہم سو بار گھر سے نکلے سو بار گھر مین آئے

قتل ہے مرغوب اسکو، مجکو جینا ناگوار ہے مین ادھر مشتاق ہون قاتل ادھر مشتاق ہے

قضا نے مقتل عشاق کے نقشے مین ہر جا پر وہان سر ہی بنایا ہے جہان شمشیر رکھی ہے

دل پیچ زلف سے ہو کیونکر رہا کسی کا، گر دام ہے تو یہ ہے زنجیر ہے تو یہ ہے
ابرو کے آگے مجکو لازم ہے سر جھکانا محراب ہے تو یہ ہے شمشیر ہے تو یہ ہے

نزاکت عاشق و معشوق کی یکسان نہین ہوتی مری گفتار نازک ہے تری رفتار نازک ہے

نکھرا ہوا کیا چہرہ اُس آئنہ رو کا ہے شعلہ ہے شرارہ ہے آتش ہی بھبوکا ہے

کبھو تک کے در کو کھڑے رہے کبھی آہ بھر کے چلے گئے ترے کوچے مین جو ہم آئے بھی، تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے
نہ انیس ہی نہ جلیس ہے نہ رفیق ہی نہ شفیق ہے ہم اکیلے گھر مین پڑے رہے، سبھی لوگ گھر کے چلے گئے
کہو ان موئے زلف کا کیا بیان یہ عجیب قصہ ہی درمیان یہ ادھر کو سینے پہ آرہی، وہ ادھر کمر کے چلے گئے

محاورہ بندی مین مصحفی مرحوم کو خاص امتیاز حاصل ہے مین نے متعدد مرتبہ ان کے کلام پر نگاہ ڈالی ہے اور اس کثرت مطالعہ کے بعد یہ خیال میرے صفحۂ دل پر نقش ہوگیا ہے کہ مصحفی مرحوم نے اپنے عہد کا کوئی فصیح محاورہ نہین چھوڑا جسے مناسب محل پر استعمال نہ کیا ہو بلکہ بعض بعض محاورات تو اس قدر حسن و خوبصورتی کے ساتھ کام مین لائے گئے ہین کہ انکا محل استعمال اس سے زیادہ اچھا خیال مین نہین آسکتا۔ محاورات کا جس قدر ذخیرہ کلام مصحفی سے دستیاب ہو سکتا ہے میرا دعوی ہے کہ اردو زبان کے کسی قدیم و جدید شاعر کے یہان سے دستیاب نہین ہو سکتا آزاد نے بھی جن کو شیخ مرحوم سے دلی کاوش تھی اور جو شیخ کی ہر صفت شاعرانہ کو عیب کر کے دکھانے مین کہین نہین چوکتے تھے اپنی تصنیف مین مجبوراً اس امر کو تسلیم کر لیا ہے کہ ہر حالت مین اصل محاورے کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے اور یہ ان کے کمال فن کی ایسی تصدیق ہے جس کی تکذیب کا کوئی پہلو باقی نہین رہتا۔ چند خاص مثالین ملاحظہ ہون۔ ؎

کیا غیر کا کھٹکا ہے کہ مین کچھ نہین کہتا   یہ منھ مجھے تیرا ہے کہ مین کچھ نہین کہتا

اول تو مجھے خط مین سنائی ہین ہزارون   آخر مین یہ لکھا ہے کہ مین کچھ نہین کہتا

رہا کرا ب تو اسیر قفس کو اے صیاد   کلی چٹکنے لگی رنگ پر گلاب آیا

دھویا نہ گیا خون مرا تیغ سے اسکی   کمبخت یہ پانی جو پڑا اور بھی چمکا

یہ بھی نیا جنون ہے کہ کانٹون سے چھو کر   روے ہم آبلے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر

یہ اس کے حسن کی نیرنگیان ہین   تکلف برطرف کیا حسن کیا عشق

بھاڑ مین جاے پڑے جو لگے مین کیا کام مجھے   ہو نہین سکتی ہے اب مجھ سے تو غمخواری دل

ہماری طرف آپ کم دیکھتے ہین   وہ آنکھین نہین اب جو ہم دیکھتے ہین

نہ بیٹھو ابھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر   کہان ہاتھ مین لوٹ نے بہت ہین

کیون نہ چھاتی سے مین لگا رکھون　　　داغ سینے کے مجھکو پیارے ہین
مصحفی آنسوؤن پر اتنا ناز　　　ایسے کیا عرش کے یہ تارے ہین

اچھا کبھی نہ ہو وے یہ شفا عشق کا مرض　　　سو سو دوا مین اگرچہ اس آزار کی پھرین

فلک کی خبر کب ہے ان شاعرون کو　　　یونہی گھر مین بیٹھے ہوا باندھتے ہین

مین مر گیا، ٹلی مری چھاتی کی سل کہین　　　پیچھے مرے ہو نہ مین کا الٰہی یہ دل کہین

خوار رکھتا ہے اب تلک ہم کو　　　دیکھ سکتا نہین فلک ہم کو

آنکھ ان کو نہین شناخت کہان　　　لوگ کچھ سمجھے ہین، خدا ہے کچھ

لیلیٰ کی جستجو مین ہے کتنا تباہ قیس　　　صحرا مین اُس جوان کی مٹی خراب ہے

غم مین تیرے راحت و آرام سے جاتے رہے　　　گھل گئے ایسے کہ ہم ہر کام سے جاتے رہے

تب ڈبویا ہے قہر خالق نے　　　جب گنا ہون سے ناؤ بھر لی ہے

میرا گناہ کیا ہے جو مجھ بے گناہ پر　　　عالم سمٹ کر آیا ہے دعوائے خلق ہے

کس سے ہم اپنے دیدۂ تر کا کرین گلہ　　　ڈوبے یہ آپ اور ہمین بھی ڈبو گئے

لیلیٰ کو شام غربت مجنون نے آلیا　　　محمل گران ہوا، قدم ناقہ تھک گئے

راہ سے دیر کی گردست مشرب چاہیے | کہ ترا دل ابھی اے کعبہ نشین تپھر ہے

اور کچھ مطلب نہین ہان رہ گئی ہے آنی بات | راہ مین اس سے کبھی صاحب سلامت ہو گئی

رکھ کے ہم زانو پہ جس وقت کہ سر بیٹھ گئے | یہ سمجھ لیجیو کہ ہمسایون کے گھر بیٹھ گئے

پتھر مین بن گیا ستم روزگار سے | ٹوٹے گا آبلہ نہ مرا نوکِ خار سے

لازم ہے تیغ اے ستم آرا لہو پیے | اس مین کمی کرے تو ہمارا لہو پیے

قطرے تری پیشانی پہ ہین یہ عرق مین | ڈرتا ہون کہ پھولون پہ کہین اوس نہ پڑ جائے

کیا مندرجۂ بالا محاورات آپ اپنی نظیر نہین ہین ؟ اور کیا اس قدر مثالون کے بعد یہ تسلیم کر لینے مین کوئی عذر باقی رہ جاتا ہے کہ محاورات فصیح کے استعمال کرنے مین مصحفی مرحوم یگانۂ روزگار تھے ؟

صرف لطف زبان سے بات پیدا کرنا داغ کے کلام کی ما بہ الامتیاز خصوصیت مانی جاتی ہے لیکن ذرا شیخ مصحفی مرحوم کے دو چار اشعار بھی سن لیجیے :-

گلی سے یار کی قاصد مرا شتاب آیا | جواب صاف ملا خط کا یہ جواب آیا
کیونکر نتیجہ نیک ہو رد سوال کا | یہ انفعال ان کو مرے انفعال کا
اس قدر قتل مین میرے تجھے جلدی کیا ہے | ٹھہر اے بت ! مین ذرا نام خدا کا لیلون
فلک کی خو نہین ایسون کی پرورش ورنہ | شکستہ حال و فقیر و غریب ہم بھی ہین
نقش شیرین مین ترے حسن کی پرواز کہان | یہ نزاکت ، یہ ادا ، اور یہ انداز کہان
تیغ ہے خنجر ہے دشنہ ہے چھری ہے تیر ہے | کچھ تو بھجواؤ تسلی کو دلِ غمناک کی
کاروان دور گیا پاؤن تھکے ہی ہارا | کون اب منزل مقصود کو پہنچائے مجھے
وہ مصحفی کی قبر کو رستے مین دیکھ کر | لوگون سے پوچھتا ہے کہ یہ کس کا مزار ہے
گیا مین اسکی مجلس مین تو وہ دربانسے یون بولا | یہ مجلس ہے کہ میلا جو چلا آتا ہے ہر کوئی

زلفین جو منہ مین لین تو کہا مار کھائے گا
چوٹی مین ہون تو بولے کہ تلوار کھائے گا

ہے گرفتاری دل باعث بیماریٔ دل
ہون نہ بیمار اگر ہو نہ گرفتاریٔ دل

گلی مین اس کی مین جا کر رہا تو غیرتِ عشق
یہ بولی اٹھ ترے رہنے کا یہ مقام نہین

تیکھا پن بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

کہتے ہو ایک آدھ کی ہے میرے ہاتھ موت
ہم بھی سمجھتے ہین یہ سناتے ہو ہمکو کیا

فتنے سے کہہ رہی ہے تری شوخیِ خرام
مین سیر کو چلون مرا دامن سنبھال لو

یہ مجھ سے کیا کہا کہ پئے قتل سر جھکا
خنجر تو آپ پہلے کمر سے نکالیے

نیند غفلت کی تمھین آتی ہے کیونکر دیکھین
ایک شب ہم بھی سنائین گے فسانہ اپنا

کر دل کی ذرا سیر کہ ہے سیر اسی مین
کعبے کی اسی مین ہے بنا دیر اسی مین

مجھ کو کیا کام کہ اس کوچے مین جا ڈالون ڈیرا
تو گرفتار رہے کچھ مین تو گرفتار نہین

سنسان دشت مین مجھے لے چل نہ اے جنون
ظلِ درخت، سایۂ دیوار کچھ تو ہو

دل نہ سمجھو کہ فرشتون نے جلانے کیلیے
رکھ دیا ہے مرے پہلو مین اک انگارے کو

مجھ سے کہتا ہے کہ گلیون مین لیے پھر ہردم
دل کمبخت کوئی تیرا خریدار بھی ہے

بھٹکتی پھرتی ہے لیلے سوار ناقے پر
جدھر ہے وادیِ مجنون ادھر نہین آتی

قاصد کوئی تم کاہے کو بھیجوگے مرے پاس
نامہ تو وہ لکھے کہ جسے یاد ہو کوئی

نرگس تری آنکھون کو بہت دیکھ رہی ہے
ہو جائے نگاہون مین مکافات ذرا سی

بندش کی چستی اور ترکیبون کی درستی چھپنے والی چیز نہین مضامین حد سے زیادہ بلند ہون یا نہ ہون لیکن مصحفی مرحوم کے ہر شعر کا اندازِ بیان الفاظ کی نشست اور جملون کا ڈھال اس قدر دلکش ہے کہ تیر کی طرح دل مین گھر کر لیتا ہے آزاد کی کوتاہ بینی کی طرف نہ دیکھیے جن کو کلامِ مصحفی کے مصفا آئینے مین اپنی ہی کدورت کا عکس نظر آتا ہے بلکہ غیر متعصب محققین کے اقوال سے استدلال کیجیے بار بار کوشش کرتا ہون کہ اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے کم سے کم اشعار سے کام لون لیکن ہر شعر کی کشش بزبانِ حال پکارتی ہے کہ خبردار مجھے نہ چھوڑنا مین گلستانِ سخن کا اچھوتا پھول ہون ؎

بحرِ جہان مین آمد و شد جلد جلد ہو
مانندِ قطرہ جا تو برنگِ حباب آ

ہم جو تنہائی مین فریاد کیا کرتے ہین
وصل کی شب کے مزے یاد کیا کرتے ہین

کام کر جاتی ہین تری آنکھین
چپکے چپکے ہزار آنکھون مین

دل جانتا ہے خوب نہ ہوگا کوئی اثر — فریاد بھی بلند ہے دستِ دعا کے ساتھ
سینے مین داب داب کے رکھوں کہاں تلک — دل ہاتھ کے تلے، جگر انگشت کے تلے
دلِ بے تاب مرا کوئی گھڑی ہے شاید — خود بخود چوٹ لگی خود بخود آواز ہوئی
اے دل تلاشِ یار مین پھرتا ہے تو عبث — خواہش عبث، امید عبث، آرزو عبث
منظور کب تھا کعبہ و بتخانہ دیکھنا — دونون جگہ تھا جلوۂ جانانہ دیکھنا
چمن ہے دیدۂ خونبار سے سرخ — بہارِ لالہ ہے داغِ جگر تک
ساتھ لے جائے کہان عشق کی رسوائی کو — گور بھی تنگ ملی ہے ترے سودائی کو
کیا قہر ہے کہ ان کو سکھاتا ہے نازِ حسن — تم چال وہ چلو کہ کسی کا چلن نہ ہو
جتنی الفت زیادہ ہوتی ہے — دل کی حسرت زیادہ ہوتی ہے
او ستمگر روان ذرا ادھر دیکھ — جی جلتے ہین تیری چال کے ساتھ
اُٹھتے ہی ترے شورِ قیامت بھی گیا بیٹھ — او فتنۂ برخاستہ از بہر خدا بیٹھ
جاؤن مین کرکے پاس مرا آشنا ہے کون — دنیا مین بے وفا ہین سبھی باوفا ہے کون
لے کے خنجر جو کیا چاک جگر اُس نے مرا — ٹکڑے الماس کے دو چار جگر سے نکلے
واحسرتا نصیب نے چونکا دیا ہمین — آئی نظر جو خواب مین صورت وصال کی
سوزن کا ہے نہ کام، نہ ناخن کی ہے جگہ — کیونکر مژہ کی پھانسی جگر سے نکالیے

زبان کی پاکیزگی اور بیان کی صفائی نے شیخ مصحفی کے کلام مین جو اثر و درد جمع کیا ہے اس کا اندازہ اس سے [ہو] سکتا ہے کہ مرحوم کے بہت سے اشعار اپنی دل آویزی کی وجہ سے زبان زدِ خاص و عام ہین، اہل درد بغیر اس علم کے [کہ] یہ شعر کس کا ہے پڑھتے ہین اور سر دھنتے ہین اور یہ اس حالت مین ہے کہ میر تقی میر، مومن خان یا مرزا غالب [کی] طرح مصحفی مرحوم کا کوئی حقیقی پرستار موجود نہین۔

ذیل کے اشعار ملاحظہ ہون۔

شیخ کعبہ سے اُٹھ نکل باہر — گھر مین بیٹھے خدا نہین ملتا
شوق سے گرمئ عارض وہ دکھائین مجھکو — موم کا تو مین نہین ہون کہ پگھل جاؤن گا
کام کر جاتی ہین تری آنکھین — چپکے چپکے ہزار آنکھون مین
مین وہ نہین ہون کہ اس بت سے دل مرا پھر جائے — پھرون مین اس سے تو مجھسے مرا خدا پھر جائے

غم کھاتا ہون جتنا مری نیت نہین بھرتی — کیا غم ہے مزے کا کہ طبیعت نہین بھرتی
صبح سے شام ہوئی شام سے پھر رات ہوئی — یہی وعدے ہین تو کب اُنسے ملاقات ہوئی
اجل لگائے ہوئے تاک ہر کسی پر ہے — بہوش باش کہ عالم رواروی پر ہے
پھٹ گیا جب سے گریبان تب سے — ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہین
اے فلک آپ کو اتنا جو پھرایا تو نے — کوئی معشوق بھی عاشق سے ملایا تو نے
شاہد رہیو تو اے شب ہجر — جھپکی نہین آنکھ مصحفی کی
لوگ کہتے ہین محبت مین اثر ہوتا ہے — کون سے شہر مین ہوتا ہی کدھر ہوتا ہے
ترا شوق دیدار پیدا ہوا ہے — پھر اس دلکو آزار پیدا ہوا ہی
بلبل کے مشت پر بھی اڑا دو تو سیر ہے — غنچون کو چٹکیون مین تو آخر اڑا چلے
نہ کہین صبح ہی ہوتی ہی نہ خواب آتا ہے — رات کیا آتی ہے اک سر پہ عذاب آتا ہے
جو ملا اس نے بیوفائی کی — کچھ عجب رنگ ہے زمانے کا
عاشق سے بھی ہوتا ہے کہین صبر و تحمل — وہ کام بتاتے ہو جو آتا نہین ہمکو
زندگی ہے تو خزان کے بھی گذر جائینگے دن — فصل گل جیتون کو پھر اگلے برس آئی ہے
چل چل کے جو رہ جاتا ہے ہر بار گلے پر — یہ ناز نہ ہمسے ترے خنجر کے اٹھین گے
شکل امید تو کب ہم کو نظر آتی ہے — صورت یاس بھی بن بنکے بگڑ جاتی ہے
حسرت پر اس مسافر بیکس کی روئیے — جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے
بلبل نے آشیانہ جب اپنا اٹھا لیا — پھر اس چمن مین بوم بسے یا ہما بسے

مصحفی اور مرزا داغ کے کلام مین معنوی حیثیت سے جو فرق ہے اسے مین ظاہر کر چکا ہون لیکن اب چند اشعار تقابل کی صورت سے بھی پیش کیے جاتے ہین ۔ مصحفی مرحوم کا ایک شعر ہے ؎

اول تو مجھے خط مین سنائی ہین ہزارون — آخر مین یہ لکھا ہے کہ مین کچھ نہین کہتا

مرزا داغ اس شعر پر اس طرح قبضہ کرتے ہین ؎

خط مین مجھے اول تو سنائی ہین ہزارون — آخر یہی لکھتا ہے کہ مین کچھ نہین کہتا

مصحفی مرحوم کا شعر ہے

اب نہ فرہاد ہے نہ مجنون ہے — رہ گیا عاشقون کا افسانہ

مرزا داغ چند الفاظ غیر ضروری اضافہ کرکے یون کہتے ہین

باقی جہان مین قیس نہ فرہاد رہ گیا افسانہ عاشقون کا مگر یاد رہ گیا

مصحفی مرحوم کا شعر ہے ؎

وعدے کی شب جو کل تھی کیا بیقرار تھے ہم سو بار سے گھر سے نکلے سو بار گھر مین آئے

اور مرزا داغ اس طرح ادا کرتے ہین ؎

شب وعدہ نہ ہوا ایک جگہ مجھ کو قرار صبح تک مین کبھی گھر مین کبھی باہر آیا

شعر اول کی بے ساختگی اور طرز ادا خصوصیت کے ساتھ دلکش ہے۔ دوسرے شعر مین یہ بات پیدا نہ ہوسکی

مصحفی مرحوم کا ایک بانکا شعر ہے ؎

جادۂ شمشیر تھا یا کوے یار پاؤن کے رکھتے ہی یہان سر گیا

مرزا داغ کے یہان یہ شعر اس طرح ادا ہوا ہے ؎

گلی مین یار کی جانا ہی جان سے جانا جو پاؤن رکھتے ہین وہ تن پہ سر نہین رکھتے

دوسرے مصرعون کا تقابل پورے شعر کے تقابل کے لیے کسوٹی ہے۔

مصحفی مرحوم کا ایک خاص شعر ہے ؎

اس طرف ہم ہونگے رخصت اس طرف تم جائیو کاٹ لے لے شمع اک شب گریہ وزاری مین ڈر

مرزا داغ اس طرح فرماتے ہین ؎

اے شمع ہمارا ساتھ دینا تکلیف ہے اور دوپہر کی

دونون کا فرق اظہر من الشمس ہے

مصحفی مرحوم کا ایک اور شعر ہے ؎

بیٹھ کر وہ جہان سے اٹھتا ہے ایک فتنہ وہان سے اٹھتا ہے

مرزا داغ کہتے ہین ؎

فتنہ ان کے قدم سے اٹھتا ہے ہر قدم کس ستم سے اٹھتا ہے

شیخ مصحفی کا شعر ہے ؎

حیران ہوں اسقدر کہ شب وصل بھی مجھے تو سامنے ہے اور ترا انتظار ہے

مرزا داغ نے یہ حیرانی ان الفاظ میں ظاہر کی ہے ؎

اس بت پہ احتمال ہے تصویر کا مجھے عادت گئی نہ وصل میں بھی انتظار کی

فرق بیان کا محتاج نہیں۔

مصحفی مرحوم کہتے ہیں ؎

مقصود ہے آنکھوں سے ترے رخ کا نظارہ جب تو ہی نہو پاس تو کس کام کی آنکھیں

اب مرزا داغ کی تشریح دیکھیے ؎

مدعا یہ تھا کہ ہم دیکھیں تجھے ورنہ کیوں نورِ نظر پیدا کیا

کیا دونوں شعروں میں بلحاظ ادا کوئی بھی نسبت ہے ؟

شیخ مصحفی کا ایک خالص عاشقانہ شعر ؎

کیا ادا ہے کہ اسے عکس سے اپنے ہے حیا آرسی آنکھ سے دیکھے ہے وہ شرمائے ہے

اور مرزا داغ کہتے ہیں ؎

اپنا ہی عکس کیوں نہو اللہ رے حجاب دیکھا نہ آئینہ کبھی اس نے قریب سے

مصحفی فرماتے ہیں ؎

صفائے دل میں بھی کیا کیا نظر نہیں آتا جو دیکھو جام جہاں میں سے کم یہ جام نہیں

مرزا داغ کے یہاں بھی یہ جام موجود ہے ؎

گر ذوقِ سیر ہے کچھ، تو دیکھ میرے دل کو یہ بھی ہے اک نمونہ، جام جہاں نما کا

اپنے اور غیر کے دل کے دیکھنے میں جو فرق ہے وہی فرق مصحفی مرحوم اور مرزا داغ کے شعروں میں سمجھنا چاہیے

مصحفی مرحوم کا ایک بے نظیر شعر ہے ؎

لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے کون سے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے

مرزا داغ نے اس سے بھی کام لیا ہے ؎

سنتے ہیں خوشی بھی ہے زمانے میں کوئی چیز — ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں کدھر ہے یہ کہاں ہے

مصحفی مرحوم کا شعر ہے ؎

دو چار قدم جا کے پھر آتے ہیں ہمیشہ — رہتا ہے نیا روز سفر اس کی گلی میں

لیکن مرزا داغ کی بازگشت کا نقشہ یہ ہے ؎

تری گلی میں رہی بازگشت مثلِ نفس — کہ جتنی دور گیا پھر کے اتنی دور آیا

مصحفی مرحوم فرماتے ہیں ؎

منھ پہ کہہ دیتا ہے یہ بزم میں سب کا بد و نیک — ہے یہی عیب کہ آئینہ صفا مشرب ہے

اب مرزا داغ کی صفائی دیکھیے ؎

آئینہ منھ پہ برا اور بھلا کہتا ہے — سچ ہے یہ، صاف جو ہوتا ہے صفا کہتا ہے

مصحفی مرحوم ذیل کے ابیات میں ایک بے مثال نقش کھینچ گئے ہیں ؎

تصور میں تری رفتار کے ہر موج دریا کا — تماشا دیکھتا ہوں میں لبِ آبِ رواں بیٹھا

مرزا داغ نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھایا ہے ؎

یاد آجاتی ہے وہ چینِ جبیں دیکھ کے موج — لہر سی دل میں ہمارے لبِ جو آتی ہے

تشبیہ کا لطف جیسا مصحفی مرحوم کے یہاں ادا ہوا ہے مرزا داغ کے یہاں نظر نہیں آتا۔

مصحفی مرحوم فرماتے ہیں ؎

جو دیکھے گل کو مرے اور نہ دیکھے تو ہو نڈھال — ہر اک طرح سے مصیبت ہے جانِ بلبل کو

مرزا داغ کے یہاں مضمون اس طرح ادا ہوا ہے ؎

ہجر ہے آفتِ جان، وصل بلائے دل ہے — آدمی کیلیے ہر طرح غرض مشکل ہے

مصحفی مرحوم فرماتے ہیں ؎

کم نصیبی کا گلا ہے کہ ہم اس دم پہنچے
گر کے جب ہاتھ سے ساقی کے سبو ٹوٹ گیا

مرزا داغ اپنی کم نصیبی کو یون ظاہر کرتے ہین ؎

کم نصیبی اس کو کہتے ہین کہ میرے وار پر
دست ساقی سے ادھر شیشہ ادھر ساغر گرا

مصحفی مرحوم کا شعر نہایت صاف و برجستہ ہے

مرزا داغ کے دواوین مین متعدد غزلین ان زمینون مین ہین جن مین شیخ مصحفی مرحوم کو طبع آزمائی کا موقع ملا ہے اور شیخ مرحوم کے کلام مین سیکڑون اشعار ان قوافی مین ہین جن کو مرزا داغ کی صفائی پسند طبیعت نے اپنے لیے انتخاب کیا ہے یہان اتنا موقع نہین کہ ایک ایک شعر درج کیا جاسکے۔ اسلیے ہم چند خاص اشعار تحریر کرتے ہین۔ جو ارباب فہم کی نگاہ فیصلہ طلب کے لیے کافی ہون گے۔

گر میرے بت ہوش ربا کو نہین دیکھا
اس دیکھنے والے نے خدا کو نہین دیکھا　　داغ

یک دن مین نے بت ماہ لقا کو نہین دیکھا
جس طرح کہ بندہ نے خدا کو نہین دیکھا　　مصحفی

افسوس کہ فرصت مین کبھی غور سے تم نے
افسانۂ ارباب وفا کو نہین دیکھا

ہم نام ہی سنتے ہین فقط مہر و وفا کا
آنکھون سے کہین مہر و وفا کو نہین دیکھا

صدقے مین تم نے چھوڑ دیے ہین بہت اسیر
مین بھی رہا ہوا کہ گرفتار ہی رہا

مانند مرغ قبلہ نما مرغ دل مرا
نکلا نہ آشیان سے گرفتار ہی رہا

جلوے کے بعد وصل کی خواہش ضرور تھی
وہ کیا رہا جو عاشق دیدار ہی رہا

ملنے سے میرے یار کو انکار ہی رہا
جب تک جیا مین وعدۂ دیدار ہی رہا

زاہد مزہ تو جب ہے عذاب و ثواب کا
دوزخ مین بادہ کش نہون جنت مین تو نہ ہو

تیری ہی ذات سے تو ہے وابستہ یہ طلسم
ہستی کہان ہماری اگر ہم مین تو نہ ہو

دست دعا کو ملتی ہے تاثیر عرش سے
جو ہاتھ سے ہو پاؤن سے ہو وہ جستجو نہ ہو

سرگشتہ میری طرح جو رہتا ہے آسمان
ڈر ہے مجھے اسے بھی تری جستجو نہ ہو

ملائیں آسمان و زمیں کوئے غیر میں		بنجائے ہر ستارہ دُرِ گوشِ نقشِ پا
ہے کاروانِ رفتہ فراموشِ نقشِ پا		بانگِ جرس کو سن نہ سکے گوشِ نقشِ پا

تم شوخیوں سے پاؤں تو رکھو زمین پر		کھل کھیلتے ہیں اب لبِ خاموشِ نقشِ پا
افتادگانِ وادیِ غربت کی سرگذشت		کرتا ہے خود بیاں لبِ خاموشِ نقشِ پا

روندی نہیں ہے آپ نے کیا قبرِ داغ کی		پھولوں کی چادر اُسنے چھپا جوشِ نقشِ پا
روندن میں ہم تو ہو گئے پامالِ مصحفی		از بس کہ اس گلی میں ہوا جوشِ نقشِ پا

اُڑایا جیسے تو نے چٹکیوں میں اسکو اے قاتل		یہ زخمِ دل بھی ہنس کر منہ چڑھاتا ہے نمکدان کا
نہ ہم مرہم سے کچھ واقف نہ پھاہے کو سمجھتے ہیں		ہمارے زخم پر احسان ہے تیرے نمکدان کا

فلک نے خوب خدمت لی ہمارے دیدۂ تر سے		کہ ہر آنسو سے منہ دھویا شبِ تاریکِ ہجران کا
اگر اس زلف کا مذکور بھی کچھ درمیان آتا		فسانہ طول کھینچے گا بہت شبہائے ہجران کا

ہمارے داغِ عصیاں داغ کیا کیا رنگ لائینگے		گمان گذریگا دوزخ پر بھی جنت کے گلستان کا
نوائے بلبلانِ قدس کا میں سننے والا ہوں		خوش آتا ہے مجھے کب زمزمہ مرغِ گلستان کا

ناوکِ یار سے یہ دل نے کہا مجھ کو چھوڑ		سائے کے ساتھ ترے میں بھی نکل جاؤنگا
دمِ بیمار ہوں کیا میرا بھروسہ ہے مسیح		جب کڑی مجھ پہ پڑے گی میں نکل جاؤنگا

دل لگاتا نہ کبھی دارِ فنا میں ہرگز		کیا خبر تھی مجھے آج آؤں گا کل جاؤنگا
مجھ کو قاصد کے تغافل نے تو مارا ہے ہے		روز ظالم یوں کہتا ہے کہ کل جاؤنگا

اِس قدر ناز ہے کیوں آپکو یکتائی کا		دوسرا نام ہے وہ بھی مری تنہائی کا
ہے یہاں کس کو دماغ انجمن آرائی کا		اپنے رہنے کو مکان چاہیے تنہائی کا

ہو گیا پرتو رخسار سے پھولا ہی رنگ　　　مین نے منہ چوم لیا اس کے تماشائی کا
کیا تماشا ہے جو آتا ہے ترے کوچے مین　　　قدم آگے نہین بڑھتا ہے تماشائی کا

تھم گئے جم گئے آنکھون مین لہو کے قطرے　　　خون ظاہر ہے مرے صبر و شکیبائی کا
رہزن قافلۂ دل ہوئیں جب وہ آنکھین　　　پہلے اسباب لٹا صبر و شکیبائی کا

سخت جانون کا تو مشکل ہے گلا کٹتا ہے　　　پہلے پتھر پہ لگا لیجیے خنجر اپنا
خون بسمل سے ہے اس ساعد رنگین پہ بہار　　　تم نے کیون پھینک دیا ہاتھ سے خنجر اپنا

توبہ جو مین نے کی نکل آیا ذرا سا منہ　　　وہ رنگ روپ ہی نہین صبح بہار کا
دیکھو شبیہ عاشق و معشوق کا ورق　　　گویا مقابلہ ہے خزان و بہار کا

عاشق کی مشت خاک پریشان نہو کبھی　　　اس مین جو میل ہو ترے دل کے غبار کا
کرلے صبا طواف ہمارے مزار کا　　　پائے گی پھر نشان بھی نہ مشتِ غبار کا

گر تو نہ ہو تو پھر کسی کافر کا دل لگے　　　دوزخ مین آرمیدہ ارم سے رمیدہ ہون
ہستی سے اپنی مجھ کو نہین مطلق آگہی　　　عمر گذشتہ ہون کہ مین ہوش رمیدہ ہون

نازک مزاجیون نے مجھے تجھ سا کر دیا　　　اے بے خبر مین اپنے سے آپ ہی کشیدہ ہون
مرغان باغ مین مرے نالے کا شور ہے　　　ہرچند مین ابھی نفس ناکشیدہ ہون

اللہ رے کشاکش دیر و حرم کہ مین　　　ظالم ہزار ہاتھ سے دامن دریدہ ہون
پیدا ہے میری وضع سے اک شوخی جنون　　　دریا نہین، مین سیل گریبان دریدہ ہون

سوائے جور و جفا ماورائے بغض و دغا　　　بتون کے واسطے دنیا مین کوئی کام نہین
دل ایک قطرۂ خون، کوہِ عشق بارِ گران　　　تحمل اس کا کرے آدمی کا کام نہین

وہ جدھر کو گئے اٹھا یہ شور
مجھکو پامال کر گیا ہے ابھی

وہ قیامت اٹھائے جاتا ہے
یہ جو دامن اٹھائے جاتا ہے

جنبش مین یون ہے وہ لب نازک نفس کیساتھ
صورت عرق مین یون ہی رخ بیحجاب کی

جیسے ہلے نسیم سے پتی گلاب کی
بھیگی ہو جیسے اُوس مین پتی گلاب کی

لوگ جانین گے تصور انکا نہین اسکا ہے
سادگی دیکھ کہ بوسے کی ہوس رکھتا ہون

حشر مین آپ دیے جاتے ہین دشنام مجھے
جن لبون سے کہ میسر نہین دشنام مجھے

تجھ سے تو ستمگر ترے ارمان ہین اچھے
خواہان ہے یہ دل آرزوئے زخم دگر کا

تو جا کے نہ آیا کبھی یہ عمر بھر آئے
جو زخم لگے دل پہ وہ جلدی سے بھر آئے

آخر مین دونون باکمالون کی دو سالم غزلین نقل کرکے اس مضمون کو ختم کرتا ہون۔

مرزا داغ

یون چلیے راہ شوق مین جیسے ہوا چلے
ہم بیٹھ بیٹھ کر جو چلے بھی تو کیا چلے

بیٹھے اُداس، اُٹھے پریشان، خفا چلے
پوچھے تو کوئی آپسے کیا آے کیا چلے

آئین گی ٹوٹ ٹوٹ کے قاصد یہ آفتین
غافل ادھر اُدھر بھی ذرا دیکھتا چلے

ہم ساتھ ہو لیے تو کہا اس نے غیر سے
آتا ہے کون اس سے کہو یہ جدا چلے

بالین سے میری آج وہ یہ کہکے اُٹھ گئے
اس پر دوا چلے نہ کسی کی دعا چلے

موسیٰ کی طرح راہ مین پوچھے نہ راہ راست
خاموش خضر ساتھ ہمارے چلا چلے

افسانۂ رقیب بھی تو بے اثر ہوا
بگڑے جو سچ کہے سے ہان جھوٹ کیا چلے

رکھا دل و دماغ کو تو روک تھام کر
اس عمر بے وفا پہ مرا زور کیا چلے

بیٹھا ہے اعتکاف مین کیا داغ روزہ دار
اے کاش میکدے کو یہ مرد خدا چلے

مُصحفی مرحوم

جس دم وہ میری خاک کو ٹھوکر لگا چلے | چڑ کے بہت وہاں سے نہ دامن اٹھا چلے
لیلے بھی سیر باغ کو ہوتی نہین سوار | تے کے آگے آگے نہ جبتک صبا چلے
بلبل کے مشت پر بھی اڑا دو تو سیر ہے | غنچون کو چٹکیون مین تو آخر اڑا چلے
اُٹھنے لگے وہ جب مری بالین سے وقتِ نزع | نکلا یہی زبان سے آہستہ کیا چلے
کیا تھا خزان مین باغ مین آنے سے ہمکو کام | آئے تھے آشیانے کو اپنے جلا چلے
یارب یہ مصحفی کی دعا ہے کہ آج کل | شرق سے ایک بار کچھ ایسی ہوا چلے

جو خود بخود سپہر پہ چڑھ مثلِ آفتاب
مغرب زمین کو تختِ سلیمان چلا چلے

افسر امروہوی

دو نئی کتابین

نقاب اٹھ جانیکے بعد۔ حضرت نیاز فتحپوری کے ان افسانون کا مجموعہ جن مین بتایا گیا ہے کہ ہر وہ چیز جو چمکتی ہو سونا نہین" حضرت نیاز کا مخصوص انداز تحریر اور زور قلم ان افسانون مین بدرجہ کمال نظر آتا ہے، جابجا وہ مزاحیہ رنگ جو جناب نیاز کی تحریر کی خصوصیت ہے عجیب لطف دیتا ہے۔ قیمت مع محصول ۸/

لالہ رُخ۔ طامس مور کی اس معرکۃ الآرا مثنوی کا ترجمہ نگار کے اول سال اشاعت مین بالاقساط شایع ہو کر جتنی قبولیت حاصل کر چکا ہے وہ کسی سے مخفی نہین ایک تو طامس مور کی نزاکت خیال اور اسپر ملک کے ادیب جلیل جناب لطیف احمد صاحب اکبرآبادی کا ترجمہ جتنی بھی تعریف کی جاے کم ہے اس کتاب مین چار افسانے ہین (۱) ابن مقنع (۲) بہشت اور پری (۳) آتش پرستاران فارس (۴) نور محل اور ہر افسانہ اپنی جگہ نزاکت خیال اور شاعرانہ تخیل کا ایک ایسا بہترین نمونہ ہے کہ مشکل ہی سے اسکی نظیر مل سکتی ہے اور جسکو پڑھکر انسان پر سکر کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ قیمت مع محصول ۱۲/

نوٹ:۔ دونون کتابین ایک ساتھ طلب کرنے پر مع محصول ڈیڑھ روپے مین مل سکتی ہین۔

منیجر "نگار" لکھنو

عشق کی گولیاں

یہ مضمون مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی کی ایک خاص جدت کا نتیجہ ہے۔ انھون نے اس کو ناتمام لکھ کر مختلف رسائل مین نقلین روانہ کین تاکہ ملک کے دوسرے مزاحیہ نگار اس کو اپنے اپنے نقطۂ نظر سے مکمل کرین۔ چنانچہ اس سلسلے مین جناب شوکت تھانوی کو بھی دعوت دی گئی اور نگار مین انھین کا پورا کیا ہوا مضمون شائع ہو رہا ہے۔ نیرنگ خیال، عالمگیر، ساقی، اور ہمایون کو بھی اس کی نقلین روانہ کی گئی تھین اور غالباً وہان بھی یہی مضمون دیگر حضرات کے قلم سے مکمل ہو کر شائع ہوگا۔ سب سے آخر مین خود مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بھی اسے اپنے خیال کے مطابق مکمل فرما دین گے۔ یقیناً یہ طریقہ مختلف حضرات کے ذوق کے امتحان کا بہت دلچسپ ہے اور مجھے امید ہے کہ اس کے بعد جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کسی شخص ثالث کو اس فیصلے کا بھی اختیار دین گے کہ وہ ان تمام مضامین پر تنقید کر کے سب سے بہتر پیوند لگانے کو منتخب کرے۔

نیاز

از مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی

ناصر کو مین کیا اس کے سارے دوست بے وقوف سمجھتے تھے۔ اور کیون نہ سمجھتے جس بھلے آدمی کا سر کھوپرے کی بٹیا ہو اس مین عقل ہی کہان سے آنے لگی اور آئے گی بھی تو کتنی آئے گی۔ بیچارہ چار دفعہ انٹرنس کے امتحان مین بیٹھا اور سب مضمونون مین فیل ہوا۔ اللہ نے مان باپ کو روپیہ دیا تھا۔ جھٹ اٹھا ولایت بھیجدیا۔ ہماری تو سمجھ مین نہین آتا کہ ولایت کی کچھ آب و ہوا ہی نئی ہے یا وہان والے طالبعلمون کو کتابین گھول کر پلا دیتے ہین کہ یہان سے ان پڑھ جاؤ اور تین چار ہی برس مین بی۔ اے، ایم۔ اے۔ ایل ایل ڈی ہو کر آجاؤ۔ یہان ناصر کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ یا تو کسی طرح انٹرنس مین پاس ہی نہوتے تھے یا ولایت جاتے ہی زنازن امتحانون مین پاس ہونے لگے۔ اور تین ہی برس مین بی اے ہو کر ڈاکٹری کی جماعت مین شریک ہوگئے۔ بڑی تو اہی سے وہان پانچ برس گذارے امتحان مین بیٹھے پاس ہوئے اور سند مل گئی کہ آج سے اس شخص کو اختیار ہے کہ جس کو چاہے زہر دیکر مار ڈالے جس پر چاہے چھری چلا دے۔ جس کو چاہے عدم آباد پہنچا دے۔ کسی قانون کے رو سے اس کے مقابلہ مین ضرر رسانی۔ زہر خورانی۔ یا قتل عمد کا مقدمہ قائم نہ ہو سکے گا۔ خیر پڑھائی سے فارغ ہو کر گھر آئے اور بہت دھوم دھام سے آئے

ہان باپ کے دل باغ باغ ہوئے قبرستان والون کے ہان عید ہوئی مریضون اور بیمارون کی موت آئی۔ میان ناصر نے اپنی دوکان پھیلائی اور ملک الموت نے ان کے نام سے اپنے دفتر مین ایک نیا کھاتہ کھول دیا۔

میرے بچپنے کے دوست اور گھر کے دوست تھے مین بھی ملنے گیا۔ شکل وصورت مین تو کچھ فرق نہین آیا تھا جیسے کالے پہلے تھے ویسے ہی اب بھی تھے۔ ہان صابن اور کریم کے رگڑون نے چہرے کو ذرا چمکا دیا تھا۔ مانگ سیدھی سے آڑی ہو گئی تھی۔ ترکی ٹوپی کی جگہ ہیٹ نے، شیروانی کی کوٹ نے اور پیجامہ کی پتلون نے لے لی تھی۔ مونچھین منڈنے سے ذرا مردانہ شکل بھی نکل آئی تھی زبان مین تیزی آگئی تھی لیکن اختصار اور بھیجے کی کمی ان کی گفتگو کو بمبئی سا کر دیتی تھی۔ بات شروع کرتے بڑے لوگون کے مقولے بیان کرتے اور بہک کر کہین سے کہین نکل جاتے۔ ہان ان کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی کہ جس طرح اکڑے گئے تھے اسی طرح ایک اکن ایک آئے ولایت مین اپنی یادگارین چھوڑی ہون تو چھوڑی ہون۔ لیکن اپنے ساتھ کوئی دم چھلا لگا کر نہین لائے۔ خیر یہی غنیمت ہوا ورنہ ان سے تو یہ بھی بعید نہ تھا اور پھر آپ جانتے ہین کہ ولایتی بیگم صاحبہ اکثر ہم غریب ہندوستانیون کے ہان آتی ہین تو اینٹھتی ہوئی آتی ہین۔ رہتی ہین تو دوسرون کی ہو کر رہتی ہین اور جاتی ہین تو لانے والے صاحب کے سر پر الٹا استرا پھیر کر جاتی ہین۔

بھلا مین کیا اور میری بساط کیا۔ ڈیڑھ سو روپے کا سی آئی ڈی انسپکٹر اس پر ایک بیوی اور دو بچے وہ ٹھہرے امیر ابن امیر اور ولایت کے تعلیم یافتہ لیکن خدا لگتی کہون گا کہ وہ بیچارہ جس طرح مجھ سے اور دوسرے دوستون سے پہلے ملتا تھا اسی طرح بعد مین ملتا رہا معلوم نہین کہ اس کا باعث اس کی خاندانی شرافت تھی یا یہ وجہ تھی کہ وہ ہم لوگون کے علاوہ دوسرون کے سامنے بیوقوف بننا نہین چاہتا تھا۔ بہرحال کچھ بھی ہو واقعہ یہ ہے اس نے اپنے دوستون کی تعداد مین اضافہ نہین کیا جب ملتا بہت محبت سے ملتا اور اس طرح ملتا کہ یہ بھی معلوم نہوتا کہ یہ شخص دوسرے ولایتیون کی طرح ہم غریبون کا دنیا مین رہنا بے ضرورت سمجھتا ہے۔ یہ سب کچھ تھا مگر مجھے ناصر کی ایک بات سے نفرت تھی وہ ضرورت اور بے ضرورت ہر بات مین خواہ مخواہ دخل دینا۔ اور اپنی رائے ایسے وثوق کے ساتھ بیان کرنا کہ گویا اب اس کی تردید افلاطون ہی کرے تو کرے اور اس کے ساتھ ہی ایسے عجیب وغریب واقعات بیان کر جاتا کہ ان کو اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو "سفید جھوٹ" کہا جا سکتا ہے۔ اور جہان کہین ۔۔کٹری کی بحث آجاتی تو پھر کچھ نہ پوچھو وہ وہ قصے شروع ہو جاتے کہ نہ آنکھون دیکھے اور نہ کانون سنے۔ وہ ۔۔ تھا کہ ڈاکٹری ایک ایسا علم ہے جس کو عقل سے کوئی تعلق نہین اور ایک ایسا فن ہے جو ولایت گئے بغیر ۔۔ ہی نہین ہو سکتا اگر اس مین یہ بات نہوتی تو واقعی اس کی صحبت بڑی اچھی صحبت ہوتی لیکن اس کی ان قصون سے ۔۔جھنے لگتی اور جی چاہتا کہ بس اٹھ بھاگو۔ سب یار دوستون کو اس سے بس یہی ایک شکایت تھی لیکن صاف صاف

کہہ دینے کی کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی۔ سب خاموش بیٹھے اس کی یہ اُلو پنے کی باتیں سنا کرتے۔ بے لطف ہو کر اٹھتے اور گھر پر آ کر اس کا مذاق اڑاتے۔

ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ اس نے سب دوستوں کی دعوت کی میں بھی گیا۔ کھانے کے بعد پھر اُس نے وہی بے معنی باتوں کا سلسلہ چھیڑا۔ کسی نے حکیم شریف خان کی معجون کی تعریف کر دی کہ اعضائے رئیسہ کے لیے اس سے بہتر دوا ملنی مشکل ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ ناصر تو بگڑ ہی گیا کہنے لگا کہ "اوہو حکیم بھی اب اس قابل ہو گئے کہ نسخہ ترتیب دے سکیں۔ اور ہندوستان کی سڑیل دوائیں بھی ایسی ہو گئیں کہ اعضائے رئیسہ کو تقویت پہنچائیں یارو تم کو کیا ہو گیا ہے۔ ایک فن کو جانتے ہیں اور خواہ مخواہ اپنی ٹانگ اڑا دیتے ہو۔ ذرا ولایت جاؤ تب معلوم ہوگا کہ طب کا علم کیا ہے اور علاج کس طرح کرتے ہیں۔ جب میں جرمنی گیا تھا تو ڈاکٹر اسٹریس مین سے بھی پڑھنا پڑا۔ انھوں نے ایک ایسا عرق ایجاد کیا ہے ایک بوند روزانہ پلا دینے سے آٹھ دن میں انسان کی صورت ہی بدل جاتی ہے"

احسان بیچ میں بول اٹھا کہ "یار عزیز تم تو جیسے لڑ بڑ گئے تھے ویسے ہی آ گئے، ایک آدھ بوند تم بھی پی آئے ہوتے" ناصر نے کہا کہ "آخر میں کیوں پیتا۔ مجھ میں ایسی کون سی کسر ہے جو خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے علاج کراتا" احمد سے بھلا کیا چپکا رہا جاتا وہ بولے "مگر یار ڈاکٹر اسٹریس مین تو علاج نہیں کرتے وہ تو معاشیات کے ڈاکٹر ہیں" اب ناصر کی بے حیائی دیکھیے کہ بجائے قائل ہونے کے الٹا احمد سے ربٹ گیا اور کہنے لگا کہ ماشاء اللہ آپ بھی چہکنے لگے ہم نے چھ مہینے تک ڈاکٹر اسٹریس مین سے جراحی سیکھی ہم تو ہوئے بھوسے اور آپ ہوئے بیٹے، ذرا سوچ سمجھ کر بولا کرو ورنہ لوگ بے وقوف کہیں گے۔ آج تو یہ کہا ہے کل شاید یہ کہو کہ ڈاکٹر مارگولیتھ کو بھی ڈاکٹری نہیں آتی۔ میرے آنے سے کوئی دو مہینے پہلے کی بات ہے کہ ڈاکٹر مارگولیتھ نے ایسی گولیاں ایجاد کی ہیں کہ تم جیسا بے وقوف شخص بھی چالیس روز تک کھائے تو خاصہ بھلا آدمی ہو جائے۔ مجید نے ذرا مسکرا کر کہا کہ "ہاں میاں ناصر! یہ تو بتاؤ کہ تم نے بھی ان گولیوں کا استعمال کیا ہے یا جیسے گئے تھے ویسے ہی واپس آئے، یار ہمیں بھی تھوڑی سی منگا دو یا کم سے کم پتہ ہی بتا دو یہ وہی مارگولیتھ ہیں نا جو آکسفورڈ میں پروفیسر ہیں" ناصر نے کہا کہ "ہاں یہ وہی ڈاکٹر ہیں۔ جب تم کو پتہ معلوم ہے تو پھر مجھ کو بیچ میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے خود ہی کیوں نہیں منگا لیتے مگر یار یہ گولیاں ہیں بہت مہنگی"

یاروں میں یہ نوک جھونک ہو رہی تھی۔ میں چپکا بیٹھا سن رہا تھا۔ خبر نہیں کیوں میاں ناصر ایک دفعہ ہی میری طرف مڑ کر کہنے لگے "ارے بھئی تم نے دیکھا یہ لوگ سمجھتے ہیں نہ بوجھتے خواہ مخواہ دخل درمعقولات دینے لگتے ہیں۔ ذرا تم ہی بتاؤ میں کچھ غلط کہہ رہا ہوں" میں اس کی یہ بے تکی باتیں سن سن کر پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے کہا "میاں ناصر کل تک اگر تم ایسی باتیں کرتے ایسی نئی نئی ایجادوں کا ذکر کرتے تو میں تم کو یقیناً جھوٹا کہتا مگر کل سے مجھے ہاتھ میں ایک ایسا مقدمہ آیا ہے کہ تم جو کچھ کہو سب صحیح ہے۔ جب ہندوستان والے "عشق کی گولیاں" ایجاد کر سکتے ہیں

تو ولایت والے جو کچھ نہ کر دکھائین وہ کم ہے" عشق کی گولیون کا نام سن کر سب ہکا بکا سے رہ گئے۔ میان ناصر بھی بہت کچھ سٹپٹائے آخر کچھ سنبھل کر بولے" ان گولیون سے عشق کا مرض زائل ہوتا ہے یا پیدا ہوتا ہے"۔ مین نے کہا "پیدا ہوتا ہے"۔ ناصر نے کہا ہرگز نہین دوا مرض کو زائل کرتی ہے پیدا نہین کر سکتی اور پھر عشق کوئی مرض بھی نہین ہے جو پیدا کیا جا سکے مین نے کہا کہ دیکھو میان ناصر تم نے اپنے اتنے چشم دید واقعات بیان کیے مین نے کسی کو غلط نہین کہا اور نہ یہ کہا کہ تم جھوٹ کہتے ہو پھر جب مین اپنا دیکھا ہوا واقعہ بیان کرتا ہون تو تم کو کوئی حق نہین ہے کہ اس کو غلط کہو یا مجھکو جھوٹا سمجھو تم نے جو کچھ کہا وہ صرف زبانی تھا اور میرے پاس تحریری ثبوت موجود ہے یہ کہہ کر مین نے اپنی جیب سے ایک پاکٹ بک نکالی، دو چار صفحے ادھر ادھر الٹے پلٹے اور کہا دیکھو ان گولیون کا پورا حال۔ ان کا اثر اور ان کا تجربہ سب کچھ اس مین لکھا ہے اور ایسے شخص نے لکھا ہے جس نے خود ان گولیون کو کھایا ہے اور اس وقت شہر کے بڑے اسپتال مین موجود ہے اس کے بعد مین بھی دیکھون کہ وہ کون ہمت والا ہے جو مجھ کو جھوٹا کہہ سکے میرا یہ کہنا تھا کہ ہمارے سارے دوست کچھ دم بخود ہو گئے تھوڑی دیر تک تو سناٹا رہا اس کے بعد ہی سب کے سب میرے پیچھے پڑ گئے کہ بھئی وہ قصہ بیان کرو۔ مین نے بہت کچھ ٹالا مگر یہ شیطانی لشکر کب ماننے والا تھا آخر مین نے کہا کہ دیکھو یار دون مین واقعہ تو بیان کرتا ہون لیکن ایک شرط ہے تم کو معلوم ہے کہ مین سی آئی ڈی مین ہون یہ کارروائی بھی راز کی ہے۔ پہلے یہ اقرار کر لو کہ اس کا ایک حرف بھی ہم لوگون کے باہر نہین جائے گا اور اگر باہر گیا تو پھر ہماری تمھاری دوستی القط۔ خیر بہت کچھ اقرار مدار ہوئے۔ قسما قسمی ہوئی اور مین نے قصہ یون بیان کرنا شروع کیا۔

ہان تو ہوا یہ کہ پرسون شام کے کوئی ساڑھے چار بجے مین کلب جانے کے لیے کپڑے بدل رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ جا کر سنا تو صاحب مجھے کہنے لگے دیکھو ابھی ٹھنڈی سڑک پر جاؤ ایک واقعہ ہو گیا ہے اور امن عامہ مین خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ کل صبح تک مجھے پوری رپورٹ دی جائے۔ جی تو بڑا جلا کہ آج ٹینس گیا۔ مگر کیا کیا جاتا۔ نوکری ہے نہ بھائی بندی ہے۔ اسی وقت الٹے سیدھے کپڑے پہن ٹھنڈی سڑک پہنچا کیا دیکھتا ہون کہ لوگون کا ہجوم ہے۔ پھاڑ چیر کر اندر گیا۔ وہان کی جو کیفیت دیکھی تو آنکھین پھٹی کی پھٹی رہ گئین۔ بیچ سڑک پر نواب عاشق حسین خان پڑے ہین ایک ہاتھ مین ڈپٹی معشوق علی خان کی لڑکی محبوب بیگم کی ساری کا کونہ ہے اور برابر اونچی آواز مین کہے جا رہے ہین "مین عاشق ہون مین عاشق ہون مین یار تمھارا عاشق ہون" محبوب بیگم کو تو تم نے بھی دیکھا ہو گا کوئی ۱۷، ۱۸ برس کی لڑکی ہے اسی سال ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا ہے۔ باوجود مان باپ کے منع کرنے کے پردہ اٹھا دیا ہے اور ٹھنڈی سڑک پر ہیمون کی طرح اینٹھتی پھرتی ہے۔ مگر یارون اس وقت جو اس کی حالت تھی وہ دیکھنے کے تھی۔ چہرے پر ہوائیان اڑ رہی تھین، ہونٹ خشک تھے آنکھین ڈبڈبائی ہوئی تھین، ہاتھ پاؤن کانپ رہے تھے بیچاری ساری کا پلو چھڑانے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن میان عاشق حسین کچھ ایسے بھوت بن کر چمٹے تھے کہ کسی طرح

نہ چھوڑتے تھے۔ مجھے دیکھ کر ذرا اس غریب لڑکی کی جان مین جان آئی۔ مین نے جاتے ہی پہلے تو یہ کیا کہ جھٹکا دے کر اس بیچاری کا پلو چھڑایا، ارے بھائی پلو کا چھوٹنا تھا کہ نواب نے تو ہائے مار ڈالا کا اس زور سے نعرہ مارا کہ مین بھی پریشان ہو گیا، اب جو دیکھتا ہون تو نواب بے ہوش پڑا ہے۔ اتنی دیر مین یہان احسان تمھارے چھوٹے ماموں کی موٹر ادھر سے نکلی۔ مین نے موٹر مین نواب کو ڈالا اور شوفر سے کہا کہ ابھی اسپتال لیجا۔ مین بھی آتا ہون۔ اسکے بعد تماشائیون کو ڈانٹا کہ بھائیون تمھین شرم نہین آتی کہ ایک غریب لڑکی کا مذاق اڑا رہے ہو، جاؤ راستہ لو۔ خیر میرے اس کہنے سے وہ لوگ تو چلے گئے۔ اب مین اور محبوب بیگم وہان رہ گئے مین نے پوچھا کہ محبوب آخر یہ کیا معاملہ ہے تم کو اتنا بھی خیال نہین ہوا کہ کورٹ شپ بھی کیا تو بیچ سڑک مین۔ تمھارے باپ اور تمھارے خاندان والون کو لوگ کیا کہین گے۔ ایسا ولایتی پن تو شاید یورپ مین بھی نہین ہوتا۔ میرے اس طرح کہنے سے اس بیچاری کے آنسو نکل آئے کہنے لگی۔ بھائی پہلے آپ قصہ تو سن لین اس کے بعد جو جی چاہے آپ مجھے کہین۔ میرا اس مین کیا قصور ہے آپ جانتے ہین کہ مین شام کو چار بجے ٹہلنے نکلا کرتی ہون کوئی آٹھ دس دن سے یہ ہونے لگا کہ مین ٹھنڈی سڑک کے پاس پہنچی اور نواب عاشق حسین خان آموجود ہوئے۔ مین سڑک کے ایک کنارے پہ چلتی اور وہ دوسرے پر مگر آج تک انھون نے مجھ سے ایک بات بھی نہین کی۔ بس ان کا اتنا ہی کام تھا کہ ساری ٹھنڈی سڑک وہ میرے ساتھ ساتھ طے کرتے آپ خود جانتے ہین کہ یہ میرے والد صاحب قبلہ کے دوست ہین مین ان کو بچپن سے جانتی ہون۔ مجھے پھر ان کے اس طرز عمل سے گھبرانے کی کیا وجہ تھی، لیکن مین دیکھتی تھی کہ ان کی حالت دن بدن ابتر ہو رہی ہے۔ چلنے مین پاؤن تھرتھراتے ہین۔ آنکھون مین حلقے پڑ گئے ہین۔ خیر ہوتے ہوتے آج یہ ہوا کہ چلتے چلتے ان کو چکر آگیا اور لڑکھڑا کر گر پڑے۔ مین ان کی مدد کو دوڑی پاس بیٹھ کر رومال سے ہوا دینی شروع کی۔ انھون نے آنکھین کھولین۔ مین نے ان کی خیریت پوچھی بجائے اسکے کہ وہ میرا شکریہ ادا کرتے یا مزاج کی کیفیت بیان کرتے انھون نے میرا پلو پکڑ لیا اور خبر نہین کیا وائی تبائی بکنے لگے۔ تھوڑی دیر مین لوگون کا ٹھٹھ لگ گیا معلوم نہین کہ آپ کو کیسے خبر ہوئی اگر آپ نہ آجاتے تو خدا معلوم میری کیا نوبت ہوتی۔ آخر عورت ذات تھی کہان تک آپ کو سنبھالتی زار و قطار رونے لگی۔ مینے بہت کچھ تسلی دی کرائے کی موٹر منگائی۔ محبوب کو اس کے گھر پہنچایا اور خود اسپتال پہنچا۔

یہان پہنچ کر کیا دیکھتا ہون کہ نواب عاشق حسین خان صاحب پلنگ پر لیٹے ہائے ہائے کر رہے ہین۔ مین نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا یہ کیا معاملہ ہے، انھون نے کہا کہ ان کو مرض تو کچھ نہین ہان عام کمزوری [illegible] ہے اور بہت ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے ملکر مین نواب کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ حضرت یہ بیٹھے بٹھائے آپنے کیا آفت بپا کی بھلا اپنے کو دیکھو اور اس لونڈیا کو دیکھو۔ ہم بھی تو سنین کہ آخر یہ ہے کیا بات، نواب نے ایک بڑا لمبا ٹھنڈا سانس لیا اور کیا بتاؤن مین عاشق ہون مین عاشق ہون مین یار تمھارا عاشق ہون۔ جب مین بہت سر ہوا تو انھون نے یہ پاکٹ بک

مجھے دی اور کہا کہ اس مین میرے عشق کی ساری داستان درج ہے اب جاؤ میرا دل گھبرا رہا ہے یہ کہہ انھون نے پھر وہی اپنی جپنی جپنی شروع کی کہ "مین عاشق ہون مین عاشق ہون مین یار تمھارا عاشق ہون"

گھر آتے آتے رات ہوگئی تھی اس لیے کھانا وانا کھا کر مین اس پاکٹ بک کو لے کر بیٹھا۔ اب بجاے اس کے کہ مین خود اس قصے کو بیان کرون اس کے اندراج پڑھ دیتا ہون "عنوان ملاحظہ ہو۔

عاشق حسین خان کے عشق کی داستان

یون تو اللہ کا دیا میرے یہان سب کچھ موجود رہے لیکن وہ چیز جس کے لیے انسان پیدا ہوا ہے۔ یعنی عشق اس سے مین اب تک نا آشنا رہا عشق مجازی کی بھی کوشش کی لیکن تھوڑے ہی دنون مین طبیعت اُکتا گئی عشق حقیقی کیلیے بھی بہت کچھ نمازین پڑھین وظیفے گھوٹے مگر کورے کا کورا رہا آخر پریشان ہو کر اس کو بھی چھوڑ دیا۔ اس وقت میری عمر پچاس سے کچھ اوپر اور ساٹھ سے کچھ کم ہے رہ رہ کر خیال آتا کہ میان عاشق حسین جیسا تمھارا نامۂ اعمال سیاہ ہے وہ تو تم بھی جانتے ہو۔ عبادت مین دل نہین لگتا کم سے کم کسی نہ کسی طرح عشق مجازی ہی کی تکمیل کرلو کیونکہ یہی عشق حقیقی کا زینہ ہے مگر کیا کیا جائے ہزار کوشش کرتا کسی صورت سے عشق مجازی کی طرف بھی طبیعت راغب نہین ہوتی تھی۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے آخر یہ مشکل بھی آسان ہوگئی رسالہ ندرت کے خاص نمبر مین حکیم مشکل کشا کا اشتہار دیکھا! انھون نے منطقی دلائل سے یہ ثابت کرکے کہ عشق ایسی چیز نہین ہے جو خود بخود پیدا ہو اپنی گولیون کا اشتہار دیا تھا اور دعویٰ کیا تھا کہ اگر ان گولیون کے کھانے سے پریشان سے پریشان خیال آدمی بھی عاشق نہ ہوجاے تو وہ ہر طرح کا ہرجانہ بھرنے کو تیار ہین۔ اشتہار کی تحریر ایسی معقول کہ اس کی صداقت پہ کسی طرح شبہ ہی نہین ہو سکتا تھا اشتہار کی نقل کیے دیتا ہون تاکہ آپ بھی ملاحظہ فرمالین کہ میری رائے صحیح ہے یا غلط۔

عشق کی گولیان

حکما کا قول ہے کہ عشق بھی ایک مرض ہے

از شوکت تھانوی ——— جو

عام امراض کی طرح بغیر مادے کے پیدا نہین ہوتا اور بغیر اخراج مادہ کے دفع نہین ہوتا انسان مین فطرتاً عشق کا مادہ موجود ہے جس کا ہیجان مین آجانا معمولی انسان کو قیس اور فرہاد کا درجہ دے دیتا ہے ورنہ انسان اپنے مقصد زندگی سے بے خبر رہ کر جس طرح دنیا مین آتا ہے اسی طرح دنیا سے چلا جاتا ہے بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر عشق کا مادہ ہیجان مین نہ آئے تو انسان کو اندر ہی اندر

نہین معلوم کن کن امراض مین مبتلا کر دیتا ہے، ان ہی تمام باتون کو پیش نظر رکھ کر سالہا سال کی تحقیق اور تفتیش کے بعد رفاہ عام کے لیے ہم نے ایسی گولیان ایجاد کی ہین جن کے استعمال سے پتھر کی طرح بے حس انسان بھی عاشق بن سکتا ہے اور عشق کا منجمد سے منجمد مادہ بھی ہیجان مین آسکتا ہے، ان گولیون کے متعلق صرف اسقدر لکھ دینا کافی ہے کہ ان کے اجزا مین سے ایک جز اتفاق سے قیس نے کھا لیا تھا جو مجنون بن گیا۔ اور ایک فرہاد نے کھایا تھا جو کوہ کن کے نام سے زندہ جاوید ہے آج ہی آرڈر دیجیے ورنہ تازہ گولیان بننے تک انتظار کی زحمت برداشت کرنا پڑے گی۔ قیمت فی پیکٹ جس مین مکمل خوراک دس گولیان ہون گی اور پرچہ ترکیب استعمال بھی ہمراہ ہو گا ۵۰؎ محصول بذمہ خریدار فائدہ نہ ہو تو قیمت کے ہمراہ پچاس روپے بطور جرمانہ واپس ذیل کے پتے پر آرڈر دیجیے۔

حکیم مشکل کشا خان۔ عمدۃ الحکما مالک مشکل کشا دواخانہ اردو خانہ اسٹریٹ، لاہور

اس اشتہار کو دیکھ کر میرے دل نے گواہی دی کہ یہ اشتہار منجانب اللہ صرف میرے لیے دیا گیا ہے۔ اور حکیم مشکل کشا خان کو خداوند کریم نے صرف میری مشکل کشائی کیلیے پیدا کیا ہے مین نے بار ہا اشتہار کا مضمون پڑھا اور ہر مرتبہ میرے دل پر اس کی صداقت کا اثر قائم ہو تا گیا یہان تک کہ مین نے ایک کارڈ اٹھا کر لکھ ہی دیا۔

مکرمی جناب حکیم صاحب تسلیم۔ آپ کا اشتہار رسالہ ندرت مین نظر سے گذرا براہ کرم اپنی عشق کی گولیون کا ایک پیکٹ مندرجہ ذیل پتے پر دی پی فرما دیجیے۔ شکر گذار ہون گا۔

نیازمند

عاشق حسین خان

عاشق منزل نمبر ۴۲۰۔ الفت نگر۔ پریم گنج

خط لکھ چکنے اور سپرد ڈاک کرنے کے بعد ہی سے مجھ کو اپنے مین ایک ایسی تازگی اور چستی محسوس ہونے لگی گویا کسی بہت بڑے فرض سے سبکدوش ہو گیا ہون بلکہ بعض اوقات تو مین اپنے مین کچھ اس قسم کی گرمی محسوس کرتا تھا کہ گویا محض گولیون کا آرڈر دے دینے سے عشق پیدا ہو گیا ہے۔ سات آٹھ روز تک میرا یہی عالم رہا اور اس دوران مین اپنی کیفیت کا خود ہی اندازہ کرنے کے بعد مین اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ عشق تو خیر نہین عشق کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی معلوم نہین ظالم نے کونسا عمل پڑھ کر اشتہار لکھا تھا کہ اس کے الفاظ تک مین عشق کی گولیون کی تاثیر تھی بہرحال خدا خدا کر کے عین انتظار کے عالم مین ایک دن پوسٹ مین نے ۵۰؎ کا دی پی دیا ہم تو خود ہی ہر وقت دی پی کے دام ازار بند مین باندھے پھرتے تھے فوراً قیمت ادا کر کے دی پی وصول کر لیا۔ اور نہایت اضطراب کے ساتھ پیکٹ کھول کر پہلے تو گولیون کی صورت دیکھی

جو بالکل بکری کے بچون کی مینگنیون کے برابر تھین اور رنگ مین بھی ان ہی سے ملتی جلتی۔ لیکن یہ معلوم ہو رہا تھا کہ گویا ہر گولی کے اندر ایک ونیلے عشق آباد ہے اور ہر گولی کیوپڈ کے کمان کا تیر نہین بلکہ کیوپڈ کے ریوالور کا کارتوس ہے ہم نے دسون گولیون کو بغور دیکھنے کے بعد ترکیب استعمال کا پرچہ کھولا جو تھا تو ایک ہی ورق لیکن دونون طرف چھپا ہوا۔ ایکطرف تو تقریباً وہی مضمون تھا جو اشتہار کی صورت مین ہم دیکھ چکے تھے اور دوسری طرف ترکیب استعمال درج تھی جو من وعن درج ذیل ہے۔

اگر تم عاشق بننا چاہتے ہو تو آج ہی سے طے کر لو کہ تم عاشق ہو اور دل مین اس کا پورا یقین کر لو کہ تم کو عشق ہے اس کے بعد سہ پہر کو غروب آفتاب سے کچھ قبل غسل کر و آنکھون مین سرمہ لگاؤ صاف کپڑے پہن کر عطر لگاؤ سر مین خوشبودار تیل ڈال کر تھوڑا سا پانی بھی ملا لو کنگھی سے بال سنوار و اور یہ طے کر کے کہ تم اپنے محبوب کے پاس جا رہے ہو بسم اللہ کہہ کر گھر سے نکلو لیکن گھر سے چلتے وقت ایک تولہ سرد پانی کے ہمراہ ایک گولی کھا لو اور پھر خوشبودار پان کھا کر کسی پر فضا مقام پر یہ طے کیے ہوے چلے جاؤ کہ وہان تم کو تمھارا محبوب ملے گا چنانچہ جس مرد یا عورت کو دیکھ کر تمھارے دل مین پسندیدگی کا جذبہ سب سے پہلے پیدا ہو اس کو تم اپنا محبوب سمجھنا اسی سے تم کو عشق ہو گا اور دس دن کے اندر ہی اندر عشق اپنے تمام مدارج طے کرے گا، لیکن دس دن تک تم کو چاہیے کہ اپنے محبوب کا تعاقب ضرور کرو اور اگر بہت زیادہ دشواریان ہون تو کم سے کم ایک مرتبہ دیکھ ضرور لو اگر ان ترکیبون پر عمل کر کے تم نے دس دن تک دس گولیان ایک گولی روزانہ کھائی تو تمھارے عاشق ہونے کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ ورنہ ہم ذمہ دار نہین۔

اگر اپنے محبوب کو مطیع بنانا چاہتے ہو تو اس عمل کو یاد کر لو "مین عاشق ہون مین عاشق ہون مین یار تمھارا عاشق ہون" اور جب تم اپنے عشق کے ہاتھون بالکل ہی بے قابو ہو جاؤ اور یہ سمجھ لو کہ اب بغیر وصل یار کے زندگی محال ہے تو اسی عمل کو اپنے محبوب کے سامنے اس طرح پڑھو کہ وہ اس کو بخوبی سن سکے بلکہ اگر بار بار سنے تو زیادہ اچھا ہے۔

مین نے ترکیب استعمال کو بار بار پڑھا تاکہ خوب اچھی طرح سمجھ جاؤن اور جب خوب سمجھ گیا تو اس کو عملی صورت مین لانے کے لیے اہتمام شروع کر دیے۔ غروب آفتاب مین ابھی بہت دیر تھی لیکن مین نے اس دیر کو غسل وغیرہ کے اہتمام مین کسی طرح کاٹ دیا اور آخر کار حسب ہدایت غروب آفتاب سے کچھ قبل نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن کر عطر سے ہو کر اور کنگھی چوٹی سے فارغ ہو کر دل مین یہ طے کر کے کہ محبوب کے پاس جا رہے ہین۔ گھر سے اس طرح نکلے کہ

کوچۂ یار میں اس ٹھاٹھ سے جاتا ہوں میں   شور ہر سمت اٹھا مار چلا مار چلا

گو اتفاق سے واقع ہوا ہے جو راہ ہے پر جہاں سے چار سڑکیں مختلف مقامات کو جاتی ہیں ایک بوچڑ خانہ کو دوسری جیل کو تیسری دریا کے کنارے اور چوتھی سول لائنس کو ہم نے سوچا کہ اگر بوچڑ خانہ کی طرف گئے تو کسی قصائی زادی سے عشق ہونا لازمی ہے اور اگر جیل کی طرف گئے تو معشوق جرائم پیشہ ملے گا دریا کے کنارے زیادہ سے زیادہ دھوبی یا ملاح کے خاندان سے عشق کا رشتہ جوڑنا پڑے گا لہذا سب سے بہتر یہی ہے کہ ٹھنڈی سڑک سے ہوتے ہوئے سول لائنس کی طرف چلا جائیں۔ بہت ممکن ہے کہ قسمت میں کوئی غریب بت طناز لکھا ہو لہذا بسم اللہ کہہ کر اسی طرف کو چل کھڑے ہوئے راستے میں قدم قدم پر راہ گیر ملتے تھے اور ہم ہر ایک کو اس لیے دیکھ لیتے تھے کہ ممکن ہے ان ہی میں کوئی ہمارا مطلوب ہو لیکن دل میں پسندیدگی کا جذبہ پیدا نہ ہوتا تھا آخر چلتے چلتے جب ہم ٹھنڈی سڑک سے سول لائنس کی طرف مڑنے ہی والے تھے کہ دور سے آسمانی رنگ کی ریشمی ساری ہوا میں لہراتی ہوئی نظر آئی اور اس ساری میں لپٹی ہوئی خاتون ہماری ہی طرف آتی ہوئی دکھائی دی میں سمجھا کہ شاید کنواں خود پیاسے کے پاس آ رہا ہے ایک دم سے چلتے چلتے ٹھہر گیا وہ خاتون ایک خوبصورت کشتی کی طرح اپنے بادبان اڑاتی ہوئی مجھ سے قریب تر ہوتی گئی یہاں تک اب میں نے اسکی صورت کو دیکھ کر یہ غور کرنا شروع کیا کہ میں نے اس کو کہیں دیکھا ضرور ہے۔ صورت پہچانی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی لیکن دماغ پر لاکھ لاکھ زور دینے کے بعد بھی مجھکو یاد نہ آیا کہ میں نے اس کو کہاں دیکھا ہے یہاں تک کہ وہ میرے نزدیک سے گذری اور مجھکو سلام بھی کیا سلام کا جواب تو خیر میں نے غیر ارادی طور پر دے دیا لیکن اب مجھکو اور بھی یقین ہو گیا کہ یہ صورت دیکھی بھالی ہے۔ میرا دماغ اسی غور و فکر میں تھا۔ نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں اور دل اسی طرف کھنچا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں اس کے ایک ایک انداز کو اس طرح دیکھ رہا تھا گویا وہ کوئی ایسی چیز ہے جس کو اب تک میں نے نہیں دیکھا اس کی چال میں کافی بانکیاں تھیں وہ کبھی مجھ کو ایک مست طاؤس نظر آتی تھی اور کبھی حسین ہرنی وہ اپنی ساری کو ہوا کی تیزی سے اڑنے نہ دینے کی کوشش میں کبھی تو کامیاب ہو جاتی اور کبھی ناکام ہو کر عجیب منظر پیش کرتی تھی۔ ہرن کھری کا سفید جوتا اس کے نازک جسم کو اس طرح اٹھائے ہوئے تھا کہ وہ سڑک پر اس رنگین حباب کی طرح تیرتی نظر آتی تھی جو موجوں کے زور میں بہا جا رہا ہو۔ میں تھوڑی دیر تک اس دلکش منظر کو دیکھتا رہا اور پھر غیر ارادی طور پر اس کے پیچھے ہو لیا۔ تمام راستے میں اسی کو دیکھتا رہا لیکن جب وہ ایک کوٹھی کے احاطے میں تار پھاند کر داخل ہو گئی تو مجھ کو بھی یاد آیا کہ میں اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا اب وقت زیادہ آ چکا تھا لہذا میں بھی گھر آ گیا اور جب بستر پر لیٹا تو میرے دماغ میں سوائے اس سوال کے کوئی بات ہی نہ تھی کہ میرا محبوب کون تھا؟ دل نے کہا وہی خاتون لیکن میں نے کہا استغفر اللہ میرا اسکا کونسا جوڑ وہ ٹانگ برابر کی چھوکری اور میں پنشن لینے کے قریب لیکن اس کے علاوہ میرے دل و دماغ میں کسی کا خیال ہی نہ تھا۔ میں اسی غور و فکر میں بستر پر پڑا ہوا کروٹیں بدل رہا تھا کہ طبیعت مالش کرنے لگی اور باوجود الائچی اور پان وغیرہ کھانے کے ایسی زبردست قے ہوئی

کہ پیٹ کی ایک ایک آنت کھینچ کر رہ گئی مین سمجھا کہ ٹکی کھا گیا ہون لیکن یاد آیا کہ کھانا بھی تو نہین کھایا ہے۔ پھر سوچا کہ کالرا ہوا ہو گا مگر پیشاب کیا تو خوب کھل کر ہو گیا۔ پھر ہم کو خود بھی یاد آگیا کہ لاحول ولاقوۃ نہ ٹکی کھائی ہے نہ کالرا ہوا ہے یہ تو سب علامتین عشق کے مادے کے ہیجان مین آنے کی ہین گولیون کے تیر بہدف اور زود اثر ہونے پر اعتقاد سا ہو گیا اور ہم قے آجانے کے بعد والی خستگی سے نڈھال ہو کر سو گئے صبح کو طبیعت صاف تھی مگر کمزوری بدستور محسوس ہو رہی تھی جس کی وجہ ظاہر تھی کہ رات کو ایک تو کھانا نہین کھایا اس پر قے ہو گئی حالانکہ اس وقت بھی کھانا دیکھ کر متلی آ رہی تھی لیکن زبردستی ایک آدھ لقمہ کھا کر آنے والی شام کے انتظار مین بیٹھ گئے اور آفتاب کی رفتار کا اندازہ کرتے رہے کبھی غسل کا پانی ٹب مین بھرتے تھے اور کبھی کپڑے نکال کر رکھتے تھے کبھی عطر کی شیشی اٹھا کر آئینے کے سامنے رکھ دیتے تھے اور کبھی تیل کی بوتل کے قریب تھوڑا سا پانی اسی طرح خدا خدا کر کے پہاڑ سا دن کاٹا اور شام کو اسی طرح گھر سے گولی کھا کر نکلے اور ٹھنڈی سڑک پہنچے آج پھر وہ بیگم صاحبہ اسی انداز مین ملین ان کی غارت گری مین سوائے اسکے کوئی فرق نہ تھا کہ بجائے آسمانی کے کاسنی رنگ کی ساری مین تھین مین نے لاکھ لاکھ ان کی طرف سے نظرین ہٹانے کی کوشش کی لیکن جب سامنے سے گذرتے ہوئے انھون نے ادب سے تسلیم کی تو مجھ کو بھی آنکھین چار کر کے جواب دینا پڑا اور اس کے بعد مین پھر اسی غور و فکر مین محو ہو گیا کہ یہ ہین کون اور مین نے ان کو یا انھون نے مجھ کو کہان دیکھا ہے مگر کچھ سمجھ مین نہ آیا ہم اسی غور و فکر مین آج پھر اُن ہی کے ساتھ ہو لیے۔ ع۔

جس سے کچھ جان نہ پہچان بڑی مشکل ہی

اور کل کی طرح آج بھی سڑک کے ایک سرے پر وہ اور ایک سرے پر ہم چلتے رہے یہان تک کہ وہ تار پھاند کر کوٹھی کے احاطے مین داخل ہو گئین اور ہم غریب خانے پر واپس آ گئے۔ آج بھی بھوک نہ تھی بلکہ طبیعت مین گرانی محسوس ہو رہی تھی لیکن مین اس طرف سے بے فکر یہ طے کر رہا تھا کہ کیا واقعی یہی صاحبزادی میری محبوبہ ہین دل کو یقین نہ آتا تھا لیکن واقعات یقین دلا رہے تھے آخر کار مین نے بھی کہا کہ اگر مشیت ایزدی یہی ہے تو کیا چارہ؟ ظاہر ہے کہ عشق کا دیوتا اندھا ہے وہ کچھ نہین دیکھتا کہ کس کا دامن کس کے ہاتھ مین دے رہا ہے نہ اس کو سارڈا بل کا خیال ہوتا ہے نہ دنیا کے کسی بل کا وہ تو بس آنکھ بند کر کے تیر چلا دیتا ہے اب اس کی بلا سے جس کے چاہے لگے۔ آج پھر طبیعت مالش کرنے لگی اور بجائے ایک کے دو مرتبہ قے ہوئی۔ بلکہ تھوڑی دیر کے بعد دست بھی آیا لیکن مجھ کو کوئی تشویش نہ تھی بلکہ مین عشق کے مادے کے ہیجان مین آنے سے خوش تھا تیسرے دن بھی سب کچھ وہی ہوا جو پہلے اور دوسرے دن ہوا تھا فرق صرف اس قدر تھا کہ اول تو مین نے اس خاتون کو بجائے صاحبزادی کے براہ راست اپنی محبوبہ سمجھ کر دیکھا اور ان کے سلام کا جواب بھی [illegible] کر دیا۔ دوسرے مجھ کو قے بھی دو مرتبہ ہوئی اور پاخانے بھی دو مرتبہ گیا۔ اب میرا روز کا یہ معمول ہو گیا کہ شام کو [illegible] کھا کر ٹھنڈی سڑک جانا وہان سے اپنی محبوبہ کے ہمراہ سڑک کو درمیان چھوڑ کر ان ہی کے متوازی چل کر انکو کوٹھی کے

احاطے کے تار ون تک پہنچا تا وہان سے گھر لوٹ کر آتا دو ایک مرتبہ قے کرنا دو ایک مرتبہ پاخانے جانا اور بے حد نڈھال ہو کر سو رہنا۔ لیکن روز بروز مین اپنے مین ایک کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ غذا تقریباً بالکل چھوٹ گئی تھی رنگ زرد ہو کر رہ گیا تھا ہاتھ پیرون مین ارتعاش پیدا ہو گیا تھا، دوست احباب مریض بتاتے تھے لیکن مین جانتا تھا کہ عشق کا مادہ ہیجان پر ہے اور مین عاشق بن رہا ہون اس لیے مجھ کو کوئی فکر نہ تھی۔ میری محبوبہ میرے دل و دماغ بلکہ تمام جسم مین سما چکی تھی۔ اور مجھ کو اب بغیر اس کے زندگی دشوار نظر آتی تھی۔ بارہا ارادہ کیا کہ اب اس کو مطیع کرنے والا عمل پڑھون لیکن دل نے کہا اب ایسی بھی کیا جلدی ذرا مادے کو اور ہیجان مین آنے دو لیکن آٹھوین دن تو میرا برا حال تھا۔ اول تو کمزوری کی وجہ سے مجھ کو امید نہ تھی کہ کل پھر اُٹھ سکون گا۔ دوسرے اب صبر کی تاب نہ تھی بمشکل تمام ضبط کیا اور طے کر لیا کہ کل عمل ضرور پڑھ کر اپنی قسمت کا فیصلہ کر لون گا ـــــ

مین نے عاشق حسین خان کے عشق کی داستان سنا کر کہا نوین دن جو کچھ ہوا وہ مین پہلے ہی عرض کر چکا ہون، اب بتایئے کہ ان گولیون کو کس طرح جھوٹا کہا جا سکتا ہے ؟ سب کے سب اپنی اپنی جگہ پر نقش حیرت بنے بیٹھے تھے قصے کے سچ ہونے کے لیے تحریری ثبوت موجود تھا اور گولیون کے تیر بہدف ہونے کا ثبوت یہ قصہ تھا لیکن ناصر بھلا کب ماننے والے تھے تھوڑی دیر تک "انگشت حیرت در دہان نیمے درون نیمے برون" کے بعد فرمایا اگر کوئی گولی بچی ہو تو مجھکو دو انگلستان مین اس کے اجزائے ترکیبی کو علحدہ علحدہ کر کے مشتہر صاحب کو بڑے گھر کی سیر کرا دونگا مذاق نہین ہے اس قسم کی دوائین بنا لین بدمعاش کہین کے یہ لوگ ڈاکو ہین ڈاکو ؟

مین نے کہا اس مین بڑے گھر کی سیر کرانے کی کونسی بات ہے کیا صرف اس لیے کہ ایک ہندوستانی نے ایسی چیز تیار کر لی جو یورپ مین ہونا چاہیے تھی ؟

ناصر نے قابلیت کے ساتھ ہم کو سبق پڑھانے کے انداز مین کہا "بھائی تم لوگ طب نہین جانتے تم کو کیا بتاؤن تم سمجھ ہی نہین سکتے اصل قصہ یہ ہے کہ ان گولیون مین زہریلی چیزین بھی ہین جو عشق مجازی تو خیر مجازی ہے، انسان کو خدا سے بھی واصل کر سکتی ہین"۔

احمد نے طالب علمانہ انداز سے کہا "لیکن زہر کا فعل یہ تو نہین ہے کہ عشق پیدا کر دے اور اگر زہر سے عشق ہو گیا تو خواہ وہ زہر ہو یا کچھ بہر حال حکیم مشکل کشا خان کا مقصد پورا ہو گیا"۔

ناصر نے اُس کو بے وقوف سمجھ کر جواب دیا "آپ ہین صاحب اُلٹے، عزیز من ان گولیون مین دماغ کو ماؤف کرنے معدے کو خراب کرنے جگر کو تباہ کرنے اور دل کو کمزور کر دینے کے ایسے ایسے زہر ہین جو اچھے خاصے جوان کو جان سے مار کر چھوڑین۔ غریب عاشق حسین خان کا دماغ اس حد تک بیکار کیا کہ وہ اپنے دوست کی لڑکی کو بھی ... افسوس یہ حکیم مشکل کشا خان نے طبابت کی ہے یا موت کے فرشتے کے فرائض انجام دیے ہین"۔

احسان کی شامت آئی" تو ان زہریدون سے دماغ کے خراب ہونے کے بعد سہی مگر عشق ہی کیون ہُوا، اور کچھ ہو جاتا"

ناصر نے "اونہ" کہہ کر اس کی طرف سے رخ بدل لیا اور مجھ سے کہا "حضرت آپ مجھکو وہ گولی دیجیے ضرور پھر دیکھیے تماشا، حرام زادے، بے ایمان، دغاباز، مکار،"

اب گویا مجھ کو اس مقدمے کی تفتیش بھی کرنا تھی اور عشق کی گولی بھی حاصل کر کے ناصر کو پہنچانا تھی لیکن ناصر کے یہان سے اُٹھ کر جب شیطانی لشکر کچھ دور نکل گیا تو سب نے ایک زبردست قہقہہ لگایا کہ خوب گدھا بنایا مگر طے یہی پایا کہ کل ایک بکری کی مینگنی ان لقمان وقت کو دی جائے گی دیکھیے اس مین کون کون سے زہر نکالتے ہین اور کیا قابلیت بگھارتے ہین۔

تیسری صدی ہجری کا ملحدِ اعظم

ابن الراوندی

نام و نسب ابوالحسین احمد بن یحیی بن اسحق الراوندی کی ولادت ۲۰۵ھ اور ۲۱۵ھ ہجری کے درمیان واقع ہوئی، اس کی تاریخ وفات مین شدید اختلاف ہے، اغلب یہ ہے کہ ۲۹۸ھ اور ۳۰۱ھ کی درمیانی مدت مین انتقال کیا۔

ابن الراوندی فی الاصل مرو الروز کا باشندہ تھا لیکن مورخین اس کو قاسان کے ایک قریے کی طرف منسوب کرتے ہین۔ یہ قریہ اصفہان کے نواح مین فارس کے جنوب پر شط العرب کے شمال مین واقع ہے

اس کی ابتدائی نشو ونما اور تعلیم و تربیت کے متعلق کچھ پتہ نہین چلتا۔ مشہور یہ ہے کہ عنفوان شباب مین ترک وطن کرکے بغداد چلا آیا۔ اس زمانے مین بغداد دار السلام اور مدینۃ العجائب کہلاتا تھا۔ جہان تمام عالم اسلامی کے نوادرات جمع تھے۔

ہم ابن الراوندی کی طفولیت اور اس کے ابتدائی نشو و نما سے قطعاً بیخبر ہین۔ اسلیے افسوس کے ساتھ اس کے اس حصۂ زندگی کو ترک کرنا پڑتا ہے۔

الراوندی کے خاندان کے متعلق صرف اسقدر پتہ چلتا ہے کہ وہ یہودی الاصل ہے، اسکے باپ مذہب جو بعد کو مسلمان ہوگیا۔ ابو الحسین الخیاط کی کتاب الانتصار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابن الراوندی کا بھائی اور چچا معتزلہ

ابن الراوندی کے باپ یحیٰی ابن اسحٰق میں شورش و اضطراب کا مادہ تھا جو ابن الراوندی کو وراثت میں ملا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی یہودی نے ابن الراوندی کے بارے میں ایک مسلمان سے کہا تھا کہ یہ تمھاری کتاب (قرآن) کو اسی طرح بگاڑے گا جس طرح اس کے باپ نے توریت کو خراب کیا تھا۔ اس روایت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ الراوندی کے باپ کا مسلمان ہوجانا بھی شاید اسی بنا پر تھا کہ وہ یہودیوں سے بہت الجھا رہتا تھا اور جب آتش انتقام زیادہ بھڑکی تو مسلمان ہوگیا۔

ابن الراوندی کے معتزلہ ہونے سے قبل کے حالات کتابوں میں نظر نہیں آتے۔ لیکن وہ کب معتزلی ہوا اور کس طرح، کس شخص سے اصول اعتزال کا درس لیا، یہ دونوں باتیں بھی نہیں معلوم۔ ہمارے خیال میں ابن الراوندی نے عین عالم شباب میں مذہب اعتزال اختیار کیا اور یہ زمانہ ۱۸ سال سے ۲۵ سال تک ممتد ہوسکتا ہے۔

ابن الراوندی کو معتزلہ کے علم کلام میں مہارت تامہ حاصل ہوگئی تھی اور ان کے اصول کے مطابق اقتباس و اختراع میں وہ یگانۂ روزگار تھا، چنانچہ عالم شباب ہی میں اپنے ہم عصر فضلاء سے سبقت لے گیا علم کلام میں قدرت اور علوم اعتزال میں وسعت نظر کا یہ عالم تھا کہ خود معتزلہ کا ایک جید فاضل ابوالقاسم البلخی الکعبی اپنی کتاب محاسن خراسان میں اس کی شہادت دیتا ہے۔

ابن الراوندی متکلمین میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے معاصرین میں علم کلام اور تحقیق و تدقیق کے باب میں کوئی شخص اس کا ہمسر نہ تھا مشہور رہے کہ اُس کا علم اُس کی عقل سے زیادہ تھا۔

اس کے بعد بلخی لکھتا ہے۔ ابتداءً ابن الراوندی نیک سیرت، پسندیدہ مذہب رکھتا تھا لیکن بعد ازاں بعض اسباب پیش آجانے کے باعث اس نے یہ چولا بدل دیا۔

عبدالرحمٰن العباسی (معاهد التنصیص) میں تحریر کرتا ہے کہ ابن الراوندی متکلمین علمائے معتزلہ میں سے تھا، بعد ازاں ان کی جماعت سے علٰحدہ ہوکر ملحد بن گیا۔

احمد بن یحیٰی المرتضیٰ (المنیۃ والامل) مطبوعہ حیدرآباد ۱۳۱۶ھ ہجری میں لکھتے ہیں ابن الراوندی پہلے معتزلہ کے طبقے میں داخل تھا لیکن جب اس سے کچھ ناشائستہ حرکات سرزد ہوئیں اور اس نے دین داری ترک کرکے الحاد اور زندقہ کا اظہار کیا تو معتزلہ نے اس کو اپنی جماعت سے علٰحدہ کردیا۔ اس کے بعد اس نے اسلام کی مخالفت میں بہت سی کتابیں لکھیں۔

ابوالحسین الخیاط نے الانتصار میں لکھا ہے کہ ابتداءً وہ معتزلہ کے فرقہ نظامیہ سے تعلق رکھتا تھا، لیکن آخر میں اس نے گڑبڑ شروع کردی اور حق کو چھوڑ دیا، اس پر معتزلہ نے اسکو اپنی جماعت سے نکال باہر کیا

. . . .

متقدمین علماء کے مذکورۂ بالا بیانات سے ابن الراوندی کے حالات اور مذہب پر روشنی پڑتی ہے،

ابن الراوندی کی وسعت علم سے انکار نہین کیا جا سکتا ہے اس کو جامع العلوم یا دائرۃ المعارف کہنا زیادہ موزون ہے کیونکہ اس کو ہر علم مین کافی دسترس حاصل تھی۔ گذشتہ بیانات سے یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ ابن الراوندی کا علم نہایت وسیع تھا۔ چنانچہ خود ان لوگون نے بھی اس کا اقرار کیا ہے جو رائے اور عقائد مین اس کی مخالف ہین۔ ابوالحسین الخیاط کی تصنیف کتاب الانتصار پڑھنے کے بعد جو انھون نے ابن الراوندی کی کتاب فضیحۃ المعتزلہ کے جواب مین لکھی ہے، اس کی وسعت علم و ذکا کا پتہ چلتا ہے فضیحۃ المعتزلہ مین ابن الراوندی نے روافض کی حمایت کرتے ہوے معتزلہ کی تردید کی ہے۔ ہمارے پاس ابن الراوندی کی کوئی ایک تصنیف بھی موجود نہین۔ حالانکہ بقول ابن خلکان اس کی تصنیفات کی تعداد ۱۱۴ تک پہنچتی ہے اس کے بعض اقوال سے جو رد کی غرض سے الانتصار مین نقل کیے گئے ہین اسکی جودت اطلاع، قوت معارضہ، اور خوبی استدلال پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

گو ابن الراوندی جوانی ہی مین ملحد اور دہریہ ہو گیا تھا۔ لیکن قرآن کے اعجاز اور اس کی ساحرانہ تاثیر بہت سے مسلمانون سے زیادہ سمجھتا تھا۔ معتزلی عقائد ترک کر دینے کے بعد ابن الراوندی معتزلہ کا دشمن ہو گیا تھا اور چونکہ یہ مذہب اعتزال کے نظریون اور اصول سے خوب آگاہ تھا۔ نیز علوم کلامیہ کو خود معتزلہ سے بھی زیادہ جانتا تھا اس لیے خوب خوب مقابلے رہے۔ بلخی کہتا ہے کہ اس کے معاصرین مین سے کوئی بھی علم کلام مین اس سے زیادہ دسترس نہ رکھتا تھا نہ کسی کو دقائق علم کلام کی اس قدر معرفت حاصل ہو سکتی تھی، ابن خلکان مین لکھا ہے ـــ علم کلام مین اس نے ایک مقالہ لکھا ہے۔ یہ اپنے عصر کے فضلاء مین شمار کیا جاتا تھا۔ متکلمین کے ساتھ اس نے بہت سے مناظرے کیے ہین۔ اس کے انوکھے خیالات کو متکلمین نے اپنی کتابون مین نقل کیا ہے۔

ابن القدیم نے "الفہرست" مین یہ قصہ لکھا ہے ـــ، ابوالحسن الراوندی بیان کرتا تھا کہ مین ایک بوڑھے کے پاس سے گذرا، یہ شخص ہاتھ مین مصحف لیے بیٹھا تھا اور پڑھ رہا تھا وَلِلّٰہِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مین نے کہا آسمان و زمین کے بنانے سے کیا مدعا ہے، کہنے لگا یہی بارش مراد ہے، مین نے کہا آپ ہی جیسے حضرات کے ہاتھون مذہب تباہ ہوتا ہے، بندۂ خدا یہ میراث السموات ہے، بوڑھا کہنے لگا خدایا مجھے معاف کر، مین تو چالیس سال سے یہی پڑھا کرتا تھا۔ اور یہی میرے مصحف مین لکھا ہوا ہے۔

ایک طرف تو یہ دہریہ ایک مومن کی قرأت کی تصحیح کر رہا تھا۔ اور دوسری طرف قرآن مجید کی مخالفت اور انبیاء و کتب سابقہ کی تردید مین کتاب لکھ رہا تھا۔ معاہد التنصیص مین لکھا ہے ـــ ابن الراوندی اور ابوعلی الجبائی ایک دن بغداد کے پل پر آئے ابن الراوندی نے کہا ـــ: ابوعلی تم نے کچھ سنا ہے مین نے قرآن کے مقابلہ اور اس کی

تردید میں کیا کچھ لکھا ہے! ابوعلی نے کہا میں تمہارے اور تمہارے ہم عقیدہ دہریوں کے شرمناک علوم سے آگاہ ہوں لیکن میں خود تم ہی سے انصاف کی درخواست کرتا ہوں کیا تمہارے جواب میں شیرینی، خوشگواری اور ہمواری موجود ہے، کیا اس کی ترتیب قرآن کے مثل ہے اور کیا تم کہہ سکتے ہو کہ وہ کلام اللہ کی طرح شیریں ہے" ابن الراوندی نے کہا بخدا ایسا نہیں ہے۔

ابوعلی :- بس فیصلہ ہو گیا، اب جو جی چاہے کر۔

ابن الراوندی ان تمام علوم کا مخزن تھا جو اس کے زمانے میں مروج تھے وہ اس عہد کے فلسفے اور مذاہب کا حقیقی آگاہ تھا۔ یہودیوں کی جانب سے مسلمانوں کے رد میں ایک کتاب لکھکر خود ہی اس کی تردید کرنی چاہی لیکن بعض وجوہ سے ارادہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ اہل التوحید کے خلاف رافضیوں کی طرف سے ۳۰ اشرفیوں کے عوض ایک تصنیف کی لیکن خود ہی اہل توحید کی تعریف و توصیف میں دوسری کتاب لکھ کر اس پہلی تصنیف کی تردید کر دی، مذہب اعتزال میں اس کے بلیغ علم کا جو حال تھا، وہ کسی قدر ہم بیان کر چکے ہیں لیکن اپنی تصنیفات میں اس نے اس عقیدے کی بھی خوب خوب دھجیاں اڑائی ہیں اور معتزلہ کے اسالیب حجت و براہین ہی سے ان کی تردید بھی کی ہے۔

اس نے تمام انبیاء کی تردید میں کتابیں لکھیں اور قرآن کے مقابلہ میں بھی ایک کتاب تصنیف کی، رافضیوں کی طرف سے سنیوں کے خلاف، اور سنیوں کی طرف سے رافضیوں کے خلاف تصنیفات کیں، اور پھر معتزلہ کی طرف سے تمام مذاہب کی مخالفت میں قلم اٹھایا۔ وہ خود اپنی کتابوں کے خلاف بھی لکھا کرتا تھا، چنانچہ جس مقصد کے ماتحت اس نے کوئی کتاب لکھی فوراً ہی ان مطالب کی تردید بھی لوگوں تک پہنچا دیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مدعا تک نہایت سہولت سے پہنچ جاتا تھا اور اس لیے اس کو خود اپنی تردید بھی دشوار نہیں معلوم دیتی تھی

ابوالعباس الطبری لکھتا ہے" ابن الراوندی کسی مذہب پر نہ جما نہ کسی حال پر اسے قرار آیا مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس نے سامرا کے یہودیوں سے ۴۰۰ روپیے لے کر ان کی جانب سے مسلمانوں کی تردید میں البصیرہ لکھی لیکن مال پر قبضہ کر لینے کے بعد اس کی تردید کا ارادہ کیا۔ جب انھوں نے ۱۰۰ درہم دیئے تو اس ارادہ سے باز رہا (معاہد التنصیص)

(اس کی جو کتاب شایع ہوئی دینی و فلسفی حلقوں میں اس کا آوازہ جا پہنچا، اور وہ شایع ہوتی اور ادھر بعض مصنفین اس کی تردید میں قلم اٹھا لیتے اور بعض اس کے مدح سرا بن جاتے، وجہ یہ تھی کہ ابن الراوندی کی مذہبی زندگی عبارت تھی صرف اس سے کہ وہ مختلف ملتوں اور فرقوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ آج ایک مذہب کی تعریف میں رطب اللسان ہے تو کل اسی کی تحقیر کر رہا ہے۔ اس طور پر وہ مختلف مذہب کے پیروؤں کو باہم لڑا دیتا، وہ لوگ اپنی اس جنگ و جدل میں اس کو فراموش کر دیتے۔ اور خود گتھ جاتے۔ کچھ عرصہ بھی نہ گزرنے پاتا کہ پچھلی تحریر کی مخالفت پر کمر بستہ نظر آتا، کل جس کی ہجو کی تھی اس کی تعریف ہو رہی ہے، اور جس کی پہلے تعریف کی گئی تھی، وہ اب دنیا سے بدتر ہے، ان مذاہب کے پیرو

باہم لڑتے اور دونوں ابن الراوندی کے دلائل و حجج سے اپنی تائید اور دوسرے کی تردید کرتے

فہرست ابن ندیم میں لکھا ہے ابن الراوندی کی ناپاک و ملعون تالیفات میں ایک کتاب ہے جس میں قرآن مجید کی عبارت پر اعتراض کیے گئے ہیں۔ خیاط ابو علی الجبائی سہل بن نوبخت اور خود ابن الراوندی نے اس کی رد میں کتابیں لکھی ہیں۔

ان واقعات سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ ابن الراوندی اپنے وقت کا یکتائے روزگار عالم تھا اور ملاحدہ اور خوارج کا استاد اعظم کہنا زیبا ہے۔

ایام شباب میں ابن الراوندی ملحدوں کے ساتھ ساتھ رہتا، جب اس پر خفگی کا اظہار کیا گیا تو اس نے کہا میں ان کے خیالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک اس کا یہ جواب ایک عامی کو تو خاموش کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہ اس مقولہ سے ملتا جلتا ہے کہ جادو سیکھو لو مگر اس پر عمل نہ کرنا لیکن ہر شخص مطمئن نہیں ہو سکتا، چنانچہ ابن الراوندی کے میل جول اور اس قسم کے جوابات سے معتزلہ اور دین داروں کے دل میں شبہات پیدا ہونے لگے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے ہم خیال اور لوگ بھی تھے جو اکٹھے ہو کر اپنی افکار و معلومات پر بحث کرتے تھے

. . . .

قدیم بیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن الراوندی۔ ابو عیسیٰ الوراق اور ابو حفص الحداد وغیرہ ملاحدہ کا شاگرد اور دوست تھا، یہ لوگ اس زمانے کے مشہور ملحد تھے۔ معتزلہ اور اہل سنت کے خوف سے اپنے کو رافضی ظاہر کرتے تھے۔

ابن الخیاط نے الانتصار صفحہ (۹) میں لکھا ہے تیری نکارہ اور پوچ کتاب کی تردید سراسر دوسری ہے جب ہم تیرے اساتذہ ابی حفص الحداد اور ابو عیسیٰ الوراق کی تردید کر چکے تو ان کے متبعین کی تردید کیا مشکل ہے۔

ابن الراوندی نے ملحد ہو کر بیسیوں کتابیں لکھیں لیکن ابن خلکان کے بیان کے مطابق ۱۱۴ کتابوں میں سوائے چند متفرق مضمون اور بیانات کے کچھ باقی نہیں۔ اس نے رد رافض کے واسطے ایک کتاب فضیحۃ المعتزلہ لکھی جو ادیب کبیر جاحظ کی کتاب فضیلۃ المعتزلہ کا رد تھا۔ جاحظ بھی معتزلہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

اپنی تصنیف کے ذریعے سے اپنے اعتزال کی دعوت دی تھی، ابن الراوندی کی اس کتاب کے متفرق اور پراگندہ ٹکڑے ابوالحسین الخیاط کی تصنیف الانتصار میں نقل کیے گئے ہیں جو فضیحۃ المعتزلہ کے رد میں لکھی گئی تھی۔

مضمون کے اختتام میں ہم اس کے کچھ ایسے اقوال نقل کرتے ہیں جن سے اس عجیب وغریب انسان کا حال معلوم ہوسکتا ہے۔ بلخی کا بیان ہے کہ ابن الراوندی کی ملعون ونا پاک تالیفات میں کتاب التاج ہے جس میں عالم کی قدامت کو ثابت کیا ہے اور دوسری کتاب الزمردہ ہے اس میں رسالت کا بطلان کیا ہے کتاب الفرند میں رسول اللہ صلعم پر اعتراض کیے گئے ہیں، اور کتاب اللولوہ میں تناہی حرکات سے بحث کی گئی۔

کتاب الزمردہ میں لکھتا ہے کہ میں نے اس کتاب کا نام زمردہ اس لیے رکھا ہے کہ جس طرح زمرد کو دیکھ کر سانپ اندھا ہو جاتا ہے اسی طرح میرے مخالفین بھی اس کتاب کو دیکھ کر اندھے ہو جائیں گے۔ اس کتاب میں شریعت مطہرہ کا ابطال ہے اور نبوت پر جرح قدح کی گئی ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ اکثم بن صیفی (عہد جاہلیت کے مشہور حکیم) کے کلام میں انا اعطیناک سے بہتر کلام نظر آتا ہے۔ . . . دوسری جگہ کہتا ہے عمار بن یاسر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ تجھ کو باغی جماعت قتل کرے گی۔ اس قسم کی باتیں تمام منجمین بتایا کرتے ہیں۔ وہ کہا کرتا تھا انبیا انسانوں کو یونہی شعبدوں سے دھوکے دیا کرتے ہیں۔"

کتاب الدامغ میں کہتا ہے۔ خدا کے پاس قتل وغارت کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، جو ہمیشہ ایک کینہ پرور اور غضبناک دشمن کیا کرتا ہے، پھر کتاب اور رسول بھیجنے کی کیا حاجت تھی؟

کہتا ہے ۔۔۔ خدا کا زعم ہے کہ وہ عالم الغیب ہے چنانچہ قرآن میں کہتا ہے (وما تسقط من ورقۃ الا یعلمہا) یعنی خدا اس پتے کو بھی جانتا ہے جو درخت سے ٹوٹ کر گرتا ہے ۔۔۔ دوسری جگہ کہتا ہے (وما جعلنا القبلۃ التی کنت علیہا الا لنعلم) ۔ جنت کی تعریف میں کہتا ہے ۔۔۔ وفیہا انہار من لبن لم یتغیر طعمہ) حالانکہ دودھ کی اشتہا صرف بھوکے کو ہو سکتی ہے۔ شہد کا ذکر ہے زنجبیل کا ہے حالانکہ یہ کچھ لذیذ شربت نہیں ہیں سندس بچھانے کے کام آتا ہے اس کو پہنتے نہیں ہیں یہی حال استبرق کا ہے یہ موٹا کپڑا ہوتا ہے۔ جنت میں رہ کر ایسے موٹے موٹے کپڑے پہننا اور دودھ اور سونٹھ کا شربت پینا گویا کردوں اور نبطیوں کے مراسم عروسی ادا کر دینا ہے جن میں دولھا کو اسی قسم کا لباس پہنایا جاتا ہے اور یہی چیزیں پینے کو ملتی ہیں

یہ تو وہ شخص ہے جس نے اپنی کتاب التاج میں اجسام کے حدوث کو غلط قرار دیا ہے، اس کا خیال ہے کہ اثر موثر پر دلالت نہیں کرتا، دنیا اور جو کچھ یہاں نظر آتا ہے اور چاند تارے وغیرہ قدیم ہیں، ان کا بنانیوالا

اس کی ایک تالیف التعدیل والتجویر ہے (صاحب الفہرست نے اس کا نام عبث الحکمۃ لکھا ہے)

اس مین وہ لکھتا ہے کہ جو اپنے غلامون کو بیمار ڈالے وہ نہ تو اپنے اس برتاؤ مین دانا اور حکیم کہا جا سکتا ہے اور نہ اس کا محافظ اور ان پر مہربان قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح جو فقر و فاقہ مین مبتلا کرتا ہو جو ان کو اطاعت کا حکم دے جن کے متعلق وہ خوب جانتا ہے کہ مطیع نہین ہون گے اور پھر اپنے منکرون اور نافرمانون کو ہمیشہ کیلیے آگ مین ڈال دے وہ بھی حکیم نہین کتاب الزمردہ مین انبیا کے معجزات کا ذکر کر کے اُن پر جرح قدح کی ہے۔ اور یہ کہ قرآن کسی حکیم کا کلام نہین اسکی ایک کتاب الامامۃ کے نام سے مشہور رہے۔ اس مین مہاجرین و انصار پر زبان طعن دراز کی ہے ابن الراوندی نے چند قطعہ بھی کہے ہین۔ ان سے اس کی عجیب و غریب سائکالوجی معلوم ہوتی ہے لکھتا ہے۔

دنیا کی مصیبتین اور تکالیف تو اس قدر زیادہ ہین کہ نہ کاٹے کٹتی ہین نہ باٹے بٹتی ہین، خوشی اور راحت سب تو عید کی طرح کبھی کبھی جھلک دکھا دیتی ہے، جلیل القدر بادشاہ جو دوسرون کو غلام بناتے ہین خود اپنے احمق نوکرون کے غلام نظر آتے ہین۔

کہتا ہے

کیا یہ تعجب انگیز امر نہین ہے کہ ایک شخص جس کا بحث و مباحثہ سلیم اور گفتگو دقیق ہوتی ہے مرتے وقت صرف اس قدر جاننے پاتا ہے کہ اس نے کچھ نہین جانا۔

ابو العلاء نے رسالہ الغفران مین اس کے دو شعر نقل کیے ہین جس مین اس نے خدا کی شان مین زبان درازی کی ہے،

آخر مین ہم یہ ضرور کہین گے کہ اس وقت کی اسلامی حکومت کس قدر روادار تھی کہ ابن الراوندی جیسے گستاخ کو مذکورہ عقائد کی اشاعت کی اجازت تھی لوگ اس کی تردید کرتے تھے اور اس کے افکار کی دھجیان اڑاتے تھے لیکن فضا مین سکون رہتا تھا حق یہ ہے کہ مذہبیات قدیمہ کی تاریخ ابن الراوندی سے زیادہ بے باک اور جری کیرکٹر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

سلیم خیاط ترجمہ عرشی

نیا شوالہ

(۱)

پدما ندی کے کنارے شیو جی کا ایک خوبصورت مندر تھا، پیپل کا بڑا سایہ دار درخت مندر کے مذہبی وقار مین اور اضافہ کر رہا تھا، تلسی کا مقدس پودہ ایک بلند مقام پر اُگا تھا، گیندا اور رجنی گندھا کے پھول مندر کے احاطے مین کھلے ہوئے تھے، ایک بلند بانس پر جھنڈا لہرا رہا تھا جس پر ہنومان جی کی تصویر تھی۔ گھنٹے اور ناقوس کی آواز دور سے مندر کا پتہ دیتی تھی، پدما ندی مندر کے چرن مین عقیدت مندانہ شان سے بہ رہی تھی، شیو جی کا مندر قرب و نواح کا مشہور مندر تھا، یہان دور دور سے لوگ نذر عقیدت چڑھانے آتے تھے، مندر کا نوجوان جوگی متوفی گرو کا بڑا چیلا تھا گرو جی اسے بہت عزیز رکھتے اور اس کی قدر و منزلت فرماتے تھے۔ نوجوان جوگی بڑا گیانی تھا، وہ دن رات تپسیا کرتا رہتا، ہر کس و ناکس سے اس کا برتاؤ نہایت ہی محبت آمیز ہوتا تھا، رات کو پیپل کے نیچے کتھا ہوتی تھی، دید پران کا درس دیا جاتا۔ مہا بھارت، رامائن کی کہانی سُنائی جاتی۔ گانون کے لوگ کتھا سُننے کے لیے جمع ہوجاتے۔ صبح کو بھجن گائے جاتے تھے اور اس قسم کے مذہبی مشاغل سے مندر کی دنیا آباد رہتی تھی گاؤن کے زن و مرد صبح کو پدما ندی مین اشنان کرکے مندر مین جل ڈالنے اور پھول چڑھانے آتے اور جوگی سے آشیرباد لے کر چلے جاتے تھے

(۲)

کامنی ترڑکے اشنان اور پوجا کے لیے ندی کنارے آتی تھی، ہری دوب پر چلتے ہوئے وہ ہرنی معلوم ہوتی، اس کی ملاحت اور شگفتگی پر سحر کی تمام رعنائیان قربان تھین۔ مندر مین پوجا کرتے وقت تو وہ خود دیبی نجاتی اور اسے دیکھ کر ہر شخص اپنے دل مین جذبۂ ایمان و عقیدت کو قوی تر پاتا تھا۔ اس کا محو عبادت ہونا خود پرستش تھی ——— نہ معلوم کیون ایک ہفتے سے وہ پوجا کے لیے بہت زیادہ سویرے آنے لگی تھی۔ اس کی وضع مین تبدیلی رونما ہوگئی تھی۔ اس کی پیاری پیشانی پر شکن کی چند لہرین بھی دکھائی دیتی تھین، کامنی کچھ

کھوئی کھوئی معلوم ہوتی تھی۔ مندر کے سایہ مین پہنچتے ہی اس پر وحشت برسنے لگتی جسے وہ بہت سنجیدگی سے چھپانیکی کوشش کرتی، پوجا کے وقت اس کی محویت مین بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا تھا اور کون جانتا ہے کہ اس وقت اس کی، دل ربا آنکھین پُرنم نہ ہو جاتی تھین —— جب مندر کا جوگی اسے اشیرباد دینے آتا تو وہ اپنے چہرے پر سے سارے اثرات کو محو کرنے کی عاجلانہ کوشش کرتی —— مگر ناکام، اس کا چہرہ تمتما اٹھتا، نظرین نیچی ہو جاتین اور وہ بالکل سمٹی سمٹائی نظر آتی تھی۔

دن گذرتے گئے اور کامنی کا معمول وہی رہا، وہ بہترین پھولون کا تحفہ لاتی اس کے گوندھے ہوے ہار اور منتشر پھول سارے چڑھاوون مین بہت زیادہ نمایان ہوتے، وہ دل مین عقیدت، آنکھ مین پیار، نگاہون مین محبت لے کر مندر آتی، اور درد، مایوسی و مجبوری کی تصویر بن کر واپس جاتی۔ اس کی اس سوگوار کیفیت کو مندر کا جوگی بہت دنون تک نظر انداز نہ کر سکا اور ایک دن کامنی سے ازراہ تلطف دریافت کیا —— "بچی تو اس قدر اُداس کیون رہتی ہے؟ پرماتما تیرا بھلا کرے"۔ کامنی اس کا کچھ جواب نہ دے سکی، پھوٹ پڑی اور بہت دیر تک روتی رہی غالباً یہ سب سے زیادہ قیمتی چڑھاوا تھا جو مندر مین چڑھایا گیا۔ جوگی نے اس کی بہت دل دہی کی لیکن اسکا ہر فقرہ کامنی کو اور زیادہ گریان کر دیتا۔ کچھ دیر کی تسلی و تشفی کے بعد جوگی یہ کہہ کر چلا گیا "جا بچی تجھے پرماتما سکھی رکھے!"

اس کی آواز مین رقت تھی اور۔ کامنی کا تو عجب حال تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود آنسو بنکر پگھل جائے گی۔ جب جذبات کا طوفان تھما اور آنسو کا سیل رُکا تو سوگوار کامنی اپنے گھر چلی گئی، مگر کس حال مین!

(۳)

کامنی کے چلے جانے کے بعد جوگی مندر مین جاکر رات کی کتھا کے لیے پُران کا پاٹھ کرنے لگا، مگر آج اس کے مطالعہ مین کوئی چیز حائل ہوئی جا رہی تھی، اس کی یکسوئی تباہ ہو چکی تھی، یہ تو نہین کہا جا سکتا کہ کسی کے آنسوؤنکی یاد نے مقدس کتاب کی تحریر کو سراسر دھو ڈالا تھا، لیکن یہ ضرور ہوا کہ الفاظ دُھندلے پڑ گئے، ایک خاص خیال تھا جو سب پر چھایا جا رہا تھا۔ جب گیانی جوگی منو مہاراج کے اس قول کو پڑھ رہا تھا کہ "عورت کسی حالت مین اعتماد کے لائق نہین عورت ایک سانپ ہے۔ عورت سے دل کا کھیل مت کھیلو"۔ اس کا دل رُک رُک کر دھڑکنے لگا، اور اسکی زبان کی روانی رُک گئی، وہ کچھ سوچنے لگا، آج پہلی بار اُسے منو مہاراج کے زرین قول پر شک پیدا ہوا، ہر چند کہ وہ اس نظریہ کا بالکل مخالف نہ ہو گیا تھا۔ لیکن اس مین تبدیلی پیدا کرنی ضرور چاہتا تھا۔ یہ تھا اس کا پہلا کفر، جو ایمان سے زیادہ قریب تھا۔ ہر عورت اعتماد کے قابل نہین۔ عورت ایک گلاب کا پودا ہے، جن مین پھول بھی ہین ا[illegible] بھی"۔ یہ تھے تبدیل شدہ نظریے کے پہلے دو اجزا، اور تیسرے جز کے متعلق جوگی قطعی رائے قائم کرنے سے مع

وہ اس مقام سے آگے بڑھ گیا لیکن اس کے دماغ مین یہ ٹکڑے چکر لگاتے رہے، اسے مطالعہ بند کر دینا پڑا اور وہ پودون مین پانی ڈالنے چلا گیا، لیکن ہر پھول کو دیکھ کر کسی کا جمال صبیح اس کی نظرون مین پھر جاتا، پودون کی شادابی دیکھ کر اسے کسی کی رعنائی یاد آجاتی اور گھاس پر شبنم کے قطرون کو دیکھتے ہی کسی کے قیمتی آنسوؤن کا خیال اس کے دل مین گداز پیدا کر دیتا، اب جوگی کو بجائے پرماتما کی قدرت کے ہر شے مین کسی ارضی دیوی کی جھلک دکھائی دینے لگی ——— وہ دن بھر کسی کے دل پذیر تخیل مین محو رہا ——— غروب آفتاب سے پہلے کامنی گاگر مین جل لانے ندی کے کنارے جاتے ہوے مندر کے قریب سے گذری، جوگی نے اس زہرۂ ارضی کے حسن ملائک فریب کو دیکھا اور لرز کر رہ گیا ——— ڈوبتے ہوے آفتاب کی مضمحل کرنون مین آنسو کے دو قطرے سر مژگان ستارۂ شام کی طرح چمکے، اور جوگی کے دامن کو مقدس بنا کر لازوال ہو گئے۔ اب جوگی منوجی کے نظریے کے تیسرے ٹکڑے پر بھی اپنی قطعی راے قائم کر چکا تھا ——— دل تو پہلو مین صرف اسلیے دھڑکتا ہے تاکہ اسے کسی عورت کے قدمون پر نچھاور کر دیا جاے، چاہے وہ اسے ٹھکرا دے یا اس کے قریب سے بے نیازانہ گذر جائے ——— یہ تھا نوجوان جوگی کا نوزائیدہ نظریہ ——— رات کو کتھا ہوئی، جوگی نے منو مہاراج کے مذکورہ قول پر سخت نکتہ چینی کی، بہت سے لوگ محو حیرت تھے اور جوگی کی زبان قینچی سی چل رہی تھی گھریلو زندگی کی محبت کا نقشہ کھینچ کر اُس نے راے عامہ کو اپنے خیال کا پیرو بنا لیا تھا، جوگی کے سیلاب دلیل کے سامنے منوجی کی روح بھی ایک تنکے کی طرح لرزان تھی ——— کتھا ختم ہوئی، جوگی اپنی کٹیا مین چلا گیا ———

اس کی زندگی کی یہ سب سے اہم رات تھی، آج اس کے دل کے مندر مین محبت کی دیوی براجمان تھی جسکی پوجا شور ناقوس مین نہین کی جاتی، بلکہ رات کی خاموشیون مین، جس کے حضور بھجن نہین گائے جاتے، بلکہ جس کی عبادت "گریۂ خاموش" سے ہوتی ہے، جس کے آگے چڑھاوون کے عوض آنسوؤن کے ہار ہدیۂ پیش کئے جاتے ہین جس کا ہر بلورین پھول ایک دنیاے محبت کی تصویر ہوتا ہے، نوجوان جوگی کے بیدار دل مین ایک زندہ خلش کروٹین لے رہی تھی، ایک لذت آگین درد ایک بے چین کر دینے والا گداز ——— اُسنے رات بسر کی لیکن دل نواز صبح کی یاد مین

(۵)

——— ابھی سپیدۂ سحر اچھی طرح نمودار نہوا تھا کہ جوگی اٹھ بیٹھا، زہرۂ آسمان اس پر مسکرا رہی تھی، وہ سرتاسر کانپ رہا تھا۔ اس کی ساری تمنائین آنکھون مین کھنچی آرہی تھین وہ تلسی کے مقدس پودے کے پاس کسی محبت ناک ہستی کی جستجو کر رہا تھا، جس نے اس کے نظام زندگی کو درہم و برہم کر دیا تھا، آج وہ اُٹھ کر پہلی بار مندر کا گھنٹہ بجانا بھی بھول گیا، وہ سرتاپا انتظار تھا ——— صبح ہوئی ستارے جھلملا جھلملا کر رخصت ہوے

ہر جگہ آثار حیات پیدا ہونے لگے، پرندوں کے دلکش نغموں نے آمد سحر کا اعلان کر دیا اور ہر جاندار اپنی تمنا لیے ہوئے اُٹھا ——— کامنی بھی جس کی آنکھیں رات کو جاگ کر "سحر بیدار" ہو گئی تھیں پدما ندی میں اشنان کرنے آئی "حسن معصوم" کی تپیّا خیزیوں نے ندی کی موجوں میں بھی زندگی پیدا کر دی اور لرزاں موجیں کامنی کے بلوریں جسم سے ایک بار مس کر جانے کی آرزو لیے ہوئے بڑھیں اور کامیاب ہوئیں۔ اس لمس سے نازک نورانی لہریں پیدا ہوئیں، اور فضا میں ایک دلکش لطیف نغمہ پھیل گیا، کامنی اشنان کر کے مندر کی طرف چلی جیسے کوئی حور آب کوثر سے نہا کر نکلی ہو، اور ندی دیدۂ حیران ہو کر اسے دیکھتی رہی، کامنی آج مندر جانا نہ چاہتی تھی لیکن آہ! راستہ تو اسی طرف ہو کر گیا تھا، مندر کے دروازے پر پہونچکر وہ خود بخود اندر کھنچ گئی وہ نہیں جانتی تھی کہ کیا کر رہی ہے، مندر کے اندر آج وہ اپنے نازک جسم پر کسی کی جذبات سے لبریز نگاہوں کا بار محسوس کر کے شرمائی جا رہی تھی، وہ جلد پوجا میں مشغول ہو گئی اور سراپا ایک اثر خیز دعا بن کر مستجاب ہوئی، جا رہی تھی لیکن وہ پرارتھنا کرنے سے بھی قاصر تھی، آج کامنی خود ایک "گریۂ مسلسل"، ایک "حسین تمنا"، ایک رنگین دعا بن گئی تھی ——— اس جمیل و ساحر منظر کی نوجوان جوگی تاب نہ لا سکا اور بے تابانہ کامنی کی طرف بڑھا، کامنی لجالو کی طرح سمٹ گئی اور چونک اٹھی جوگی بے خود ہو رہا تھا بولا ——— اے میری سرمایۂ حیات! اے محبت ناک لڑکی! اے وہ کہ جس نے میرے دل میں قیامت برپا کر دی ہے، جس نے میری روح تک کو اپنا اسیر بنا ڈالا ہے، مجھے اپنے قدموں پر مٹ جانے دے! میں تیرے حضور اپنے دل کا ادنیٰ ترین ہدیہ لایا ہوں، اسے قبول کر! ——— اے میرے دل کے مندر میں رہنے والی دیوی مجھے اجازت دے کہ تیرے تلووں سے آنکھیں ملوں . . . !

. . . کامنی لجاتی ہوئی بولی ——— "وہ ——— جوگی جی مہاراج آپ میرے دھرم گرو ہیں، میں آپکی داسی ہوں . . . " وہ اور کچھ نہ کہہ سکی لیکن وہ اپنے دلربایانہ انداز اور رفتار نہ تیور سے بہت کچھ کہہ رہی تھی

نوجوان جوگی بے خودانہ انداز سے پھر کامنی سے مخاطب ہوا ——— آہ! دھرم گرو بھی انسان ہی ہوتے ہیں، اور دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن سے وہ بھی مستغنی نہیں ——— ایک بار محبت کا سبق سیکھنے کے بعد گرو اور چیلے میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا، آہ اب تو میں تیری پوجا کرتا ہوں ——— چل! ایک نامعلوم دیار میں چل جہاں ہم ایک نیا شوالہ تعمیر کر سکیں جس کی بنیادیں پریت اور محبت پر ہوں، جہاں میں تیری الفت کی سمرن جپ سکوں اور تیری پوجا اپنی بہترین عبادت سمجھوں . . . " ——— یہ کہہ کر جوگی رونے لگا اور کامنی بھی محبت کے آنسو بہا رہی تھی . . . . یہ تھا ان کا پیمانِ وفا، نازک لیکن بہت زیادہ مستحکم، فرشتوں نے اس منظر پر کیف کو دیکھا اور محو حیرت رہ گئے غالباً انھوں نے بھی خدائے قدوس کے حضور میں کبھی اس سے زیادہ خلوص و محبت کا ہدیہ پیش نہ کیا تھا

اختر اریوی

اقبالنامۂ جہانگیری کا ایک قلمی نسخہ

اور

عہدِ مغلیہ کے ایک درباری اہلِ قلم کے چشمدید بیانات

بسلسلہ مئی ۱۹۳۱ء

صوفیا و درویش اکبر کی طرح جہانگیر کو بھی ہر مذہب و ملت کے فقرا، اور تارک الدنیا درویشوں سے عقیدت تھی معتمد خان نے اس سلسلے مین بعض نہایت دلچسپ واقعات لکھے ہین۔

جلوس کے گیارھوین سال شہر اُجین مین جہانگیر کا گذر ہوا وہان ایک ہندو فقیر کی ریاضت عبادت کا حال سن کر اس کی ملاقات کا اسے شوق ہوا، اور آخرکار جوگی کے مٹھ پر پہنچ گیا،

اس فقیر نے آبادی اور رہ گزر سے دور ایک جنگل مین اپنا مٹھ (صومعہ) بنایا تھا، اور اسی مین ایک گڑھا کھود کر رہا کرتا تھا، اس گڑھے کی لمبائی آدھ گز اور چوڑائی ۲ ½ گز تھی، جوگی پہلے دونوں ہاتھ سوراخ کے اندر دیکر سہارے سے نیچے اترتا تھا، اور اسی طرح اس سے نکلتا بھی تھا، گرمی مین ایک چٹائی اور جاڑے مین ایک ٹاٹ پر گزر کرتا تھا، پہننے کے لیے آدھ گز کا ایک کپڑا رکھتا تھا جس سے بس دبیش کی ستر پوشی ہوسکتی تھی دریا مین دو مرتبہ غسل کرتا، پانی پینے کا تانبے کا ایک برتن تھا، شہر اُجین کے اندر برہمن خاندان کے صرف سات گھرون مین وہ کھانا کھاتا تھا اور وہ بھی اس شرط پر کہ اس گھر مین کوئی جشن اور تقریب نہوئی ہو۔ صبح کے وقت روزانہ وہ آبادی مین آتا تھا، اور ان سات گھرون مین سے تین دروازون پر جاتا اور بھکاری کی طرح کھڑا رہتا، اہل خانہ پانچ لقمے اسکے کھانے کیلیے جو وہ پکاتے تھے یا مہیا رکھتے تھے، اس کے ہاتھ مین دیدیتے اور وہ جوگی بلا چبائے ہوئے اور لذت لیئے ہوئے نگل جاتا تھا، مصنف لکھتا ہے۔

بصحبت مردم چندان راغب نیست علم بیدانت کہ مراد از علم تصوف باشد خوب ورزیدہ فہم تیز دمدرکہ عالی دارد حضرت شہنشاہی بخانہ او کہ معمورہ حقیقت بود تشریف بردہ صحبت ستوفی داشتند مصطلحات تصوف اہل اسلام را با طریق تصوف خود تطبیق دادہ بیان نمود، صاحب این مقام را "سرب باشی" نامند یعنی تارک ہمہ،

اس کا نام اجمد روپ تھا، اقبالنامہ کے اندر ایک جگہ اور اس کا تذکرہ ہے، تیرھوین سال جلوس کے سلسلہ مین مصنف لکھتا ہے۔

اجمد روپ کہ درا دجین کعب انزوا اختیار کردہ بود مرقوم گشتہ، در ینولا از اوجین بمتھرا کہ از اعظم معابد ہنود است نقل مکان نمودہ در پایہ جمنا بآئین دین خویش یزدان پرستی می نمود حضرت شاہنشاہی ظلمت کدۂ اورا بنور قدوم سعادت لزدم روشنی بخشید، درزمان ممتد درخلوت صحبت ستوفی داشتند۔

گیارھوین صدی جلوس کے سلسلے مین ایک صوفی حافظ کے متعلق مصنف لکھتا ہے۔

صوبۂ کشمیر کے نامہ نگار دن نے دربارشاہی مین صوفی حافظ کے سانحۂ وفات کا عجیب وغریب واقعہ لکھ بھیجا، حضرت حافظ ایک درویش تھے جنھون نے چالیس سال سے کشمیر کی ایک خانقاہ مین اقامت اختیار کرلی تھی، مرنے سے دو سال قبل خانقاہ کے وارثون سے درخواست کی کہ مرنے کے بعد مجھے اسی کے ایک گوشے مین دفن کردیا جاے، انھون نے خوشی دل سے قبول کیا، جب موت کا زمانہ نزدیک آیا تو دوستون اور عزیزدن سے کہا کہ میرے پاس ایک امانت ہے جسے مین مرنے سے قبل تمھارے سپرد کردینا چاہتا ہون اس کے بعد کشمیر کے ایک قاضی زادے کو جسے شیخ کے ساتھ ایک خاص درجے کی عقیدت تھی پاس بلایا اور کہا کہ میرے قرآن کیلیے سات سو روپے لاؤ اور اس مین سے ایک حصہ میری تجہیز وتکفین مین صرف کرو، اور کل جمعہ کے دن جب اذان کی آواز سنو تو میری خبر لینا، اور چیزین اپنے دوستون کو بانٹ دین، جمعرات کے دن شام کے وقت حمام مین جاکر غسل کیا دوسرے دن قاضی زادہ نماز سے قبل خانقاہ مین آیا دیکھتا ہے کہ حجرے کا دروازہ بند ہے اور خادم دروازے پر بیٹھا ہے، قاضی زادہ ارادہ ہی کر رہا تھا کہ شیخ کی حالت دریافت کرے کہ خود بخود حجرے کے اندر سے آواز آئی،

تا در حجرہ خود بخود کشادہ نگردد جستجوے احوال من نہ کنی، قاضی زادہ برپاے توقف می نماید

تا در حجرہ داخل شوند، و باتفاق مردم درون در می آیند و می بینند کہ مقابل قبلہ دو زانو نشستہ
جان بحق تسلیم نمودہ،

دسوین سال جلوس کے سلسلے مین مصنف نے جہانگیر کے سفر احمد آباد اور وہان کے بعض مقابر و عمارات کے متعلق تفصیل سے روشنی ڈالی ہے چنانچہ لکھتا ہے،

مزار شاہ عالم در سر راہ واقع بودہ بدرون روضہ درآمدہ فاتحہ خواندند ممکن کہ یک لک روپیہ
صرف عمارت این مزار فایض الانوار شدہ باشد سلسلۂ ایشان بہ مخدوم جہانیان منتہی می شود
و مردم گجرات را غریب اعتقاد بہ حضرت شاہ است می گویند کہ کرار شاہ عالم احیائے اموات
بظہور رسیدہ بعد از انکہ پدرش ازین معنی آگاہی یافتہ مانع آمدہ کہ تصرف در کارخانۂ الٰہی
خلاف شرط بندگی است، سید محمد کہ امروز جانشین ایشان است از خوبان روزگار است
شاہ عالم در ہشت صد وہشتاد ازین جہان فانی بہ عالم جاودانی شتافت

اولیا، اللہ اور بزرگون کے مقبرون مین نیازمندانہ جانا، جا بجا دین وقف کرنا اور فقرا، و تارک الدنیا جوگیون سے ملنا جلنا جہانگیر کا طغرائے امتیاز تھا چنانچہ مصنف اقبالنامہ نے بعض اور واقعات لکھے ہین جنھین عمارات و آثار کے ذیل مین لکھنا زیادہ مناسب ہے،

عمارات و آثار

جہانگیر فطرت کی طرف سے جمالیات پرستی کا نہایت ہی نازک اور لطیف ذوق لے کر آیا تھا، سبزہ زار اور آبشارون، گل و گلستان، قدرتی مناظر اور حسین و جمیل عمارات و مقابر سے اسے بڑی دلچسپی تھی اس نے اپنے عہد حکومت مین بہت سی پرانی عمارتون کی از سر نو ترتیب دی، بڑے بڑے مقبرے اور پر تکلف باغ بنوائے۔

جلوس کے پہلے سال کابل مین گیا تو وہان شہر آرا نامی ایک باغ کے پہلو مین اپنا ایک جنت نشان باغ بنوایا اس مین نہرون سے پانی جاری کیا اور اس کا نام جہان آرا رکھا

جلوس کے گیارھوین سال جہانگیر جب دہلی مین آیا تو سلیم کدہ مین اترا، اس عمارت کے متعلق معتمد خان لکھتا ہے

در منزل سلیم کدہ کہ سلیم خان (سور خاندان) در ایام حکومت بر لب آب جون اساس نہادہ چہار روز
مقام فرمودند، الحق منزل نکیف دل نشین است،

جلوس کے تیسرے سال جہانگیر اکبر کے مقبرے کی زیارت کیلیے پاپیادہ (سہ کردہ) گیا مصنف لکھتا ہے

بعد از فراغ زیارت...... روضۂ مقدس را بہ تعمق نظر دیدہ و سنجیدہ تصرفاتے کہ
بخاطر مشکل پسند رسید فرمودند مبلغہائے کلی بہ رسم خیرات بہ اہل حاجت عنایت شد

مبلغ پانزدہ لکھ روپیہ خرج عمارت روضہ متبرکہ حضرت عرش آشیانی شدہ

گیارھوین سال جلوس کے تذکرے مین مصنف نے جہانگیر کے اس کارنامۂ عظیم پر ایک دلچسپ تبصرہ کیا ہے، جو اس نے آثار قدیمہ کی حفاظت و مرمت کے لیے ایک انجینیر مقرر کرکے انجام دیا تھا،

میر عبدالکریم معموری (انجینیر) بموجب حکم اشرف عمارت سلاطین ماضی را مرمت دلخواہ نمود، مجدداً ...... خوش و عمارات دلکش از جهروکہ و غسلخانہ ترتیب دادہ بود، تحسن افتاد، قریب سہ لک روپیہ صرف شدہ باشد، قلعہ ماندو بر قلہ کوہ واقع شدہ دورآن دہ کروہ بمسافت درآید، درایام برشکال خوش ہوا و روح افزا مقامی است آثار سلاطین در ماندو بسیار است از جملہ گنبدیست، مدفن سلاطین ہوشنگ بغایت عالی[۱] دیگر مسجد یست معظم و گنبدے مدفن سلاطین صاحبہ و منارے از سنگ در غایت حسن اندام و موزونی

قلعہ ماندو کی بعض عمارتون کی مرمت کراکے جہانگیر احمدآباد پہنچا، یہان کے مقابر و مساجد کے دلکش نظارے کیے مصنف نے احمدآباد کے متعلق صرف اسی قدر لکھا ہے،

بانیٔ شہر احمد آباد سلطان احمد نبیرۂ ظفر خانست،

اور اس کے بعد احمدآباد کی مسجد اور شیخ وجیہ الدین کے مقبرے کے متعلق کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے لیکن جو لوگ دولت بہمنیہ کی تاریخ سے ناواقف ہین وہ احمدآباد کی اہمیت اور سلطان احمد کی خصوصیات سے لذت اندوز نہین ہوسکتے، فرشتہ کے اندر اس باب مین بعض نادر واقعات ملتے ہین جن سے پتہ چلتا ہے کہ کس تاریخ مین احمدآباد کی بنیاد پڑی اس مقام کا قدیم نام کیا تھا اور جغرافی اور تاریخی حیثیت سے اس جگہ کو کونسی اہمیت حاصل ہے احمد شاہ بہمنی نے ۸۲۵ھ سے ۸۳۴ھ تک حکومت کی، احمدآباد کی بنیاد ڈالنے کا خیال سلطان کو اس وقت ہوا، جب وہ سلطان ہوشنگ شاہ کے ساتھ معرکہ آرا تھا، چنانچہ تاریخ فرشتہ مین ہے،

[۱] محمود غزنوی کے بعد سلاطین دہلی مین سے خاندان تغلق کے ایک بادشاہ غیاث الدین کے عہد مین مالوہ فتح ہوا، اس خاندان کے بادشاہ محمود بن فیروز شاہ کے قتل کے بعد حسین نامی ایک شخص جو سلطان دہلی کی طرف سے گورنر تھا مالوہ کا خودمختار حاکم بن بیٹھا، اس کا لقب دلاور خان تھا اسے شہاب الدین غوری کی اولاد بتاتے ہین۔ اس کے خاندان نے مالوہ اور مندو مین ۸۰۴ھ سے ۹۳۷ھ تک حکومت کی ہوشنگ دلاور خان کا بیٹا تھا، باپ کی زندگی ہی مین اس نے مندو مین ایک نہایت مستحکم قلعہ بنایا تھا، فرشتہ کی روایت ہے کہ مندو مین ہوشنگ کا مقبرہ ہے جس کے داخلی حصے مین پانی ٹپکتا رہتا ہے ابوالقاسم فرشتہ نے یہ منظر اپنی آنکھون سے دیکھا، اس کا خیال ہے کہ تعمیر کی درازون سے جو ہوا گذرتی ہے غالباً یہ اسی کا اثر ہے کہ پانی کی شکل مین بدل جاتی ہے اہل ہند اسکو سلطان ہوشنگ کی کرامات سے تعبیر کرتے ہین (دیکھو فرشتہ مقالہ ۸

چون بحوالی حصار بیدر رسید با فرزندان و مقربان بعزم شکار از لشکر جدا شدہ مانند فلک دوار رستبار گردید ۔۔۔۔۔۔۔۔ در اثنائے سیر نظر خجستہ اثرش بصحرائے افتاد کہ در وسعت و خضرت مانند سپہر اخضر بود، در لطافت و صفا مثال چشمۂ خور و صحن زمینش چون بہشت برین بانواع ریاحین آراستہ و بگونہ گونہ رستنیہا پیراستہ، مجاوران شام و سحر در خاک پاکش طبلۂ عنبر اشہب کشادہ و مسافران صبا و شمال در ہوائے فیض بخشش نافۂ مشک اذ فرنہادہ،

یہ تھے وہ قدرتی مناظر جو حصار بیدر کے نزدیک صحرا میں نظر آرہے تھے، احمد شاہ نے یہاں ایک لومڑی دیکھی نہایت حیلہ گر اور نیرنگ ساز، میر شکار کو حکم دیا کہ شکاری کتون کو اس پر چھوڑے، کتون نے زبردست حملہ کیا لومڑی نے بھی حیلہ گری شروع کی اور چاہتی تھی کہ کسی مان یا گڑھے وغیرہ مین چھپ جائے لیکن میسر نہ ہوا، کتون نے تعاقب کیا اور اس کے نزدیک پہنچ گئے، اب لومڑی نے بجائے گریز کے کتون پر حملہ کر دیا، سلطان نے دیکھا تو دانت مین انگلی دبالی، یکایک اس کے خیال مین یہ بات آئی کہ لومڑی کی یہ جرأت ممکن ہے یہان کی آب و ہوا کی برکت کا نتیجہ ہو اس لیے اس کا ارادہ ہوا کہ یہین اپنا دار السلطنت بنائے یہ خیال اس نے اکابر دربار کے سامنے پیش کیا، چنانچہ سبھون نے اس نظریے سے اتفاق کیا اور بتایا کہ یہ مقام چونکہ مملکت دکن کے وسط مین واقع ہے اس لیے یون بھی دار السلطنت ہونے کا مستحق ہے، ابوالقاسم فرشتہ اپنا ذاتی خیال اس کے متعلق لکھتا ہے،

و مسود این اوراق می گوید کہ معظم بلاد ہندوستان را دیدہ ام در لطافت و خوبی مثل آن مملکت بنظر نیامدہ است، زمینش مانند شنجرف سودہ سرخست و در ایام برشکال کہ خوبترین فصلہائے ہندوستانست گل ولائے نمی شود چراکہ در احوال شہر تا دہ فرسخ چون اکثر زمین سرخست و چسپندگی ندارد در وقت سیر و شکار نہ اسپ تشویش می کشد، و نہ آدم بلکہ سم اسپان و پائے آدمیان در موسم باران گل آلود نمی گردد و جامہ و بدن سرخ نمی شود۔ و اکثر میوہائے ولایات خراسان و عراق دران حاصل شود، و خواجہ محمود گاوان المخاطب بخواجہ جہان زعفران و امرود و اقسام انگور نیز دران زمین حاصل کرد،

اہل دربار نے جب بادشاہ کے ارادے سے اتفاق کیا تو سلطان نے منجمون کو بلایا تاکہ وہ زائچے کے ذریعے دیکھکر اس کا پتہ بتائین کہ حصار بیدر کے نزدیک شہر یا دار الخلافت بنانا ستارون کی سعادت و نحوست کے اعتبار سے کیا اثر رکھتا ہے، منجمون نے بادشاہ کی رائے صائب بتائی اور سلطان نے عمارت بنوانی شروع کر دی۔

مہندسانِ اقلیدس شعار وطراحانِ مانی آثار بدائع انگار کہ از اقطار وامصار بپایۂ سریر ثریا جمع آمدہ بودند بہ کلک بصارت صورت شہر وعمارات را بر لوحِ مہارت نگاشتند وبمسامع جہان بانی رسانیدہ در ساعتے کہ کیوانِ بلند ایوان بیت الشرف خویش را مشرف ساختہ بودند وناہید عیش گستر روے بہ برجِ ثور نہادہ وقمر سریع السیر فلکش در برجِ شیر کہ آشیانہ خورشید است منزل گاہ خود ساختہ ومشتری سعادت اثر در جلوہ گاہ خویش رحلِ اقامت انداختہ اختیار بنائے شہر نمودند، ومعمارانِ دانشور وبنایانِ صاحبِ ہنر بکارِ خویش مشغول شدہ در جائیکہ قدیم الایام حصار بیدر بود دار الامارہ ساختند ومنازل ومساکن شاہانہ در اندک زمانے بہ تقدیم رسانیدند، پس امرا واعیانِ درگاہ وسائر سپاہیان دور عمارت شاہی طرح منازل افگندہ وآن بلدہ را بہ "احمد آباد بیدر" موسوم گردانیدند،

بیدر اپنے اندر بعض قدیم تاریخی خصوصیات بھی رکھتا ہے، یہین سے حسن وعشق کی ایک روایت جمیل مشہور ہوئی فیضی نے نلدمن لکھ کر حضرت اکبر ہی کی تکمیل آرزو نہین کی بلکہ بیدر کی ایک غزال رعنا کی فسونگری کے متعلق افسانہ لکھ کر ہندوستان کو فارس وعرب کے دعوے دارانِ عشق دور کے دوش بدوش لا کھڑا کیا، کون کہہ سکتا ہے عرب نے قیس ولیلیٰ، وامق وعذرا ہی اور فارس نے فرہاد وشیرین پیدا کیے تو ہندوستان نے اپنے دامن تربیت مین نل ودمن کو جوان کرکے دنیائے درد ومحبت مین کم قربانیان کین قدیم زمانے مین بھیم سین اسی بیدر کا راجہ تھا اور اسی کی لڑکی دمن پر مالوہ کا راجہ عاشق ہوگیا تھا جن کی عشقیہ داستان کو سن کر فیضی نے اپنی مثنوی لکھی،

احمد شاہ نے احمد آباد بیدر کی تعمیر کرائی تو فارس کا ایک یگانۂ روزگار ادیب اور علامۂ دہر شیخ آذری اسفرائینی دربار مین موجود تھا، اس نے ایک قصیدہ کہا، جب دار الامارہ کی تعمیر کا کام ختم ہوگیا تو شیخ آذری نے یہ دو بیت کہے،

حبذا قصرِ مشید کز فرطِ عظمت آسمان سدرہ از پایۂ این درگاہست
آسمان ہم نتوان گفت کہ ترکِ ادبست قصرِ سلطانِ جہان احمدِ بہمن شاہست

ملا شرف الدین مازندرانی نے جنھین خوشنویسی مین کمال تھا اور بڑے مشہور تھے، خطِ جلی مین یہ ابیات لکھے اور تلنگ کے سنگ تراشون نے جو تقلید مین سحر کی حد تک مہارت رکھتے ہین انھین بڑے پتھر پر کھود کر دروازے کے اوپر لگا دیا، اسی زمانے مین حضرت سید محمد گیسو درازؒ نے انتقال کیا تھا اس لیے بادشاہ مرشد کی جدائی مین ایک روحانی الم محسوس کرتے تھے، یہی وجہ تھی کہ شیخ آذری کو باوجود درخواست وطن جانیکی رخصت نہین دی گئی

جب بادشاہ نے یہ کتبہ دیکھا اور شہزادہ علاء الدین نے بتایا کہ یہ ابیات شیخ آذری کی فکر کا نتیجہ ہین تو بادشاہ بہت خوش ہوا، شہزادے نے موقع پاکر عرض کیا کہ شیخ وطن کی طرف معاودت کرنا چاہتے ہین، بادشاہ نے اجازت دیدی[۱]

شہر بیدر نے فارسی لٹریچر مین بھی شہرت حاصل کرلی اس کا واقعہ یون ہے کہ خواجہ محمود گاوان جنعین دولت بہمنیہ مین بہت بڑا اثر ورسوخ حاصل تھا اور جو وزارت کے درجے پر فائز تھے بڑے علم دوست واقع ہوے تھے، ان سے اور حضرت جامی سے خط وکتابت تھی اور خواجہ محمود شاعر کو برابر تحائف بھیجا کرتے تھے چنانچہ جامی نے ایک قصیدے کے اندر جس مین خواجہ محمود کی دعوت کے سلسلے مین معذرت نامہ پیش کیا ہے لکھا ہے ؎

شہر بیدر را چنان در بست بر من کبریا[۲]

چونکہ ہوشنگ شاہ اور احمد شاہ بہمنی کی معرکہ آرائی ۸۳۲ھ مین واقع ہوئی اس لیے یہی احمد آباد کی تعمیر کا زمانہ ہے،

یہ تھین چند ضمنی بحثین جو معتمد خان کی کتاب اقبالنامہ مین نہین، اور جن کا جاننا اس سلسلے مین ناظرین کے لیے بہت ضروری تھا معتمد خان نے احمد آباد کی شاہی مسجد اور خانقاہ شیخ وجیہ الدین کے متعلق ایک تبصرہ کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے،

احمد آباد مین شہر کے اندر ایک بہت عالی شان مسجد ہے اسکے تین دروازے ہین،
اور ہر دروازے کے نزدیک ایک بازار ہے، جو دروازہ پورب طرف ہے اُسکے
مقابل سلطان احمد شاہ کا مقبرہ ہے جس مین اس کا بیٹا اور پوتا قطب الدین بھی محو خواب ہے
مسجد کی لمبائی ۱۲۳ گز اور چوڑائی ۹۰ گز ہے اسکے چارون طرف مکانات ہین
مسجد کے فرش صحن مین اینٹین بچھی ہوئی ہین اور اس مین سنگ سرخ کے ستون ہین
مقصورہ (حجرہ) مین ۳۵۴ ستون ہین اور ستون کے اوپر گنبد بنائے گئے ہین
مقصورہ کی لمبائی ۵۰ گز اور چوڑائی ۳۷ گز ہے، مقصورے کا فرش اور محراب
سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے،

مصنف شیخ وجیہ الدین کے متعلق رقم طراز ہے کہ جہانگیر شیخ موصوف کی خانقاہ مین گیا، اس کے تیس سال قبل شیخ رحلت کرچکے تھے اس وقت شیخ حید سجادہ نشین تھے، سلطان احمد شاہ بہمنی کو شیخ وجیہ الدین سے

---

[۱] یہ تمام تفصیلات تاریخ فرشتہ مقالۂ سوم مین ملتے ہین، [۲] دیکھو نگار بابت دسمبر ۱۹۲۸ء عرفی ستیر ۲ نزی

بڑی عقیدت تھی، چنانچہ اسی عقیدت کا نتیجہ تھا کہ شیخ اپنے موطن و مولد سے گجرات میں آئے جمعہ کی شب کو تمام وضیع و شریف شیخ کی زیارت کو آتے ہیں،

سلطان محمد پسر احمد مذکور عمارات عالی از مقبرہ و مسجد و خانقاہ بر سر مزار ایشان اساس نہاد متصل بہ مقبرہ در ضلع جنوب نال کلان ساختہ......... و اتمام این عمارات در زمان قطب الدین ولد محمد شاہ گشتہ و مقبرہ سلاطین گجرات بر کنارۂ نال در طرف پائے شیخ واقعست و دران گنبد سلطان محمود بیگرہ، و سلطان مظفر پسر او محمود کہ آخرین سلاطین گجرات است آسودہ اند و بے اغراق مقبرۂ شیخ مقامیست پر فیض از روئے قیاس پنج لک روپیہ صرف این عمارت شدہ باشد[1]

مصنف اقبال نامہ نے حضرت شیخ سلیم چشتی کے مقبرے اور اس عظیم الشان مسجد کا تذکرہ بہ تفصیل لکھا ہے جن کی تعمیر اکبر کے زمانے میں ہوئی، شیخ سلیم کے حالات زندگی اور ان کے مقبرے کا تذکرہ تاریخ فرشتہ کے بارھویں مقالہ میں بھی پایا جاتا ہے، شیخ سلیم حضرت فریدالدین مسعود گنج شکر کی اولاد میں سے تھے، آپکے والد ایک سپاہی تھے آگرہ کے نزدیک ایک قصبہ سنکری میں پیدا ہوئے، سن رشد کو پہنچے تو ضروری مسائل سیکھ کر علوم باطنی کی طرف راغب ہوگئے ایک مرتبہ سولہ برس تک عرب و عجم، روم و یمن کی سیر کی اور دوسری مرتبہ سات برس تک سیاحت کرتے رہے، بہت دنوں تک بصرے میں رہے اور تیئیس حج کیے آخر میں ہندوستان واپس آئے اور ایک کوہستان میں جو آپ کے مولد سنکری کے پہلو میں واقع ہے سکونت اختیار کی، شیر شاہ و سلیم شاہ و خواص خان (جو دربار سوری میں بڑا عہدہ رکھتا تھا) حضرت شیخ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، جلال الدین اکبر ایسے گرویدہ ہوئے

---

[1] سلطان محمود بیگرہ سلطان قطب الدین محمد شاہ گجراتی کا چھوٹا بھائی تھا، تاج و تخت کا مالک تو قطب الدین کا چچا داؤد خان بنایا گیا تھا لیکن بدأطواری کے باعث تخت سے اتار دیا گیا اور محمود بیگرہ تخت پر بیٹھا اس نے ۸۶۳ھ سے ۹۱۷ھ تک حکومت کی "بیگرہ" کی وجہ تسمیہ فرشتہ نے یہ لکھی ہے کہ بیگرہ اس گائے کو کہتے ہیں جس کی سینگیں اوپر اٹھی ہوئی گردادار ہوں، چونکہ محمود بیگرہ کی مونچھیں ایسی ہی تھیں اسی لیے یہ لقب دیا گیا لیکن پھر صاحب تاریخ فرشتہ لکھتے ہیں کہ شاہ جمال الدین حسین انجو نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی ہے کہ بادشاہ نے دو قلعے گرنال اور جینانیر پر قبضہ کر لیا اس لیے اس نے "بیگرہ" یعنی دو قلعوں کا مالک کہا جاتا ہے اور اسی کو وہ صحیح بتاتا ہے، مظفر شاہ گجراتی (۹۱۷ھ - ۹۳۲ھ) سلطان محمود بن لطیف خان بن سلطان مظفر (۹۴۴ھ - ۹۶۱ھ) محمود کے بعد اور بھی دو بادشاہ گجرات میں تخت پر بیٹھے لیکن انھیں گجرات کے شاہی خاندان سے کوئی علاقہ نہ تھا اس لیے معتمد خان نے انھیں آخری بادشاہ کہا، محمود کی وفات کے سال سلطان سلیم شاہ سور، اور نظام الملک بحری حاکم احمد نگر نے بھی وفات کی ابوالقاسم فرشتہ کے والد مولانا غلام علی ہندو شاہ نے تاریخ کہی جسکا آخری بیت یہ ہے

سہ زتاریخ وفات این سہ خسرو　　چہ پرسی زوال خسروان بود　　(فرشتہ)

کہ اس کوہستان میں ایک شہر بنوا دیا اور اس کا نام فتحپور رکھا یہی بارہ برس تک دولت مغلیہ کا پایۂ تخت بنا رہا۔ حضرت سلیم نے ۹۷۹ھ میں رحلت کی شیخ کے بڑے صاحبزادے بدرالدین سجادہ نشین ہوئے اور کچھ دنوں کے بعد مکہ میں جا کر فوت ہو گئے۔ شیخ کے دوسرے صاحبزادے قطب الدین تھے آپ کی والدہ نے جہانگیر کو دودھ پلایا تھا اس لیے جہانگیر نے اپنی حکومت کے زمانے میں انہیں بنگالہ کا حاکم مقرر کر دیا جب وہ کسی اہل غدر کے ہاتھ سے مقتول ہوئے تو بدرالدین کے لڑکے علاء الدین کو اسلام خان کا خطاب اور بنگالہ کی حکومت ملی[۱]،

اقبالنامۂ جہانگیری میں شیخ سلیم کے مقبرے و بعض آثار کی تفصیل بایں الفاظ مذکور ہے،

> روز جمعہ سیزدہم بہمن (　　　) زیارت روضۂ غفران پناہ شیخ سلیم چشتی ارزانی داشتہ اظہار نیازمندی بسیار فرمودند، یکے از اعاظم آثار کہ در زمان دولت و عہد خلافت حضرت عرش آشیانی (اکبر) انار اللہ برہانہ بظہور آمدہ این مسجد است بے اغراق عمارتیست عالی از سیاحان ربع مسکون استماع افتادہ کہ مثل این مسجد در ہیچ بلادے از معمورۂ جہان نیست عمارتش ہمہ از سنگ در غایت صفا آرایش یافتہ پنج لک روپیہ از خزانۂ عامرہ خرچ گشتہ باتمام رسید[۲]

اس کے بعد مصنف نے مسجد کے طول و عرض اور بلندی کے متعلق مفصل حالات لکھے ہیں،

یہ مسجد ایک پہاڑ کے اوپر جنوبی سمت بنائی گئی ہے اس میں دس بڑے بڑے پر تکلف دروازہ ہیں، صدر دروازہ (پیش طاق) ۱۲ گز چوڑا، ۱۶ گز لانبا پچاس گز اونچا ہے، اسی قسم کا دوسرا دروازہ پورب طرف ہے، مسجد کی لمبائی اس شرقی چھت سے دیوار تک چوڑائی کو لیے ہوئے ۲۱۲ گز ہے، اس میں مقصورہ (چھوٹا حجرہ) شامل نہیں ہے ۵½ گز چوڑا ۱۵ گز لانبا، بیچ میں ایک گنبد واقع ہے، اس کا صدر دروازہ ۷ گز چوڑا، اور ۴ گز لانبا اور ۵ گز بلند ہے اور اس کے دونو پہلو میں دو چھوٹے چھوٹے گنبد واقع ہیں چاروں طرف ۸۴ حجروں کا ایک ایوان ہے اس سلسلے کا ہر حجرہ ۴ گز چوڑا، اور ۵ گز لانبا ہے اور خود ایوان ۷½ گز چوڑا ہے (یعنی ہر حجرے کے سامنے ۳½ گز کا ایک سائبان ہے) اور مقصورہ کے علاوہ مسجد کی صحن ۱۶۴ گز لانبی اور ۱۴۳ گز چوڑی ہے۔ ایوان اور مسجد کے اوپر چھوٹے چھوٹے گنبد بنائے گئے ہیں جو کہ برسات کے زمانے میں مینہ کے پانی سے مملو

---

[۱] تاریخ فرشتہ مقالہ ۱۲　[۲] اقبال نامہ جہانگیری وقائع سال دوازدہم

ہو جاتے ہیں اور چونکہ فتحپور میں پانی کم برستا ہے اس لیے یہی پانی سال بھر تک کے لیے اس خانقاہ کے مجاوروں اور متعلقوں کے لیے کافی ہو جاتا ہے، اترا ور پورب کی طرف بڑے دروازے کے مقابل شیخ سلیم کا روضہ ہے جس پر سات گز کا ایک گنبد ہے اور اسی کے مقابل میں پچھم طرف تھوڑے فاصلے پر دوسرا گنبد واقع ہے، جس میں شیخ سلیم کی اولاد اور عزیز مدفون ہیں

چودھویں سال جلوس کے سلسلے میں مصنف لکھتا ہے،

رایات اقبال بصوب لاہور ارتفاع یافت بحکم اشرف در ہر منزل عمارتے اساس یافتہ

جلوس کے بائیسویں سال موت سے کچھ قبل جہانگیر نے اکبر کی طرح اجمیر کا پاپیادہ سفر کیا، مجاوروں اور معتکفوں کو مالامال کر دیا، اور سنگ مرمر کی ایک مسجد بنوادی، معتمد خان کا بیان ہے،

مسجد عالی از سنگ مرمر طرح انداختہ بانیان چابک دست مقرر بودند کہ در اندک فرصتے بہ نحویکہ طرح شدہ بود حسن انجام بخشید،

قلعۂ کانگڑہ کی فتح چونکہ سیاسی اور تاریخی حیثیت سے اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتی ہے اسلیئے معتمد خان نے تفصیل کے ساتھ اس کا حال لکھا ہے

قلعہ کانگڑہ بر فراز کوہ مرتفع واقعست استحکام .... بحدیست کہ تا آذوقہ وسائر مصالح قلعداری برجا باشد دست استیلا بدامنش نمی رسد وکمند تدبیر از تسخیر آن قلعہ کوتاہ است .... قلعۂ مذکور بست وسہ برج وہفت دروازہ دارد

کوئی مسلمان بادشاہ باوجود کوشش اسے فتح نہ کرسکا، جہانگیر نے اسے فتح کیا تو یہاں اذان دلائی نماز خطبہ پڑھا قربانی کی اور قلعہ کے اندر ایک عالی شان مسجد بنوائی چنانچہ مصنف اقبال نامہ لکھتا ہے،

حکم فرمودند کہ قاضی ومیر عدل ودیگر علمائے اسلام در رکاب بودہ آنچہ شعائر اسلام وشرائط دین متین محمدیست علیہ الصلوٰۃ والسلام در قلعۂ مذکور بعمل آرند بتوفیق ایزد جل سبحانہ، بانگ نماز وخواندن خطبہ وکشتن گاؤ وغیرہ کہ از ابتدائے این قلعہ تا حال بوقوع نیامدہ بود ہمہ در حضور اشرف بظہور آمد وسجدات شکر این موہبت عظمیٰ وعطیۂ کبریٰ کہ ہیچ پادشاہے توفیق بران نیافتہ بود بتقدیم رسید وحکم شد کہ مسجد عالی درون قلعہ اساس نہند، (باقی)

عبدالمالک آروی

مرزا کامران

گو مرزا کامران کی زندگی کے متعلق تاریخیں ساکت نہیں ہیں لیکن حالات پراگندہ ضرور ہیں کسی مورخ نے بچپن کی طرف زیادہ توجہ کی کسی نے ایام جوانی کے تذکرے میں طوالت سے کام لیا، اور کسی نے موت کے دردناک لمحوں پر رنگ آمیزی کی۔ اسی دوران میں بعضوں نے فسانے کو واقعہ اور بعضوں نے واقعہ کو فسانہ بنا ڈالا بہرحال بہت کم مورخوں نے کامران کی سیاسی تگ و دو کو ایک جگہ جمع کیا ہے اور شاید کسی نے بھی اس کی شاعری کی طرف کافی توجہ نہیں کی، اس لیے ہم نے کوشش کی ہے کہ یہی دو چیزیں اس مضمون میں جمع ہو جائیں

(سید بادشاہ حسن)

(۱)

سلطان محمود مرزا کے بیٹے مرزا خان کی وفات پر بابر نے ہمایون کو بدخشان کا حاکم مقرر کیا اور ہندوستان فتح کرنے کے بعد ۱۵۲۶ء میں قندھار پر مرزا کامران کو حکمران کیا، ۱۵۳۰ء میں جب کامران نے بابر کی موت کی خبر سُنی تو ملک گیری کی طمع نے لاہور کا رخ کرنے پر مجبور کیا، قندھار کی نگرانی کے لیے اپنے بھائی مرزا عسکری کو چھوڑ کر فتح و ظفر کی امنگ میں نکل پڑا، میر یونس کو جو اس وقت پنجاب کا گورنر تھا، سبز باغ دکھلائے، دام فریب بچھایا، لالچ کے دانے بکھیرے اور خود نظروں سے پوشیدہ گھات میں لگا رہا۔ بہت دن نہ گذرے تھے کہ میر یونس جال میں الجھا ہوا، ہاتھ پاؤں مارتے اور دم توڑتے دکھائی دیا، اس طرح پنجاب پر اپنا تسلط جما کر ہمایون کو باور کرایا کہ وہ کوئی بُرا ارادہ نہیں رکھتا، ہمایون نے مصلحت وقت سمجھ کر اس کو کابل، قندھار اور پنجاب کا گورنر تسلیم کر لیا عسکری سے بدظن ہو کر قندھار کا علاقہ اس سے چھین لیا اور بابر کے وفادار سپہ سالار خواجہ کلان بیگ کو حاکم مقرر کیا، سام مرزا جو موقع کی تاک میں تھا قندھار پر حملہ آور ہوا اور آٹھ مہینے تک قلعہ کو گھیرے رکھا، کامران ایک کثیر فوج لے کر خود آگے بڑھا اور سام مرزا کو شکست دی ابھی پنجاب واپس ہوا ہی تھا کہ سام مرزا کے بھائی نے یورش کی اور باوجود کلان بیگ کی کوشش کے قبضہ کر ہی لیا، حکومت کا انتظام امرا کے سپرد کر کے خود عراق کا رخ کیا، کامران نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور

قندھار کو دشمنون سے چھین لیا،

۱۵۳۶ء مین ہمایون شیر خان کی بغاوت فرو کرنے کے تجاویز عمل مین لا ہی رہا تھا کہ مرزا ہندال نے جو بابر کا چوتھا لڑکا تھا کوتہ اندیش شیر دن کے مشورے سے شہنشاہ کے خلاف جھنڈا بلند کیا، مرزا کامران کو قندھار سے لوٹتے ہوے ان بغاوتون کا علم ہوا، آگرے پر چھاپہ مارنے کے خیال سے اسنے اپنی فوج کا رخ پھیرا، ہندال یہ خبر سنکر الور مین پناہ گزین ہوا، ہمایون بغاوتون سے تنگ آکر اور شیر خان سے شکست کھا کر مرزا عسکری اور مٹھی بھر سپاہیون کے ساتھ آگرہ پہنچا، خلاف توقع وہ ہندال سے گرمجوشی کے ساتھ بغلگیر ہوا اور اس کی خطاؤن کو درگذر کیا، معاہدہ کی رو سے طے پایا کہ سب بھائی متفق ہو کر باغیون کے سرغنہ شیر خان کا قلع قمع کرین اسی اثنا مین کامران سخت علیل ہوا اور ایک ستہ سپاہیون کا سکندر کی کمان مین چھوڑ کر لاہور چل دیا،

وہ جنگ جس نے مغلون سے تاج چھین کر پھر افغان سردار کے سر پر رکھا اور جس نے ہمایون کو بےخانمان کیا تاریخ مین یادگار رہے، ہمایون شہنشاہ کی طرح نہین بلکہ ایک مفرور قیدی ایک معزول بادشاہ اور ایک شکستہ حال انسان کے مانند جس کا سر سایہ رحمت چاہتا ہو، جس کا دل سچی ہمدردی ڈھونڈھتا ہو اور جس کی آنکھین مونس و غمگسار کی تلاش مین ہون لاہور کی طرف آیا، لیکن یہ معلوم کر کے کہ بھائی نے طوطا چشمی کی اس کے خرمن امید پر بجلی گر پڑی مجبوراً قندھار کی طرف چل پڑا اور بہ ہزار دقت کچھ سپاہیون کو جمع کر کے ہمت مردانہ سے کام لے کر کابل پر حملہ آور ہوا، کامران بھی ایک کثیر لشکر کے ساتھ میدان مین نکلا، لیکن خدا کی کرنی ایسی ہوئی کہ سپاہی کامران کا ساتھ چھوڑ کر جوق در جوق ہمایون کے ہمراہیون کی تعداد بڑھانے لگے، اپنی فوج کی اس کارستانی سے کامران کی کمر ٹوٹ گئی اور اس نے فوراً معاہدہ کی ٹھان لی، ہمایون نے معاہدہ منظور کرتے ہوے باج گذاری کی شرط عائد کی یہ شرط ناقابل قبول تھی، کامران پہلے قلعہ مین بند ہوا پھر گجرات کی طرف فرار ہوا اور آخر غزنی مین اپنے خسر کے پاس پناہ گزین ہوا، جب ہمایون بدخشان مین سلیمان مرزا سے برسرپیکار تھا کامران نے اپنی منتشر فوج جمع کر کے کابل پر حملہ کر دیا، یہ خبر وحشت سن کر ہمایون لوٹا، کامران نے بھی فوج روانہ کی لیکن شکست نصیب ہوئی، سپہ سالار قید کر لیا گیا اور مار ڈالا گیا، یہ حالات دیکھ کر لوگ کامران کا ساتھ چھوڑ کر شہنشاہ کے ہمرکاب ہوگئے، کامران نے دیکھا کہ جز طاعت غیر چارہ نہین تو صلح کی درخواست کی، شہنشاہ نے حاضر دربار ہونے کو کہا مگر کامران کی ہمت نہ ہوئی ہمایون قلعہ کابل کا محاصرہ کرنے کے لیے آگے بڑھا یہ دیکھ کر چغتائی قبیلے کے بعض سردارون نے کامران کو مشورہ دیا کہ قلعہ بے چون و چرا حوالے کر دے، ایک رات کامران نے بہت سے باغیون کو تلوار کے گھاٹ اتارا اور خود لوگون کی آنکھ بچا کر فوچکر ہوا، ہمایون نے تعاقب کے لیے حاجی محمد خان کو روانہ کیا، اس آفت سے بچا ہی تھا کہ پہاڑ کے دامن مین ایک وحشی قبیلے نے آگھیرا، بہزار خرابی غنیم کے چنگل سے نکل کر شیر علی کے یہان پناہ گزین ہوا، یہان کے لوگون نے اس سے

ہمدردی ظاہر کی اور تھوڑے ہی عرصے مین رفقا، کی تعداد کافی ہوگئی، کامران بلخ سے ہوتا ہوا بدخشان پہونچا یہان نہ صرف خیر مقدم ہی کیا گیا بلکہ آس پاس کے سردارون نے باہم مشورے کے بعد طے کر لیا کہ بدخشان کی عنان حکومت کامران کے ہاتھون مین دینی چاہیے، جاسوسون نے ہمایون کو اندیشہ سے آگاہ کیا تو وہ بہ نفس نفیس ہزارونکا لشکر ہمراہ رکاب لے کر دندناتا ہوا مقابلے کے لیے میدان مین آنکلا، کثرت سپاہ اور شاہی رعب وداب نے کامرانکا دل دہلا دیا لڑنے کی تاب باقی نہ رہی اور طاعت کا طوق گلے مین ڈالنے پر راضی ہوگیا، ساتھ ہی معروضہ پیش کیا کہ اسکو مکۂ معظمہ چلے جانے کی اجازت دے دی جاے، ہمایون نے استدعا قبول کی اور حکم دیا کہ باغی سردارون کو اسکے حوالہ کر دیا جاے، کامران نے شرط منظور کر لی لیکن سردار جب قیدیون کی طرح دربار مین حاضر کیے گئے تو ہمایون کے دلمین رحم و کرم کا دریا موج زن ہوا اور اس نے سب کی خطائین معاف کر دین یہ دیکھ کر کامران نہایت شرمندہ ہوا اور اپنے کیے پر لعنت ملامت کرنے لگا، نادم و شرمسار وہ دربار مین حاضر ہوا، ہمایون شفقت برادری سے مجبور ہو کر اٹھا اور بھائی کو گلے لگا لیا،

تھوڑے دنون بعد کامران کو قلاب کا علاقہ بطور جاگیر عطا ہوا، جب ہمایون کابل چھوڑ کر بلخ کی بغاوتین فرد کرنے کے ارادے سے نکلا تو اس نے کامران اور عسکری کو اپنی مدد کے لیے طلب کیا لیکن دونون بھائیون نے پھر بغاوت کی اور ہمراہ رکاب چلنے سے عذر کیا، ہمایون نے مرزا سلیمان اور مرزا ابراہیم کو روانہ کیا، کامران نے جب سنا کہ ایک زبردست فوج مقابلے کے لیے آرہی ہے تو فرار ہو جانا مناسب سمجھا اسی اثنا، مین ہمایون کے بعض سردارون نے جو باغیانہ خیالات دماغون مین ایک زمانے سے پرورش کر رہے تھے کامران کو لکھا کہ وہ اس کی مدد کے لیے ہر طرح سے تیار رہین اور ہونے والی جنگ مین وہ سب ہمایون کا ساتھ چھوڑ کر اس کی رفاقت کرینگے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا سمجھ کر کامران نے پھر کمر ہمت چست باندھ لی، ہمایون نے فوج کی کمان خود اپنے ہاتھ مین لی گھمسان کی لڑائی ہوئی جس مین ہمایون شدید زخم کھا کر خیمہ گاہ کی طرف لوٹا بس سارے سپاہیون کے دل بیٹھ گئے اور وہ جی چرا چرا کر پیچھے ہٹنے لگے، آخر ساری فوج پسپا ہوگئی اور دوبارہ کابل کامران کے قبضے مین آگیا،

کچھ عرصے بعد ہمایون نے اپنی منتشر قوت پھر جمع کی، سلیمان، ابراہیم اور ہندال مرزا اکٹھے ہوے اور کابل کے ارادے سے چل پڑے، کامران بھی شہر سے باہر نکلا ایک معرکۃ الآرا جنگ ہوئی اور کامران کے حق مین فیصلہ کن شکست ہوئی کامران کو میدان چھوڑنا پڑا لیکن اس نے جلد ہی سندھ مین ایک گوشۂ عافیت تلاش کر لیا، بہت جلد وہ اپنی بیچین طبیعت کے ہاتھون تنگ آ کر افغانون کے مشورے کو اہمیت دینے لگا، اور جب حاجی محمد خان نے مدد کرنے کا وعدہ کیا تو پھر اسکے سر مین بغاوت کا سودا سمایا لیکن قبل اس کے کہ خیالی منصوبے عملی رنگ مین رونما ہوتے بیرم خان نے حاجی محمد کو جا لیا اور اس کو نظر بند کر کے کابل کی طرف روانہ کیا، عسکری کو بلخ جانے کے لیے مجبور کیا گیا، پھر بھی کامران نے ایک آخری کوشش کی

مگر وہی شکست قسمت مین لکھی تھی، کامران امن و سکون کی تلاش مین تھا اور بعض افغان اس کی طبیعت سے بیزار تھے، سلیم شاہ کے سپاہیون نے اسے گرفتار کر لیا اور ایک تیرہ و تار قید خانے مین بند کیا، جان پر کھیل کر ایک رات بھاگ نکلا، اور اب ہند و راجاؤن کے دامن تلے پناہ لینی چاہی مگر وہ سب ہمایون کی تلوار سے خائف تھے اسلیے کنارہ کشی اختیار کی، مانکوٹ کے قریب دشمنون نے اس کو آلیا اور قریب تھا کہ گرفتار کر لیتے مگر کامران نے یہان بھی ان کی آنکھون مین مٹی جھونکی زنانہ لباس زیب تن کیے نکلا اور ہزارون کی آنکھون کے آگے سے صاف بچکر نکل گیا، مگر کبرے کی مان کبتک خیر منا تی آخر سیالکوٹ پہنچا ہی تھا کہ گرفتار ہوکر ہمایون کے دربار مین کشان کشان لایا گیا،

"اُمرائے وقت، حکام زمان، رؤسائے شہر اور افسران خیر خواہ سبھون نے ہم زبان ہوکر عرض کیا محبت برادرانہ اور دنیا وی مراسم کو حکومت کے معاملات مین دخیل نہ ہونا چاہیے، اگر جہان پناہ کو بھائی کی پاسداری منظور ہے تو سلطنت سے دست بردار ہو جائین اور اگر شاہی منظور ہے تو شفقت برادرانہ کو بالائے طاق رکھین، وہ جہان پناہ کے بھائی نہین دشمن ہین، سرکشون کی گردن خم کرنا حکومت کی بہبودی اور سلطنت کے استحکام کے لیے ضروری ہے"

ہمایون نے جواب دیا "گو میرا دماغ تمھارے پیش کردہ اصول کو ماننے کیلیے تیار ہے لیکن کیا کرون دل پر اختیار نہین"

اُمراء کے جبر سے ہمایون کو ان کی تجویز ماننی پڑی اور اس نے سید محمد کو حکم دیا کہ مرزا کامران اندھے کر دیے جائین محمد سید نے غلام علی سے آنکھین نکال ڈالنے کے لیے کہا غلام علی کامران کے پاس پہنچا اور رسمی تسلی و دلاسہ کے بعد حرف مطلب زبان پر لایا

شہزادے نے یہ خبر سن کر کہا "اندھا کر کے چھوڑ دینے سے تو بہتر ہے کہ تم مجھے قتل ہی کر ڈالو" لیکن غلام علی نے جواب دیا "ہم حکم شاہی کے آگے نہین بڑھ سکتے"

اسکے بعد غلام علی نے شہزادے کے منھ مین کپڑا ٹھونسا اور خیمے سے باہر لاکر زمین پر لٹایا، تقریباً پچاس مرتبہ نشتر اس کی آنکھون مین چبھویا گیا، کامران نے انتہائی صبر و استقلال سے کام لیا اور اُف تک نہ کی۔ لیکن جب جلاد نے لیمو کا رس اور نمک کا پانی اس کی زخمی آنکھون مین ڈالا تو ضبط نہ ہو سکا۔ وہ چلایا،

"اے خدا! اے میرے خدا!! جو کچھ مین نے گناہ کیے تھے ان کی سزا اسی دنیا مین بھگت رہا ہون! اب دوسری دنیا مین میرے حال زار پر رحم کر!"

"نیشتر" اور "چشم پوشید ز بیداد سپہر" سے تاریخ نکلتی ہے، اندھے شہزادے نے مکہ کی راہ لی جہان وہ چار سال بعد

۱۱ ذوالحجہ ۹۶۴ھ مین مرگیا، ع گوشاہ محروم در مکہ ماند - مین 'گو' کا لفظ چھوڑ کر تاریخ نکلتی ہے، مولانا قاسم کاہی نے حسب ذیل تاریخ کہی :-

کامران آن کہ بادشاہی را کس نبود ست ہمچو او در خورد
شد ز کابل بکعبہ و آنجا جان بحق داد و تن بخاک سپرد
گفت تاریخ او چنین کاہی
بادشا کامران بکعبہ بمرد

کامران نے ایک لڑکا اپنی یادگار چھوڑا، اس کا نام ابوالقاسم مرزا و تخلص شوکتی تھا، ۹۷۴ھ مین اکبر کے حکم سے گوالیار کے قلعہ مین قتل کر دیا گیا جہان وہ قید تھا، اس کی وفات کی تاریخ کسی نے یون کہی :-

نماند از کامران نام و نشانے

(۲)

اب ہم مرزا کامران کی شاعری کی طرف متوجہ ہوتے ہین - آج کی صحبت مین ہم دیوان کے اس قلمی نسخہ کا ذکر کرین گے جو پٹنہ لائبریری مین محفوظ ہے، محققین کا خیال ہے کہ کامران کے آخری دردناک لمحون کی یاد تازہ کرنے کے لیے ہندوستان مین یہی ایک نسخہ باقی رہ گیا ہے اس لیے اس کی قدر و قیمت بے اندازہ ہے -

اس نسخہ پر جہانگیر، نور جہان، شاہجہان اور بہت سے اُمراؤ وُزرا کی مہرین ثبت ہین اور تحریرین دیدہ زیب ہین اس کا کاتب خواجہ محمود بن اسحٰق شہابی ہے جو خوشنویسی مین شہرۂ آفاق میر علی کا بہترین شاگرد سمجھا جاتا ہے مرأت العالم کے مطابق خواجہ محمود میر علی کا شاگرد تھا، اس کا خط میر علی سے اس قدر ملتا جلتا تھا کہ بعض دفعہ اپنی تحریر کو میر علی کے نام سے منسوب کر دیتا تھا، ملاحظہ ہو مرات العالم :-

خواجہ محمود آن کہ یک چندے بود شاگرد این حقیر فقیر
بہ تعلیم او دلم خون شد تا خطش یافت صورت تحریر
در حق او نہ رفتہ تقصیرے لیک او ہم نمی کند تقصیر
مینویسد ہر آنچہ از بد و نیک جملہ را می کند بنام فقیر

دیوان غزلیات، قطعات، رباعیات، فرد اور مثنویون پر مشتمل ہے لیکن ترتیب مین نقص یہ ہے کہ فارسی اور ترکی کلام ساتھ ہی ساتھ جمع کر دیا گیا ہے،

الف کی ردیف مین کل چھ غزلیات ہین پہلے چار فارسی ہین اور بعد کے دو ترکی، پہلی غزل کے تین شعر ملاحظہ ہون

چون بمقصود نشد ہیچکسے رہبر ما — بعد ازین خاک در پیر مغان و سر ما
کار ما چون زد ربستہ زاہد بکشود — بو کزین پس نہ خرابات کشاید در ما
بارگی ست و شب تیرہ و رہزن کمین — وائے گر ہادیٔ لطفت نشود رہبر ما

دوسری غزل کا مطلع ہے

حسن تو دمبدم افزون بادا — طالعت فرخ و میمون بادا

اکبرنامہ مین لکھا ہے کہ جب ہمایون نے کابل قندھار اور پنجاب کے علاقہ کامران کو بطور جاگیر کے عطا کیے تو اسنے شہنشاہ کی تعریف و توصیف مین یہ غزل کہہ کر تشکرانہ ادا کیا، ہفت اقلیم کا مصنف بھی اس کا ذکر کرتے ہوے لکھتا ہے کہ ہمایون اس قدر خوش ہوا کہ حصار فیروزہ انعام مین عطا کیا،

تیسری غزل کا مطلع کہا ہے۔

با رقیبان ہمدم و ہمراز دیدم یار را — یارب آسان کن بمن این حالتِ دشوار را

اسکے بعد حافظ کی غزل پر تضمین کہی ہے، پہلا بند ملاحظہ ہو:۔

اے کافرانِ میخوارہ بے باک خدارا — رحمے بکن این سوختۂ بے سر و پا را
از اشک چو شبنم دلِ تو نرم نگردد — سیمین ذقنا سنگ دلا لالہ عذارا
دارم طمع گوشۂ چشمے ز تو لیکن — خوش کن بہ نگاہے دلِ غم پرور ما را

پانچوین اور چھٹی غزل ترکی مین ہے،

ب کی ردیف مین چھ غزلیات ہین جن مین صرف پہلی فارسی مین ہے اور باقی پانچ ترکی مین۔

پہلی غزل کا مطلع ہے

بے تو نایاب شد از ملک دلم طاقت و تاب — خسرو عالم جانی و جہان از تو خراب

ت کی ردیف مین چھ غزلیات ہین جن مین پہلی اور آخری ترکی مین ہے اور باقی فارسی مین

دوسری کا مطلع کہا ہے

باز دامان خود آن سرو بہ بالا زدہ است — کس بدامانش مگر دستِ تمنا زدہ است

تیسری کا مطلع ہے،

حلقۂ زلف پریشانِ تو بے چیزے نیست — غمزۂ نرگس فتانِ تو بے چیزے نیست

چوتھی کا مطلع ہے،

آسودگی خستہ دلان از ستم اوست — خوشحالیٔ ماتم زدگان از الم اوست

پانچوین غزل کا مطلع ملاحظہ ہو،

گر ز تو چاک است دلم باک نیست   نیست دلے کز غم تو چاک نیست

ردیف د مین سات غزلیات ہین جن مین صرف ایک ہی (پہلی) ترکی، دوسری غزل مین چار شعر ہین

سنبل و گل در بہار عارضت باہم دمید   کس بہار این چنین در گلشن ندید

تیسری غزل مین تین شعر ہین۔

رسید مژدہ کہ ایام وصل یار آمد   گذشت فصل دی و موسم بہار آمد

چوتھی مین صرف دو حسب ذیل شعر ہین۔

تا این دل شیدائی در قید جنون افتاد   ہر راز کہ نہفتم از پردہ برون افتاد
بیمار غم ہجران در بزم وصال تو   مشکل کہ رسد روزے زینسان کہ زبون افتاد

پانچوین غزل کا مطلع ہے

ز رخسار و قدت شدم بہرہ مند   زہے طالع سعد و بخت بلند

چھٹی کا مطلع ہے

چشم بر راہ تو داریم شد ایامے چند   وقت آن شد کہ نہی جانب ما گامے چند

اور ساتوین کا

چیست دنیا بنائے بے بنیاد   چیست گردون مدارست نہار

ر، ز اور ق، کی ردیفون مین بالترتیب سات دو اور ایک غزل ہے لیکن سب کا سب ترکی زبان مین ہے
ک کی ردیف مین سات غزلیات ہین صرف ایک (پہلی) فارسی مین ہے اس غزل مین صرف تین ہی حسب ذیل
شعر ہین۔

اے جہان از تو ہویدا تو از عالم پاک   ہست در معرفت ذات تو عاجز ادراک
دست در جبل متین کرمت خواہم زد   روز محشر کہ سر خویش بدارم از خاک
شعلہ شمع در دونم بجہان آتش زد   منکہ از سوز درون آہ زدم آتشناک

ل کی ردیف مین ایک پہلی ترکی اور دو فارسی غزلین ہین۔ پہلی فارسی غزل مطلع ہے

بکام غیر شد لعل دے اے دل   شد آب زندگانی زہر قاتل

اور مقطع۔

غمت را کامران در دل نہفتہ   کہ باشد گنج را ویرانہ منزل

دوسری غزل کا مطلع کہا ہے۔

مرا چون کوہ دردے از تو بر دل — چہ سان بار سفر بندم بہ محمل

م کی ردیف مین کل دو غزلین ہین پہلی فارسی ہین دوسری ترکی مین۔ فارسی غزل کا مطلع ہے

کند سیل غم ہجران تو از بنیادم — نظرے کن کہ براہ تو ز پا افتادم

سات غزلیات نون کی ردیف مین ہین شروع کے چار ترکی مین ہین اور آخر کے تین فارسی مین۔ پہلی فارسی غزل مین حسب ذیل تین شعر ہین۔

اے قدِ رعنائے تو سروِ گلستانِ حسن — روئے دلارائے تو لالۂ بستانِ حسن
روے خوشِ مہوشت تازہ گلِ باغ لطف — سرو قدِ دلکشت نخلِ گلستانِ حسن
شمس و قمر را نماند ماہ رخا رونقے — تا تو برآوردہ سر ز گریبانِ حسن

دوسری مین دو یہ ہین

رفتہ رقیب از درت کم شدہ اندوہِ من — حمد خداوند را اذہب عنا الحزن
باز زلیخائے شب موے سیہ را کشاد — زانکہ بچاہ اوفتاد یوسف گل پیرہن

اور تیسری غزل مین تین شعر ہین:-

بہا لا بلائی، بچشم آفتِ دین — برخ مہ لقائی، بعقد سروِ سیمین
سر رشتۂ عیش آید بدستم — بدستم اگر افتد، آن زلفِ مشکین
بگفتم گدائے توام، خندہ زد گفت — گدا را چہ نسبت بود با سلاطین

و کی ردیف مین صرف ایک غزل ہے اور وہ بھی ترکی مین۔

ی کی ردیف مین نو غزلیات ہین جن مین پہلی چھ ترکی مین اور آخری تین فارسی مین پہلی اور دوسری فارسی غزل کے مطلع بالترتیب ذیل مین ہین:

زہی سان کہ جمالِ خود آراستہ می آئی — در زہد شکست آری در عشق بیفزائی
زہے بزلف و رخت صد ہزار زیبائی — ہزار شوق ز تو در دلِ تماشائی

اس کے بعد فردیات درج ہین جو دو طریقون پر تقسیم کیے گئے ہین، پہلے ابیات فرد مطلع ہین جن کی تعداد انیس ہے ان مین صرف انیس فارسی ہین۔ پہلے دو ملاحظہ ہون۔

اے شدہ خاک درت در نظرم توتیا — رفت صبوری برخت بے تو بباد ہوا
دوش دیدم با رقیبان ہمنشین دلدار را — چون برون آرم ز خاطر اینچنین آزار را

دوسری قسم میں "ابیات فرد غیر مطلع" ہیں، دس ترکی میں ہیں اور چار فارسی میں، پہلی اور آخری فارسی بیت حسب ذیل ہیں:-

گر نبود شیدے رخش را از لعب شبگون کے شکر	این چنین روز سیاہ و حالت درہم مرا

پیش قد تو بنفشہ با ہمہ شرمندگی	تکیہ بر گل کردہ و بہر ادب برخاستہ

اب قطعات شروع ہوتے ہیں ان میں تین ترکی میں ہیں اور تین فارسی میں ہم صرف فارسی قطعات نقل کرتے ہیں

اے برادر ز من بشنو سخنے	کہ ازان بہرہ در شوی شاید
دل بکار جہان منہ کہ ازان	بار غم بر دل تو افزاید
کار عقبے بساز ورنہ ترا	کار و بار جہان چہ کار آید

اے کہ در شیوۂ خلاف سخن	شہرہ شد در جہان فسانۂ تو
تاکنون بر خلاف عہد اگر	عہدہا از تو شد بہانۂ تو
این زمان ہم خلاف میگوئی	آزمودیم ہمہ بہانۂ تو

اے آنکہ بہر محفل و مجلس ہمہ کس	با سینۂ پر کین رخ پر چین بدر آئی
گفتی کہ گرفتست دل از خانۂ عمرم	وقتست کزین خانۂ پر کین بدر آئی

رباعیات ہیں تو کل بیس مگر سوائے چار کے سب ترکی میں ہیں منجملہ ان کے تین رباعیاں درج ذیل ہیں

در آرزوے قد تو دالی گشتم	از فکر دو ابروت ہلالے گشتم
اندر ہوس لب و میانت جانا	القصہ من خستہ خیالے گشتم

اے باد برآن یار سلامم برسان	در خلوت وصل او پیامم برسان
بر صبح وصال و شام زلفش بگذر	یعنی کہ دعاے صبح و شامم برسان

یارب ز کرم درے برویم بکشاے	زنگ غیر از دل حزینم بزداے
پیوند من از جملہ علائق بگسل	از ہر دو جہان سوے خودم راہنماے

اٹھارہ مثنویات ہیں یوں تو ہیں سب چھوٹی چھوٹی لیکن چار جو فارسی میں ہیں پانچ پانچ چھ چھ شعر پر ختم ہو جاتی ہیں پہلی فارسی مثنوی یوں شروع ہوتی ہے

سخن پرداز این شیرین حکایت چنین کرد از کہن پیران روایت
زلیخا کز مہ کنعان جدا ماند بہ تنہائے و دوری مبتلا ماند

معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی کہتے وقت کامران کے پیش نظر جامی کی شہرۂ آفاق مثنوی یوسف زلیخا تھی اور وہ اس میں اس قدر کھو گیا تھا کہ جامی کے دو مختلف مصرعوں کو ایک جگہ کرکے اپنی مثنوی کی ابتدا کرتا ہے، جامی ایک جگہ کہتا ہو

سخن پرداز این شیرین فسانہ چنین آرد فسانہ درمیانہ۔

دوسری جگہ ہمیں یہ شعر نظر آتا ہے۔

چمن پیرائے این باغ حکایت چنین کرد از کہن پیران روایت

ملاحظہ ہو پہلے مصرع میں فسانہ کی جگہ "حکایت" ہے لیکن دوسرا تو بجنسہ جامی کا ہے اس سے ہمارا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ کامران پر سرقہ کا الزام عائد کیا جائے بلکہ قیاس گذرتا ہے کہ کامران بھی یوسف زلیخا کی طرز پر ایک بلند پایہ مثنوی کہنا چاہتا تھا، لیکن یا تو یہ سمجھ کر کہ جامی کا مقابلہ کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہے خیال ترک کر دیا یا سیاسی جدوجہد نے طبع آزمائی کرنے کا موقع ہی نہ دیا ہو۔

دوسری مثنوی اس طرح شروع ہوتی ہے۔

تا چہ سازد جہانِ بے سروبن غافل از مکر آسمان کہن
رفت کارم ز دست دست از کار نیست کارم بغیر نالۂ زار

تیسری کی ابتدا یوں ہوئی۔

سرِ نوخم شدہ ابرو بیت نالہ خونین جگری از رو بیت
گل ز دستِ تو گریبان زدہ چاک بے تو انداختہ خود را بر خاک

اس کے بعد ساقی نامہ شروع ہوتا ہے جس کے جملہ نو شعر ہیں۔ شروع کے دو شعر ملاحظہ ہوں

بیا ساقی آں مے کہ جان پرور است کہ جانِ حزینِ مرا درخور است
بمن دہ کہ دوران چنین من است پئے قصدِ جانِ حزینِ من است

دیوان نثر کے چند جملوں پر ختم ہوتا ہے جو ترکی میں ہیں اکاتب کے نام کے ساتھ حسب ذیل عبارت درج ہے

تمت دیوان حضرت الاعلیٰ حفظہ اللہ تعالیٰ عن الآفات والبلایا علی ید العبد الضعیف محمود بن اسحٰق الشہابی الہروی علیٰ طریق الاستعجال .....؟

ہم شروع میں ذکر کر چکے ہیں کہ اس نسخۂ نایاب پر جہانگیر، نور النساء اور شاہ جہان کی تحریریں خود ان کے خطا میں موجود ہیں، اب ہم چاہتے ہیں کہ انکی تحریریں بجنسہٖ نقل کر کے مضمون ختم کر دیں۔ جہانگیر لکھتا ہے

اللہ اکبر

دیوان مرزا کامران کرعم پدر بزرگوار نست بخط محمود اسحق سہابی۔ حررہ نور الدین محمد جہانگیر شاہ اکبر

سنہ جلوس مرافق سنہ ۱۰۲ھ

اس کے سیدھی جانب شاہ جہان لکھتا ہے :-

ھُو

الحمد للہ الذی انزل علے عبدہ الکتاب حررہ شاہجہان ابن جہانگیر ابن اکبر شاہ

ذیل کے نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان نور النساء بیگم کے بھی قبضے میں رہا، ملاحظہ ہو

قیمت اموال نواب نور النساء بیگم

مُہر

سیّد بادشاہ حسن حیدر آبادی

اطلاعنامہ بنام دائنان نسبت تعیین تاریخ سماعت درخواست دیوالہ

دفعہ ۹ ایکٹ نمبرہ سنہ ۱۹۲۰ء	بعدالت جناب سب جج صاحب بہادر ڈول بہرائچ مقام بہرائچ
درخواست دیوالہ نمبرہ سنہ ۱۹۳۱ء	بمقدمہ قرار دیے جانے دیوالیہ مسمی رامدیال ولد گنگادین مراؤ ساکن
موضع بنہوان پرگنہ حسام پور	بنام حسین خان وغیرہ

ہر گاہ مسمی رامدیال سائل نے عدالت ہذا میں بذریعہ عرضی مورخہ ۴ ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۱ء درخواست کی ہے کہ وہ حسب منشاء ایکٹ دیوالیہ نمبرہ سنہ ۱۹۲۰ء دیوالیہ قرار دیا جاوے اور تمہارا نام فہرست دائنان میں جو مدیون مذکور نے داخل کی ہے پایا جاتا ہے لہذا تم کو اطلاع دیجاتی ہے کہ عدالت نے تاریخ ۱۲ ماہ اگست سنہ ۱۹۳۱ء واسطے سماعت درخواست مذکور الصدر اور لینے بیان مدیون کے مقرر کی ہے اگر تم کچھ اس معاملہ میں پیروی کرنا چاہتے ہو تو اصالتاً یا بذریعۂ وکیل جو حال مقدمہ سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو حاضر ہو۔

میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

آج بتاریخ ۱۱ ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۱ء

مہر عدالت

دستخط حاکم بخط انگریزی

وقت حاضری بدفتر ۱۰ بجے سے ۴ بجے شام تک

بابُ الاستفسار

مولویہ

(جناب رضا علیخانصاحب رامپور)

مولویون کا ذکر تو نگار مین اکثر رہتا ہے لیکن کبھی اس مولویہ طبقے کا بھی تو ذکر فرمائیے جو صوفیہ مین شمار ہوتا ہے اگر زحمت نہ ہو تو مطلع کیجیے کہ یہ جماعت کب قائم ہوئی اور اس کے کیا اصول ہین ۔

(نگار) یہ جماعت منسوب ہے جلال الدین رومی سے جنھین مولوی اور مولانا کا لقب خود ان کے والد نے عطا کیا تھا، مناقب العارفین مین لکھا ہے کہ ان کے تبعین خود اپنے آپ کو بھی اسی نسبت سے مولوی کہتے تھے اور سنہ ۶۸۰ھ سے سنہ ۷۰۶ھ تک جتنی نقلین مثنوی کی نظر آتی ہین ان سب مین نقل کرنے والون نے بھی اپنے آپ کو مولوی لکھا ہے ۔ ابن بطوطہ جو اس زمانے کے بعد قونیہ پہونچا تھا لکھتا ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو جلالیہ کہتے تھے اور مناقب العارفین مین جو ان کو مولوی کے لقب سے یاد کیا ہے وہ صرف احترام علمی کے لحاظ سے نہ اس حیثیت سے کہ وہ جلال الدین رومی کے تبع تھے"۔ مناقب العارفین مین لکھا ہے کہ ایک شخص بدرالدین گوہرطاش نے ایک کالج قونیہ مین جلال الدین کے والد کے لیے تعمیر کرایا تھا جو بعد کو جلال الدین کے قبضے مین آیا اور اس طرح ایک اسکول مولویہ جماعت کا قائم ہوا ۔

اس جماعت کا رقص خاص چیز ہے اور اہل مغرب "رقاص جماعت" ہی کے نام سے ان کو موسوم کرتے ہین یہ لوگ داہنے پاؤن پر کھڑے ہو کر ساز کی آواز اور ڈھول کے تال سم کے ساتھ چارون طرف گھومتے اور رقص کرتے تھے، ہر چند جلال الدین رومی کے زمانے سے قبل بھی صوفیہ مین رقص کی عادت پائی جاتی ہے لیکن جلال الدین رومی نے اس کو زیادہ اہمیت دی اور اس کا سبب مناقب العارفین نے یہ بیان کیا ہے کہ

ایشیائے کوچک کے لوگ لہو لعب کے زیادہ شائق تھے اسلیے انکو متوجہ کرنے کے لیے جلال الدین رومی نے رقص و سرود کو زیادہ اہمیت دی،

مناقب مین زمانہ ماقبل کے صوفیہ (مثلاً جنید بسطامی، منصور حلاج وغیرہ) کا ذکر نہایت عزت و احترام کے ساتھ کیا ہے لیکن عہد رومی کے صوفیہ کو یا تو نظر انداز کر دیا ہے یا کافی احترام سے کام نہین لیا، چنانچہ شیخ عبد القادر جیلانی کا ذکر ہی نہین کیا اور محی الدین ابن عربی اور رفاعی کے لیے اچھے الفاظ استعمال نہین کیے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولویہ جماعت نے ایک خاص مسلک اختیار کرکے اپنے اصول کی تبلیغ مین جائز و نا جائز ہر طرح کے ہر ہتھکنڈے سے کام لیا اور اسی کا اثر تھا کہ بعد کو بکطاشی جماعت کے ساتھ بہت زیادہ مخالفت پیدا ہو گئی۔

جہان تک اصول کا تعلق ہے اس جماعت کے خیالات یقیناً پاکیزہ تھے کیونکہ مذہبی تقشف ان مین بہت کم تھا، اور اسی لیے اس زمانے کے عیسائیون سے ان کے مراسم بڑی حد تک دوستانہ تھے چونکہ ان کے مسلک کی بنیاد زیادہ تر فلسفۂ اخلاق پر تھی اس لیے وہ ہر اس شخص کی عزت کرتے تھے جس نے اپنے علم و فضل یا اخلاق سے بنی نوع انسان کی خدمت انجام دی ہے خواہ وہ کسی مذہب یا مسلک کا پیرو رہا ہو۔ چنانچہ وہ مقام قونیہ کی عزت اسی لیے کرتے تھے کہ ان کے نزدیک افلاطون وہین دفن ہوا تھا، اس عہد کے فقہا البتہ اس جماعت کے سخت دشمن تھے کیونکہ وہ رقص و سرود کو حرام کہتے تھے اور یہ اس کے سخت پابند تھے

سرزمین قونیہ سے باہر اس جماعت کی اشاعت رومی کے بیٹے سلطان بہاء الدین کے ذریعہ سے بہت کافی ہوئی اور اس عہد کے بعض فرمانرواؤن پر بھی اس کا اثر ہوا۔ جب سلطان سلیم اول نے قونیہ پر حملہ کیا تو اس نے شیخ الاسلام کے فتوے کے مطابق مولوی خانہ (یعنی مولویہ جماعت کی خانقاہ) کو مسمار کرا دیا لیکن اس واقعے سے اس جماعت کے اثر مین کوئی کمی پیدا نہین ہوئی بلکہ بعد کو سلاطین ترک مین سے اکثر اس جماعت کے معتقد ہوئے اور سب سے زیادہ مولوی خانے سلطنت عثمانیہ ہی مین قائم ہوئے۔ بہت اونچی ٹوپی بغیر آستینون کا کرتہ، جس پر ایک جاکٹ آستینون والی ہوتی تھی، کمربند اور خرقہ، یہ تھے لوازم لباس اس جماعت کے رقص و سرود کے سلسلے مین زیادہ تر چار ساز استعمال کرتے تھے۔ بانسری، ڈھول، مردنگ، اور تنبورہ قونیہ مین ہر پندرھوین دن نماز جمعہ کے بعد صحبت رقص و سرود قائم ہوا کرتی تھی لیکن قسطنطنیہ مین جہان انکے متعدد تکیے تھے اکثر یہ جلسے ہوتے رہتے تھے۔

اس جماعت کا صدر اعظم جو ملا خنکار، حضرت پیر، اور عزیز افندی کے خطابات سے یاد کیا جاتا تھا قونیہ مین رہتا تھا سنہ ۱۹۱۰ء تک تقریباً ۲۰ آدمی صدر ہو چکے تھے، انکے وکلا و نائبین بھی مختلف مقامات مین رہتے تھے

جو شخص اس حلقے مین داخل ہونا چاہتا تو ایک سو ایک دن تک اسے خادمون کی طرح کام کرنا پڑتا اسکے بعد اسے تکیے کا خاص ملبوس عطا کیا جاتا اور ایک حجرہ مخصوص ہو جاتا۔ یہین رہکر اور ذکر و شغل مین مشغول رہتا تھا یہان تک کرو ہ باقاعدہ حلقہ مین شریک ہونے اور مجلس حال وقال مین حصہ لینے کا اہل ہو جاتا مصر و ایشیائے کوچک مین اب بھی کہین کہین مولویہ جماعت کے درویش نظر آتے ہین کہین ابتک غیر منظم حالت مین۔

نمونہ سمن برائے انفصال مقدمہ

مقدمہ نمبر ۵ سنہ ۱۹۳۱ء

بعدالت جناب منصف جج صاحب بہادر قیصر گنج ضلع بہرائچ۔

پنڈت رکا مانت پرشاد — مدعی

بنام

والکا ولد لالتا قوم برہمن ساکن موضع جھالا پرگنہ وضلع گونڈہ — مدعا علیہ

ہرگاہ مدعی نے تمہارے نام ایک نالش بابت مالعہ کے دائر کی ہے لہذا تم کو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ ۵ ماہ اگست سنہ ۱۹۳۱ء بوقت ۱۰ بجے دن اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حال سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جس کے ساتھ کوئی اور شخص ہو جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہو اور جواب دہی دعوی مدعی مذکور کی کرو اور ہرگاہ وہی تاریخ جو تمہارے احضار کے لیے مقرر ہے واسطے انفصال قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے بس تم کو لازم ہے کہ اپنے جواب دعوے کی تائید مین جن گواہوں کی شہادت پر یا جن دستاویزات پر تم استدلال کرنا چاہتے ہو اسی روز ان کو پیش کرو

مطلع رہو کہ اگر بروز مذکور تم حاضر نہ ہوگے تو مقدمہ بغیر حاضری تمہارے مسموع اور فیصل ہوگا

آج بتاریخ ۱۳ ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۱ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا

دستخط حاکم بخط انگریز — مہر عدالت

وقت حاضری بدفتر — ۱۰ بجے سے ۴ بجے تک

مطبوعاتِ موصولہ

مسلمانانِ اندلس ایک مختصر رسالہ ہے ۳۲ صفحات کا جسے ملک کے مشہور مورخ مولوی اکبر شاہ خان صاحب نجیب آبادی نے مرتب کیا ہے ۔ اس میں ہسپانیہ کی اسلامی تاریخ کو اجمال مگر جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے

ہندوستان کی موجودہ سیاسیات کے لحاظ سے بھی یہ رسالہ دیکھنے کے قابل ہے کیونکہ ہندوستان کے مسلمان آج کل جس نااتفاقی کی لعنت میں مبتلا ہیں وہی اسپین میں بھی رونما ہوئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں ہسپانیہ کو خالی کرکے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جانا پڑا ، چونکہ فاضل مصنف کی ہر تاریخی کتاب کامل تفتیش و تحقیق کا نتیجہ ہوتی ہے اس لیے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ یہ رسالہ تاریخی نقطۂ نظر سے کس حد تک قابل اعتماد ہے یہ کتاب ۲۰ ر میں نیجر عبرت نجیب آباد سے مل سکتی ہے ۔

نوابِ امیر خان اس رسالے میں بانی ریاست ٹونک کے حالات درج کیے گئے ہیں جو انسانی عزم و استقلال کا عجیب و غریب مرقع پیش کرتے ہیں ۔ نواب امیر خان نے جس معمولی حالت سے ترقی کرکے ٹونک کو حاصل کیا وہ ہر انسان کے لیے ایک درس ہمت و اقدام ہے چونکہ نواب امیر خان کے کارنامے مالوہ ، پنجاب اور حکومت ہولکر و سندھیا سب سے متعلق ہیں اس لیے عہد پیشوا کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کے لیے اس کتاب کا دیکھنا ضروری ہے ۔ یہ رسالہ بھی مولوی اکبر شاہ خان صاحب نے تحریر کیا ہے ۔ ضخامت ۴ جزو ہے اور قیمت ۵۰ ر ملنے کا پتہ وہی منیجر عبرت نجیب آباد ۔

قواعدِ مضمون نویسی مولوی محمد مظفر الدین صاحب مدرس مدرسہ تحتانیہ مانوت (حیدر آباد دکن) نے دو جلدوں میں بسلسلۂ کتب درسیہ اس کتاب کو تالیف کیا ہے ابتدائی درجے کے طلبہ کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے اور سبقاً سبقاً قواعد کے ماتحت نہایت سلجھے ہوئے الفاظ میں ، جملوں کا بنانا اور خطوط و عرائض وغیرہ لکھنا بتایا گیا ہے یہ دونوں جلدیں ۱۱ ر میں مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن سے مل سکتی ہیں ۔

جنگِ انگورہ یہ رسالہ بھی ۴۰ صفحات کا مولوی اکبر شاہ خان صاحب نجیب آبادی کا تصنیف کیا ہوا ہے ، اس میں تیمور اور بایزید یلدرم کی اس لڑائی کا حال بتایا گیا ہے جو دنیا کی سب سے بڑی لڑائی سمجھی جاتی ہے

وہ حضرات جو موجودہ جمہوریت انگورہ سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کیلیے اس کا مطالعہ کسی طرح لطف سے خالی نہیں ۱۲ر میں منیجر عبرت نجیب آباد سے مل سکتی ہے

مبادی نفسیات مولوی شیخ عبدالحمید صاحب شوق بی۔اے صدر مدرس مدرسۂ وسطانیہ احمد پور (دکن) نے یہ کتاب سائیکالوجی کے مبادیات پر لکھی ہے اور پوری جامعیت کے ساتھ، اخیر میں بعض اصطلاحات فنی کا ترجمہ بھی دے دیا ہے جو فائدے سے خالی نہیں۔ ضخامت ۹۰ صفحات، قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

محمود گاوان محمد ظہیر الدین صاحب متعلم مکتبہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے محمود گاوان کے حالات اس رسالہ میں قلمبند کیے ہیں تاریخ دکن میں شاید ہی کوئی ایسا مدبّر وزیر ہوا ہو جیسا محمود گاوان تھا اس لیے ضرورت تھی کہ اسکے حالات علیحدہ کتابی صورت میں شایع کیے جاتے، خوشی کی بات ہے کہ محمد ظہیر الدین صاحب نے اس ضرورت کو محسوس کرکے یہ کتاب تالیف کی، اخذ و اقتباس، تفتیش و تحقیق میں کافی محنت و سلیقہ سے کام لیا گیا ہے، محمود گاوان کے مشہور عالم مدرسہ کی بھی تصویر رسالے میں دی گئی ہے اور اس کی قبر کی بھی، یہ کتاب ۸ر میں مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد سے مل سکتی ہے

انگریزی شاہ کار افسانے مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد نے شاہ کار افسانے کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا ہے جس کی یہ تیسری جلد ہے قدیم افسانے اور چینی جاپانی افسانے دو جلدیں اس سے قبل شایع ہو چکی ہیں

انگریزی شاہ کار افسانوں میں ۱۴ افسانے مختلف مشہور ادیبوں کے منتخب کیے گئے ہیں اور یقیناً سب کے سب خوب ہیں، لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ شاہ کار کی حیثیت رکھتے ہیں بہت دشوار ہے، کیونکہ ہر شخص کا ذوق پسندیدگی جدا ہوتا ہے اور بالکل ممکن ہے کہ وہی ایک چیز جو کسی کو شاہ کار نظر آتی ہے دوسرے کو بالکل ناکارہ نظر آئے اس کی قیمت ۱۲ر کتاب پر درج ہے۔

معلم اسود ڈرامہ ہے جسے اشتیاق حسین صاحب قریشی ایم۔اے نے تحریر کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس وقت تک اردو میں کم ڈرامے ایسے لکھے گئے ہوں جو خصوصیات تمثیل کے لحاظ سے اسقدر مکمل ہوں یہ ڈرامہ پلاٹ، زبان اور نتیجہ ہر لحاظ سے قابل ستایش ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ فاضل ڈرامہ نگار قدرت کی طرف سے اس فن کے اختیار کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں یہ ڈرامہ ۱۲ر میں الامان بکڈپو گلی قاسم جان دہلی سے ملسکتا ہے

مخزن ادب مولوی محمد عبدالشہید صاحب نے درسی کتابوں کے سلسلے میں تالیف کی ہے سب سے پہلے خطوط نویسی کے طریقے بتائے گئے ہیں اور پھر خط شکست پڑھنے کے۔ اس کے بعد بعض مشاہیر کے مضامین نثر و نظم کا انتخاب دیا گیا ہے۔ جس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ نے شائع کیا ہے قیمت کہیں درج نہیں ہے۔

بس کار رکھ بنگال کے مشہور ناول نویس بنکم چندر چٹرجی کے ناول کا ترجمہ ہے جسے فدا علی صاحب ایم اے (ڈھاکہ یونیورسٹی) نے اس دعوے کے ساتھ پیش کیا ہے کہ سارے ہندوستان کی مشترکہ زبان ایسی ہی ہو سکتی ہے، جہاں تک پلاٹ اور اصل فسانے کا تعلق ہے اس میں وہی سوقیت و عامیانہ پن نظر آتا ہے جو اکثر بنگالی ناولوں میں جنس مشترک کی حیثیت رکھتا ہے، رہا ترجمہ تو اس میں شک نہیں کہ مترجم نے کافی محنت سے کام لیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ ہندوستان کی مشترکہ زبان پیدا کرنے کی کوشش میں بہت سی غلطیاں کرنے پر بھی مجبور ہو گئے محاورات اور زبان کی غلطیاں تو کثرت سے نظر آتی ہیں، یہ ترجمہ ٹائپ میں چھاپا گیا ہے، اور کتابستان الہ آباد سے ایک روپے میں مل سکتا ہے۔

الجد مولوی محمد عبد الواسع صاحب پروفیسر حدیث مکتبۂ جامعۂ عثمانی حیدر آباد نے یہ رسالہ غزوۂ بدر کے حالات میں لکھا ہے۔ جس میں روایت و درایت اور فلسفۂ تاریخ کے معیار سے غزوۂ بدر کے حقیقی اسباب پر بحث کی ہے غزوہ بدر کے متعلق مخالفین کا یہ اعتراض ہے کہ اس کی نوعیت بالکل غارت گری کی سی تھی، اس کتاب میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ غزوہ بدر بھی حقیقتاً بالکل دفاعی جنگ تھی اور مسلمان مجبور تھے، طباعت وغیرہ نہایت نفیس ہے۔ حجم ۱۲۸ صفحات، قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ، ایس۔ اے باقی اینڈ کو۔ گورکھپور

دیوان حفیظ دو جلدوں میں شایع ہوا ہے اور طباعت و کتابت میں کافی اہتمام سے کام لیا گیا ہے حفیظ جونپوری پرگو شاعر تھے اور زیادہ تر لکھنؤ اسکول کے پیرو تھے۔ یہ دونوں جلد ۳ روپے میں ایس۔ اے باقی اینڈ کو گورکھپور سے مل سکتی ہیں۔

دیوانِ آسی مولانا شاہ عبد العلیم آسی مرحوم دنیائے شاعری میں خاص شہرت رکھتے ہیں اور نگار کے سالِ اول میں ان کے کلام پر مفصل تبصرہ ہو چکا ہے جناب آسی کا کلام صحیح معنے میں وہ درد و کیف رکھتا ہے جو ایک غزل کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے وہ حضرات جو معیاری رنگ تغزل سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں ضرور اس کا مطالعہ کریں۔ یہ کتاب بھی ایس۔ اے باقی اینڈ کو گورکھپور سے مل سکتی ہے

ہندوستان کی دو بہادر عورتیں ایوان اشاعت گورکھپور کی شایع کی ہوئی سلسلۂ درسیات کی پہلی کتاب ہے جس میں درگاوتی چاند بی بی، تارا بائی، پنا، سنجوگتا، پدمنی اور اہلیہ بائی کے حالات نہایت دلچسپ شگفتہ اور سلیس زبان میں درج کیے گئے ہیں، تاریخی حیثیت سے بھی تمام حالات صحیح و درست معلوم ہوتے ہیں لیکن پدمنی اور علاؤ الدین کے واقعہ عشق و محبت کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ساقط الاعتبار ہے

یہ کتاب لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے یکساں مفید ہے اور اس قابل ہے کہ نصاب میں داخل کی جائے آٹھ آنے میں ایوان اشاعت گورکھپور سے مل سکتی ہے۔

تحرِ تبسم جناب شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ جسے نسیم بکڈپو لکھنؤ نے شائع کیا ہے پہلا حصہ موج تبسم اس سے قبل چند ماہ ہوئے شائع ہوا اور ملک مین کافی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا

ہرچند جناب شوکت کے مضامین نگار مین شایع نہین ہوتے لیکن اور رسالون مین اسقدر کثرت سے شایع ہو رہے ہین کہ ان کے انداز تحریر سے حلقۂ نگار بھی یقیناً واقف ہوگا میرا ایک مختصر سا مقدمہ یا تعارف بھی اس مجموعہ کی ابتدا مین شامل ہے اور اس مین کلام نہین کہ بعض بعض مضامین اس مجموعہ کے "ادبیات نگاہی" کی جان ہین یہ مجموعہ ۲۵۶ صفحات کو محیط ہے اور مجلد دو روپے چھ آنے ۶ؔ؍ مین ملتا ہے،

اطلاعنامہ بنام مہاجنان نسبت تعین تاریخ سماعت درخواست دیوالہ

دفعہ ۱۹ ایکٹ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء
درخواست دیوالہ نمبر ۵ سنہ ۱۹۳۱ء
موضع نکاری پرگنہ چردہ ضلع بہرائچ سائل

بعدالت جناب سب جج صاحب بہادر اول مقام بہرائچ
بمقدمہ قرار دیے جانے دیوالیہ مسمی جھیرون ولد رکھی قوم کوری ساکن
بنام اودھورام وغیرہ
مہاجنان

ہرگاہ مسمی جھیرون کوری سائل نے عدالت ہذا مین بذریعہ عرضی مورخہ ۲ ماہ مئی سنہ ۱۹۳۱ء درخواست کی ہے کہ وہ حسب منشاء ایکٹ دیوالیہ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء دیوالیہ قرار دیا جاوے اور تمھارا نام فہرست دائنان مین جو مدیون مذکور نے داخل کی ہے پایا جاتا ہے لہذا تم کو اطلاع دی جاتی ہے کہ عدالت نے تاریخ ۳۱ ماہ اگست سنہ ۱۹۳۱ء واسطے سماعت درخواست مذکور الصدر اور لینے بیان مدیون کے مقرر کی ہے اگر تم کچھ اس معاملہ مین پیروی کرنا چاہتے ہو تو اصالتاً یا بذریعہ وکیل جو حال مقدمہ سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو حاضر ہو،

آج بتاریخ ۱۷ ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۱ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا،

دستخط حاکم بخط انگریزی
وقت حاضری بدفتر
۱۰ بجے سے ۴ بجے تک

مہر عدالت

آئندہ جنوری سنہ ۳۲ء کا نگار

تقریباً دو سو صفحات پر شائع ہوگا

اور

مخصوص ہوگا مطائبات غالب کیلیے، اسوقت تک غالب پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اسکی فلسفہ طرازی، معنی آفرینی، علوی خیال بلندی مفہوم اور دشوار پسندی سے متعلق تھا لیکن یہ راز ابتک سربستہ ہے کہ غالب کی شہرت و کامیابی کا حقیقی راز ان سب سے علیحدہ صرف اسکی شوخی، شوخ نگاری، بذلہ سنجی، اور مطائبات پسندی مین پنہان ہے جنھون نے اسکے سارے کلام کو خواہ وہ نثر ہو یا نظم فارسی ہو یا اُردو اک نہایت ہی اچھوتی قسم کی تنقید ملیح (Witty Criticism) مین تبدیل کر دیا ہے یہ مضمون ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے جس مین برسون کی محنت و کاوش کے بعد اسکے اردو کلام سے اور اسکی فارسی تصانیف سے اسکے رقعات سے اور تمام ان رقعات و حالات سے جو تذکرون اور خود اسکی تصانیف مین ملتے ہین غالب کی شوخی و شوخ نگاری پر تمام پہلوؤن سے نہایت ہی مکمل بحث کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ غالب کی شہرت و کامیابی کا تنہا راز صرف یہ تھا کہ وہ قدرت کی طرف سے نہایت شوخ و بذلہ سنج طبیعت لے کر آیا تھا اور اس کی ساری زندگی اسی حالت میں بسر ہوئی اور یہی وہ رنگ ہے جو تمام شعراسے اسے ممتاز بناتا ہے۔

سب سے پہلے ایک بسیط مقدمے کے ذریعے سے مثالین دیدیکر بتایا جائیگا کہ شوخی و ظرافت کی دنیا مین کتنی قسمین ہین غالب سے قبل کن کن شعرا نے اسے اختیار کیا، ہندستان مین اس رنگ نے کتنا نوع اختیار کیا اور پھر غالب کے اُردو فارسی کلام اور اسکے حالات و کوائف زندگی کا استقصا کر کے بتایا جائیگا کہ غالب حقیقتاً کس قدر دلچسپ انسان تھا اور کیسے کیسے نوادر ادب اور لطائف انشا وہ اپنے بعد چھوڑ گیا ہے۔

یہ کتاب اگر ایک طرف فن تنقید کی بہترین مثال ہے تو دوسری طرف ایسا مجموعۂ لطائف ہے کہ شاید ہی اس سے بہتر ذریعہ تفریح و دلچسپی کا کوئی اور ہو، یہ تصنیف غالب کے متعلق بالکل اچھوتی چیز ہوگی اور ہر شخص کے ذوق کو آسودہ کرنے والی، وہ حضرات جو غالب کا صحیح مطالعہ کرنا چاہتے ہین ان کے لیے اس کتاب کا دیکھنا ایک فریضۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے

یہ کتاب صرف نگار کے جنوری نمبر مین شایع ہوگی اور اسلیے اسکے حاصل کرنیکا تنہا ذریعہ یہی ہے کہ نگار کی خریداری کو جاری رکھیے اور آپ کے حلقۂ احباب مین جو حضرات اس کتاب کو حاصل کرنا چاہتے ہین انھین نگار کی خریداری پر آمادہ کیجیے

نیب

اے چاند!!

لیا ہے پیار

(۱)

کوئی موہوم فضا ہے تری دنیا اے چاند؟
یا ہم آغوشِ ضیا ہے تری دنیا اے چاند؟
کچھ تو معلوم ہو کیا ہے تری دنیا اے چاند؟

(۲)

حُسن آمادہ بیداد وہاں ہے کہ نہیں؟
عشق کو جرأتِ فریاد وہاں ہے کہ نہیں؟
سچ بتانا، کوئی ناشاد وہاں ہے کہ نہیں؟

(۳)

خوابِ فرزانگیٔ عقل کی تعبیر ہے کیا؟
اور حق گوئی منصور کی تعزیر ہے کیا؟
ترے معمورے میں انسان کی تقدیر ہے کیا؟

(۴)

زندگی کشمکشِ غم سے عبارت تو نہیں؟
آرزو نشترِ ہجران کی حکایت تو نہیں؟
جسے دل کہتے ہیں اک شعلۂ حسرت تو نہیں؟

(۵)

کوئی بلبل تو نہیں! دامنِ گلشن سے جدا!
بوئے گل بھی ہے اسیر ونکے نشیمن سے جدا؟
شمع بھی کیا؟ ہے دلِ نگار کے مدفن سے جدا؟

(۶)

محرمِ داغِ دلِ لالۂ احمر تو نہیں؟
خون فشاں، چاکِ گریبانِ گلِ تر تو نہیں؟
دلِ بلبل کے لیے لذتِ نشتر تو نہیں؟

(۷)

رگِ کہسار میں خونِ دلِ فرہاد بھی ہے؟
یادِ شیرین میں لبِ جو، کوئی شمشاد بھی ہے؟
قلۂ کوہ سے آتی کوئی فریاد بھی ہے؟

(۸)

محرمِ گوش ہیں مجنوں کی صدائیں کہ نہیں؟
کسی لیلےٰ میں ہیں لیلی کی وفائیں کہ نہیں؟
گونجتی بھی ہیں محبت کی نوائیں کہ نہیں؟

(۹)

تیرے ویرانوں میں آباد ہیں دیوانے بھی؟
اور مستانوں سے معمور ہیں میخانے بھی؟
میکدوں میں ترے ہیں عشق کے پیمانے بھی؟

(۱۰)

دلِ انسان کو دل آزار ستاتے تو نہیں؟
شمعِ غم خانۂ الفت کو بجھاتے تو نہیں؟
نقشِ آئینِ محبت کے مٹاتے تو نہیں؟

(۱۱)

تیرے معمورے میں ایسا بھی ہے گوشہ کوئی!
جس میں انسان کو ستائے نہ تمنا کوئی؟
اور نشتر نہ لگائے غمِ دنیا کوئی!

(۱۲)

کاش ایسا ہو تو اے چاند بلالے مجھکو
اُن سکون بخش فضاؤں میں بسالے مجھکو
اپنے آغوشِ محبت میں چھپالے مجھکو

روشن صدیقی

دریا

اپنے دامن میں لیے پرجوش ہیجانوں کا شور
ساحلوں سے عالمِ وحشت میں ٹکراتا ہوا
جنگلوں میں آندھیوں سے گفتگو کرتا ہوا
بجلیوں کے ارتعاشِ آگیں تبسم پرنثار
چلچلاتی دھوپ کے نازِ ادا سہتا ہوا
چاندنی راتوں کے جلووں پر فدا ہوتا ہوا
صبح کے پرنور جلووں کی ضیا سے فیضیاب
سبزہ زاروں کی حسین زلفوں کو سلجھاتا ہوا
سست ملاحوں کی ہمت کو جوان کرتا ہوا
مسکراتا، کھیلتا، ہنستا، مچلتا، جھومتا
قوتِ جہد و عمل کی آگ سینے میں لیے
مضطرب لہروں کے پیچ و تاب کا سرمایہ دار
اپنی رگ رگ میں چھپائے زندگی کی کائنات
شورشِ ہستی سے مل سکتا نہیں کیفِ جمود

تند موجوں کا تلاطم مست طوفانوں کا شور
پتھروں کو پائے استغنا سے ٹھکراتا ہوا
بادلوں کے قہقہوں کی جستجو کرتا ہوا
اودی اودی بدلیوں کے حسن کا آئینہ دار
تلملا کر مضطرب انداز میں بہتا ہوا
شمع رو تاروں کی محفل پر فنا ہوتا ہوا
شام کے خمخانۂ رنگیں کا مست و خراب
بے خودی کے کیف میں ہنستا ہوا گاتا ہوا!
ناخداؤں سے ذرا اٹکھیلیاں کرتا ہوا
وجد میں آکر کنارے کی جبین کو چومتا
بادۂ پرجوش دل کے آبگینے میں لیے
مقتضائے سوزِ فطرت سے سراپا اضطرار
کامیابی سے کیے جاتا ہے طے راہِ حیات
اضطرابِ زیست کا پیکر ہے دریا کا وجود

عدم

نگارستان

طالب باغپتی

ساون کی پُروائی نے کیا دُکھتی چوٹ دکھائی ہے
کیسے آنسو امنڈے ہین جب یاد تمھاری آئی ہے

آنکھ سے اوجھل ہو کر دل کو اپنی یاد دلائی ہے
دل ہی مین آ بیٹھے ہو یہ اور قیامت ڈھائی ہے

آہین مسرُور ہوئی جاتی ہین تم آئے یا سحر ہوئی؟
چاند کی رنگت پھیکی ہے تارون پہ اداسی چھائی ہے

اک سناٹا سا طاری ہے چار پہر کے تڑکے سے
خیر تو ہے! یہ آج مریضِ ہجر نے کیا ٹھہرائی ہے

دنیا کا دستور یہی ہے دل یون کب تک روئیگا؟
ان اچھی صورت والون نے کس سے بیت نبھائی ہے

یا دل چیخ اٹھا ہے، بجلی ٹوٹ پڑی تھرّا کر
جب ہمنے اپنی برسی برسائی آنکھ اُٹھائی ہے

جسم کے اندر دل کی بے چینی سے یہ معلوم ہوا
ساری چیزین اپنی ہین بس اک یہ چیز پرائی ہے

اب مرنا بھی مشکل ہے وہ پوچھ رہے ہین بالین پر
کس نے ان کو یاد کیا ہے؟ کیسی ہچکی آئی ہے

تم آخر کیون کڑھتے ہو، طالب کے دُنیا ہونے پر
دنیا اس پر ہنستی ہے، سب کہتے ہین سودائی ہے

خلیق فیض آبادی

عجب کیا ہو یہی تسکین کی صورت امتحان کر لون
کسی نامہربان کو اور بھی نامہربان کر لون

ندامت خیز ہے عریانیِ احساس کا حاصل،
مذاقِ عاشقی کو صورتِ جذبِ نہان کر لون

کہین موسم کا باعث وہ نہ سمجھین میری وحشت کو
بہار آنے سے پہلے جیب و دامن دھجیان کر لون

اُنھین گھر کر گھٹا مین بجلیون نے زور باندھا ہے
چلون صیاد کے گھر مین بنائے آشیان کر لون

خبر دردِ جگر کی ان کو پہنچانی ضروری ہے
نہین کچھ تو کسی دشمن کو اپنا رازدان کر لون

خلیق اُس بے وفا کے عہد و پیمان کا بھروسہ کیا
کہو تو یونہی تھوڑی دیر کو دل شادمان کر لون

احقر بہاروی (مرحوم)

کچھ بات ہی ایسی ہے جس سے دم بھر بھی اسے آرام نہیں
اب حال تو یہ ہے احقر کا گر صبح رہا تو شام نہیں

وہ بزم نہیں وہ لوگ نہیں وہ دور مے گلفام نہیں
پینے میں مزہ اب کیا آئے اک رند قدح آشام نہیں

کر طعن نہ مجھ پر اے واعظ ناداں یہ اچھا کام نہیں
پہونچے گی کبھی تو آہ مری کچھ عرش بتوں کا نام نہیں

پر خار بہت ہے دشت جنوں اے اہل جنوں سنتے ہو
ہٹ جاؤ یہاں سے ناداں تو مجنوں کا یہاں کچھ کام نہیں

دل خانۂ شادی تھا مرا آباد تھی اک دن یہ بستی
اب دیکھئے کیا ہو سینے کو اس گھر میں خوشی کا نام نہیں

قرباں کروں کیا چیز ہے یہ ہو دل جو پسند جاناں نہیں
مفلس کا سمجھ لو مال اس کو کیا دام اسکے کچھ دام نہیں

ہیں عاشق زلف روئے صنم بس عشق ہمارا مذہب ہے
اب رہتے ہیں ہم جس منزل میں واں کفر نہیں اسلام نہیں

آتی ہیں صدائیں کانوں میں ذرات یہی کہتا ہے کوئی
چلنے کیلیے تیار رہو رہنے کا یہاں کچھ کام نہیں

یہ کافر و مومن دیر و حرم اسرار ہیں اس کی حکمت کے
جو واقف ہے وہ واقف ہے یہ خاص ہیں باتیں عام نہیں

گھبرائے جو بندے محشر میں رحمت نے صدائیں بڑھ کر
لکھے سے ملا کر دیکھا ہے تم لوگوں پہ کچھ الزام نہیں

پوچھے جو کوئی احوال مرا کچھ بیچ کی حالت کہہ گذر دن
ایسا ہی فسانہ ہے جس کا آغاز نہیں انجام نہیں

کیا دور ہے کیسی گردش ہے اے چرخ کہن یہ بدعت تو
اغیار کو بخشے خم ساقی، یاروں کیلیے اک جام نہیں

اے چرخ ستمگر خوب ہمیں رسوائے زمانہ تو کرلے
ہم عشق کے بندے ہیں ہمکو اندیشۂ ننگ و نام نہیں

دن آگئے مرنے کے لیکن دل میں ہے ہوسناکی ابتک
اندھیر یہ کیسا ہے احقر کچھ فکر چراغ شام نہیں

باسط بسوانی

دو وار کر گئے ہیں، وہ ایک ہی نظر میں
کچھ دل میں ہیں ہمارے، کچھ درد ہی جگر میں

او پردہ کرنیوالے، او ہمسے چھپنے والے
آخر یہ بات کیا ہے، پھرتا ہے تو نظر میں

فرقت کی رات کاٹی، ہمنے تڑپ تڑپ کر
دل نے تجھے پکارا، سو بار رات بھر میں

کس کام کا تصور، جبتک نہو یہ حالت
میں ہوں تری نظر میں، تو ہو مری نظر میں

طاقت جو دل میں ہوتی، باسط شب جدائی
اک آہ ہم بھی کرتے، ڈوبی ہوئی اثر میں

حافظ غازیپوری

مرحبا لذت شیرینیٔ انکار کرم
ہر تمنا مری قربان ہوئی جاتی ہے

اللہ اللہ ترے حسن کی صد رنگ بہار
مری دیوانگی ارمان ہوئی جاتی ہے

کاش بڑھ جائیں ذرا درد جگر کی حدیں
لذت عشق بھی حسان ہوئی جاتی ہے

خامیٔ عشق کی تکمیل ہے احساس طلب
فطرت کفر بھی ایمان ہوئی جاتی ہے

رد کیے رد کیے نازوں سے تبسم اپنا
نکہت حسن پریشان ہوئی جاتی ہے

ہوش بھی اب نہیں مجبوری و مختاری کا
مشکل اک عمر کی آسان ہوئی جاتی ہے

حسن محدود نہیں عشق بھی محدود نہیں
کشمکش شوق کا سامان ہوئی جاتی ہے

شکوۂ بعد نہیں آرزوئے قرب نہیں
بیخودیٔ عشق پہ احسان ہوئی جاتی ہے

حسن کی شوخ نگاہی نے بھی بدلی کروٹ
پیچ و تاب درد سے درمان ہوئی جاتی ہے

بوند اک اشک ندامت کی تھی لیکن حافظ
گرمیٔ شوق سے طوفان ہوئی جاتی ہے

بسم اللہ

نگار

جلد ۲۰ فہرست مضامین ماہ ستمبر ۱۹۳۱ء شمارہ ۳

نگار

جلد ۲۰ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ء شمارہ ۳

مُلاحِظات

آئیے آج کی صحبت میں، اپنے ملک کے شاعروں سے کچھ باتیں کرلیں۔

مکہ کی ایک نوجوان لڑکی مدینہ آتی ہے اور سُنتی ہے کہ "عمر بن ابی ربیعہ" کا انتقال ہوگیا —— واضح رہے کہ جرمنی کے شاعر "شیلر" کی طرح "عمر بن ابی ربیعہ" بھی صرف "عورتوں کا شاعر" کہلاتا تھا، اس نے اپنی ساری عمر اس جمیل ونازک جنس کی مدح وتوصیف میں بسر کردی تھی اور عرب کی کوئی عورت ایسی نہ تھی جو اس کے شعر کی دیوانہ نہ ہو —— ہاں، تو جب اس لڑکی کو ابن ابی ربیعہ کی موت کا حال معلوم ہوا تو بری طرح رونے پیٹنے لگی، اور عربوں کی رسم کے مطابق اپنے نالۂ وشیون سے اس نے گویا صفِ ماتم بچھادی، وہ روتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔ کہ اب کون ہے جو ہماری جنس کے حسن وجمال کا راگ گائے گا۔ وہ سینہ کوبی کرتی تھی۔ اور چیخ چیخ کر کہتی جاتی تھی کہ اب کون ہے جو ہمارے صنف کی رعنائیوں اور دلربائیوں کی توصیف کرے گا

لوگ جمع ہوگئے اور اس سے کہا کہ "اسقدر غم نہ کر، عثمان بن عفان کا ایک پوتا موجود ہے۔ جو ابن ابی ربیعہ کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ وہ اس کمی کو پورا کرے گا" اس لڑکی نے یہ سنکر لوگوں سے کہا کہ "اس کا کوئی شعر تو مجھے سناؤ"

جب لوگوں نے اس کے اشعار سنائے تو اُس نے آنکھیں پونچھیں اور مسکرا کر بولی: "خدا کا شکر ہے کہ وہ اپنی یادگار قائم کئے بغیر اس دنیا سے نہیں گیا۔"

کیا ہزاروں میل کا طول و عرض رکھنے والے ہندوستان میں، سیکڑوں سال کی تاریخ شاعری میں سے کوئی ایک ایسا شاعر مجھے بتایا جاسکتا ہے۔ جس کے مزار پر محض اس کی شاعری کی وجہ سے کسی عورت نے دو پھول چڑھانے کی بھی زحمت گوارا کی ہو ــــ یہ امر یہاں خارج از بحث ہے کہ اس سرزمین کی عورت ہی ان جذبات کی پرورش کرنے کی اہل نہیں ہے یا یہ کہ فی الحقیقت یہاں کوئی شاعر ایسا پیدا ہی نہیں ہوسکتا

جاہلیۃ اور اوائل اسلام میں عورت و مرد دونوں آزادی سے باہم ملتے جلتے تھے، محافل و مجالس میں دونوں شرکت کرتے تھے، تبادلۂ نظر کے ساتھ، تبادلہ جذبات و خیالات میں بھی آزاد تھے۔ اور ان کی قومی فطرت، ملکی افتاد اور معاشری خصوصیت کے لحاظ سے یہ میل جول خطرہ سے خالی ہوا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ حطیم کعبہ میں بھی دونوں دوش بدوش نظر آتے تھے۔ اور طواف میں بھی ایک کا شانہ دوسرے کے شانہ سے رگڑ کھاتا تھا۔ جب ان میں تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ امارت و خودداری، غیرت اخلاق و تفریق مراتب کا جذبہ پیدا ہوا تو خلفا، و امراء نے ایک کو دوسرے سے جُدا کر دیا لیکن اس کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ یہ واقعہ بھی سننے کے قابل ہے ــــ سلیمان بن عبدالملک اموی کے خلافت کا زمانہ ہے، خالد بن عبداللہ القسری مکہ کا سردار ہے۔ کہ اس کے کانوں تک کسی شاعر کے یہ اشعار پہونچتے ہیں:-

یاحبذا الموسم من موقف وحبذا الکعبۃ من مسجد

وحبذا اللاتی یزاحمننا عند استلام الحجر الاسود

(کیسا پیارا ہے یہ موسم، کیسی پیاری ہے مسجد کعبہ اور کیسی پیاری ہیں وہ عورتیں جو حجر اسود کو بوسہ دینے کے وقت ہم کو گھیر لیتی ہیں)

خالد نے یہ اشعار سنکر کہا کہ خیر، اب آیندہ سے وہ تم کو نہیں گھیریں گی۔ اور حکم دیا کہ مرد و عورت میں تفریق کردی جائے اور اور سپاہی متعین کر دئے کہ کوڑے مار مار کر دونوں کو علاحدہ کیا جائے۔ چنانچہ یہ جدائی جو اُس وقت قائم ہوئی تھی ابتک باقی ہے اور مرد و عورت دونوں ساتھ مل کر یہ فریضۂ حج ادا نہیں کرسکتے۔ کیا ہندوستان کے ہزاروں شعلہ بیان شاعروں میں سے کسی ایک شاعر کا نام لیا جاسکتا ہے۔ جس کے کلام سے متاثر ہو کر کسی بادشاہ یا امیر نے شعائر دینی تو خیر بڑی چیز ہے۔ کسی معمولی رسم و رواج کو بھی بند کر دیا ہو ــــ یہ سوال یہاں پیدا نہیں ہوتا کہ اس ملک کے امراء و سلاطین ہی ایسے بےحس تھے۔ یا یہ کہ کسی شاعر کی زبان میں خدا نے یہ اثر پیدا ہی نہیں کیا

ایک غریب عرب کی تین لڑکیاں ہیں جو شکل و صورت کے لحاظ سے بھی قابل لحاظ نہیں اور ذہن و دماغ کے اعتبار سے بھی لائق اعتنا نہیں، گھر میں اتنا سرمایہ نہیں کہ سب کو بیٹھ کر کھلائے، شوہر ملتے نہیں کہ ان کے سپرد کر کے اس مصیبت سے نجات پائے۔ مجبوراً وہ ایک شاعر (اعشیٰ) کے پاس جاتا ہے اور اپنی داستان غم سناتا ہے۔ یہ فوراً اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور سوق عکاظ میں جا کر ایک قصیدہ ان لڑکیوں کی تعریف میں سناتا ہے۔ جس کا پہلا شعر یہ ہے:

لعمری لقد لاحت عیون کثیرۃ

الیٰ ضوء نار بالبقاع تحرق

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاعر قصیدہ ختم بھی نہیں کر چکتا کہ تینوں لڑکیاں شوہر حاصل کر لیتی ہیں

ایک طرف ان کی مدح و توصیف کا یہ اثر ہے اور دوسری طرف ان کی ہجو و مذمت کا وہ رعب کہ خلیفۂ وقت بھی ہزار درہم دے کر ایک شاعر سے اس کی ہجو خریدنے پر مجبور ہو جاتا ہے

کیا ہمارے یہاں کے شعراء میں سے کسی ایک قصیدہ گو کا نام ایسا بتایا جا سکتا ہے۔ جس نے، کسی اور کا تو خیر کیا ذکر ہے، خود اپنے ہی لئے کوئی بہتر رشتۂ ازدواج اپنی شاعری سے پیدا کیا ہو ——— یہ بحث بیکار ہے۔ کہ یہاں کی آبادی ہی اثرات مدح و ذم کے قبول کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی یا یہ کہ خود ہمیں دوسروں کو متاثر کرنے کا سلیقہ حاصل نہیں۔

عراق کا ایک تاجر مدینہ آتا ہے اور جتنے نقاب اس کے پاس ہیں سب فروخت کر دیتا ہے، صرف سیاہ نقاب باقی رہ جاتے ہیں۔ جن کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہ مسکین الدارمی شاعر کے پاس گیا جو کسی وقت اپنی عیش پرستیوں اور رنگ رلیوں کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ لیکن اب تائب ہو کر مسجد میں زاویہ نشین ہو گیا تھا۔ مسکین الدارمی نے کہا کہ میں کیا تیری مدد کر سکتا ہوں۔ تاجر نے کہا کہ "جس طرح ممکن ہو کوئی نہ کوئی تدبیر نکالئے ورنہ میرا تمام مال پڑا رہیگا۔ اور مجھے سخت نقصان ہوگا"۔ مسکین الدارمی نے تھوڑی دیر تامل کیا۔ اور پھر اپنا لباس زہد و تقویٰ اتار کر وہی رندانہ وضع اختیار کی۔ اس حال میں وہ مسجد سے باہر آ گیا۔ اور اپنے ایک دوست کو یہ تین شعر یاد کرا کے کہا کہ شہر کے مغنیوں کو جا کر سنا دو:۔

قل للملیحۃ فی الخمار الاسود ماذا فعلت براھب متعبد

قد کان شمر للصلاۃ ثیابہ حتیٰ خطرت لہ بباب المسجد

ردی علیہ صلاتہ وصیامہ لا تقتلیہ بحق دین محمد

(اس معشوقہ ملیح رنگ سے جو سیاہ نقاب ڈالے ہوئے ہے کہہ دو کہ یہ تو نے ایک فقیر گوشہ نشین کا کیا حال کر دیا۔ وہ تو اپنا دامن سمیٹ کر عبادت کے لئے ایک گوشۂ مسجد میں بیٹھ رہا تھا کہ تو دفعۃً سامنے آ گئی اور نماز و روزہ سب غارت کر کے رکھ دیا۔ پھر اے نازنین تجھے واسطہ ہے دین محمد کا، کہیں ایسا نہ کرنا کہ تو اس کو قتل کر دے۔)

جس وقت یہ اشعار مدینہ کے گلی کوچوں میں پہونچے تو سب کو یقین ہوگیا کہ دارمی واقعی کسی سیاہ نقاب والی پر عاشق ہو کر مسجد سے باہر آگیا ہے۔ اور تمام مدینہ میں کوئی ملیح رنگ لڑکی ایسی نہ رہ گئی جس نے اس تاجر سے سیاہ نقاب خرید کر اپنے چہرہ پر نہ ڈالا ہو۔ اس کے بعد سے سیاہ نقاب اس وقت کے فیشن میں داخل ہوگیا

کیا ہندوستان کے بے شمار شاعروں میں کوئی ایک ایسا پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس کے کلام سے متاثر ہو کر کسی ایک ہی شخص نے کوئی جدید وضع اختیار کر لی ہو ———— یہاں بھی اس گفتگو کا موقعہ نہیں کہ اس ملک کی آب و ہوا خود اس جوش کی پیداوار کی منافی ہے۔ یا یہ کہ یہاں کا شاعر خود اس کیفیت سے معرا ہوتا ہے

ہشام بن عبدالملک کی خلافت کا زمانہ ہے۔ اور خالد القسری عراق و خراسان کا حاکم ہے۔ اسوقت تک عام دستور تھا کہ مسجدوں میں بلند مینار ہوتے تھے۔ اور ان پر کھڑے ہو کر موذن اذان دیا کرتے تھے۔ اتفاق سے خالد کے کانوں تک کسی شاعر کے یہ اشعار پہونچ گئے:

لیتنی فی الموذنین حیاتی الھم یبصرون من فی السطوح
فیشیرون او تشیر الیھم بالھوی کل ذات دل ملیح

(کاش میں بھی ان موذنوں میں سے ہوتا جو اونچے میناروں پر کھڑے ہو کر آس پاس کے چھتوں پر نگاہ ڈالتے ہیں اور وہیں سے عشوہ طراز ملیح لڑکیوں سے اشارہ بازی کرتے ہیں۔)

ان اشعار کے سننے کے بعد ہی خالد نے حکم دیا کہ تمام مساجد کے مینار منہدم کر دیے جائیں

کیا ہندوستان کی تاریخ میں بھی کوئی واقعہ ایسا ملتا ہے۔ کہ کسی شاعر کے کلام نے انہدام مسجد و مینار تو خیر بڑی بات ہے کسی محراب میں ایک پردہ ہی کا اضافہ کر دیا ہو ———— یہ عذر اس جگہ قابل سماعت نہیں کہ اس کا سبب ملک کی غیرت دینی کا فقدان ہے یا خود شاعر کی بے اثر زبان

امیر معاویہ مصروف جنگ ہیں اور دشمن کے ہجوم نے اسقدر تنگ کر دیا ہے کہ سوائے فرار کے کوئی صورت نظر نہیں آتی، لیکن ٹھیک اس وقت ابن الاطنابہ انصاری کا یہ شعر ان کے کانوں تک پہونچتا ہے:

ابت لی عفتی وابی بلائی
واخذی الحمد بالثمن الربیح

وہ نئے جوش و خروش کے ساتھ حملہ کر کے دشمن کو شکست دیتے ہیں۔

رشید کو جس چیز نے نقفور ملک روم کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔ وہ صرف ایک یہ شعر تھا:

غدر الذی اعطاک نقفور — فعلیہ دائرۃ البوار تدور

خلیفہ سفاح ستر امرا بنی امیہ کیساتھ بیٹھا ہوا، کھانے کا انتظار کر رہا ہو کہ دفعۃً ایک شاعر اندر آتا ہے اور مظالم بنی امیہ کا ذکر کرکے یہ شعر پڑھتا ہے :۔

اذکروا مصرع الحسین وزیدا — وقتیلاً بجانب المہراس

سفاح یہ سنتے ہی برہم ہوجاتا ہے اور تمام امرا بنی امیہ کو قتل کرا دیتا ہے

ایکبار اسی خلیفہ سفاح کے پاس سلیمان بن ہشام اموی بیٹھا ہوتا ہو کہ سدیف شاعر آتا ہے اور کہتا ہے :

لا یغرنک ما تری من رجال — ان تحت الضلوع داءً دویا
فضع السیف وارفع السوط حتی — لا تری فوق ظہرہا امویا

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سفاح فوراً سلیمان کو قتل کرا دیتا ہے

رشید مالک بن طوق کے قتل کا حکم دیتا ہے جس وقت جلاد اس کو قتل کیلئے سامنے لاتا ہو اور گردن جھکا دیتا ہے۔ تو اس کی زبان سے یہ اشعار نکلتے ہیں :

اری الموت بین النطع والسیف کامناً — یلاحظنی من حیثما التفت
وما بی من خوف اموت وانی — لاعلم ان الموت شئی موقت
ولکن خوفی صبیۃ قد ترکتہم — واکبادہم من حسرۃ تتفتت

رشید رونے لگتا ہے اور کہتا ہو کہ " میں نے تیری لڑکی کا صدقہ تجھے معاف کردیا۔ جا اور اب پھر لوٹ کر یہاں نہ آنا "

عرب میں قبیلہ نمیر نہایت ہی معزز قبیلہ سمجھا جاتا تھا۔ اور اس قبیلہ کے افراد نہایت فخر و غرور سے اپنی نسبت اس قبیلہ سے ظاہر کرتے تھے، لیکن جب شاعر جریر نے اس قبیلہ کی ہجو میں یہ شعر کہا کہ

فغض الطرف انک من نمیر — فلا کعباً بلغت ولا کلابا

تو تمام ملک میں رسوائی کا یہ عالم ہوگیا کہ اگر لوگ اس قبیلہ کے کسی آدمی سے اسکا نام پوچھتے تو وہ نمیر کا نام چھوڑ کر کسی اوپر کی پشتوں کے نام بتاتا یہاں تک کہ آخر کار اس قبیلہ کا نام ہی دنیا سے محو ہوگیا

تاریخ شعر عرب اس قسم کے واقعات سے لبریز ہو۔ لیکن میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا ہندوستان میں کبھی کوئی شاعر ایسا ہوا ہو جسنے ہمارے مصالح دینی، ہمارے روایات اخلاقی اور ہمارے شعائر قومی و ملی پر کوئی ہلکے سے ہلکا اثر چھوڑا ہو ——— پھر جب میرے ان تمام سوالوں کا جواب نفی میں دیا جاتا ہے تو خدا کیلئے مجھے بتایا جائے کہ اس یاوہ گوئی، اس ژاژ خائی، میں وقت ضائع کرنا کیا معنی رکھتا ہے

غالب کا ایک شعر ہے ؎

حیف کہ من بہ خوں تپم ورز تو سخن رود کہ تو — اشک بدیدہ بشمری نالہ بہ سینہ بنگری

شاعر نے تو اسے اپنے مخصوص حالات محبت کے لحاظ سے کہا ہوگا لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اثر و نتیجہ کے لحاظ سے ہندوستان کے ہر شاعر پر فرداً فرداً شاید ہی کوئی شعر اس سے بہتر طور پر منطبق ہو سکے

ہر ملک کی آب و ہوا کا خاص اثر ہوتا ہے، ہر قوم کی سیاسیات کا مخصوص اقتضا ہوتا ہے اور ہر سرزمین اپنی معیشت و معاشرت کے ماحول کے لحاظ سے ذہن انسانی کی تربیت کرتی ہے۔ ہندوستان جو ہمیشہ سے غیر ملکی تاخت کا عرکز بنا رہا یقیناً یہاں کے لوگوں میں کوئی جذبۂ حماست پیدا نہیں کر سکتا تھا، اس لئے شاعری کا یہ قہرمانی عنصر جو دنیا میں انسان کو سکندر و چنگیز بنانے میں مدد دیتا ہے یوں ختم ہو گیا، لیکن مغلوبیت و مظلومیت سے جو کیفیت پیدا ہو سکتی تھی وہ ضرور انتہا کو پہونچ گئی۔ اور یہ نکبت و ذلت، انحطاط و ادبار قومی زندگی کا ایک ضرور جزو ہو کر رہ گیا حتیٰ کہ یہاں کا بہترین تغزل وہی مانا گیا جس میں سب سے زیادہ یاس و حرماں کا اظہار تھا۔ چنانچہ میر کو خدائے متغزلین کہنے کی علت یہی ہے کہ ان سے زیادہ کسی نے اپنی بیکسی و بیچارگی، محرومی و مایوسی کا اظہار نہیں کیا۔ یہاں کی حماسی شاعری کا بڑا سرمایہ مراثی کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن آپ کسی بہترین مرثیہ گو کا کلام اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس کا قابل ذکر حصہ وہی ہے جہاں اس نے فریاد و شیون سے کام لیا ہے۔ ورنہ جہاں اس نے جوش مردانہ سے کام لینے کی کوشش کی وہیں وہ منہ کے بل آرہا۔ یہاں تک کہ اگر وہ تلوار و اسپ کی تعریف کرتا ہے تو اس طرح گویا کسی عروس کا حال بیان ہو رہا ہے۔ اور جب وہ حرب و دفاع کا بیان کرتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ بچیوں کی پالی کا ذکر ہو رہا ہے۔

آپ مراثی کا تمام ذخیرہ ڈھونڈھ ڈالئے۔ لیکن آپ کو عربی کے اس ایک شعر کا بھی جواب کہیں نہ ملے گا۔

كأن مثار النقع فوق رؤسنا واسيافنا ليل تهاوى كواكبه

(یعنی میدان جنگ میں جو گرد و غبار سروں پر اٹ کر رہ گیا تھا تو اس میں تلواروں کی چمک ایسی نظر آتی تھی جیسے رات کو ستارے ٹوٹ رہے ہیں۔)

اس کا سبب یہ ہے کہ وہاں کے لوگ جنگ کی حقیقت سے واقف تھے، قبائلی غیرت و خودداری ان کو ہمیشہ حرب و دفاع کے لئے آمادہ رکھتی تھی۔ اور یہ وہاں روز کا منظر تھا کہ اگر کوئی عورت واتغلباہ کہکر ایکبار چیخ پڑی، تو سارا قبیلہ تلواریں سوت سوت کر باہر آگیا۔ اور جب تک انتقام نہیں لے لیا واپس نہیں گئے۔ پھر یہی وہ حقیقت تھی جو اُن سے یہ شعر کہلوا دیتی تھی کہ

فآبوا بالرماح مكسرات وأبنا بالسيوف قد انحنينا

(وہ لوگ واپس گئے اس طرح کہ ان کے تیرے ٹوٹے ہوئے تھے اور ہم واپس ہوئے اس حال میں کہ ہماری تلواریں خم ہو گئی تھیں)

اور اسی حقیقت کا فقدان تھا جو ہندوستان میں حماسی شاعری کو پیدا نہیں کر سکا حالانکہ اصل چیز یہی ہے

یہاں غزلگوئی کی کثرت رواج کا سبب یہی ہوا کہ اس صنف سخن میں پوری طرح جی کھول کر درد و کرب کا بیان ہو سکتا ہے، اور اس میں کلام نہیں کہ اس لحاظ سے یہاں کی قنوطی شاعری کا مقابلہ کوئی دوسری زبان مشکل سے کر سکتی ہے لیکن سوال

یہ ہے کہ اس سے ایک ایک یا قوم کو کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہے کہ ایک شخص اپنے مصائب جھیلنے کے لئے زیادہ صبر سے کام لینا سیکھ جاتا ہے۔ اور اگر بستر مرگ پر ہے تو جان زیادہ اچھی طرح دے سکتا ہے۔ لیکن کیا شاعری کا انتہائی مقصود یہی ہونا چاہئے۔ اور صرف اسی لئے اس کو اختیار کرنا چاہئے کہ ملک میں ایک جماعت "احدیوں" اور "مُرطچڑوں" کی پیدا ہو جائے

اِس وقت ملک جس دَور سے گزر رہا ہے وہ یقیناً نہضت وارتقا، کا آغاز ہے۔ جس کی بنیاد سیاسی انقلاب پر قائم ہوئی ہے، اس لئے ہمارے شعرا کا ایسے زمانہ میں صرف "ہائے، وائے" کی آواز بلند کرنا۔ ملک کے مقاصد کو نقصان پہونچانا ہے ضرورت ہے کہ لوگوں میں ان کی پستی و نکبت کا احساس پیدا کرکے، انسانی غیرت و خودداری کو اُبھارا جائے۔ اور چند دنوں کے لئے اس عشقبازی کو ترک کر دیا جائے۔ جس کا مدعی تو یہاں کا ہر شاعر ہے، لیکن عامل کوئی نہیں۔

مَیں غزل گو حضرات کی توہین نہیں کرتا۔ اور نہ ان کی اہمیت کو کسی طرح کم کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ مدعا صرف یہ کہنا ہے کہ غزل گوئی کا صحیح زمانہ ایک قوم پر اس وقت آتا ہے۔ جب وہ انتہائی نکبت و ذلت تک پہونچ جائے، یا انتہائی عروج و ارتقا کی حالت میں ہو۔ لیکن ان دونوں زمانوں میں بھی اس کی افادیت مشتبہ ہے۔ کیونکہ زوال کے دَور میں وہ فنا کے حدود سے قریب تر کرنے والی ہوتی ہے۔ اور عروج کے زمانہ میں زوال کی خبر دینے والی۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس فطری استعداد و قوت سے کوئی بہتر کام نہ لیا جائے۔ اور وہ ملکۂ شعر جو صرف غزل گوئی میں صرف کیا جاتا ہے، ملک و قوم کی فلاح و اصلاح کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔

کیا وہ ہاتھ جو ماتم کے لئے اُٹھتے ہیں۔ اُن ہاتھوں سے جُدا ہوتے ہیں، جو تیغ و تبر کا وزن اٹھاتے ہیں۔ جب گھر میں آگ لگتی ہے تو اہل تدبیر گریہ و زاری میں وقت صرف نہیں کرتے بلکہ پانی فراہم کرنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں۔ پھر کیا ہندوستان کے لئے اس سے زیادہ نازک وقت کوئی اور آنے والا ہے۔ جب ہم اس کی خدمت کے لئے آمادہ ہونگے۔ اور کیا ہمارے شعرا پر مادر وطن کا کوئی حق نہیں ہے۔ جو ایسے نازک وقت میں اُن سے طلب کیا جائے۔

اس وقت سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے اور جو مسلمانوں میں تقریباً مفقود ہے۔ وہ جذبۂ وطنیت ہے۔ اس لئے یہ ساعت زلف و عارض کے ذکر کی نہیں ہے۔ بلکہ اُس غیرت و خودداری کو بیدار کرنے کی ہے۔ جس کے فقدان نے ہم کو دنیا میں ذلیل و رسوا کر رکھا ہے۔

افسوس ہے کہ شاعری کے ذکر نے ملاحظات میں کسی اور اظہار خیال کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی اور بعض ایسے سیاسی مسائل جنکا ذکر ضروری تھا رہ گئے۔ کوشش کروں گا کہ ماہ آیندہ میں اس کی تلافی ہو سکے ——

میں ستمبر کے اول ہفتہ میں کشمیر جا رہا ہوں تاکہ وہاں کے موجودہ اضطراب کا مطالعہ کرکے ان دو متضاد بیانوں پر تنقید کر سکوں۔ جو حکومت و پبلک کی طرف سے شائع ہو رہے ہیں

—— نیاز ——

مطالعۂ حدیث صحیح کی روشنی مین

ایامِ صیام

مذاہب مین روزہ کسی طبّی اصول کو مدنظر رکھ کر فرض نہین کیا گیا اور نہ درحقیقت روزہ رکھنے سے مذہب کا خیال اصلاح معدہ تھا اس سے مقصود محض امتثال امر ربانی ہے اور مذہب کی ایک عظیم الشان یادگار کو ہرسال تازہ کرنا ورنہ ظاہر ہے کہ نہ انسان بھوکا رہ کر خدا پر کوئی احسان کرتا ہے اور نہ بزعم صوفیہ اس سے روحانیت پیدا ہوتی ہے اسلام ایسی روحانیت یا رہبانیت کا قائل نہین اگر بھوکا رہنے سے معدے پر کوئی اچھا اثر پڑتا ہے تو وہ ایک اتفاقیہ نتیجہ ہے ورنہ جہان تک مسلمانون کے روزے کا تعلق ہے یہ فائدہ مدنظر نہین، اسلام مین روزے کی غرض وغایت اس قدر ہے کہ خدا نے ایک حکم دے کر ہماری آزمایش کی ہے کہ ہم کس قدر اس کے حکم کی تعمیل کرکے اس کے وجود کا اقرار عملی طور سے کرتے ہین مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے یا یہ سمجھو کہ وہ انسان کی اس عادت کو جانتا ہے کہ بندہ ہر امر کی علت وغایت پر کج بحثی کرنے لگتا ہے اس لیے روزے کا یہ سبب بتا دیا کہ وہ اسلام کی اس عظیم الشان واقعہ کی یاد تازہ کرتا ہے جب کہ خدا نے قرآن کو انسان پر نازل کیا،

قبل اس کے کہ مین اس مضمون پر کچھ لکھون یہان ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے بعضونکا خیال ہے کہ مین حدیث کی مخالفت اس وجہ سے کرتا ہون کہ اس مین اکثر یہودیت کی تقلید ہے لیکن یہ الزام میرے اوپر غلط ہے کیونکہ مین نے یہ کبھی نہین کہا کہ حدیث کی بعض باتین یہودیون کے احکام سے ملتی ہین اور اس واسطے وہ یہودیون سے لی گئی ہین، مین تو یہود ونصاریٰ کے مذاہب کو خود ایسی ہی مسخ شدہ صورت سمجھتا ہون جیسی اہلِ فقہ وحدیث کے اسلام کی ہے بلکہ میرا کہنا یہ ہے کہ قرآن کے بہت سے احکام یہود کے مسائل کی روشنی مین بخوبی جانچے جاسکتے ہین یعنی میرے نزدیک اہلِ اسلام کا معیار قرآن ہے، اگر قرآن کی تائید مین توریت، انجیل وحدیث سے تو ہم کو قرآن کے معنی سمجھنے مین بے انتہا مدد ملتی ہے اور اگر اس کی تائید مین قرآن نہین ہے تو میرے نزدیک

وہ سب اختراعی باتین ہین، یقیناً قرآن نے جو اسلام پیش کیا ہے یہی اسلام یہود و نصاریٰ پر پہلے پیش کیا گیا تھا اور یہود و نصاریٰ ہین جو باتین قرآن کی تائید مین ہین وہی دراصل ان نوشتون مین الہامی تھین ورنہ باقی الحاقی لیکن اگر احکام شریعت وقصص انبیاء مین یہود ایسی باتین بیان کرتے ہین جو قرآن مین مذکور نہین یا اس کے برخلاف ہین اور بالکل وہی باتین حدیث مین پائی جاتی ہین تو اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حدیث نے وہ باتین براہ راست یہود سے لین لیکن برخلاف اس کے اگر قرآن کے احکام کی تائید یہود و نصاریٰ کے نوشتون سے ہوتی ہے اور اسکے خلاف حدیث مین ہے تو ہم حدیث کی تردید مین قرآن کا بیان کافی نہ سمجھین گے بلکہ ہم کو یہ بھی کہنے کا حق ہوگا کہ قرآن کے جو معنے صحیح ہین وہ وہی ہین جو قرآن کی عبارت سے ظاہر ہین اور یہ معنی یہود کے نوشتون مین بھی ہین، اس لیے یقیناً قرآن کے جو معنی حدیث نے لیے ہین وہ صحیح نہین اس کی دو مثالین خود آیت صیام مین مل سکتی ہین،

یہود مین انطار کا وقت رات کا ہوتا تھا جب کہ آسمان پر ستارے نکل آتے تھے اور روزہ اسوقت سے رکھا جاتا تھا جب کہ وہ سفید تاگے کو سیاہ تاگے سے پہچان لیتے تھے، قرآن کے الفاظ بالکل صاف ہین جو اس طریقہ کی تائید کرتے ہین:-

(۱) ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ — پھر رات تک روزہ پورا کرو

(۲) وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ — اور کھاؤ اور پیو یہان تک کہ کالا تاگا سفید تاگے سے صبح (کے سبب سے) دکھلائی دینے لگے

باوجودیکہ مسلمانون ہی مین ایک فرقہ یعنی اہل تشیع کا قرآن کے صاف الفاظ کی پیروی کرتا ہے لیکن سنی لوگ ایک پر تو بالکل عمل ہی نہین کرتے اور دوسرے کے معنی غلط لیتے ہین اور غضب یہ ہے کہ دونون امور کی تائید مین حدیثین لاتے ہین، ظاہر ہے کہ ایسی حدیثین قبول نہین ہو سکتین ہر شخص جس کو ذراسی عربی آتی ہے وہ لیل کے معنی وہی سمجھے گا جب کہ خوب رات ہو کر ستارے نکل آئین، شام یا مغرب کے وقت پر لیل کبھی بولا نہین جاتا، اسی طرح خیط ابیض و خیط اسود سے رات کی سیاہی اور صبح کی سفیدی مراد لیتے ہین اور اس کی تائید مین ایک دو روایتین بھی پیدا کر دی ہین:-

مثلاً سہل بن سعد سے روایت ہے کہ جب آیت کلوا واشربوا حتے یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود نازل ہوئی تو لوگ روزہ رکھنے کا ارادہ کرتے وقت رات کو اپنے پاؤن مین سفید اور سیاہ ڈورے لپیٹ لیتے تھے اور کھاتے پیتے رہتے تا وقتیکہ ان دونون مین تمیز ہونے لگتی - (صحیحین)

یہان تک تو غنیمت تھا کیونکہ یہ وہی بات تھی جو قرآن کا مدعا تھا، مگر عدی بن حاتم کی روایت دیکھو جو مسلم مین ہے عدی بن حاتم نے دو رسّے اونٹ باندھنے کے ایک سفید اور ایک سیاہ اپنے تکیے کے نیچے رکھے

اور جب رات کا کچھ حصہ باقی رہ گیا تو ان کو دیکھنے لگے مگر کچھ تمیز نہ کر سکے جب صبح ہوئی تو رسول اللہ صلعم کی خدمت مین حاضر ہو کر عرض کیا کہ مین نے اپنے تکیے کے نیچے خیطِ ابیض و خیطِ اسود رکھے تھے مگر کچھ تمیز نہ کر سکا، آپ نے فرمایا بے شک اگر تمھارے تکیے کے نیچے خیطِ ابیض و خیطِ اسود آگئے تو تمھارا تکیہ ضرور بڑا لمبا ہوگا ایک نے عرض کیا یا رسول اللہ خیطِ ابیض و خیطِ اسود کیا ہے کیا وہ دو دورے نہین ہین، آپ نے فرمایا تمھاری گردن ضرور بڑی لمبی ہوگی کہ تم نے دونون خیط دیکھ لیے اس کے بعد آپ نے فرمایا نہین بلکہ اس سے رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی مراد ہے

کیا یہ حدیث قرآن کی تائید واقعی کر رہی ہے مین نے آج تک کبھی آسمان پر سفید و سیاہ دھاری بنتے نہین دیکھی اور اگر بنتی ہوگی تو عرب کے آسمان کے لیے مخصوص ہوگی وہان کی فضا خشک آب و ہوا کی وجہ سے نہایت صاف و شفاف ہوتی ہے مگر جن ممالک مین صبح کے وقت کہرا پڑتا ہے اور آسمان کو کوئی آٹھ بجے دن تک نہین دیکھ سکتا وہان اس پر کیسے عمل ہو سکتا ہے، مین نے اکثر ممالک کی سیاحت کی ہے عراق و عجم مین بھی صبح کے وقت یہ خطوط نظر نہین آتے اب بتائیے کہ اگر قرآن کا یہ مطلب ہے تو بالکل فضول بات کہی گئی اور یا پھر اس سے یہ مراد لی جائے کہ جب خوب دھوپ نکل آئے اور کہرا غائب ہو جائے اس وقت تک آدمی کھائے پیے مگر قرآن کسی عجمی کی بنائی حدیث نہین ہے، اس نے وہی طریقہ روزے کے شروع کرنے کا بتایا ہے جو یہود کو بتایا تھا اور اس زمانے مین بجائے اس کے ہمارے لیے گھڑیال ہے جو وہی سفید و سیاہ تاگے کے معنی کو پورا کر رہا ہے سمجھ مین نہین آتا کہ قرآن کی عبارت مین کیا پیچ تھا جو اس کی اس طرح تاویل کی گئی۔

اسی طرح قرآن کے بہت سے الفاظ ہین جن کی لغو تاویل کی جاتی ہے جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حدیث رسول اللہ صلعم کا قول تو درکنار کسی اہل زبان کا بھی قول نہین ہے مثلاً کشف الساق کی حدیث ملاحظہ کرو یا ابن عباس کے غسل رجلین والی حدیث کو جس مین کھلی ہوئی غلطی موجود ہے۔

قبل نزول قرآن سب سے بڑی یادگار کا وہ دن سمجھا جاتا تھا جبکہ بنی اسرائیل نے فرعون کے جبر و استبداد سے نجات پائی تھی اور اسی لیے یہود مین تشریق یعنی ساتوین مہینے کی دسوین تاریخ کو ایک روزہ اس یادگار مین رکھا جاتا تھا، کہا جاتا ہے کہ جب رسول اللہ صلعم مدینے تشریف لائے تو آپ نے فرمایا کہ ہم کو یہود سے زیادہ اس کا حق ہے کہ اس روزے کو رکھین، اور آپ نے یہ روزہ رکھا مگر یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ہجرت کے دوسرے سال آپ پر وہ احکام صیام نازل ہوئے جو سورۂ بقر کے ۲۳ ر رکوع مین بالتفصیل درج ہین انکا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانون کو رمضان کے چند دنون مین روزے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے جیسے ان سے پہلے کے مسلمانون کو دیا گیا تھا، تاکہ وہ لوگ خدا کے حکم کی تعمیل سے یہ ظاہر کرین کہ وہ خدا سے ڈرتے ہین، مریض و مسافر اپنے روزہ کی قضا دوسرے دنون مین پوری کر لین اور جو مریض و مسافر صاحبِ استطاعت بھی ہون وہ رمضان کے ایام صیام مین

فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلا کر دے سکتے ہین اور اس کے ساتھ قضا رکھین تو اچھا ہے اور نہ رکھین تو یہ فدیہ کافی ہے
اگر مسلمان معتکف ہو تو رات کو اپنی بیوی سے مباشرت کر سکتا ہے ورنہ نہین

اِس مضمون مین مجھے صرف ایام صیام سے بحث کرنا ہے، سب سے پہلے قرآن کی وہ آیت جس مین روزے کے دنون کی تعیین کی گئی ہے قابلِ غور ہے

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۔ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ — مسلمانو! جس طرح تم سے پہلے اہل کتاب پر روزہ رکھنا فرض تھا تم پر بھی فرض کیا گیا تاکہ تم خدا سے ڈرو۔ گنتی کے چند روز ہین۔

"اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٌ" کے کیا معنی گنتی کے چند روز اگر تم کو عربی آتی ہے تو غالباً تم جانتے ہو گے کہ ایام بر وزن افعال جمع ہے یوم کی اور یہ جمع قلت ہے، یعنی وہ جمع تعداد مین ڈھائی سے نہ بڑھے اگر اہل عرب سے ملنے کا اتفاق ہو تو تم کبھی کسی عرب کو ثلاثین ایام کہتے ہوے نہ سنو گے یا عشرین یا خمسین ایام یعنی ۳ سے ۹ دن تک تو یوم کی جمع ایام بول سکتے ہین اس کے آگے اہل نجد کو تو مین نے بولتے ہوے نہین سنا، اہل حجاز پھر گو البتہ مین نے تیس سے کم کے اعداد پر ایام لاتے ہوے سنا ہے مگر ان کی عربی سوقی ہے مستند نہین ہو سکتی، واقعہ یہ ہے کہ جس طرح ہمارے یہان سات دن کو ہفتہ اور تیس دن کو مہینہ کہتے ہین ایسے ہی عرب مین بھی بولا جاتا ہے لیکن جب ایاما معدودات ہے تو پھر وہ کسی طرح ۳ سے کم اور ۹ سے زیادہ پر بولا ہی نہین جاتا۔ خود قرآن شریف مین بھی اکثر جگہ ایاما معدودات آیا ہے۔ اور وہان اس سے تین دن مراد لیے گئے۔

یہود کا یہ پرانا عقیدہ تھا کہ ان کی قوم تین دن سے زیادہ دوزخ مین نہ رہے گی، حضرت مسیح کی نسبت بھی کہا جاتا ہے کہ وہ تین دن دوزخ مین رہے۔ قرآن مین آیا ہے

وقالوالن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ (بقرہ-۸) — اور وہ کہتے ہین کہ ان کو آگ نہ چھوے گی مگر چند دنون کے لیے

معلوم نہین جلالین نے اس کی تفسیر مین چالیس روز کہان سے پیدا کیے حالانکہ یہود کا عقیدہ ۳ دن کا ہے اور ایاما معدودہ کو چالیس دن کہنا خود غلط ہے، اسی طرح قرآن شریف مین ہے۔

وَاذْکُرُوا اللّٰہَ فِیْ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ — اور اللہ کو ان تین دنون مین یاد کرو (جو ایام تشریق کہلاتے ہین)
فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَا اِثْمَ عَلَیْہِ — اور جو اس سے پہلے دو دن

تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ رمضان[1] کے روزے ابتدا مین تین ہی دن کے فرض تھے اسلیے معلوم ہوا کہ ایاما معدودات سے ۳۰ دن ہرگز نہین مراد ہو سکتے نہ معنًا نہ تاریخًا پھر یہ ۳۰ روزے کہان سے آئے قرآن سے؟ نہین، قرآن کی جو لوگ سند پیش کرتے ہین ان کا عروۃ الوثقیٰ یہ آیت ہے۔

---

[1] سیرۃ النبوی علامہ شبلی نعمانی جلد دوم صفحہ ۱۱۱

شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن هدی للناس وبینت من الهدی والفرقان فمن شهد منکم الشهر فلیصمه (بقرہ)

رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کا رہنما ہے اور اس میں ہدایت (حق و باطل کی تمیز کے کھلے کھلے حکم ہیں۔ تو تم میں سے جو شخص اس میں موجود ہو تو چاہیے کہ روزہ رکھے

اگر رمضان کے پورے مہینے کا حکم اس آیت میں ہوتا تو یقیناً اس آیت کے بالکل بعد و من کان مریضاً او علی سفر فعدۃ من ایام اخر میں ایام کا لفظ نہ بولا جاتا بلکہ من شهر اخر بولا جاتا کیونکہ رمضان کے مہینے ہی میں رمضان کی قضا کبھی رکھی نہیں جاتی یہ ضرور ہے کہ شہر رمضان بولا گیا ہے لیکن اس کا تعلق انزل فیه القرآن سے ہے اور یہ صحیح نہیں کہ قرآن رمضان کی پہلی تاریخ سے جو اترنا شروع ہوا تو عید کے روز تک اترتا رہا۔ قرآن لیلۃ القدر میں نازل ہوا، اور اگر مسلمانوں کو اس یادگار کے قائم کرنے کا کبھی خیال ہوتا تو یقیناً آج اس کی تاریخ میں اختلاف نہ ہوتا فمن شهد منکم الشهر فلیصمه کے معنی دو ہی ہو سکتے ہیں ایک جو میں نے اوپر لکھے ہیں یعنی تم میں سے جو شخص اس مہینہ میں موجود ہو تو چاہیے کہ روزے رکھے دوسرے یہ کہ تم میں جو شخص رمضان کا مہینہ یا چاند دیکھے تو روزے رکھے، اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سے لوگ تھے جو رمضان کا چاند نہیں دیکھ سکتے تھے[1] ظاہر ہے کہ یہ مریض و مسافر کیلیے نہیں، مردوں کے لیے نہیں اس لیے تم یہی کہو گے کہ اس سے صرف یہ مراد تھی کہ رمضان کے دنوں کی تعیین کر دی جائے مگر اس کی تعیین نہایت شرح و وضاحت سے پہلے ہی کر دی گئی ہے اور تعیین کے لیے جو جملہ آیا ہے وہ اس خیال و قول کے خلاف ہے، تمھارے پاس صرف یہ جواب ہو سکتا ہے کہ فقہ اور حدیث نے تیس روزے مقرر کیے ہیں اور ہم قرآن کو نہیں جانتے قرآن کا سمجھنا اور اپنی طرف سے معنی پیدا کرنا ہمارے لیے ضلالت و گمراہی اور رجعت الی جہنم[2] ہے جیسا ہم نے حدیث میں پایا، جیسا ہمارے فقہا نے سمجھا وہی صحیح ہے اگر قرآن میں اس کے خلاف ہے تو وہ حکم منسوخ ہے اس لیے اب ساری بحث دو نقطوں پر منحصر رہ جاتی ہے۔

۱۔ آیا قرآن کا پہلا حکم قرآن یا حدیث سے منسوخ ہے،

۲۔ آیا حدیث سے تیس دن کے روزے ثابت ہیں۔

اول کیا قرآن کی پہلی آیت صیام منسوخ ہے؟ میں نے اس موضوع پر علیحدہ معاندت قرآن و اہل قرآن کے عنوان سے قرآن کے ناقص، منسوخ اور محروف ہونے پر بحث کی ہے، شان نزول یعنی قرآن کو بالکل ایک وقتی اور موسمی چیز سمجھنا اس پر بھی میں نے اسی مضمون میں بحث کی ہے علمائے اسلام نے تو قرآن کو صرف قرآن ہی کی آیتوں سے منسوخ نہیں مانا ہے، بلکہ حنفیہ کے نزدیک حدیثیں بھی آیت قرآنی کی ناسخ ہو سکتی ہیں اور قرآن کی آیتوں میں آپ کو جہاں دو آیتوں میں

---

[1] وہ لاپ لینڈ کے رہنے والے ہیں اور میرے نزدیک قرآن کی مراد انہیں ملک کے رہنے والوں سے جہاں طلوع ہلال کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا

[2] من فسر القرآن برایہ فلیتبوأ مقعدہ فی النار

ذرا بھی اختلاف ظاہر نظر آیا تو فوراً ایک آیت ناسخ اور دوسری منسوخ سمجھ لی گئی اور اس طرح پچاسون آیتون پر نسخ کا حکم لگا دیا گیا، ابن عربی نے اس تعداد کو کم کر کے اکیس آیتین منسوخ قرار دین اور شاہ ولی اللہ نے پانچ پر اکتفا کی لیکن جو بات ناسخ و منسوخ مین سب سے زیادہ عجیب و غریب ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مین ایک ہی عبارت کے اندر ناسخ و منسوخ کو تسلیم کیا جائے اس کے یہ معنی ہوے کہ مبتدا کے جملے مین پہلے ایک حکم دیا گیا اور خبر کے جملے مین مبتدا کے جملے کی تردید کر دی گئی، اگر ناسخ و منسوخ کی یہ صورت مانی جائے تب تو اس مین کوئی شک نہین کہ آیات صیام مین ایام معدودات منسوخ ہے اور فمن شہد منکم الشہر ناسخ ہے مگر غالباً یہ قول قابل اعتما د نہین ہے اور قرآن کے ساتھ سخت بے ادبی ہے کہ میرے خیال مین اس عقیدے کا رکھنے والا اپنے کو مسلمان کہلانے کا کوئی حق نہین رکھ سکتا، اور وہ یقیناً نصاری اور غیر مسلم کا ہم نوا ہے اور قرآن کا دشمن ہے، ناسخ و منسوخ کے لیے یہ ضرور فرض کرنا پڑ گیا کہ ایک حکم است مین کچھ عرصے تک جاری رہا اور جب اس حکم کا تجربہ ہو لیا اور حکم قابل تبدیل نظر آیا تو دوسری آیت سے بدل دیا گیا، گو کہ یہ عقیدہ بھی خدائے واحد کے علم و خبر پر سخت حملہ ہے لیکن اس مضحکہ خیز قول سے کہ قرآن ایک ہی جملہ مین اپنی تردید کرتا ہے بدرجہا بہتر ہے،

صیام کی آیتون مین پہلے یہ دیکھو کہ آیا فی الواقع یہ آیتین ایک زمانہ کی ہین یا مختلف زمانون کی ان آیتون کو یا ایہا الذین سے لے کر کذلک یبین اللہ آیاتہ للناس لعلہم یتقون تک خوب غور سے دیکھو تم کو معلوم ہوگا کہ فی الواقع اس مین دو مختلف مگر قریب کے اوقات کی آیتین جمع ہین یعنی پہلے وقت کی آیت تو یا ایہا الذین سے شروع ہو کر لعلکم تشکرون پر ختم ہو گئی جس مین ایام معدودات و فمن شہد منکم الشہر دونون آ گئے، اس کے بعد دوسری بحث واذا سالک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی ولیومنوا بی لعلہم یرشدون سے حد فاصل قرار پائی، اور پھر ارشاد ہوتا ہے احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الی نسائکم ھن لباس لکم وانتم لباس لھن علم اللہ انکم کنتم تختانون انفسکم فتاب علیکم وعفا عنکم فالئن باشروا ھن وابتغوا ما کتب اللہ لکم

آخری آیتون سے بہت سی باتین شک لانے والی پیدا ہوتی ہین۔ اول تو یہ کہ مسلمانون کو پہلے یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ رمضان کے دنون مین رات کو بھی عورتون سے علحدہ رہین لیکن مسلمانون پر یہ حکم شاق ہوا اور اللہ تعالی نے اس کو معاف کر دیا، اب پہلا سوال تو یہ ہوگا کہ یہ حکم قرآن مین کہان تھا جس کا قرآن نے یہان حوالہ دیا ہے لیکن چونکہ ایسا حکم کہین نہین ہے اس لیے ماننا پڑے گا کہ قرآن کے احکام مجمل ہوا کرتے تھے رسول اللہ صلعم ان کی صراحت فرما دیا کرتے تھے، جب روزہ فرض کیا گیا تو کسی نے شاید پوچھا کہ رات کو عورتون سے

مباشرت بھی کی جاے حالانکہ اس قسم کے سوال کرنے کی ممانعت مسلمانون کو ہوچکی تھی کیونکہ یہود نے اس قسم کے سوالات پیش کرکے گاے کے ذبح کرنے مین حجتین پیدا کی تھین اور اسی لیے آن حضرت نے ان کو تادیبًا فضول سوالات سے منع کردیا، یہود کا قاعدہ تھا کہ وہ روزے کی راتون مین اپنی بیویون سے علحدہ رہتے تھے مسلمانونکو روزہ رکھنے مین یہود کا طریقہ بطور نمونے کے ملا انھون نے بھی رات کو بیویون سے علحدہ رہنا شروع کیا، اور چونکہ عرب مباشرت پر بہت حریص ہین وہ اپنے نفس پر قابو نہ پاسکے اور یہ سمجھ کر کہ اب روزہ رکھنا بے سود ہے، روزہ چھوڑ دیا کرتے تھے ایسی صورت مین ان کو بتادینا ضروری تھا کہ رات مین عورتون سے مباشرت بجز اس صورت کے کہ ایک شخص اعتکاف مین ہو جائز ہے، دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی روزے تین ہی دن کے تھے تو اس قدر کم تھے کہ اس قسم کی کوئی حجت پیدا نہ ہوسکتی تھی اس لیے یہ بھی قرین قیاس نہین کہ روزے واقعی تین دن کے تھے۔ یہ اعتراض وزنی ہے اور مین اس اعتراض کو تسلیم کرتا ہون میری ذاتی رائے ہے اور اس کو مدنظر رکھ کر مین حدیث کا مطالعہ کرون گا کہ درحقیقت رمضان کے روزے آخری دس دن کے روزے ہین اور اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے میرے دلائل یہ ہین۔

۱- عام طور سے اعتکاف رمضان کے آخری عشرے مین کیا جاتاہے اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ اعتکاف اور روزے ساتھ ساتھ ہوتے تھے یعنی جس طرح حج وعمرہ دو چیزون سے مل کر حج پورا ہوتاہے اور اسمین اختیار ہے کہ خواہ حج کرے یا عمرہ اور اس کے بھی دس ہی روز ہین اسی طرح رمضان مین اعتکاف اور روزہ ساتھ ساتھ نو دس روز ہوتے تھے، روزے کے ساتھ اعتکاف کرے تو اچھا ہے اور اگر اعتکاف نہ کرے بلکہ صرف روزہ رکھے تو بھی حرج نہین، البتہ جب اعتکاف کرے تو رات کو عورتون سے مباشرت منع ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

ولا تباشروھن وانتم عاکفون فی المسٰجد۔

۲- یہودیون مین قاعدہ تھا کہ وہ روزہ جس دن کی یاد مین رکھتے تھے، وہ ان کی عید کا دن ہوتا تھا، اور اس کی خوشی منانے کے لیے اس سے تین چار روز قبل سے روزے رکھتے تھے تاکہ عید کے روز کھانے پینے مین زیادہ خوشی حاصل ہو اس قدر تسلیم ہے کہ قرآن کے نزول کی یادگار مین روزہ رکھنے کا حکم مسلمانونکو دیا گیاہے اور حق تو یہ ہے کہ یہ دن اسلام کی اتنی عظیم الشان یادگار ہے جس کے مقابلے مین ولادت رسول، معراج، فتح بدر وغیرہ سب ہیچ ہین اور اس یادگار کو قائم رکھنا یقینا ایسی صورت مین بہتر ہوسکتا جب کہ اس کے سامنے کوئی ایسا عمل مسلمان اختیار کرتے جیسا روزہ ہے، پھر چونکہ اس قدر مسلم ہے کہ لیلۃ القدر جسمین قرآن نازل ہونا شروع ہوا، رمضان کے اخیر عشرہ مین ہے، اس لیے بہتر یہی تھا کہ ۲۱ر رمضان سے روزہ شروع کیا جاے، اس مین نزول قرآن کی یادتازہ کرنے کا زیادہ موقع تھا، اور لیلۃ القدر کی اختلافی تاریخون پر بھی حاوی ہے۔

۳- مسلمانون مین چار فرائض ہین ۲ روزانہ اور ۲ سالانہ یعنی صلوٰۃ و زکوٰۃ روزانہ اور روزہ و حج سالانہ سالانہ فرائض کے اختتام پر عید منائی جاتی ہے۔ حج مین سالانہ فرائض کے لیے نو یا دس دن مقرر ہین جو ذی الحجہ کی پہلی تاریخ سے شروع ہوتے ہین، اسی طرح رمضان کے روزے اور اعتکاف کے دس دن ہین اور ان کے بعد عید منائی جاتی ہے دونون کی مماثلت عید سے نہین بلکہ دنون سے بھی ہے۔

۴- ایام معدودات کا اشارہ ثابت کر رہا ہے کہ روزے دس سے زیادہ ہو نہین سکتے اور اسلیے درحقیقت روزے جو مسلمانون پر قرآن کے رو سے فرض معلوم ہوتے ہین وہ ۲۱ رمضان سے ۲۹ رمضان یا صبح عید تک ہین جس مین بعض اعتکاف کرتے ہین اور بعض صرف روزے پر اکتفا کرتے ہین۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا حدیث سے تیس دن کے روزے ثابت ہین۔ سو قبل اس کے کہ حدیث کا مطالعہ شروع کرون مجھے ایک بار پھر مسلمانون کو تاریخ پر توجہ دلانی ہے اگر تم انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مین Fasting یعنی روزے کا مضمون پڑھو تو تم کو معلوم ہوگا کہ عیسائیون مین ایام صیام پر بعد کو عجب اختلافات پیدا ہوے، بعضون نے ہفتے مین جمعے اور سنیچر کو روزہ رکھنا فرض جانا، بعضون نے سال مین تین دن یعنی ایسٹر کے دنون مین جب مسیح نے صلیب پائی تھی اور جب وہ زندہ ہوے تھے یعنی جمعے سے لے کر اتوار تک لیکن عیسائیت جب رہبانیت کی طرف بہت شدت سے مائل ہوئی تو اس کے ساتھ ہی روزے کے لیے چالیس روز بہ تقلید حضرت مسیح مقرر ہو گئے، عربون کو سب سے پہلے یہ روزے دار رہبانیین شام و فلسطین مین ملے، انھون نے دیکھا کہ قرآن کے روزے ان کے روزون کے آگے کوئی حقیقت نہین رکھتے اور یہ لوگ فخر کرتے تھے کہ ان مین خداپرستی مسلمانون سے زیادہ ہے اس لیے عربون کو یقیناً تیس دن کے روزے رکھنے کا خیال ہردم رہا ہو گا۔

اب آئیے حدیثون پر غور کرین۔ حدیث مین سب سے زیادہ جو چیز مجھے حیرت مین ڈالنے والی ہے وہ ثواب کی کمی و زیادتی کا بیان ہے کہ مثلاً ایک شخص اپنے کمرے مین نماز پڑھے تو اس کو ایک من کا ثواب ملیگا، مسجد مین پڑھے تو پچاس من، بیت المقدس مین پڑھے تو ہزار من، اور مکے مین پڑھے تو لاکھ من ثواب، معلوم نہین اس مقدار مین کیا راز تھا، کیا مسلمان بغیر اس لالچ کے نیک کام کرنے کے اہل نہین تھے، لہذا مین ان حدیثون کو تو قطعی چھوڑ دون گا جو روزے کی ترغیب مین پائی جاتی ہین، اگر کسی کو ان کا شوق ہو تو احیاء العلوم مین امام غزالی کی روایتون کو پڑھے جس مین خدا کے فضل سے تمام صحیح و ضعیف حدیثین ہماری آسانی کے لیے جمع کر دی گئی ہین، مجھے صرف ان حدیثون پر غور کرنا ہے جن مین ایام صیام کی تعیین کی گئی ہے اور ان مین بھی وہ جو رسول اللہ صلعم کی طرف سے حکم کی صورت مین ہون، کیونکہ نماز کی طرح رسول اللہ صلعم نوافل روزے بھی بکثرت رکھتے تھے جو عامۃ المسلمین پر شاق ہین اور اسکی تقلید ہر شخص سے ہو ہی نہین سکتی کیونکہ ہر شخص نبی نہین ہو سکتا، اور اس سے روزے کے دنون کا وجوب نکالنا صحیح نہ ہو گا

اس کے بعد میرا دعویٰ ہے کہ حدیث مین تیس دن کے روزے کا کوئی حکم صریح میری نظر سے نہین گذرا، مین مسلم و ابن ماجہ کے باب صیام کی تمام متفرق احادیث یہان جمع کیے دیتا ہون قارئین خود نتیجہ نکال لین۔ البتہ ابوہریرہ کی وہ حدیث جو ابن ماجہ مین ہے رمضان کے تیس روزے پر دلالت کرتی ہے مگر اس حدیث سے کوئی حکم مستنبط نہین ہوتا صرف اس سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ نفلاً تمام ماہ رمضان روزہ رکھتے تھے، وہ حدیث یہ ہے

ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے مین ۲۹ دن کے روزے رکھے اور زیادہ سے زیادہ تیس دن

ایک حدیث اور ابوہریرہ کی ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور جب پھر چاند دیکھو تو افطار کرو پھر اگر ابر آجائے تم پر تو تیس روزے پورے کرو۔

معلوم ہوتا ہے کہ راوی نے یقیناً آخر کا جملہ بڑھا دیا ہے کیونکہ ابن عمر کی حدیث مین جو بالکل اسی طرح کی ہے یہ الفاظ نہین ہین۔ پہلی کے معنی صاف ہین یعنی مہینے کے آخر ہفتے مین چاندنی رات رات کے آخر حصے مین شروع ہوتی ہے پس رات کے آخری حصے سے روزہ شروع کرکے رات کو جب تک آسمان پر تارے نکل آئین روزہ رکھو، دوسرے چاند سے غلط فہمی ہو جاتی ہے مگر حدیث مین ایسی لفظی غلطیان بے انتہا ہین، مثال کے لیے جابر کی وہ دو حدیثین دیکھو جو غزوۂ بطن بواط کے واقعات کو بیان کرتی ہین اور ایک دوسرے کی کس قدر ضد ہین اور دونون نے کس قدر وھیل مچھلی کی ماہیت کے بارے مین مبالغے سے کام لیا ہے جس کی تردید ہر زمانے مین وھیل مچھلی کو دیکھ کر ہو سکتی ہے، دونون حدیثین مسلم مین موجود ہین، طویل حدیث کو چھوڑے دیتا ہون جس کا جی چاہے وہ مسلم مین دیکھ لے۔ مختصر حدیث کا یہان ترجمہ کیے دیتا ہون۔ یہ بھی واضح رہے کہ جنگ بطن بواط کا یہ قصہ واقدی نے جو مسلم سے پہلے کی کتاب ہے اور یقیناً اس سے زیادہ مستند ہے بیان نہین کیا۔

رسول اللہ صلعم نے ہم کو بھیجا اور ہمارا سردار ابوعبیدہ بن الجراح کو کیا تاکہ ہم ملین قریش کے قافلے سے اور ہمارے توشے کے لیے ایک تھیلہ کھجور کا دیا اور کچھ آپ کو نہ ملا، تو ابوعبیدہ ہم کو ہر روز ایک کھجور دیا کرتے تھے ابوالزبیر نے کہا مین نے جابر سے پوچھا تم ایک کھجور مین کیا کرتے تھے، انہون نے کہا اس کو چوس لیتے تھے بچے کی طرح پھر اس پر تھوڑا پانی پی لیتے تھے وہ ہم کو سارے دن رات کو کافی ہو جاتی اور ہم اپنی لکڑیون سے پتے جھاڑتے پھر اس کو پانی مین تر کرتے اور کھاتے۔ جابر نے کہا ہم گئے سمندر کے کنارے تک وہان ایک لمبی سی چیز نمودار ہوئی۔ ہم اس کے پاس گئے دیکھا تو وہ ایک جانور ہے جس کو عنبر کہتے ہین۔ ابوعبیدہ نے کہا یہ مردار ہے پھر کہنے لگے نہین ہم اللہ کے رسول کے بھیجے ہوے ہین اور اللہ کی راہ مین نکلے ہین اور تم بے قرار ہو رہے ہو تو اس کو کھا لو، جابر نے کہا ہم وہان ایک مہینے رہے اور ہم مین سو آدمی تھے ایسا گوشت کھایا کیے یہانتک کہ ہم موٹے ہوگئے

جابر نے کہا تم دیکھو ہم اس کی آنکھ کے حلقے میں سے چربی کے گھڑے کے گھڑے بھرتے تھے آخر ابو عبیدہ نے ہم میں سے تیرہ آدمیوں کو لیا وہ سب اس کی آنکھ کے حلقے کے اندر بیٹھ گئے اور ایک پسلی اس کی پسلیوں میں سے اٹھا کر کھڑی کی پھر سب سے بڑے اونٹ پر پالان باندھا اور وہ اس کے تلے سے نکل گیا اور ہم نے اسکے گوشت اُبال کر توشے کے لیے جمع کیا جب ہم مدینے آئے تو رسول اللہ صلعم کے پاس آئے اور یہ قصہ بیان کیا، آپ نے فرمایا وہ اللہ تعالٰے کا رزق تھا جو تمھارے لیے اس نے نکالا تھا، اب تمھارے پاس کچھ ہے اس کا گوشت تو ہمکو بھی کھلاؤ جابر نے کہا ہم نے اس کا گوشت آپ کے پاس بھیجا، آپ نے اس کو کھایا ۔

اس حدیث کے بعد وہ لمبی حدیث پڑھو جو عبادہ بن الولید نے جابر سے روایت کی ہے اور جس میں رسول اللہ صلعم کے کئی معجزات کا بھی ذکر ہے اور آخر میں اس جانور کے نکلنے کا، دونوں واقعات ایک ہی میں ہیں، مگر دونوں میں بے انتہا اختلاف ہی ایسا اختلاف کہ ایک روایت قطعی اور راز سر تا پا جھوٹ ثابت ہو جاتی ہے۔اور دونوں روایتیں خود اس طرح جھوٹ ہیں کہ وھیل کی آنکھ نہ اتنی بڑی ہوتی ہے کہ اس میں تیرہ[۱۳] آدمی سما جائیں اور نہ اسکی پسلی اتنی بلند ہوتی ہے کہ اونٹ اس کے نیچے سے نکل جائے ۔

اسلیے اگر حدیث میں جا بجا ایسی روایتیں رمضان کے تیس روز دن کے باب میں نظر آویں تو انسے گھبرانا نہ چاہیے کیونکہ ادنیٰ غور و تامل سے ان کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔

میں نے جو حدیث بیان کی ہے وہ ابو ہریرہ کی ہے اور ابن ماجہ و مسلم میں پائی جاتی ہے اسکا موازنہ اس حدیث سے کرلو تم کو فوراً اندازہ ہو جائے گا کہ ابو ہریرہ کی حدیثوں کی کیا وقعت ہے۔

۱۔ ابو ہریرہ سے روایت ہے قسم ہے کعبہ کے رب کی یہ بات کہ جو کوئی صبح کرے جنابت کی حالت میں وہ افطار کرے، میں نے نہیں کہی بلکہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے کہی (ابن ماجہ)

باوجود یکہ ابو ہریرہ جامۂ کعبہ پہن کر حلف لے رہے ہیں مگر یہ حدیث بالکل مردود ہے۔عائشہ و ام سلمہ ہی سے اس کی تردید نہیں ہوتی بلکہ حنفیہ، شافعیہ و مالکیہ سب متفق ہیں کہ یہ قول صحیح نہیں ۔

۲۔ رسول اللہ صلعم ہر سال میں اخیر رمضان کے دس دن میں اعتکاف کیا کرتے تھے (بخاری)

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا کے کسی دن میں عبادت کرنا اللہ تعالیٰ کو اتنا پسند نہیں جتنا ان دس دنوں میں، اور ایک دن کا روزہ سال بھر کے روزوں کے برابر ہے، اور ایک رات عبادت کرنا شب قدر کے برابر ہے (ابن ماجہ)

۴۔ آن حضرت صلے اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخر دس دن میں اعتکاف کرتے نافع نے کہا عبداللہ ابن عمر نے مجھے وہ جگہ بتلائی جہاں آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کیا کرتے تھے ۔ (مسلم انس عمر)

۵۔ آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان شریف کے آخر دس دن مین ایسی کوشش کرتے تھے عبادت مین ویسی اور دنون مین نہین کرتے تھے (مسلم، عائشہ)

۶۔ دوسری روایت مین ہے جب رمضان کا آخر عشرہ آتا تو رات کو جاگتے اور ازار کو مضبوط باندھتے (یعنی عورتون سے ہم بستر نہ ہوتے)

۷۔ حضرت عائشہ صدیقہ سے پوچھا گیا رسول اللہ صلعم کے روزون کے بارے مین، انھون نے کہا آپ شعبان کے سارے مہینے کے روزے رکھتے تھے یہان تک کہ اس کو ملا دیتے تھے رمضان سے (ابن ماجہ عائشہ)

۸۔ میرے اوپر رمضان کے روزون کی قضا ہوتی تھی تو مین اس کو نہ کرتی یہان تک کہ دوسرے سال کا شعبان آجاتا، عائشہ (ابن ماجہ)

۹۔ جابر کی روایت ہے کہ مین نے آنحضرت صلعم کو دیکھا کہ آپ روزے سے جمعہ کے دن نہوتے

نمبر ۷، ۹ کی حدیثون پر غور کرو اس کے بالکل مخالف روایت ابوہریرہ کی ہے جب ایسی ظاہر باتون مین حدیث کا یہ اختلاف ہو تو سوائے قرآن کے اور کہان قابل اطمینان بات بسر ہو سکتی ہے۔ بہرحال میرا ایمان ہے کہ قرآن مین ایام صیام کی کافی وضاحت (ایاما معدودات) مین موجود ہے، اور کوئی قول قرآن کے اس حکم کو منسوخ نہین کرسکتا، حدیث سے اس قدر تائید ہوتی ہے کہ آپ نے رمضان کے آخری عشرہ مین خصوصیت سے روزے کا اہتمام کیا ہے، چونکہ آخری عشرہ مین نزول قرآن کی ایک تاریخ بھی ہے اور آخری عشرہ پر ایام معدودات کا محل بھی ہوسکتا ہے اس لیے رمضان کے روزے اتنے ہی فرض ہین

قرآن سے ایام صیام کے دو اور نکتے

تم نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ قرآن مجید نے روزہ کا حکم دیتے ہوئے یہ کیون کہا کما کتب علی الذین من قبلکم یہ قطعی ثابت ہے کہ یہودیون مین کم سے کم ایک دن اور زیادہ سے زیادہ تین دن کے روزے سالانہ تھے لہٰذا قرآن کا قول صحیح نہین (نعوذ باللہ) کہ تم پر یہودیون کی طرح روزے فرض کیے گئے، اگر اس سے زیادہ لطیف نکتہ ایام معدودات کے روزون کا یہ ہے کہ روزہ قرآن کے نازل ہونے کی یاد مین رکھا جاتا ہے کبھی تم نے اس پر غور کیا کہ قرآن کے نازل ہونے مین وہ کیا خصوصیت تھی کہ اس کی یادگار روزہ رکھنے سے منائی جائے۔ بات یہ ہے کہ قرآن ایک عہدنامہ ہے خدا اور اس کے بندون مین یعنی عہد خداوندی یہ ہے کہ اگر تم ایمان لاؤگے اور نیک عمل کروگے تو ہم تم کو دنیا مین بھی ممتاز رکھین گے اور آخرت مین بھی، یہی عہد خدا کا یہود و نصاریٰ سے تھا، چنانچہ اب تک یہود و نصاریٰ اپنی الہامی کتابون کو عہد نامۂ جدید و عہد نامۂ قدیم کہتے ہین۔ ہم اس عہد سے کس قدر عہدہ برآ ہوئے ہین۔ خدا کو خوب معلوم ہے اس نے خود کہہ دیا کہ انسان نے ایسے گران قدر عہد کو اٹھالیا ہے کہ پہاڑ بھی ہوتا تو متحمل نہ ہوتا، یقیناً انسان جاہل اور کمزور ہے

اس سے عہد ٹوٹے گا اور ٹوٹے گا اور اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت ہے کہ اس عہد کو بار بار توڑنے کی وجہ سے ہم پر عذاب نہین کرتا بلکہ اپنی نہایت مہربانی سے روزہ رکھا کر ہمارے اس عہد کے توڑنے کا کفارہ ہر سال دلواتا ہے اور اور قرآن مین عہد توڑنے کا کفارہ کیا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

لا یواخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم ولکن یواخذکم بما عقدتم الایمان فکفارتہ اطعام عشرۃ مساکین من اوسط ما تطعمون اھلیکم او کسوتھم او تحریر رقبۃ فمن لم یجد فصیام ثلثۃ ایام ذلک کفارۃ ایمانکم اذا حلفتم واحفظوا ایمانکم کذلک یبین اللہ لکم ایتہ لعلکم تشکرون۔ (سورۃ مائدہ ایت ۸۹)

حق گو

کاجل، سرمہ، چورن، منجن

ایڈیٹر صاحب **نگار** نے خود ان دواؤن کا اطمینان کرکے اپنی راے ان کے مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظات مین ظاہر کی ہے دوسری تازہ سند ملاحظہ ہو:۔ سرمہ ضعف بصارت کے لیے بہت مفید ہوا، ایک شیشی اور بھیج دیجیے،

سید رضا زیر سو پنتھ پوت محل

کاجل، آشوب، سرخی، ضعف بصارت کیلیے ازبس مفید ہے، ایک ڈبیہ جو ایک شخص کیلیے سال بھر کو کافی ہے۔ قیمت عہ

سرمہ، یہ بیش بہا سرمہ چالیس دن مین تیار ہوتا ہے اس مین نہ ممیرہ نہ کوئی جواہر بلکہ معمولی سرمہ ہے جسکو جڑی بوٹیون کے عرق مین پیس کر تیار کیا جاتا ہے اس کے فوائد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جالا، دھند، موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے اور بار بار آزمایا ہوا ہے قیمت فی پڑیہ عہ علاوہ محصول

چورن، یہ وہ اکسیری چیز ہے جسکا ہر گھر مین رہنا ضروری ہے، پیٹ کا درد، قبض، نفخ، ریاح کا پیدا ہونا، سوء ہضم، دستون کا آنا یہ سب یکلخت اسکے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ کیسا ہی شدید درد پیٹ مین ہو ایک چٹکی کھالینے سے جاتا رہتا ہے۔ قیمت فی ڈبہ ۸ تولہ عہ علاوہ محصول

منجن، اس کی ادنیٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوے دانت جم جاتے ہین۔ قیمت فی ڈبہ ۸ تولہ عہ علاوہ محصول وغیرہ

نوٹ:۔ سب چیزین منگوانے والون کو محصول ڈاک معاف۔

م بیگم ذریعہ دفتر نگار لکھنؤ

ٹیلی فون نمبر ۶۷

مسٹر زیدی جب ولایت سے واپس آئے تو اور نشے تو خیر جلد ہرن ہوگئے لیکن یہ یقین ان کے دل سے کسی طرح محو نہ ہوا کہ بیوی تو نام ہے صرف اس عورت کا جو جلسے مین تقریر کر سکے، ادبیات پر تنقید کی اہلیت رکھتی ہو نظم و نثر مین مصنفانہ حیثیت کی مالک ہو، رقص کرنے والیون کی جماعت مین بہترین بنڈلی پر انعام حاصل کر سکتی ہو اور اگر کبھی ضرورت ہو تو گرلس اسکول کی معلمہ بھی بن سکے اور ماسٹر ٹیلر بھی یعنی اس سلسلہ مین خیر سے یہی ایک بات ایسی تھی جو ان کی اہلی و معاشرتی زندگی کے لیے مفید ہو سکتی تھی۔

کامل ایک سال تک انھون نے مختلف رسالون اور اخبارون مین اشتہار دیا، احباب و اعزہ کے ذریعے سے جستجو کی مختلف شہرون کی مختلف آزاد سوسائٹیون مین خود جا کر اس جنس نایاب کو تلاش کیا جب کہین جا کر مس لطیفہ سہروردی ان کے ہاتھ آئین۔

مس سہروردی بمبئی کے اس خاندان کی جوہر تابندہ تھین جو بہت عرصہ ہوا بہ سلسلۂ تجارت ایران سے ترک سکونت کر کے بمبئی آ گیا تھا اور مغربی تہذیب و معاشرت کے حصول مین جس کی شہرت تقریباً ایک صدی سے قائم تھی مسٹر اشفاق حسین سہروردی مس سہروردی کے والد ہرچند مالی حیثیت سے کوئی ممتاز درجہ نہ رکھتے تھے لیکن مغربی تہذیب مین ان کی واقفیت و مہارت اس قدر مشہور تھی کہ کوئی بلند سوسائٹی ایسی نہ تھی جہان انکی رسائی نہ ہو اور شاید ہی کوئی تقریب تہذیب جدید کی ایسی ہوتی ہو جس مین ان سے مشورہ نہ طلب کیا جاتا ہو — گورنر کا ڈنر ہو یا کسی آنریبل ممبر کا، کوئی الوداعی جلسہ ہو یا خیر مقدم کا اس کا اہتمام انھین کے سپرد ہوتا تھا اور اس مین کلام نہین کہ جس وقت وہ اپنی صاحبزادی مس سہروردی کے ساتھ محفل کے سلیقے و ترتیب مین مصروف ہو جاتے تو خدا جانے کیون ہر جگہ اور ہر چیز مین آپ ہی آپ ایک خاص قسم کا حسن نظر آنے لگتا۔

مسٹر سہروردی کے متعدد لڑکیان ہوئین لیکن سب کی سب جوان ہونے سے پہلے ہی مر گئین، صرف ایک صاحبزادی مس لطیفہ زندہ رہین، اور یہ کہنا غالباً خلاف حقیقت نہ ہوگا کہ شاید ان کی تمام مرنے والی بہنین اپنے مستقبل کا حسن و شباب انھین کے سپرد کر گئی تھین

مس لطیفہ کی تعلیم تو صرف الیف۔ اے تک ہوئی تھی لیکن چونکہ ہوئی تھی وہ بالکل مغربی ماحول مین اور اس کے بعد کافی زمانہ انھون نے یورپ مین بھی بسر کیا تھا اس لیے ان کا شماران برقیارون مین سے تھا جو یورپ مین بھی ہمیشہ حلقۂ امراہی کے اندر گردش کرتے نظر آتے ہین اور مشرق مین بھی اندور، رامپور اور کشمیر سے کم کسی جگہ کو اپنی سیر کا جولانگاہ نہین بناتے۔

یورپ مین مس سہروردی کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے تقریبًا بین الاقوامی قسم کا حسُن ان مین پیدا کر دیا تھا، ان کی اسٹیج کی زندگی سے متعلق تھا۔ جب وہ صرف شوق کی بنا پر بغیر حصول اُجرت آرکسٹرا مین اپنے غیر معمولی جمال اور اپنی سحر آفرین موسیقی کا مظاہرہ کیا کرتی تھین مشہور تھا کہ ان کے جوتے کی نوک اسی طرح سبک وسریع جنبش کے ساتھ تختۂ رقص کو چھوتی تھی جیسے ہرن کے پاؤن چوکڑی بھرنے کے وقت۔ اور جب برقیہ کی رنگین روشنیان ان کے قامت خوش اندام پر ڈالی جاتین تو ایسا معلوم ہوتا کہ یا تو وہ پرستان کی کوئی مخلوق ہے جو راستہ بھول کر دنیا مین آگئی ہے یا سمندر کی کوئی دیوی جو دنیا والون کو ڈبو دینے کے لیے سطح آب پر آگئی ہے۔ اس کے بعد مس سہروردی کی شہرت کا دوسرا دور وہ تھا جب امپیریل فلم کمپنی نے انھین تصویر متحرک بننے کی دعوت دی اور یہ واقعہ ہے کہ اگر انکی وجہ سے دو نوجوانون مین باہم جنگ کی نوبت نہ آجاتی اور اس بدنامی کی بنا پر وہ ہندوستان کی واپسی پر مجبور نہ ہوتین تو اُن کے اسٹار بننے مین چند ہفتون سے زیادہ کی دیر نہ تھی —— وہ کلبون اور جلسون مین بھی شریک ہوتین تقریرین کرتین اور اپنی خطابت کی داد ہر شخص سے حاصل کرتین۔ ادبیات کے متعلق غالبًا اس قدر کہہ دینا کافی ہوگا کہ یورپ کے مشہور رسائل مین ان کی نظمین اکثر شایع ہوتی تھین اور افسانہ نویسی مین بھی ان کی ذہانت کافی شہرت حاصل کر چکی تھی۔

مسٹر زیدی کو یہ دولت بے پایان کس طرح ہاتھ آئی یہ ایک ایسا سوال ہے کہ بعض اوقات خود جناب زیدی کی بھی سمجھ مین نہ آتا اور ان کو اپنی خوش بختی پر خواب کا سا دھوکا ہونے لگتا۔ مسٹر زیدی سویلین افیسر تھے ایک ہزار سے زاید کا مشاہرہ پاتے تھے، شہر کی تمام بلند سوسائٹیون مین عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے یہ سب سہی لیکن مس لطیفہ جو اپنے اکتسابات وخصوصیات کے لحاظ سے کسی شاہانہ ہاتھ کی بجا طور پر تمنی ہو سکتی تھین کس طرح ان سے مالوف ہوگئین۔ مسٹر زیدی تنہائی مین تو اس کو صرف خدا کی دین سمجھتے تھے، لیکن احباب مین بیٹھ کر اسے وہ اپنے تصرفات حسن وتہذیب سے تعبیر کرتے تھے، کیونکہ واقعی وہ حسین بھی تھے اور حد درجہ شائستہ و خوش اطوار بھی۔

مسٹر قاسم بھائی کی تقریب شادی مین جب اول اول ان دونون کا تعارف ہوا تو ان مین سے کسی کو یہ وہم وگمان بھی نہ تھا کہ ایک وقت وہ آئے گا جب یہ رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوجائین گے ——

مسٹر زیدی کا بیان ہے کہ سب سے پہلا واقعہ جسے ان کے قلب نے متاثر کیا مس لطیفہ کی وہ تقریر تھی جو انھون نے عقد ثریا کلب کے عام مجمع مین عورت کے مستقبل پر کی تھی اور مس لطیفہ کا کہنا یہ ہے کہ ان پر سب سے زیادہ اثر جس بات نے کیا یہ تھی کہ جب مسٹر زیدی فینسی ڈریس ہال مین بہترین وضع و آرایش کی پارسی خاتون بنکر آئے تو وہ خود بھی نہ سمجھ سکی کہ واقعی یہ کوئی عورت نہین ہے بہرحال سبب یہ ہو یا کوئی اور اس مین شک نہین کہ ہوا سب کچھ بہت اچانک اور اس قدر جلد کہ تمام شہر حیرت زدہ سا ہوگیا۔

عروس نو کا حجاب، نئی جگہ جانے کی جھجک، اجنبیون مین دفعۃً پہنچ جانے کی شرم، ہفتون تک گھونگھٹ نہ کھولنا اور سمٹے سمٹائے بیٹھے رہنا —— ان باتون کا وہان کیا ذکر تھا اگر کوئی تغیر لطیفہ سہروردی کی زندگی مین ہوا تو صرف اتنا کہ وہ ایک مکان سے اٹھ کر دوسرے مکان مین آگئین۔ مسٹر زیدی سے ظاہری بے تکلفی پہلے ہی سے تھی اب اخلاقی و معاشرتی یگانگت بھی پیدا ہوگئی اور جب ایک ماہ کے بعد دونون بنگلور سے ہنی مون کا زمانہ بسر کرکے پونا مین آئے جو مسٹر زیدی کا مستقر تھا تو دونون ایسا محسوس کر رہے تھے کہ شاید دونون کی ملاقات برسون کی ہے، اور جذبات مین کوئی گرمی باقی نہین رہی۔

لطیفہ سہروردی لاکھ ذہین و طباع سہی مگر اس مین شک نہین کہ اس نے مسٹر زیدی کے بعض خصوصیات سمجھنے مین غلطی ضرور کی۔ یا یہ کہ خود اس نے اپنی قوتِ اقتدار کا اندازہ صحیح نہین کیا، یقیناً وہ حسن و جمال کے لحاظ سے ایک بدیعۂ قدرت تھی اس مین کلام نہین کہ تہذیب و تعلیم کی حیثیت سے وہ بہترین نتیجۂ تربیت تھی اور ظاہر ہے کہ اس پر مٹنے اور مٹتے رہنے کے لیے اس سے زیادہ زبردست دلیل ایک مرد کے پاس اور کیا ہوسکتی تھی لیکن وہ شاید اس سے واقف نہ تھی کہ انسان نہ حسن و جمال کے لیے بے تاب ہوتا ہے نہ آرایش ملبوس و زیبایش گیسو پر مٹتا ہے بلکہ وہ تڑپتا ہے صرف اس لیے کہ فلان چیز اس کی نہین —— اور جس قدر زیادہ یقین کسی شے کے بُعد یا عسیرالحصول ہونے کا ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کی بیتابیان بڑھتی جاتی ہین اس لیے مشکل ہی سے چار ماہ کا زمانہ گذرا ہوگا۔ کہ مس سہروردی نے اپنی ازدواجی زندگی کی بے نمکی کو محسوس کرنا شروع کیا اور ایک ہلکے قسم کا استغنا دونون مین پیدا ہوگیا۔ لیکن چونکہ مسٹر زیدی اس قسم کے صاحبون مین سے تھے جن کو ہر وقت یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ وہ اپنے ہندی الاصل ہونے کا داغ کیونکر مٹائین، دوسری طرف لطیفہ سہروردی ان عورتون مین سے تھین جنھین اگر شادی سے قبل مس صاحب اور شادی کے بعد میم صاحب نہ کہا جائے تو برہم ہوجاتی ہین، اسلیے اگر ادھر زیدی صاحب ایک بہترین صاحب بننے کی ایکٹنگ کر رہے تھے تو دوسری طرف لطیفہ سہروردی بھی لوگونکی نگاہون مین اپنے آپ کو بالکل معیاری میم صاحب ظاہر کرنا چاہتی تھین، بنگلے کے اندر تنہائی مین خواہ ایک کو دوسرے سے

گفتگو و اختلاط کی نوبت ہفتوں نہ میسر ہو لیکن کھانے کی میز پر خادموں کو دکھانے کے لیے ڈرائنگ روم میں ملاقاتیوں کو دھوکا دینے کے لیے اور موٹر پر شوفر کو جلانے کے لیے باہم لطف محبت کا اظہار ضروری تھا

ان دونوں کی روزانہ زندگی کا پروگرام یہ تھا۔

مسٹر زیدی - صبح آٹھ بجے حاضری کے بعد ملاقات کے کمرے میں آجاتا، گیارہ بجے کچہری جاتا ۴ بجے شام کو واپس آکر چائے پیتا اور ٹینس کھیلنے کے لیے فوراً چلا جاتا۔ رات کو ۹ بجے واپس آکر کھانا کھاتا، اور خواب گاہ میں چلا جاتا۔

لطیفہ سہروردی۔ صبح کی حاضری سے فارغ ہو کر سیر و ملاقات کے لیے نکل جاتا اور ایک بجے واپس آکر چار بجے تک خطوط وغیرہ لکھنا، شام کو مسٹر زیدی کی واپسی سے قبل تنہا چاء پی کر عقد ثریا کلب میں جاکر رات کو واپس آنا اور اگر کبھی کوئی محفل رقص و سرود برپا ہوگئی تو صبح کر دینا

مختصراً یوں سمجھ لیجیے کہ ان دونوں کی زندگی اس طرح بسر ہوتی تھی کہ جب میاں گھر میں ہوتے تو بیوی گھر سے باہر ہوتیں، اور جب بیوی گھر میں ہوتیں تو میاں موجود نہ ہوتے گویا یہ دونوں قطب نماسوئی کے دو سرے تھے کہ اگر ایک سرا شمال کو ہوگا تو دوسرے کا جنوب کی طرف رہنا لازم ہے۔

مہینوں گذر گئے اور ان دونوں کی زندگی جو بالکل مشین کی طرح تھی بغیر کسی شکوہ و شکایت کے جاری رہی ایک روز شام کو جب مسٹر زیدی کچہری سے واپس آئے تو انھیں یہ معلوم کرکے حیرت ہوئی کہ بیوی گھر ہی میں ہیں اور اب تک باہر نہیں گئیں دریافت سے معلوم ہوا کہ کوئی خاتون مہمان آئی ہوئی ہیں، یہ سیدھے اس کمرے کی طرف پہنچے اور دروازے پر دستک دے کر اندر آنے کی اجازت طلب کی تھوڑی دیر میں لطیفہ سہروردی نے اٹھ کر خود دروازہ کھولا، اور جب مسٹر زیدی اندر پہنچے تو "مس بلقیس" سے تعارف کرایا گیا جو کراچی سے تشریف لائی تھیں۔

بلقیس کراچی کے ایک مشہور تاجر کی صاحب زادی تھیں اور مس سہروردی کے ساتھ ہی تعلیم پاتی تھیں اتفاق سے جب وہ بمبئی آئیں اور انھیں مس سہروردی کی شادی کا حال معلوم ہوا تو ملنے چلی آئیں۔

رسم تعارف ادا ہوگئی، تھوڑی دیر تک پورے لطف کے ساتھ آپس میں گفتگو ہوتی رہی اور جس وقت مسٹر زیدی وہاں سے اٹھ کر واپس آئے تو ان کے دماغ میں لطیفہ سہروردی اور بلقیس دونوں کی صورتیں قائم تھیں لیکن اس طرح کہ ایک میں ان کو بہت سے نقائص نظر آرہے تھے اور دوسری میں سیکڑوں محاسن یہ بالکل واقعہ ہے کہ شکل و صورت کے لحاظ سے لطیفہ سہروردی کو بلقیس پر کسی طرح ترجیح نہیں دی جاسکتی تھی لیکن اطوار کے لحاظ سے وہ بلقیس سے بدرجہا بلند تھی مگر اس کا کیا علاج کہ لطیفہ سہروردی مسٹر زیدی کی بیوی تھیں اور بلقیس ان کی کیا کسی کی بھی بیوی ابھی تک نہیں بنی تھی۔

جب تک مسٹر زیدی کچہری سے واپس نہ آئے تھے وہ لطیفہ سہروردی کے یہان قیام کرنے سے انکار کر رہی تھی لیکن جب اس نے ایک بار زیدی اور اس کی نگاہون کو دیکھ لیا تو خود ہی قیام پر راضی ہوگئی اور چار دن کے اندر وہ زیدی سے اس قدر بے تکلف ہوگئی گویا برسون کی ملاقات تھی اول اول تو لطیفہ کو یہ خیال ہوا کہ جب زیدی گھر مین ہوتی ہین تو بلقیس کیون کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے اس کے ساتھ باہر جانے سے انکار کر دیتی ہے اور جب زیدی کو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ بلقیس باہر جانے والی نہین تو کیون وہ شام کا ٹینس اور کلب غائب کر دیتے ہین لیکن آخر کار ایک دن یہ راز کھل کر رہا اور زندگی مین سب سے پہلی مرتبہ لطیفہ سہروردی مین وہ تمام نسائی جذبات رشک رونما ہوئے جو ایکبار ابھر آنیکے بعد مشکل ہی سے بغیر انتقام کے آسودہ ہوسکتے ہین۔

ایک دن شام کو جب وہ کلب سے بالکل غیر متوقع طور پر گھر واپس آئی اور بالائی منزل کا دریچہ کھول کر خانہ باغ مین نگاہ ڈالی تو اس نے بعید ترین گوشے مین ایک بنچ پر ان دونون کو اس طرح مصروف اختلاط دیکھا کہ مشکل سے وہ اپنی نگاہون پر اعتبار کر سکتی تھی۔ بلقیس زیدی کی آغوش مین تھی اور زیدی کے لب اس کے لبون پر غیظ و غضب کے عالم مین اس نے ارادہ کیا کہ اسی حالت مین ان کو جاکر گرفتار کرے لیکن بدنامی کے خیال سے رک گئی اور دیر تک مضطربانہ ادھر اُدھر ٹہلتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور آخر کار ایک فیصلہ کرکے وہ آہستہ آہستہ نیچے گئی اور وہان سے کوڈک کیمرا لاکر اس نے دہین دریچے سے دونون کی تصویرین لے لین ——

اور پھر نیچے آکر اپنے خادم رمضانی کو بلایا اور دیر تک کچھ سمجھاتی رہی۔ اس کے بعد جب وہ اپنے کمرے مین پہونچی اور تھوڑی دیر بعد بلقیس بھی وہان آئی تو اسے بالکل سکون تھا اور اس کی طرف سے کوئی بات ایسی ظاہر نہین ہوئی جس سے بلقیس یا زیدی کو کسی قسم کا شبہ پیدا ہوتا

اس واقعے کے تیسرے دن صبح کو مسٹر زیدی اپنے آفس کے کمرے مین بیٹھے ہوے ڈاک دیکھ رہے تھے کہ رمضانی آیا اور ایک لفافہ ہاتھ مین دے کر بولا کہ "حضور مجھے کچھ عرض کرنا ہے"

مسٹر زیدی :- "یہ لفافہ تو میم صاحب کے نام کا ہے"

رمضانی :- "ہان ہے تو میم صاحب کا لیکن سرکار اسے کھول کر ضرور پڑھین۔ اسی طرح کے لفافے کئی دن سے ایک آدمی دستی دے جاتا ہے اور ہر دفعہ جب مین میم صاحب کو دیتا ہون تو کہتی ہین کہ دیکھو کسی سے ذکر نہ کرنا، یہی آدمی ایک دن جب حضور کچہری مین تھے تین چار کاغذ کے بکس بھی لایا تھا اور چھپا کر میم صاحب کو دے گیا تھا مین نے بارہا ارادہ کیا کہ حضور سے ذکر کر دون لیکن میم صاحب کے ڈر سے ہمت نہ ہوئی۔ اب چاہے مجھے نکالین یا رکھین مین نے سارا ماجرا حضور سے کہہ دیا ہے"

زیدی یہ داستان سن رہا تھا اور حیران تھا، وہ کبھی لطیفہ کی طرف سے اس قسم کی بیوفائی کی توقع رکھتا تھا یہ ضرور جانتا تھا کہ وہ آزاد ہے لیکن اخلاقی کمزوری کا وہم وگمان بھی اس کو نہ ہوا تھا، وہ نہ صرف حیران تھا بلکہ غصے کی وجہ سے اس کا چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا، اب اس نے بالکل پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ اسے لطیفہ سے واقعی شدید محبت ہے اور کسی طرح وہ اپنے اس حق کو چھنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔

رمضانی کے چلے جانے کے بعد اس نے احتیاط سے لفافہ کھولا جس کے اندر ٹائپ کیا ہوا ایک خط رکھا ہوا تھا، اس کا مضمون یہ تھا،

آرام جان!

میں سنا کرتا تھا کہ دیویاں ظالم ہوتی ہیں، لیکن تم تو ایسی نہیں ہو، تمہارا التفات تمہارا لطف وکرم جس وقت یاد کرتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ ان کے مقابلے میں میرا جذبۂ پرستش کس قدر کم وزن نظر آتا ہے۔ اب سے دس دن قبل جب میری نگاہ کا اولین بدیۂ شوق تم نے اپنی آنکھوں کے تبسم سے قبول کیا تو میں نے جانا کہ ایک انسان کے لیے فردوس صرف یہی ہو سکتی ہے لیکن جب اس کے بعد پے در پے حجابات اٹھتے گئے اور تمہاری محبت نے اپنی بارش کرم سے مجھے بالکل شرابور کر کے رکھ دیا تو معلوم ہوا کہ:-

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایان

میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں تمہارا شکریہ ادا کر دوں، میرے پاس سوائے جان کے کوئی ہدیہ نہیں کہ اسے پیش کر دوں، سو بیس دفعہ کہہ چکا کہ اس سے زیادہ لطف و عنایت کی برداشت مجھ میں نہیں رحم کرو اور جان لے کر اس جھگڑے کو ختم، لیکن تم نے ہمیشہ مسکرا کر ٹال دیا —— کیا کروں حیران ہوں، نہ کسی کام میں جی لگتا ہے نہ رات کو آنکھ بند ہوتی ہے، ہر وقت تم ہو، تمہاری تصویر ہے اور ہر وقت

اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

خدا کرے تم آگ لگانے والی خوش رہو۔

آج بھی بارہ بجے ٹیلیفون پر آنے کی زحمت گوارا کیجیے، اگر فرصت ہو۔

صرف تمہارا

جمیل

اس خط کو پڑھ کر زیدی کی جو کیفیت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے لیکن چونکہ تہذیب جدید کے زیر اثر اس کی تربیت ہوئی تھی اس لیے وہ غیرت تو تھی نہیں کہ فوراً بیوی کا جا کر گلا کاٹ ڈالتا اور جمیل کو ڈھونڈھ کر اس کے پیٹ میں چھری بھونک دیتا ——— زیادہ سے زیادہ وہ یہی کر سکتا تھا کہ اسے طلاق دے دے اور اس خیال کے آتے ہی اسے ایک گونہ سکون بھی ہوا کیونکہ اس صورت میں وہ بلقیس سے شادی کرنیکے لیے آزاد بھی ہو جائے گا ——— چنانچہ وہ اس کے لیے آمادہ ہو کر جانا ہی چاہتا تھا کہ رمضانی پھر گھبرایا ہوا آیا اور بولا کہ حضور نے وہ خط پھاڑا تو نہیں۔ میم صاحب کو کسی طرح معلوم ہو گیا کہ وہ آدمی خط دے گیا ہے، مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا ہاں دے گیا ہے اور میں ابھی لاتا ہوں کام کی وجہ سے خیال نہیں رہا۔ لائیے وہ خط مجھے دیجیے میں لفافے میں احتیاط سے بند کر کے انھیں دے دوں۔

پہلے تو زیدی کا خیال تھا کہ خود جا کر وہ اس خط کو دے گا اور اسی وقت آیندہ کا فیصلہ کرے گا لیکن رمضانی کی یہ گفتگو سن کر اس نے تدبیر کی صورت بدل دی اور سوچا کہ زیادہ سے مناسب یہی ہے کہ ٹیلی فون کی گفتگو بھی سن لے، ممکن ہے کوئی اور نیا راز ظاہر ہو ——— یہ سوچ کر خط اس نے رمضانی کے حوالہ کیا، اور خود لطیفہ کے نام ایک خط لکھ کر کہ میں ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں شام تک آسکوں گا، چلا گیا۔

ٹھیک بارہ کے ہندسے پر کلاک کی دونوں سوئیاں پہنچی ہی تھیں کہ لطیفہ ٹیلی فون پر گئی اور اکسچینج سے ۶۷۰۰ نمبر ملوا کر گفتگو کرنے لگی:-

ہاں، ہاں ..... میں ہوں .... مجھے کیا کم انتظار رہے ....

ضرور .... شام کو .... کس وقت کہیا ....

جب آپ فرمائیں ....

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ زیدی بپھرے ہوئے شیر کی طرح پردے کی اوٹ سے باہر آیا اور لطیفہ کے سامنے کھڑے ہو کر بولا:-

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ کس سے راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہیں"!

لطیفہ نے مطلقاً کوئی پرواہ نہ زیدی کے آنے کی کی اور نہ اس کے استفسار کی، اس نے اسی طرح ٹیلی فون پر اپنی گفتگو کو جاری رکھا:-

ہاں آپ کے تحائف ملے۔ کس قدر پاکیزہ تھے ...... خوب میں شرمندہ کر رہی ہوں

جی نہیں معاف فرمائیے ——— اس سے زیادہ تکلیف اٹھانے کی اجازت نہیں ———

زیدی اس سے زیادہ اپنی توہین کو برداشت نہ کرسکا اور غصے میں بڑھ کر ٹیلی فون اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور بولا کہ "میں حکم دیتا ہوں کہ مجھے اسی وقت اس شخص کا نام بتاؤ جس سے تم گفتگو کر رہی تھیں اور جواب دو کہ تم نے کیوں غیر مرد سے اختلاط پیدا کیا"۔

لطیفہ زیدی کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی کہ "میں تمھارا حکم ماننے سے انکار کرتی ہوں اور بتانا چاہتی ہوں کہ میں بھی آزاد ہوں جس سے چاہوں اختلاط کرسکتی ہوں"۔

زیدی۔ "بہتر ہے آپ اپنے کو بالکل آزاد سمجھیں اور اپنے گھر تشریف لے جائیں"۔

لطیفہ۔ "شکریہ۔ لیکن مہربانی کرکے ایک تحریر مجھے دے دیجیے کہ پانسو روپے ماہوار میرے مصارف کے لیے آپ ماہ بماہ ادا کرتے رہیں گے"۔

زیدی۔ "خوب یہ بدوضعی اور اس پر یہ مطالبہ! قانوناً و شرعاً ایک شوہر بداطوار بیوی کے مصارف کا کفیل نہیں قرار دیا جاسکتا"۔

لطیفہ۔ "اگر آپ کو اس سے انکار ہے تو عدالت اس کا فیصلہ کرے گی اور وہ فیصلہ یقیناً میرے حق میں ہوگا، کیونکہ آپ کے پاس کوئی ثبوت میری بداطواری کا موجود نہیں ہے"۔

زیدی نے غصے سے آگے بڑھ کر وہ خط اٹھا لیا جو سامنے ہی میز پر رکھا تھا، اور بولا کہ "کیا اس سے زیادہ ثبوت تمھاری غداری کا کوئی اور ہوسکتا ہے"۔

لطیفہ نے آہستگی سے میز کی دراز کھولی اور ایک تصویر سامنے رکھ کر بولی کہ "کیا اس سے زیادہ ثبوت تمھاری بدچلنی اور ہرجائی پن کا کوئی اور ہوسکتا ہے"۔

جس وقت زیدی نے دیکھا کہ یہ تصویر اسی کی تھی جس میں وہ بلقیس کے ساتھ ہم آغوش نظر آرہا تھا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور سر سے پاؤں تک عرق عرق ہوگیا،

بلقیس تو اس واقعے کے بعد ہی پونا سے غائب ہوگئی اور اس طرح کہ یہ پتہ بھی نہ چلا کہ کہاں اور کب گئی، لیکن زیدی بدستور اپنی تمام شرمندگیوں کے ساتھ وہیں موجود رہا۔ —— بعد کو جب اسے معلوم ہوا کہ جمیل اور اس کا خط یہ سب فرضی باتیں تھیں اور ٹیلی فون نمبر ۶ زنانہ اسکول کا تھا تو زیدی کی خفت کا یہ عالم ہوا کہ اس نے دونوں لطیفہ کو اپنی صورت نہ دکھائی —— اور جب کبھی انتہائی لطف کی حالت میں بھی لطیفہ اس کے چھیڑنے کے لیے ٹیلی فون نمبر ۶ کا نام لے دیتی تو وہ جھیپ کر رہ جاتا،

نیاز

اقبالنامہ جہانگیری کا ایک قلمی نسخہ

اور

عہد مغلیہ کے ایک درباری اہل قلم کی چشم دید بیانات

گذشتہ سے پیوستہ

مصوری صنعت معتمد خان نے اس سلسلہ مین دو ایسے دلچسپ واقعات لکھے ہین جو عہد اسلامیہ کی صناعت پر ایک عجیب و غریب روشنی ڈالتے ہین۔

بادشاہ نے شاہ عالم نامی ایک درباری کو ایران کا سفیر بنا کر بھیجا تھا جب وہ واپس آئے تو جہانگیر کے حضور مین ایک حیرت انگیز تصویر پیش کی، تصویر کے نقوش یہ تھے،

صاحب قران تیمور لنگ اور القمش خان کی جنگ کا نقشہ تھا اس جنگ مین جتنے امرا اور صاحبقران کی اولاد تھی تمام لوگون کی تصویرین بنائی گئی تھین، اس نقش مین دو سو چالیس تصویرین تھین مصور کا نام خلیل مرزا تھا چنانچہ اقبال نامہ مین ہے۔

> از نفائس و نوادر کہ خان عالم آورد و بہترین تحفہای او توان گفت مجلس تصویر جنگ
> صاحب قران گیتی ستان ست بہ القمش خان شبیہ آن حضرت و اولاد امجاد و امرائے عظام
> کہ دران جنگ بہ سعادت ہمراہی اختصاص داشتند در زیر ہر صورت نوشتہ کہ شبیہ کیست
> و این مجلس مشتمل ست بر دویست و چہل صورت و مصور نام خود را خلیل مرزا . . . .
> نوشتہ کارش بنہایت پختہ و غالب است کہ بہ قلم استاد بہزاد مناسبت و شباہت تام دارد
> چون بہ حسب تاریخ از بہزاد . . . . . بمقدم است اغلب ظن آنکہ بہزاد از شاگردان اوست

پرورش اوشتق کردہ[1]

معتمد خان نے عہد جہانگیری کے فن مصوری پر مزید روشنی نہین ڈالی حالانکہ جہانگیر کا ذوق مصوری اسقدر بلند سطح کی چیز ہے کہ تاریخ مین اس نے ایک اہم حیثیت پیدا کر لی ہے چنانچہ ای بی ہیول لکھتا ہے

جہانگیر کو اکبر کی صفات عالیہ کا بہت ہی کم حصہ ودیعت ہوا تھا لیکن فنون لطیفہ کے ساتھ اس کی دلچسپی بالکل ویسی ہی تھی جیسی اکبر کی۔ اس کے "تزک" سے بہت سے ایسے ثبوت ملتے ہین جن سے معلوم ہوتا ہے وہ اپنے درباری مصورون اور ان کے نقوش ونگار کے ساتھ کیسی گہری دلچسپی او رلگاؤ رکھتا تھا، وہ ان کے ساتھ قریبی دوستون کا سا برتاؤ کرتا تھا اور ان کو ممتاز مراتب عطا کیا کرتا تھا، جہانگیر خود لکھتا ہے کہ شریف خاندان بن عبدالصمد کو (عبدالصمد اکبر کے شبیہ طرازون مین سے تھے) جس نے بچپن سے اس کے ساتھ پرورش پائی تھی اس نے اپنی ولی عہدی ہی کے زمانے مین "خان" کا خطاب دیا تھا، اور عہد حکومت مین وزیر اعظم بنا دیا"

جہان گیر "تزک جہانگیری" کے اندر تیرھوین سال جلوس کے سلسلے مین لکھتا ہے:-

آج ابوالحسن نے جس کا خطاب "نادر الزمان" ہے، میرے دربار کی ایک تصویر پیش کی اسے اُسنے "جہانگیر نامہ" کے شروع مین لگایا تھا چونکہ یہ قابل تعریف کارنامہ ہے مین نے اس پر لطف و مہر کیا، اگر اس وقت مشہور ابوالحی اور بہزاد ہوتے تو وہ اس کے لطیف ذوق مصوری کا صحیح فیصلہ کرتے، اس کا باپ آقا رضا میری شاہزادگی کے زمانے مین ہمیشہ میرے ساتھ رہتا تھا اور اس کا یہ لڑکا میرے گھر مین پیدا ہوا تھا، مین نے اسے اچھی تعلیم دلائی یہان تک کہ وہ زمانے مین ممتاز ہستی ہو گیا، اس کی تیار کی ہوئی شبیہین حسین و جمیل ہین، منصور بھی فن تصویر کشی کا ماہر ہے، اس کا خطاب "نادر الاصلی" ہے . . . . میرے والد اور میرے زمانہ مین بھی ان دونون مصورون کا کوئی ہمسر نہین[2]

ہیول لکھتا ہے کہ ابوالفضل نے آئین اکبری کے اندر عہد اکبری کے مصورون کی جو فہرست دی ہے اس مین نہ تو ابوالحسن کا نام ہے نہ منصور کا اس لیے معلوم ہوتا ہے اکبر کے آخری زمانۂ حکومت مین ان کی شہرت ہوئی، کلکتہ آرٹ گیلری مین منصور کے کارنامون کے حسین و جمیل نمونے موجود ہین

---

[1] ایران پر مختلف زمانون مین مختلف قومون نے حکومت کی تیمور اور سلاطین تیموریہ نے ۱۳۶۹ء عیسوی سے ۱۵۰۰ء تک حکومت کی، صفویہ ۱۵۰۲ء عیسوی سے ۱۷۳۶ء عیسوی تک سریر آرا رہے، بہزاد مشہور ایرانی مصور دولت صفوی کے بانی اسمٰعیل اول کے عہد مین ہوا ہے، (دیکھو "پرشین آرٹ" مقالہ تاریخی مرقومہ ڈینیسن راس)

[2] تفصیل کے لیے دیکھو "انڈین اسکلپٹر اینڈ پینٹنگ" مصنفہ ای بی ہیول

جہانگیر کو مصوری کا ایسا اعلیٰ ذوق تھا اور اس کی حیات جمیلہ ایسی لطیف تھیں کہ آج ہم پڑھ کر حیرت مین آجاتے ہین وہ خود لکھتا ہے کہ اگر کوئی مرقع ایسا ہو جس کے مختلف حصون کو مختلف مصورون نے تیار کیا ہو تو مین بتا دون گا کہ فلان حصہ فلان مصور نے تیار کیا ہے، خواہ وہ مصور زندہ ہو یا مر گیا ہو

ہیول نے "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے معزز عہدے دار "سر ٹامس رو" اور جہانگیر کے ان شرائط کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے جو فن مصوری کے متعلق جانبین مین ہوئے ٹامس رو نے ایک تصویر پیش کی جہانگیر نے اپنے درباری مصورون سے اسی طرح کے چار مرقع تیار کرائے اور ٹامس رو سے کہا کہ اپنا مرقع پہچان لے لیکن وہ عاجز رہ گیا، جہانگیر نے اس کا مرقع اسے دیا اور اس کے بعد ان کے فرق و امتیاز کے متعلق ایسی ایسی باریک بینیان پیش کین کہ ٹامس رو دنگ رہ گیا،

اسی طرح صاحب اقبال نامہ کا بیان ہے کہ جلوس کے چھٹے سال ایک شاہی غلام نے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی ایک عجیب و غریب صنعت کی چیز پیش کی اس نے ایک چھڑے کے اوپر ہاتھی دانت سے چار مجلسین مرتب کی تھین جنکی تفصیل حسب ذیل ہے

پہلی مجلس - اس مین پہلوانون کی تصویرین ہین ان مین دو آپس مین کشتی لڑ رہے ہین تیسرا ہاتھ مین نیزہ لیے ہوئے ہے ایک اور پہلوان زمین پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا ہوا ہے اور اسکے سامنے لکڑی و کمان اور ایک برتن رکھا ہوا ہے

سلہ فنون جمیلہ کے عنوان سے چونکہ مین ایک بسیط مقالہ لکھ رہا ہون اس لیے یہاں ان دقت طلب سوالات پر بحث کرنا نہین چاہتا کہ دربار مغل کی مصوری کیون کر وجود مین آئی، اور اس کے اندر کون کون عناصر کار فرما ہین اس ضمن مین چونکہ تاریخی انقلاب بہت اہمیت رکھتا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ چین، ایران اور ہند کے بعض تاریخی واقعات سے نتائج مرتب کرنا ہون گے، ہیول کی کتاب "آنڈین اسکلپٹر اینڈ پینٹنگ" اور رائل اکاڈمی کی جدید مطبوعہ "پرشین آرٹ" مین یہ مباحث ملتے ہین کہ ہندوستان نے مغلیہ آرٹ پر کیا اثر کیا اور ایران سے اس کا کیا تعلق ہے۔ اسی طرح جب یہ ثابت ہے کہ فارس پر چین کی مغول قوم نے (جن کی قومیت سے ہندوستان کے سلاطین مغلیہ علاقہ رکھتے ہین) ۱۲۵۸ء عیسوی سے ۱۳۳۶ء عیسوی تک حکومت کی اور تیمور لنگ اور سلاطین تیموریہ ۱۳۶۹ء عیسوی سے ۱۵۰۰ء عیسوی تک فرمان روا رہے، تو مغل آرٹ پر مختلف قومون کی ذہنیت و احساس کی کار فرمائی ایک کھلی ہوئی حقیقت معلوم ہونے لگتی ہے، ہر چند ایرانی مصوری پر یورپی مصوری کا بھی اثر بتایا جاتا ہے جیسا کہ "لورنس بنیین" پرشین آرٹ مین لکھتا ہے کہ شاہ عباس ثانی نے اپنے ایک مصور محمد زمان کو روم مین بھیجا تھا، جہان وہ عیسائی ہو گیا اور یہ فن سیکھا اس کے بعد وہ ہندوستان آیا اور پھر فارس لوٹ گیا لیکن ہیول اپنی کتاب "ہندوستان کی فن سنگتراشی و مصوری" مین اس نظریہ کو نہین مانتا۔ اس نے اس کے خلاف بہت سے دلائل پیش کیے ہین۔

دوسری مجلس ایک تخت بنا ہوا ہے، اور اس پر ایک شامیانہ کھنچا ہوا ہے اس میں ایک امیر آدمی ایک پیر دوسرے پر چڑھائے ہوئے بیٹھا ہے، اور اس کی پشت پر تکیہ بھی نمایاں ہے، اور پانچ خدمت گار اس کے چاروں طرف کھڑے ہیں اور تخت پر ایک درخت کا سایہ پڑ رہا ہے

تیسری مجلس اس میں نٹوں کے کمال فن پر روشنی ڈالی گئی ہے، ایک لکڑی گڑی ہوئی ہے اور اس میں بہت سی رسیاں بندھی ہوئی ہیں، نٹ (ریسمان باز) بائیں ہاتھ سے سر کا پچھلا حصہ پکڑ کر اپنا سر لکڑی پر رکھ کر تماشہ دکھا رہا ہے، ایک شخص گردن میں ڈھول لیے ہوئے بجا رہا ہے، دوسرا کھڑا ہوا رسی کی طرف دیکھ رہا ہے، اور پانچ آدمی تماشا دیکھ رہے ہیں، اور ان میں ہر ایک کے پاس ایک عصا ہے

چوتھی مجلس ایک درخت ہے اور اس کے نیچے حضرت عیسیٰ کی تصویر ہے، ایک شخص آپکے پیر پر سر رکھے ہوئے ہے، ایک بوڑھا آدمی آپ سے گفتگو کر رہا ہے۔ اور دوسرے چار آدمی کھڑے ہیں

طیور و وحوش جہانگیر کو شکار سے بھی گہری دلچسپی تھی، وہ اپنی دلبستگی کے لیے اکثر سیر و شکار میں مشغول رہتا چنانچہ آج مچھلی کا شکار ہو رہا ہے تو کل آہو کا، آج ہاتھی پھنسائے جا رہے ہیں تو کل شیر پر حملہ ہو رہا ہے، خوفناک چیتے پالے جاتے ہیں اور انھیں آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے، معتمد خان نے جہانگیر کے ذوق شکار پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ جہانگیر شیر کے شکار اور انھیں پالنے کا بہت ہی دل دادہ تھا،

شیر ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ اثنائے شکار میں ایک شیر درخت کے نیچے بیٹھا ہوا نظر آیا، بادشاہ اور امرا ہمراہ ہیں چاہتے ہیں گھوڑے کی پشت پر بیٹھے ہوئے بندوق سے شیر کا شکار کریں گھوڑا شوخی کرنے لگا، پاپیادہ ہوگئے اور شیر پر بندوق کا فیر کیا، نہیں معلوم گولی لگی یا نہیں، دوسری مرتبہ پھر بندوق کا فیر کیا گیا، شیر نے اپنی جگہ سے جست کی اور میر شکار کو زخمی کر کے اپنی جگہ پر جا بیٹھا بادشاہ نے بندوق پھر کر "سہ پایہ" (تپائی) رکھا اور انوپ رائے کمر میں تلوار باندھے، ہاتھ میں عصا لیے سہ پایہ پکڑے رہا، شاہزادہ خورم بادشاہ کے بائیں جانب تھا، رام داس اور دوسرے خدام و نوکر پیچھے تھے، شیر پھر حملہ آور ہوا، بادشاہ نے جھٹ بندوق کا فیر کیا گولی شیر کے دانت سے ٹکراتی ہوئی گذر گئی، بندوق کی آواز سے شیر اور بھی غضبناک ہوا، جو لوگ نزدیک کھڑے ہوئے تھے تاب نہ لائے، ادھر ادھر بھاگنے لگے جہانگیر بھی لوگوں کے دھکے سے دو تین قدم پیچھے ہٹ کر گر گئے، خود جہانگیر کا بیان ہے کہ اس وقت دو تین آدمی میرے سینے پر پیر رکھ کر گذر گئے، ایک ہند و دربار ی اعتماد رائے اور کمال قراول نے خود کو سنبھالا اور دوبارہ مستعد ہوئے، شیر نے اس وقت بائیں طرف والے آدمیوں پر حملہ کیا، انوپ رائے نے سہ پایہ چھوڑ دیا

اور شیر کی طرف متوجہ ہوا، اور شیر بھی اس کی طرف جھپٹا، انوپ رائے کے ہاتھ مین جو لکڑی تھی اس سے دو مرتبہ شیر پر دو دستی ماری شیر نے اس کو زمین پر پچھاڑ دیا اور اسکے دونون ہاتھ منھ مین لے کر چبانے لگا لیکن اس لکڑی اور چند انگوٹھیون کے باعث جو اس کے ہاتھ مین تھین اس کا ہاتھ بیکار نہ ہوا، انوپ رائے شیر کے دونون ہاتھون کے بیچ مین پشت کے بل پڑا ہوا تھا اس نے شیر کے دونون اگلے پانوں حایل کر لئے اسوقت شاہزادہ خورم نے تلوار غلاف سے نکالی اور چاہا کہ شیر کا کام تمام کرے لیکن انوپ رائے کے ہاتھ کا خیال آیا تلوار پھینک دی، رام داس نے شیر کو چند زخم لگائے، حیات خان نے سر پر چند ڈنڈے مارے، انوپ رائے پہلو بدل کر اپنے زانو کے زور سے کھڑا ہو گیا، انوپ رائے بھی شیر کے ناخن سے مجروح ہو گیا تھا جب شیر نے اسے چھوڑ دیا اور روانہ ہوا تو انوپ رائے نے بھی غضب مین آکر اس پر تلوار کا وار کیا، پھر دوسرا وار کیا شیر کی دونون آنکھین نکل پڑین، اطراف کے آدمیون نے آکر شیر کا کام تمام کیا، انوپ رائے کو "رائے سنگھ دلن" کا خطاب ملا اور منصب مین بھی اضافہ ہوا، اسی عرصے مین ایک خانہ زاد شیر پر جو بہت قوی ہیکل اور مست تھا، جہانگیر کی نظر پڑی جسکا حکم دیا کہ چار نیل گاؤ اس پر باندھے جائیں ہندوستان کے وزن کے مطابق یہ بیالیس من ہوا، شیر نے اٹھایا اور لیکر روانہ ہوا، بادشاہ نے حکم دیا کہ اچھا ایک نیل گاؤ اور اس پر باندھ دیا جائے، اب شیر اتنا بوجھ نہ اٹھا سکا جہانگیر نے کہا اچھا جب کھڑا ہو جائے تو اس پر مزید بوجھ لادا جائے، جب شیر کھڑا ہو گیا تو لوگون نے پانچوین نیل گاؤ کو اس پر رکھ دیا، شیر سب کو اٹھا کر لے چلا۔ یقیناً یہ بوجھ پچاس من سے بھی زیادہ ہوگا۔

اسی طرح شیرون کی پرورش کے سلسلے مین ایک عجیب و غریب واقعہ مصنف نے لکھا ہے جس کے متعلق خود اس کا خیال ہے کہ

> و این غریب امور است کہ در عہد جہانگیر بادشاہ بظہور آمدہ در ہیچ عہدے و عصرے
> نہ شدہ کہ شیرے بے زنجیر درمیان مردم بگردد و اچارہ دہ پانزدہ شیر بقیر دیدہ کہ در فضائے حجرہ کہ
> کہ در طرف دریا بود می گشتند و شیر بانان ہمراہ بودہ محافظت می نمودند

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جلوس کے چھٹے سال ایک قلندر نے بادشاہ کی خدمت مین ایک بہت بڑا شیر پیش کیا، یہ شیر جب بچہ تھا تو قلندر کے ہاتھ آگیا، اسی مدت سے اس کی تربیت کی، اس کا نام "لعل خان" رکھا تھا یہ شیر آدمیون سے اس قدر مانوس تھا کہ کسی کو آزار نہین پہنچاتا تھا، ایک دن جہانگیر نے اسے اپنے سامنے طلب کیا اور ایک گائے کے ساتھ اس کا مقابلہ کرایا بہت سے لوگ تماشہ دیکھنے کے لیے جمع تھے، ایک طرف پہرے دار بھی تماشہ دیکھ رہے تھے، شیر انھین کی طرف دوڑا، ان مین ایک آدمی ننگے بدن تھا، اسے پکڑ کر اس طور سے کلیل کرنے لگا جیسے اپنی مادہ کے ساتھ جفت کرتا ہے، اس کے بعد چھوڑ دیا، اس چوکیدار کو ناخن سے

خراش لگی نہ دانت سے زخم پہنچا، بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے قید سے نکالو، اس کی زنجیرین دور کرو تاکہ جھروکہ کی فضامین آزادانہ دریا کے کنارے پھرا کرے۔

بادشاہ کو چونکہ شیرون کی پرورش اور ان کی لڑائی سے خاص دلچسپی تھی اس لیے لوگ اکثر شیر کا بچہ پیش کش کرتے تھے یہ کل شیر بلا زنجیر و پٹکے کے آزادانہ جھروکے کی فضامین دریا کے کنارے گھومتے پھرتے تھے، اور ہر شیر پر دو شیر بان مقرر تھے جو انھین کھانا دیتے تھے، رفتہ رفتہ بڑے بڑے شیر جمع ہوگئے بادشاہ نے کسی کا "مردانہ" نام رکھا تھا کسی کا "فیل" اور کسی کا "شیر دل" اور انھین باہم لڑاتے، ایک شیرنی نے ان شیرون مین سے ایک سے جفتی کھائی اور بچے دیے، شیرنی نے دودھ پلایا، بچے سیانے ہوئے

انیسوین سال جلوس مین شاہزادہ داور بخش نے جہانگیر کی خدمت مین ایک زرد رنگ کی شیرنی پیش کی جو نر کے ساتھ اس قدر مانوس تھی کہ ایک ہی پنجرے مین رہتی تھی اور عورتون کے ساتھ بھی نہایت محبت اور کلیل کرتی تھی اور جیسا کہ جانورون کا دستور ہے نر کو گود مین لے کر حرکت کرتی تھی، بادشاہ نے حکم دیا کہ نر کو پنجرے سے نکال کر دور چھپا دیا جائے، شیرنی نے بہت فریاد کی حکم ہوا کہ اسی رنگ اور قد و قامت کا ایک دوسرا نر اس پنجرے مین رکھ دیا جائے، شیرنی نے اسے سونگھا اور اس کی کمر پکڑ کر دانت سے توڑ ڈالی، ایک بھینس پنجرے مین ڈالی گئی شیرنی نے اسے بھی فوراً چیر ڈالا اور کھا گئی، اس کے بعد پھر وہی نر پنجرہ مین بند کیا گیا، شیرنی نے اگلے طریقے پر اس کے ساتھ مہربانی اور ہمدردی شروع کی، خود چمٹ لپٹ گئی، اور نر کو سینے پر لے کر اس کا منھ چاٹنے لگی، معتمد خان لکھتا ہے،

از ہیچ حیوان اہلی و وحشی تا حال مشاہدہ نہ شدہ کہ دہان جفت خود را بوسہ کند،

چیتہ جہانگیر کو شیر کی طرح چیتہ پالنے کا بھی شوق تھا، جلوس کے سولھوین برس یہ عجیب و غریب واقعہ ہوا کہ ایک نر چیتے نے مادہ کے ساتھ جفتی کھائی اور اس سے بچے پیدا ہوے۔

اکبر ہی کے زمانے سے شاہی حیوانات کے سلسلے مین نو ہزار چیتے جمع ہوگئے تھے، اکبر کی بڑی خواہش تھی کہ یہ چیتے باہم جفتی کھا کر بچے دین، اور اسی غرض سے کئی نر و مادہ چیتون کو بلا قید و بند شاہی باغون مین چھوڑ دیا کہ اپنی خواہش سے جہان چاہیں پھرین، پھر بھی یہ مقصد بر نہ آیا، جہانگیر کے زمانے مین ایک نر چیتے نے زنجیر توڑ کر مادہ سے جفتی کھائی مادہ حاملہ ہوگئی اور ڈھائی ماہ کے بعد تین بچے پیدا ہوے اور وہ بڑے ہوے،

فیل بارھوین سال جلوس کے سلسلے مین مصنف لکھتا ہے۔

ایک بار بادشاہ چند مخصوص درباریون کے ساتھ شکارگاہ مین تشریف لیگئے، اس سے قبل پیادے اور

سواروں نے جنگل کو قمرغہ کے شکار کے طریقے سے گھیر لیا تھا، جنگل کے باہر لوگوں نے بادشاہ کے بیٹھنے کیلیے ایک درخت پر مچان بنایا تھا، بہت سے امراء نے اطراف کے درختوں پر اپنا نشیمن ٹھہرالیا تھا، دو سو نر ہاتھی کمند کے ساتھ اور بہت سی ہتھنیاں جمع تھیں ہر ہاتھی پر توم جھرنہ کے دو دو آدمی جنھیں ہاتھی کا شکار کرنے میں کمال ہے مقرر تھے، حکم ہوا کہ جنگل سے ہاتھیوں کو ہنکا کر ادھر لایا جائے تاکہ بادشاہ سلامت اچھی طرح شکار کا تماشہ دیکھیں، اتفاقاً جیسے ہی لوگ جنگل سے نکلے یہاں جو لوگ چاروں طرف سے رستہ روکے کھڑے تھے، اس سلسلے میں بدنظمی ہوگئی۔ جنگلی ہاتھی پریشان ہو کر ادھر ادھر بھٹک گئے پھر بھی بارہ زنجیر نر و مادہ ہاتھی کا جہانگیر کے سامنے شکار ہوا، ان میں دو ہاتھی بڑے حسین و اصیل ہاتھ آئے۔

آہو

جلوس کے چھٹے سال حوالی اکبرآباد کی شکارگاہ میں جو ایک موضع (سموکر) میں واقع ہے جہانگیر تمام اہل محل کے ساتھ سات دن تک عیش مناتا رہا، نر و مادہ نو سو ستر آہو کا شکار رہا جن میں چھ سو ایک زندہ گرفتار ہوئے بادشاہ نے ان میں سے چار سو ہرنوں کو فتح پور بھیجا کہ چوگان کے میدان میں چھوڑ دیے جائیں اور ان کے آب و دانے کا خیال رکھا جائے۔ ایک سو ہرنوں کے گلے میں چاندی کا پٹہ دے کر اسی جنگل میں چھوڑ دیا اور باقی ہرنوں کو جنھیں بندوق لگی تھی، امراء اور تمام خدام دربار کو بانٹ دیا،

ماہی

مچھلی کے شکار کے متعلق مصنف نے ایک عجیب طریقہ لکھا ہے،

"ہوتا یہ ہے کہ جہاں پر آدمی کے سینے تک پانی ہو، وہاں کشتیاں لے جاتے ہیں اور ان کا ایک سرا دوسری کشتی کے سرے سے ملا دیتے ہیں، اور دونوں کا دوسرا سرا جو دہ پندرہ گز کے فصل پر رکھتے ہیں اور دو ملاح کشتی کے باہر ادھر ادھر لانبی لانبی لکڑیاں لے کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں تاکہ پانی کم و بیش نہ ہو اور دس بارہ ملاح پانی میں اتر کر کشتی کے اس کنارے پر جہاں دو کشتیوں کا منھ ملا کر ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا جاتا ہے پیر زمین پر مارتے جاتے ہیں، جو مچھلی ان دونوں کشتیوں کے درمیان آجاتی ہے، چاہتی ہے تنگی کے باعث نکل بھاگے، ملاح کا پیر اس سے ٹکراتا ہے دوسرا ملاح اس کی پیٹھ پر بوجھ دے کر زور کرتا ہے تاکہ پانی اسے (مچھلی کو) اوپر نہ لائے، اس طریقے سے مچھلی پکڑ لی جاتی ہے، جو لوگ اس فن میں مہارت رکھتے ہیں وہ بیک وقت دو دو مچھلیاں گرفتار کر لاتے ہیں، ایک بوڑھا ملاح ہر غوطے میں دو مچھلیاں پکڑ لاتا تھا،

گورخر

ایک گورخر کی عجیب و غریب صورت کے متعلق مصنف نے نہایت استعجاب کے ساتھ لکھا ہے اس کے بدن پر اس توازن اور مناسبت کے ساتھ خطوط منقش تھے کہ معلوم ہوتا تھا کسی نے مصوری کی ہے۔

دریں ولا گورخرے از راہ دریا آوردہ بودند، بغایت عجیب و غریب از سر تا انتہائے دم

واز گوش تا...... خطہائے سیاہ و سفید مناسب جا و مقام کلان خورد و بہ قرینہ
افتادہ و برگرد چشم خطے سیاہ در غایت لطافت کشیدہ واز بسکہ عجیب بود ۔ بعضے را
گمان آن می سازد کہ شاید رنگ کردہ باشند بعد از تحقیق و تفحص بہ یقین پیوست
کہ خدا آفرین است ،

لنگور گیارھویں سال جلوس میں ایک شخص بہاء الدین برق انداز نے ایک بکری کے ساتھ لنگور کا بچہ جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا، بہاء الدین کا بیان ہے کہ ایک مادہ لنگور اپنا بچہ سینے لگائے ہوئے ایک بلند شاخ پر بیٹھی ہوئی تھی، بیرحم توپچیوں نے اسے گولی ماری مادہ نے بچے کو دوسری ڈال پر رکھ دیا اور خود گر کر مر گئی، اسی وقت میں پہونچا اور اس بچے کو دودھ پلانے کے لیے اس بکری کے پاس لایا خدا نے اس بکری کے دل میں رحم دیا اس نے فوراً اسے چاٹنا شروع کیا اور غیر جنس ہونے کے باوجود اس قدر مالوف ہو گئی کہ گویا لنگور اسی کا بچہ ہے، بادشاہ نے حکم دیا کہ لنگور کے بچے کو بکری کی نظروں سے پنہان کر دیا جائے، بچہ جب نظروں سے اوجھل ہو گیا تو بکری نے بے تابانہ فریاد شروع کی ادھر لنگور کا بچہ بھی بے تاب ہو کر اس قدر فریاد و نالہ کرنے لگا کہ حاضرین حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے،

کتّا آٹھویں سال جلوس کے ذیل میں معتمد خان نے ایک دیوانے کتے اور ہاتھی کا ایک خوفناک واقعہ لکھا ہے ایک رات ایک بنگلا کتا شاہی فیل خانے میں چلا آیا اور ایک مادہ ہاتھی کے پیر میں کاٹ لیا، ہاتھی نے چنگھاڑنا شروع کیا، محافظ جاگ اُٹھے، کتا بھاگ کر ایک زقوم زار میں جو اسی اطراف میں تھا چھپ گیا ایک عرصے کے بعد پھر فیل خانے میں پہونچا اور ہاتھی کے اگلے پیر میں کاٹ کھایا ہاتھی نے اسے پیر سے کچل ڈالا اس واقعے کو ایک ماہ پانچ دن گذر گئے، ایک دن جب کہ پانی برس رہا تھا، بجلی چمک رہی تھی رعد گرج رہا تھا ہوا تیز و تند چل رہی تھی ہاتھی نے چنگھاڑنا شروع کیا اور اس کے تمام جسم میں کپکپی شروع ہو گئی، زمین پر گر پڑا اور بڑی سخت محنت کے بعد اٹھا، سات دن تک برابر اس کے منہ سے لعاب نکلتا رہا کھانا پینا چھوڑ دیا رات دن اسی تباہ حالی سے بسر کر رہا تھا ساتویں دن جان دی اس واقعے کے ایک ماہ کے بعد ایک بڑے ہاتھی نے بھی جس دن رعد و برق اور بارش و طوفان تھا شور مچانا شروع کیا، آخر کار اس کے جسم میں رعشہ ہونے لگا اور منہ سے پانی نکلنا شروع ہوا اور اسی طرح مر گیا، اللہ نے ہر مرض کی دوا پیدا کی ہے، علاج کی کوشش کی گئی لیکن نہ کوئی دوا ملی نہ منتر،

سارس جہانگیر کو وحوش کی طرح طیور کے ساتھ بھی بڑی دلچسپی تھی چنانچہ اس نے تزک جہانگیری میں ایک ترکی مور کے متعلق تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور اسی کے ساتھ اپنے درباری مصور سے شبیہ بھی تیار کرا کے

مضمون کے ساتھ لگا دی ہے، ای. بی. ہیول نے جہانگیر کے اس مقالے کا انگریزی میں ترجمہ درج کیا ہے اور اسی کے ساتھ جہانگیر کا تیار کرایا ہوا وہ مرقع بھی لگا دیا ہے۔

ای. بی. ہیول لکھتا ہے۔

ایک ترکی مور کا مرقع غالباً منصور کا دوسرا کارنامہ ہے، اس پر بھی جہانگیر کی مہر لگی ہوئی ہے، اور اس کی تاریخ بھی جہانگیر نے اپنے روزنامچہ کے اندر ساتویں سال جلوس کے سلسلے میں لکھی ہے جیسا کہ "واقعات جہانگیری" میں درج ہے، مقرب خان جو گوا کی طرف بھیجا گیا تھا، واپسی کے وقت شہنشاہ کے لیے بہت سے نوادر خرید کر لایا، جہانگیر کہتا ہے، اس میں بعض جانور ایسے تھے جنھوں نے میرے اندر ایک حیرت انگیز دلچسپی پیدا کر دی اور جنھیں میں نے قبل کبھی نہ دیکھا تھا، بابر نے اپنے روزنامچہ کے اندر بہت سے جانوروں کی قابلانہ تصریح اور ان کی شبیہیں پیش کی ہیں لیکن غالباً گمان یہ ہے کہ انھوں نے مصوروں سے جاندار جانوروں کی تصویریں تیار نہیں کرائیں لیکن میرے سامنے جو جانور موجود ہیں وہ عجیب ندرت رکھتے ہیں۔ میں نے ان کی تصریح کی اور حکم دیا کہ ان کی تصویریں تیار کرا کے جہانگیر نامہ میں لگائی جائیں تاکہ ان کی حقیقی مثال دیکھ کر پڑھنے والے محض لفظی تفصیل کی بہ نسبت زیادہ متعجب ہوں۔"

ان طائروں میں مورنی کی شکل کی ایک چڑیا ہے، لیکن جثے میں اس سے کچھ بڑی اور مور سے چھوٹی ہے، جب اسے جفتی کھانے کی خواہش ہوتی تو وہ اپنا دم اور پر پھیلا کر مور کی طرح ناچتی، اس کا منقار اور پنجہ مرغ کی طرح ہے ہر منٹ پر اس کے سر، گردن اور حلق کا رنگ بدلتا رہتا ہے لیکن جفتی کھانے کے لیے جب زیادہ بیتاب ہو جاتی ہے تو مونگے کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتی، تھوڑی دیر کے بعد وہ ایسی سفید ہو جاتی جیسے روئی اور بعض اوقات اس کا رنگ بالکل آسمانی ہو جاتا مختصر یہ کہ اس کا رنگ گرگٹ کی طرح بدلتا رہتا، گوشت کا حصہ جو اس کے سر کے ساتھ چسپاں ہے تاج خروس کی طرح معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے جسم کا عجیب و غریب حصہ وہ تھا کہ جب وہ جفتی کھانے کے لیے ہوتی تو ہاتھی کی سونڈ کی طرح ایک بالشت لٹکتا رہتا اور جب اپنی جگہ پر آ جاتا تو انگل سر کے اوپر بلند ہوتا، اس جانور کی آنکھوں والا حصہ برابر آسمانی رنگ کا رہتا اور اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا کرتا بازو کا یہ حال نہ تھا، اس کا رنگ مور کے برعکس بدلتا رہتا۔"

ای. بی. ہیول لکھتا ہے کہ جہانگیر نے جس جانور کی تفصیل لکھی ہے اس کا نام اس مقالہ کا مترجم "ترکی مور" بتاتا ہے اور یہ حیرت کی بات ہے کہ خود ترکستان میں اسے ہندوستان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہاں اسے "ہند توغی" کہتے ہیں[۱]۔

---

[۱] تمام تفصیلات کے لیے دیکھو انڈین اسکلپٹر اینڈ پینٹنگ مصنفہ ای. بی. ہیول،

کائنات کے اجزائے ترکیبی میں جذب وکشش کو جو دخل ہے وہ سائنس کی مشہور حقیقت ہے بزم کائنات کے اسی رمز کو جان لینے کے بعد صوفیہ نے عشق وجمال پر اپنی طریقت کی بنیاد رکھی، کائنات کا ہر ذرہ حسن کا جلوہ زار ہے، حسیات کی ساری دنیا میں موج عشق کی بیتابیاں ہیں

ہے تنگ سینہ دل اگر آتش کدہ نہو　　ہے عار دل نفس اگر آذر فشان نہیں

معتمد خان نے سارس کے عشق کا ایک حیرت انگیز واقعہ لکھا ہے، یہ قصہ خیالی نہیں اس لیے اگر آپ اس سے کوئی روحانی لذت لینا چاہتے ہیں تو اسے افسانہ نہ سمجھیے بلکہ حقیقت جان کر پڑھیے اسے حقیقت سمجھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ای بی ہیول نے اپنی کتاب میں عہد مغلیہ اور خصوصیت کے ساتھ عہد جہانگیری کے عجیب وغریب طیور کی تصویروں کے متعلق جو حالات لکھے ہیں ان میں ایک بڑے سارس کا مرقع بھی لگایا ہے جو نہ صرف فن مصوری کے اعتبار سے قابل قدر چیز ہے بلکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سارس وغیرہ کا قصہ جو معتمد خان نے لکھا ہے صحیح ہے۔ اقبال نامہ میں ہے،

"از موانست ومحبت سارس با جفت خود نقلہاے غریب بر زبان جاریست
قیام پسر شاہ محمد قندھاری کہ قراول بیگی حضرت شاہنشاہیست در خدمت شاہی
نقل کرد [1]"

معتمد خان نے واقعہ بیان کرنے سے قبل راوی کا نام اور موقعہ بیان بھی نقل کر دیا ہے، قیام نامی شاہی قراول نے جہانگیر کی خدمت میں اپنا ذاتی مشاہدہ بیان کیا کہ

میں نے شکار کرتے وقت ایک سارس کو دیکھا جو کہ ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا، میں نے چاہا کہ بندوق سے شکار کروں اس ارادے سے چند قدم آگے بڑھا کہ جب کھڑا ہو تو اسے گولی ماروں لیکن مجھے حیرت ہوئی جب اس نے مطلق حرکت نہیں کی میں اس کے نزدیک ہوتا گیا مگر اس میں ذرا وحشت پیدا نہیں ہوئی میں نے دل میں کہا شاید بیمار ہے جب میں اس کے پاس آیا تو اس کا پیر پکڑ کر اٹھایا، اسقدر ہلکا تھا کہ گویا اس کے بدن میں ایک مثقال بھی گوشت نہو گا، دو تین قدم ڈگمگاتا ہوا چلا اور گر کر مر گیا، جب میں نے اچھی طرح سے اسے ملاحظہ کیا تو دیکھتا ہوں اس کے سینے میں کیڑے پڑے ہیں اور چہرہ تحلیل ہو گیا ہے، جہاں پر بیٹھا ہوا تھا ایک مردہ سارس کی چند ہڈیاں نظر آئیں جنھیں یہ بال و پر کے نیچے دبائے بیٹھا تھا [2] معلوم ہوا کہ سینے کے اندر اپنے جوڑے کی ہڈیاں لیے تھا،" آہ غالب نے شاید کسی عاشق کی اسی لطافت حسن کی طرف اشارہ کیا تھا،

---

[1] اقبال نامہ وقایع سال یازدہم　[2] میں نے اپنی آنکھوں سے پہلواری کے متصل ایک تریکڑ دری جگہ کمیدان میں

بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۳۹

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے — دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زندان کا

جہانگیر مالوے کی طرف جا رہا تھا، اثنائے راہ مین ایک خواجہ سرا سارس کے دو بچے پکڑ لایا، جب بادشاہ شکار سے واپس آیا تو سارس کا ایک جوڑا شاہی خلوت خانے کے نزدیک بے وحشت و خوف آکر بیٹھ گیا اور مظلومانہ انداز سے فریاد و فغان شروع کی بڑی جستجو کی گئی خواجہ سرا بچون کو بادشاہ کے حضور مین لایا، بچون کو دیکھ کر وہ بیتابانہ ان کے نزدیک آئے اور اس خیال سے کہ انھون نے کچھ کھایا نہ ہوگا اپنے منہ سے کچھ نکال کر بچون کے منہ مین کھلانا شروع کیا اور بڑے شوق کے ساتھ بچون کو درمیان مین لے کر آشیانہ کی طرف اڑ گئے

(اقبالنامہ وقایع سال یازدہم)

گورتیا جہانگیر ایک مرتبہ اجمیر سے کشمیر جا رہے تھے، تھانیسر کے اطراف مین خود مصنف کے ایک خواجہ سرا نے ایک جنگلی گوریا کا بچہ پکڑ لیا، اس کی مان بھی فریاد کرتی ہوئی ساتھ آئی، خواجہ سرا نے بچے کو پنجرے کے اندر بند کر دیا، اور پنجرے کو اپنے سے کچھ دور رکھا، اس کی مان جنگل مین جاتی تھی اور چارہ لاکر اس بچے کو کھلاتی تھی دوسرے دن جب کوچ ہونے لگا تو اس کی مان بھی ساتھ ہو گئی اور اگلے دنون کی طرح بچے کو چارہ لاکر کھلاتی رہی جب یہ خبر مصنف کو معلوم ہوئی تو اس نے خواجہ سرا سے کہا کہ بچے کو ہاتھ پر رکھ لے، مان آئی پہلے دو تین مرتبہ بچے کے چارون طرف اڑی اس کے بعد بیتابانہ وہ بھی ہاتھ پر آکر بیٹھ گئی اور اسی طرح چودہ منزل تک لشکر کے ساتھ رہی یہان تک کہ بچے مین کچھ قوت آگئی، مان اسے اڑا کر اپنے ساتھ لے گئی،

ہما معتمد خان نے ہما کا تذکرہ بہ تفصیل لکھا ہے 'ہما' ہماری فارسی شاعری مین رمزیات و استعارہ اخلاقی موعظت کا موضوع قرار پا گیا ہے بعض محققین کا خیال ہے کہ فارسیون نے یہ خیال اساطیر و اوہام سے لیا ہے چنانچہ سعدی کے اس شعر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳) ایک سانپ کا نہایت ہی حیرت انگیز واقعہ دیکھا کسی سپیرے نے ایک دھامن سانپ کو مار ڈالا تھا اس کی مادہ تین چار دن تک اس کی لاش کے گرد رقص کرتے کرتے مر گئی مین جس وقت پہونچا دو یا تین دن ہو چکے تھے لاش سے بدبو نکل رہی تھی، دیہاتی حلقہ باندھے کچھ کھڑے تھے بعض بیٹھے تھے، معتقدین نے پھول چاول دودھ چڑھایا تھا، لوگ جوق جوق آ رہے تھے لوگون کا بیان تھا کہ متعدد بار اس مادہ سانپ کو اس جگہ سے ہٹا کر دور رکھ دیا گیا لیکن رات کے وقت پھر آگئی، لوگون نے منہ کھول کر دودھ وغیرہ دینا چاہا لیکن اس نے نہین پیا، مردہ سانپ کے گرد بیتابانہ طواف کر رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایک کراہ کی آواز نکلتی تھی یہ عجیب تماشہ خود میری آنکھون نے دیکھا اور آج تک مجھے اس واقعے پر سخت حیرت ہے سننے مین آیا ہے کہ چار یا پانچ دن تک خواب و خور ترک کرکے وہ مادہ اپنے جوڑے پر نثار ہو گئی سنا ہے ہندوؤن نے وہان "ستی" کی ایک یادگار بنائی ہے

کس نیاید بزیر سایۂ بوم ور ہما از جہان شود معدوم

کے اندر یہی اساطیری فکر و احساس کام کر رہا ہے ہر چند غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ سعدی ہما کے متعلق اپنا ذاتی عقیدہ نہین بیان فرما رہے ہیں بلکہ انہون نے اپنے اخلاقی بیان مین ایک مشہور خیال سے تمثیل دیدی ہے ہما کے متعلق جو عقیدت مندیان پائی جاتی ہیں انکا اساطیری پہلو کتنا ہی مضحکہ خیز کیون نہو لیکن خود وجود ہما سے انکار کر دینا تاریخ طبعی کے عمیق مطالعہ پر مبنی نہین مصنف لکھتا ہے

بتاریخ نوزدہم شہر محرم الحرام ہزار و سی و پنج ہجری از کشمیر متوجہ دار السلطنت لاہور شدند پیش ازین مکرر بعرض رسیدہ بود کہ در کوہ پیر پنجال جانورے می باشد مشہور بہ ہمائے و مردم این سرزمین می گفتند کہ طعمہ اش استخوان است و پیوستہ بر روئے ہوا پر دازکنان مشاہدہ می افتد نشستہ کم بنظر آمدہ چون خاطر اشرف اعلی حضرت شاہنشاہی بہ تحقیق این مقدمات توجہ مفرط دارد حکم شد کہ از قراولان ہر کس تفنگ زدہ بحضور بیارد پانصد روپیہ انعام می فرمایم قضا را جمال خان قراول بہ بندوق زدہ بحضور اشرف آورد چون بپایش رسیدہ بود زندہ تندرست بنظر درآمد . . . . از حوصلہ اش استخوان ریزہ برآمدہ و مردم این کوہستان معروض داشتند کہ مدار خورش استخوانست ہمیشہ بر روئے ہوا پر دازکنان چشم برزمین دارد و ہر جا استخوانے بنظرش درآمد بہ نول خود گرفتہ بلند می شود و از انجا بر روے سنگ می اندازد تا بشکند و ریزہ ریزہ شود، انگاہ می چیند و می خورد درین صورت غالب ظن آنکہ ہمائے مشہور ہمین باشد چنانکہ گفتہ اند،

ہمائے برہمہ مرغان ازان شرف دارد کہ استخوان خورد و طائرے نیازارد

در جثہ و ترکیب بہ عصبات شباہت دارد و سر دنولش بشکل مرغ می نماید لیکن بر شکل مرغ پرنہ دارد و این پر ہاے سیاہ براق درحضور وزن فرمودند چہار صد و پانزدہ تولہ کہ یک ہزار و سی و ہفت و نیم مثقال باشد بہ وزن درآمد[1]

(اقبالنامہ جہانگیری وقائع سال نوزدہم) (باقی)

عبدالمالک

---

[1] ہم لوگون کے موجودہ وزن کے مطابق پانچ سیر تین چھٹانک ہوا،

قصرِ شیرین

قصر شیرین سرحد ایران پر دولت عجم کا پہلا شہر ہے جہان تک پہنچتے پہنچتے کھجور کے درخت بالکلیہ غائب ہو جاتے ہین اگرچہ قزل رباط سے آگے ہی عربی زبان بہت کم سنائی دیتی ہے مگر قصر شیرین میں شاید ہی دو چار عربی سمجھتے ہون ورنہ تمام تر فارسی اور کردی بولتے ہین، فارسی اور کردی زبان مین وہی فرق ہے جو لکھنؤ کی شہری اردو اور ہمارے پورب کی دیہات کی بولی مین فرق ہے، کردی اس حیثیت سے صرف گنوارون اور دیہاتیون کی زبان پر جاری ہے، مہذب آدمی ہمیشہ کردی بولنے سے شرماتا ہے اور فارسی مین گفتگو کرنے کو ترجیح دیتا ہے، فارسی اور کردی زبان کا فرق ذیل کی چند مثالون سے عیان ہوگا، مثلاً

فارسی	کردی
مرحبا، بسر و چشم آمدی	مرحبا، بان چاؤ باتوی
خانہ شما کجاست	مال تو کوا
این راہ بکجا می رود	این ریہ گا لہ کوا ردی
من گرسنہ ہستم	من برسیم
من تشنہ ہستم	من تینیتیم

قصر شیرین مین میرا قیام بحیثیت ڈپٹی اسسٹنٹ پولیٹکل افسر اس عمارت مین تھا جس کو سرباز خانہ کہتے ہین اور جو ایک بڑے بارک کے طرز کی عمارت ہے، روسیون کے ہاتھون قصر شیرین کی بربادی سے پہلے (جس کی وجہ سے تمام قصر شیرین تقریباً ویران پڑا ہوا ہے اور اب از سر نو تھوڑا تھوڑا آباد ہو رہا ہے) اسی عمارت مین ایرانی سرحدی فوج کا ہیڈ کوارٹر تھا جب ترکون کے بعد روسی فوج قصر شیرین مین داخل ہوئی تو عمارت کے تمام کواڑ اور دھنیان نکال کر جلانے کی لکڑی کے کام مین صرف کی گئین اور اب یہ تمام عمارت بالکل ویران پڑی ہوئی ہے بجز ان تین چار کمرون کے جن کو مینے اپنے قیام کی وجہ سے وقتی طور سے درست کرا لیا ہے، چنانچہ رات کے وقت

نیچے دریاے حلوان کی شورش اور بوسیدہ مکان مین میرے کُردی گارڈ کا آوازہ[1] اور بقیہ کھنڈرون مین گیڈرون کی ہا ی دہو سے عجیب ڈراونی قسم کی چل پہل پیدا ہو جاتی ہے لوگون کا بیان ہے کہ میرے کمرے کے بالکل نیچے وہ کوٹھری ہے جس مین روسیون نے مقتول ایرانیون کی بہت سی لاشین پھینکی ہین اور سناٹے مین اس کوٹھری سے آہ و بکا کی آواز سنائی دیتی ہے، سربازخانہ ایک اونچی پہاڑی کے ٹیلے پر واقع ہے جس کے نشیب مین ایک طرف مکانات اور بازار پھیلے ہوے ہین اور دوسری طرف دریاے حلوان بہتا ہے قصر شیرین مین جو کچھ درخت یا سبزہ یا کھیت ہے وہ صرف دریاے حلوان کے کنارے کنارے تھوڑی دور تک پایا جاتا ہے دریا کے پار ایک بڑا باغ باغ شاہی کے نام سے مشہور رہے، جہان مختلف قسم کی سبزیان، انجیر، میٹھے اور ترش لیمون دستیاب ہوتے ہین اس کے علاوہ قصر شیرین کے چارون طرف بالکل سناٹا ہے اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیون کے خشک سلسلے بے ترتیب ہر طرف پھیلے ہوئے ہین، سربازخانہ کے قریب ایک پہاڑی کا زیادہ حصہ سفید ہے جس پر پہلے مجھے سنگ مرمر کا دھوکا ہوا مگر بعد کو معلوم ہوا کہ یہ صرف چونے کے کام مین آتا ہے

قصر شیرین کا بازار اور شہر قابل ذکر نہیں، زیادہ تر عمارتین کچی سفالہ پوش اور شکستہ ہین، دکانون مین دو چار بقالون اور چند بزازون کے سوا کچھ نہین، بازار کے آخری سرے پر ایک بڑی دومنزلہ ایرانی عمارت ہے جو زمانۂ جنگ سے پہلے یہان کا سرکاری مدرسہ تھا، مگر روسیون نے اس کو بالکل تباہ و برباد کر دیا ہے، اب کی دیوار جو دریا کی جانب ہے گولیون سے چھلنی ہو رہی ہے، روسی غریب کردون اور ایرانیون کو پکڑ کر اسی دیوار کے قریب کھڑا کر کے باغ شاہی سے اپنے نشانے کی مشق کیا کرتے تھے اور لاشون کو حلوان مین بہا دیتے تھے، اس سے آگے ایک کہنہ و شکستہ قلعہ ہے جو قلعہ جوان میر کے نام سے مشہور ہے یہ بھی سرباخانہ کی طرح ایک بلند ٹیلے پر بنایا گیا ہے اور نہایت مستحکم تیمر کی عمارت ہے قلعے کے اندر کی عمارتین جواب گر رہی ہین اس بات کا پتہ دیتی ہین کہ انکا بنانے والا تمدن جدید سے متمتع ہونے کا اہل تھا، جوان میر ایک کردی قبیلہ ہماوند نامی کا سرگردہ تھا، قزاقی اس کا پیشہ تھا اور ایک عرصے تک ایرانی حکومت اس سے سخت نالان رہی حتی کہ عوام کی روایت کے مطابق ایک بار شاہ ناصرالدین کی لڑکی کو جو کربلا کی زیارت کو جا رہی تھی اس نے پکڑ کر اپنے پاس بطور یرغمال کے رکھ چھوڑا۔ جب تک پادشاہ بغداد اس کی پشت پناہی پر تھا ایرانیون کو ہمیشہ پریشان کرتا رہا، مگر جب پاشا سے بھی ناچاقی ہوئی تو ایرانیون نے اس پر قابو پا کر قتل کر ڈالا اور اس کے مشہور قلعے کو مسمار کرا دیا،

قلعۂ جوان میر کے آگے ایرانی گرگ خانہ ایک اچھی اور معقول عمارت تھی مگر ترکون اور روسیون کی کشمکش مین

---

[1] آوازہ کردی گیت جو رات کو پاسبان گاتے ہین،

بالکل تباہ و برباد ہوگئی اور اس کے تمام در و دیوار شکستہ حالت مین پڑے ہوے تھے قلعہ جوان میر، گرگ خانہ، سرباز خانہ اور مکتب ایرانی یہ سب قصر شیرین کی پبلک عمارتین ہین، گرگ خانہ اور قلعہ جوان میر مین مکانون کے اندر تہخانے بنے ہوے ہین اور صحن مین حوض و فوارے کے نشانات پائے جاتے ہین، جس کے چارون طرف کشادہ اور ہوادار دالان بنے ہوے ہین، سرباز خانہ کی کوٹھری کے اندر ایک آتش دان اور چھت مین ہوا کے لیے جدید اصول پر روشن دان بنے ہین، انکی تمام کھڑکیان دریاے حلوان کی طرف کھلتی ہین جہان سے دریا اور پھر دور کی بلند پہاڑیون کا نہایت عمدہ منظر سامنے رہتا ہے

آثار قدیمہ مین شیرین کا محل جس کو یہان چار قاپی یعنی چار دروازہ (ترکی مین قاپی یا قپو دروازے کے معنی مین آتا ہے) ایک مربع اونچی عمارت ہے اور اس کے پاس ایک سلسلے مین اور بھی بہت سی چھوٹی عمارتین ہین، یہ سب عمارتین بلا تراشے ہوے پتھر کی بنی ہوئی ہین مگر اب پتھرون کے ڈھیر ہو رہے ہین اور پراگندہ پتھرون کو موجودہ آبادی اپنے مکانون مین لگانے کے لیے اٹھا کرلے جاتی ہے، چار قاپی کے اندر ایک بڑے حوض کے نشانات پائے جاتے ہین۔ مکان کی دیوارون پر کوئی کتبہ یا نشان رہا ہوگا مگر اب سب مٹ گئے ہین، اندر کئی جگہ جنگلی کبوترون نے گھونسلے بنا لیے ہین

دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرہ مین لکھا ہے کہ اس محل کے اندر یہ قدیم شعر کندہ تھا،

ہژبرا بگیہان انوشہ بدے　　　جہان را بدیدار نوشہ بدے

اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ عضد الدولہ دیلمی کے زمانے تک بروایت ابو طاہر قانونی یہ کتبہ موجود تھا، یہ پہلا شعر ہے جو ایران مین قبل اسلام معلوم ہوا ہے، قصر شیرین کا ویرانہ دو میل کے دور مین پھیلا ہوا ہے اور چارون طرف شہر پناہ کے نشانات معلوم ہوتے ہین، تاریخ عرب مین اس نام کا کوئی شہر نہ تھا بلکہ جہان پر قصر شیرین ہے وہان ایک بڑا شہر حلوان آباد تھا اور ممکن ہے کہ یہ تمام ویرانہ اسی حلوان شہر کا ہو۔ دریا اس ویرانے سے دور ہٹ گیا ہے۔ اور زمین رفتہ رفتہ بلند ہوگئی ہے اور اب تمام میدان خشک و بے برگ و گیاہ ہے،

قصر شیرین کے قریب ایک مقام چاہ سرخ سے مٹی کا تیل نکلتا ہے، اب انگریزون نے اس پر قبضہ کرکے عراق کی سرحد مین شامل کرلیا ہے، بالفعل تیل نکالنے کا اجارہ حکومت سیاسی عراق کی طرف سے قصر شیرین کے ایک بہت بڑے تاجر یہودی کو دے دیا گیا ہے، جو وہان سے کثیف تیل بھروا کر گدھون پر قصر شیرین لاتا ہے اور سرباز خانہ کے نیچے ایک مکان مین پرانے طریقے سے صاف کرا کر بازار مین فروخت کرتا ہے یہ صاف شدہ تیل مین بھی فوج کے لیے خریدتا ہون خاصا کام دیتا ہے،

قصر شیرین کی موجودہ آبادی تقریباً دو سو مکانون پر مشتمل ہوگی، یہان کے مالدار عموماً یہودی ہین جنکی طرز معاشرت بالکل ایرانیون کی طرح ہے اور انھین کی طرح مرزا اور خان کا لقب خود استعمال کرتے ہین اگرچہ مسلمان ہمیشہ ان کو خواجہ کا لقب دیتے ہین۔

یہودیوں میں سب سے زیادہ متمول اور جو خود ہماری فوج کے ٹھیکیدار ہیں خواجہ ہارون، عزیز و خواجہ داؤد ہیں یہ تینوں بھائی ہیں یہ لوگ زمینداروں اور سرداران قبائل سے سبزی میوہ گیہوں۔ بھیڑ بکریاں کم داموں پر خرید کرکے ہمارے ہاتھ دہ چند قیمت پر فروخت کرتے ہیں

ایران کے شہروں میں جو بات سب سے زیادہ عجیب نظر پڑتی ہے وہ کلاہ ایرانی ہے، ہمارے یہاں کے ایک بہت بڑے دیگچے کو جس میں پانچ سیر چاول پک سکتے ہیں اُلٹ کر سر پر رکھ لو تو وہ ایک قسم کی ایرانی ٹوپی ہو جائے گی، ایک دوسری وضع کی ٹوپی تقریباً ایک ہاتھ لانبی ہوتی ہے جو نیچے سے نصف فٹ دور میں شروع ہوکر اوپر چند وسے کے پاس دو فٹ کے دور میں ہو جاتی ہے، نیچے کی گولائی میں بالعموم شوقین مزاج لوگ رنگین ریشمی رومال لپیٹ لیتے ہیں، ایک تیسری قسم کی ٹوپی کی بالکل کاسہ سر کے ڈھانچے پر بنائی جاتی ہے جو سر کی پوری گولائی کو حلقہ کر لیتی ہے، چوتھی قسم کی مہذب ٹوپی جو عموماً یورپین فیشن والے ایرانی زیب سر کرتے ہیں وہ ہمارے ہندوستان کے ہندوؤں کی فلٹ کیپ کی خواہر بزرگ معلوم ہوتی ہے، ایک قسم کی اور ٹوپی میرے دیکھنے میں آئی ہے جسے اکثر شکاری پہنتے ہیں اس میں سامنے انگریزی ٹوپی کی طرح چھجا نکلا رہتا ہے اور جرمن سپاہیوں کے ہیلمٹ سے زیادہ مشابہ ہوتی ہے، ٹوپیوں کے بعد متوسط طبقے کے ایرانیوں کا لباس عربوں کی طرح زبول اور عبا ہوتا ہے۔ لیکن زبول بے رنگ نہیں ہوتا بلکہ سروں کے شلوار کو جو عموماً نیلے رنگ کا ہوتا ہے نمایاں کرتا رہتا ہے، یہ شلوار اکثر بڑے پائنچے کا پاجامہ ہوتا ہے جیسے لکھنؤ میں اکثر پرانے فیشن کی عورتیں پہنتی ہیں ایرانیوں کا جوتا غالباً ان کے لباس میں سب سے اچھا ہوتا ہے اگرچہ پائدار نہیں ہوتا، اس کی ساخت اور ہمارے یہاں کے کریپ سول جوتے کی ساخت میں بہت کم فرق ہوتا ہے پتھریلی زمین اور کیچڑ میں چلنے کے لیے بہت آرام دہ ہوتا ہے، میں نے اکثر عورتوں کو دیکھا ہے کہ جُرّاب کی طرح شوقیہ فرصت کے وقت اس کو بنا کرتی ہیں۔

جس زمانے میں میں قصر شیرین میں آیا تھا وہ جون جولائی کا مہینہ تھا، اور عراق کی طرح ان دنوں یہاں بھی سخت گرمی پڑ رہی تھی، لوگ زیادہ تر چھت پر سوتے تھے، نومبر سے کچھ کچھ سردی شروع ہو جاتی ہے، اور ان ایام میں بارش بھی ہوتی ہے، دسمبر، جنوری اور فروری کے ایام میں اگر بارش نہ ہو تو موسم بالکل ہندوستان کا سا رہتا ہے قصر شیرین کی آب و ہوا بجز جون، جولائی کی سخت گرمی کے ہمیشہ ہندوستانیوں کے لیے معتدل رہتی ہے اگرچہ صحت بخش نہیں ہے میں خود گرمی بھر بخار میں مبتلا رہا، اور یہی حال تقریباً آدھے سے زیادہ فوجیوں اور یہاں کی آبادی کا تھا، میرا خیال ہے کہ یہ زیادہ تر عوام کی غلاظت و گندگی کے سبب سے ہے یہاں گھروں میں ادب خانے (پاخانے) نہیں ہوتے، لوگ باہر میدان میں جاکر حوائج ضروری سے فارغ ہوتے ہیں، مجھے خود اپنے کموڈ کی صفائی کے لیے فوج سے ایک مہتر بلانا پڑتا تھا لوگ اپنی بدتمیزی سے حوائج ضروری کے لیے دریا کے کنارے بلکہ اکثر شہر کے اندر سڑکوں پر بیٹھ جاتے ہیں اور سارا شہر غلاظت سے

متعفن رہتا تھا، میرا معمول تھا کہ صبح اُٹھ کر حلوان کے ٹھنڈے پانی مین غوطہ لگایا کرتا مگر جب کئی بار غلاظت سے پاؤن آلودہ ہوگیا تو مین ایسا گھبرایا کہ آخر کار مجبوراً اس لطف کو چھوڑنا پڑا،

قصر شیرین مین مین نے نہ کوئی مسجد دیکھی اور نہ اپنے ایام قیام مین کبھی اذان کی آواز سنی اسکا سبب غالباً یہ تھا کہ آبادی مین زیادہ حصہ شیعون کا ہے مگر افسوس کہ دارالاسلام مین خاص شعائرِ اسلام کا رواج نہین، مین نے سنا ہے کہ یہان کوئی حمام بھی نہین اور چونکہ اس ملک کا طریقہ یہ ہے کہ نہانے کا انتظام بھی گھر سے باہر حمام مین ہوا کرتا ہے اسلیے غالباً یہان لوگ طہارت کو بھی ضروری نہین سمجھتے۔

ترکون اور روسیون کے زمانۂ قیام قصر شیرین مین یہان کی غریب آبادی پر جو ہولناک مظالم کیے گئے تھے ان کی شہادت صرف در و دیوار کی شکستگی سے نہین بلکہ خود بقیۃ السیف آبادی کی زار و نزار حالت سے بھی ملتی ہے مسلمان غالباً معترض ہون کہ مین روسیون کے ساتھ ترکون کو کیون لپیٹ رہا ہون مگر یہ حق پسندی کے خلاف ہے۔ جو کچھ بھی حسین رؤف بک (سابق کپتان حمیدیہ) اور بہابک ترکون کے جیش الاحتلال نے کیا، اس مین خواہ کتنی ہی مبالغہ آمیزی کیون نہو مگر واقعہ یہ ہے کہ مین نے ایک متنفس کو انھیں اچھے نام سے یاد کرتے نہین سنا، ان کے نزدیک جیسا مجھ سے بیان کیا گیا، عرب و ایرانی و کرد کا خون گھوڑے اور خچر کے خون سے بھی کم قیمت رکھتا تھا، ایک کرد نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک بیچارہ ایرانی سید درویش کربلائے معلی زیارت کو جا رہا تھا، ترکون نے جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لیا، اور آناً فاناً اس کو قتل گاہ مین لے گئے، درویش نے بہابک سے کہا کیا آپ خدا سے نہین ڈرتے بہابک نے کہا اللہ کریم در یعنی اللہ کون ہو، غیر مفلوک الحال آبادی کے لیے انگریزون کی انسانیت یا ڈپلومیسی جو کچھ بھی کہو اس بات پر مجبور رہوئی کہ ان کو خود فوج کے سامان رسد سے حصہ دیا جائے اور اس کی صورت یون کی گئی کہ فاقہ کش مگر شریف خاتونین کیمپ کے چارون طرف ہلکے ہلکے کام پر لگادی جاتین اور شام کو مزدوری کے عوض ان کو پورا راشن دیا جاتا، اس کا انتظام میرے متعلق تھا اس کام مین مجھے صد درجہ پریشانی اٹھانی پڑتی تھی کیونکہ فوجی سپاہی ان کو چھیڑتے اور اکثر گمراہ کرنے پر بھی کامیاب ہو جاتے اس مین ایک غریب مگر نہایت غیرت مند کُردی نوجوان لڑکی تھی جس سے خود مجھ کو محبت ہوگئی اور آخر مین مین نے اس سے شادی کرلی، میری عمر اس وقت اکیس [۲۱] برس سے زیادہ نہ تھی، اور کالج سے نکلے ہوے مجھے ایک سال بھی نہ ہوا تھا، مجھے اس وقت نہ بتقاضائے سن خانہ آبادی کی اتنی فکر تھی اور نہ ضرورت تھی مگر دل نے بے قابو کر دیا، اس کی علٰحدہ داستان ہے یہان صرف اتنا کہنا چاہتا ہون کہ ترکون نے آبادی کو قحط زدہ بنایا تھا اور جب انگریزی دور کی برکات مین انکی تزئین مقرر ہوئی تو میرے ہاتھ اتفاقیہ وہ بہشت بہا گوہر لگا جو شاید کسی دوسری صورت سے ممکن نہوتا اس لیے مین ترکون کی بُرائی مین بھی اپنے لیے ایک بھلائی پاتا ہون، مین ان کا پہلے بھی دعاگو تھا اور اب تو اور زیادہ ہون،

میری یہ متاہل زندگی ۷ رجون ۱۹۱۸ء سے شروع ہوئی اور ۲۶ رنومبر ۱۹۲۱ء کو ہندوستان مین ختم ہوگئی

گویا کہ وہ ایک نہایت شیرین خواب تھا جو مین پھر کبھی نہ دیکھونگا لیکن اس یاد کے ساتھ قصر شیرین کی یاد کبھی کبھی تڑپا دیتی ہے اور یہ مضمون صرف اسی تڑپ کے مٹانے کے لیے حوالۂ قلم ہے۔

میری بیوی متوسط کُرد طبقے کی لڑکی تھی مین فارسی اور عربی مین اپنا مطلب تو بے تکلف ادا کرسکتا تھا، اور ترکی میں وقت کے ساتھ مگر کردی کا ایک لفظ بھی میری سمجھ مین نہ آتا تھا، اسی طرح میری بیوی سوائے کردی کے خود فارسی زبان بھی نہ بول سکتی تھی۔ مگر ذہانت کا یہ حال تھا کہ چند ماہ مین نہایت صاف فارسی اور ٹوٹی پھوٹی ترکی بولنے لگ گئی کردی عورتون کا لباس بالکل اسی وضع کا ہوتا ہے جیسے ہماری طرف بلوچنون کا مگر میری بیوی ایرانی اور ترکی لباس بھی پہنتی تھین اور مین نے ان کو ساری اور فراک کا شوق بھی دلایا، پیرون اور ہاتھون مین کوئی زیور نہین ہوتا، سر پر ایک گول ٹوپی اور بعض اوقات ریشمی رومال بندھا رہتا ہے، کانون مین آویزے اور گلے مین گلوبند میری بدعت تھی، اور میری بیوی نے قصر شیرین مین اس کا فیشن کر دیا تھا، کردی عورتین جو ٹیلاق[۱] کی رہنے والی ہوتی ہین وہ بالعموم نہایت سُرخ و سپید و حسین ہوتی ہین مگر ان کا نقشہ تیکھا نہین ہوتا، بالعموم بلند قد اور قوی و توانا ہوتی ہین، جیسے ہمارے یہان کی جاٹنیان۔ میری بیوی بھی ٹیلاق کی پروردہ تھین اور وہی حلیہ ان کا تھا جو ان کی قوم کا تھا، گھوڑے کی سواری اور بندوق کا نشانہ دونون مین مجھ سے زیادہ مشاق تھین اور قد بھی مجھ سے کچھ ہی کم تھا، حالانکہ شادی کے وقت ان کی عمر چودہ برس سے زیادہ نہ تھی۔

قصر شیرین مین مین نے متواتر پانچ ماہ گذارے اگرچہ زیادہ تر مجھے سبزی فروشون اور یہودی بھیکدارون سے سابقہ پڑتا تھا، لیکن خانہ داری کی زندگی شروع ہوتے ہی مین قصر شیرین کی سوسائٹی مین داخل ہو گیا،

دریائے حلوان کے دوسری طرف ایک نہایت فرحت افزا باغ ہے جس کو باغ شاہی کہتے ہین، شاہ ناصر الدین جب کربلائے معلیٰ کی زیارت کو جا رہے تھے تو انھون نے موکب شاہی کی یادگار مین ایک باغ کی بنیاد ڈالی گویا یہ ایک قسم کا پبلک گارڈن ہے اور اس کا انتظام شرفائے قصر شیرین مین سے ایک کے سپرد کر دیا اب یہ اس خاندان کی وراثت ہے اور یہ اپنے لقب باغبان باشی کے نام سے مشہور رہے، موجودہ باغبان باشی ایک نہایت دلچسپ اور حد سے زیادہ موٹے انسان ہیں مجھ سے بہت جلد مانوس ہو گئے، مین ان کی دعوت پر ہمیشہ شام کو قاطر پر سوار ہو کر دریا کو پار کر کے باغ شاہی مین جاتا جہان سماوار گرم ہوتا، چائے کا دور چلتا اور لطف و کیف سے زندگی بسر ہوتی مگر افسوس ہے کہ اب ایسے جلسۂ احباب مین تمدن جدید کے طفیل مین بجائے چائے اور قہوہ کے کسی اور چیز کا دور رہتا ہے۔

قصر شیرین مین میرا ایک اور رفیق شاہ مراد نامی دکان دار تھا، کرد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی گفتگو مین

---

[۱] ٹیلاق انگریزی ہائی لینڈ کا مرادف ہے

دال ہمیشہ گرا دیتے ہین مثلاً وہ بغداد کو کہین گے بغا، محمد کو محہ، احمد کو احہ، مجھے کرُد سید احمد کے نام سے جانتے تھے تو میری بیوی اور تمام کرد مجھے سید احمد کی بجائے سیا احہ سے پکارتے اور مین سمجھتا کہ وہ مجھے سیاہ کہ کر میری تحقیر کرتے ہین کیونکہ ہندو سیاہ مشہور رہے اگرچہ مین کالا نہ تھا اور میرے ہی رنگ کے قصر شیرین کے اور تمام لوگ تھے بعد کو معلوم ہوا کہ یہ سید احمد کا بگاڑا ہوا لفظ ہے خیر تو شاہ مراد کا نام کردون کی زبان پر ہمیشہ شاما رہتا ہے، پہلے جب شاما کا لفظ مین نے سنا تو مجھے گمان ہوا کہ یہ کسی ہندوستان کا پیارا ہندوانہ نام تو نہین بعد کو پتہ چلا کہ یہ شاہ مراد کا بگاڑا ہوا لفظ ہے خیر ہمارا رفیق شاہ مراد عرف شاما اپنی زندگی کا خود ایک فلسفہ رکھتا ہے اس مین شک نہین کہ وہ شراب کا عادی ہے مگر اس کے ساتھ حد درجے کا لاابالی اور زندہ دل ہے موجودہ پالٹکس مین بھی حصہ لیتا ہے اور جب اس سے فرصت پاتا ہے، تو کباب بیچتا ہے مگر یہ کباب بیچنا سوسائٹی مین اس کی رفعت کو کسی طرح کم نہین کرتا، اپنے کو دیا قرات کہتا ہے جسکے معنی غالبًا اس کے نزدیک زیادہ برین نیست کہ وہ موجودہ سیاست سے کچھ واقف ہے اور اخبار بینی کرتا ہے مین نے اُسکو قصر شیرین مین بھی ہر اعلیٰ و ادنی کا دوست و رہبر پایا، اور جب تک مین قصر شیرین مین رہا میرا بڑا ہی ہمدم تھا، وہ میرے گھر مین بے تکلف آتا اور گھنٹون گذرے ہوے واقعات، ترکون کی یلغار جرمنون کا تقسیم پول، روسیون کی قزاقی، مشروطہ اور استبداد کی بڑی دلچسپ داستان سناتا، اسی شاما نے مجھے بہت سی قدیم عمارتون کا پتہ دیا اور دو تین قدیم سکے یزدجرد کے زمانے کے جو کسانون کو قصر شیرین کے خرابہ مین ملے تھے مجھے عنایت کیے۔

اپنے دوستون کی بدولت مجھے کردستان کے قومی ناچ دیکھنے کا بھی موقع ملا، شادی، برات اور جشن کے دنون مین کردون کی جوان لڑکیان جوان مردون کے ہاتھ مین ہاتھ ڈال کر ایک حلقہ بناتی ہین، بیچ مین کھڑے ہو کر ایک شخص باجہ بجاتا ہے اور یہ مرد اور عورتون کا حلقہ اچھلتا ہوا گردش کرتا ہے، مرد اور عورت بالکل غیر محرم ہوتے ہین۔ عمومًا یہودی عورتین اور کردی مرد اس مین حصہ لیتے ہین، کردی عورتین اور یہودی مرد زیادہ تر تماشائی ہوتے ہین۔ مگر مین نے اکثر سلیمانیہ کے اضلاع مین کردی عورتون کو بھی یہودی مردون کے ساتھ رقص کرتے ہوے دیکھا ہے، اس ناچ کو یہان پر پھرکا کہتے ہین، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ہندی لفظ ہے یعنی ہر پھر کر آنا، اور یہ ناچ دراصل ان خانہ بدوش زنگاریون نے ایجاد کیا ہے جو ہندوستان سے گئے تھے، یونانیون اور بلقانی قومون کا ناچ بھی ایسا ہی ہوتا ہے، ہر پھرکا ہی کے سلسلہ مین مجھے یہ اندازہ ہوا کہ کردون کا حسن شامی عورتون کے بعد سب سے زیادہ دلاویز ہوتا ہے، عورتین عمومًا بلند بالا اور گداز بدن کی ہوتی ہین، اور اگر ان کی آنکھین موصل اور دمشق کی عورتون کی طرح بالکل چمکدار سیاہ ہوا کرین تو وہ ان سے حسن مین بڑھ جائین، مگر کردی عورتون کی آنکھین بالعموم شربتی یا بھوری ہوتی ہین، رنگ ان کا کشمیریون کی طرح صباحت لیے ہوے زیادہ ہوتا ہے، اور شامی عورتون کی سفید رنگت ملاحت لیے ہوتی ہے، زلفون کو شانہ کر کے اپنے رخسار کے دونون طرف ڈالے رہتی ہین اور یہی طریقہ ایرانی عورتون کا بھی ہے، چنانچہ اسی لیے شعرائے ایران جب زلف معشوق کا ذکر کرتے ہین

تو اس کی سیاہی کو رخسار کی سپیدی کے ساتھ ملا کر مقابلہ کرتے ہین حیرت ہے کہ ہندوستان کا شاعر جہاں عورتیں چوٹیاں گوندھ کر پیچھے ڈال لیتی ہین وہ کیون زلف اور رخسار کا ساتھ ذکر کرتے ہین، اسی طرح ایران مین خال کا وہ مفہوم نہین سمجھا جاتا جو ہندوستان مین ہے خال وہاں تل کو نہین بولتے بلکہ وہ نیلا گودنا ہوتا ہے جو عورتین اپنے رخسارون کے دونون طرف اور ٹھوڑی پر گدواتی ہین، تل کو نشانہ بولتے ہین اور یہ خوبصورتی کے بجائے عیب ہے، کردستان مین جب موسم بہار آتا ہے تو تمام خشک پہاڑیان گل و سبزہ سے دولہن بن جاتی ہین اجڑیان چہکنے لگتی ہین، ہوا مین ایک عجیب تازگی پیدا ہو جاتی ہے، ہر چہار طرف سے بلبل کی آوازین آنے لگتی ہین اس وقت ایرانی شاعر گل و بلبل اور بہار کی تعریف مین رطب اللسان ہوتا ہے، ہندوستان مین موسم بہار نہین آتا مگر یہان کے اردو شعرا بلبل اور گل و بہار کی تعریف اس طرح کرتے ہین، گویا خود یہ ان کے ملک کی چیز ہے، اردو کے شعرا واقعی اگر کسی چیز کی تعریف کر سکتے ہین تو وہ، ساون بھادون کا موسم ہے،

ایرانی زبان مین کُرد کے معنی دیہاتی کے ہین اور یہ غالباً ایرانی زبان کی خصوصیت ہے کہ اس مین بعض قومون کی صفات کو اس قدر ضرب المثل کر دیا ہے کہ اس کے معنی اب لغوی ہو گئے مثلاً قزاق ایک تاتاری قوم ہے اور فارسی مین ڈاکو، اسی طرح پارسا، پہلوان، لُر، ہندو، قوچی، تاتار، تازی، تُرک یہ سب قومون کے نام تھے اب ان کے معنی نیک بخت، طاقت ور، بے وقوف، کالا غلام، خدمتگار، نامہ بر، بھگوڑا اور معشوق کے آتے ہین۔

کردون مین بہت سے الفاظ ایسے ہین جو عجیب طرح سے ہندی الفاظ سے مشابہت رکھتے ہین مثلاً پیاد کے معنی مرد کے ہین اور ہندی مین بھی پیا عاشق مرد کے لیے آتا ہے، جاجم کے معنے چادر، شامہ کے معنی کالا ایسے ہی ہندی کا ہے جو کردی مین سیا ہے لڑکی کو کنشا کہتے ہین جو کنیا کی بگڑی ہوئی صورت ہے

مین نے قصر شیرین کا محرم دیکھا، باغبان باشی اس کے سرغنہ ہین یہان مین نے تعزیہ نہین دیکھا، دُلدل کا رواج ہے جس پر ایک سُرخ چادر پڑی ہوتی ہے اور اس کے ارد گرد ننگے جسم، ننگے سر، ننگے پیر اور زلف پریشان عورتون کا غول ہوتا ہے، ایک اپنا منہ نوچ کر لہولہان کرتی ہے اور دوسری اپنی چھاتی پیٹ پیٹ کر، بعض خواتین خنجر اور زنجیر سے اپنے سینے کو زخمی کرتی ہین۔ ماتم والون کے ساتھ ایک سرکاری گارڈ رہتا ہے تاکہ کوئی شخص اپنے کو مہلک ضرب نہ لگائے۔ اکثر ایسے حادثات ہو چکے ہین۔ بہرحال محرم مین کوئی خاص بات نہ تھی اور نہ مجھے اُس پر زیادہ روشنی ڈالنے کی حاجت ہے۔

قیام قصر شیرین مین مجھے اکثر مضافات کے گاؤن بھی دیکھنے کا موقع ملا، قصر شیرین کے جنوب مین دس میل دور ایک زرخیز خطہ گیلان کا ہے، یہ وہی گیلان ہے جہان شیخ عبدالقادر گیلانی پیدا ہوئے تھے، کیخسرو کہا کرتا تھا کہ میری مملکت مین ایک منزل پر برف پڑتی ہے اور دوسری منزل پر باد سموم چلتی ہے۔ جو شخص ایران مین رہا ہے وہ یقیناً

اس قول کی تائید کرے گا، مین نے کہین بھی اتنے کم فاصلے پر ٹمپریچر کا ایسا اختلاف نہین دیکھا، قصر شیرین کا خطہ بلند پہاڑون کے دامن مین واقع ہے اور یہ حصہ ایران کا گرم سیر کہلاتا ہے، جہان بقول میری بیوی کے "ہوائے قصر شیرین آدم را کور می کند" گرمی بھر بخار اور آشوب چشم مین آبادی مبتلا رہتی ہے، پائے طاق قصر شیرین سے مغرب کی جانب اندرون ایران کوئی بیس چھبیس میل دور ہے، یہ مقام ایک بلند پہاڑ کے دامن مین واقع ہے اس بیس میل کے اندر قصر شیرین اور پائے طاق کی آب و ہوا کا وہی تناسب ہے جو شملہ اور دہلی کی آب و ہوا مین ہے۔ جب مین قصر شیرین سے گرمی مین چل کر یہان آیا تو اختلاف ہوا سے میرے ہونٹھ پھٹ گئے، جیسا شروع جاڑے مین اکثر ہندوستان مین ہوجاتا ہے سرپل ایک گاؤن ہے جو پائے طاق اور قصر شیرین کے ایک نہایت شاداب میدان مین واقع ہے اور یہ سب مقامات قصر شیرین، کرند، کرمانشاہان کی شاہراہ پر واقع ہین، سرپل کے شمالی جانب زہاب کا زرخیز میدان واقع ہے جو مغربی ایران مین سب سے زیادہ زرخیز خطہ سمجھا جاتا ہے، لوگ کہتے ہین کہ یہ زر آب کا بگاڑا ہوا ہے، یہان کی سب سے بڑی کاشت مکا ہے جس کو یہان ذرات بولتے ہین، یہ یہان کی سب سے بڑی غذا ہے

سرپل کا میدان اور زہاب کا میدان دریائے حلوان اور ایک چھوٹی پہاڑی سے جو بالکل دریائے حلوان کے متوازی چلی گئی ہے جدا ہو جاتا ہے، سرپل کو سرپل زہاب بھی کہتے ہین اور غالبا سرپل کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہان دریائے حلوان پر ایک پرانا پتھر کا پل بنا ہوا ہے، پہاڑی کا سلسلہ تین حصون مین تقسیم ہے، پہلے حصے کا شمالی رُخ قدیم ایران نقوش و تصاویر سے مزین ہے ہر سلسلے کے آخر مین ایک گاؤن ہے، ایک گاؤن کا نام میان گل ہے یہان کردون کا ایک قبیلہ ناچ گانے کا کام کرتا ہے اور ہمارے یہان کے نٹ سے مشابہت رکھتا ہے، ہمارے فوجیون کی تفریح گاہ یہی گاؤن ہے، اکثر مجھے اڈجوٹنٹ اور کرنیل کی تلاش مین شام کو یہان آنا پڑتا تھا، پائے طاق اور سرپل کے کرد عموماً علی اللٰہی ہین جو نصیریون کا سا عقیدہ رکھتے ہین۔ اور میرے نزدیک کسی حیثیت سے مسلمانون کی جماعت مین داخل نہین کیے جاسکتے سور کا گوشت ان کے نزدیک ہر بیماری کی دوا ہے، طہارت اور نماز نہین جانتے داڑھی رکھنا نا سخت معیوب جانتے ہین، سال مین ایک روزہ رکھتے ہین، بجائے لا الہ الا اللہ کے ان کا کلمہ جو وہ صبح و شام پڑھا کرتے ہین، اول و آخر علی غالب ہے، غرض کہ جو کچھ ان کا خدا، پیغمبر، رسول، امام ہے وہ علی کی ذات ہے، اس فرقہ کا سب سے بڑا مرکز کرند ہے، علی اللٰہی عباس اور داؤد کو بھی اپنا پیشوا جانتے ہین، ایران مین جب تم کسی ایرانی کو بات کرتے ہوے سنو گے تو ممکن نہین کہ وہ دوران گفتگو مین ابوالفضل عباس کے سر کی قسم نہ کھائے، اور علی اللٰہی کردون مین یا عباس ایسا ہی تکیہ کلام ہے جیسا سنی کردون مین یا غوث! ابوالفضل عباس غالبًا حضرت عباس عم رسول کی کنیت تھی اور آل عباس کو شیعہ نہین مانتے مگر شاید یہ یادگار ہے عباسیون کے وقت کی کہ ان کو اپنے آبا و اجداد خصوصًا ابن عباس کے نام کو روشن کرنے کی بڑی آرزو تھی،

ایک علی اللہی نے اپنے عقیدے کے متعلق مجھ سے ایک عجیب روایت بیان کی کہنے لگا کہ حضرت علی جب ایران تشریف لائے تو ایک بڑھیا کے یہاں ٹھہرے، اس کا ایک لڑکا تھا وہ حضرت علی کی کرامتیں دیکھ کر انھیں کو خدا کہنے لگا، حضرت علی نے اس کو غصے میں قتل کر دیا مگر بڑھیا کی آہ و بکا سے حضرت علی کو رحم آیا اور انھوں نے اس لڑکے کو از سر نو زندہ کر دیا، جب وہ زندہ ہو گیا تو وہ حضرت کی خدائی کا اور زیادہ معتقد ہو گیا حضرت علی نے غصے میں پھر اس کو قتل کر دیا اور اس طرح کئی بار قتل کیا اور جلایا، آخر کار تھک گئے اور اس لڑکے کو اپنے حال پر چھوڑ دیا، اس لڑکے کی اولاد سے علی اللہی پیدا ہوئے اور چونکہ حضرت علی نے اس لڑکے کو بشارت دی تھی کہ تیری نسل خوب چلے گی اور وہ میری خدائی کا اقرار کرے گی اپنے کو کسی دوسرے خدا کا بندہ مت کہلانا، داؤد کے متعلق مجھے معلوم نہ ہوا کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ نبی داؤد سے بظاہر کوئی دور کا تعلق بھی ان کردوں کو نہیں ہے غالباً یہ کسی باطنی فدائی و داعی کا لقب ہے جس کو ان احمقوں نے یاد کر لیا ہے، خلاصہ یہ کہ ایران کے اندر یہ فرقہ اس زمانے کی یادہے جبکہ منافقین، مجوس، زنادقہ، و باطنیہ فرقوں میں ظاہر ہو کر فتنے کے سبب ہوئے ہیں

میدان زہاب کے رہنے والے کرد سُنّی عقیدے کے ہیں اور سرپل کے باشندے بھی سُنی ہیں ان کے رئیس شہباز خان سے ملا ہوں، آدمی نہایت سنجیدہ و خاموش ہیں، اور برخلاف اپنی قوم کے نہایت دُبلے پتلے حقیر و لاغر شخص ہیں ان کی بیوی گوہر خانم ایک علی اللہی سردار قادر سلطان کی بہن ہے جو نہایت بذلہ سنج، تعلیم یافتہ اور شاعرہ خاتون ہے اور اس کے ساتھ حسن خداداد ایسا ہے کہ جنھوں نے خانم موصوف سے ملاقات کی ہے (اور وہ کسی سے پردہ نہیں کرتیں) ان کو ضرور ملاقات کے ختم ہونے کا افسوس ہوا ہو گا، میں شہباز خان کے پاس اپنے قیام سرپل میں کئی بار گیا انھوں نے میری ملاقات اپنے سالے سے کرائی اور ان دونوں نے جو فارسی بہت صاف بولتے ہیں میری بڑی حرمت و عزت افزائی کی۔

سرپل سے کوئی پانچ میل اُتر کی طرف ایک بلند پہاڑی پر ایک شکستہ قلعہ ہے جو قلعۂ یزدگرد کے نام سے مشہور ہے، اس کے قریب ایک قدیم کہنہ مسجد ہے جو مسجد بابا یادگار کہلاتی ہے، کہتے ہیں کہ یہ مسجد حضرت سعد فاتح ایران نے بنوائی ہے، اس کے چاروں طرف انجیر کا بہت بڑا جنگل ہے اور ان پہاڑیوں سے بہترین شہد نکلتا ہے، پہاڑ دفعۃً زمین سے اونچا ہو گیا ہے اور پہاڑ کے اوپر پہنچنا مشکل ہے میرے ساتھ اصفہان کا ایک درویش سفید کلاہ پہنے ہوئے ساتھ تھا، جو کربلا جا رہا تھا، بڑا دلچسپ قصہ گو تھا اور اپنی گذر اوقات اخروٹ بیچ کر کیا کرتا تھا،

میرا کیمپ بالکل دریائے حُلوان کے ساحل پہ کرمانشاہان بغداد کے شاہراہ پر تھا، اور قیام سرپل میں مجھے ایران کے بہت بڑے لوگوں کی مہربانی کا فخر حاصل ہوا ہے، اس میں نصرت الممالک گورنر کرمانشاہان، اخوند کرمانشاہان اور وزیر خارجیہ ایران بھی تھے، جنھوں نے میرے ساتھ کرند جاتے ہوئے چائے پی اور ایک تبریزی کی

ایرانی خاتون دلبر خانم جو تنہا کربلا جا رہی تھیں اپنے خادم کے ساتھ میرے یہاں شب باش ہوئیں، جب وہ رخصت ہوگئیں تو معلوم ہوا کہ وہ روس کی ایک مفرور ارمنی عورت تھی جس کا نام مریم سیکر ڈشین تھا اور سویٹ روس کی جاسوس تھی ان سے پھر میری ملاقات بغداد میں ہوئی جہاں وہ نرس کا کام کر رہی تھیں اور جب میں نے ان سے کربلا کی زیارت کا حال دریافت کیا تو مسکرائیں اور اپنے حیرت ناک راز بتائے وہ میرے ہمراہ باکو روس تک آئیں اور اس کے بعد پتہ نہ چلا کہ ان کو زمین کھا گئی یا آسمان،

پاے طاق کی بلند پہاڑیوں پر چھوٹے چھوٹے بلوط کے درختوں کا جنگل ہے اور اس سے متعدد چشمے بہ کر میدان سرپل کو سیراب کرتے ہیں، یہ میدان جو تقریباً دس یا بارہ میل کے رقبے کا ہے کیسر قابل زراعت ہے مگر کہیں ایک درخت کا بھی پتہ نہیں، جنوب کی طرف وہی بابا یادگار والی پہاڑی ہے اور اسی کے جوار میں ایک گاؤں رجاب ہے جس میں کثرت سے میوے دار درخت خصوصاً انجیر دہی کے پائے جاتے ہیں۔

سرپل، پاے طاق میں جو خانہ بدوش کردی عشائر رہتے ہیں ان میں عشیرت گلخانی بابا یادگار کے میدان میں اکثر سردی بسر کرتی ہے، دوسری عشیرت کلہور ہے جو حلوان کے دوسرے جانب میدان میں تمام سال رہتی ہے، کلہور کے قبیلے میں شیعہ سنی دونوں مذہب کے لوگ ہیں مگر یہ لوگ گلخانیوں کی طرح لٹیرے نہیں، گلخانی قبیلہ علی اللہی عقیدہ رکھتا ہے وہ بڑا سفاک اور غارت گر قبیلہ ہے اور ان کے راستے سے کوئی حاجی، سپاہی، مسافر بچ کر نہیں جاسکتا، کلہور عموماً گلہ بانی کرتے ہیں۔ اور امن سے رہتے ہیں، تیسرا قبیلہ سنجابیوں کا ہے جو بالکل شیعہ ہیں اس قبیلے کا سردار اکبر خان ترکوں کی حمایت کی وجہ سے انگریزوں کا دشمن سمجھا جاتا تھا اور میرے زمانے میں اکبر خان ترکوں کے ساتھ مل کر لڑ رہا تھا اور انگریزی طیارے اس قبیلے کو گھیر گھیر کر بم سے تباہ کر رہے تھے زہاب کے سنی کردوں کا سرگروہ ایک شخص مصطفیٰ پاشا باجلال تھا جو ایک وقت میں ترکوں کی طرف سے بغداد کا قائم مقام رہ چکا تھا، چونکہ مٹی کے تیل کی زمین اسی قبیلے کی حدود میں زیادہ تر واقع ہے اس لیے انگریز عبدالحمید خان کے زمانے سے اس کو پرچا رہے تھے اور اس جنگ میں ترکوں کے خلاف انگریزوں کی مدد اسی قبیلے نے سب سے زیادہ کی ہے، انگریزوں کی طرف سے ایک شخص میجر سون جو جنگ کے پہلے اینگلو پرشین آئل کمپنی میں ملازم تھا، اور جو کردی مادری زبان کی طرح بولتا تھا اس قبیلے کا حاکم سیاسی مقرر کیا گیا، یہ کبھی مسلمان ہو جاتا اور کبھی ایرانی اور کبھی کچھ اپنا نام غلام حسین رکھ لیتا اسنے ایک ایرانی عورت سے شادی یا متعہ کر لیا تھا حد درجہ سنگ دل اور ظالم شخص تھا

میجر سون کے ماتحت میں بھی رہا ہوں بلکہ کردی زبان میں میرا امتحان اسی نے لیا تھا، یہ شخص ولایت جا کر مر گیا کئی کتابوں کا مصنف ہے، مصطفیٰ پاشا باجلال اب انگریزوں سے وظیفہ پاتا ہے ایک بڈھا کانا شخص ہے، اور

بغداد آتے ہوے میری اور اس کی لڑائی بھی ہوگئی، مین نے اس کے ایک طمانچہ رسید کیا اور بعد کو مجھے معذرت مانگنی پڑی ۔

سرپل مین روسیون کے آنے سے قبل ایک ایرانی تارگھر اور ایک چاپارخانہ (پوسٹ آفس) اور ایک قورخانہ (میگزین) تھا، اب سب تباہ ہوگئے ایک بہت بڑی سرائے شاہ عباسی کے نام سے مشہور مین میرے کیمپ کے مقابل واقع ہے اس مین مسافر اور زائرین کے لیے پختہ مکانات بنے ہین، یہان ضرورت کی سب چیزین مل جاتی ہین مگر روس کی تباہی کے بعد اب ویرانہ ہے'

سرپل مین چند ایرانی عملے ٹیکس وصول کرنے پر مامور ہین مگر مجھے معلوم نہوا کہ ان کی مالیات کس کی جیب مین جاتی ہے، پولیٹیکل افسر قصر شیرین کا عموماً ان عملون کی نگرانی کرتا ہے، سب سے بڑا ٹیکس جو سرپل مین وصول ہوتا ہے وہ پول چار واداری ہے جو کاروانون سے بحساب فی قران فی قاطر (خچر) اور دو قران فی شتر وصول کیا جاتا ہے اس روپے سے کسی قسم کی سڑک وغیرہ تیار نہین کی جاتی اور ایرانی عملون نے مجھ سے بتایا کہ چونکہ زہاب کی زمین شاہی املاک سے ہے اس لیے کاروان کے جانور جو سبزہ چرتے ہین یہ ٹیکس اس کی اُجرت ہے مامورین اس کے ساتھ اپنا حق بھی وصول کرتے ہین اور اس کو پول بنہ کہتے ہین جیسے ہمارے ہندوستان کے تحصیل کے عملے کرتے ہین صرف اتنا فرق ہے کہ یہان خوشامد سے لیتے ہین اور وہان سینہ زوری سے مین نے اکثر راتون کو عرب کاروانچی کو واویلا کرتے ہوے سُنا معلوم ہوا کہ مرزا اپنا پول بنہ وصول کر رہا ہے مرزا مرتضیٰ خان رئیس مالیہ ایک نوجوان ایرانی ہین، فرانسیسی جانتے ہین، شراب پیتے ہین، پاتلون پہنتے ہین اور سرپل کی لڑکیون سے وقتی نکاح کیا کرتے ہین"

ابن السبیل

لسانیات کے اصول اولین - لغت و زبان کا معیار صحت

اور

ہندوستانی اکیڈیمی کے دو لفظ تماہی اور ہندستانی

جس وقت سے صوبۂ متحدہ کا سرکاری دارالادب ہندوستانی اکیڈیمی عالم وجود مین آیا ہی اسی وقت سے اہل ملک اس کی طرف متوجہ معلوم ہوتے تھے لیکن جب سے اس دارالادب نے ایک تماہی آرگن ہندستانی کا اجرا کیا ہے اس وقت سے لوگون کو زیادہ توجہ ہوگئی ہے۔

اس رسالے کا نام بجاے ہندوستانی کے ہندستانی رکھنا اوراس کے موقت ہونے کی تفسیر بجاے سہ ماہی کے تماہی سے کرنا اس پر ملک مین دو رائین موافق و مخالف نظر آتی ہین، آج کی صحبت مین ہم بھی اسی مسئلہ پر غور کرنا چاہتے ہین لیکن اس مسئلے مین سب سے پہلے ہم کو وضع لغت و زبان پر اصولی گفتگو کرنے کی ضرورت ہے تاکہ بعد کو یہ مسئلہ از خود حل ہوجائے۔

وضع لغت و زبان "ہراسی" مشہور ادیب نے اپنی مستند کتاب "تعلیق" مین لکھا ہے کہ

وضع لغت کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ انسان کا تمدن اور تعاون باہمی قائم ہو، انسان چونکہ مدنی الطبع ہے اس لیے اس کو تعاون کی ضرورت ہے جو زبان سے قائم ہوتا ہے

اس کی تشریح ان الفاظ مین کی ہے:۔

انسان چونکہ طلب معاش و معاشرت مین تنہا کامیاب نہین ہوسکتا بلکہ اس کو دوسرون کی حاجت ہوتی ہے اس لیے اس نے شہر یا قصبہ وغیرہ مین رہنا ضروری خیال کیا تاکہ امور معاش و معیشت مین ایک دوسرے کی اعانت حاصل ہوسکے اس اعانت اور طلب مدد کے لیے کسی چیز کا مشترک ہونا ضروری تھا

اور وہ چیز زبان تھی جس کے ذریعے سے اظہار خیال اور طلب مدد کا مقصد پورا ہوتا ہے
دوسرا قول امام سیوطی نے مزہر میں یہ نقل کیا ہے۔

انسان چونکہ مدنی الطبع واقع ہوا ہے اس لیے اس کو صنائع وغیرہ کی ضرورت ہوئی، ایک انسان اپنی تمام ضرورتیں مہیا نہیں کر سکتا اس لیے دو حالتوں میں سے ایک کا ہونا ضروری ہے، یا تو اس کی حاجت اور مقصد کی چیز اس کے سامنے موجود ہوگی یا موجود نہ ہوگی، موجود ہوگی تو اسکے حصول یا طلب کے لیے اشاروں کی ضرورت ہوگی، موجود نہ ہوگی تو اس کا طلب کرنا ضروری ہوگا اس طلب اور استحصال کے لیے کلام کی ضرورت ہوگی کلام حروف اور آواز کا مجموعہ ہوتا ہے آواز کے تابع حروف ہوتے ہیں آواز کا مخرج لب، زبان تالو اور حلق ہوتے ہیں اسلیے جو حروف وضع کئے گئے انھیں مخارج کے اعتبار سے اور ان کی تعداد انتیس[۲۹] ہے۔

چونکہ مفرد حروف سے تکملہ طلب مدعا کا نہیں ہوتا تھا اس لیے ان سے دو حرفی، سہ حرفی، چہار حرفی، پنج حرفی الفاظ بنائے گئے یہی مجموعۂ حروف کلمہ اصلی قرار دیا گیا جو پانچ حرف سے زیادہ نہیں ہوتا البتہ خاص مواقع پر اس میں اضافہ کر دیا جاتا ہے، پھر الفاظ اور کلمات کیلیے معانی مقرر کیے گئے، اس کی دو صورتیں قرار دی گئیں۔

اول الفاظ متوارد

دوم مترادف

الفاظ مترادف وہ قرار دیے گئے جو ایک ہی معنی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً شیر کے لیے غضنفر، اسد، لیث حارث دلہاث وغیرہ کہ ان سب کا مفہوم ایک ہی ہے۔

متوارد وہ قرار دیے گئے کہ ایک لفظ کے کئی معنی ہوں مثلاً عین کے معنی آنکھ، چشمہ، سونا وغیرہ

پروفیسر ڈبلو، ڈی ہوٹنی ماہر لسانیات کا قول بھی انھیں اقوال کا خاکہ ہے وہ لکھتے ہیں کہ:-

لسانیات کا مواد اور موضوع زبان من حیث المجموع ہے یعنی نطق انسانی (Human Speech) کی تمام اقسام مع اپنے کثیر التعداد اختلافات کے (لسان و مطالعہ لسان صفحہ ۶)

وضع لفظ و معنے۔ تاج سبکی کا قول شرح منہاج البیضاوی میں یہ ہے کہ:-

وضع نام ہے کسی شے کو کسی شے کے ساتھ اس طرح خاص کرنے کا کہ جب ایک بولی جائے تو دوسری بھی سمجھ میں آجائے، مثلاً کہا جائے کہ "زید کھڑا ہوا" اس سے صدور قیام سمجھ میں آگیا

بعض اہل لغت کا اس میں اختلاف ہے کہ واضع نے الفاظ کو مفردات اور مرکبات کے لیے وضع کیا ہے یا صرف

مفردات کے لیے

امام رازی ابن حاجب اور ابن مالک کی رائے ہے کہ صرف مفردات کے لیے کیونکہ مرکب بالذات کوئی مستقل شے نہیں اس کی ضرورت جملوں کے استعمال اور نقل کے لیے ہوتی ہے

قرافی اور تاج سبکی دوسری شق کی تائید کرتے ہیں ان کی رائے میں مفردات اور مرکبات دونوں دوش بدوش ایک حیثیت رکھتے ہیں،

ابن ایار شرح فصول میں لکھتے ہیں کہ:-

کلام لفظ مرکب مفید و ضع کا نام ہے۔

شیخ سعد الدین کا قول ہے کہ واضع لغت نے مفردات کی طرح جملوں کو وضع نہیں کیا ہے بلکہ ان کو متکلم کے اختیار میں چھوڑ دیا ہے

امام فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر لفظ کے معنی ہوں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ معانی غیر متناہی ہوتے ہیں اور الفاظ متناہی کیونکہ مرکب ہوتے ہیں حروف سے، جو چیز متناہی ہوتی ہے وہ غیر متناہی کو محیط نہیں ہوسکتی۔ ورنہ تناہی مدلولات لازم آجائے،

ایک قول یہ بھی ہے کہ وضع لفظ سے معانی مفردہ مقصود نہیں ہوتے بلکہ ان سے مرکبات مقصود ہوتے ہیں۔

بعض ائمہ لغت کہتے ہیں کہ

الفاظ اس لیے وضع کیے گئے ہیں کہ ان کے ذریعے سے صورت ذہنیہ سمجھ میں آئے یعنی وہ صورت جس کا تصور واضع نے اپنی ذہن میں وضع کے وقت کیا ہے

بعض کی رائے ہے کہ ان سے اہیات خارجی مقصود ہوتے ہیں، شیخ ابواسحق شیرازی اس رائے کی تائید کرتے ہیں، امام رازی اول شق کے موافق ہیں

اس پر یہ دلیل قائم کرتے ہیں کہ:-

الفاظ کا تغیر صورتِ ذہنی کے تغیر کے ساتھ ہوتا ہے مثلاً دور سے کسی شخص نے ایک چیز دیکھی اسکو اس نے پتھر سمجھا اس نے اس کا نام پتھر رکھ دیا اور قریب سے دیکھا تو اس کو درخت معلوم ہوا، اس نے اس کا نام درخت رکھ دیا اور قریب سے دیکھا تو اس کو گھوڑا معلوم ہوا، اس نے اس کو گھوڑا کہہ دیا اور قریب آیا تو معلوم ہوا کہ انسان ہے اس نے انسان کہدیا اس سے معلوم ہوا کہ الفاظ معانی ذہنیہ کے تابع ہیں اور الفاظ معانی ذہنیہ کے لیے وضع کیے گئے ہیں، خارجی کے لیے نہیں۔

صاحب تحقیق کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ "خارج مین جو صورتین ہوتی ہین ان کے اعتبار سے ذہن متاثر اور متشکل ہے نہ یہ کہ ذہن خود متاثر اور متشکل ہوتا ہے۔

عباد بن سلیمان صیمری معتزلی کی رائے ہے کہ ہر لفظ اور اس کے مدلول کے درمیان مناسبت طبعی ہوتی ہے جو واضع کو وضع لفظ پر مجبور کرتی ہے۔

امام عضدالدین کہتے ہین کہ لفظ کبھی شخص خاص کے لیے وضع کیا جاتا ہے اور کبھی اس کے لیے اس طرح وضع کیا جاتا ہے کہ اس سے امر عام کا اعتبار سمجھا جاتا ہے۔

اس بحث کے ذیل مین چند ضروری مسائل آتے ہین

۱۔ ابن جنی مشہور امام لغت کا قول ہے کہ تمام لغات ایک وقت مین نہین بنتے بلکہ حسب ضرورت بنتے رہتے ہین۔

۲۔ امام رازی کا قول ہے کہ لغت معلوم کرنے کے دو ذریعے ہوتے ہین ۱ ایک صرف نقل دوسرا استنباط عقل۔

معنی کی بھی دو صورتین ہوتی ہین، تواتر، احاد، اس کی بحث آیندہ آتی ہے۔

۳۔ لغت کا علم قیاس سے ہوتا ہے؟ یا اس مین قیاس کو دخل نہین۔

ہر اسی کی رائے ہے کہ لغت مین قیاس کو دخل نہین بلکہ اس کا انحصار روایت پر ہے یہی رائے اکثر اصولیون کی ہے اکثر فقہائے لغت کہتے ہین کہ لغت مین قیاس کو بھی دخل ہے لیکن قیاس اور رائے کس کی قابل سند ہے اسکا بیان آگے آتا ہے۔

افراد لغت اس فصل مین یہ بتانا ہے کہ اگر ایک شخص ایک لغت بیان کرتا ہے اور اس کو استعمال کرتا ہے تو اُس کا استعمال دوسرون کے لیے مفید ہو سکتا ہے یا نہین ؟

امام سیوطی مزہر مین لکھتے ہین کہ اگر یہ شخص تحقیق او فضیات، اصابت رائے رکھتا ہے تو اسکا قول قابل قبول ہوگا اس کی حسب ذیل مثالین ہین۔

۱۔ ابوزید نے بداوۃ (بادیہ مین رہنا) ب کے فتحہ سے کہا۔ ان کے پہلے بداوۃ فتح سے استعمال نہین ہوا

۲۔ خلیل نے رت اور اس کی جمع رتوت استعمال کی اس کے معنی سور کے نر بچے کے ہین۔ خلیل سے پہلے کسی نے نہین کہا تھا۔

۳۔ یونس بن حبیب نے ضنیت کو ضد یہ کے معنی مین کہا ہے

۴۔ ابن انباری نے بازل کی جگہ بارلہ کہا۔

۵۔ ابو مالک کی تنہا روایت ہے کہ انھون نے بر یک "مبارک" کے معنی مین سنا ہے۔
۶۔ انھین ابو مالک کی تنہا روایت ہے کہ انھون نے چھنگلیا اور اس سے ملی ہوئی انگلی کے درمیانی حصے کا نام "بصم" سنا ہے

اُردو مین بھی افراد لغت کی حسب ذیل مثالین موجود ہین۔

۱۔ شہنشاہ اکبر نے گھوڑے کے ایک رنگ کا نام سُرنگ رکھا اور وہ رائج ہوگیا،
۲۔ اسی نے گھوڑے کی اندھیری کا نام اجیالی رکھا اجیالی کو تمام لوگ استعمال کرنے لگے
۳۔ بھنگی کو اسی بادشاہ نے حلال خور کہا جو اب بھی رائج ہے۔
۴۔ جہانگیر بادشاہ نے شراب کو رام رنگی کہا یہ لغت مشہور ہوگیا یہان تک کہ شعرا نے اپنے اشعار مین لیا طالب آملی کا شعر ہے۔

نہ ایم منکرِ صہبا و نیک می گویم   کہ رام رنگیٔ ما نشۂ دگر دارد

۵۔ محمد شاہ نے سنگترہ کو رنگترہ کہا،
۶۔ بلبل ہندوستان کو گلدُم کہا،
۷۔ ہار کو "پھلمال" کہا،
۸۔ شاہ عالم نے سرخاب کو گلسرہ کہا لیکن اس لفظ نے رواج نہ پایا تھا یداس لیے کہ شاہ عالم کی حکومت کا انحطاط شروع ہوگیا تھا،
۹۔ نواب سعادت علی خان نے ملائی کا نام بالائی رکھا، اس نے رواج پالیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان کی ترویج مین حکومت کے اختیارات اور اثرات کو بھی بہت کچھ دخل ہے ان الفاظ کی تفصیل آب حیات کے صفحہ ۴۰ و ۴۱ مین موجود ہے، اسی طرح اور بہت الفاظ ہین جنکی تفصیل ضروری نہین۔

اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ ایک شخص خلاف قیاس و روایت بھی ایک لفظ یا الفاظ بول سکتا ہے۔ لیکن یہ بحث طلب ہے کہ اس مین کیا خصوصیات اور اوصاف ہونے چاہیین۔ اس کا اجمالی بیان ہو چکا ہے تفصیل آگے آتی ہے،

کس کی روایت قابل قبول ہے؟ قبول لغت کے لیے حسب ذیل اشخاص کو آئمۂ لغت نے تسلیم کیا ہے

۱۔ ابن فارس نے فقہ اللغت مین لکھا ہے کہ:۔
راوی لغت اگر ثقہ، صادق القول، امین اور گمان سے بری ہے اور کوئی لغت اس طرح بیان کرتا ہو کہ

اس نے فلان شخص سے سنا ہے تو اس کو قبول کر لینا چاہیے

یہ شرطین اس لیے لگائی گئی ہین کہ اکثر اشخاص کلام غیر عرب کو کلام عرب سمجھ لیتے ہین یا یہ کہ اپنی رائے سے اضافہ کرنا چاہتے ہین حالانکہ یہ دونون صورتین پاکیزگی لغت کے منافی ہین

کمال بن انباری نے لمع الادلہ مین لکھا ہے کہ ناقل لغت کو عادل ہونا چاہیے خواہ مرد ہو یا عورت، غلام ہو یا آزاد، نقل و روایت حدیث کے لیے بھی یہی شرط ہے اگر فاسق اور غیر محتاط ہوگا تو اس کی روایت لغت بھی قبول نہ کی جائے گی۔

احتیاط کی شرط اسلیے لگائی گئی ہے کہ ایسا شخص نہ ہو کہ نقل لغت مین اسکی ذاتی غرض شامل ہو۔

میکسملر (Max Muller) نے اسی موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ قریب قریب انھین اقوال کی تشریح ہے وہ لکھتا ہے کہ:۔

اگرچہ زبان مین ہمیشہ تغیرات ہوتے رہتے ہین لیکن ان کا ہونا نہ ہونا آدمی کے بس کی بات نہین، قوانین زبان کے بدلنے یا اپنی مرضی کے موافق الفاظ تراشنے کا خیال ایسا ہی ہے جیسا اپنے قد کی لمبائی مین ایک انچ اضافہ کرنے کا خیال۔

ٹبریس (Tiberius) شہنشاہ روما الکبرے اور سگمنڈ (Sigismund) شاہ جرمنی نے لاطینی بولنے مین غلطیان کین اس پر معمولی درجہ کے ماہرین زبان نے کہا کہ خداوند نعمت کے جبروت جلال کی رسائی لاطینی زبان تک نہین۔

پروفیسر ڈبلو۔ ڈی ہوٹنی ایک جگہ لکھتے ہین کہ:۔

قوم، زبان کے بہت ہی ضروری اور عزیز حصہ یعنے الفاظ اور مرکبات ناقص کے بارے مین ان لوگون کو کسی قدر اختیارات عطا کرتی ہے جو اس کے اہل ہوتے ہین

ایک جگہ اپنی رائے کا اس طرح اظہار کیا ہے،

وہ قوم جو کوئی زبان بولتی ہے ایک جمہوریہ (Republic) یا عمومیہ (Democracy) جس کے اختیارات کا منبع عوام کی رضامندی اور وجہ موجہ ہین

پروفیسر موصوف ایک جگہ لکھتے ہین کہ یہ ہوسکتا ہے کہ عوام کوئی لفظ اختیار کرلین پھر وہ رائج ہو جائے۔ مثلاً ساحل ساچٹ پر پہلا اسکونر طیار ہو کر تختون سے اتارا گیا اور پانی مین ڈالا گیا تو ایک شخص نے متحیر ہو کر کہا (Oh! How she schoons) اس کے موجد نے یہ سن کر کہا! اچھا! اس کا نام (Schooner) ہی ٹھیک ہے۔ پروفیسر مذکور انحطاط زبان کا سبب لکھتے ہوا اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ مین کرتے ہین

اختلاط ناقص روایت لسان کا نتیجہ ہوتا ہے تحصیل الفاظ مین بے پروائی برتنے یاان کے سرانے
مین غلطی کرنے سے لوگ نسلاً بعد نسل زبان کو مسخ کرتے رہتے ہین ۔

۲- ابن انباری کا قول ہے کہ عدل واحد کا قول نقل لغت مین قابل قبول ہوتا ہے چاہے اس کے
موافقین مین کوئی دوسرا شخص شہادت پیش کرے یا نہ کرے اس پر دلیل قائم کرتے ہوئے لکھتا ہے
یہ نقل یا تو غلبۂ ظن کے وجہ سے ہوگی یا حصول علم کے لیے ؟ اگر حصول علم کے لیے ہے تو دو یا تین
کی شرط فضول ہے ، اگر غلبۂ ظن کے لیے ہے تو دو یا تین شخصون کی موافقت کچھ مفید نہین ،
مثلاً جمہرہ مین ہے کہ عبدالرحمن نے اپنے چچا سے بیان کیا کہ مین نے ایک اعرابی عورت سے سنا
کہ اس نے اپنی بیٹی سے کہا ھمھی اصابعك فی راسی یعنی اپنی انگلیون کو میرے سر مین حرکت دو
ھمھی اصابعك ، حرکی اصابعک کے معنی مین بالکل نئی چیز تھی ،

۳- شیخ عزالدین بن عبدالسلام اپنے فتاوائے لغت مین لکھتے ہین کہ عربی زبان کے لغات کی سند
عرب شعرا کے اشعار سے ہوتی ہے چاہے وہ کفار ہی کیون نہ ہون ، کیونکہ وہ اپنی زبان مین
تدلیس جائز نہ رکھین گے جیسے کہ مسائل طب اکثر غیرمسلم سے قبول کیے جاتے ہین اور کیے جاچکے ہین
اس مین بلوغ کی بھی شرط نہین ، شرکون کی روایت بھی قابل قبول ہے ابن درید نے عبدالرحمن
کی ایک روایت نقل کی ہے جوانھون نے ایک لڑکے سے لی ہے اسی طرح اردو فارسی مین بھی
اگر کوئی لڑکا حافظ وسعدی ، میر و داغ وغیرہ کے اشعار پڑھے تو وہ سند مین لیے جاسکتے ہین
کیونکہ اس کو کسی قسم کی تدلیس وغیرہ کا خیال نہ ہوگا ۔

۴- ابن انباری کی رائے ہین عامی کی روایت بھی قابل قبول ہے بشرطیکہ اسکو جھوٹ کی عادت نہ ہو

۵- اگر کوئی مجہول شخص کسی معین شخص کی طرف نسبت کرکے اس کی روایت بیان کرے تو کمال کے نزدیک
قابل قبول ہے اگر وہ کہے کہ مین نے ایک شخص سے سنا لیکن اس کا نام نہین جانتا تو وہ روایت
قابل قبول نہ ہوگی ۔

آپ نے دیکھا کہ ان تمام دفعات مین عدل وصدق احتیاط وبے غرضی مشترک ہین اس سے فن لغت کے
اصولی احتیاط کا پتہ چلتا ہے ۔

ان امور سے یہ مسئلہ صاف ہوگیا کہ جب کسی غیر ذمہ دار شخص کی روایت تک مقبول نہین ہوسکتی تو اسکا خود ساختہ
لفظ کہان تک درست اور صحیح ہوسکتا ہے

یہ مسئلہ آگے چل کر اور زیادہ صاف اور واضح ہوگا ،

اخذ لغت کے طریقے تسلسل مضمون اور اخذ نتیجہ کے لیے اس مسئلے پر بھی بحث ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اخذ لغت کے کیا طریقے ہیں ؟

ائمۂ لغت و ادب نے چھ طریقے لکھے ہیں :-

۱۔ کسی معتبر اور معتمد شخص یا کسی اہل زبان سے سننا اخذ لغت کا ایک طریقہ ہے

ابن فارسی کہتے ہیں کہ اگر اہل زبان کا کوئی لڑکا بھی لغت بیان کرے تو وہ بھی قابل اعتبار ہے

ابو علی قالی اپنی مشہور کتاب امالی میں لکھتے ہیں کہ "ابو حاتم نے ابو عبیدہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے خرنق بنت ہفان سے بھی لغت نقل کی ہے،

ایک بار وہ اپنے شوہر کا مرثیہ پڑھ رہی تھی

ہمارے ایک عرب دوست نے بیان کیا کہ اگر کوئی شخص مختلف قبائل کے محاورات سیکھنا چاہے تو حجاز کے قہوہ خانہ میں بیٹھے۔

۲۔ دوسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے فلاں شیخ کے سامنے یہ لغت بیان کیا تھا اور اس نے قبول کر لیا۔

۳۔ طریقہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی امام لغت، یا اہل زبان کے پاس بیٹھا ہو اور ایک تیسرا شخص لغت بیان کرے اور اہل زبان اس کو قبول کر لے

۴۔ چوتھا طریقہ یہ ہے کہ کوئی اہل زبان کسی کو اجازت دے دے کہ یہ لغت بیان کرنا یا یہ کہ اپنی کوئی تحریر کسی کو دے دے

حضرت رسول اللہ صلعم نے جو خطوط بادشاہوں کے پاس روانہ کیے تھے وہ بھی ایک طرح سے استعمال محاورات کی اجازت تھی۔ ابن انبار نے اس کو جائز کہا ہے

۵۔ پانچواں طریقہ مکاتبت اور مراسلت ہے

تغلب نے اپنی امالی میں لکھا ہے کہ مازنی نے میرے پاس یہ شعر لکھ کر بھیجا اور لکھا کہ اصمعی نے پڑھا تھا

. . . .

۶۔ چھٹا طریقہ یہ ہے کہ کسی کتاب معتبر میں لغات دیکھے جائیں چاہے اسکے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکے،

ابو عبیدہ نے کتاب ایام العرب کا حوالہ دیتے ہوئے اس قسم کے اشعار پڑھے کہ وہ سند میں پیش کیے جا سکتے تھے،

اہل زبان و زباندان فارسی اور اُردو کے علاوہ انگریزی اور دوسری زبانہائے یورپ میں بھی "اہل زبان"، اور "زباندان"، کا اعتبار یہاں تک کیا جاتا ہے کہ ان کے اقوال سند میں پیش کئے جاتے ہیں۔
ہندی زبان کا بھی یہی حال ہے۔

عربوں میں حجاز اور قریشی کی زبان مستند سمجھی جاتی تھی، قرآن پاک اسی زبان میں نازل ہوا، "حدیثیں"، اسی زبان میں بیان کی گئی ہیں۔ فارسی میں شیراز اور اصفہان کی زبان ٹکسالی سمجھی جاتی تھی، ہندی میں (برج) یعنے متھرا کی زبان مستند تھی، اُردو میں دہلی اور لکھنؤ کی "زبان"، سند سمجھی جاتی ہے۔

دہلی اور لکھنؤ کے اسکولوں کے متعلق عرصہ سے دو فریق تفوق اور امتیاز کے دعویدار ہیں۔
ہمارا فیصلہ وہی ہے جو آزاد نے آبحیات میں اور مولوی سید احمد صاحب مولف فرہنگ آصفیہ نے "محاکمہ مرکز اُردو" میں کیا ہے۔
آزاد صاحب آبحیات میں لکھتے ہیں کہ :-

میرے دوستو! تم جانتے ہو کہ ہر شے کی اصلیت اور حسن و قبح کے واسطے ایک مقام ایسا ہوتا ہے کہ جیسے سکہ کے لئے ٹکسال، کیا سبب ہے کہ ابتدا میں دلی ٹکسال تھی؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ دارالخلافت تھی دربار ہی میں خاندانی امراء اور امیرزادے خود صاحب علم ہوتے تھے۔ ان کی مجلسیں اہل علم اور اہل کمال کا مجمع ہوتی تھیں، جنکی برکت سے طبیعتیں گویا ہر شے کے سلیقے اور شائستگی اور لطافت و ظرافت کی قالب ہوتی تھیں، اسی واسطے گفتگو اور لباس، ادب آداب، نشست برخاست، بلکہ بات بات ایسی سنجیدہ اور پسندیدہ ہوتی تھی کہ خواہ مخواہ سب کے دل قبول کرتے تھے۔ ہر شے کے لئے ہمیشہ نئی نئی تراش، نئی نئی اصلاحیں، اور ایجاد و اختراع وہاں سے ہوتے تھے۔ اور چونکہ دارالخلافت میں شہر شہر کا آدمی موجود تھا۔ اس لئے وہ دلپذیر اصلاحیں ہر شہر میں عام ہوجاتی تھیں۔ چنانچہ بہادر شاہ سے پہلے تک وہی جذبات کے لئے سند رہی۔ اور انہی صفتوں سے لکھنؤ نے بھی سند افتخار حاصل کی دلپسند ایجادوں۔ رنگین باتوں کا ایجاد ہونا کسی شہر کے اینٹ پتھر کی تاثیر نہیں، ہاں شائستہ اور رنگین مزاج لوگ جہاں جمع ہوں گے وہیں سے وہ پھول کھلنے لگیں گے۔ چنانچہ وہی دلی کے لوگ اور ان کی اولاد تھی کہ جب تباہی سلطنت اور آبادی لکھنؤ کے سبب سے وہاں پہونچے تو چند روز میں ویسے ہی تراشیں وہاں سے نکلنے لگیں۔ لکھنؤ دارالسلطنت ہوگیا۔ اور اس کے ضمن میں زبان بھی دلی کی رعایت سے آزاد ہوگئی۔ (آب حیات صفحہ ۶۶) آزاد ہونے کے یہ معنے نہیں کہ جو محاورات دہلی میں بولے جاتے تھے۔ اہل لکھنؤ نے ان کو ترک کردیا۔ مذموم سمجھنے لگے۔ بلکہ اپنے محاورے بھی شامل کردئے،

اس کی مثال آتی ہے !

مولوی سید احمد صاحب اہل لکھنؤ کو اہل زبان دہلی کے مقابلہ میں زباندان ماننے پر مجبور ہوئے ہیں۔
صاحب تسہیل البلاغتہ نے اس سلسلے میں ایک فیصلہ کن تحریر حوالہ قلم کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ :-

علم اللسان سے زبانوں کے پیدا ہونے ترقی و تبدُّل اور ان کے باہمی تعلق اور رشتے اور مرنے کی کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے، اس کے علاوہ اہل زبان کے محاورے اور روزمرہ کا جاننا بھی ضروری ہے
کسی ملک میں جا، اگرچہ سارے قطعہ ارض کا نام ایک ہے، لیکن کسی شہر میں کوئی میوہ اچھا پیدا ہوتا ہے۔ کسی میں کوئی، کہیں ایک صنعت زیادہ ترقی پر ہے کہیں دوسری، لیکن کسی خاص قریہ کے اشیا اور اس کے باشندے اپنے اوصاف میں امتیاز رکھتے ہیں، یہی حال زبان کا ہے کہ سارا ملک یا ملک کا بڑا حصّہ ایک زبان بولتا ہے لیکن شہر کی زبان . . . . دوسروں سے ممتاز ہوتی ہے۔ وہ شہر اس زبان کا مرکز اور وہاں کے باشندے اہل زبان کہلاتے ہیں۔ یہ امتیاز کئی وجہ سے حاصل ہوتا ہے :

(۱)۔ وہ زبان اس خاص قریہ میں پیدا ہوتی ہے۔ اور وہاں سے تمام ملک میں پھیلتی ہے۔

(۲)۔ شہر کے خاص و عام وہی زبان بولتے ہیں۔

(۳)۔ اس شہر میں ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ جو زبان کو تراش خراش کر خوش نما اصلاحیں دیتے۔ موثر اور دلنشین انداز بیان نکالتے نئے نئے اسالیب بیان پیدا کرتے ہیں، اور زبان کو ایسی وسعت دیتے ہیں کہ وہ ہر طرح ادائے مطلب پر قادر ہو جائے۔

(۴)۔ ان لوگوں کے کلام دوسرے لوگوں کے لئے زبان دانی کے سبق آموز ہوتے ہیں، دوسرے شہروں کے لوگ جو اپنی طبعی مناسبت اور اہل زبان کی صحبت یا شاگردی یا ان کے کلام کے مطالعہ سے زبان سیکھتے ہیں ۔ " زباں داں " کہلاتے ہیں، ان کا دائرۂ زباں دانی اکتساب کی حد تک محدود ہوتا ہے۔

مولف " محاکمہ " نے تو اس حد تک سختی سے کام لیا ہے کہ وہ سوا " دہلی " کے کسی شہر کو " اہل زبان " بننے کا حق نہیں دیتے ، وہ لکھتے ہیں کہ :-

ہند کے اطراف و جوانب کے باشندے گو وہ لکھنؤ۔ اکبرآباد، بنارس، کانپور۔ میرٹھ یا لاہور وغیرہ کے رہنے والے کیوں نہ ہوں دائرۂ تقلید سے خارج نہیں ہو سکتے " (محاکمہ مرکز اردو صہ ۵ و ۶) ہماری ذاتی رائے اس تعصب کی موئد نہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں جس طرح " انسان " کے لئے ایک مرکز، دار الحکومت، ارباب حل وعقد سلطنت، قوانین ضروری ہیں، اسی طرح زبان کے لئے لازم ہیں۔ ورنہ کوئی چیز مشترک نہیں رہ جاتی، عدم اشتراک

"تمدن" کے منافی ہے، اس لئے کسی جگہ کا "مرکز زبان" ہونا لازم اور ضروری ہے۔ ضرورت مرکز پر سجاد مرزا دہلوی مولف تسہیل البلاغۃ حسب ذیل خیالات کا اظہار کرتے ہیں:-

"جو لوگ اچھے زباں داں نہیں وہ اعتراض کرتے ہیں کہ کسی خاص شہر کو مرکز زبان قرار دیکر وہاں کی زبان کو صحت کا معیار قرار دینا ہٹ دھرمی ہے، ان کو معلوم نہیں کہ زبان کے اختلاف سے کیسی کیسی عملی دقتیں پیدا ہوتی ہیں؟ برسر حکومت قومیں اسی وجہ سے کوشش کرتی ہیں کہ ان کی زبان ان کے تمام مقبوضات میں رائج ہے، زبان کی فتح مستقل اور مادی فتح ہے۔ ہماری رائے میں اہل زبان ہونے کے شرائط میں تین پہلی شرطیں ایسی ہیں کہ وہ خود دہلی اور لکھنؤ کو ہندوستان کے دوسرے شہروں سے ممتاز کر چکی ہیں۔

سب سے زیادہ اہم شرط یہ ہے کہ وہ شہر کے عام وخاص ایک ہی زبان بولیں۔ دہلی اور لکھنؤ میں یہ امتیاز نمایاں ہے، دہلی کے متعلق مولف فرہنگ آصفیہ ایک روایت لکھتے ہیں کہ:-

ایک بڑھیا جاڑے کے موسم میں سوسو کرتی ہوئی بازار سودا لینے جارہی تھی، کسی دوکاندار نے پوچھا بڑی بی اس طرح کیوں سکڑتی ہوئی جارہی ہو؟ اس نے جواب دیا کہ بھائی برف کٹ رہی ہے۔ یہ خاص محاورہ ہے۔ جو غیر اہل زبان کے خاص لوگوں کو بھی میسر نہیں۔ لکھنؤ میں بھی اس قسم کی مثالیں ملیں گی۔

مدینۂ طیبہ میں کچھ لوگ پانی کی تلاش میں سرگرداں ایک چشمہ کے قریب پہونچے۔ اتفاق سے اس کا پانی کھاری تھا، ایک سات برس کی عرب لڑکی نے کہا:-

یا حجاج ھذا ماء اجاج ھنالک العذب تحت الباسقات

"حاجیو! یہ پانی کھاری ہے، شیریں پانی وہ کھجوروں کے نیچے ہے۔"

جو لوگ عربی زبان کی خوبی سے واقف ہیں اس فصاحت اور بلاغت پر سر دھنیں گے سب سے آخر میں اس موضوع پر یہ کہنا مناسب ہوگا۔ کہ "اہل زبان" کے رگ وپے، خون کی روانی میں زبان کی شیرینی اور صحت کا اثر ہو جاتا ہے، یہی چیز ان کے فضل و امتیاز کے لئے ایسی ہے۔ جو دوسروں کے مقابلہ میں قابل تسلیم ہے۔

دہلی اور لکھنؤ کے علاوہ ہندوستان کے اور حصوں میں علما اور شعرا کا ایک وقت میں خاصا مجمع رہا ہے لیکن وہ "مرکز" زبان قرار نہیں پائے۔

"ولی دکھنی" مشہور شاعر کے اشعار اور زبان قابل اعتنا نہ ہوئے جب تک انہوں نے "شاہ گلشن" کے مشورے سے ان کو دہلی کے ٹکسالی زبان میں نہیں ڈھالا۔

اضافہ لغات و محاورات جب انسانی معاشرت اور ضروریات زندگی تخلیق لغات وزبان کا سبب ٹھہریں۔ تو ان میں جس قدر اضافہ ہوتا جائے گا۔ زبان کی وسعت ناگزیر ہے۔

تمام زبانوں کی وسعت کا یہی راز ہے۔

انگریزی زبان کچھ دن پہلے بیس ہزار الفاظ کا مجموعہ تھی، آج چند دنوں بعد ایک لاکھ سے زیادہ الفاظ اس کی ملکیت میں آ گئے۔ ابھی ایک لغت تیار ہو رہا ہے۔ جس کے متعلق یہ دعوے ہے کہ بیس لاکھ الفاظ اور محاورات پر حاوی ہوگا، ہم نے اس کا اشتہار دیکھا ہے۔

امریکہ دنیا میں اس وقت سب سے بڑا تجارتی مقام کہا جاتا ہے۔ وہاں کی حالت یہ ہے کہ روزانہ الفاظ اور محاورات میں اضافہ ہو رہا ہے۔

عربی میں پہلے ہزاروں کی تعداد میں عبرانی اور سریانی الفاظ شامل ہوگئے۔ اور اب یوروپ کے الفاظ جگہ لے رہے ہیں۔

مسلمانوں نے جب ایران فتح کیا تو چند ہی دنوں کے اندر فارسی پر عربی چھاگئی۔

عربی میں جو الفاظ عبرانی و سریانی داخل ہوگئے۔ عربوں نے ان کو اس طرح معرب بنایا کہ اصل نقل میں غائب ہوگئی مثلاً:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ماخوذ ہے شمار احارا رحیما سے۔

حکیم	حاخام سے
جہنم	جی ہنوم سے
سلام	شلام سے
اسم	اشم سے
مسک	مشک سے

یہودی شالوم علیخیم کہتے تھے۔ لیکن عربی میں یہی السلام علیکم ہوگیا۔

مصری قدیم ملینے ہیرو غلیفی زبان میں "دبی"، رئیس خاندان کے معنے میں تھا۔ عربوں نے اسے بجنسہ لے لیا۔

لاطینی زبان میں (Palatium) پالاٹیم تھا۔ عربوں نے اس کو "بلاط"، کیا۔

یونانی میں کالاموس (Kalamos) تھا عربوں نے "قلم"، کرلیا

قرآن نازل ہوا تو اس نے ان الفاظ کو ترک نہیں کیا۔ جو عربی میں رائج تھے اور غیر عربی تھے

اس جگہ اصولی طور پر ایک بات سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ معرب کرنے والے اہل زبان تھے۔ اور کس اصول کے تحت میں تعریب جاری کرتے تھے۔ مثلاً جب کوئی لفظ لیتے تھے تو اس کو اپنی زبان کے وزن، قالب میں ڈھال لیتے تھے۔ اور اس میں تصریف کرتے تھے۔

ایسے بھی الفاظ ہیں جو ان قیود کے تحت میں نہیں آئے مثلاً خراسان۔ ابراہیم۔ اطریفل۔ ایلیلج۔ ابریشم۔ اجر۔ شطرنج۔

ان الفاظ کے لئے عربی میں کوئی وزن نہیں۔ مگر بے تکلف اپنے اشعار میں ان کا استعمال جائز رکھتے تھے۔ مثلاً :۔

قالوا خراسان اقصی ما یراد بنا
ثم القفول فقد جئنا خراسانا

جوہری نے صحاح میں لکھا ہے کہ عرب، عجمی کلمات کو استعمال کرتے تھے تو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھال لیتے تھے۔

جوالیقی نے بھی معرب کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کے موافق ہے، اس کی رائے میں اس قسم کے الفاظ کا حکم یہ ہے کہ وہ باعتبار اصل عجمی ہیں اور باعتبار حال عربی۔

ابوحیان نے ارتشاف میں لکھا ہے کہ اسمار عجمیہ کی تین قسمیں ہیں۔

اوّل۔ وہ اسمار ہیں کہ عربوں نے لے کر اپنی زبان کے اوزان اور اسمار میں ڈھال لیا، مثلاً "درہم" اور "بہرج"

دوم۔ وہ اسماء ہیں کہ ان میں تغیر تو کیا لیکن زبان عربی کے کسی وزن وغیرہ میں نہیں لیا۔ مثلاً "اجر"

سوم۔ وہ اسماء ہیں جنکو ان کی اصلی حالت پر چھوڑ دیا۔ مثلاً "خراسان"

اس اصول تعریب کے علاوہ ائمہ لغات عرب نے عجمی الفاظ کی پہچان کے لئے بھی قواعد اور ضوابط مقرر کئے ہیں، وہ سات ہیں :۔

۱۔ نقل سے معلوم کرتے ہیں کہ فلاں امام نے اس کو لیا ہے۔
۲۔ اسماء عربیہ میں ان کا درست نہ اترنا۔ مثلاً ابریسم۔
۳۔ جس لفظ کا شروع حرف نون ہو۔ اور آخر سین وہ عجمی ہے مثلاً نرجس
۴۔ جس میں زے، دال کے بعد ہو مثلاً مہندز۔
۵۔ جس لفظ میں صاد اور جیم یکجا ہوں مثلاً صولجان

۶ - جس لفظ میں جیم اور قاف اکٹھا ہوں مثلاً منجنیق۔
۷ - خماسی اور رباعی ہو لیکن حروف زلاقہ نہ ہوں (حروف زلاقہ ی۔ ر۔ ف۔ ل۔ م۔ ن) ہیں

اسی طرح اور ائمہ نے بہت شرطیں لکھی ہیں۔ ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اُردو زبان کا وجود ہی دوسری زبانوں کی دریوزہ گری ہے۔ اس کو خصوصیات کے ساتھ اہل زبان اور زبان کا محتاج ہونا قرین عقل ہے۔

اُردو زبان کو وسعت دینے کے لئے اساتذہ نے فارسی الفاظ اور فارسی محاورات اس طرح لئے کہ وہ اُردو کی ملک ہو گئے مثلاً

۱ - عرق عرق شدن فارسی ہے، اس کو ذوق نے اُردو میں اس طرح لیا ہے سے

آگ دوزخ کی بھی ہو جائے گی پانی پانی،
جب یہ عاصی عرق شرم میں ترجائیں گے

۲ - موئے آتش دیدہ - غالب نے اس طرح لیا ہے:۔ سے

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

۳ - گردن مینا - آتش کا شعر ہے:۔ سے

ہر شب شب برات ہے ہر روز روز عید
سوتا ہوں ہاتھ گردن مینا میں ڈال کے

پہلے مصرعہ میں شب برات - روز عید خالص فارسی ہے۔ لیکن اُردو میں اساتذہ نے رائج کیا ہے۔

۴ - منت کشیدن - احسان لینا - مشہور مصرعہ ہے:۔

اے دعائے سحری منت تاثیر نہ کھینچ۔

۵ - گوش کردن - سُننا - سوداؔ کا شعر ہے:۔ سے

کب اسکو گوش کرے تھا جہاں میں اہل کمال
یہ سنگ ریزہ ہوا ہے درعدن مجھ سے

اہل کمال - سنگریزہ - درعدن فارسی ترکیبیں ہیں۔ جو اُردو میں عام طور پر رائج ہیں۔

۶ - زنجیر کردن - زنجیر کرنا - زنجیر پہنانا - انشا نے کہا ہے۔

سودا زدہ دل ہے تو یہ تدبیر کریں گے
اس زلف گرہ گیر سے زنجیر کریں گے

سودا زدہ دل۔ زلف گرہ گیر۔ فارسی ترکیبیں ہیں۔

۷۔ لفظ صرف اور صرف دربان خالص فارسی ترکیب ہے۔ اس کو غالب نے اس طرح لیا ہے :۔ ؎

تھیں دعائیں جسقدر وہ صرف درباں ہوگئیں

اگرچہ یہ ترکیب اُردو نے ابتک اور ترکیبوں کی طرح قبول نہیں کی ہے۔ لیکن فارسی میں بالکل درست ہے۔

یہ مرکب ان مرکبات میں ہے کہ ترجمۂ اضافت میں "کے" اور "کی" کی جگہ پر۔ میں۔ کے لئے وغیرہ کہا جاتا ہے مثلاً :۔

محو خیال = خیال میں محو

آمادۂ سفر = سفر پر آمادہ

ناگوار طبع = طبیعت کو ناگوار

مستعدِ جنگ = جنگ کے لئے مستعد

لیکن غالب نے اُردو میں لے لیا۔ اور اس وقت نہ تو کسی نے اعتراض کیا۔ اور نہ اب کیا جاتا ہے

یہ مرکبات کا حال ہے، مفردات میں ہزاروں سے زیادہ الفاظ اُردو میں رائج ہیں۔

عربی مفردات اور مرکبات کا بھی یہی حال ہے مثلاً :۔

استغفراللہ۔ نعوذباللہ۔ لاحول ولاقوۃ اِلاّ باللہ۔ علی الصباح۔ علی الرغم۔ علی الدوام۔ علی الحساب وغیرہ اگرچہ یہ جملے اُردو میں براہِ راست عربی سے نہیں لئے گئے۔ بلکہ فارسی سے لئے گئے ہیں۔ لیکن اصلی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ انگریزی الفاظ بھی اُردو میں بڑھتے جاتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہیں جنکو اہل زبان نے اپنے رنگ میں ڈھالا ہے مثلاً

۱۔ لینٹرن سے لالٹین

کیمرہ " کمرہ

بنگلو " بنگلہ

گوڈاؤن " گودام وغیرہ

دوسرے وہ ہیں جنکا تلفظ اپنی اصلی شکل میں قائم ہے۔ لیکن اُردو میں رائج ہیں۔ مثلاً :۔

۲۔ مشین - ریل - ریلوے لائن اسٹیشن وغیرہ

یہ الفاظ یا تو اہل زبان نے اُردو میں لئے ہیں یا ان کا لینا قبول کر لیا ہے۔

لُغاتِ مخصوصہ ہر زبان میں اہل زبان کچھ لغت اور محاورات خلاف قیاس اپنے لئے مخصوص کر لیتے ہیں لیکن کسی کو اختیار نہیں کہ اس کو اصول اور قیاس قرار دے کر اور الفاظ میں یہ حکم جاری کرے مثلاً :۔

ابن فارسی کا قول ہے کہ "عرب" بعض اوقات ایسے جملے اور لغات بولتے ہیں کہ دوسروں کو تعجب ہوتا ہے مثلاً :۔

کہتے ہیں " عاد فلان شیخا "۔ فلاں شخص بڑھاپے کی طرف لوٹ آیا۔ یا پھر بوڑھا ہوگیا حالانکہ کبھی نہ تو بوڑھا تھا۔ اور نہ بڑھاپے کی طرف لوٹا۔

قرآن نے اسی معنے میں استعمال کیا ہے " حتی عاد کالعرجون القدیم "

مدح کے موقع پر کہتے ہیں " قاتلہ اللہ ما اشعرہ "

واحد بول کر جمع مراد لیتے ہیں۔ مثلاً جماعت کے لئے لفظ مفرد " ضیف " اور " عدو " لاتے ہیں

جمع بول کر واحد یا تثنیہ مراد لیتے ہیں مثلاً:۔

قرآن میں ہے " ینادونک من وراء الحجرات " تم کو اے محمد جو لوگ حجرے کے پیچھے سے آواز دیتے ہیں۔

حالانکہ ندا کرنے والے صرف ایک صحابی تھے "

بعض مفسرین نے لفظ جمع سے دھوکا کھا کر کئی صحابیوں کا نام ندا کرنے والوں میں بتایا ہے۔ حالانکہ واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔ اسی طرح سیکڑوں۔ اور ہزاروں مثالیں ہیں۔

اردو میں بھی واحد بول کر جمع مراد لینے کی مثال یہ ہے " اس کی آنکھ میں جادو ہے " آنکھوں میں جادو ہے کی جگہ بولتے ہیں۔

" ہم " ضمیر جمع متکلم شخص واحد استعمال کرتا ہے

کہتے ہیں ہزاروں آدمی جمع تھا، ہزاروں آدمی جمع تھے کی جگہ۔ انشا نے دریائے لطافت میں چند مثالیں ان الفاظ کی دی ہیں۔ جو قواعد کی رو سے صحیح نہیں لیکن اہل زبان بولتے ہیں۔ مثلاً:۔

۱۔	سفیل	بمعنے	فصیل۔
۲۔	چکّر	"	گھومنے والا، گردش کرنے والا۔
۳۔	چپاڑ	"	چوپڑ باز۔
۴۔	مجاز	"	مزاج۔
۵۔	پچاوا	"	پڑاواہ۔
۶۔	صفا	"	صفائی۔

میر نے ایک جگہ لکھا ہے:۔ ؎

آئینے کی طرح صفا ہے یہاں

انشا لکھتے ہیں کہ " ہر چہ بر زبان قابل و نا قابل گزرد و در سامعہ پسند اہل اردو ست گو غلط باشد " (دریائے لطافت ص ۲۴۲)

یہ نکتہ خصوصیت سے سمجھ لینا چاہئے کہ اس قسم کے الفاظ رواج کے لئے اہل زبان کے محتاج ہیں، جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے اس سے نہ کوئی اصول بن سکتا ہے اور نہ غیر اہل زبان کو کسی قسم کا کوئی اختیار ہے (باقی آیندہ)

محقق اعظمی

اُردو شاعری اور بیکاری

سے نے بکارِ خویشتن آئم نے بکارِ دیگرے
چوں چراغِ روز میسوزد مرا ایں زندگی

جب پیٹ کی طرف سے اطمینان ہو جاتا ہے تو پھر بیکاری کے شغلوں کی سوجھتی ہے۔ کہیں بٹیر بازی کا چرچا ہے۔ کہیں مرغ بازی کی دھوم۔ کوئی کبوتروں کی ٹکڑی اڑا کر دوسروں کے کبوتر پکڑ کر نام پیدا کرتا ہے تو کوئی نواب آصف قدر کو پیدل شہ مات دیکر مشہور ہو جاتا ہے۔ مگر ان تمام بیکاری کے مشغلوں میں شاعری کا نمبر اول ہے۔ نہ کہیں آنے کی ضرورت نہ کہیں جانے کی حاجت۔ بس پلنگ توڑیئے۔ سر کے بالوں میں ہاتھ سے شانہ کرتے جایئے۔ اور دیوان کے دیوان لکھ لیجئے۔ مرزا رسوا "شریف زادہ" میں لکھتے ہیں "لکھنؤ کے اکثر صاحبزادوں کو عنفوان شباب ہی سے عشق بازی کا لپکا پڑ جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی شعر و سخن کی طرف طبیعت ہو جاتی ہے۔ اس بہانہ سے اکثر جائز تخیلات کو عمدہ الفاظ کے پیرایہ میں ادا کرتے کا اچھا موقع مل جاتا ہے"، یہ نظریہ صرف لکھنؤ ہی کے لئے نہیں بلکہ ہندوستان کے بیشتر نوجوانوں پر منطبق ہو سکتا ہے۔ جوانی کی آمد آمد کے ساتھ ہی شاعری کی لت پڑ جاتی ہے۔ اور بُری طرح سے پڑتی ہے۔ جسے دیکھئے پنسل کاغذ لئے طبع آزمائی کر رہا ہے۔ اپنے فرضی معشوق کے جور و ظلم کی فرضی داستانیں آنکھ بند کرکے نظم کر رہا ہے۔ واضح ہو کہ حقیقی شاعری مشاہدہ و تجربہ کے بعد آتی ہے نہ کہ چارپائی توڑنے سے۔

اس میں شک نہیں کہ شاعری اخلاق کی درستی کے لئے بہترین شے ہے۔ لیکن کیا شعرا جب شعر لکھنے بیٹھتے ہیں۔ اس امر کو مدّنظر رکھتے ہیں کہ ہم آئندہ نسلوں کے لئے اخلاق کا ایک سبق چھوڑے جاتے ہیں۔ شاعری ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے۔ جب آپ پر جذبات طاری ہوتے ہیں یا آپ کسی شے سے لُطف اندوز ہوتے ہیں تو شعر کہنے بیٹھتے ہیں۔ اور جذبات اُسی وقت طاری ہوتے ہیں۔ جب دماغ دنیاوی کشاکش یعنی فکر تحصیل رزق وغیرہ سے خالی ہو۔ اس لئے وہی شخص جس کو کوئی فکر نہو۔ یا یوں سمجھئے جو بیکار ہو شاعری کرسکتا ہے۔ اور شاعری سے . . . . آپ کا مقصد حصول انبساط ہوتا ہے نہ کہ اخلاق کی تعلیم۔

اگر آپ گلدان میں پھول محفل کی زیب و زینت کے لئے لگائیں اور لوگ اُن سے عرق یا عطر نکال لیں تو آپ کو کیا؟ پتنگ آپ تفریح کے لئے اُڑائیں لیکن اگر کہربائی قوت کا راز اس سے معلوم ہو جائے تو یہ خدا کی دین ہے۔ اس لئے معلوم ہوا کہ گو شاعری کے فوائد جو کچھ ہوں یا نکال لئے گئے ہوں لیکن مشغلۂ شاعری مشغلۂ بیکاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی دُور بیں نظریں اپنی

کم ہاتھ کی طرف اُٹھ گئیں ؎

در جہاں مثلِ چراغِ لالۂ صحراستم نے نصیبِ محفلے نے قسمتِ کاشانۂ

یہاں پر ایک سوال یہ ہو سکتا ہے کہ شعر کہتے وقت کوئی مقصد مد نظر ہوتا ہے خواہ وہ حصول انبساط ہی ہو اس لئے شاعری بیکاری کا مشغلہ نہیں کہی جا سکتی۔ بیشک اگر آپ ذاتی منفعت دیکھتے ہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ لیکن اجتماعی نقطۂ نظر سے قوم کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے آپ اپنی قوم کا نقصان کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کسی اور مشغلہ میں پڑ کر اپنی قوم کو زیادہ فائدہ پہونچا سکتے۔ لیکن اس حالت میں آپ خود غرضی کرتے ہیں کہ آنے والی نسلوں کے لئے اخلاق کا کوئی سبق نہیں چھوڑتے

امر مسلمہ ہے کہ جذبات کی کثرت علم کی قلت کی دلیل ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ لوگ ہما و تختِ سلیمان کے خیال سے دلچسپی لیتے تھے۔ لیکن عقلی ترقی اور سائنس کی آمد آمد نے جادوگری۔ طلسمات دیو و پری کے اعتقاد کو سرے سے اُڑا ہی دیا۔ شاعری کی مشین جذبات کی کل سے چلتی ہے۔ اگر عملی زندگی میں انہماک زیادہ ہے تو جذبات سے متاثر ہونے کا کم موقع ملے گا۔ امن و امان اور لوگوں کی طبائع میں اگر جمود کی حالت ہے تو شعر و شاعری کا زیادہ چرچا ہوگا۔ ایران میں ہنگامۂ تاتار کے عرصہ میں تقریباً سو برس تک کوئی شاعر نہیں ہوا (سوائے سلمان ساوجی کے)۔ امن و اطمینان کی حالت سے میرا مطلب حکومت کے استقلال سے ہے۔ لیکن لوگوں کے مشاغل کا اثر بھی اس اطمینانی حالت پر کافی پڑتا ہے۔ امریکہ میں باوجود حکومت کے استقلال کے عملی انہماک بہت زیادہ ہے۔ لکھنؤ میں واجد علی شاہی دور کیا آیا۔ بیکاری کا اسکول قائم ہو گیا اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ شاعری مثل میجک لینٹرن کے ہے۔ جس قدر تاریکی زیادہ ہوگی اتنی ہی روشنی زیادہ تیز معلوم ہوگی۔ عرب میں اسی وجہ سے ایام جہالت میں شاعری کی زیادہ گرم بازاری تھی۔ لوگ جذبات سے زیادہ متاثر ہوتے تھے۔ عقل کو کم کام میں لاتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑ بیٹھتے تھے۔

نیاز صاحب فتحپوری۔ فروری ۱۹۲۳ء کے نگار میں کیا خوب لکھتے ہیں :-

"مشرق کا باشندہ جب جنت کا تصور کرتا ہے تو اُسے خوش منظر باغ نظر آتا ہے جہاں لوگ آرام کر رہے ہیں امن و سکون کے ساتھ پُر لطف زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور کسے را با کسے کارے نباشد کا جلوہ ہر جگہ پیش نظر ہے۔ لیکن مغرب کا رہنے والا۔ فردوس کو عمل و حرکت کی جگہ خیال کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے وہاں ایجاد و اختراع کا بازار گرم ہوگا۔ لوگ کاموں میں منہمک ہوں گے اور علم و حکمت اپنی پوری ترقی پر نظر آتے ہوں گے۔ جسوقت امریکہ کا باشندہ بروکلین اور نیو یارک کے درمیان ساحل پر کھڑا ہوتا ہے تو غور کرتا ہے کہ کس تدبیر سے یہاں پُل قائم کر دیا جائے کہ لوگ آسانی سے گذر سکیں۔ برخلاف اسکے مشرق کا باشندہ یہاں آکر صرف ایک نظم کہہ سکتا ہے۔ اسی طرح آبشار نیاگرا کو دیکھ کر مغرب کا باشندہ صرف یہ سوچ سکتا ہے کہ کیونکر اس کی قوت سے کہربائیت پیدا کی جا سکتی ہے اور مشرق کا رہنے والا وہاں صرف گنگنا سکتا ہے۔"

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ شعر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جذبات کی پرورش اور اخلاق کی درستی کے لئے شاعری کا

وجود ایک بیش بہا شے ہے۔ انسان میں جذبات قدرت کی طرف و دلیعت کئے گئے ہیں۔ کبھی ہنسنا کبھی رونا کسی سے محبت کرنا کسی سے نفرت کرنا۔ لگا ہی رہتا ہے اور پھر مدنی حالت میں تو ان کی کثرت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ ادیب صاحب ہماری شاعری میں لکھتے ہیں کہ

"یہ صحیح ہے کہ شعر سے لازمی طور پر کوئی مالی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن اگر ذہن کی تیزی، دل کی شگفتگی، روح کی بیداری اور اخلاق کی استواری کا شمار بھی فائدوں میں ہے تو شعر و شاعری کے مفید ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے۔ شاعری بے حس قوتوں کو چونکاتی ہے، سوتے احساس کو جگاتی ہے، مُردہ جذبات کو جلاتی ہے، دلوں کو گرماتی ہے، حوصلوں کو بڑھاتی ہے، مصیبت میں تسکین دیتی ہے، مشکل میں استقلال سکھاتی ہے، بگڑے ہوئے اخلاق کو سنوارتی ہے۔ اور گری ہوئی قوموں کو ابھارتی ہے"

سینکڑوں موقعوں پر بڑے کام آئی ہے، مشکلوں میں آڑے آئی ہے، گرتے ہوؤں کو سنبھالا ہے۔ بھاگتے ہوؤں کو لڑایا ہے تاریخ مثالوں سے پُر ہے۔ اور اصل تو یوں ہے کہ دنیا میں رونق، چہل پہل انھیں جذبات کی بدولت ہے ورنہ بقول شبلی اگر یہ چیزیں مٹ جائیں تو دفعتاً سناٹا چھا جائے اور دنیا قالب بیجاں، شراب بے کیف، گل بے رنگ، گوہر بے آب ہو کر رہ جائے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

گلشن دہر میں اگر جوئے مئے سخن نہ ہو پھول نہ ہو کلی نہ ہو سبزہ نہ ہو چمن نہ ہو

ایک مشہور مثل ہے کہ شاعری ایک چمکنے والی آنکھ ہے۔ اور فلسفہ اونگھنے والی پلکیں۔ فلسفیوں اور سائنسدانوں سے اگر پوچھو گے کہ شاعری کیا چیز ہے اور اس کے کیا فائدے ہیں تو وہ ایسے ایسے پست کن ناموں سے اسے تعبیر کریں گے کہ تم اس سے متنفر ہو جاؤ گے۔ کیوں۔ کیونکر اور کیسے کے پھندوں میں پھنسا کر اسے بالکل لایعنی بتا دیں گے۔ ہر طریقہ سے اس کی مذمت کریں گے۔ سائنس اور فلسفہ واقعات سے تعلق رکھتے ہیں ان کی نگاہیں پھول کے اجزا کو دیکھتی ہیں۔ خوبصورتی سے کوئی تعلق نہیں یا یوں سمجھئے کہ وہ اپنی خشکی میں فنون لطیفہ کی ترقی کو دخل انداز نہیں ہونے دیتے۔ لیکن تابکے "جب سائنس اور مشاہدات کی ممارست ہمکو سخت دل اور کٹر بنا دیتی ہے۔ اور تمام معتقدات اور مسلمات عامہ کے دل میں حقارت پیدا ہو جاتی ہے کسی بات کا اعتبار نہیں آتا۔ کسی چیز کا اثر نہیں رہتا۔ اسوقت شاعری ہمارے دل کو رقیق اور نرم کرتی ہے۔ . . . . مادیت کے بجائے روحانیت قائم ہوتی ہے۔ شاعری ہم کو عالم تخئیل میں لے جاتی ہے۔ جہاں تھوڑی دیر کے لئے مشاہدات کی بیرحم حکومت سے ہم کو نجات مل جاتی ہے"

جوش ملیح آبادی ان کو مخاطب کرکے کہتے ہیں:۔

رحم اے نقادِ فن یہ کیا ستم کرتا ہے تو کوئی نوک خار سے چھوتا ہے نبض رنگ و بو
شاعری اور منطقی بحثیں؟ یہ کیسا قتل عام برش مقراض کا دیتا ہے زلفوں کو پیام

فلک کا جسکی ہو اس ظاہری پر ہو مدار — شاعری ہے قصر مدہوشی میں پاسکتا ہے بار
کیوں ادھار ہو نفس شاعر کے پرکھنے کیلئے — کیا شمیم سنبل و نسرین ہو چکھنے کے لئے
شعر کی تنقید سے پہلے مری تقریر سن — خود زبان شاعری سے شعر کی تفسیر سن
اک ترنم سے اب تنقید کھلنا چاہیے
قطرۂ شبنم کو برگ گل پہ تلنا چاہیے

یہ مثل کہ شاعری جزویست از پیغمبری اسی وجہ سے درست ہے کہ جس طرح ایک پیغمبر دنیا میں آکر لوگوں کو قعر مذلت سے نکالتا ہے۔ انکی اخلاقی حالت درست کرتا ہے، ظلمت سے روشنی میں لاتا ہے۔ اپنی قوم کی پستی کو دور کرتا ہے، ان کو تمدن و تہذیب کا صحیح مفہوم بتلاتا ہے اسی طرح ایک شاعر بھی اپنی قوم اور ملک کی جہالت، ان کے نقائص اور ان کے عیوب کو مٹانیکی کوشش کرتا ہے۔ راہ گم کردہ کو صحیح راستہ پر لگاتا ہے، بھٹکتے ہوؤں کو منزل پر پہونچاتا ہے، ڈوبتوں کو ساحل پر لاتا ہے۔ بہر حال اپنی قوم کی حالت درست کرنے میں ہر طرح کی امکانی کوشش سے دریغ نہیں کرتا۔ ولیم بلیک لکھتا ہے کہ

"محدود شاعری انسانی نسل کو بھی محدود کردیتی ہے۔ قومیں اوسی نسبت سے ترقی کرتی یا برباد ہوتی ہیں جس نسبت سے ان کی شاعری، مصوری اور موسیقی ترقی کرتی یا برباد ہوتی ہے"

شاعر ہر وقت انسان کی بھلائی اور بہتری کی تدبیریں سوچا کرتا ہے۔ جنگلوں اور صحراؤں میں بادیہ پیمائی کر رہا ہے تو یہی خیال اس کے پیش نظر ہے۔ ریگستانوں میں مائل دشت نوردی ہے۔ تب بھی قوم کا مرثیہ اس کی زبان پر ہے۔

An tacitum silvas inter reptare salubres curantum quidquid dignum sapiente bonoque est.

(وہ خاموش پر فضا جنگلوں کی دشت نوردی کرتا ہے۔ لیکن اس کا دماغ دانائی اور بھلائی کے خیالوں میں مصروف ہے)

وہ گو بظاہر دیوانوں کی سی صورت بنائے ہے مگر سوجتا دور کی اور کہتا پتہ کی ہے۔ اپنے ملک اپنی قوم کے پیچھے پاگل ہو رہا ہے۔ ہر طرح کی کوشش کرتا ہے۔ لاکھوں طرح کے جتن کرتا ہے کہ اس کے بھائی بند ٹھیک راستہ پر چلنے لگیں۔ حکومت سے زیادہ اس کو ان کی بھلائی کی فکر رہتی ہے۔ ؎

محفل نظم حکومت چہرۂ زیبائے قوم — شاعر رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

اس میں شک نہیں کہ خیالات کو مجتمع اور یکسوئی قلب کے لئے مکمل خاموشی کی ضرورت ہے۔ ظاہرا ایک کاروباری آدمی کو ایسے لمحات میسر نہیں آسکتے لیکن وہ بھی پہلو میں دل رکھتا ہے۔ احساسات اور جذبات کی دنیا اس کے قلب میں بھی آباد ہے۔ دن بھر کا تھکا ماندہ جب مکان آتا ہے۔ بچے پیار سے چمٹ جاتے ہیں۔ اگر ایک بچہ خوشی کے مارے ٹانگوں سے لپٹا جا رہا ہے تو دوسرا کاندھے پر سوار ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ بیوی الگ نیچی نظروں سے انکی حرکات دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ کون

کہہ سکتا ہے کہ اُس شخص کے لئے یہ اظہار انبساط، یہ مسرت خوش کُن نہیں ہے۔ اگر اُس کو اپنے پیشہ میں نقصان ہوا ہے تو اس خسارہ کا اثر کوئی اس کے دل سے پوچھے۔ چہرہ پر افسردگی چھائی ہوئی آنکھوں میں حلقے پڑے حیران پریشان بیٹھا ہے۔ ان ہر دو متضاد حالتوں میں اگر وہ اپنی حالت لکھنے کی کوشش کرے گو وہ غم غلط کرنے کے طور پر سہی تو وہ لٹریچر کے انمول جواہر میں شمار کئے جائیں گے۔ اگر نظم میں پیش کرے تو پھر یہ اس کی آتش بیانی آگ ہی لگا دیگی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ کاروباری شخص کا دل مردہ ہو جاتا ہے۔ اور اپنے پیشہ میں انہماک کی وجہ سے اُسے اپنے جذبات کے ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملتا اور اگر ملے بھی تو وہ زیادہ موثر نہو گا باطل ہے۔

رہی شاعر کی ہئیت کہ گم صم بیٹھے ہیں تو یہ واقعہ ہے کہ شعر لکھنے کے لئے تنہائی اور خاموشی ضروری ہے۔ جب تک فضا میں خاموشی نہوگی۔ اس کے خیالات پراگندہ اور پریشان رہیں گے۔ یکسوئی قلب اور خیالات کا مناسب اجتماع نہو سکے گا۔ انسان کو جب کوئی اہم اور غور طلب مسئلہ حل کرنا ہوتا ہے تو خاموشی اور خلوت چاہتا ہے۔ اور پھر شاعری تو ایسی نازک چیز ہے کہ ذرا سی لغزش پر شاعر کی تمام جد و جہد، غور و فکر برباد ہو جاتی ہے۔ اس لئے اگر وہ شہر کے غل شور سے پناہ لینے کے لئے کسی پُر فضا مقام پر جا بیٹھتے ہیں تو یہ جائے استہزا اور طعن نہیں۔ آرتھر آف شاغنسے نے خوب کہا ہے:۔

We are the music makers
And we are the dreamers of dream.
Wandering by lane sea breakers,
And sitting by desolate streams,
World losers and world for-sakers,
On whom the pale moon gleams,
Yet we are the movers & shakers,
Of the world it seems,

ترجمہ:۔ ہم آفرینندۂ موسیقی ہیں اور ہم خواب و خیال میں پڑے رہتے ہیں۔ سمندر کے خاموش ساحلوں پر گھوما کرتے ہیں اور سنسان چشموں کے کنارے بیٹھے رہتے ہیں۔ ہم خانہ بدوشوں اور گوشہ نشینوں پر زرد چاند اپنی پھیکی روشنی ڈالتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہی ہیں جو دنیا کو لرزاں اور تہ و بالا کر دیتے ہیں"

موسیقی ایسی چیز ہے کہ انسان تو انسان حیوان کو بھی اپنی طرف مائل کر لیتی ہے۔ لحن داؤدی ایک قصۂ پارینہ سہی مگر آج بھی گراموفون کی دلکش آواز راہ گیروں کو روک لیتی ہے۔ انسان کسی اہم کام میں مشغول کیوں نہو گویے کی ایک تان اس کو اپنی طرف راغب کر لیتی ہے۔ شعر موسیقی کے زیور سے آراستہ ہو کر ایسا دیدہ زیب ہو گیا ہے۔ کہ بہتوں نے نقد جان دے دیا ہے۔ کتنا ہی مغموم

کوئی کیوں نہ لاکھوں تسلیاں اور تشفیاں اس کو گریہ وزاری سے روک نہ سکتی ہوں مگر ایک پھڑکتا اور چبھتا ہوا۔ حسب حال شعر اس کو بشاش اور مطمئن کر دیتا ہے۔ اشعار کو کارلائل کے نزدیک موسیقیانہ خیالات ہیں۔ مشرقی معلموں اور مذہب کے بانیوں نے خصوصاً ہندوستان میں اسی شاعری کی بدولت سینکڑوں کے دل موہ لئے ہیں۔ دلکش آواز میں بھجن گا گا کر لاکھوں کو اپنا ہم مذہب بنالیا گیا ہے۔ شاعری جذبات کے ابھارنے میں نظیر نہیں رکھتی روحانی تعلیم کے لئے بہترین ذریعہ ہے۔ انسان کا دل فوراً ہی نرم ہو کر اس معبود حقیقی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جو نظام دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے۔ معرفت کے منازل طے ہونے لگتے ہیں۔ ظاہری پردے اٹھنے لگتے ہیں اور پھر بندہ ہوتا ہے اور بندہ نواز۔

اس کے علاوہ ماہرین تعلیم کی رائے ہے کہ نظام تعلیمات میں شعر کو جگہ ضرور ملنا چاہئے کیونکہ اس سے قوت متخیلہ ترقی پذیر ہوتی ہے۔ اور قوت متخیلہ ہی ایسی شئے ہے جس کی ترقی اور نشو و نما طالب علم کے لئے اشد ضروری ہے۔ تمام ایجادات و اکتشافات اسی قوت کے منت پذیر ہیں۔ جس طالب علم میں یہ قوت ترقی کریگی اتنا ہی وہ تیز اور ذکی ہوتا جائیگا۔ شعر بوجہ ترنم اور ترتیل کے جلد یاد ہو جاتا ہے۔ اس لئے حافظہ کو کافی مدد دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ شعر سے ہمکو کافی فائدے حاصل ہوتے ہیں خواہ وہ شاعر کے مدنظر رہے ہوں یا بعد میں لوگوں نے اخذ کر لئے ہوں۔

. . . . اس لئے شاعری کسی طرح سے بیکاری کا مشغلہ نہیں کہی جا سکتی اور حقیقت تو یہ ہے کہ جب تک انسان میں جذبات ہیں اور وہ بالکل مشین ہو کر نہیں رہ جاتا شاعری ہمیشہ زندہ رہے گی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہاں شاعری بیکاری کے مرادف کیونکر ہوگئی جسے دیکھئے اردو شاعری سے متنفر او اس کو لغو اور فضول کہتا ہے اور حد تو ہوگئی کہ شاعری اور بیکاری ایک مثل سی ہوگئی ہے۔

شاعری کا دار و مدار تخئیل اور محاکات پر ہے۔

طبائع انسان اُن اشیاء سے جو مرئی ہیں زیادہ حظ حاصل کرتے ہیں بہ نسبت ان کے جو ہم کو نظر نہیں آتیں یا بسبب ہماری حواس کی کمزوری کے نہیں دکھلائی دیتیں۔ تاج محل کی تعریف اور خوشنمائی کا ذکر اُس شخص پر زیادہ اثر کرے گا۔ جس نے اُسے دیکھا ہے۔ بہ نسبت اس کے جس نے اُسے نہیں دیکھا ہے۔ اسی لئے ارسطو شاعری کو بوجہ محاکات کے موثر سمجھتا تھا۔ میتھو آرنلڈ اپنے تنقیدی مقالات میں شاعری کی بابت لکھتا ہے کہ

"شاعری خیالات سے وابستہ ہے اور خیالات واقعات ہوتے ہیں۔"

لیکن ہمارے یہاں اردو شاعری میں واقعات تو ہوتے ہی نہیں صرف خیالات ہی خیالات ہوتے ہیں۔ تخئیل کو بغیر محاکات کے . . . . . استعمال کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ٹھوکر کھاتے ہیں۔ مغرب میں شاعری بیکاری کیوں نہیں سمجھی جاتی صرف اس وجہ سے کہ اُن کے خیالات واقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔ جھوٹ کذب اور افترا نہیں ہوتا۔ محاکات کے قرطاس پر تخئیل کے موقلم

سے رنگین تصویریں بناتے ہیں۔ فارس میں قصیدہ سب سے پہلے شروع ہوا۔ جب کسی کی مدح یا ذم کی جاتی ہے۔ تو اس میں محاکات کو دخل نہیں ہوتا۔ اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔ صرف تخیل کی بلند پروازی دکھلانا پڑتی ہے۔ جھوٹی تعریف ہوتی تھی۔ اور جھوٹی باتیں نظم ہوتی تھیں۔ جب خلفائے بنو عباسیہ اور بادشاہ ایران اپنی جائز و ناجائز مدح کے عادی ہو گئے تو پھر کیا تھا۔ ہر شاعر بلند پروازی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی اور مقرب بارگاہ ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تخیل میں بے اعتدالیاں ہونا شروع ہو گئیں۔ دُور از کار خیالات باندھنا شروع کئے۔ جس کا حشر یہ ہوا کہ اثر شعر زائل ہو گیا۔ درباروں میں صرف واہ واہ تک ان کا کلام باقی رہا۔ اس کے بعد کسی نے پوچھا بھی نہیں۔ نمونے ملاحظہ ہوں۔ سلمان ساؤجی سلطان جلال الدین حسن شاہ کی تعریف میں لکھتے ہیں :-

صد بار گرد بالش خورشید سر نہد — تا شاہ زیر دست خود اورا مکاں دہد
روزے کہ گرد لشکر مریخ رزم شاہ — بر جبیں راز شوسیہ طیلساں دہد
بہر ہنروراں کہ ہیجا ز عیبہا — عارض چو عرض جوشن برگستواں دہد
رُمحت میاں بستہ نہد بہر دام و دد — یک خواں کہ شرح رزنگہ ہفتخواں دہد
چوں چرخ پیر طلعت بخت ترا بدید — گفت ار دہد مراد دآں نوجواں دہد

~~~~~~

صفات عصمت ذاتش کہ عین مردمی آت — سواد کردہ ملک بر بیاض دیدۂ حور
زہے نقود کلام ترا عیار گہر — زہے غبار سمند ترا خواص و زور
تو ئی کہ بر صفحات فلک بخط غبار — بود مآثر نعل مواکبت مسطور

ظہیر فاریابی اپنے ممدوح کی یوں تعریف کرتے ہیں :-

نہ کرسی و فلک نہد اندیشہ زیر پائے — تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد
در موضع کہ چوں دم روح القدس نند — نصرت ہمائے رایت او را مکاں دہد
بیروں ز کائنات پرد تا ہزار سال — سیمرغ وہم تا ز جنابش نشاں دہد

اور چونکہ درباری شعرا واقعی بڑی شہرت اور قابلیت کے ہوتے تھے۔ اس لئے ان کی زبان۔ ان کی بات مستند مانی جاتی تھی۔ اس لئے عام شاعروں کو بھی انہیں کی تقلید کرنا ضروری ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب ایک ہی رنگ میں رنگ گئے اور صرف تخیل کی ترقی میں منہمک رہے۔ اور اس میں بڑی بڑی بلند پروازیاں دکھلائیں۔ لیکن آخر زوال شروع ہی ہو گیا۔ لغو اور لایعنی باتیں بکنے لگے۔ اکثر اچھی باتیں بھی کہتے تھے۔ مگر وہ بھی بُری طرح سے۔ مبالغہ غلو کی حد تک پہونچ گیا۔ اس کا اثر اردو پر بھی پڑا۔ یہاں بھی وہی رنگ جما۔ شہباز تخیل آسمان کی خبر لینے لگا
~~~~~~

ذوقؔ اپنے ایک قصیدے میں لکھتے ہیں:۔

چھیڑے ہے تارِ شمع کو گر ناخنِ موجِ نسیم — بزم میں پیدا ہو تارِ سازِ مطرب کی صدا
جسم کو اِس کے دھویا تو نے جس دم وقتِ غسل — گردِ کلفت کو دلِ عالم سے گویا دھو دیا
سرخیِ حنا پہنچے ہے عاشق کے جگر تک — معشوق کا گر ہاتھ میں ہو دستِ حنائی
کیا صرف ہوا کا ہے کہ تاثیر ہوا سے — گر دل پہ ہو خورشید کا دیدہ ہوائی
رونگٹے یار کے پشتِ لبِ شیریں پہ نہیں — شہد پہ بیٹھ کے ہیں پائے مگس ٹوٹ گئے
ڈرتا ہوں اس کا خنجر نہ بہہ جائے ہو کے آب — میرے گلے میں نالۂ آہن گداز ہے
گھوڑے کی کیا سبک روی یاں کیجئے بیاں — مارے حباب کو یہ اگر ٹھوکر آب میں
سُم میں تری نہ آئے نہ ٹوٹے حبابِ بحر — عکسِ خیال ہو یہ ہوا بنکر آب میں (ق) منیرؔ
خمیدہ ضعف سے ایسا میں دردمند ہوا — کہ سایہ پاؤں کا سر سے مرے بلند ہوا خواجہ وزیرؔ
سنتے ہیں وہ عشاق کی آہیں پسِ دیوار — پھر یہ بھی شکایت ہے کہ گرمی ہے ہوا میں داغؔ
کیا ہاتھ میں درکار ہے انکو ہے مہندی — چھولیں گلِ عارض تو وہی رنگ حنا ہو اسیرؔ

چنانچہ ہر صنف شاعری میں یہاں بھی تخئیل کی زیادتی پائی جاتی ہے۔ نتیجہ ہوا کہ ایسے ایسے نازک شعر نکلنے لگے کہ سمجھنے والوں کو دقت ہونے لگی مثلاً

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی — ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا
دوزخ شود ز خاصیتش باغِ خلد اگر — گردید بگردِ چشمۂ کوثر گیاہ ما
کیا نزاکت تھی کہ عارض انکے نیلے پڑ گئے — ہم نے تو بوسہ لیا تھا خواب میں تصویر کا

بھلا ایسی شاعری سے کیا فائدہ۔ اپنا وقت خرچ کیا دماغ صرف کیا۔ اور کچھ نہیں اسی نازک خیالی کی دُھن اور فضول غور و فکر اور صمٌ بکمٌ بیٹھے رہنے نے شاعری کو بیکاری کا مشغلہ بنا دیا

حکومت کا اثر رعایا پر کافی پڑتا ہے۔ جیسا دربار کا رنگ ہوتا ہے وہی حالت رعایا بھی اختیار کر لیتی ہے۔ رنگیلے پیا جانعالم کے زمانہ میں بٹیر بازی، مرغ بازی اور اس کے ساتھ ساتھ شاعری کا جیسا دور دورہ تھا۔ وہ ظاہر ہے اور اسی طرح کی حالت ہر اس بادشاہ کے زمانہ میں ہوئی ہے جو طبیعت کا شوقین رہا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ

ہر کوچہ معلّے ستادہ — ہر گام فلاطنے نہادہ

ہر کہ و مہ شاعری کی لَت میں پڑ جاتا تھا۔ جسے دیکھئے میرؔ و غالبؔ ہو رہا ہے۔ مشاعرے کافی سے زیادہ ہوتے تھے ہر بیکار پنسل و کاغذ لئے شعر سوچ رہا ہے زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا ہے۔ اور موضوع وہی عشق (واضح ہو کہ معاملات عشقیہ

میں بھی حسب عادت وہی تخیل سے کام لیا جانے لگا۔ جب حد اعتدال سے بڑھ گیا تو معشوق ظلم کی اس حد تک پہونچ گیا۔ کہ اس کی ایک نظر سینکڑوں کو زخمی کر گئی اس کے ایک اشارۂ ابرو نے لاکھوں کو تہ تیغ کر دیا۔ اس کا کوچہ کا ہے کو ہے عاشقوں کی ایک چھوٹی سی بستی ہے کوئی ادھر لوٹ رہا ہے کوئی ادھر تڑپ رہا ہے۔ دوسری قوم کے ارباب سخن اُردو شاعری پر یہ بڑا اعتراض کرتے ہیں اور یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے مگر اس کا سبب تخیل کی بے اعتدالی ہے مغربی شاعری اور ہندی شاعری میں محاکات کو بڑی حد تک دخل ہے۔ اس لئے ان کی شاعری بہ نسبت اردو کے زیادہ مستحکم ہے۔ اُردو کے سینکڑوں شاعر ایسے ہوں گے۔ جن کی عمر بھر کی کمائی یعنی ان کے دیوان کو کوئی پوچھتا بھی نہیں اور گمنامی کی حالت میں پڑے ہیں اور کون پوچھے اور کیسے پوچھے جبکہ آپ زبردستی اپنے اوپر جذبات طاری کر کے شعر کہتے ہیں۔ قافیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پہلے ہی رکھ لیتے اس کے بعد ان پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ یا یوں سمجھئے کہ پہلے تو ہاتھ پاؤں زنجیروں سے کس دیتے ہیں۔ اس کے بعد دوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قوت تخیل کو اسقدر لایعنی اور فضول باتوں میں صرف کرتے ہیں جنکا بیان نہیں۔ کہیں گاؤ زمین کو دیکھتے ہیں تو کہیں ہما کی طرف نظر اٹھاتے ہیں۔ کہیں تخت سلیمان پر اُڑتے ہیں تو کہیں سیمرغ کے ساتھ پرواز کرتے ہیں۔ بیکار اپنی زندگی تباہ کرتے ہیں اور دوسروں کا مذاق خراب کرتے ہیں اور آخر کار یہ کہتے ہوئے سدھار جاتے ہیں کہ

دریغا می ندانستم طریق زندگانی را　　بباطل صرف کردم نقد ایام جوانی را

اور انہیں شاعروں کی خدائے تعالیٰ قرآن شریف میں یوں مذمت کرتا ہے

وَالشعراء یتبعہم الغاؤن ۝ الم تر انہم فی کل واد یہیمون ۝ انہم یقولون مالایفعلون ۝

(اور شاعروں کی بات پر چلیں وہی جو بے راہ ہیں۔ تو نے نہیں دیکھا کہ وہ میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں اور یہ کہ وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے)

نور الحسن ہاشمی سندیلوی

بابُ الاستفسارُ

ابتدائے عہدِ اسلام کے اسلحۂ آتشبار

(جناب محمد مظفر خاں صاحب۔ کلکتہ)

کیا آپ براہِ کرم مطلع فرما سکتے ہیں کہ ابتدائے عہد اسلام میں اسلحۂ آتشبار استعمال ہوتے تھے یا نہیں اور اگر ہوتے تھے تو ان کی صورت و نوعیت کیا تھی؟

(نگار) تاریخ سے ثابت ہے کہ مسلمان بری و بحری دونوں جنگوں میں آگ کا استعمال کرتے تھے، جس کو مورخین مابعد نے نارِ یونانی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس کو بعلبک کے ایک مشرقی شخص نے بازنطینی حکومت کے لئے ایجاد کیا تھا۔ جو عربوں کے حملۂ قسطنطنیہ سے بحد پریشان ہو گئی تھی اور کسی نہ کسی طرح ان کے نہب و غارت کو دفع کرنا چاہتی تھی۔ اس آگ کا استعمال عرصہ تک بازنطینی حکومت راز کی صورت سے کرتی رہی، لیکن آخر کار عربوں کو بھی اس کی ترکیب معلوم ہو گئی۔ اور پھر انھوں نے اس کے استعمال کے متفرق و متعدد طریقے اختیار کئے۔

محمد بن منکلی کا بیان ہے کہ

"اہل عرب کشتیوں کے اندر سے فریق مخالف پر روغن نفط پھینکتے تھے جس کو یونانی زبان میں سلیونیہ کہتے تھے۔ اور وہ خود زراقات کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ ان سے نہایت سخت تڑاقا اور دھواں پیدا ہوتا تھا۔ اور دشمن کی کشتی میں آگ لگ جاتی تھی۔"

نفط فی الحقیقت وہی چیز ہے جسے اب پٹرول کہتے ہیں اور جو اس وقت سرزمین بابل میں بکثرت پیدا ہوتا تھا۔ یہ سفید و سیاہ

دونوں رنگ کا ہوتا تھا۔ اور فوراً مشتعل ہوجاتا تھا۔

روغن نفط کا استعمال ایک تو نلکیوں کے ذریعہ سے ہوتا تھا اور دوسرا طریق استعمال بالکل وہی تھا جسے اب بم پھینکنے سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ لوگ تانبے کی گول ہانڈیوں میں اور صندوق ظروف میں نوکدار چیزیں چاقو وغیرہ کی قسم سے بھر دیتے تھے۔ اور پھر روغن نفط ڈال کر، گوپھن (منجنیق) کے ذریعہ سے اس کو دشمن پر پھینکتے تھے۔ اس طرح وہ پتھر کے گولے بھی بناتے تھے۔ جنکے اندر چار خانے ہوتے تھے۔ اور نفط مصطگی وغیرہ سے بھرے سر کرتے تھے۔ علاوہ ان کے شیشے اور بوتلیں بھی اس ترکیب سے استعمال کرتے تھے۔

بری جنگوں میں دستی بم بھی انھوں نے استعمال کئے جو دستہ دار شیشوں اور بوتلوں سے بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ دولت عباسیہ کے دور اوسط میں عماد الدولہ بن بویہ کے لئے یاقوت المنادی نے اس کا استعمال کیا تھا۔ اور کامل ابن اثیر نے اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔

مسلمانوں نے روشن بموں کا بھی استعمال کیا ہے۔ یہ ایک قسم کا گولا ہوتا تھا۔ جو گندھک، گوند، روغن بلساں وغیرہ سے ترکیب دیکر خشک کر لیا جاتا تھا۔ جب اس کو چلانا مقصود ہوتا تھا تو اس پر روغن نفط سفید مل دیا جاتا۔ اور گندھک پیس کر چھڑک دی جاتی۔ جس وقت اس کو ایک سخت کمان کے ذریعہ سے پھینکتے تو ہوا کی رگڑ سے اس میں آگ پیدا ہوجاتی اور گولہ روشن ہوجاتا۔

علاوہ ان کے وہ پھسلنے والے گولے بھی استعمال کرتے تھے یعنی وہ ہانڈیوں میں صابون اور اسی طرح کی دوسری لیسدار چیزیں بھر کر منہ بند کر دیتے تھے۔ اور کشتیوں پر پھینکتے تھے جہاں وہ جاکر ٹوٹ جاتی تھیں اور کشتی کی سطح اسقدر چکنی ہوجاتی تھی کہ پاؤں نہ ٹھہر سکتے تھے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کرتے کہ ہانڈیوں میں سانپ اور بچھو بھر کر پھینکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک طرف لوگ پھسل پھسل کر گرتے اور دوسری طرف سانپ بچھو ڈسنے لگتے۔

ایک خاص قسم کے گولے وہ ایسے بھی بناتے تھے جو صرف جلد کو جلا ڈالتے تھے اور جسم کے اندر کوئی چیز ان میں سے نکل کر پیوست نہ ہوتی تھی۔

تدبیر حرب میں ایک طریقہ یہ بھی اختیار کیا جاتا کہ اپنے کو ہزیمت شدہ ظاہر کرکے پسپائی اختیار کی جاتی لیکن پسپائی کے ساتھ ساتھ راستہ میں وہ روغن نفط چھڑکتے جاتے تھے۔ جب دشمن ان کے تعاقب میں اس راستہ سے گزرنے لگتا تو اس کو آگ دکھادیتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ساری فوج آگ کے نذر ہوجاتی۔

اسی کے ساتھ گوکھروں کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ یہ کانٹے دار گوکھرو جو لوہے کے بنائے جاتے تھے، خندقوں کے چاروں طرف، دشمن کے راستے میں بچھادیے جاتے تھے۔ جس سے گزرنا سخت دشوار تھا۔

جرمنی نے حال کی جنگ عظیم میں گیس کے زہریلے گولے استعمال کئے تھے اور لوگوں نے اس کو بالکل جدید چیز سمجھی، حالانکہ اب سے بہت قبل مسلمانوں ہی نے اس چیز کو سب سے پہلے ایجاد کیا تھا۔

اس کے دو طریقے تھے۔ ایک تو یہ کہ جب دشمن کی طرف ہوا کا رُخ ہوتا تو گندھک اور لاشیں جلا جلا کر دھویں کو دشمن کی طرف بھیجتے۔ جس سے وہاں کی ہوا خراب ہوجاتی اور ٹھیرنا دشوار۔ دوسرا طریقہ دم بند کرنے والے لوگوں کے استعمال کا تھا۔ ان گولوں میں کبھی افیون دھتورا وغیرہ بھرتے تھے۔ اور کبھی بغیر بجھا ہوا چونا سفوف کی صورت میں۔ اس کے دھویں سے دم گھٹنے لگتا تھا۔ اور بصارت کام نہ دیتی تھی۔

تیروں، نیزوں اور دبابوں میں بھی وہ آگ کا استعمال کرتے تھے۔ نیزوں اور تیروں کی نوک پر دو کانٹے لوہے کے اور ایک حلقہ بناتے تھے جس پر سند لپیٹ کر مشتعل مادہ سے تر کر دیتے تھے۔ اور حریف کی طرف پھینکتے تھے۔

دبابوں سے مراد وہ آہنی آلات ہیں جو گھوڑوں کے زین سے لگا دئے جاتے تھے اور ان کے ذریعہ سے مجادلہ کرتے تھے۔ ان کو پہلے عمد کہتے تھے لیکن بعد کو دبابیں کہنے لگے جس کا واحد دبوس ہے۔ ان میں بھی بعد کو آگ شامل کر دی گئی تھی۔

خود اپنی حفاظت کے لئے وہ ایسے کپڑے تیار کرتے تھے۔ جو آگ کو قبول نہ کریں۔ ان کپڑوں میں نوشادر اور شب یمانی وغیرہ بعض ایسی چیزیں ملتے تھے کہ آگ کا اثر نہ ہوتا تھا۔ کشتیوں کی حفاظت کے لئے بھی اسی قسم کی اشیاء استعمال کرنے کا دستور تھا۔

سمرن و تسبیح پر تاریخی روشنی

(جناب ابو الہدیٰ محمد افضل صاحب۔ کراچی)

"دنیا میں تسبیح کا رواج کب سے ہوا؟ اور مسلمانوں نے اسے کس طرح اختیار کیا۔ براہِ کرم تاریخی نقطۂ نظر سے گفتگو فرمائیے۔"

(نگار) خیال کیا جاتا تھا کہ سب سے پہلے جن لوگوں نے سمرن کا استعمال کیا۔ وہ تبت کے بودھ لوگ تھے۔ کیونکہ وہاں کے آثار سے بہ کثرت ایسے ڈورے دستیاب ہوئے ہیں۔ جن میں لکڑی، صندل اور سیپ کے دانے پروئے ہوئے ہیں، بعض میں جواہرات بھی دیکھے گئے۔ جن کی تعداد اکثر و بیشتر ۱۰۸ ہے۔ لیکن اب تحقیق جدید سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصریوں میں بھی اس کا رواج پایا جاتا تھا۔ اور مسیح کے بعد قرن اول میں قبطی رہبانوں نے مسیحیت میں اس کا رواج قائم کیا۔

مسیح کے عہد میں یہ چیز بالکل نہیں پائی جاتی تھی۔ کیونکہ انجیل میں کسی ایک جگہ بھی اس کا ذکر نہیں پایا جاتا۔

جرمنی کے مشہور عالم شیف ہرزج کا بیان ہے کہ نصاریٰ میں سب سے پہلے سمرن کا استعمال قبطی عیسائیوں نے کیا اور یہ زمانہ مسیح کے بعد پہلے قرن کا تھا۔ اس کے بعد تسبیح پر دعاؤں کے پڑھنے کا رواج سب سے پہلے مالادیوس اور سوزدمین نے قائم کیا۔ اسی سلسلہ میں رواج تسبیح کے لئے بہت سی روائتیں بھی پیدا کی گئیں۔ چنانچہ منجملہ ان کے ایک یہ بھی کہ پطرس

اور اس کی بیوی کو خواب میں جناب مریم نے ہدایت کی کہ وہ تسبیح کے رواج کو جاری کریں

تاریخ اسلامی کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں بالکل اس کا رواج نہ تھا۔ گولڈ زیہر کی تحقیق یہ ہے کہ عرب میں تیسری صدی ہجری سے پہلے تسبیح کا رواج نہیں ہوا۔ اور یہ رواج ان میں مصر سے آیا۔

ایک حدیث میں روایت کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ؐ نے اپنی ایک بیوی کو تسبیح کے ذریعہ سے عمل استخارہ بتایا۔ لیکن یہ بالکل غیر موثق ہے۔ ایک اور حدیث ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز دعا کے شمار کے لئے چھوٹے چھوٹے سنگریزوں کا استعمال رسول اللہ نے منع کیا۔ اور اس کے بجائے اونگلیوں سے شمار کرنے کا طریقہ بتایا۔ اسی طرح یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار عبد اللہ بن عمر نے دیکھا کہ لوگ شمار کے لئے سنگریزوں کا استعمال کرتے ہیں اور آپ نے اس حرکت سے باز رکھا۔

اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ابتدا عہد اسلام میں شمار کے لئے سنگریزوں کا استعمال ہوتا تھا۔ لیکن جس چیز کا نام تسبیح یا سُمرن ہے وہ رائج نہیں ہوئی تھی۔

تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسری صدی ہجری میں بیشک اس کا رواج ہوگیا تھا۔ لیکن خالص مذہبی نقطۂ نظر سے اسے محمود طریقہ نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب ایک عباسی خلیفہ نے اپنی ماں کو جو امور سلطنت میں دخل دیتی تھی، نصیحت کی تو اس کے الفاظ یہ تھے کہ

"عورتوں کے لئے اُمورِ مملکت میں دخل دینا مُناسب نہیں تم اپنا وقت نماز و استعمال تسبیح میں صرف کیا کرو۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تسبیح کا رواج صرف عورتوں اور دنیاداروں میں پایا جاتا تھا۔

ایک بار لوگوں کو ابو القاسم الجنید کے اسباب میں ایک تسبیح نظر آئی اور اُسے لینا چاہا، لیکن ابو القاسم نے عذر کیا کہ

"میں یہ چیز کیسے دیدوں جبکہ وہ روزانہ مجھے خدا سے قریب کرتی رہتی ہے۔"

ان واقعات سے دو نتیجے نکلتے ہیں ایک یہ کہ بعض متقی لوگ تسبیح کا استعمال کرتے تھے۔ اور فقہا اس کے خلاف تھے۔ ابو عبداللہ محمد الانباری نے اپنی کتاب المدخل میں بدعت کے طور پر اس کا ذکر کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ تسبیح کا استعمال لوگ زیادہ تر ذکر و شغل کے جلسوں میں کرتے تھے۔ اور اس سے فارغ ہونے کے بعد ایک خاص صندوق میں رکھ دیتے تھے ہر ذاکر و شاغل کو "شیخ السبحۃ" کہتے تھے۔ اور اُن کے خُدام "خادم السبحۃ" کے نام سے موسوم ہوتے تھے۔

بہرحال اسلام کو تسبیح سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ اور نہ اُس نے کبھی عبادات کے ساتھ اس قسم کی چیزیں رائج کر کے طاعت کے صحیح مفہوم کو تباہ و برباد کیا

زمانۂ موجودہ میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس کے مذہبی لوگ تسبیح کا استعمال نہ کرتے ہوں۔ ایران، مصر، عرب، ہندوستان

ہندوستان، چین، جزائر جاوا وغیرہ ہر جگہ اس کا رواج ہے۔ اور اسقدر وہم کے ساتھ کہ لوگوں کو تسبیح دھو دھو کر شفاء مرض کے لئے پانی پلایا جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے عمل استخارہ کیا جاتا ہے اور اگر کسی درویش کے پاس یہ چیز نہ ہو تو اس کی ولایت و بزرگی ناقص ہے۔ حاجی لوگ جب حج سے واپس آتے ہیں، تو زمزم کے ساتھ خاک شفا کی تسبیح بھی ضرور لاتے ہیں۔ اور اعزہ و احباب میں تقسیم کرتے ہیں۔ لیکن یہ سب لغویات ہیں اور اسلام نے ہمیشہ ان باتوں سے بچنے کی تعلیم دی ہے، مگر اب لوگ حقیقی اسلام سے اسقدر بیگانہ ہوگئے ہیں کہ اگر ان کے سامنے اس قسم کی باتیں بیان کی جائیں تو وہ انھیں کلمات کو کفر پر محمول کریں گے۔ اور کہنے والے کو کافر و مرتد قرار دے دیں گے۔

فلکیات کے عجائب و غرائب

جب ۱۸۶۳ء میں مشہور ہئیت داں ہگنس نے اسپکٹرسکوپ (آلۂ تحلیل طیفی) کے ذریعہ سے ستاروں کی روشنی کے اجزاء کئے تو اسی کے ساتھ اس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ستاروں کا درجۂ حرارت کیا ہے۔ اور فی مربع انچ کتنی حرارت ان سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ آفتاب کے درجۂ حرارت کے متعلق یہ تحقیق ہوئی کہ اس کی سطح کے ہر مربع انچ سے ایک منٹ میں اتنی حرارت پیدا ہوتی ہے کہ اس سے ۳۶۰۰۰ کیلوگرام پانی کو جوش دیا جاسکتا ہے یا ۵ گھوڑوں کی قوت کا ایک انجن اس سے چل سکتا ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ سطح آفتاب بہت زیادہ گرم نہیں ہے۔ بعض سیارے اسقدر گرم ہیں کہ ان کے ہر مربع انچ کی حرارت ایک منٹ میں ۶۳ کرور کیلوگرام پانی کو کھولا سکتی ہے۔

اس تحلیل طیفی سے یہاں اور فائدے ہوئے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ ستاروں کا قطر اور ان کا حجم دریافت ہوگیا۔ یہ ریاضی کا مسئلہ ہے جس کی صراحت بیکار ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک ایسے سیارہ کا قطر دریافت ہوا جو ہمارے سورج سے ۳۰۰ گنا بڑا ہے۔ اس سیارہ کا نام منکب الجوزا ہے۔ اور اس میں اتنی وسعت ہے کہ سورج ایسے ۹۰ لاکھ سیارے اس کے اندر سما سکتے ہیں اور ایک دوسرے سب سے چھوٹے سیارہ (التابع الشعری) کا قطر دن ۳۶ ہزار میل دریافت ہوا۔ ان دونوں سیاروں کا مادہ نہ تو بالکل شفاف ہے اور نہ جامد بلکہ آفتاب کی طرح درمیانی حالت میں ہے۔

وہ سیارے جو بہت زیادہ گرم ہیں ان کے مادہ کے متعلق یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ وہ مرکب ہے برقپاروں اور نواۃ (ELECTRONS PROTONS) سے اور یہ برقپارے اور نواۃ دقائق گیس کی طرح انتہائی سرعت کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔ اور یہ سریع حرکت اس جذب کہربائی پر غالب آجاتی ہے جس سے جواہر فردہ ترکیب پاتے ہیں ۱۶۴۴ء میں ڈکارٹ نے یہ رائے ظاہر کی کہ آفتاب اور سیارے ایک ایسے مادہ سے مرکب ہیں جو نہایت تیزی سے گردش کر رہا ہے۔ اور جب وہ دوسرے اجسام سے ملتا ہے تو بے شمار نہایت ہی چھوٹے چھوٹے اجزا میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ۱۹۰۰ء میں یہ تحقیق ہوئی کہ آفتاب اور سیارے گیسی حالت میں ہیں۔

بعض ستارے زیادہ روشن نظر آتے ہیں اور بعض کم، لیکن یہ خیال درست نہیں کہ جو زیادہ روشن ہیں وہ زیادہ گرم ہیں۔ کیونکہ بعض نہایت گرم ستارے ایسے ہیں جو کم روشن ہیں جیسے قلب عقرب یا منکب الجوزا۔ اس کا تعلق زیادہ تر انکی عمر سے ہے یعنی جو ستارہ بہت پرانا ہے وہ کم روشن ہے اور جو حال کا ہے وہ زیادہ روشن ہے۔

علمی دنیا میں ناپ یا پیمائش کے لئے اس وقت دو طرح کے آلات موجود ہیں۔ ایک وہ جن سے بڑے اجسام یا بڑی مسافت کی پیمائش ہوتی ہے اور دوسری وہ جن سے چھوٹے اجسام یا کم مسافت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ لیکن جب اجسام یا مسافت کی وسعت و تنگی حدود ریاضی سے گزر جاتی ہے تو پھر انسانی قیاس کا اضطراب دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ہم موج نور کو ناپنا چاہیں تو آلہ ملیمیٹر کافی نہیں ہوتا کیونکہ موج نور اس سے بہت چھوٹی ہے۔ اس لئے علماء نے اس کے لئے ایک اور آلہ بنایا۔ جو ملیمیٹر سے ہزارواں حصہ چھوٹا ہے، اس کے بعد جب یہ دیکھا گیا کہ رانتجنی شعاعیں بہت زیادہ چھوٹی ہیں تو اس کے لئے پھر ایک آلہ ایجاد کیا گیا جو $\frac{1}{1000000000}$ انچہ کے برابر ہے

اسی طرح اب اجسام اور بڑی مسافتوں کو دیکھئے کہ اس کی پیمائش کے لئے انچ، فٹ، گز اور میل وغیرہ ایجاد کئے گئے، لیکن جب فلکیات کے سلسلے میں ستاروں کی مسافتوں کی پیمائش کا سوال پیدا ہوا تو میل وغیرہ سب بیکار ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ ہمارے نظام شمسی سے جو ستارہ قریب تر واقع ہوا ہے وہ زمین و آفتاب کے درمیانی فاصلہ سے تین سو ہزار گنا زیادہ دور ہماری زمین سے واقع ہے۔ اس لئے فلکیات میں مسافت کا اندازہ کرنے کے لئے "نوری سال" کی اصطلاح قائم ہوئی۔ یعنی ایک ستارے سے دوسرے ستارہ تک روشنی کتنے عرصہ میں پہونچتی ہے۔ اب یہ سامنے رکھ کر کہ روشنی ایک سکنڈ میں ۱۸۶۱۷۳ میل کا سفر کرتی ہے۔ فلکیات کے عجائب اور کائنات کی وسعت کا اندازہ کیجئے کہ زمین سے جو ستارہ قریب تر واقع ہے۔ اس کی روشنی ساڑھے تین سال میں زمین تک پہونچتی ہے۔ دوسرا ستارہ شعریٰ ہے جس کی روشنی ۱۰ سال میں پہونچتی ہے، قطب تارہ کی روشنی ۲۰۰ سال میں اور سدیم الجبار کی ۵۰۰ سال میں پہونچتی ہے۔

اگر ہم آفتاب کو مرکز قرار دے کر اس کے چاروں طرف کی فضا کو ایک ہزار نوری سال کے برابر وسیع کرلیں تو اس کے معنے صرف یہ ہوں گے کہ ہم نے اس فضا میں صرف ان ستاروں کو شامل کیا ہے جو بغیر دوربین کی مدد سے آنکھ سے نظر آتے ہیں۔ اور اگر ہم اس فضا کو ۲۵ ہزار نوری سال کے برابر وسیع مان لیں۔ تو ہم زیادہ سے زیادہ کہکشاں تک کا احاطہ کرسکیں گے لیکن کائنات اس جگہ ختم نہیں ہوجاتی۔ بلکہ اس کی وسیع فضا میں خدا جانے کتنے اور نظام ہماری کہکشاں سے بہت زیادہ وسیع پائے جاتے ہیں جن کی روشنی لاکھوں سال میں بھی ہم تک نہیں پہونچتی پھر ظاہر ہے کہ ان مسافتوں کی پیمائش کے لئے نوری سال بھی کافی نہیں

ہو سکتا۔ مثلاً مجلاآن ہی کو لیجئے کہ وہ ہم سے ایک لاکھ نوری سال کے فصل پر واقع ہے، یا ستاروں کے اُن مجموعہ کو لیجئے۔ جو N.G.C. کے نام سے مشہور ہیں کہ ان کی روشنی سات لاکھ سال میں پہونچتی ہے۔ اور سدیم لولبی کی روشنی ۱۰ لاکھ سال میں بھی نہیں پہونچتی۔

"المراۃ المسلسلۃ" کے سدیم کے متعلق علماء کی تحقیق یہ ہے کہ وہ ہم سے ۱۰ لاکھ نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہے اور اس کا قطر ۵ ہزار نوری سال کا ہے۔ اس کے اندر کروڑوں ستارے ایسے ہیں جو ہمکو نظر ہی نہیں آتے اور جو نظر آتے ہیں وہ ہمارے آفتاب سے ہزاروں گنا بڑے اور زیادہ روشن ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر ہم آفتاب کو ۱۰ لاکھ نوری سال کے فاصلہ پر لے جائیں تو ہم اس کی تصویر نہیں لے سکتے، لیکن ان ستاروں کی تصویر فوٹوگراف کے ذریعہ آجاتی ہے۔ اس سلسلہ میں بعض ایسے ستارے دریافت ہوئے ہیں جو ہمارے آفتاب سے ۱ کروڑ گنا زیادہ روشن ہیں۔ اور جب ان کی روشنی انتہائی کمی پر ہوتی ہے تو اُن سے ہر سکنڈ میں ....۲ ٹن مادہ نکل کر فضا میں منتشر ہوتا رہتا ہے۔

ہمارا کرۂ زمین جو ۲۴ ہزار میل کے دور میں ہے بظاہر بہت بڑا معلوم ہوتا ہے لیکن آفتاب کے مقابلہ میں اسکی کیا حقیقت ہے اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اگر آفتاب کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اس سے زمین کے برابر بہت سے کرے تیار کئے جائیں تو اُن کی تعداد ۲۲۳۴۳ ہوگی۔

لیکن یہ آفتاب بھی باوجود اس قدر عظمت کے کائنات میں وہی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسے کسی بڑے فانوس کے اندر کوئی مکھی۔

عریاں آنکھ سے ہم کو صرف ۶۰۰۰ تارے نظر آتے ہیں لیکن دوربین کی مدد سے ۲۲ کروڑ ۴۰ لاکھ تارے تصویر میں آجاتے ہیں۔ اور یہ سب کے سب وہی تارے ہیں جو ہماری کہکشاں سے متعلق ہیں، لیکن باوجود اس قدر کثرت کے ایک کا فصل دوسرے سے اتنا ہے کہ اگر ہم دس مکھیاں یوروپ میں چھوڑدیں، دس ایشیا میں اور دس افریقہ میں تو انکا فصل ایک دوسرے سے کم، ہوگا۔ بہ نسبت اُس فصل کے جو ان کروروں ستاروں کے درمیان باہم پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر ہبل نے اپنی بڑی دوربین کے ذریعہ سے جس کے شیشہ کا قطر ۱۰۰ انچ کا ہے جو تصویر لی ہے۔ اس سے ۲۰ لاکھ ایسے سدیم معلوم ہوئے ہیں جو ۱۴ کروڑ نوری سال کے فاصلہ پر ہم سے واقع ہیں۔ اور خود ان کے درمیان باہم

۱۸ لاکھ نوری سال کا فصل پایا جاتا ہے۔

ہر سسٹیم کے اندر اتنا مادہ پایا جاتا ہے کہ اس سے ہمارے آفتاب کے ایسے لاکھوں آفتاب تیار ہو سکتے ہیں

سمن بغرض انفصال مقدمہ

(آرڈر ۵ قواعد ۱ و ۵ مجموعہ ضابطہ دیوانی سنہ ۱۹۰۸ء)

نمبر مقدمہ ۱۸/ج

بعدالت مال جناب بابو ماتا پرشاد صاحب سنہا مقام بھونگام ضلع مین پوری
آنریری اسسٹنٹ کلکٹر بہادر ڈونڈہ درگا پرشاد مدعی

حامد علی
بنام

بنام ہردیال سنگہ ولد برج لعل و مسماۃ متھنا بیوہ پتو ہردیال سنگہ وغیرہ مدعا علیہ

۔۔۔ بائی لال ولد رام سہائے و مہیت ولد دیوجیت قوم اہیر ساکن موضع نوادہ پرگنہ و تحصیل بھونگام ضلع مین پوری

واضح ہو کہ ــــــــ مدعی نے تمہارے نام ایک نالش بابت بقایا آب پاشی کے دائر کی ہے لہذا تمکو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ ۱ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ء بوقت دس بجے دن بمقام بھونگام اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کیحالت سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہے اور جو کل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جس کے ساتھ کوئی اور شخص ہو کہ جواب ایسے سوالات کا دیسکے حاضر ہو اور جوابدہی دعوی کی کرو اور چونکہ وہی تاریخ جو تمہاری حاضری کیلئے مقرر ہے واسطے انفصال قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے پس تمکو لازم ہے کہ اوسی روز اپنے جملہ گواہوں کو جنکی شہادت پر نیز جملہ دستاویزات جن پر تم بتائید اپنے جوابدہی کے استعمال کرنا چاہتے ہو پیش کرو۔

اور تمکو اطلاع دی جاتی ہے کہ اگر بروز مذکور تم حاضر نہو سکے تو مقدمہ بغیر حاضری تمہارے مسموع اور فیصل ہوگا۔
یہ تحت میں دستخط اور مہر عدالت کے آج بتاریخ ۱۵ ماہ اگست سنہ ۱۹۳۱ء جاری کیا گیا

(دستخط) سید حامد علی پیشکار
اسسٹنٹ کلکٹر درجہ دوم

مہر عدالت

آیندہ جنوری ۳۲ء کا نگار

تقریباً دوسو ۲۰۰ صفحات پر شایع ہوگا

اور

مخصوص ہوگا **مطائبات غالب** کے لئے۔ اسوقت تک غالب پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اسکی فلسفہ طرازی، معنی آفرینی، علوے خیال، بلندی مفہوم اور دشوار پسندی سے متعلق تھا لیکن یہ راز ابتک سربستہ ہے کہ غالب کی شہرت و کامیابی کا حقیقی راز ان سب سے علیحدہ صرف اسکی شوخی و شوخ نگاری، بذلہ سنجی اور مطائبات پسندی میں پنہاں ہے جنھوں نے اسکے سارے کلام کو خواہ وہ نظم ہو یا نثر، فارسی ہو یا اردو ایک نہایت ہی اچھوتی قسم کی تنقید ملیح WITTY CRITICISM میں تبدیل کردیا ہے

یہ مضمون ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ مہینوں کی محنت و کاوش کے بعد اسکے اُردو کلام سے اسکی فارسی تصانیف سے اسکے رقعات سے اور تمام ان واقعات و حالات سے جو تذکروں اور خود اسکی تصانیف میں ملتے ہیں غالب کی شوخی و شوخ نگاری پر تمام پہلوؤں سے نہایت ہی مکمل بحث کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ غالب کی شہرت و کامیابی کا تنہا راز صرف یہ تھا کہ وہ قدرت کی طرف سے نہایت شوخ و بذلہ سنج طبیعت لیکر آیا تھا۔ اور اسکی ساری زندگی اس کی جملہ تصانیف میں یہی وہ رنگ ہے جو تمام شعراء سے اسے ممتاز بناتا ہے۔

سب سے پہلے ایک بسیط مقدمہ کے ذریعہ سے مثالیں دیدیکر بتایا جائیگا کہ شوخی و ظرافت کی دنیا میں کتنی قسمیں ہیں۔ غالب سے قبل کن کن شعراء نے اسے اختیار کیا۔ ہندوستان میں اس رنگ نے کتنا نوع اختیار کیا اور پھر غالب کے اُردو فارسی کلام اور اس کے حالات و واقعات زندگی کا استقصار کرکے بتایا جائیگا کہ غالب حقیقتاً کسقدر دلچسپ انسان تھا۔ اور کیسے کیسے نوادر ادب اور لطائف انشا وہ اپنے بعد چھوڑ گیا۔

یہ کتاب اگر ایک طرف فن تنقید کی بہترین مثال ہے تو دوسری طرف ایسا مجموعہ لطف ہے کہ شاید ہی اس سے بہتر ذریعہ تفریح و دلچسپی کا کوئی اور ہو۔ یہ تصنیف غالب کے متعلق بالکل اچھوتی چیز ہوگی اور ہر شخص کے ذوق کو آسودہ کرنیوالی۔ وہ حضرات جو غالب کا صحیح مطالعہ کرنا چاہتے ہیں انکے لئے اس کتاب کا دیکھنا ایک فریضۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کتاب صرف نگار کے جنوری نمبر میں شائع ہوگی اور اسلئے اسکے حاصل کرنیکا تنہا ذریعہ یہی ہے کہ نگار کی خریداری کو جاری رکھیے اور آپکے حلقۂ احباب میں جو حضرات اس کتاب کو حاصل کرنا چاہتے انکو نگار کی خریداری پر آمادہ کیجیے۔

اِسی کے ساتھ غالب کی ایک رنگین تصویر ہوگی جو اس سے قبل کہیں شایع نہیں ہوئی۔

نیاز

"سرورِ کونین"

وہ دیکھ! فضائے ہستی میں انوار کا اِک طوفاں اٹھا   لو حُسن کی بارش ہونے لگی، وہ ابرِ ضیا افشاں اُٹھا
ساقی نے سجائے جام و سبو، بادل اُمڈے کلیاں چٹکیں   اک شورِ صلائے عام، سرِ صہباکدۂ عرفاں اُٹھا
شب ختم ہوئی، تارے ڈوبے، گردوں کے دریچے کھلنے لگے   پیغامِ طرب دینے کے لئے، پیکِ سحرِ خنداں اُٹھا
تصویرِ حیاتِ فانی سے باطل کی سیاہی دھونے کو   سامانِ طرازِ روح لئے، نقاشِ مہِ تاباں اُٹھا
آئیں، وہ تلاشِ حسنِ ازل کا سوز ہے جنکے سینوں میں   اس بزم میں جو مضطر آیا وہ تفتہ جگر شاداں اُٹھا

بیدار ہی رُوحِ آسائش، اب بزمِ جہاں نورانی ہے　　وہ دَورِ شبِ آزار ختم ہوا وہ صبر شکن ساماں اُٹھا
ہر فتنہ گر محرومِ یقیں کا خرمن ہستی جلنے لگا　　اِک برق سی کیا چمکی پیشِ نظر، اِک شعلہ سرِ داماں اُٹھا
بکھرے ہیں ہزاروں مہر مبیں، ہے محوِ تحیر چرخِ بریں　　پردہ تھا جو تیرے جلوؤں پر اے انجمنِ لامکاں اُٹھا

مِٹتی ہے دلوں کی بے چینی، پیغام طرب کے آتے ہیں
چلتی ہے نسیمِ روح فزا، اب غنچے کھِلتے جاتے ہیں

اے دہر مبارک ہو تجھکو فردوسِ طرب کی جلوہ گری　　پھولوں کا تبسم، حسنِ فضا، نغموں کا تلاطم، رقصِ پری
چلتی ہے نسیم امن واماں، آسودہ ہی ریگستانِ عرب　　دم توڑ رہی ہے خود بینی، خاموش ہے نبضِ فتنہ گری
اقبال ظفرمندی نے الٹ دی، بڑھ کے بساطِ ناکامی　　احساس جواں سالی میں ہوا تبدیل غمِ پیرانہ سری
تکمیلِ حقیقت نے بخشا، غفلت کو شعورِ بیداری　　تعمیرِ صداقت نے پایا، خطرات میں درسِ بے خطری
تذلیل غلامی نے پائی توفیق کمالِ آزادی　　گم کردہ رہی نے روشن کی قندیلِ مقامِ راہبری
تنظیم کرم پر ختم ہوئی، افکار جفا کی خوں ریزی　　تعلیم خرد میں صرف ہوئی ارباب جنوں کی جامہ دری
اے کون و مکاں کے رازِ شرف! ای بادشہ دین و دنیا　　روشن ہے تری ذاتِ عالی سے انجمن اوجِ بشری
کافی ہے اسے نسبت، تجھ سے کچھ اور نہو گو دُنیا میں　　اے کاش زمانہ کر سکتا، احساسِ حبابِ کم نظری

رخشاں ہے تجلّی سے تیری تاریک زمیں کی پیشانی
عنوان ہے تیری ہستی کا تکمیل حیاتِ انسانی

دہقانی لڑکی

(۱)

اُجلا نکھرا چاند کا ٹکڑا بھُولا بھٹکا صبح کا تارا
فطرت کا وارستہ جلوہ شبنم کا آوارہ قطرہ
حُسنِ مجسّم، پیکرِ زہرا گاؤں کی ملکہ۔ دُخترِ صحرا

(۲)

کانٹوں میں اک پھُول کھلا ہے سارا جنگل مہک رہا ہے
دُنیا اُلٹی گھُوم رہی ہے پتی پتی جھُوم رہی ہے
بیخود ہیں خاموش فضائیں وجد میں ہیں مدہوش ہوائیں
لوٹ رہی ہے ہوش کی دنیا
گاؤں کی ملکہ۔ دُخترِ صحرا

(۳)

بے ترتیب پریشاں گیسو الڑھ پن رشکِ رم آہو
بھری بھری بلّوریں باہیں تیز تیز بیباک نگاہیں ،
لالہ رُخ، طاؤسی گردن بھولی صورت، سادی چتون
جوہی کا نورستہ غنچہ!
گاؤں کی ملکہ - دُخترِ صحرا

(۴)

جامن کی اک شاخ جھکائے چہرے کو پتوں میں چھپائے
گالوں کو خوشوں سے لگائے رستے والوں سے شرمائے
زانو پر اک پاؤں اُٹھائے یوں خود کو "تصویر" بنائے
دیکھ رہی ہے رستہ چلتا
گاؤں کی ملکہ - دُخترِ صحرا

(۵)

پیروں میں کیکر کے بچھوے کانوں میں سینکوں کے بالے
زیبِ گلو کنول کی مالا آنکھ میں کاجل کا دُنبالا
سیدھے تیر چلانے والی ہرنی کو شرمانے والی
فخرِ بیاباں "عالم آرا" گاؤں کی ملکہ - دُخترِ صحرا

(طالب باغپتی)

سیلِ جذبات

اجل تو اک اتفاق ہی، اتفاق کا کچھ گلا نہیں ہے
وگرنہ جو ذی حیات ہیں اُن کی جستجو کو فنا نہیں ہے

بُجھے ہوئے دلمیں آرزوؤں کی روشنی سرد ہو چکی ہے
معاف کر اے نوازشِ دوست اب کوئی مدعا نہیں ہے

یہ محشرِ رنج و غم، یہ مجبوریاں، یہ حالاتِ صبر پیما
حیات کیونکر بسر ہوئی جا رہی ہی کوئی پتا نہیں ہے

حوادثِ روزگار دیکھیں ابھی دکھاتے ہیں اور کیا کیا
ابھی تو اتنا سمجھ میں آیا ہے بیکسوں کا خدا نہیں ہے

یہ محفلِ کائنات کیا ہی، یہ شور کیا ہے، یہ بات کیا ہی
فنا یہاں مستقل نہیں ہی بقا یہاں دیرپا نہیں ہے

وہ دل جہاں محوِ خواب تھیں قہقہوں کی راحت فزا نوائیں
فغاں! کہ اُس دلمیں کچھ بھی اب غیرِ نالۂ جانگزا نہیں ہے

اٹھا اے دلِ خستہ اپنی رگ رگ میں برقِ قوت کو مرتعش کر
سوائے اپنے جہاں میں کوئی کسی کا مشکلکشا نہیں ہے

وہ دل تو اب بجھ چکا ہے، ترے نثار، اک اور دل بنا دے
ترے لئے دل بنانیوالے یہ جنس کچھ بے بہا نہیں ہے

یہ نشۂ قوتِ عمل ہے کہ سرکشی کی نوازشیں ہیں
دعا سے یوں بے نیاز ہی دل کہ جیسے دستِ دعا نہیں ہے

عدم

حسن کا عروج

تھا حسن بے بس خود دام بن کر
وہ جعدِ مشکین زلفِ خمیں
اب حسن مائل پرواز پر ہے
کوتاہ دامن گیسو بریں

افسر میرٹھی

نگار

جلد ۲۰ - فہرستِ مضامین ماہ اکتوبر ۱۹۳۱ء - شمارہ ۴

نگار

جلد ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء شمارہ ۴

مُلاحظات

غالبؔ، مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

"سنو صاحب شعراء میں فردوسی، فقراء میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں، یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر و پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے، فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے اور عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہمطرحی نصیب ہو............"

اسی میں اگر اس کا بھی اضافہ کر دیا جائے کہ ایک صداقت پرست، ایک حق شناس اور ایک بے لاگ تنقید کرنے والے کی انتہا یہ ہے کہ وہ کافر و مجرم بنا دیا جائے، ملحد و بے دین کے نام سے پکارا جائے، تو میرے لئے اس سے زیادہ فخر کا موقع اور کیا ہو سکتا ہے کہ آج میں بھی اسی منزل میں ہوں جو کسی وقت فردوسی، حسن بصری اور مجنوں کو اپنے اپنے فن میں نصیب ہوئی تھی اور ناشکری ہوگی اگر اس سے زیادہ کوئی اور سعادت طلب کروں۔

ما بجامے کہ زجم ماند قناعت کردیم — بہ سکندر بد بہ بینا نچہ زدارا ماند

آج سے کئی صدی قبل جب مذہب نام نفس و ضمیر کے سکون کا تھا، جب قرآن کا مفہوم ایک مولوی کے مواعظ و ارشادات سے بلند تھا، جب دین حنیف میں جبر و اکراہ کا ذرا سا بھی شائبہ گوارا نہ کیا جاتا تھا، اور جب عہد بنی عباس میں آزادی کے ساتھ ہر شخص کو اسلام کا

صحیح مفہوم جاننے کیلئے جرح وتنقید کی اجازت تھی ۔ اس وقت کفر وارتداد کا مفہوم صرف یہ تھا کہ اصول اخلاق کو پس پشت ڈال کر انسانیت کی ترقی کو روک دیا جائے ۔ لیکن اب یہ معیار بہت بلند ہوگیا ہے ، اسقدر بلند کہ میں تو خیر کیا چیز ہوں ، اگر آج غزالی اور رازی زندہ ہوتے تو ان کا دامن بھی مولوی کے ہاتھ میں ہوتا اگر مولوی کی عبا ان کے ہاتھ ۔ ۔ ۔ نہ آسکتی ۔ غضب خدا کا ، میں دوبارہ کہہ چکا ہوں کہ خدا کی عظمت وجبروت ، اور اس کی قوت وقدرت کا اس طرح قائل ہوں کہ شاید ہی کوئی دوسرا ہو ۔ ہزار بار کہہ چکا کہ رسول کی صداقت وبلندیٔ فطرت پر جس طرح میں ایمان لایا ہوں شاید ہی کوئی اور ایمان لایا ہو لیکن باوجود اس اقرار کے بھی میں کافر ہوں ، ملحد ہوں ، مرتد ہوں ! پھر اگر اسی اقرار وعقیدہ کا نام کفر والحاد ہے تو

نادم بہ کافری کہ بہ ایمان برابر است

لاؤ ساری دنیا کی بیدینی مجھے دیدو ، تمام عالم کا ارتداد میرے حوالہ کردو اور کائنات کے ہر ہر گوشہ کا الحاد میرے قلب میں بھردو کہ اس دولت کے ساتھ تو مجھے جہنم بھی اس فردوس سے زیادہ عزیز ہے جہاں ایک مولوی مسلمان کو کافر بنائے بغیر نہیں رہ سکتا ——— آہ ،

این چہ شوریست کہ در دور قمری بینم !!

اس دوران میں ہندوستان کے مختلف مقامات سے نہایت منظم طور پر میری بیدینیوں کے خلاف تبلیغ واشاعت کی گئی ، یہاں تک کہ بعض انجمنوں نے جو مقامی مولوی جماعت کے زیر اثر تھیں میرے اور نگار کے الحاد کو ناقابل برداشت قرار دے کر نگار کی خریداری سے لوگوں کو باز رکھنے کی کوشش کی ، صوبۂ بہار کے کوئی بزرگ مولوی عبدالحکیم یا حکیم الدین صاحب ہیں انہوں نے اپنے صوبہ کے اخبار اتحاد میں ایک خطیبانہ مقالہ کے ذریعہ سے ابناء وطن کو نگار کے فتنہ سے آگاہ کرکے اس کے مطالعہ کو حرام وناجائز قرار دیا ۔ یہاں تک کہ ایمیں لکھنؤ میں بعض اکابر قوم ومذہب نے جلسہ کرکے یہ بھی ارادہ کیا کہ میری اس عارضی زندگی ہی کو ختم کردیا جائے ، بعض حضرات نے متعدد خطوط اس نوع کی تخویف وترہیب کے بھی میرے پاس روانہ کئے ۔ مقامی اخباروں میں روزنامہ ہمت اور ہفتہ وار سچ نے اس کار ثواب میں زیادہ اہتمام وتوجہ سے حصہ لیا ، الغرض اس دوران میں وہ سب کچھ ہوا جو صحافت دیرینہ وپاگندہ کی مدد سے ہوسکتا تھا ۔ لیکن میں نے ان تمام حملوں کے جواب میں صرف سکوت سے کام لیا ، کیونکہ ان تمام حضرات میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جسنے نگار کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد کوئی رائے قائم کی ہو ۔ اور مجھے معلوم ہے کہ جو کچھ کہا جاتا ہے یہ سب ظن وقیاس اور عوام کی افواہ کا نتیجہ ہے جو ہمیشہ بے معنی ہوا کرتی ہے یا پھر دیدہ ودانستہ کتمان حقیقت ہے اور ۔ ۔ ۔ میرے خلاف میری ہی تحریر کی غلط تعبیر جو ممکن ہے اصول جنگ کے لحاظ سے ان کی شرع متین میں جائز قرار دیدی گئی ہو ۔ جنھوں نے بمصداق " اس کا ثواب نذر کروں گا حضور کی ،، شاید میرے خلاف تبلیغ واشاعت ہی کے ذریعہ سے امسال فردوس میں ایک قصر تازہ کی تعمیر کا عزم راسخ کرلیا ہے

ہمارے مسٹر عبدالماجد صاحب دریابادی (زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا !) نگار کی الحاد پروری کا ذکر تو اکثر کرتے رہتے ہیں ، لیکن کیا کبھی کوئی ضعیف سی کوشش انھوں نے اس امر کی بھی کی ہے کہ وہ عصبیت سے علحدہ ہوکر میرے خیالات پر غور فرمائے اور پھر فیصلہ کرتے کہ میرا حقیقی مقصود ، اسلام کی خدمت ہے یا اس کی تخریب وتوہین ۔ مجھے حیرت ہے کہ باوجود اینہمہ دعوائے ادبیت وتفلسف وہ تعصب کے بھی کے زیر اثر یہ بھی نہ غور کرسکے کہ جن مضامین کے اقتباسات وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کررہے ہیں ، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ انھیں سے انکی

تردید ہوتی ہو۔ میر بکائی کے نگاہی مضمون میں خدا کے متعلق جو خیالات پریشاں ظاہر کئے گئے ہیں وہ ایک دیوانہ یا مخبوط الحواس کی طرف سے ہیں جیسا کہ مضمون کی ابتدا میں ظاہر کر دیا گیا ہے اور مضمون سے جو نتیجہ پیدا کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ انسان خدا کو جو چاہے کہے، جس اصول کے ماتحت چاہے مطالعہ کرے لیکن آخر کار وہ خدا ہے اور وہی کرتا ہے جو اسے منظور ہوتا ہے ——— میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس "دانشمندی" کو علیحدہ کر کے صرف "لا نقربوا الصلوٰۃ" پیش کرنے والی ذہنیت جناب عبدالماجد صاحب دریابادی کو کس مدرسہ میں زانوئے ادب تہ کرنے سے حاصل ہوئی ہے۔ اسی طرح انھوں نے دوزخ و جنت کے متعلق میرے خیالات کے سمجھنے میں غلطی سے کام لیا ہے (گو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ غلطی قصداً وارادۃً اتحت تھی یا تعصب و نا انصافی کی بنا پر) میرا مقصود ان مضامین سے یہ تھا کہ جن غلط روایات کی بنا پر دوزخ و جنت کا مفہوم عام طور پر پیش کیا جاتا ہے وہ کس قدر مضحک اور اسلام کی شان کے منافی ہے۔ پھر جب تک کہ جناب دریابادی یا انہیں کی طرح کوئی اور حامیِ دین یہ نہ ثابت کر دے کہ واقعی دوزخ و جنت کا تعلق مادی لذات سے ہے، اس وقت تک میرے ان مضامین کو توہین مذہب یا مخالفت اسلام کی صورت میں کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

یہ کہنا بھی سخت غلط بیانی ہے کہ میں امام بخاری کا مخالف ہوں۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ نہ صرف بخاری بلکہ تمام کتب احادیث بحالت موجودہ ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ انپر کلیتہً اعتماد کر کے کسی مذہب کے اصول کو پیش کیا جا سکے علی الخصوص مذہب اسلام جو دنیا کا تنہا فطری مذہب ظاہر کیا جاتا ہے۔ کیا جناب دریابادی کے پاس اس امر کا کوئی ثبوت ہے کہ صحاح ستہ میں جتنی احادیث درج ہیں وہ واقعی وہی ہیں جو ان کے جامعین نے فراہم کی تھیں اور ان میں بعد کو تدلیس و تحریف، حذف و اضافہ کچھ نہیں ہوا۔ یقیناً اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا اس لئے میری مخالفت نہ امام بخاری سے ہے نہ ان کے مجموعۂ احادیث سے بلکہ صرف اس خیال سے کہ کیوں بغیر تنقید کے ہر قول کو رسول اللہ سے منسوب کر کے مذہب اور رسول کی توہین کی جائے اور کیوں ایک ایسے شخص کو جو بغیر سمجھے ہوئے احادیث کو احادیث ماننے کے لئے تیار نہیں، مذہب کا مخالف قرار دیا جائے۔ بخاری کے درس سے ترک مذہب کا درس اسی لحاظ سے کہا گیا کہ یہ حالت موجودہ اگر شروع سے لیکر اخیر تک تمام احادیث کو صحیح تسلیم کرنے پر انسان کو مجبور کیا جائے تو اس کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ یا تو وہ مذہب کا خیال ترک کر دے گا۔ اور اگر ایسا نہ کرے گا تو پھر وہ جس مذہب کا پیرو ہوگا اسے اسلام تو کسی طرح نہیں کہہ سکتے اور جو نام چاہے اس کا قرار دے لیجئے۔

اسی طرح جناب عبدالماجد صاحب نے ۲۵ ستمبر کے سچ میں میرے خلاف اور جو الزامات قائم کئے ہیں وہ سب تحریف مفہوم کا نتیجہ ہیں۔ اور میرے مقصود سے بالکل علیحدہ۔ میں نے جن اکابر ملت کی طہارت و عصمت کی داستانوں کا ذکر کیا ہے۔ اُن سے مراد صرف آجکل بعض ایسے نام نہاد علماء کرام ہیں جو صداقت کو محو کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اور جن کا باطن ان کے ظاہر سے بالکل مختلف ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سلسلہ میں انھوں نے ابو حنیفہ وغیرہ کو کیوں شامل کر لیا، کیا عبارت کے سیاق و سباق سے وہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ میری مراد اکابر ملت سے کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اگست سنہ ء کے ملاحظات میں اپنا ذکر دیکھ کر وہ بیتاب ہو گئے۔ اور فرط غضب میں محض انتقام لینے کیلئے انھوں نے میرے فقرہ کا محل بدل کر خواہ مخواہ ایسے معنی پیدا کئے جو لوگوں کو مشتعل کر دینے والے ہوں۔

. . . .

. . . .

. . . .

پھر یہ سب کچھ جانتے دیکھتے میں مانتا ہوں کہ جو کچھ میں لکھتا ہوں یا جو مضامین "نگار" میں شائع ہوتے ہیں وہ یکسر الحاد و شرک ہیں لیکن خدارا کبھی ان کا جواب دینے کی بھی تو سعی فرمائیے۔ میرے اضطراب کو تو دور کیجئے۔ بفرضِ محال یہ بھی مان لیجئے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں، وہ غیر مسلم ہونے کی حیثیت سے کہتا ہوں، تو کیا آپ کا فرض بہ حیثیت ایک مسلم ہونے کے یہ نہیں ہے کہ میرے شبہات کو دور کریں، مجھے راہِ راست پر لائیں۔ کیا یہ فرض صرف اس طرح پورا ہو جاتا ہے کہ مجھے ملحد و مرتد بنا کر خدا کے حوالہ کر دیا جائے۔ اور "نگار" کے مطالعہ کو حرام قرار دے کر میری تاریک ذہنیت میں اور اضافہ کیا جائے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ یہ کس نوع کی خدمتِ اسلام ہے، یہ کس انداز کی تبلیغ ہے

تمام رسائل میں صرف "معارف" ہی ایک رسالہ ایسا ہے جو کبھی کبھی جواب دینے کی زحمت گوارا کرتا ہے۔ اور محض "کفرگری" کو ذریعۂ حرب و دفاع قرار نہیں دیتا، لیکن افسوس ہے کہ نگار میں جس نقطۂ نظر سے گفتگو ہوتی ہے۔ اس سے وہاں بھی اعتنا نہیں کیا جاتا اور اس لئے میری تشنہ کامیاں بدستور باقی رہتی ہیں

میرا دعوےٰ یہ ہے کہ تمام مذاہبِ عالم میں، اسلام ہی صرف ایک مذہب ایسا ہے جو وقت و زمانہ کا ساتھ دینے والا ہے۔ اور یہی ایک تنہا مسلک ہے جس نے اخوتِ عامہ اور انسانیتِ کبریٰ کو منزلِ حقیقی قرار دے کر ساری دنیا کو اشتراکِ عمل کی دعوت دی۔ اور اسی اعتقاد و یقین کے ساتھ میں تمام اصول و شعائر پر نگاہ ڈالتا ہوں ——— یوں تو ایک مولوی بھی بظاہر یہی کہتا ہے کیونکہ جب تک وہ یہ دعوےٰ نہ کرے مذہبِ اسلام کا امتیاز اور اس کی ہمہ گیری کیونکر ثابت ہو سکتی ہے، لیکن جس وقت اصول و عقائد، شعائر و عمل کا سوال آتا ہے تو پھر اس کا چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے۔ جو یقیناً کسی پیرو اسلام کا نہیں ہو سکتا

اس لئے اس وقت جو بہی علمائے کرام کی میرے خلاف ہے، اس کا سبب حقیقتاً یہ نہیں ہے کہ میں اسلام کا مخالف ہوں بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں کیوں ان کے سامنے سرِ بسجود نہیں ہوتا، اور میں کیوں اسلام کو ان کے عقول کا پابند نہیں سمجھتا۔ جن حضرات نے نگار کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں اگر اسلام نام صرف یزداں پرستی کا ہے تو اس کے سینکڑوں شواہد اس میں نظر آ سکتے ہیں، لیکن اگر اسلام کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور ہے تو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ اب پھر کہتا ہوں اور فاش و برملا کہتا ہوں کہ میں ہرگز مسلمان نہیں ہوں اور نہ دنیا میں کوئی انسان مسلمان ہو سکتا ہے

آج زمانہ جس دورِ اضطراب سے گزر رہا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ پھر کوئی بت شکن نبی پیدا ہو۔ بلکہ وہ یہ چاہتا ہے۔ کہ کوئی مذہب شکن رسول آ لئے اور دنیا سے اس مذہبیت کی گرانباری کو دور کر دے جس نے دنیا کا امن و سکون غارت کر رکھا ہے۔ پھر اگر آپ ایسے نازک وقت میں اسلام کی کوئی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں اور اپنے اس دعوے کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کا نصب العین دنیا میں امن و سکون قائم کرنا ہے تو اس کی صورت وہ نہیں ہے جو آپ لوگ اختیار کرتے ہیں، بلکہ اس کی تدبیر

یعنی ہے کہ

یک دو نفس نالہ شو از دل دیوانہ بر آ

اسلام کے چہرہ کو اُن تمام داغوں سے پاک کیجئے جنھوں نے اس کے اصلی خط و خال کو پوشیدہ کر رکھا ہے اور وہ حقیقی سادگی وہ بلند نظری، وہ فراخ دلی اور علوئے نگاہ پھر پیدا کیجئے جو اسلام کے عناصر ترکیبی تھے۔

اس وقت تک کہ آپ ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے مثلث "مثلاً صرف" "بہ آواز دولاب سے کنند" کو اپنا ایمان قرار دئے ہوئے ہیں۔ اور کسی کو اجازت نہیں دیتے کہ آپ کے ان حرکات مذبوحی پر جرح و تنقید کرے، اور آپ میں آکر شامل ہو، یقیناً آپ بالکل محفوظ ہیں اور کسی کو چون و چرا کی گنجائش نہیں۔ لیکن اگر آپ نے کبھی یہ دعوےٰ کیا کہ آپ اپنے اصول کی تبلیغ بھی چاہتے ہیں تو بہ معاف کیجئے اس وقت آپ کا مجھے کافر و ملحد کہہ دینا، نگار کے خلاف لغو و غلط پروپاگنڈا قائم کر کے عوام میں ہیجان پیدا کر دینا، مفید مطلب نہیں ہو سکتا، کیونکہ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اس وقت دماغ انسانی جس اضطراب میں مبتلا ہے، اُس کی تشفی آپ کے پروپاگنڈا سے نہیں۔ بلکہ نگار ہی کے مطالعہ سے ہو سکتی ہے ——— پھر ممکن ہے کہ آج کا . . . . ماحول اس کی قدر نہ کرے۔ لیکن ایک وقت آئے گا۔ جب نگار کے صفحات ہی میں آپ کو پناہ لینا پڑے گی۔ اور آپ کے پاس کوئی ذریعۂ دفاع نہ ہوگا۔ مگر وہ جسے نگار اور صاحب نگار قائم کر چکا ہے۔ وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ کلام اللہ کے بعد جس مذہبی لٹریچر (یعنے مجموعۂ احادیث) کو اپنا مقصود سمجھے ہوئے ہیں، اس نے اسلام کی جڑوں کو کس قدر متزلزل کر دیا ہے۔ عیسائیوں کے اعتراضات، آریوں کے حملے، اور تمام غیر مسلم اقوام کی نکتہ چینیاں کلام مجید پر اتنی منحصر نہیں ہیں جتنی احادیث پر اور حقیقت یہ ہے کہ آج تک ڈاکٹر ٹسڈل کی مشہور کتاب ینابیع الاسلام کا جواب ہمارے ہاں کے کسی بڑے سے بڑے عالم سے بن نہیں پڑا، کیونکہ اس کے تمام اعتراضات کا بڑا ماخذ مجموعۂ احادیث ہے اور آپ اس پر مجبور ہیں کہ جو واقعہ یا لفظ رسول اللہ سے منسوب کر دیا گیا ہے اُسے غلط نہ قرار دیں خواہ وہ کتنا ہی لغو و مہمل کیوں نہ ہو ——— یعنی یہ تو آپ گوارا کر سکتے ہیں کہ مذہب کی بنیاد کھوکھلی ہو جائے، رسول اللہ کی توہین ہو جائے لیکن مجموعۂ احادیث پر آپ سے کبھی تنقید نہ ہوگی۔ اور اگر کوئی دوسرا اس کی جرأت کریگا تو اسے ملحد، بیدین، فتنہ نگار، اور خدا جانے کیا کیا کہیں گے۔ درانحالیکہ ان تمام الفاظ کا بہترین مصرف تو واضعین احادیث ہی کی ذات بابرکات ہو سکتی ہے

بہرحال میں ان تمام معذرت نگاریوں کے بعد بھی ہر وقت اپنے آپ کو ایک مبتدی طالب علم سے زیادہ نہیں جانتا۔ اور اس کے لئے تیار ہوں کہ ہندوستان کا کوئی ایک مولوی یا مولویوں کی کوئی بڑی سے بڑی جماعت مجھے سمجھا دے اگر میں غلطی پر ہوں، لیکن اس کا طریقہ شاید یہ نہیں ہے جو آپ لوگ اختیار کر رہے ہیں۔

میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ مذہبیات کے سلسلہ میں اس مقصود سے ہٹ جاؤں جس کا نام میں نے صرف معرفت انسانی رکھا ہے، اور خواہ مخواہ وہ الجھنیں عوام کے سامنے لے آؤں جو مجموعۂ احادیث اور ہمارے علمائے کرام کی تنگ نظری سے پیدا ہو گئی ہیں، لیکن چونکہ

اہلِ مذہب نے اب میرے خلاف کھلی ہوئی جنگ قائم کر دی ہے - اور مصلحت نہیں کہ خاموش رہوں ---- اس لئے میں تمام علمائے کرام کو چیلنج دیتا ہوں کہ اشاعت آیندہ سے جو سلسلۂ جدید بہ عنوان "اسلام دوسروں کی نگاہ سے" شروع ہوگا - اس کا جواب دیں اگر ان کے امکان میں ہے، اگر وہ اس میں کامیاب ہوگئے تو میں سمجھوں گا - کہ ایک بڑی دینی خدمت اس طرح انجام ہوگئی اور ناکام رہے تو پھر دنیا خود جان لیگی کہ اسلام کا دشمن حقیقتاً کون ہے - وہ جو صاحب نگار کو کافر کہتا ہے - یا وہ جو کافر بن کر بھی خدمت دین سے باز نہیں آتا -

---

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ میرے اور نگار کے خلاف تمام ملک کے اخباروں میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا - اور خصوصیت کے ساتھ لکھنؤ میں تو اسقدر متفقہ و متحدہ قوت کے ساتھ تمام جماعتوں نے مظاہرے شروع کئے کہ مجھے افسوس بھی ہوا - اور خوشی بھی - افسوس اس لئے کہ میری تحریریں کیوں اتنے لوگوں کے لئے باعث دل آزاری ثابت ہوئیں - اور مسرت اس لئے کہ مسلمانوں میں ہنوز اتنا جوش باقی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے مزعومات کے خلاف (خواہ وہ مزعومات کیسے ہی ہوں) کسی قوت کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہو جاتے ہیں - (خدا کرے کوئی شخص اس جوش سے بہتر کام لینے والا ہم لوگوں میں پیدا ہو جائے - اور اس کو ذاتی اغراض و نفسانی جذبۂ انتقام پر صرف نہ ہوتے دے) - چونکہ میں قدرتاً ذہنی یا علمی جنگ کے علاوہ کسی ایسے ہنگامہ کو پسند نہیں کرتا - جو کسی فرد یا جماعت کی عمرانی زندگی میں اختلال پیدا کر دے - اور چونکہ موجودہ مظاہرے کھلے ہوئے دو محاذ بنا رہے تھے - جن کی باہمد گر آویزش خطرناک نتائج پیدا کرنے والی تھی - اس لئے جس وقت میرے بعض مخلص احباب کا وفد مشاورت صلح کے لئے آیا تو چونکہ اس دوران میں مجھے کافی تجربہ ہو چکا تھا کہ مسلمانوں میں ہنوز اتنی بیداری پیدا نہیں ہوئی ہے کہ وہ موجودہ زمانہ کے حالات کو سامنے رکھ کر تبلیغ و اشاعت مذہب تو خیر بڑی چیز ہے، کم از کم "لا اکراہ فی الدین" ہی کا صحیح مفہوم عملی زندگی میں متعین کر سکیں - اس لئے میں نے اظہار رضامندی میں مطلق پس و پیش نہ کیا، کیونکہ جب دوا کی تلخی ناقابل برداشت ہو تو طبیب کو اپنے نسخہ میں تبدیلی پیدا کرنا ضرور ہے

اس دوران میں بعض مضامین کی وجہ سے لوگوں کو شکایت پیدا ہوگئی تھی - نہ اُن سے بعض منصوصات مذہب کو صدمہ پہونچتا ہے - خود میں نے بھی اس مسئلہ پر غور کیا - اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ میں جس نقطۂ بلند سے اسلام و تعلیمات اسلام کی صداقت و حقانیت کو دیکھتا ہوں وہاں تک پہونچنا آسان نہیں، اس لئے میں نے پوری طرح محسوس کیا کہ یقیناً میرے بعض مضامین سے بہت سے حضرات کو تکلیف ہوئی ہوگی - اور مجھے اس کا اعتراف ہے - کہ جس طریق کار کو میں نے خالصتہً للہ محض مسلمانوں کے فائدہ کے لئے اختیار کیا تھا - ہنوز اس کا وقت نہیں آیا ہے - یا یہ کہ اسی کو کسی دوسرے لب و لہجہ یا اسلوب تحریر کے ساتھ پیش کیا جاتا تو زیادہ مناسب تھا -

بہرحال ان حالات کے ماتحت میں ان تمام حضرات کو جن کو اس وقت تک میرے مذہبی مضامین سے کسی قسم کی تکلیف پہونچی ہے - یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقصود ہمیشہ سے صرف خدمت اسلام رہا ہے - اور رہیگا - لیکن آیندہ میں جن خطوط پر اس خدمت کو انجام دینا سوچ چکا ہوں وہ کچھ مختلف ہوں گے یعنی اب میرے مضامین سے کوئی ظاہری تاویل کسی کی دلآزاری کی پیدا نہ ہو سکے گی

اس لئے ناظرین نگار میں سے وہ حضرات جنھوں نے تنقیدات مذہبی کو ہمیشہ پسند کیا ہے مطمئن رہیں کہ یہ عنصر کچھ کمی کیساتھ ہنوز نگار میں باقی رہیگا غالباً زیادہ خوبی کے ساتھ اور وہ حضرات جو اس سلسلہ کو اشتداد لہجہ کی وجہ سے پسند نہیں کرتے - اُن کو بھی مطمئن ہو جانا چاہیئے کہ آیندہ اس شکایت کا

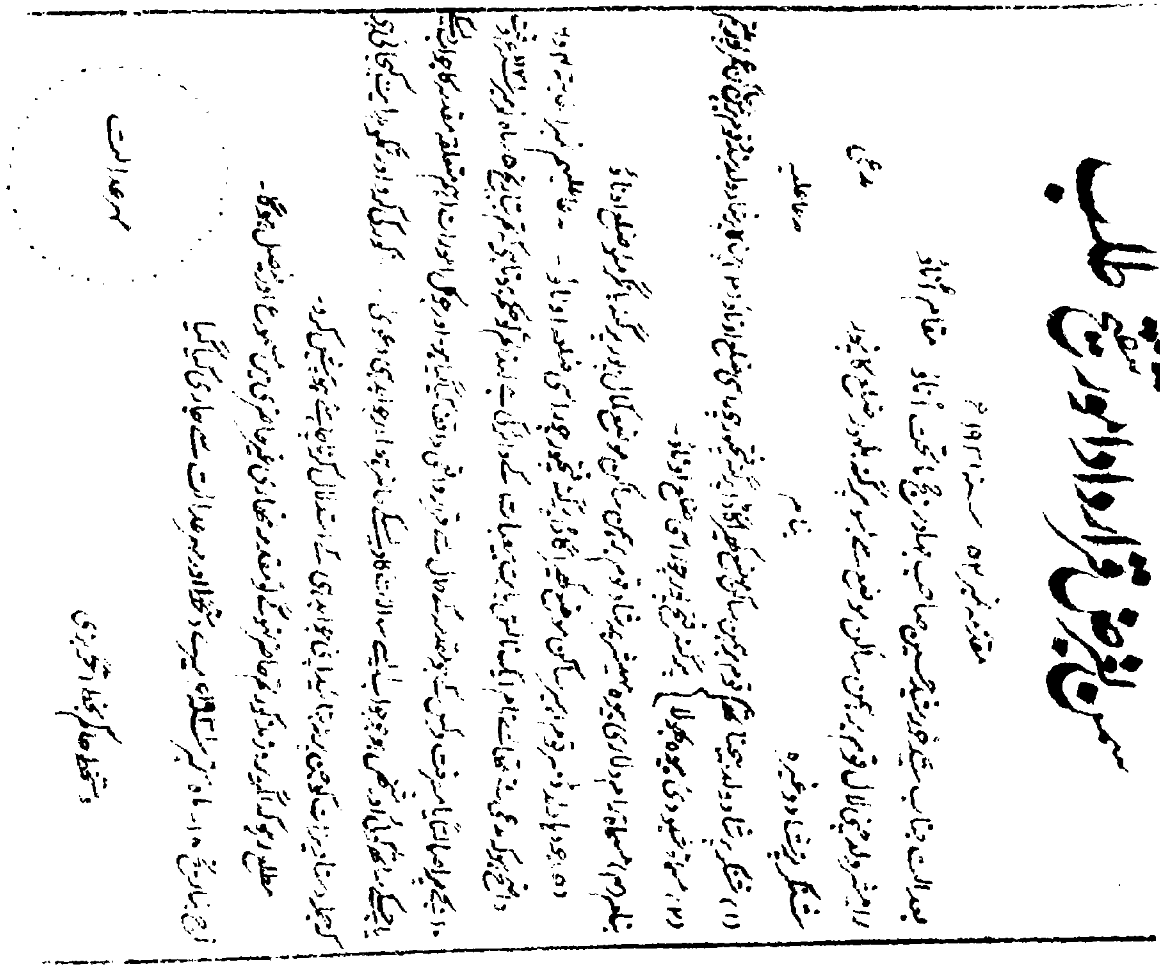
موقع انھیں نہ ملے گا

میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے اور لکھنؤ پبلک کے درمیان جو گفتگوئے صلح ہو رہی ہے، وہ پوری ہوگی بھی یا نہیں اور اگر ہوئی تو کس نوع کا اعلان کن الفاظ میں مجھ سے چاہا جائے گا لیکن میں بلا لحاظ اس کے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ آیندہ کے لئے اپنا طرز عمل ناظرین نگار اور تمام ملک کے سامنے واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ اور اگر اس وقت تک کسی کے جذبات کو میری طرف سے صدمہ پہونچا ہے تو میں اظہار تاسف کرتا ہوں اور اُن لوگوں کو جو مجھے میری تحریروں سے کافر و ملحد ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ (جیسا کہ میں نے اکثر و بیشتر ظاہر کیا ہے) پھر ایک بار اور ہمیشہ کے لئے یقین دلانا چاہتا ہوں۔ کہ بحمد اللہ میں مسلمان ہوں اور ان تمام اصول شرائط کے ساتھ جو ایک شخص کو مسلمانوں کی جماعت میں شامل کرنے کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ اور اگر کسی جماعت نے میری تحریروں سے اس کے خلاف کوئی مفہوم پیدا کیا ہے اور وہ اب بھی میرے کفر و ارتداد پر یقین رکھنے کے لئے مُصر ہے۔ تو میں کائنات کے ایک ایک ذرہ کو شاہد بنا کر باواز بلند کہنا چاہتا ہوں کہ

نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیات اعمالنا و اخر دعوانا

ان الحمد للہ رب العالمین - و الصلوٰۃ علی نبیہ الکریم

نیاز



مطالعہ حدیث تنقید صحیح کی روشنی میں

(نصاب زکوٰۃ وعشر)

قرآن میں زکوٰۃ کا ذکر اس تواتر کے ساتھ آیا ہے کہ بہت کم آیتیں قرآن شریف کی ایسی ہوں گی جہاں نماز کی تاکید کے ساتھ زکوٰۃ دینے کی تاکید نہ کی گئی ہو۔ قرآن نے اس کے ساتھ ہی زکوٰۃ اور صدقہ میں کوئی تخصیص نہیں کی ہے۔ اور ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کیا ہے۔ مگر جس طرح نماز کی ترکیب کی کہیں صراحت قرآن شریف میں نہیں ہے۔ اس طرح نصاب زکوٰۃ کا ذکر بھی کہیں نہیں ہے۔ حالانکہ مستفسرین نے اس کو دریافت بھی کیا جس کا قرآن شریف نے یہ جواب دیا ہے۔

یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو۔ کذالک یبین اللہ لکم الایٰت لعلکم تتفکرون (بقر۔ رکوع ۲۶۰-)۔

اور تم سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنی زکوٰۃ دیں۔ کہدو جتنا تم سے ہو سکے۔ اسی طرح اللہ اپنے احکام تم سے کھول کھولکر بیان کرتا ہے تاکہ تم غور کرو

پوچھنے والوں کی اس سے تشفی نہیں ہوئی۔ دوبارہ دریافت کیا۔ پھر جواب ملتا ہے

یسئلونک ماذا ینفقون۔ قل ما انفقتم من خیر فللوالدین والاقربین والیتمیٰ والمساکین وابن السبیل وما تفعلوا من خیر فان اللہ بہ علیم۔ (بقر۔ رکوع ۲۵)

کیا اس سے زیادہ اور وضاحت کی ضرورت تھی کہ مسلمانوں کو بتایا جاتا کہ خیرات کوئی سرکاری انکم ٹیکس نہیں ہے بلکہ تمہاری رافت ہمدردی اور نیکدلی کا نتیجہ ہے۔ تم جتنا چاہو دو۔ اسکا دینا البتہ تمہارے اوپر ایسا ہی فرض ہے جیسا تمہاری نماز۔ قرآن نے کیوں اس نصاب سے اعراض کیا جس سے فقہ اور حدیث کے اوراق بھرے پڑے ہیں کیا قرآن کے لئے یہ بتانا ممکن نہ تھا۔ کہ تم ڈھائی روپیہ سیکڑہ اپنے اس مال میں سے ادا کرو جو تمہارے پاس سال کے آخر تک باقی رہے۔ اس خاموشی کی کیا مصلحت تھی یا کم سے کم اگر نصاب نہ بتایا تھا تو اس کہنے میں کیا حرج تھا کہ تم زکوٰۃ اسی شرح سے ادا کرو جو تم سے مانگی جائے۔ البتہ قرآن شریف کے سورۂ برأت آیت ۶۰ میں زکوٰۃ کے مصرف کی اس طرح تشریح کی گئی ہے۔

انما الصدقٰت للفقراء والمساکین والعاملین علیہا والمؤلفۃ قلوبہم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ

زکوٰۃ ان مصارف کے لئے ہے۔ فقرا۔ مساکین۔ زکوٰۃ کے محصلین مؤلفۃ القلوب۔ غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے۔ مقروض۔ مسافر و غربا لغ الیہ یار

اور راہ خدا میں۔ یہ خدا کا فرض ہے اور خدا حکیم و علیم ہے۔
وابن السبیل فریضۃ من اللہ واللہ علیم حکیم (توبہ)
سورۂ برأت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی۔ جس میں زکوٰۃ فرض کی گئی۔ اور زکوٰۃ کے مصرف علیحدہ علیحدہ بتائے گئے۔ منجملہ اور مصارف
کے اس کا ایک مصرف یہ بھی ہے کہ محصلین زکوٰۃ کو اس مد سے تنخواہ بھی دی جائے۔ جس کے یہ معنی ہوئے کہ قرآن نے زکوٰۃ کی اس صورت
کو بھی تسلیم کیا ہے جو سلطنت کے انکم ٹیکس کی بھی تھی۔ لیکن اگر زکوٰۃ سے ایک وقت میں انصرام سلطنت اور تجہیز جیوش اسلامی
.... کا کام لیا گیا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ زکوٰۃ کا مصرف وہی مصرف قرار دیا گیا۔ اگر ایک اسلامی سلطنت نے دوران جنگ
میں مجروحین کے لئے بعض مساجد کو خستہ خانوں میں تبدیل کر دیا۔ تو اس ضرورت کے رفع ہونے کے بعد وہ مسجد کے کام میں بھی
نہیں لائے جا سکتے قرین قیاس یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں جنگ کے اخراجات کے لئے زکوٰۃ
مثل انکم ٹیکس کے وصول کی گئی ہو۔ مگر تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت عثمان نے اپنے زمانۂ خلافت میں بیت المال و عاملین
زکوٰۃ کو موقوف کر دیا تھا اور مسلمانوں کو اختیار دے دیا تھا کہ وہ بطور خود زکوٰۃ کا روپیہ جس مستحق کو چاہیں دے دیں۔ جب حضرت عثمان
نے پرانے طرز عمل کو ترک کرنے میں نہ سنت سے انحراف کیا اور نہ قرآن سے تو کیا ہم اس سے آگے قدم بڑھا نہیں سکتے یعنی ان زبانی
قیود کو جو فقہا نے زکوٰۃ پر قائم کئے ہیں علیحدہ کر کے اس کے اصل مفہوم یعنی صدقہ اور خیرات کو اختیار نہیں کر سکتے۔ ... تک کہیں
کہ اب زکوٰۃ زکوٰۃ کو ایک ملکی انکم ٹیکس میں تبدیل کر دیتا ہے اور اس مفہوم کے ماننے میں کوئی حرج نہیں ... بشرطیکہ ...
اسلامی سلطنت ... میں محدود ہو۔ مگر موجودہ صورت میں جبکہ اسلام اسلامی سلطنت کے حدود سے بہت دور نکل گیا ہے ...
لکیر کو پیٹے چلے جانا جو اس زمانے کی یادگار ہے جبکہ ہمارے اجداد کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ اسلامی سلطنت سے باہر بھی ...
ہونا ممکن ہے۔ حماقت ہے بجائے اس کے کہ اس کی تردید میں نظری دلائل پیش کئے جائیں۔ اسقدر کہنا کافی ہے کہ اسلام ...
کی موجودہ صورت ان تمام خرافات کے منافی ہے۔ جنہوں نے دار الحرب کے سلسلہ مسائل میں ایک وقت اسلام کو قومی و سیاسی
کی صورت میں تبدیل کر دیا تھا۔ اسوقت اسلام دنیا کی کسی ایک قوم میں محدود نہیں اور نہ ایک سلطنت کے حدود کے اندر
بالفعل مسلمانوں کی آبادی کا ۹/۱۰ حصہ اسلامی سیاست کے دسترس سے باہر ہے۔ لہذا اسلامی سلطنت سے باہر اسلام کا قیام ...
ایسی حقیقت ہے جسکا انکار روز روشن کا انکار ہے۔ اور اس سواد اعظم اسلام کا کام بغیر سلطان اسلام کے چل رہا ہے۔ نہ
چل رہا ہے بلکہ ان میں عمرانیت و شخصی آزادی ان ممالک سے زیادہ ہے جہاں مسلمانوں کی سلطنتیں ہیں۔ اس لئے دار ...
دار الاسلام کی تفریق اور دار الحرب میں قیام کی ممانعت اور وہاں سے ہجرت کی فرضیت وغیرہ وغیرہ کو اب ...
اسلام کا تعلق ملکی سیاست سے بتلانا جبکہ ہمارے سامنے خود ہندوستان کی سیاست ...
ہے۔ چنانچہ دار الحرب کے مسئلہ پر گفتگو کرنا۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان ...
پر ہندوستان سے ہجرت کر جانا فرض ہے۔ باوجودیکہ یہاں نہ کوئی سلطان ہے نہ قاضی نہ ...
وضع کے مولوی پرانی لکیر پیٹے چلے جا رہے ہیں۔ مگر انکا وجود ... ہے۔ نہ انہوں ...

و تمدن نے انکا ساتھ دیا - جاہلوں کی ایک جماعت ان کے ساتھ ہے جو ان کی طاقت کو تباہ کر رہی ہے - وہ نہ ان کو مسلمانوں کے مال پر اختیار رہا - اور نہ ان کی آبرو پر - تعزیرات ہند نے انکی لئے کوئی دفعہ مستثنیات میں سے نہیں رکھی - اس صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک اسکیم تنظیم جماعت اسلامی کی عرصہ ہوا مجھ کو ہی سوجھی تھی - جبکہ خلافت ترکیہ میں تغیر و تبدل ہو رہا تھا - اسکو میں نے معارف کے کسی اشاعت میں پیش کیا تھا مگر آں قدح بشکست و آں ساقی نماند - وہ خیالات بھی خلافت کے ساتھ ختم ہوگئے - اگرچہ اس کے بعد ہی امرتسر کے چند جوشیلے مسلمان اس کی تشکیل کے لئے کمربستہ ہوئے - لیکن سعی اچھا ہوا کہ بارآور نہ ہوئی کیونکہ مجھے فوراً اپنی غلطی اور اسکیم کی خطرناکی سے انتباہ ہوا اور اب تو میرا یہ خیال ہے کہ اسلامی قومیت توسیع اسلام کے لئے سنگ راہ ہے - مسلمانوں کی جماعت قومیت کا رنگ اختیار کرکے اپنی جماعت کو وسیع کرنے کے ناقابل ہو جاتی ہے اور قومیت کی جتنی برائیاں اور لعنتیں ہیں ان سب کا حامل ایک ایسا مذہب کر دیا جاتا ہے جو تمام دنیا کے انسانوں کے لئے پیام امن ہے - خیر یہ تو ضمنی گفتگو تھی - اصل بحث یہ ہے کہ نصاب زکوٰۃ متعین ہو جانا چاہئے - اگر حدیث سے اس کی تعیین ثابت ہو تو وہ موقوف ہے ایک وقت و زمانہ کے لئے - اور یہ کہ اب زکوٰۃ کا مفہوم اسلامی سلطنت سے باہر اور موجودہ اسلامی سلطنت میں صرف خیرات ہے جو مسلمانوں پر جب کہ وہ مستطیع ہوں ہر وقت فرض ہے - نہ اس کے لئے کوئی زمانہ درکار ہے اور نہ کوئی نصاب - عامل بالقرآن کی زکوٰۃ تمام وہ مصارف - و زمانہ میں جو خیراتی مدمیں ہیں - فقہ اور حدیث نے زکوٰۃ کو جو صورت دی ہے - وہ درحقیقت اب اس جگہ پر رکھے جانے کی قابل ہے جہاں انکم ٹیکس ملتا ہے - انکم ٹیکس پڑھتے ہیں زکوٰۃ کے نصاب میں یہ امر بھی قابل غور ہے - کہ شریعت یہود اور قوانین نوشیرواں جیسی نہیں پر کہاں تک فقہائے اسلام نے عمل کیا - خصوصاً یہود کا عشر جس کے متعلق قرآن نے ایک لفظ بھی نہیں کہا مگر رسول اللہ صلعم سے ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ جو غلہ آسمان یا چشموں کے پانی سے پیدا ہو اس میں دسواں حصہ زکوٰۃ ہے اور جو غلہ کھینچنے سے پیدا ہو تو اس میں بیسواں حصہ زکوٰۃ (ابن ماجہ)

یہ گویا بالکل شریعت یہود کا چربہ ہے جس کو قرآن سے کوئی واسطہ نہیں - اگر ایک سلطنت غلہ پر کوئی ٹیکس وصول کرتی ہے - تو اسلام اور مذہب کو اس سے کیا - مگر شاید اس قسم کی احادیث کا مطلب یہ تھا کہ عوام کو مذہب کے ذریعہ سے سلطنت کا مطیع بنایا جائے - لیکن اگر اس طرح سلطنت کی طرفداری کی گئی تھی تو کیا یہ زیبا نہ تھا کہ سلطنت کو بھی مذہب سے ڈرایا جاتا اور ان کو منع کر دیا جاتا کہ عشر وصول کرکے اس سے حرم کے لئے خوبصورت لونڈیاں نہ خریدی جائیں اور علماء کو رشوت نہ دی جائے - بلکہ مفلوک الحال مسلمین کی پرورش پر وقف کر دیا جائے - عشر درحقیقت یہودیوں کی ایجاد نہیں - اہل بابل و مصر بھی اتنا ہی حصہ اپنے دیوتاؤں پر چڑھاوا چڑھانے کے لئے الگ کر دیتے تھے - اور جیسا کہ کتاب خروج سے معلوم ہوتا ہے، یہود بھی بالکل یہ ہی چڑھاوا چڑھایا کرتے تھے - اسکے مقابل اگر قرآن شریف میں کچھ کہا گیا ہے تو وہ مال غنیمت پر خمس تھا - جیسا ارشاد ہوتا ہے -

واعلموا انما غنمتم من شئ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربی والیتمی والمسکین وابن السبیل ان کنتم امنتم باللہ - (سورۂ انفال - آیت ۴۱)

یہ لطیفہ بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ بعض اوقات ایسے احکام جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ خود بخود ترک ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان میں کوئی مسلمان کاشتکار اپنی کھیتی کا عشر نہیں دیتا۔ باوجودیکہ حدیث میں اس کی صراحت ہے اسی طرح حدیث نے جس بات سے منع کیا ہے۔ اس سے مسلمانوں کو کچھ بھی انکار نہیں۔ چنانچہ زمین کو کرائے پر دینا حدیث میں ممنوع ہے۔ جیسا مسلم کی اس روایت سے ظاہر ہے۔

ابن عمر اپنی زمین کرائے پر دیا کرتے تھے۔ پھر ان کے پاس ایک آدمی آیا اور ان سے حدیث بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا کھیتوں کو کرائے پر دینے سے تو ابن عمر گئے اور میں بھی (یعنی راوی) ان کے ساتھ تھا یہاں تک کہ بلاط (ایک مقام ہے مدینہ میں مسجد نبوی کے پاس) میں رافع سے ملے اور ان سے یہ حدیث پوچھی۔ انہوں نے کہا ہاں آنحضرت نے منع کیا کھیتوں کو کرایہ پر دینے سے۔ آخر ابن عمر نے کھیتوں کو کرایہ پر دینا چھوڑ دیا۔ مگر کوئی مسلمان اس پر عمل نہیں کرتا۔ حالانکہ یہ روایت سوشلزم کی جان ہے۔

قرآن کو چھوڑ کر دوسروں کے اقوال کی تقلید کا نتیجہ اکثر ایسا ہی ہوا ہے۔ کیونکہ انسانی اقوال انسانی طبیعت کے اختلاف پر نظر نہیں کرتے۔ وہ اپنے اوپر تمام انسان کی طبیعت کو محمول کرتے ہیں۔ اور قرآن کے خلاف منشا تشدد سے کام لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ رہتا ہے کہ مسلمانوں کا بڑا حصہ سرے سے اس فرض کو ہی ادا نہیں کرتا۔ مسلمانوں میں بالعموم جو نماز و روزہ کی پابندی میں ہے۔ اس کا بھی یہی سبب ہے کہ ان پر قرآن سے زیادہ تشدد کیا گیا اور انہوں نے اس کی وجہ سے اصل فرض کو بھی گم کر دیا۔

نصاب زکوٰۃ کی جو صراحت فقہا نے کی ہے۔ مجھکو کوئی حدیث .... اس کی تائید میں نظر نہ آئی البتہ انس سے مسلم میں ایک روایت ہے جسکی تائید ابن عمر کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک نے ابوبکر صدیق کا نام لیا ہے اور دوسرے نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا۔ انس کی روایت یوں ہے۔

"ابوبکر صدیق نے میرے واسطے لکھا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یہ فرض زکوٰۃ کا بیان ہے جسکو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا۔ اور اللہ نے اس کا حکم اپنے رسول کو کیا جب اونٹوں کی عمروں میں فرق ہو اور اس کے پاس صرف تین برس کی اونٹنی ہو تو وہی لے لی جاویگی۔ اور دو بکریاں اور لیجاویگی۔ اگر اس کے پاس ہوں۔ ورنہ بیس درم لئے جاویں گے۔ اور جس کے پاس اتنے اونٹ ہوں جس میں تین برس کی اونٹنی واجب ہوتی ہے (یعنی چالیس سے ساٹھ تک) اور اس کے پاس تین برس کی اونٹنی نہ ہو تو اس سے دو برس کی اونٹنی لی جاویگی۔ اور دو بکریاں اور بیس درم اور جسکے پاس اتنے اونٹ ہوں جس میں دو برس کی اونٹنی لینا واجب ہوتی ہے (یعنی ۳۶ سے ۴۵ تک) اور اس کے پاس دو برس کی اونٹنی نہ ہو لیکن تین برس کی اونٹنی ہو تو وہی لی جاویگی۔ اور زکوٰۃ تحصیل کرنے والا اس کو بیس درم پھیر دیگا اور جس کے پاس اتنے اونٹ ہوں جن میں دو برس کی اونٹنی واجب ہو جاتی ہے اور اس کے پاس دو برس کی اونٹنی نہ ہو تو اس سے ایک برس کی اونٹنی لی جاویگی۔ اور بیس درم اس کو اور دینا ہوں گے یا دو بکریاں۔ اور جس کے پاس اتنے اونٹ ہوں۔ جس میں ایک برس کی اونٹنی واجب ہوئی ہے (یعنی ۲۵ سے ۳۵ تک) اور ایک برس کی اونٹنی اس کے پاس نہ ہو

لیکن دو برس کی اونٹنی اس کے پاس موجود ہو تو وہی اس سے لی جاویگی اور زکوٰۃ لینے والا اس کو بیس درہم یا دو بکریاں پھیر دیگا۔ اور اگر کسی کے پاس ایک برس کی اونٹنی موجود نہیں لیکن دو برس کا نر اونٹ موجود ہے تو وہ اس سے لے لیا جاوے گا۔ اور اس کو کچھ اور نہ دیا جاوے گا"

یقیناً ان احکام کا تعلق مذہب سے نہیں ہو سکتا بلکہ محض سیاست و خراج ملکی سے ہے۔ محدثین نے اس کو ابوبکر صدیق سے بیان کیا ہے اور میں اس کو چشم دید بینی سے بیان کرسکتا ہوں کہ پرانے ترکوں میں یہی ٹیکس "زکوٰۃ" کہلاتا تھا۔ اور میں نے خود یہ ٹیکس انگریزی حکومت کی طرف سے جبکہ میں جنوبی کردستان میں ڈپٹی اسسٹنٹ پولیٹکل افیسر تھا۔ قبائل بنی تمیم سے وصول کیا ہے۔

نصاب زکوٰۃ کا مدعا اگر یہ ہے کہ زکوٰۃ کی پابندی بجائے عام تاکید کے ایک فرض خاص سمجھا جائے تو اس کو عملی حیثیت سے دیکھو۔ اوّل تو انکم ٹیکس و خیرات میں باہم اتفاق کی صورت نہیں۔ ایک جبریہ ہے اور دوسرا اختیاری۔ کیا مسلمان بھی قاضی ابویوسف کی طرح اس ٹیکس کے دینے میں حیلہ حوالہ کیا کریں گے یا حاجتمندوں کی حقیقی سمتوں میں امداد کریں گے۔ فرض کرو کہ ایک شخص کے پاس خیرات کرنے کو مال ہے مگر فقہ کی رو سے اس پر نصاب ابھی واجب نہیں ہوتا۔ تو تم ایسے شخص کو کیونکر خیرات کی طرف مائل کر سکتے ہو۔ حالانکہ ضرورت تو یہ تھی کہ اس کو زکوٰۃ کا مفہوم وہی بتایا جاتا۔ جس کے لئے نصاب و وقت کی کوئی قید نہ ہو۔

آخر میں صرف اسقدر گزارش ہے کہ زکوٰۃ نماز کی طرح ایک فرض روزانہ ہے۔ عیسائیوں میں ہر اتوار کو جب نماز ختم ہو جاتی ہے تو زکوٰۃ جمع کی جاتی ہے۔ اور وہ نیک کاموں میں خرچ ہونے کے لئے گرجا میں جمع رہتی ہے۔ کیا اس میں واقیموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ کی بو نہیں آتی۔ کیا تم بھی اپنی جمعہ کی نماز کے ساتھ ایک آدھ روپیہ زکوٰۃ کا نہیں نکال سکتے۔

(باقی) "حق گو"

نگار بک ایجنسی کی زیرِ طبع کتابیں

چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کیساتھ اسمیں نہایت ہی دلکش انداز بیان کیساتھ انسانی سوسائٹی کے نظام، دنیا کے امن و سکون ہیئت اجتماعی کے اصول پر بالکل افسانہ کی زبان میں بحث کیگئی ہے اور ہر اس شخص کو جو موجودہ مسائل ہند سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ یہ تالیف بھی حضرت نیاز فتحپوری کی ہے۔

مادیین کا مذہب اسوقت ہر شخص کی زبان پر مادہ اور مادہ پرستی کے الفاظ چڑھے ہوے ہیں، لیکن آپ کو اس کتاب کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوسکے گا۔ کہ مادیین کا مسلک و مذہب کیا ہے اور وہ کس نگاہ سے عالم کو دیکھتے ہیں۔ اس کتاب کا طرز ادا اسقدر آسان و دلکش ہے کہ ایک بار شروع کرنا گویا ختم کر دینا ہے۔ یہ بھی جناب نیاز فتحپوری کے فکر و دماغ کا نتیجہ ہے۔

گہنا اور دوسرے افسانے حضرت مجنوں گورکھپوری کے بہترین افسانوں کا مجموعہ۔ جناب مجنوں کی افسانہ نگاری ایک مخصوص دلکش انداز کی ہوتی ہے۔ جس سے ناظرین نگار بخوبی واقف ہیں یہ مجموعہ ۲۰۰ صفحات سے زائد کا ہے۔

مینیجر نگار

ایک عجیب شادی

یوں تو آفتاب ہر صبح مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور دنیا اور اس کے ہر گوشہ کو روشنی اور حرارت پہنچا کر تھکا ماندہ کسی مغربی شہزادی کے آغوش میں بیہوش ہو جاتا ہے مگر آج اس کی پہلی کرن اپنے ساتھ کچھ جدید پیغام تغیر لے کر آئی۔ پہلی شے جس کو آفتاب کی پہلی کرن نے روشن کیا وہ کلکتہ کا ایک بوسیدہ مکان ہے جس میں ایک نوجوان سر جھکائے کسی خیال میں منہمک ہے۔ اسکا مرجھایا ہوا چہرہ اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اگر یہ شخص اسوقت نہیں تو کچھ دن قبل بیمار ضرور تھا۔

یک بیک اس نے سر اوپر اٹھایا اور یوں کہنا شروع کیا: "اگر میری پیدائش خدا کی ایک لایعنی حرکت ہے اور مقصود اس سے صرف تفریح ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس لغو حرکت کے لئے صرف میری روح کیوں منتخب کی گئی اور تفریح کا یہ سلسلہ کب تک قائم رہے گا"

اب وہ اٹھ بیٹھا اور زیادہ جوش کے ساتھ بولنا شروع کیا!

"میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں ذلیل ہوں۔ میری یہ ہستی قابل استکراہ ہے۔ میرا وجود..... قابل نفرین ہے اور شاید مجھے کوئی حق نہیں کہ اپنی اس ذلیل شخصیت کو قائم رکھنے کی کوشش کروں۔ لوگ کہتے ہیں خودکشی بزدلانہ حرکت ہے..... ہوا کرے..... میں سمجھتا ہوں کہ خدا سے انتقام لینے کا یہی ایک طریقہ انسان کے پاس ہے۔ دنیا امیدوں کی جولانگاہ ہے۔ نہیں غلط، میں اس کو سراب سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتا۔ اس کی کل لذتیں عارضی اس کی تمام کیفیتیں ناپائدار...... پھر بھی انسان انہیں عارضی لذتوں کے حصول کے لئے بڑی سی بڑی قربانی کے لئے تیار ہو جاتا ہے... میں اپنی موجودہ حالت اور اس وقت کی حالت سے جب والد زندہ تھے۔ مقابلہ کرتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ آہ میں کیا تھا اور کیا ہو گیا"

جمشید انتہائی مایوسی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ اور جو کچھ زبان پر آ رہا تھا بک رہا تھا۔ پھر وہ کچھ سنبھلا اور بولا "بیس روز سے میں کلکتہ میں ہوں۔ اور نوکری حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کر چکا۔ کونا کونا چھان مارا یہاں تک کہ طاقت اور جوتہ دونوں نے ایک ساتھ جواب دے دیا لیکن بیکار۔ جو کچھ پاس تھا سب خرچ ہو گیا۔ اب میرے پاس والدہ کی نشانی ایک آئینہ رہ گیا ہے جو مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے مگر مجبوراً مجھے اس کو بھی علیحدہ کرنا پڑے گا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہو گا، تاریکی..... لاعلمی.... فراموشی.... اور اُس خدا پر بھروسہ جو کسی طرح بھروسہ کے قابل نہیں۔"

.... آئینہ ہاتھ میں لے کر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے وہ بازار کو نکل گیا..

جمشید فضل بھائی کا اکلوتا لڑکا تھا۔ بیس سال قبل، فضل بھائی بمبئی کے بڑے تاجر مانے جاتے تھے مگر کچھ عرصہ ہوا۔ طاعون کا شکار ہوگئے اور ان کے ساتھ ہی انکی دولت بھی ختم ہوگئی۔ فضل بھائی نے جمشید کی تعلیم و تربیت شہزادوں کی طرح کی تھی۔ اور اسکو ہر اس فن کا ماہر بنادیا تھا جس کی ضرورت، عملی دنیا میں پڑتی ہے۔ چنانچہ اس کو گھوڑے کی سواری اور شکار کی بھی مشق کرائی گئی تھی

باپ کی موت پر وہ دل کھول کر ماتم بھی نہ کرچکا تھا کہ مکان بھی نیلام ہوگیا اور مجبوراً اُسے آوارہ ہونا پڑا۔ اس کے پاس صرف ایک جوڑہ کپڑا تھا اور چند روپیہ گھر سے نکلتے ہی پہلا خیال جو اس کے دل میں آیا وہ بمبئی چھوڑنے کا تھا۔ وہ سیدھا اسٹیشن گیا اور وہاں سے کلکتہ روانہ ہوا۔ کلکتہ پہنچ کر وہ ایک معمولی سے ہوٹل میں ٹھہرا اور نوکری کی تلاش میں لگا رہا۔ ابھی وہ کوشش کر ہی رہا تھا کہ دفعتہً بیمار ہوگیا۔

آئینہ کے عوض اس کو اتنا مل گیا تھا کہ وہ سیر ہوکر دو وقت کھاسکے

لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ کل کیا کرے گا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ ہوٹل کا خادم اسکے پاس ایک خط لایا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید اس کی کسی درخواست کا جواب ہے۔ مگر وہ مایوس ہوگیا کیونکہ لفافہ کے اندر صرف اخبار کا ایک ورق تھا۔ اخبار کے ایک حصہ پر سرخ روشنائی سے چند نشان دیے تھے۔ جمشید اس کو پڑھنے لگا: لکھا تھا "ضرورت ہے ایک شریف تعلیم یافتہ نوجوان کی جو گھوڑے کی سواری اور شکار کی مہارت رکھتا ہو۔ معاوضہ معقول دیا جائے گا۔ ذیل کے پتہ پر امیدواروں کو کل دس بجے دن کو حاضر ہونا چاہیے،،

پتہ

مسٹر زماں۔ بار ایٹ لا

۲۱ رگرین روڈ

کلکتہ

پڑھنے کے بعد جمشید کو تعجب ہوا کہ یہ اخبار اس کے پاس کیونکر پہنچا کلکتہ میں وہ بالکل اجنبی تھا۔ بھیجنے والے کو اس کا پتہ کیونکر معلوم ہوگیا، آخرش اس نے یہ سوچ کر تسلی کرلی کہ خدا کے کارخانے عجیب ہیں۔ صبح کو وہ اسی پتہ پر روانہ ہوا۔ امیدواروں کی ایک کثیر تعداد دفتر کے گرد جمع تھی اور بیرسٹر صاحب ایک ایک فرد سے الگ الگ ملاقات کررہے تھے۔ اس کے پہنچتے ہی بیرسٹر صاحب نے فوراً اس کو منتخب کیا اور باقی امیدواروں کو اطلاع دیدی کہ جگہ پُر ہوگئی ہے

مسٹر زماں جمشید کو اپنے پرائیوٹ کمرہ میں لے گئے اور اس کو ایک کوچ پر بٹھاکر خود بھی پاس بیٹھ گئے۔ جمشید تقریباً سولہ گھنٹہ سے بالکل بھوکا تھا کمزوری کا یہ عالم تھا کہ اگر بیرسٹر صاحب کچھ دیر تک بیٹھنے کو نہیں کہتے تو وہ یقیناً گر پڑتا۔

جمشید اپنی نحیف آواز میں زماں صاحب سے یوں مخاطب ہوا۔

"جناب میرے خیال میں آپ نے اس جگہ کے پُر کرنے میں بہت عجلت کی ہے کیونکہ نہ آپ نے ابھی تک مجھے میرے فرائض سے آگاہ کیا اور نہ آپ نے میری رضامندی حاصل کی

مسٹر زماں: بالکل صحیح لیکن یہ کام اتنا سہل ہے اور معاوضہ اسقدر معقول کہ مجھے پوری امید ہے کہ آپ اسے ضرور منظور کریں گے۔ اگر انکشاف حقیقت جرم نہیں تو میں آپ کے لباس اور حالت کو دیکھکر یہ کہوں گا کہ آپ کی موجودہ مالی حالت اچھی نہیں ہے"

جمشید: جی ہاں مجھے اعتراف ہے کہ میں غریب ہوں اور مفلسی کی حد تک۔ پھر بھی میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری غربت مجھے ناجائز طریقہ سے روپیہ حاصل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی

جمشید اس وقت غریب تھا اور بھوکا مگر اس کی باتوں سے ایک شاہانہ استغنا ظاہر ہو رہا تھا۔ مسٹر زماں نے اس سے پھر دریافت کیا "جناب آپ مجھے شرائط سے مطلع فرمائیں تاکہ میں اپنا خیال ظاہر کر سکوں

مسٹر زماں: عزیزمن ذرا صبر کیجئے میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں پہلے مجھے دو تین باتیں دریافت کرنا ہیں۔ کیا میں آپکا اور آپ کے والد صاحب کا نام معلوم کر سکتا ہوں

جمشید: میرا نام تو جمشید ہے مگر والد کا نام اگر آپ دریافت نہ کریں تو زیادہ مناسب ہے مگر آپ یقین کریں کہ مجھے اپنے والد کے نام سے شرمندہ ہونے کی کوئی بھی وجہ نہیں بلکہ میں صرف اس لئے ان کا نام بتانا نہیں چاہتا کہ میری موجودہ ردی حالت انکے نام کی توہین کی باعث ہے۔ وہ زندہ نہیں ہیں کچھ عرصہ ہوا انکا انتقال ہو گیا

مسٹر زماں: خوب! میں آپ کے اعلیٰ خیال کی قدر کرتا ہوں آپ کے بشرہ اور انداز تکلم سے شرافت اور اعلیٰ اخلاق صاف نمایاں ہیں اور میرے مقصد کے لئے یہ کافی ہیں

جمشید: شکریہ جہاں تک شرافت کا سوال ہے آپ یقین کریں کہ میں شریف ہوں اور باقی باتوں کے متعلق صرف آپ کا تجربہ بتا سکے گا کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں

مسٹر زماں نے اب گفتگو کے دوسرے پہلو کو چھیڑا۔

مسٹر زماں: وہ معاملہ جس میں آپ کی مدد کی ضرورت ہے نہایت اہم ہے اس لئے مجھے ہر صورت سے اطمینان کر لینا ضروری ہے اگر آپ کسی وجہ سے اس کو منظور نہ کر سکے تو ایسی حالت میں آپ وعدہ کریں کہ یہ راز آپ ہی تک رہے گا:

جمشید: "اس کا آپ اطمینان رکھیں میں ان لوگوں میں ہوں جو دوسروں کا راز قبر تک ساتھ لے جاتے ہیں

مسٹر زماں: بہت خوب۔ سنئے وہ کام جو ایک راز کی حیثیت رکھتا ہے مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ اسکا تعلق صنف نازک کے ایک فرد سے ہے اور آپ جانتے ہیں وہ راز جو جنس لطیف کے کسی فرد سے وابستہ ہو کسقدر اہم ہوتا ہے۔ ایک لڑکی ہے جسکا نام اور خاندان میں اس وقت بتلانا مناسب نہیں سمجھتا یہ لڑکی کچھ دنوں قبل خوش حال تھی مگر اسباب کی نامساعدت کی وجہ سے اس کی مالی حالت کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ چنانچہ وہ اسوقت بالکل غریب ہے مگر آپ چاہیں تو اس کی حالت

سُدھر سکتی ہے اور وہ کافی دولتمند بن سکتی ہے۔
لڑکی اس وقت اس دنیا میں بالکل تنہا ہے۔ اس کے والدین عرصہ ہوا مر گئے۔ اس کی پرورش اس کی بیوہ چچی نے کی مگر وہ بھی حال میں مر گئی۔ لڑکی کی یہ چچی بہت دولتمند تھی اور چونکہ اس کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے چچی کی کل جائداد لڑکی کو ملی مگر ایک شرط کے ساتھ۔

اس لڑکی کے والدین کی ازدواجی زندگی کامیاب نہیں تھی اس لئے لڑکی شروع ہی سے نکاح کی مخالف ہے۔ اور اس نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ وہ شادی نہیں کریگی اس کا ذکر وہ ہمیشہ اپنی چچی سے کرتی تھی۔ مگر اس کی چچی نے اس رائے سے اختلاف کیا۔ لڑکی فطرتاً ضدی واقع ہوئی ہے اس لئے وہ اپنی چچی کی زندگی تک اپنے ارادہ میں کامیاب رہی۔ مگر مرنے کے بعد چچی نے یہ وصیت چھوڑی کہ

"وہ پچاس ہزار روپیہ جو بنگال بینک میں میرے نام سے جمع ہے وہ میرے بعد میری بھتیجی کو ملے اس شرط پر کہ وہ کسی شریف تعلیم یافتہ شخص سے شادی کر لے اور اگر میرے مرنے کے ایک سال کے اندر شادی نہ ہو تو یہ رقم خیراتی امور میں صرف کی جائے"

لڑکی نے روپیہ لینے سے قطعی انکار کر دیا کیونکہ شادی کرنا اس کو کسی طرح منظور نہ تھا۔ اسطرح چھ مہینہ گزر گئے۔ رفتہ رفتہ لڑکی غریب ہوتی گئی یہاں تک کہ اس وقت وہ غالباً بالکل مفلس ہے۔ مگر آپ باور کیجئے شادی کے لئے وہ اس وقت بھی تیار نہیں..... اسکی یہ حالت دیکھ کر ہم نے ایک ترکیب نکالی ہے اور وہ یہ کہ اس لڑکی کی شادی ایک شخص سے صرف اس لئے کی جائے کہ لڑکی روپیہ لینے کی مجاز ہو سکے۔ اور اس شخص کو (جس سے اس کی شادی ہوگی) بیس ہزار روپیہ دیا جائے تاکہ وہ شادی کے بعد بہت دور کسی ولایت میں جاکر بود و باش اختیار کرے اور یہ قطعی بھول جائے کہ کبھی اسکی شادی بھی ہوئی ہے شادی کے فوراً ہی بعد اس کو یہ شہر چھوڑ دینا ہوگا۔ شادی ایک ہفتہ کے اندر ہوگی اور شادی تک روزانہ پانچ روپیہ اس شخص کو معمولی اخراجات کے لئے دیئے جائیں گے۔

میں آپ کو اس کے لئے بالکل موزوں سمجھتا ہوں اور امید ہے کہ اس کو آپ منظور کر لیں گے اگر آپ کو منظور ہے تو لیجئے پانچ روپیہ کا نوٹ آج کے مصارف کے لئے حاضر ہے

جمشید سخت حیران تھا کہ ان عجیب باتوں کا کیا جواب دے۔ وہ سنجیدگی کے ساتھ معاملہ کے ہر پہلو پر غور کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ ایک روپیہ کا کھانا کتنا لذیذ ہوگا اور یہ کہ وہ ہوٹل کا کرایہ بھی انہی پانچ روپیہ سے ادا کر سکے گا۔ آخر ش کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا

"مجھے تو آپ کی ساری باتیں بہت عجیب معلوم ہوتی ہیں لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اس شخص کو آپ کیونکر مجبور کر سکتے ہیں کہ اپنی بیوی سے علیحدہ رہے"

مسٹر زماں:- بالکل درست اور اس لئے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ بیس ہزار کی یہ بڑی رقم اس کو کیوں دی جارہی ہے اور کیوں اس شخص کی شرافت اور اخلاق کی بلندی پر اعتماد کیا جارہا ہے یہ ہمیں معلوم ہے کہ اس شخص پر کوئی قانونی گرفت نہیں اگر ہے تو صرف اخلاقی

جمشید:- دوسری بات جو میری سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے کہ اشتہار میں ان مخصوص شرطوں کے ذکر کرنے سے آپ کی کیا غرض تھی

مسٹر زماں:- "اس سے صرف امیدواروں کی تعداد کو محدود بنانا تھا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس پر بھی امیدواروں کی کتنی کثرت تھی۔ اگر میں کوئی دوسری شرط تعلیم وغیرہ کی رکھتا تو شاید نصف کلکتہ میرے دفتر کا محاصرہ کئے ہوتا"

---- اب آپ کوئی عذر نہ پیش کریں اگر آپ کو اپنے فائدہ کا خیال نہیں تو اس لڑکی کے فائدہ کو ملحوظ رکھئے۔ صنف نازک کی مدد کرنا جنس قوی کے ہر فرد کا فرض ہے۔ چلئے آج میرے ساتھ کھانا کھائیے یہ کہکر جمشید کو اپنے موٹر پر بٹھاکر ایک ہوٹل میں لے لیا اور کھانے کے بعد اس کے ہوٹل تک پہونچادیا۔ جمشید اپنے کمرہ میں پہنچ کر اس اہم معاملہ کو سوچنے لگا کہ آیا وہ ان شرائط کو منظور کرے یا نہیں جہاں تک اس کی عقل کام کرتی تھی وہ اس میں کوئی ذاتی نقصان نہیں پاتا تھا اور اس کے پاس تھا ہی کیا جس کے نقصان کا احتمال ہوتا۔ ابھی وہ کسی خاص فیصلہ پر پہنچا بھی نہ تھا کہ ہوٹل کا منیجر آکر کہنے لگا۔ جناب میں ہفتوں سے تقاضا کر رہا ہوں مگر آپ نے ابھی تک کرایہ ادا نہیں کیا ہے آج آپ مہربانی کرکے کرایہ دے دیں۔ جمشید کے پاس پانچ روپیہ کا وہ نوٹ تھا اس نے فوراً کرایہ چکادیا اور اطمینان سے دن بھر سیر کرتا رہا۔ دوسرے روز صبح کو وہ پھر بیرسٹر صاحب کے دفتر گیا اس کا ارادہ تھا کہ وہ زماں صاحب سے مل کر ان باتوں کی تشفی کرے گا جس کا خیال اس کو بعد کو ہوا تھا۔ مگر بیرسٹر صاحب موجود نہ تھے۔ انکے کلرک نے اس کو ایک لفافہ دیا۔ اس میں پانچ روپیہ کا نوٹ تھا۔

یوں ہی ایک ہفتہ گذر گیا جمشید نے ہر چند کوشش کی مگر زماں صاحب سے ملاقات نہ ہوسکی۔ مگر روز اس کو اس دفتر سے اسی طرح پانچ روپیہ ملتے رہے

شادی کے ایک روز قبل اس کے پاس ایک پارسل آیا جس میں نہایت عمدہ لباس تھا اور ایک خط تھا جس میں چند ہدایتیں درج تھیں اور ایک وقت مقررہ پر شادی کے روز اس کو ایک خاص مکان میں (جس کا پتہ خط میں دیا ہوا تھا) بلایا گیا تھا وہ اس پتہ کے مطابق اس مکان پر پہنچا۔ یہ مکان لب دریا واقع تھا اور پوری طرح آراستہ تھا اس کے پہنچتے ہی فوراً نکاح ہوگیا۔ نکاح کے بعد سب لوگ چلے گئے۔ مسٹر زماں بھی جلد واپس آنے کا وعدہ کرکے چلے گئے۔ جمشید اس مکان میں تنہا رہ گیا۔ اور یہ بیٹھا ہوا مسٹر زماں کا انتظار کرنے لگا

نصف گھنٹہ بعد نوکر نے آکر اطلاع دی کہ چائے تیار ہے جمشید نوکر کے ساتھ کھانے کے کمرہ میں گیا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ ایک حسین لڑکی اس کا انتظار کر رہی ہے

جمشید اس کو دیکھ کر مسحور و مبہوت ہوگیا جمشید کی اس کیفیت کو سمجھ کر وہ بولی۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ گذشتہ دو ہفتہ

سے بیمار ہیں اور بہت کمزور ہوگئے ہیں۔ میں کوشش کروں گی کہ آپ کو جلد صحت حاصل ہو۔ شائد ان دنوں آپ نے بہت زیادہ کام کیا ہے لیکن آپ خاموش کیوں ہیں"

جمشید خاموش تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ زماں صاحب کو وہ لڑکی اپنا چچا بتا رہی ہے اور گفتگو سے وہ اپنی شادی کے خلاف بھی نہیں معلوم ہوتی پھر یہ بیس ہزار کی رقم دے کر فوراً ہندوستان چھوڑنا کیا معنی اور وہ بے چین تھا کہ کسی طرح مسٹر زماں سے ملاقات ہو اور سارا حال معلوم ہو

آخر کار اُس نے ہمت کر کے کہا کہ

"مجھے آپ کے چچا سے ضروری کام ہے۔ میں ان کا انتظار کر رہا ہوں کیا آپ بتا سکتی ہیں وہ کس وقت آئیں گے"

"غالباً نصف گھنٹہ میں" جمشید گھبرا رہا تھا۔ پریشان تھا اور سخت بے چینی سے زماں صاحب کا انتظار کر رہا تھا۔ انتظار کرتے کرتے جب رات کے دس بج گئے تو وہ کہنے لگا "خاتون آپ اجازت دیں کہ میں آپ کے چچا کی تلاش میں باہر نکلوں سخت حیرت ہے کہ وہ ابھی تک نہیں آئے مجھے ان سے ایک ضروری کام ہے"

"آپ کی مرضی۔ مگر میرے خیال میں اس وقت مکان سے باہر جانا کسی طرح مناسب نہیں"

مگر جمشید نے اس مکان میں رات کو ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لئے عذر کرتا ہوا بیرسٹر صاحب کی تلاش کو نکلا۔ سڑک پر پہنچ کر وہ سوچنے لگا کہ اس وقت بیرسٹر صاحب سے ملاقات ہونا ناممکن ہے۔ ان کے مسکن کا پتہ بھی اسے معلوم نہ تھا یہ سوچ کر وہ دریا کے کنارے جا کر لیٹ رہا۔ اور صبح کو وہ پھر زماں صاحب کی جستجو میں چل کھڑا ہوا۔ تھوڑی دور چلا ہوگا کہ زماں صاحب موٹر پر آتے دکھائی دیے۔ جمشید نے ان کی موٹر روک کر کہا

"مجھے صاف صاف بتا دیجئے کہ یہ معمہ کیا ہے اور ان باتوں کی جن کا ذکر آپ نے مجھ سے قبل کیا تھا کچھ حقیقت ہے بھی یا نہیں؟"

مسٹر زماں: عزیز من۔ ذرا صبر کیجئے میں سب کچھ بتاتا ہوں"

جمشید: نہیں آپ فوراً بتا دیجئے۔ اب میں صبر نہیں کر سکتا۔

مسٹر زماں: کیا آپ کو وہ لڑکی پسند نہیں آئی؟

جمشید: برعکس اس کے میں تو اس کا بالکل گرویدہ ہوگیا ہوں اور اگر میں شادی کرنے کے لئے آزاد ہوتا تو یقیناً اس کو اپنی شریک زندگی بناتا

مسٹر زماں: (خوش ہو کر) پھر تو سب باتیں آسانی سے سلجھ گئیں۔ میں نے جو کچھ آپ سے بیان کیا تھا وہ صحیح ہے مگر تھوڑے فرق کے ساتھ۔ وہ لڑکی میری بھتیجی ہے۔ اس کے والدین عرصہ ہوا مر چکے ہیں اس کی پرورش میں نے کی اور نہایت اعلیٰ

تعلیم و تربیت دلائی۔ اس نے اسی سال بی۔ اے پاس کیا ہے۔ اس کی شادی کی فکر مجھے بہت زمانہ سے تھی اور اس کے لئے میں ایک دولتمند، شکیل، تعلیم یافتہ اور شریف شوہر کی تلاش میں تھا۔ اور آپ کی ذات میں میں نے ان سب اوصاف کو پایا۔ ایک مہینہ ہوا ایک شخص تین پچاس ہزار روپیہ بنگال بینک میں چھوڑ کر مر گیا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی اور کسی وارث کا بھی پتہ نہ تھا۔ سرکار نے اس کے وارث اور رشتہ داروں کا پتہ لگانے کا کام میرے سپرد کیا۔ بہت تلاش و جستجو کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ مرحوم بمبئی کا رہنے والا تھا اور وہاں کے مشہور تاجر فضل بھائی کا چھوٹا بھائی تھا۔ فضل بھائی کا بھی انتقال ہو چکا تھا اس لئے اس روپیہ کا وارث فضل بھائی کا لڑکا جمشید ہوا۔ مجھے بڑی کوشش اور جانفشانی کے بعد آپ کا کچھ پتہ معلوم ہوا۔ اور وہ اخبار میں نے آپ کے پاس بھیجا۔"

جمشید ان غیر متوقع باتوں کو سنکر متحیر و مبہوت ہو گیا مگر اس نے کہا

"اب میں آپ کی باتوں کا یقین نہیں کر سکتا جب تک میں خود ان کاغذوں کو نہ دیکھ لوں جن سے میرا وارث ہونا ثابت ہوتا ہے۔"

جمشید ان کاغذوں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ مسز جمشید نے آ کر کہا

"للہ آیندہ آپ اس طرح رات کو غائب نہ ہو جایا کیجئے۔"

عبدالستار

لِسَانیات کے اُصُول اوّلین

(بہ سلسلہ سابق)

چند محاورات لکھنؤ زبان اُردو کی سرپرستی جب زبان دانان لکھنؤ نے شروع کی اور زمانے نے اس سرپرستی کو تسلیم کیا تو ان لوگوں نے "دہلی" کے اہل زبان سے علیحدہ کچھ محاورات کا اضافہ کیا، ان کو روزمرہ میں داخل کیا، اور اس پر کسی نے اعتراض نہیں کیا مثلاً :-

ساوُنی گانا، اہل دہلی نہیں بولتے لیکن امیر مینائی لکھتے ہیں :- ؎

جب چمن میں آگیا مستوں کو ساون کا خیال
ساوُنی گاتی ہوئی آئی گھٹا برسات کی

اس محاورے کو اُردو میں داخل کرنے کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم نغمات میں "ساون" ایک خاص قسم کی راگنی ہوتی ہے جو ساون میں گائی جاتی ہے۔ چونکہ اطراف بنارس و بہار وغیرہ میں یہ چیز مشہور تھی اس لئے زبان نے اُس کو فوراً قبول کر لیا۔

شعر میں یہ محاورہ فصیح بھی ہے اور معنوی اعتبار سے بلیغ بھی

۲- پانا - لینا - کی جگہ - امیر لکھتے ہیں : ع

"ہاتھ ہے کوتہ، شاخ ہے اونچی پائیں گے کیونکر کوئی ثمر ہم"

۳- چکھا چاہئے :- ؎

ترکِ لذّت بھی نہیں لذّت سے کم
کچھ مزا اس کا بھی چکھا چاہئے

۴- چاٹ دینا :- ع

وہ چاٹ دوں کرے نہ مذمت شراب کی

ترک و اخذ محاورات و الفاظ الفاظ یا محاورات کا ترک کرنا یا ان کو پھر لینا اہل زبان اور زباں داں کا کام ہے۔

اہل دہلی نے جب ذیل کے الفاظ اپنے اشعار سے نکال دیے تو اہل لکھنؤ نے لے لئے مثلاً:۔

تلک - بجائے تک - امیر نے لکھا ہے :۔

اے نگاہِ یاس ہو تیرا بُرا
گھر تلک روتا ہوا قاتل گیا

ناسخ جو زبان کی صحت کے بڑے حامی تھے لکھتے ہیں :۔

دو ذرا اشک سے ہے کیوں گلے تلک پانی
ہمارا کاسۂ سر کاسۂ حباب نہیں

زور بجائے خوب، اچھی طرح، اچھا - امیر نے کہا ہے :۔

ناتوانی نے زور کام کیا
چڑھ گئے یار کی نگاہوں پر

ناسخ :۔

عابد و زاہد چلے جاتے ہیں پیتا ہے شراب
اب تو ناسخ زور گو رندِ لاابالی ہو گیا

کیجیو بجائے کرنا - آتش کا شعر ہے :۔

مجھ سے مستی میں جو ہوں شیشہ و ساغر ٹکڑے
ساقیا کیجیو میرے بھی برابر ٹکڑے

ہوجیو بجائے ہونا - ناسخ :۔

ناسخ نہ ہوجیو مگس خوانِ اغنیا
سنتا ہوں یہ سخن لبِ نان جویں سے میں

عزیزاں بجائے عزیز و اعزہ - آتش کا شعر ہے :۔

برسوں کی راہ آگے عزیزاں نکل گئے
افسوس کارواں سے میں اپنے بچھڑ گیا

حالانکہ "اعزہ"، کہہ سکتے تھے اور بحر و وزن میں فرق نہ آتا

بعض اختلافات دہلی و لکھنؤ

دہلی	لکھنؤ
دھکیلنا	ڈھکیلنا

اُڑسنا	گھڑسنا
گھرکنا	گھڑکنا
اندھیرا	اندھیارا
اُجالا	اجیالا
بوچھاڑ	بوچھار
بانسری	بانسلی
تیرنا	پیرنا
کواڑ	کواڑا
سب سے پہلے	سب کے پہلے
جمائی	جماہی

یہ الفاظ بہ ظاہر علیحدہ معلوم ہوتے ہیں لیکن دونوں کا استعمال اکثر ہوتا ہے (تسہیل البلاغۃ ص۲۴)

مفرد اور مرکب الفاظ مفرد اور مرکب الفاظ کے استعمال اور ترویج سے پہلے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اساتذۂ فن نے ان کے لئے کیا اصول مقرر کئے ہیں

قاہرہ مصر کے مشہور دارالعلوم جامعہ ازہر کے مشہور ماہر لسانیات مغرب احمد ہاشمی اپنی مستند کتاب "جواہر الادب" میں لکھتے ہیں کہ فصاحت "مفرد" کے لئے چار شرطیں ہیں:-

(۱) حروف میں تنافر نہ ہو
(۲) استعمال نیا نہ ہو
(۳) قیاس لغوی کے مخالف نہ ہو
(۴) اس کے سننے سے کراہت معلوم نہ ہو

تنافر کے معنے یہ ہیں کہ زبان آسانی سے ادا نہ کر سکے مثلاً "ہعخع"۔ "مستشزرات"

دوسری "شق" کے معنے یہ ہیں کہ اہل لغت و ماہرین زبان کے استعمال سے باہر نہ ہو، لغات اور استعمال میں اس کا وجود ہو مثلاً "تکاکاتم" عیسیٰ بن عمرو نحوی نے استعمال کیا ہے۔

تیسری شرط کا مطلب یہ ہے کہ "قانون صرف و نحو، قیاس لغت کے خلاف نہ ہو، نہ واضع کے منشا کے مخالف ہو مثلاً لفظ "اجلل"، اس کو "ادغام" کے بعد "اجل" ہونا چاہیے تھا

چوتھی شرط کا منشا یہ ہے کہ ایسے الفاظ نہ ہوں کہ کانوں کو بُرے معلوم ہوں مثلاً "نقاخ"۔

اصول مرکبات مرکب کو چھ عیبوں سے پاک ہونا چاہیے:۔

(۱) الفاظ مجتمعہ میں تنافر نہ ہو
(۲) ضعف تالیف نہ ہو
(۳) تعقید لفظی نہ ہو
(۴) تعقید معنوی نہ ہو
(۵) کثرت تکرار نہ ہو
(۶) توالی اضافات نہ ہو

مثال اوّل:۔

وقبر حرب بمکان قفر
ولیس قرب قبر حرب قبر

اسمیں قرب اور قبر کے اجتماع نے شعر کو معیوب کر دیا ہے۔

مثال دوم:۔

ضرب غلامہ زیداً
مارا اس کے غلام نے زید کو

اس میں اضمار قبل ذکر و مرجع ہے

مثال سوم:۔ متنبی کا شعر ہے:۔

جفخت وھم لایجفخون بھابھم
شیم علی الحب الاغر دلائل

اس کو ہونا چاہیے تھا "جفخت بھم شیم دلائل علی الحب الاغر الخ

مثال چہارم:۔ عباس بن احنف کا شعر ہے جس میں "سکب دموع" سے کنایہ لزوم فراق مراد لیا ہے جو بعید الفہم ہے

مثال پنجم:۔

الی ذا سطار سطر من سطر ا
لقائل یا نصر نصر نصرا

مثال ششم:۔ ابن بابک کا شعر ہے:۔

حمامتہ جرعا حومۃ الجندل اسجعی
فانت بمرأی من سعاد و مسمع

اساتذہ زبان اُردو نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) تنافر حروف کی مثال۔ آتش کا شعر ہے :- ؎

دل قصر شہنشہ ہے وہ شوخ اس میں شہنشاہ
عرصہ یہ دو عالم کا جلوخانہ ہے اس کا

(۲) تنافر کلمات۔ ناسخ کا شعر ہے :- ؎

شکل نہیں نظر پڑی آیا نہیں پیام بھی
عمر ہوئی کہ ایک سی حالت چشم و گوش ہے

(تسہیل البلاغۃ صفحہ ۱۷)

(۳) غرابت کلام۔

ایسے غیر مروج الفاظ کا لانا جو اہل زبان کے محاورہ روزمرہ کے موافق نہ ہوں۔ مثلاً :- ؎

ہو گیا تیغ سیہ تاب سے ہے سُرمہ گلو
دم نہ مارے گا ترے آگے حسود بقباق

(۴) مخالفت قیاس لغوی۔ سودا کا شعر ہے :- ؎

سودا میں اس چمن میں ہوں جوں غنچہ دل گرفت

" دل گرفت ،، بجائے دل گرفتہ استعمال کیا۔

اسی طرح اور مثالیں ہیں تفصیل کی ضرورت نہیں۔

ان تمام قیود کا صرف ایک مرکز معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ مفردات و مرکبات کو کس " زبان ،، " اہل زبان ،، " قواعد ،، وغیرہ کے تحت میں ہونا چاہئے۔ جو لفظ مفرد اور مرکب ان اصول سے باہر ہوتے ہیں وہ کبھی قابل قبول نہیں ہوتے نہ عوام کے نزدیک اور نہ خواص کے۔

وضع اصطلاحات مولوی سید وحید الدین سلیم مرحوم نے اس موضوع پر اپنی کتاب وضع اصطلاحات میں مُفید بحث کی ہے۔

وضع اصطلاحات دو قسموں پر منقسم ہے۔

(۱) وضع اصطلاح مفرد۔

(۲) اصطلاح مرکب۔

اصطلاح مفرد کے متعلق حسب ذیل اصول مقرر کئے ہیں:-

(۱) ان تمام زبانوں سے الفاظ لئے جا سکتے ہیں جو ہماری زبان (اردو) میں بطور قدرتی عنصر کے شامل ہیں۔ انگریزی کے صرف
وہ الفاظ لئے جانے چاہئیں جو اردو میں بہت زیادہ رائج اور مشہور ہیں مثلاً گیس، مشین، کونین، انجن وغیرہ۔

(۲) وہ الفاظ لینے چاہئیں جو مستعمل اور رائج ہیں۔ وہ الفاظ بھی لئے جا سکتے ہیں جو رائج نہیں لیکن ترکی اور انگریزی زبانوں
کے الفاظ نہ لینے چاہئیں جو مستعمل نہیں

(۳) ہر مفرد اصطلاح کے وضع کرنے کے وقت حتی الامکان کوشش کرنی چاہیئے کہ اصطلاحی معنے کا نمایاں اور ممتاز حصہ اصطلاحی
لفظ سے ظاہر ہو

(۴) حتی الامکان عنصری زبانوں کے مشہور اور رائج الفاظ سے وضع اصطلاحات میں کام لیا جائے، ہمیں ضروری ہے کہ ہم
موجودہ الفاظ کو نئے نئے معنے پہنائیں

(۵) عربی زبان کی قدیم مفرد اصطلاحیں قائم رکھنی چاہیئے (ان میں معرب الفاظ بھی شامل ہیں) کیونکہ اس زبان میں مفرد الفاظ
کثرت سے ہیں

(۶) مفرد اصطلاحیں عربی کے ان رائج اور مستعمل الفاظ سے بنا سکتے ہیں جو ہماری زبان میں موجود ہیں اور ان کو بھی کام میں
لا سکتے ہیں جو اب تک رائج نہیں

(۷) انگریزی الفاظ بھی منتقل کئے جا سکتے ہیں

(۸) سائنس کی ان اشیا کے علاوہ اور تمام علوم اور اشیا کے لئے مفرد الفاظ وضع کئے جا سکتے ہیں

(۹) انگریزی الفاظ اور اصطلاح اُردو زبان کے اصول کے مطابق ڈھالنا چاہیئے

(۱۰) انگریزی کا کوئی لفظ اگر غلط رائج ہے تو اپنی زبان میں لیتے وقت تصحیح کر لینا چاہیئے

(۱۱) اگر ایک علم کی کسی انگریزی اصطلاح کے مقابل کوئی ایسی اصطلاح تجویز کی جائے جو پہلے سے کسی اور علم میں مستعمل ہو تو
اس کا کوئی مضائقہ نہیں

(۱۲) اگر انگریزی میں کوئی اصطلاح مشترک ہو اور مختلف علوم میں اس کے معنے جداگانہ لئے گئے ہوں تو اُردو میں ایسا لفظ تلاش
کرنا چاہیئے جو انگریزی لفظ کی طرح کئی معنوں کے لئے کافی اور کئی علوم میں مشترک ہو سکے، ایسا نہ ہو سکے تو ہر اصطلاح کے لئے
نیا لفظ لینا چاہیئے

(۱۳) جہاں تک ممکن ہو انگریزی مفرد کے لئے اُردو مفرد اصطلاح مقرر کرنا چاہیئے یہ نہ ہو سکے تو مرکب اصطلاح سہی۔

(۱۴) ہماری نئی اصطلاحیں عنصری زبانوں سے بے تکلف ماخوذ ہونی چاہیئے

(۵) جو اصطلاح ہم اصول مذکورۂ بالا پر حتی الوسع عمل کر کے وضع کریں اگر وہ اصطلاح اور اس کے مقابل کی انگریزی اصطلاح دونوں یکساں طور پر مبہم ہوں تو اپنی اصطلاح پر انگریزی اصطلاح کو ترجیح دینی چاہئے بلکہ اس کو ترک کر کے اپنی اصطلاح قائم کرنی چاہئے۔

(۱۹) عام طور پر انگریزی مفرد اصطلاحات کا لفظی ترجمہ کافی ہو سکتا ہے بعض جگہوں پر اس کو چھوڑ کر دوسرے طریقے اختیار کرنے پڑینگے (تفصیل کے لئے دیکھئے وضع اصطلاحات ص ۱۱۵)

وضع اصطلاحات مرکب | مفرد اصطلاحوں کے بیان کے بعد مرکب اصطلاحوں کا بیان بھی ضروری معلوم ہوتا ہے مرکب اصطلاحوں کی وضع کرنے کے حسب ذیل خاص خاص اصول ہیں

(۱) اگر مرکب کے دونوں اجزا ہندی ہوں یا دونوں فارسی ہوں، ایک فارسی اور ایک ہندی اور ان میں حرف علت ہوں تو دونوں جزوں میں سے یا ایک جزو سے حرف علت گرا دینا چاہئے، تاکہ مرکب مختصر ہو جائے۔

(۲) اگر مرکب کے پہلے جزو کا آخری حرف اور دوسرے کا پہلا حرف ایک ہو تو ان میں سے ایک کو حذف کر دینا چاہئے کس کو حذف کرنا چاہئے۔ اس کو بھی مرکز" اور اہل مرکز ہی طے کر سکتے ہیں ورنہ اشتراک قائم نہیں رہ سکتا

(۳) اگر مرکب کے پہلے جزو کا آخری حرف اور دوسرے کا پہلا قریب المخرج ہو تو ان میں سے ایک حذف کر دینا چاہیے

(۴) اگر ہائے مختفی مرکب کے کسی جزو کے آخر میں ہو تو اس کو گرا دینا چاہئے

(۵) ہندی کے ایسے الفاظ جن کے آخر میں نون غنہ ہو اور اس سے پہلے کوئی حرف علت ساکن ہو تو حرف علت کے ساتھ نون غنہ کو بھی گرا دینا چاہئے مثلاً چھینک سے چھک۔

معلوم نہیں وضع اصطلاحات کے مؤلف نے چھینک میں کیا قباحت دیکھی حالانکہ تمام اساتذہ اور زبان دانوں نے اس کو بحالہ رکھا ہے۔

(۶) فارسی زبان کے ایسے الفاظ جو مرکب کے شروع میں آئیں اور جن کے آخر میں دو حرف صحیح ساکن ہوں ضرورت کے وقت آخری حرف کا گرا دینا جائز ہوگا۔ (معلوم نہیں اس اصول کی کیا ضرورت تھی؟)

(۷) فارسی زبان کے ایسے الفاظ جن کے آخر میں حرف صحیح ہو اور اس سے پہلے حرف علت ہو، اگر کسی مرکب میں بطور ابتدائی اجزا کے آئیں تو ان کا آخری حرف گر جائے گا۔ (یہ بھی بے ضرورت ہے)

(۸) جن الفاظ کے شروع میں الف ممدودہ ہو وہ لاحقہ یا شیم لاحقہ بنانے کے لئے سب سے بہتر ہوتے ہیں۔ (تفصیل کے لئے اصل کتاب دیکھئے) ان اصولوں کو پیش نظر رکھنے کے بعد یہ ضروری ہے کہ نادرات عام طور پر رائج نہ کئے جائیں بلکہ ایک مرکز ہو جو ان اصول کے تحت میں الفاظ بنائے ورنہ ہر شخص اس کے تحت میں الفاظ گڑھیگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک گھر کے مختلف اور متعدد افراد میں، ایک گاؤں کے باشندوں میں باہم اختلاف زبان ہو جائے گا، تمام ملک میں مشترک زبان کا ہونا

برسی = ایک رسم ہے جو کسی کے مرنے کے سال بھر بعد ادا کی جاتی ہے
چھماہی = فاتحہ اور کھانا جو کسی کے مرنے کے چھ مہینے کے بعد ہوتا ہے (اس کے علاوہ یہ لفظ اور کسی معنے میں مستعمل نہیں)
تیجا = فاتحہ سوم
چھٹی = بچہ پیدا ہونے کے چھ روز بعد زچہ کے نہانے کی رسم
چہلم = وہ رسم جو کسی کے مرنے کے سوا مہینے کے بعد ادا کی جاتی ہے
چلّا = زچہ کے چالیسویں دن کا نہانا

جو الفاظ مہینے سے مرکب ہیں | مہینا چڑھنا = کسی کے ذمہ ایک مہینے کی تنخواہ ہو جانا۔ مہینا وار = ماہ بماہ تنخواہ پانے والا ملازم یہ تمام لغات سماعی ہیں اور کتب لغت میں موجود ہیں

تیسری صورت یہ ہے کہ عوام نے قبول کر لیا ہو۔ ان اصولوں سے لفظ "ہندستان" اور "ماہی" کو جانچئے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ

(۱) نہ تو اہل زبان نے رائج کیا
(۲) نہ کسی اصول اور قیاس کے تحت میں ہیں
(۳) نہ عوام نے پسند کیا ہے اور نہ ملک کا اس پر اتفاق ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ یہ دونوں لفظ قابل قبول ہوں

ہم ان دونوں لفظوں پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ عرض کرنا چاہتے ہیں:-

ہندستان۔ ہندستانی | اس لفظ کی صحت کو سب سے پہلے لغت سے جانچنا چاہئے:-

(۱) بہار عجم کا مؤلف لکھتا ہے:-

"ھند" بالکسر ہندوبار، ہندوزار، ہندوستان، دیار معروف "ہندستان" اغلب کہ دراصل ہنداستھان بود بہمزہ و فوقانی مخلوط الہا آنکہ در ہندی اصل بمعنی مکانست" (بہار عجم ج ۲ ص ۴۹۷ م نولکشور لکھنؤ)

برہان قاطع میں یہ تحقیق موجود ہے:-

"ہندستان" مخفف "ہندستان" و ہندستان مخفف ہندوستانست "ہندو" بمعنی "ہندوستان" باشد

لفظ ہندو کے ساتھ حسب ذیل مرکبات بنتے ہیں:-

ہندوے اژدہا = کنایہ از شمشیر
ہندوے باریک بیں = " " زحل
ہندوے پیر = " " "
ہندوے [illegible] = " " "
ہندوے سپہر = " " "

ہندی معروفست کہ ہندوستانی باشد، کنایہ از تیغ ہندی ہم است (برہان قاطع ج ۴ ص ۲۳۲)

فرہنگ آصفیہ میں اس طرح ہے:-

ہندوستان۔ ملک ہند، آریہ ورت۔ بھارت کھنڈ۔

ہندوستانی: ہند کا باشندہ

ہندی = ہندوستانی، ہندوستان کی وہ زبان جو سنسکرت سے نکلی ہے۔ پراکرت۔ ہندوستان کی چیز (ج ۴ ص ۲۳۳)

بھارت = ہندوستان۔ ملک (نور اللغات ج ۱ ص ۶۶۲)

ہندوستان۔ India انڈیا۔ ہندوستانی۔ انڈین

ہندوستانی: Relating to India (ڈنکن فوربس ص ۲۰۰، ۲۷۰)

ہندوستان: place ستان — Indian ہندو

(جان شکسپیر ص ۱۸۷۵)

ہندوستانی: A native of India (جی۔ ٹی پلیٹس)

لغات پر نظر بہار عجم کا مؤلف ہند کی تشریح لفظ ہندوستان سے کرتا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہی لفظ عام و خاص رائج ہے۔

"ہندستان" کے متعلق کہتا ہے کہ اغلباً یہ لفظ اصل میں ہنداستھان تھا لفظ "اغلباً" بتاتا ہے کہ اس پر اس کو وثوق کامل نہیں۔ برہان قاطع کا مؤلف بھی الفاظ تشریح میں ہندوستان ہی لکھتا ہے پھر کہتا ہے کہ "ہندسان" ہندوستان کا مخفف ہے۔ اور ہندستان ہندوستان کا، یعنے ہندستان اصلی حالت میں نہیں بلکہ ہندوستان کی بگڑی ہوئی حالت کا نام ہے، اس لئے دعوئی صحت ہندستان کو اس سے فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔

اگر تخفیف دلیل صحت ٹھہرے تو بجائے "ہندستان" "ہندسان" ہونا چاہئے کیونکہ یہ اور زیادہ مخفف ہے۔

بُرہان قاطع نے "ہندو" کے معنے بھی "ہندوستان" لکھے ہیں اس لئے "ہندستان" کی جگہ "ہندو" کیوں نہ استعمال کیا جائے؟

اس لغت میں لفظ "ہندو" کے ساتھ جو مرکبات دئے گئے ہیں ان سے یہ متحقق ہوتا ہے کہ جس طرح اور مرکبات درست ہیں اسی قیاس پر "ہندوستان" بہ جائے ہندو صحیح اور درست ہے، جیساکہ "بہار عجم" نے بھی اس کی تائید کی ہے یعنے ہندو بلد ہندو بازار۔ ہندوستان۔

ستان۔ زار۔ بار الفاظ ظرف ہیں۔ مثلاً زنگبار۔ گلزار۔ گلستاں وغیرہ۔

فرہنگ آصفیہ میں بھی ہندوستان کی تشریح ملک ہند۔ اور ہندی کی ہندوستانی موجود ہے

فرہنگ آنند راج میں "ہندستان" کی تشریح میں لفظ "ہندوستان" استعمال کیا گیا ہے

"نور اللغات" میں بھارت کے معنے ہندوستان ہیں نہ کہ ہندستان۔

"فوربس" نے ہندوستان اور ہندوستانی ہی لکھا ہے۔

"شکسپیر" نے بھی اس کو "ہندو" اور "ستان" سے مرکب تسلیم کیا ہے۔

"پلیٹس" نے بھی ساکن ہندوستان کو ہندوستانی کہا ہے "ہندستانی" نہیں کہا ہے

اگر یہ کہا جائے کہ اس کو "عربستان" اور "فرنگستان" پر قیاس کرنا چاہیئے سو اس کا جواب یہ ہے کہ "عرب" کے معنے قوم عرب کے بھی ہیں، اس لئے عربستان کہنا درست ہے، فرنگستان کی دوسری صورت ہے۔ اس اصول پر ہند کو "ہندو" کے معنے میں لینا پڑے گا۔ حالانکہ یہ محتاج ثبوت ہے

دوسری غلطی یہ ہے کہ "عربستان" اور "فرنگستان" میں عربی اور فرنگی کی "ی" کی وجہ سے "ستان" کی "سین" مکسور معلوم ہوتی ہے۔ اور دونوں جگہ یائے نسبت محذوف ہے، اگر یہ اصول مانا جائے کہ ہند سے "ہندستان" ہوا ہے تو "استھان" کی وجہ سے "ہندستان" بفتح دال ہونا چاہیئے

اگر "ہندی" سے ہندستان ہوگا تو کسرۂ دال سے ہندستان ہونا چاہیئے۔

ملک "ہند" سے "ہندستان" ہو نہیں سکتا کیونکہ اس میں مفہوم ظرف موجود ہے پھر علامت ظرف "ستان" کا اضافہ کیا؟

"ہندستان" بضم دال پر یہ قیاسات صحیح نہیں اترتے

تخفیف | اگر تخفیف کی صورت ہر حال میں درست ہو تو نثر میں ماہ کی جگہ "مہ"، گاہ کی جگہ "گہ"، کوہ کی جگہ "کہ"، خورشید کی جگہ "خور"، عام طور پر رائج ہونا چاہیئے حالانکہ ایسا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ "مخففات" کی خاص صورتیں ہوتی ہیں۔ بیشتر ضروریات شعر کی وجہ سے جائز ہوتے ہیں لیکن نثر نگار اصلی صورت میں لکھتے ہیں۔

جہاں کوئی مجبوری نہیں ہوتی وہاں اساتذہ "ہندوستان" لکھتے ہیں مثلاً میر تقی میر کا شعر ہے :۔ ؎

ولیکن تجاوز نہ ہووے ادب سے | کہ ممدوح اب شاہ ہندوستاں ہے

(کلیات میر دیوان اول ص۱۱)

سودا نے لکھا ہے :۔ ؎

مانگے جو زیرے کا دانہ پائے وہ کرناٹک کا ملک | چاہے جو طوطی کا پر اسکو ملے ہندستاں

(کلیات سودا ص۸۸)

ان کے علاوہ داغ۔ امیر۔ جلال۔ مصحفی۔ انشا۔ حالی۔ اقبال۔ غالب۔ اکبر اور دوسرے اساتذہ نے "ہندوستان" لکھا ہے۔ آر۔ پی۔ ڈیوہرسٹ مشہور فاضل مشرقیات اپنے استاد مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کو ایک نظم کے سلسلے میں ایک خط کے ذریعہ سے یہ

شعر لکھتے ہیں:۔ ؎

مرحبا اے بلبل ہندوستاں مرحبا اے طوطیٔ شیریں زباں

مولانائے موصوف علیہ الرحمۃ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔ ؎

جس سے ہندوستاں کو رونق ہے بلکہ سارے جہاں کو رونق ہے

ایک جگہ لکھتے ہیں:۔ ؎

کشورِ ہندوستاں شاہِ جہاں دلکشوربا

ضروریاتِ شعر ایسے شعرا بھی ہیں جنہوں نے "ہندستان" ضرورتِ شعری کی وجہ سے لکھا ہے لیکن وہ سند میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

اکثر الفاظ ایسے ملیں گے کہ شعر میں ان کا استعمال جائز ہے لیکن "نثر" میں درست نہیں مثلاً شیخ سعدی نے گلستاں میں لکھا ہے:۔ اذا یئس الانسان طال لسانہ کسنور مغلوب یصول علی الکلب

ضرورتِ شعری سے "سنور" کی تنوین گر گئی لیکن نثر میں "کسنورٍ مغلوبٍ" لکھا جائے گا۔

ابن رشیق قیروانی اور دوسرے اساتذۂ فن نے اس کا ایک علیحدہ باب قائم کر کے دکھایا ہے کہ:۔

ما یجوز للشاعر لا یجوز لغیرہ

جو شاعر کے لئے جائز ہے وہ غیر شاعر کے لئے نہیں۔

اُردو کے علاوہ فارسی اور ہندی، انگریزی میں بھی ایسے الفاظ ہیں جو نظم میں جائز لیکن نثر میں ان کا استعمال نادرست ہے۔

نثر اور ہندوستان دعوے صحتِ "ہندستان" اس وقت درست ہو سکتا ہے جب یہ ثابت کیا جائے کہ اساتذہ نے "نثر" میں "ہندستان" لکھا ہو، کسی ضرورت یا مجبوری کا نتیجہ اصولاً سند نہیں ہو سکتا۔

اُردو کے تمام مسلم الثبوت ادیبوں، انشا پردازوں نے اپنے تمام کتابوں میں "ہندوستان" ہی لکھا ہے مثلاً آزاد لکھتے ہیں:

(۱) "برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ ہی آئی ہو" (آبحیات)

(۲) شبلی فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان کے پیغمبر افسانوں کے حجاب میں گم ہیں" (سیرت النبی ج ۱ ص۳)

(۳) "انشاء اللہ ہندوستان پھر پہنچ کر تجویز کروں گا" (خطوط سرسید ص۱۰۶)

(۴) غالب نے لکھا ہے:۔

"ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں" (اُردوے معلیٰ ص۱۵۲)

ان کے علاوہ، ڈپٹی نذیر احمد۔ مولانا ذکاء اللہ۔ شرر۔ سرشار۔ سجاد حسین نے کہیں "ہندستان" نہیں لکھا ہے

تماہی دوسرا لفظ "تماہی" اس سے زیادہ قابل اعتراض ہے، اس کی تفصیل اور تشریح یہ ہے:۔

یہ لفظ۔ اُردو (تین) اور فارسی (ماہی) سے مرکب ہے اگر "سہ" اس لئے ترک کیا گیا کہ فارسی ہے تو "ماہی" کے برقرار رکھنے کا کیا اصول ہے؟

اساتذۂ اُردو نے "سہ ماہی" "سہ ماہہ" استعمال کیا ہے "تماہی" اُردو میں پہلا لفظ ہے جو بہ تبعیت سیّد وحید الدین سلیم لکھا گیا ہے۔ حالانکہ سید صاحب نے "تماہہ" لکھا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ غالب نے چھ ماہی لکھا ہے لہٰذا اس قیاس پر "تماہی" درست ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ چھ ماہی میں لفظ چھ "اصلی صورت میں ہے ورنہ اس کو "چماہی" یا اور کچھ ہونا چاہیے تھا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ "غالب" نے جہاں استعمال کیا ہے اس خصوصیت کو مدنظر رکھ کر جس کے لئے یہ لفظ بولا گیا ہے۔

یہ لفظ صرف مُردوں کے لئے بولا جاتا ہے غالب نے اس کو ظاہر بھی کر دیا ہے، اس کے علاوہ اور کوئی معنے نہ تو لغت میں ملتے ہیں اور نہ کلام اساتذہ میں

غالب نے کہا ہے:۔ ؎

(طنزیہ)

رسم ہے مُردے کی چھ ماہی ایک　　خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھکو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات　　اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

پہلے شعر میں غالب نے کہا ہے کہ "چھ ماہی مُردے کی رسم ہے تمام دنیا کا دستور ہے کہ مردے کی چھ ماہی کرتی ہے۔

دوسرے شعر میں کہا ہے کہ:۔

لیکن میری نوعیت دنیا سے نرالی ہے یعنے ہر چھٹے مہینے جو تنخواہ ملتی ہے گویا جیتے جی میری "چھ ماہی" ہوتی ہے۔ اس نظم کی نوعیت احتجاج کی ہے، احتجاج میں شکوہ بھی ہوتا ہے، طنز بھی، تقدیر کا گلہ بھی ہوتا ہے، نصیبوں کو بُرا کہا جاتا ہے، کہیں تہذیب اور خودداری سے باہر ہو جانا پڑتا ہے، کہیں خوشامد، کہیں غصّہ غرضکہ اس قسم کے اکثر جذبات ہوتے ہیں، چنانچہ غالب نے آگے چل کر لکھا ہے:۔

(غصّہ)　دن کی دھوپ اور رات کی گرمی　　بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

غیرت دلانے کا انداز دیکھئے:۔ ؎

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا　　آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

غرضکہ یہ خاص مواقع ہیں ان سے تعمیم کا فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ سودا نے گھوڑے کی ہجو میں ایسے ایسے شعر کہے ہیں کہ متانت اور ادبی تہذیب منہ چھپاتی ہے۔ لیکن فن کے اعتبار سے وہ نادرست نہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر کسی کے گھوڑے

کی تعریف کی جائے تو لکھا جائے گا :-

گھوڑی کو دیکھتا ہے تو ...... بار بار

میر حسن نے لکھنؤ کی ہجو میں ، اور میر نے کوتوال کی ہجو میں جو کچھ لکھا ہے اس کا بھی خاص موقع ہے -
"اکبر" نے ایک جگہ "بیگم کی نوج" کہا ہے اس کا بھی وہی موقع ہے جہاں وہ اٹھو چلے ہیں -
جان صاحب اور رنگین نے جو محاورے استعمال کئے ہیں وہ بھی خاص ہیں اور خاص موقع کے لئے کہ ان کی تعمیم جائز نہیں -

نتیجہ | اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ "ہندوستان" اور "تماہی" پر جتنے اصول پیش کئے گئے ہیں کسی ایک کے اعتبار سے بھی درست نہیں بلکہ "ہندستان" بجائے "ہندوستان" اور "تماہی" بجائے "سہ ماہی" میں نقص ترکیب اور ضعف تالیف ہے

جب یہ طے ہو چکا کہ "سماعی" الفاظ کے لئے اصول اور قیاس درست نہیں اور شخص واحد یا اشخاص محدودہ کسی زبان میں اضافہ نہیں کر سکتے تو ان لفظوں کا اضافہ کیا معنے رکھتا ہے - کتب لغت اور اقوال اساتذہ میں بھی ان کا درست ہونا یا وجود متحقق نہیں -

اہل ملک نے بھی پسند نہیں کیا بلکہ ہر طرف سے اعتراضات کئے جا رہے ہیں ، موافقین نے جو کچھ لکھا ہے وہ مجموعی طور پر بھی قابل اعتنا نہیں ، نہ ان کا منشا معترضین کو خاموش کرنا ہے -

لفظ "تماہی" ، "سہ ماہی" کی جگہ ترکیب کی غیر موزونی اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ "سہ ماہی" میں لفظ سہ اور ماہی دونوں فارسی ہیں اور "تماہی" میں اردو لفظ تین کی بگڑی ہوئی شکل اور فارسی کا ایک ٹکڑا ہے ، اصولیوں کے نزدیک خلوص ہمیشہ "خلط" اور "امتزاج" سے بہتر ہوتا ہے -

اگر یہ کہا جائے کہ ایک شخص کے نزدیک یہ لفظ بہتر ہے اور یہ اس کی ذاتی رائے ہے دوسرا شخص اپنی ذاتی رائے کے اعتبار سے "تر ماہی" کہتا ہے ، تیسرا "دو ماہی تر" بولتا ہے ایسی صورت میں کیا بہتر ہوگی جو ان اختلافات کو دور کر کے کوئی راہ مشترک پیدا کرے ؟
یہ سمجھنا چاہیے کہ "زبان" ، قوم اور سیاست کی جد و جہد کا محور ہوتی ہے بلکہ قومیت کی زندگی کا مدار "زبان" پر ہے - آج یورپ نے یہ راز "اسلام" کے سمجھنے کے سیکڑوں برس بعد سمجھا ہے اس لئے اس کی سب سے زیادہ توجہ "زبان" کی طرف ہے
"ہندوستان" اگر زندہ رہنا چاہتا ہے تو اس کو بھی اپنی "زبان" کی حفاظت میں ہر قسم کے ایثار اور جسارت کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے -

اگر یہ مضمون مفید ہو تو اس عمل اور کوشش کے لئے حضرت نیاز کا ممنون ہونا چاہیے کہ اس موضوع پر انھوں نے سب سے پہلے فاتحانہ قلم اٹھایا ہے - ہمارا مضمون تو تقلیدی اور نقش ثانی ہے -

"محقق" اعظمی

قوّتِ و شجاعت کا دیوتا اور جامِ زہر

یعنی

ہنی بال کا افسانۂ عروج و زوال

(۱)

مسیح سے ۲۳۸ سنہ قبل کا زمانہ ہے۔ شہر قرطاجنہ میں بعل ملوخ کے مندر میں قربانگاہ کے سامنے مشہور سپہ سالار حملکار برقہ کھڑا ہوا ہے۔ اور اس جنگی تاخت کی کامیابی کے لئے دیوتا پر بھینٹ چڑھا رہا ہے جو وہ ملک ہسپانیہ پر کرنے والا ہے۔ افسران فوج چاروں طرف سے احاطہ کئے ہوئے ہیں اور قریب ہی ایک کمسن لڑکا کھڑا ہوا ہے جس کی شباہت صاف کہے دیتی ہے کہ سپہ سالار سے اس کا کیا رشتہ ہو سکتا ہے۔ اس نوعمر لڑکے کا نام ہنی بال ہے۔ یعنی "خداوند بعل کا عطیہ"، اوّل اوّل جب رومیوں نے اہل صقلیہ سے جنگ کی تھی، ہنی بال پیدا ہوا تھا یہی وہ زمانہ تھا جبکہ جنرل حملکار نے رومیوں کے خلاف نہایت شجاعت کے ساتھ چھ برس تک لگاتار جنگیں کی تھیں تاکہ رومیوں کو جزیرہ صقلیہ میں نہ آنے دے۔ لیکن قرطاجنہ کی طرف سے عین وقت پر مدد نہ مل سکنے سے جنرل مذکور کی تمام کوششیں خاک میں مل گئی تھیں۔ کمسن ہنی بال کا ننھا سا دل فخر و ناز اور شرم و حیا دونوں قسم کے جذبات کا ایک معمورہ تھا۔ باپ کی بہادری اور شجاعت کے حالات سنکر جس نے نوک سناں لاکھوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اس کا دل فخر و ناز سے بھر جاتا تھا۔ اور جب اس کو اپنی قوم کی شکست کا خیال آتا تھا تو شرم کے مارے وہ سرنگوں ہو جاتا تھا۔ قرطاجنہ جو کسی وقت اپنی بحری قوت کے لحاظ سے ممتاز تھا اب ہمیشہ کے نکبت و ادبار کے قعرِ مذلت میں گر پڑا تھا۔

جب بعل ملوخ دیوتا کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھانے کی تمام رسمیں پوری ہو چکیں تو حملکار اعظم نے اپنے نوعمر بیٹے کو اشارہ سے بلایا۔ اور ایک طرف لیجا کر جہاں دوسرا کوئی شخص ان کی بات نہ سن سکتا تھا۔ اس نے دریافت کیا کہ کیا وہ بھی اس کے ساتھ ہسپانیہ کی جنگی مہم پر جانا چاہتا

ہے ۔ ہینی بال نے کہا "ہاں" اس کا باپ اس کا ہاتھ پکڑ کر دیوتا کی قربانگاہ پر لے گیا اور اس کو حکم دیا کہ وہ قربانی پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائے کہ جب تک زندہ رہے گا اسوقت تک روم کی دشمنی سے باز نہ آئیگا۔ جب ہینی بال نے قربانی کے خون سے قشقہ اپنی پیشانی پر لگا کر حلف لیا کہ جب تک وہ زندہ رہیگا۔ روم کا دشمن رہیگا۔ تو باپ نے فرط محبت میں سینہ سے لپٹا لیا۔ اور اس طرح ایک "خونین حلف" نے دونوں کا "خونین رشتہ" اور بھی زیادہ مضبوط کر دیا۔ اب دونوں نے اس مہم پر جانے کی تیاریاں شروع کر دیں جہاں سے باپ کو اپنے وطن واپس آنا کبھی نصیب نہ ہوا۔ اور بیٹا بھی آیا تو چھتیس برس بعد گویا وہ خونین حلف اور قربانی کے خون کا چھوٹا سا قشقہ ایک پیشین گوئی تھی اس بات کی کہ ۳۶ برس کے عرصہ میں لاکھوں آدمیوں کا گرم خون پانی کی طرح بہے گا۔

(۲)

گزشتہ واقعہ کو بیس برس گذر چکے ہیں۔ ملک اطالیہ کے شمالی کوہستان کے دامن میں ایک عظیم الشان فوج کا اجتماع ہو رہا ہے جنکے چہرے مسلسل فاقہ کشی اور لگاتار محنت کی وجہ سے اتر گئے ہیں۔ جنکی آنکھیں اندر دھنس گئی ہیں اور جن میں سے ہر ایک کی صورت پر خستگی و درماندگی برس رہی ہے اس فوج میں مختلف اقوام وملل کے جوان شامل ہیں۔ پیدل فوج ہسپانوی اور افریقی جوانوں پر مشتمل ہے سواروں میں بربر اور صحرا نشین بدوی داخل ہیں۔ ان میں جزائر بلیاری کے فلاخن انداز بھی ہیں۔ اور فرانس کے تیر انداز بھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت روم کی دشمن کتنی قومیں ہیں جو اس کو تباہ و برباد کرنے چلی ہیں۔

جب یہ فوج اطالیہ کے میدانوں میں اتری تو اس وقت اس کی تعداد بیس ہزار پیدل اور چھ ہزار سوار تھی۔ گویا یہ مٹھی بھر فوج اس قوم پر حملہ کرنے آئی تھی جو خود اپنی زمین پر لڑتی تھی۔ اور جس کی تعداد بھی اس وقت ڈھائی لاکھ مسلح جوانوں اور ساڑھے سات لاکھ ریلف پر مشتمل تھی۔

اگر مادی لحاظ سے دیکھا جائے تو اس وقت رومیوں کا پلہ ہر طرح بھاری تھا لیکن باوجود اس کے بھی اہل روم یہ خبر سنکر خائف تھے وہ ایسا محسوس کر رہے تھے۔ گویا بعل ملوخ پہاڑوں پر اتر آیا ہے اور اس کا خوفناک سایہ اطالیہ کی زرخیز میدانوں پر پڑ رہا ہے۔

(۳)

ان واقعات کو دو سال گذر چکے ہیں۔ معرکہ کنائی شام ہے۔ شمشیر انتقام علم ہے۔ اور دشمن دست و پابستہ سامنے پڑا ہوا ہے۔ صرف تلوار کی جنبش کی دیر ہے اور دشمن کا خاتمہ ہوا جاتا ہے۔ مگر نہیں! تلوار میں جنبش پیدا نہیں ہوتی۔ کیوں؟ یہی وہ تاریخی معمہ ہے جس نے مورخوں کو آج تک پریشان رکھا۔

جب سے ہینی بال اطالیہ میں داخل ہوا ہے وہ رومی فوجوں کو تین زبردست جنگوں میں شکست دے چکا ہے۔ پہلی جنگ ٹریبیا ([illegible]) میں ہوئی۔ جہاں اس نے شدت کی سردی میں صبح کے وقت دشمن کو ناشتہ کئے بغیر لڑنے پر مجبور کیا۔ اور شکست دی۔ دوسری جنگ ۲۱۷ء قبل مسیح فصل بہار میں جھیل ٹراسیمنس کے کنارے پر ہوئی۔ یہاں بھی ہینی بال نے نہایت جرأت و ہوشیاری سے کام لیا۔ اور ہینی بال کی فوج صبح کے کہر میں پہاڑیوں سے نکل کر دشمن پر بیخبری میں آپڑی اور راہ فرار بند کر کے دشمن کو تہ تیغ رکھکر [illegible]

اب روما کا راستہ صاف تھا - صرف سو میل کا فاصلہ طے کرنا باقی رہ گیا تھا - اور مزاحمت کے لئے اہل روما کے پاس کوئی باقاعدہ فوج بھی نہیں رہی تھی - مگر بجائے اس کے وہ روما کی طرف کوچ کرے - ہینی بال نے اپنی فوجوں کا رخ مشرق کی طرف سواحل بحیرۂ ایڈریاٹیق کی طرف پھیر دیا - اور تمام وسیع ملک کو تاخت و تاراج کر ڈالا - اس نے روما کا رخ کیوں نہیں کیا، اس کے جو اسباب بھی ہوں - لیکن یہ یقین ہے کہ ہینی بال اس طرح روما کے حلیفوں کو اپنے قابو میں لانا چاہتا تھا - ہر چند اس واقعہ کے بعد رومیوں کو دم لینے کا کسی قدر موقعہ مل گیا تھا - اور ان کے خلاف سخت پروپاگنڈہ میں مصروف تھا - لیکن وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ملوخ بت کے منھ سے شعلہ ہائے آتشیں نکل کر ان کے پہلوں کو جھلسائے دیتے ہیں - اس لئے اب انھوں نے فابیس نامی ایک شخص کو اپنا فرمانفرما مقرر کیا جس نے وہ مشہور جنگی چال اختیار کی جو اس کے نام سے اب تک منسوب چلی آتی ہے - یعنی اس نے یہ کوشش کی کہ بالمواجہ جنگ کرنے سے محترز رہکر دشمن کو کمزور کرے -

لیکن جب فابیس کی مدت ششماہہ گذر گئی تو رومیوں نے دیکھا کہ ہینی بال کی فوج نے ان کے حلفاء کا تمام علاقہ تباہ و برباد کر دیا ہے - اس لئے وہ سامنے ہو کر لڑنے پر مجبور ہوئے - اور مقام کنّا کے میدان جنگ میں انھوں نے اپنی عظیم ترین سپاہ کا اجتماع کیا - مگر ہینی بال نے اپنی جنگی قابلیت سے کام لے کر سب کو گھاس کی طرح کاٹ کر پھینک دیا -

------ رومیوں کی فوج کا قتل عام کرنے کے بعد اسی روز شام کو افریقی رسالوں کے کماندار مہر بال نے ہینی بال سے کہا :-

"مجھے روما پر دھاوا کرنے دیجئے - اور آپ پیچھے پیچھے چلے آئیے - اگر خداوند بعل ملوخ کو منظور ہوا تو آج سے پانچویں دن پایۂ تخت میں جشن فتح منعقد ہوگا"

اس پر ہینی بال نے کہا کہ ابھی اس معاملہ پر غور و خوض کرنے کے لئے وقت کی ضرورت ہے - یہ سنکر مہر بال بگڑ گیا اور اس نے طنزاً کہا کہ :-

"ہینی بال تم فتح حاصل کرنا تو خوب جانتے ہو - لیکن فتح سے فائدہ اُٹھانا قطعی نہیں جانتے - "

ممکن ہے کہ مہر بال کا قول غلط ہو - لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ ہینی بال نے اپنی اس عظیم الشان فتح سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا - یقیناً ہینی بال کے اس تساہل کا کوئی زیادہ گہرا سبب ہے - اس تمام جنگ و جدال اور کشت و خون سے ہینی بال کا اصلی مقصد کیا تھا؟ انتقام! اور صرف انتقام - یہ ایک سامی النسل قوم کا انتقام تھا -

قدیم زمانہ کے نیم وحشی لوگوں کی عادت تھی کہ جب وہ کسی دشمن سے انتقام لیتے تھے تو وہ اس کو جلد قتل نہیں کرتے تھے - بلکہ آہستہ آہستہ عذاب دے کر اس کی جان لیا کرتے تھے - تاکہ جسقدر دشمن کو زیادہ تکلیف ہو - اسی قدر انتقام میں لطف آئے - دشمن سے نہ صرف بدلا لیا جاتا تھا بلکہ اسے محسوس کرایا جاتا تھا کہ بدلا لیا جا رہا ہے - انسان کی اس ابتدائی فطرت کا اثر ہینی بال کی طبیعت پر بھی ہونا چاہئے تھا - اگر کوہستان البس کی بلند چوٹیوں پر سے اتر کر بجلی کی طرح رومیوں پر ہینی بال آگرتا تو اس کا یہ نتیجہ ہوتا کہ دشمن اپنے بال بچوں، اپنی عزت و ناموس اور اپنے وطن کی حفاظت میں لڑ کر جان دے دیتا اور دنیا میں نام کر جاتا - لیکن

اگر روم کی فوجوں کو یکے بعد دیگرے شکست دی جائے۔ اس کے حلیفوں اور دوستوں کو اس سے رفتہ رفتہ توڑ لیا جائے۔ اسے ان لوگوں کی نظروں میں حقیر و ذلیل کر دیا جائے جو کل تک اس کے نام سے تھراتے تھے۔ اور بالآخر پوری طرح بے بس کر کے اس کی جان لی جائے۔ تو یہ ہے انتقام۔ یہ ہے پُرلطف سہانیق انتقام۔

(۴)

پانچ سال کا زمانہ اور گزر گیا۔ ہینی بال ایک گھوڑے پر سوار شہر روم کی فصیل کے سامنے خراماں خراماں جا رہا ہے۔ اور اس شہر کو اطمینان کی نظروں سے دیکھ رہا ہے جس کی ابدی دشمنی کا اس نے قرطاجنہ میں آج سے ۲۰ برس پیشتر حلف اٹھایا تھا۔ مضافات شہر کے لوگ شہر میں پناہ گزیں ہو گئے ہیں۔ اور رات کے وقت گاؤں کے جلنے کی جو روشنی دور دور تک نظر آتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خداوند بعل ملوخ کا قہر و غضب روم پر ٹوٹ رہا ہے۔ ہینی بال شہر روم پر نظریں ڈالتا ہے۔ اور اپنے ہاتھ کا نیزہ شہر پناہ کے اوپر سے شہر میں پھینکتا ہے۔ وہ روم کی طرف ذلت کی نظروں سے دیکھتا ہے اور شہر کے سامنے سے چلا جاتا ہے۔

فتح کنّا کے بعد شہر کاپوا کے ساتھ بہت سے اطالوی شہروں نے ہینی بال کی اطاعت کر لی تھی۔ شہر کاپوا وسعت اور دولت کے لحاظ سے شہر روم کا قریب ترین حریف تھا۔ لیکن اس علاقہ میں بھی بہت سے مقامات پر ابھی تک روم کی قلعہ بند فوجیں دشمن کی مدافعت کر رہی تھیں۔ اور اطالیہ کا مغربی حصہ ابھی تک پوری طرح سے روم کے زیر فرمان تھا۔ واقعۂ کنّا کے بعد روم کو اسقدر فرصت مل گئی تھی کہ وہ تازہ دم فوجیں بھرتی کر لے۔ ادھر ہینی بال کے جدید طرفدار نے یہ چال چلی کہ وہ ہینی بال کی مدد خود تو لے لیتے تھے۔ لیکن اپنی طرف سے اس کو کوئی مدد نہیں دیتے تھے۔ اب رومی فوجیں بھی کافی ہوشیار ہو گئی تھیں۔ اور ہینی بال سے میدان میں کبھی نہیں لڑتی تھیں۔ بلکہ وہ اس کے دوستوں اور حلیفوں پر چھاپے مار کر ان کو دق کرتی تھیں۔

۲۱۲ء قبل مسیح میں جبکہ ہینی بال اطالیہ کے جنوب میں شہر تارنتم کا محاصرہ کر رہا تھا۔ تو ادھر رومیوں نے شہر کاپوا کو محصور کر لیا۔ اور اگرچہ ایک مرتبہ ہینی بال نے آکر محاصرہ اٹھا دیا تھا۔ مگر رومی جنرل اس کو پھر دوسری طرف لگائے گیا یعنی دوسرے شہر پر جا کر چڑھائی کی اور جب ہینی بال اس طرف گیا تو رومیوں نے پھر آکر شہر کاپوا کو گھیر لیا۔ اور اس مرتبہ رومیوں نے اسقدر مضبوط مورچہ بندی کی تھی کہ جب ہینی بال نے آکر محاصرہ اٹھانے کی کوشش کی تو وہ ناکام رہا۔ لیکن اس کے جواب میں ہینی بال نے یہ چال چلی کہ اس نے شہر روم پر چڑھائی کر دی۔ لیکن کاپوا یا روم میں کسی جگہ بھی رومی جرنیل ہینی بال کی اس چال سے دھوکے میں نہ آئے۔ انھوں نے کاپوا کا محاصرہ بدستور قائم رکھا۔ صرف ایک مختصر سی فوج ہٹا کر روم کی مدد کے لئے بھیج دی۔ جہاں بہت سی جدید فوج بھرتی ہو کر پہلے ہی موجود ہو گئی تھی۔

جب کاپوا میں اہل روم نے پھر قبضہ کر لیا تو ہینی بال کو اپنے آدمیوں کے سوائے اور کسی طرف سے امداد و اعانت کی توقع نہ رہی۔ کارتھیج کی طرف سے اس کو بہت قلیل کمک پہونچی تھی۔ کیونکہ اہل کارتھیج فنیقی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اور یہ قوم سوداگروں اور دوکانداروں کی قوم تھی۔ جو صرف اس خیال سے جنگ کو پسند کرتی تھی کہ فتوحات کے ذریعہ سے تجارت کے لئے جدید میدان

ہاتھ آلیں گے، وہ نہ وسعت سلطنت کے خواہاں تھی نہ انتقام کی۔ پھر اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا۔ کہ اس قوم میں افتراق پیدا ہو گیا۔ "صلح پسندوں" کی ایک طاقتور پارٹی پیدا ہو گئی۔ جو ہینی بال کی سخت مخالف تھی۔

جب ہینی بال نے لکھا کہ :۔

"میں نے دشمن کی فوجیں تہ تیغ کر دی ہیں۔ اب مجھے سپاہی بھیجو۔"

تو مخالفین یہ کہتے ہیں کہ جب دشمن کی فوجیں نیست و نابود ہو گئی ہیں تو پھر فوج کی کیا ضرورت ہے۔ اگر ہینی بال لکھتا کہ "میں نے رسد اور مال غنیمت سے بھرے ہوئے دشمن کے کیمپ فتح کر لئے ہیں۔ مجھے روپیہ اور سامان بھیجو" تو مخالفین کہتے کہ جب "کیمپوں کا سامان رسد اور مال ہاتھ آگیا ہے تو مزید رسد اور روپیہ کی کیا ضرورت ہے۔

جب وطن سے ہینی بال کو مدد نہ پہونچی تو اب صرف یہ امید باقی رہ گئی کہ اپنے "ہسپانوی مستقر سے مدد طلب کی جائے"۔ لیکن اس میں رومیوں نے مزاحمت کی۔ یعنی باوجودیکہ اس وقت رومیوں کو خود اپنا گھر بچانے کے لئے فوجوں کی سخت ضرورت تھی، مگر انھوں نے ہسپانیہ میں برابر اپنی بڑی بڑی فوجیں قائم رکھیں۔ اور مشہور رومی جرنیلوں نے کارتھیج کی فوجوں کو ہسپانیہ میں پوری طرح مصروف رکھا۔

اب ہینی بال کی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی تھی۔ کیونکہ رومی فوجوں نے اسے جنوبی اطالیہ میں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ اور روز بروز یہ حلقہ تنگ ہوتا جاتا تھا۔

(۵)

کنتا کے میدان جنگ سے چند میل کے فاصلہ پر بمقام کانوسیم ہینی بال کا کیمپ پڑا ہوا ہے۔ اور اس کے سامنے ہی رومی سپاہ خیمہ زن ہے۔ جس کی کمان اس وقت نیرو (Nero) کے ہاتھ میں ہے۔ یہ نیرو وہ ہے جو اس وقت کارتھیج کی تباہی پر کمربستہ ہے اور اب سے تین صدی بعد ایک اور نیرو پیدا ہو گا جو خود روم کو تباہ کر دے گا۔ ہینی بال کی فوج نے دیکھا کہ رومی کیمپ سے ایک جماعت برآمد ہوئی۔ اور جب وہ آگے بڑھی تو ہینی بال کی فوج نے شناخت کیا کہ ایک فوجی دستہ کی حراست میں پابزنجیر افریقی قیدیوں کی ایک جماعت ہے۔ اس کے بعد بدرقہ کے سپاہیوں میں سے ایک جوان آگے بڑھا۔ اور اس نے زمین پر ایک کٹا ہوا سر پھینکا۔ اس کے بعد یہ جماعت واپس ہو گئی۔ یہ تماشہ دیکھ کر ہینی بال کی فوج کو تحقیقات حالات کا اشتیاق پیدا ہوا اور چند سپاہیوں کے آگے بڑھ کر وہ سر اٹھا لیا۔ اور ہینی بال کے پاس لے گئے۔ ہینی بال نے جب یہ سر دیکھا تو اپنے بھائی سے مشابہ پایا۔ اس وقت گویا ہینی بال کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا۔ کہ اس کا بھائی ہسدروبال بھی اطالیہ میں موجود تھا۔ تھوڑی دیر بعد رومیوں نے دو قیدی رہا کئے۔ جنھوں نے ہینی بال کے پاس آکر کارتھیج رومیوں کے حملہ اور اس کے ہسدروبال کی شکست اور قتل کا مفصّل حال بیان کیا۔

اب ہینی بال نے سمجھ لیا کہ فتح کی آخری اُمید بھی زائل ہو گئی۔ اس لئے اس نے وہ مقام چھوڑ دیا جہاں نو برس بیشتر

اس نے رومیوں کو اسقدر ذلیل شکست دی تھی - اب وہ برد ٹیم پہونچ گیا جو اطالیہ کے جنوب میں واقع ہے - یہاں رومیوں نے اس پر چاروں طرف سے رخنہ کیا اور گھیر لیا - وہ اس ایک زخمی شیر کی مانند تھا جسے شکاریوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا مگر سامنے کوئی نہیں آتا تھا - سوائے ہینی بال کے مقابلہ کے اب رومیوں کو ہر جگہ فتح حاصل ہوتی تھی - لیکن ہینی بال کے سامنے وہ کچھ نہ کر سکتے تھے - سولہ برس تک ہینی بال ایک غیر ملک میں چاروں طرف شمشیر زنی کرتا پھرا اور کسی جگہ اس نے پشت نہ دکھائی - اور واقعہ کینا کے بعد تو اس سے کوئی آنکھ ملانے والا نہ رہا تھا - اس کو کسی طرف سے مدد نہیں ملتی تھی - مگر وہ جنگ کو جنگ ہی کے ذریعہ سے جاری رکھتا تھا - اور یہ وہ کارنامہ ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی - ایک مختلف الطبائع سپاہ کو اس طرح متفق و متحد رکھنا - کوہستان ایلپس کی برف پوش چوٹیوں کو طے کر کے اطالیہ کے قلب میں گھس جانا ہینی بال ہی کا کام تھا - سپاہی گرمی و سردی کی سختیاں برداشت کرتے تھے - رسد نہ ملنے پر فاقہ کشی کرتے تھے لیکن وہ اپنے سپہ سالار کے اسقدر وفادار اور جان نثار تھے کہ اس سے دغا کرنا تو درکنار اس کا ساتھ چھوڑنے کا خیال تک دل میں نہ لاسکتے تھے حالانکہ اس وقت چودہ سال سے ہینی بال کا اقبال مسلسل طور پر زوال پذیر تھا - ہینی بال اگرچہ چاروں طرف سے گھر گیا تھا - رومی فوجیں اس سے دور ہی دور رہتی تھیں - اور جس وقت وہ اطالیہ سے روانہ ہوا تو کسی کا حوصلہ نہ ہوا کہ اسے روک سکے -

اطالیہ میں رہ کر رومیوں سے انتقام لینے کا منصوبہ پورا نہ ہو سکا تھا کہ کارتھیج والوں نے اس کو فوراً طلب کر لیا - کیونکہ اسوقت سیپیو رومی جنرل کی طرف سے خود کارتھیج کا امن و امان خطرہ میں آگیا تھا - یہ وہی نوجوان رومی جنرل ہے جس نے اہل کارتھیج کو ہسپانیہ میں شکست پر شکست دی - تمام ملک فتح کر لیا اور جو سلطنت جنرل ہملکار برقہ نے اسقدر محنت سے قائم کی تھی - اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اب وہ خود افریقہ میں جا گھسا تھا - تاکہ کارتھیج پر حملہ کر کے ہینی بال سے انتقام لے - روم کے دار الاعیان نے سیپیو کو ہر چند منع کیا کہ وہ افریقہ نہ جائے اور جنرل فابیس نے بھی احتیاط سے کام لے مگر اس نے کچھ پروا نہ کی اور خود ہینی بال کے گھر پر حملہ کرنے کی ٹھان لی دار الاعیان کی یہ خواہش تھی کہ اطالیہ میں دشمن کے نکالنے میں تمام طاقت صرف کی جائے - مگر سیپیو نے یہی پسند کیا کہ دشمن پر عقب سے حملہ کیا جائے - جب جنرل سیپیو نے دار الاعیان کا حکم نہ مانا تو وہ اس کی اس گستاخی پر سخت برافروختہ ہوئے تو انھوں نے اس کے خلاف ایک خوفناک الزام عائد کر کے سیپیو کو برخاست کر دینا چاہا - لیکن جب وہ اس میں بھی کامیاب نہ ہوئے تو انھوں نے یہ طے کیا کہ سیپیو کو روم کی طرف سے اتنی ہی مدد دی جائے جتنی مدد کارتھیج نے اس کے حریف ہینی بال کو دی تھی -

سیپیو جزیرہ سسلی سے چل کھڑا ہوا اور سواحل افریقہ پر اپنے قدم جمائے - اس کے بعد آگے بڑھا اور اس نے کارتھیج اور اسکے حلیفوں کی فوجوں کو شکست پر شکست دینا شروع کر دی - اور قبل اس کے کہ ہینی بال کارتھیج کی مدد کو پہونچے - سیپیو نے اہل کارتھیج کو اسقدر دبکیں دیں کہ وہ صلح کرنے پر مجبور ہو گئے - لیکن جب یہ خبر معلوم ہوئی کہ ہینی بال افریقہ میں آگیا ہے تو اہل کارتھیج کے حوصلے بڑھ گئے - اور انھوں نے صلح نامہ توڑ دیا - اس وقت سیپیو کی حالت جو غیر ملک میں گھسا ہوا لڑ رہا تھا - اسقدر خراب ہو گئی کہ وہ پریشان ہو گیا - لیکن اس نے جنگی نقطہ نظر سے اسقدر عمدہ چال چلی کہ بہت جلد قسمت کا پانسہ اس کے موافق پڑنے لگا - یعنی بجائے اس کے

کہ وہ پسپا ہو کر اپنے ساحلی مستقر پر واپس آجائے۔ حوصلہ کر کے اندرون ملک کی طرف اور آگے بڑھ گیا۔ سیپیو کی اس نقل وحرکت سے کارتھیج کا ذریعہ رسد رسانی خطرہ میں پڑ گیا۔ لیکن فوراً ہی ہینی بال نے پہونچ کر اسے ایک میدان میں گھیر لیا۔ جہاں سے اس کو اہل ترکی طرف سے بھی کمک پہونچنے کی امید تھی۔

(۶)

سنہ قبل مسیح کا زمانہ ہے۔ اور زامہ کے میدان جنگ پر آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ ہر طرف کشتوں کے پشتے لگے ہوئے ہیں۔ ایک طرف لاشوں کی قطار کے پیچھے سے رومی فوج کی ایک قطار بڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جو غیر متوقع طور پر بہت لمبی ہے۔ اور ہر شخص اس خوف سے کہ اس زمین پہاں خون کے دریا بہگئے تھے پاؤں پھسل جائے۔ پھونک پھونک کر قدم آگے ڈال رہا تھا۔ دن بھر کشت وخون میں گزر گیا تھا۔ اور ہینی بال عرصۂ دراز سے اسی وقت کا منتظر تھا۔ اس نے اپنی پرانی اور جنگ آزمودہ چوبیس ہزار فوج کو جو اطالیہ سے اس کے ساتھ آئی تھی۔ آگے بڑھایا

دونوں فوجیں گتھ گئیں۔ اور گھمسان کا رن پڑنے لگا۔ اتنے میں کارتھیج کی سپاہ کی عقبی صفیں اپنے پیچھے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنتی ہیں۔ یہ آوازیں سیپیو کی سوار فوج کی تھیں۔ جو عین وقت پر دشمن کا تعاقب کر کے واپس آگئی تھی۔ اور یہی وہ چال تھی جو رومی جرنیل نے خوب سوچ سمجھ کر چلی تھی۔ اب جو حالت معرکۂ کناّ میں رومی فوج کی ہوئی تھی وہی حالت اب کارتھیج کی فوج کی ہوئی۔

(۷)

چند ہفتہ بعد ــــــــ شہر کارتھیج میں کیا ہو رہا ہے۔ مجلس ملیہ میں ان شرائط صلح پر بحث ہو رہی ہے جو نوجوان رومی جرنل سیپیو کی طرف سے پیش کی گئی ہیں۔ شرائط خلاف توقع بہت نرم ہیں۔ باوجودیکہ اس وقت کارتھیج کی حالت بہت خراب ہے۔ مگر ایک فصیح البیان مقرر ابھی تک اسی بات پر زور دے رہا ہے کہ جنگ جاری رکھی جائے ہینی بال ایسی باتیں سنتے سنتے تھک گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے اس شخص کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔ جب ہینی بال کی اس حرکت پر اسمبلی میں ہر طرف سے اظہار ناراضی ہونے لگا تو اس نے یہ کہہ کر معافی مانگ لی کہ چونکہ اس نے ۳۶ برس ملک سے باہر جنگ کرتے گذرے ہیں اس لئے وہ آداب مجلس سے واقف نہیں اس کے بعد ہینی بال نے مجلس سے درخواست کی کہ سیپیو کی پیش کردہ شرائط صلح منظور کر لی جائیں۔

صلح ہو گئی۔ اور ہینی بال نے شرائط صلح کی سات برس تک حرف بحرف پابندی کی۔ اور اپنی خداداد قابلیتوں سے جنگ کے بجائے وہ ملکی نظم ونسق کی درستی کا کام لینے لگا۔ اور چند روز میں کارتھیج پہلے کی طرح پھر خوشحال ہو گیا

قوم سے انتقام لینے کی جو زبردست اسکیم اس نے سوچی تھی کیا اس کے بغیر کامیاب ہونے کے ساتھ ہی اس کی طبیعت بھی بدل گئی یعنی تخریبی مشاغل کو فضول سمجھ کر اب وہ ہمیشہ کے لئے تعمیری مشاغل میں مصروف رہے گا۔ یا اس کا مقصد یہ ہے کہ فرصت کا وقت غنیمت سمجھ کر وہ خود کو اسقدر طاقتور بنائے کہ پھر روم سے انتقام لینے پر آمادہ ہو جائے؟ یہ راز کبھی نہیں کھل سکتا۔ کیونکہ

اب ایک جدید جذبۂ انتقام پیدا ہو گیا تھا اور وہ روم کا جذبۂ انتقام ہنی بال کے خلاف تھا۔ جنرل سیپیو نے ہر چند سفارش کی۔ کہ شخص واحد کے خلاف اسقدر شدید جذبۂ انتقام پیدا کرنا روم کی شان کے خلاف ہے۔ مگر کسی نے نہ سنا۔ اور کیٹو نے اہل کارتھیج کو ہر طرح ستانا شروع کر دیا۔ جب ہنی بال کو اپنی جان کا خوف ہوا تو وہ جہاز میں سوار ہو کر کارتھیج سے روانہ ہوا۔ اور اس نے پھر رومیوں سے انتقام لینے کی ٹھانی۔ ممالک مغرب کو رومیوں کے خلاف ابھارنے میں تو وہ ناکام رہا تھا۔ اب اس نے ممالک مشرق کو روم کا دشمن بنانے کی کوشش کی۔ اور وہ بقیہ عمر اسی فکر میں گذارتا رہا کہ جس ملک سے اس کے آبا و اجداد آئے تھے اسی ملک کو روم کے خلاف صف آرا کیا جائے۔ وہ بادشاہ شام ملک انطیوکس کے دربار میں جاتا ہے۔ (جو اس فکر میں ہے کہ رومیوں کی بڑھتی ہوئی زد کو روکنے کے لئے ملک یونان پر حملہ آور ہو) اور یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ ملک انطیوکس یونان کی طرف سے اور وہ خود کارتھیج کی طرف سے اطالیہ پر حملہ آور ہو۔ اور اس طرح رومیوں پر دو طرف سے ضرب لگائی جائے۔ لیکن انطیوکس کسی قدر شکی مزاج آدمی واقع ہوا تھا۔ اس لئے یہ اسکیم پوری نہ ہوئی۔ کچھ دنوں بعد ایک رومی فوج نے ایشیائے کوچک پر حملہ کیا۔ اور اس طرح ملک انطیوکس بھی مغلوب ہو گیا۔ رومیوں نے جو شرائط صلح پیش کیں ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ ہنی بال کو حوالہ کر دیا جائے۔ لیکن ہنی بال کو عین وقت پر خبر ہو گئی اور وہ پہلے تو جزیرہ کریٹ کو اور بعد ازاں ملک بتھنیا کی طرف چلا گیا۔ جہاں کے بادشاہ پروسیاس نے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔

(۴)

غروب آفتاب کا وقت ہے۔ شام کے دھندلکے پر رات کی تاریکی غالب آتی جاتی ہے جو محل شاہ پروسیاس نے ہنی بال کے رہنے کے لئے دیا تھا۔ اس کا ایک سیاہ پوش جماعت محاصرہ کر رہی ہے۔ اور تھوڑی دیر بعد ایک مسلح جماعت اندر داخل ہو جاتی ہے۔ ہنی بال جانتا تھا کہ چند روز سے رومیوں کا ایک ایلچی شاہ پروسیاس کے دربار میں آیا ہوا ہے اس لئے وہ خوب سمجھتا تھا کہ کوئی کارروائی ضرور ہونے والی ہے۔ اور وہ یہ بھی خوب جانتا تھا کہ بادشاہوں کے وعدے کس قدر پختہ اور استوار ہوتے ہیں۔ ہنی بال کے ملازم دوڑ کر جاتے ہیں اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ بچنے کی کوئی صورت ہے یا نہیں۔ انھوں نے اس دن کے لئے محل سے باہر نکلنے کا ایک خفیہ راستہ بھی بنا لیا تھا۔ مگر ہر جگہ شاہی سپاہیوں کو متعین دیکھا۔ لیکن اس وقت ہنی بال کے سامنے ایک راستہ ضرور کھلا ہوا تھا۔ اور یہ وہ راستہ تھا جسے کوئی بند نہ کر سکتا تھا۔ ہنی بال نے فوراً زہر طلب کیا جو اسی مقصد کے لئے عرصہ سے تیار کر لیا گیا۔ اور پورے اطمینان کے ساتھ زہر ہاتھ میں لے کر اس نے یہ کہا:-

"مجھے اب اس خطرہ کا خاتمہ کر دینا چاہئے جس میں اہل روم عرصہ سے گرفتار رہے ہیں۔ کیونکہ شاید وہ اسقدر انتظار نہیں کر سکتے کہ میں اپنی عمر طبعی کو پہونچ کر ان کو مطمئن کر دوں"

یہ کہہ کر اس نے جام زہر خالی کر دیا۔ اور آخر کار اس طرح اس شخص کا خاتمہ ہوا جو دنیا کی تاریخ کو یقیناً بدل دیتا۔ اگر اس کی مدد اہل ملک نے وقت پر کی ہوتی۔

نیاز

اقبالنامہ جہانگیری کا ایک قلمی نسخہ

اور

عہد مغلیہ کے ایک درباری اہل قلم کے چشم دید بیانات

گزشتہ سے پیوستہ

نذر و پیشکش

مصنف اقبالنامہ نے جستہ جستہ ان تمام جواہرات وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے، جو وقتاً فوقتاً بادشاہ یا شاہجہاں کو نذر دیئے گئے۔ لعل و یاقوت، الماس، زمرد وغیرہ۔ جواہرات پر ایک مکمل تبصرہ کیا ہے، چنانچہ لکھتا ہے،

"مرتضیٰ خاں از گجرات انگشتری لعل بدخشی کہ نگین و نگین دان و حلقہ آں از یک پارچہ لعل تراشیدہ بودند بوزن یک مثقال و پانزدہ سرخ بغایت خوش رنگ و خوش آب برسم پیشکش فرستادہ بود، مقبول خاطر پسند افتاد۔ الحق تا حال شنیدہ نشدہ این تحفہ بنظر در نیامدہ دانہ دیگر قطبی شش پہلو تراشیدہ بوزن دو مثقال و پانزدہ سرخ در غایت لطافت و خوبی قیمت ہر کدام بست ہزار روپیہ باشد"

اسی سال شریف مکہ کا ایک محبت آمیز خط آیا جہانگیر نے ایک لاکھ کا ہندوستانی تحفہ بھیجا، (وقائع سال دوم)
جلوس کے چودھویں سال شاہ دلاور خان کا ایک محبت نامہ آیا اور اسی وقت جہانگیر کو لعل کی ایک انگوٹھی ملی۔

جس پر شاہان مغلیہ کا نام کندہ تھا۔ جہانگیر نے اپنے درباری صناع کو حکم دیا کہ اس پر اس کا اور اکبر کا نام اور تاریخ حال کندہ کر دے،

جلوس کے گیارہویں سال شاہجہان نے نذر پیش کی، اس میں سترہ مثقال کے وزن کا ایک لعل تھا، جو بندر گوہ میں دو لاکھ روپے پر مول لیا گیا تھا، دوسرا سلیمی تھا جو آب و رنگ اور شکل و صورت میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا، ایک ہیرا جس کی قیمت چالیس ہزار روپے تھی، اور دوسرے کی قیمت تیس ہزار (جو کتابت کی غلطی سے "سہ ہزار" لکھا گیا ہے) روپے تھی، دو مروارید جن میں ایک کا وزن دو مثقال پندرہ سرخ تھا، اور غایت درجہ نفیس [illegible] تھا، اس کے علاوہ ہاتھی اور نقد جنس پیش کیا گیا۔ اس نذرانہ کی مجموعی قیمت بیس لاکھ روپے تھی،

اسی طرح ایک اور موقع پر شاہجہان نے بڑی فراخدلی اور حوصلہ سے جہانگیر کی خدمت میں نذرانہ پیش کیا جس کی تفصیل اقبالنامہ میں حسب ذیل ہے:

"روز مبارک شنبہ چہارم ربیع الآخر سنہ ہزار و بیست و نہ ہجری [illegible] تحویل
درین روز شاہزادہ گیتی ستان شاہجہان جشن عالی ترتیب داده [illegible] قیمت [illegible]
از نفائس نوادر و جواہر [illegible] پیشکش معروض داشته بساط اخلاص [illegible] انداز [illegible]
یاقوتیست [illegible] در رنگ و آب [illegible] بیست و دو ہزار روپیہ دیگر
شش دانہ مروارید غلطان کہ یکی از آنہا [illegible] ہشت سرخ وزن دارد و دو کلان
الشان بہ بیست و پنج ہزار روپیہ [illegible] ابتیاع نموده اند، و دانہ دیگر [illegible] سی ہزار
روپیہ و یک قطعہ الماس کہ [illegible] ہزار روپیہ بہا داشته .... و از جملہ
آن برگزیده دین و دولت [illegible] در عہد [illegible]
الیست از طلا و نقره .... مجموعہ شصت و پنج ہزار روپیہ بر آمده، دیگر
تخت سواری فیل کہ باصطلاح اہل ہند [illegible] گویند از طلا ساختہ [illegible] ہزار
روپیہ مرتب گشتہ دیگر دو زنجیر فیل [illegible] قطب الملک [illegible] پیشکش فرستاده
بود فیل اول "داد الہی" نام داشت [illegible] فیل دوم [illegible] پارچہ ہای
نفیس گجرات کہ زربافان بادشاہی ترتیب فرموده اند، اگر بہ تفصیل مرقوم گردد بہ طول
می کشد القصہ قیمت مجموعہ پنج لک روپیہ [illegible] شده"

(اقبالنامہ وقائع سال سیزدہم)

سوانح و حوادث

اقبالنامہ کے اندر غیر مربوط طریقہ سے بعض مقامی حادثات و سوانح پر بھی دلچسپ بحث کی گئی ہے، چنانچہ ان میں ایک ملا علی احمد مہرکن کا واقعہ ہے[1]، علامہ شبلی نے شعر العجم کے اندر خسرو کے بیان میں یہ واقعہ "تزک جہانگیری"

کے حوالہ سے لکھا ہے (جو جہانگیر کی خود نوشت سوانحعمری ہے) مصنف اقبالنامہ نے بھی تقریباً وہی باتیں لکھی ہیں جو تزک جہانگیری میں ہیں لیکن چونکہ تاریخی روایت کے اعتبار سے تزک جہانگیری اور اقبالنامہ دونوں کی روایتیں محل نظر ہیں اس لئے میں بہتر سمجھتا ہوں کہ پہلے مصنف اقبالنامہ کی روایت نقل کردوں، وہ لکھتا ہے،

"از غرائب اتفاق کہ در مجلس بہشت آئین بہ ظہور آمدہ واقعہ فوت ملا علی احمد مہرکن
است او در صنعت مہرکنی از یکتایان روزگار بودہ . . . پدرش ملا حسین نیز
مہرکن بود، و نقشی تخلص می کرد، . . . . . آں حضرت (جہانگیر) ملا علی احمد را
خلیفہ می گفتند"

اس کے بعد نفس سانحہ پر یوں روشنی ڈالتا ہے۔

"و شرح ایں سانحہ غریب بر سبیل ایجاز واختصار آنکہ شبے جمعے از قوالان سرود می گفتند
و . . . . . . بہ رسم خلیفہ سماع می کرد و ایں بیت امیر خسرو می خواند،

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے — من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

میان خانہ ایں سرود بود حضرت بجانب ملا علی احمد توجہ فرمودہ پرسیدند کہ حقیقت
ایں بیت چیست او پیش آمدہ معروض داشت کہ از پدر خود چنیں شنیدہ ام کہ روزے
سلطان المشائخ حضرت شیخ نظام الدین کلاہے بر سر کوشہ کج نہادہ بر لب آب جون
بر پشت بامے نشستہ تماشائے غسل ہنود و ہندی آں جا می کردند، دریں وقت حضرت
امیر خسرو حاضر می شوند شیخ بجانب امیر توجہ شدہ می فرمایند کہ طریق عبادت ایں
جماعہ را می بینی و ایں مصرع را می خواند ؎ ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے
امیر بے تامل روئے بجانب شیخ کردہ بر زبان جاری می سازند ؎
من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے
ملا علی احمد مصرع ثانی را بہ اتمام کردہ بیخود افتادہ تمام شد" (اقبالنامہ وقائع سال پنجم)

حاشیہ صفحہ ۴۴ سلہ مجھے یاد آتا ہے کہ فرشتہ کے اندر یہ واقعہ میں نے تفصیل کے ساتھ پڑھا تھا لیکن جب ڈھونڈھنے لگا تو باوجود تلاش بھی پتہ نہ مل سکا، ہر چند فرشتہ کے اندر صرف اکبر کے عہد تک کے واقعات ملتے ہیں لیکن مورخ نے ضمناً عہد جہانگیری کے واقعات پر بھی روشنی ڈالی ہے، چنانچہ اس کی ایک نظیر شیخ سلیم چشتی کے سلسلہ میں خود اس مضمون میں ملے گی،

ع۔م

علامہ شبلی نے بھی شعر العجم کے اندر تزک جہانگیری کے حوالہ سے یہی واقعہ لکھا ہے، البتہ انہوں نے اس سلسلہ کے بعض واقعات حذف کر دئیے ہیں، مثلاً یہ کہ جہانگیر نے اس کی شان نزول بروایت اقبالنامہ خود ملا علی احمد سے دریافت کی۔ علامہ شبلی کہتے ہیں :-

" جہانگیر نے تزک جہانگیری میں لکھا ہے، کہ میری مجلس میں قوال یہ شعر گا رہے تھے، میں نے اس کی شان نزول پوچھی ملا علی احمد مہرکن نے اس کا واقعہ بیان کیا، مصراع آخر کے ختم ہوتے ہوتے ملا کی حالت بدلنی شروع ہوئی، یہاں تک کہ غش کھا کر گرے دیکھا تو دم نہ تھا۔"[1]

اقبالنامہ میں ملا علی احمد کے بعض واقعات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے، کہ خواجہ نظام الدین دریائے جمنا کے کنارہ ایک کوٹھے پر بیٹھے تھے، جو شعر العجم میں نہیں، لیکن سب سے اہم بات جس پر اس ضمن میں مجھ سے بحث کرنا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کی شان نزول کے متعلق خود فرشتہ کے اندر ایک دوسری روایت پائی جاتی ہے[2]۔ چونکہ یہ واقعہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، یا خسرو کے سلسلہ میں درج ہونے کے بجائے، شیخ برہان الدین کے ذیل میں درج ہے، اس لئے علامہ شبلی اس پر کوئی تنقیدی روشنی نہیں ڈال سکے،

خواجہ نظام الدین اولیا کے مطبخ کے منتظم شیخ برہان الدین تھے، ایک دن باورچی خانہ میں کج پر بیٹھے ہوئے تھے، سردی معلوم ہوئی، تو کاندھے پر جو کپڑا تھا۔ اسے بچھا دیا، کسی نے حضرت خواجہ کو خبر کی کہ برہان الدین باورچی خانہ میں نہالچہ بچھا کر بیٹھے ہیں، فرمایا کہ بے ادبی کی ابھی تک ان کے سر سے ہوس نہیں گئی، انھیں میرے پاس آنے نہ دیا جائے، شیخ برہان الدین کو جب خبر ملی تو پیر کی جدائی سے بیتاب ہوگئے، اور ہر چند دوستوں سے سفارش پہونچائی لیکن کوئی فائدہ نہ نکلا، آخر کار امیر خسرو کی خدمت میں التجا کی۔ انھیں چونکہ سلطان المشائخ کی خدمت میں قرب و عزت حاصل تھی، انہوں نے قبول کیا۔ اور اپنی پگڑی شیخ برہان الدین کے گلے میں ڈال کر اسی صورت سے حضرت خواجہ کی خدمت میں لائے، چنانچہ فرشتہ میں ہے،

" از انکہ دید کہ آنحضرت کلاہ کج بر سر گزاشتہ وضوئی سازند بدیہہ ایں بیت بخواند

ع ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

آں حضرت نہایت خوش وقت شدہ برخاست و ہر دو را در کنار گرفت ؛

فرشتہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے، کہ ملا علی احمد نے۔ اس شعر کی جو شان نزول بیان کی تھی۔ وہ محض سنی سنائی بات تھی جسے اقبالنامہ کے مصنف اور خود جہانگیر نے اپنے روزنامچہ میں درج کر دیا اور یوں بھی فرشتہ کی روایت ثقہ اور اقبالنامہ اور تزک جہانگیری، کی روایتیں جو ایک ہی وادی سے سنکر لکھی گئی ہیں، سستی معلوم ہوتی ہیں کہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کا مقبرہ نہ تو برلب دریا واقع ہے، جہاں آپ کھڑے ہو کر ہندوؤں کے اشنان وغیرہ میں محو نظارہ ہو جاتے۔ جیسا کہ شعر العجم میں ہے، اور نہ

---

[1] شعر العجم تذکرہ امیر خسرو، [2] تاریخ فرشتہ مقالہ دوازدہم تذکرہ شیخ برہان الدین ۱۲

آپ کا کوئی بالاخانہ دریائے جمن کے کنارہ تھا جہاں سے اشنان کرنے والوں کی مادہ پرستی اور عریانیت کا تماشہ دیکھتے، جیسا کہ مصنف اقبالنامہ نے لکھا ہے، ظاہر ہے کہ خواجہ صاحب نہ تو ایسے بالاخانہ پر جاسکتے تھے جو دریائے جمنا کے کنارہ ہے جب خود مبارک شاہ خلجی برابر آپ کو اپنے دربار میں بلاتا رہا۔ اور آپ تشریف نہیں لے گئے تو دوسرے امرا و اہل ثروت کی دعوتیں کیا حقیقت رکھتی ہیں؟ خانقاہ چھوڑ کر شیخ نظام الدین جیسے اہل اللہ دریائے جمنا کے کنارے بالاخانے پر چڑھکر ہندوں کے غسل جیسے عریاں رسم کا تماشہ کیوں دیکھنے لگے؟ تاریخی روایت و درایت دونوں اعتبار سے اقبالنامہ کا بیان اور تزک جہانگیری کی روایت جسے علامہ شبلی نے شعر العجم میں لکھا ہے، مستبعد معلوم ہوتی ہے

ماہرین علم الاقوام جانتے ہیں کہ نسل انسانی سیاسیات سے کس حد تک اثر پذیر ہوئی ہے، افلاس نے نسلی امتیاز کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اور ثروت و سرمایہ نے تعلقات کے نسبی حالات میں جو کچھ تغیرات پیدا کئے ہیں۔ وہ تاریخ کے کھلے ہوئے واقعات ہیں، صفویہ کو خاندان نبوت سے جو تعلق ہے محتاج بیان نہیں لیکن مغلیہ کا ستارہ اوج پر آتا ہے، تو خاندان صفوی کی ایک سیدانی مغلیہ خاندان میں بیاہی جاتی ہے، چنانچہ راقم اقبالنامہ لکھتا ہے،

"و درین تاریخ جشن طوی شہزادۂ بلند اقبال سلطان خرم با صبیہ مظفر حسین مرزا ابن سلطان علی مرزا صفوی آراستگی یافتہ،"

کتاب کے اندر اسی واقعہ کے متعلق ایک جگہ اور مرقوم ہے کہ خاندان صفوی کے ساتھ ازدواجی تعلق قائم کرنے کے لئے جہانگیر نے دولت ایران میں پیام بھیجا تھا جو قبول کیا گیا[1]۔ اسی طرح ضمناً ایک جگہ اور نقشبندیہ خاندان سے ازدواجی رشتہ قائم کرنے کا واقعہ اقبالنامہ میں مذکور ہے،

"دراں حین خبر فوت سلمی سلطان بیگم رسید وخاطر حق شناس از سنوح این واقعہ ملول و محزون گشت والدہ ایشان گلرخ بیگم صبیہ قدسیہ حضرت فردوس مکانی (ہمایوں) است انار اللہ برہانہ و پدر ایشان مرزا نورالدین محمد از خواجہ زادہ ہای نقشبندیہ است بیگم بہ جمیع خوبیہا کہ پیرایۂ عصمت است آراستگی داشتند،"

سلمی سلطان نے طبیعت موزوں پائی تھی، کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتی تھیں تخلص مخفی تھا۔ ان کا ایک مطلع ہے ؎

کاکلت را من ز مستی رشتۂ جاں گفتہ ام مست بودم زیں سبب حرف پریشاں گفتہ ام

---

[1] چونکہ ایک بہت ہی اہم مضمون کے لئے میں اس موضوع کا انتخاب کر چکا ہوں (جو زیر ترتیب ہے) اس لئے اس واقعہ پر سیاسی نقطہ خیال سے کوئی حاشیہ آرائی کرنا نہیں چاہتا، ناظرین مغلوں کی اس سیاسی حکمت عملی پر خود ہی ایک نظر ڈال لیں جو انہوں نے فارس کے صفوی خاندان اور ہندوستان کے راجپوت گھرانوں سے علاقہ نسلی قائم کرکے انجام دی ہے،

جلوس کے گیارہویں سال تمام ہندوستان میں طاعون کی بلا نازل ہوئی، اس کی ابتدا پنجاب سے ہوئی اور رفتہ رفتہ دیہات اور بستیوں میں اس کا اثر پہونچا لوگ گھر چھوڑ چھوڑ کر صحرا میں بھاگنے لگے، لاہور کے اندر اکثر گھروں میں دس دس اور بیس بیس آدمی مرے لوگ گھروں کو مُردوں سے بھرا ہوا مقفل چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ ایک شخص مرا اسے ایک فقیر نے گھانس پر غسل دیا دوسرے دن فقیر مرا اسے بھی گھانس پر غسل دیا گیا۔ گھانس کا کچھ حصہ ایک گائے نے کھایا، وہ مر گئی گائے کا گوشت کتوں نے کھایا وہ بھی دم توڑنے لگے،

«دریں سال ملک ہندوستان را ایں بلیہ جائے نماند بست سال ممتد در ممالک وسیع ہندوستان سائر و دائر بود»

جلوس کے پندرہویں سال پرگنہ جندر کے ایک موضع میں صبح کے وقت بہت ہیبت ناک شور و غوغا ہوا تھا، اس شور و شغب کے درمیان بجلی کی طرح ایک روشن چیز زمین پر گری اور غائب ہوگئی، تھوڑی دیر کے بعد اس آشوب میں کمی ہوئی اور قلوب میں تسکین پیدا ہوئی، اس پرگنہ کے حاکم محمد سعید کو خبر ملی وہ سوار ہو کر موقعہ واردات پر پہونچا دیکھا کہ دس بارہ گز تک زمین میں سبزی کا نام و نشان بھی باقی نہیں، اس نے حکم دیا کہ اس جگہ کو کھودا جائے، جتنا لوگوں نے کھودنا شروع کیا گرمی بڑھتی گئی، یہاں تک کہ ایک گرم لوہا ظاہر ہوا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے ابھی آگ کی بھٹی سے نکالا گیا ہے، ہوا لگی تو سرد ہوگیا، حاکم نے اسے ایک تھیلی میں رکھ کر جہانگیر کی خدمت میں بھیجدیا جہانگیر نے ایک ماہر صناع کو بلا کر اسے حوالہ کیا اس نے تین حصہ یہ اور ایک حصہ دوسرے اجزا ملا کر اس سے دو تلواریں ایک خنجر اور ایک چاقو بنایا اور خدمت شاہی میں پیش کیا،

بادشاہ کا ایک دانہ مروارید جس کی قیمت چودہ پندرہ ہزار روپے ہوتی تھی، گم ہوگیا "جوتک رائے"، ایک منجم نے پیشینگوئی کی کہ دو تین دن میں مل جائے گا، صادق خاں نے زیچ پر زور دیکر بتایا دو تین دن میں ایسے مقام سے وہ موتی برآمد ہوگا جو پاکیزگی اور نزاکت سے متصف ہے، جیسے عبادت خانہ یا نماز و تسبیح پڑھنے کی جگہ سے، ایک عورت نے پیشینگوئی کی کہ دو تین دن میں ایک گوری عورت ہنستی ہوئی دست مبارک میں دے گی، اتفاقاً ایک ترک لونڈی کو یہ موتی عبادتخانہ میں ملا، وہ خوشی میں مسکراتی ہوئی آئی اور جہانگیر کے ہاتھ میں دیا اس طور سے تینوں منجموں کے احکام صحیح نکلے،

عجائب وغرائب

معتمد خاں نے بعض ان عجائب کا تذکرہ کیا ہے، جو یا تو خود اس کے عہد میں حادث ہوئے یا قدیم تھے لیکن اس نے انہیں دیکھا، ان میں ایک تو ان دو لڑکیوں کی پیدائش کا حال ہے، جو پیٹھ سے کمر تک باہم ملی ہوئی پیدا ہوئی تھیں،

دریں ولا از روزنامچہ وقائع کشمیر بعرض رسید کہ در خانہ ابریشم فروشے دو دختر دندان دار بوجود آمد کہ پشت ہر دو تا کمر متصل بود اما سر و دست و پائے ہر دو یک جدا زمانے زندہ ماندہ فوت شدند (اقبالنامہ وقائع سال یازدہم)

اجرام سماوی | مصنف اقبالنامہ نے ایک ایسی ہیئت فلکیہ کا تذکرہ کیا ہے، جو نجوم اور ہیئت میں خاص اہمیت رکھتی ہے، اور جس کے اثرات ارضی کے متعلق ہندوؤں کے معتبر کتب نجوم میں واقعات ملتے ہیں اور جسے اصطلاح میں "حربہ" کہتے ہیں:

"شانزدہم دی ماہ پیش از طلوع صبح سہ گھڑی در گردن ہوا مادہ بخارے بہ شکل عمود نمودار
شدہ و ہر شب یک گھڑی پیشتر از شب دیگر مرئی می گشت چوں تمام نمود صورت حربہ
پیدا کردہ پشت بجانب جنوب و روے بہ صوب شمال منجمان و اختر شناسان قد و قامت
او را بہ اسطرلاب معلوم کردند، کہ بست و چہار درجہ فلکی بہ اختلاف بہ نظر سائر است
و بہ حرکت فلک اعظم متحرک و حرکت فلک اعظم در و ظاہر می شود، چنانچہ اول در
برج عقرب مرئی می گشت، در اندک مدت برج عقرب را گزاشتہ بہ میزان سید
حرکت ارضی درجہ جنوب نیز دارد، و دانایان فن نجوم در کتب ایں قسم را "حربہ" نوشتہ اند"

اس علامت کے ظاہر ہونے کے سولہ رات کے بعد اسی طرف ایک ستارہ نکلا جسمیں روشنی اور چمک نہ تھی، اس کا اثر ممالک ہند پر یہ ہوا، کہ سارا ملک وبا اور طاعون، فتنہ اور جدال میں مبتلا رہا ایسا طاعون آیا کہ ہندوستان کی کسی معتبر کتاب میں اسکی نظیر نہیں ملتی، بیس سال تک اس وبا کا زور رہا اسی طرح سات آٹھ سال تک جہانگیر اور شاہجہاں میں معرکہ آرائی رہی اور اس سلسلہ میں کیسی افسوسناک خونریزی تھی جو نہوئی اور کون سی خانقاہ تھی جو برباد نہ ہوئی۔

عجیب حوض | اس سلسلہ (عجائب وغرائب) میں مصنف نے دو ایسے واقعات لکھے ہیں جن میں ایک نہ صرف ندرت صناعی اور عجوبیت کے لحاظ سے جالب توجہ ہے، بلکہ اس سے اس عہد کے اسلامی فن تعمیر اور کمال صنعت پر بھی روشنی پڑتی ہے،

جلوس کے تیسرے سال جہانگیر کو ایک صناع حکیم علی نامی کے عجیب وغریب حوض کا حال ملا، یہ حوض خود حکیم علی کے گھر میں تھا، اس کے ایک گوشہ میں پانی کے اندر حکیم نے ایک مکان بنایا تھا جسمیں روشنی بھی تھی، اس میں بعض سامان اور چند کتابیں رکھی ہوئی تھیں، اور ایک قطرہ پانی ٹپک کر نہیں جاتا تھا، جو کوئی اس کا تماشہ دیکھنا چاہتا تھا، حوض کے اندر اتر جاتا تھا، اس کے گوشہ سے چند سیڑھیاں نظر آتی تھیں دو تین زینہ نیچے جا کر خلوتخانہ کے اندر آتے تھے، اس کے اندر افسردہ طبیعتیں بشاش ہو جاتی تھیں۔ اس میں دس بارہ آدمیوں کی جگہ تھی، جو باہم گرم صحبت رہ سکتے تھے، معتمد خاں لکھتے ہیں

"حضرت شاہنشاہی بہ قصد تماشاے حوض مذکور بہ خانہ حکیم رفتہ بہ آب درآمدہ تفرج خانہ
مذکور کردند، و حکیم را بہ منصب دو ہزاری سرفراز ساختہ بہ دولت خانہ معاودت فرمودند"

خواجہ تابوت | جہانگیر کو خبر ملی کہ ضحاک اور تامیاں میں جو کابل کی سرحد پر ایک پہاڑ واقع ہے، اور اس پہاڑ میں خواجہ تابوت نامی ایک بزرگ کا مدفن ہے، لوگوں کا بیان تھا کہ چھ یا سات سو برس گزر گئے کہ خواجہ تابوت نے وفات پائی، معتقدین وہاں جاتے ہیں اور زیارت کرتے ہیں۔ ان کے جسم پر ایک زخم ہے کہ جب روئی ہٹائی جاتی ہے، تو وہاں سے خون ٹپکنے لگتا ہے اور جب روئی

زخم پر رکھدی جاتی ہے، تو خون بند ہو جاتا ہے، جہانگیر نے اس خبر کی تحقیق و تفتیش کے مصنف اقبالنامہ کو بھیجا معتمد خاں خود لکھتا ہے،

"بہ راقم اقبالنامہ حکم اشرف شد کہ بدانجا رفتہ بہ تعمق نظر ملاحظہ نماید و در تفحص و
تجسس تاکید بہ کار بردہ حقیقت را آمدہ بہ عرض ہمایوں رساند، و بہ جہت دیدن زخم جراحے
نیز ہمراہ کردند، کمترین شش منزل طے مسافت نمودہ بہ مقصد پیوست و شب در
موضعے تانیاں کہ جمعے از سادات سبزوار در آنجا توطن گزیدہ اند، گزرانیدہ روز دیگر
بہ دیدن خواجہ تابوت رفت در دامن آں کوہ ایوانے نمودار شد مقدار دو درعہ دہم از
زمین بلند تر یکے را بر فراز آں بر آوردم تمام اگرفتہ بالا کشید، و خود بہ زیر آمدم در عقب ایوان
خانہ مربع چہار درعہ صحن و سقف و دیوار ہا گچ کردہ"

اس گھر میں ایک قبر کھدی ہوئی تھی، اور ایک دروازہ اسمیں لگا ہوا تھا جب دروازہ کھولا گیا تو ایک تابوت نظر آیا، جب تابوت سے تختہ ہٹایا گیا، تو میت نظر آئی، بزرگ کو آئین اسلام کے مطابق قبلہ رُو لٹایا تھا، بایاں ہاتھ ستر عورت کے لئے دراز ہوا، اور آدھ گز ٹاٹ بھی ستر کے اوپر رکھا ہوا، تمام بدن درست تھا تھوڑے سے بال سر کے ایک طرف نمایاں تھے، اوپر کے دو دانت اور نیچے کے دو دانت لب کے درمیاں نمایاں تھے، ہاتھ اور پاؤں کے ناخن درست تھے، جستجو کے بعد ایک بڈھے کو ایک دیہات سے لائے، اور اس سے حالت دریافت کی گئی، کہنے لگا کہ باپ دادا سے سُنا ہے کہ خواجہ تابوت نے چنگیز خاں اور سلطان جلال الدین کی جنگ میں شہادت پائی تھی،

عبدالمالک آروی

ہندوستان کی ایک شاعرِ دیوی

رانی میرابائی

حالات زندگی | "رانی میرابائی" جودھ پور کے راٹھور خاندان کے راجہ "رتن سین" بن "جودھاجی" کی اکلوتی بیٹی تھیں اور اودے پور کے سسودیا خاندان میں مہارانا "سانگاجی" کے فرزند ولیعہد راجہ "بھوج راج" کو بیاہی ہوئی تھیں۔

یہ "کنڈکی" نامی گاؤں میں تقریباً ۱۵۰۴ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کی کمسنی ہی میں ان کی محترم ماں کا سایۂ عاطفت انکے سر سے اٹھ گیا۔ جب اس کی اطلاع ان کے سسرال والوں کو ہوئی تو انھوں نے رانی میرابائی کو پرورش کی غرض اور آرام کے خیال سے اپنے پاس بلوالیا۔ اور اُن کے خسر رانا "سانگاجی" نے نہایت شفقت اور محبت کے ساتھ ان کی پرورش کی۔ جب یہ سن بلوغ کو پہنچیں تو راجہ "رتن سین" نے اپنی خواہش سے ۱۵۱۶ء میں ان کی شادی رانا سانگاجی کے بڑے لڑکے راجہ "بھوج راج" (ولیعہد سلطنت) کے ساتھ کردی اور یہ اُسی سال اپنے شوہر کے ساتھ چتوڑ چلی گئیں۔

راجہ "رتن سین" نے اپنے خیال کے بموجب اس مبارک اور خوشگوار تعلق سے ایک ایسی مفید اور کارآمد بات سوچی تھی جس سے بڑھ کر اُن کے لئے اور کیا ہو سکتا تھا۔ یعنی میواڑ کی حکومت (جو اس زمانے میں ایک وسیع اور باافر سلطنت سمجھی جاتی تھی) کے دلیر فرمانروا رانا "سانگاجی" کے بعد اُن کے بڑے لڑکے راجہ "بھوج کی رانی" کہلانا (جس کی اس زمانے میں بہت قدر تھی) لیکن بسا اوقات انسانی تدابیر کے نتائج خلاف توقع واقع ہوا کرتے ہیں۔ اس قانون کے ماتحت یہاں بھی ناکامی ہوئی۔ کیونکہ رانی میرابائی کی قسمت میں تو کچھ اور ہی لکھا تھا۔ یعنی بیوہ ہو کر حکومت سے محرومی۔ اور ناشاد قسمت کے ہاتھوں ساری عمر اضطراب و بیتابی۔!

کمسن رانی کی نگاہ میں شادی اور اس کی دلچسپیاں طفلانہ انبساط سے زیادہ وقیع نہ ثابت ہو سکیں کیونکہ رانی کے شوہر راجہ بھوج راج نے شادی کے کچھ ہی دنوں بعد عزیز رانی اور شفیق باپ دونوں کو داغ مفارقت دیا۔

اس موقعہ پر چاہئے تھا کہ راجہ "بھوج راج" کی تاریخ فوت اور وجہ موت نیز کسی قدر تفصیلی حالات لکھے جاتے

لیکن کیا کیا جائے جبکہ راجہ بھوج راج کی صحیح تاریخ فوت، میواڑ کے محکمہ تاریخ سے بھی ہم کو نہ مل سکی۔

ہم کو نہایت تعجب ہے کہ میواڑ کا محکمہ تاریخ کسقدر نامکمل ہے کہ جس میں ایک ایسے زبردست راجہ کے ولیعہد سلطنت کی تاریخ فوت کا پتہ نہیں چلتا۔ گو اس بارے میں ہم نے بہت کوشش کی لیکن ہم نہایت افسوس کے ساتھ یہ لکھنے پر مجبور ہیں کہ ہم اپنی سعی میں ناکام رہے۔ تاہم اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۱۳ء اور ۱۵۲۳ء کے درمیان یہ امر ناگوار واقع ہوا۔

بہرکیف رنج و غم کی دیوی رانی میرابائی نے سکون و تحمل کے ساتھ اس ناگہانی مصیبت کا خیر مقدم کیا اور دنیادی عیش و آرام کو یک لخت ترک کر کے اپنے مالک کی دی ہوئی نعمت غم کو صبر و شکر کے ساتھ قبول کرتے ہوئے کچھ زیادہ اظہار پریشانی و الم نہ کیا۔

دنیا کی نیرنگی اور زمانہ کے انقلاب نے ناگہانی جواں مرگی کی صورت میں ظاہر ہو کر رانی کے دل کو عالم کی گوناگوں کیفیات اور رنگین احساسات سے بے نیاز اور ان کے جذبہ شوق کو پژمردہ کر دیا۔ رانی کی نگاہ میں دنیا اور اوسکی رنگینیاں افسردگی اور پژمردگی کا پیش خیمہ تھیں۔ مسرتیں اور دلچسپیاں اضطراب و بیتابی کی تمہید! آہستہ آہستہ یہ نیک سیرت اور پاک سرشت بائی انتہائے ضبط غم کی وجہ سے کچھ ایسے لطیف اور پاک جذبات کی حامل ہوگئی جسکا آغاز مسرت والم کے احساس کو انقلاب اور انجام دونوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ رانی کی روحانی فضا اور اس کے ذاتی ماحول کا تعلق اس جگہ سے ہوگیا جہاں دنیا اور اسکی تمام دلفریبیاں۔ آلام اور انس کے ہیبت ناک نظارے سراب کی نمود سے بھی پست نظر آتے ہیں۔ دنیاوی دلچسپیوں سے بے پرواہ ہو کر اس لطیف روح نے اپنا تعلق ایسی ذات سے قائم کر لیا جسکو ہندو خدا کا اوتار سری کرشن جی بھگوان کہتے ہیں۔

میرابائی کو بچپن ہی سے گردھر لال جی کا عشق تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے اس کی تشریح یوں کی ہے کہ ایک مرتبہ میرابائی اپنے ہمسن سکھیوں۔ سہیلیوں کے ساتھ بھولے پن سے کھیل میں مشغول تھیں اور گردھر لال جی کی مورت اُن کے ہاتھ میں تھی اسوقت کھیل کے سوا اُس مجسمہ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اسی اثنا میں انکی سہیلیوں نے انکی ماں سے سوال کیا۔ کہ اے ماں میرابائی کی شادی کہاں ہوگی؟ ان کی ماں نے جواب دیا کہ "ان کی شادی اسی مجسمہ کے ساتھ کی جائیگی"۔ مذاق اور بے پروائی کے ساتھ منہ سے نکلی ہوئی بات رانی میرابائی کے جی کو لگ گئی۔ اور یہ اتفاقی اور معمولی بات رانی کے لئے مخصوصیت کے ساتھ دلچسپی کا سبب بن گئی۔ اسی حکایت کی بنا پر بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ میرابائی نے تمام عمر اپنی شادی نہ کی لیکن غالباً یہ خیال صحیح نہیں ہے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ بہرکیف یہ اکثر ہمہ تن سری کرشن جی کے پاک تصور میں محو رہا کرتی تھیں اور ہمیشہ ان کی مورت سے کھیل کھیل اپنا جی بہلایا کرتی تھیں۔ لیکن انکی عمر کا وہ حصہ، جبکہ یہ دنیا اور اس کی نیرنگیوں کا شکار ہو کر اسکی دلفریبیوں سے کسی قدر برداشتہ خاطر ہو چکی تھیں، اس حیثیت سے زیادہ قابل توجہ ہے۔

سے گردھر لال جی۔ سری کرشن جی کے ناموں میں سے ایک نام ہے جو بروایت اہل ہنود گوردھن پہاڑ کے اُٹھانے کی وجہ سے پڑا۔ یہی بات مورت میں دکھائی گئی ہے کہ بائیں ہاتھ پر اٹھائے بانکی ادا کے ساتھ کھڑے ہیں اور داہنے ہاتھ میں بانسری لئے منہ سے لگائے ہیں۔

بھیانک اور غم خیز زندگی میں رانی کے لئے کرشن جی کا مجسمہ حقیقی سکون و راحت کی تصویر تھا۔ جس کی مفارقت کا تحمل رانی جیسی صابر و شاکر ہستی کے حوصلے سے بالاتر تھا۔ وہ ہر وقت اس مجسّمہ کو اپنے ساتھ رکھتیں۔ تنہائی میں اس سے اس طرح باتیں کرتیں گویا کوئی زندہ تصویر سے مخاطب ہے۔ اُن کی اِس زندگی میں اپنی قسم کی رنگینی پیدا کرنے والا دنیا میں اگر کوئی تھا تو وہ گردھر لال جی کا مجسّمہ تھا اور بس!

طفلی کے رنگین اور دلچسپ دلوں کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ بھی ہے۔ کہ اکثر جب وہ اپنے گھر سے رخصت ہو کر سُسرال جانے کو تیار تھیں۔ مجسمہ سے ان کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ وہ اس کو اپنے گھر پر چھوڑ دینا اور اس کی مفارقت کی تکلیف دہ گھڑیاں گذارنا اپنے لئے دشوار خیال کرتی تھیں۔ لہذا اُن کو اس وقت تک جانے کا لطف نہ مل سکا جب تک کہ وہ اس مجسّمہ کو اپنے ہمراہ لے جانے میں کامیاب نہ ہو سکیں!

جب یہ دنیاوی زندگی میں اپنے شریک زندگی کو کھو چکیں اور ایّام بیوگی کے غم ناک اوقات بسر کرنے لگیں تو ان کا روز و شب کا مشغلہ صرف یہ تھا کہ وہ اس مجسمہ کی پوجا کریں اور زندگی کے کسی لمحہ میں اس پاک مجسّمہ کی پرستش سے غافل نہ ہوں، دل و جان سے زیادہ عزیز رکھنے کے علاوہ کسی وقت اس کو خود سے یا خود کو اس مجسمہ سے علیحدہ نہ ہونے دیتیں ہمیشہ ہرن کی کھال بچھا کر زمین پر آرام کرتیں اور سادگی کے ساتھ مختصر زندگی بسر کرتیں۔

میرا بائی کے لئے ان کا بیوہ ہونا اور دنیائی نعمت یعنی ان کے شوہر کا داغ مفارقت دینا گویا مصائب و آلام کے دروازوں کا کھل جانا ہوا اور انکی بیوگی کے ساتھ ہی اُن کے خاندان اور رہی سہی شاہانہ شان و شوکت کی بربادی کا پیام آگیا جسکا اجمالی تذکرہ حسب ذیل ہے

اوّلاً تو "مہارانا سانگاجی" نے ۱۵۲۳ء میں "بابر بادشاہ" کے مقابلے میں "پانی پت" کے مقام پر شکست کھائی اور اس جنگ عظیم میں رانی کے باپ راجہ "رتن سین" اور کاکا (چچا) راجہ "رائے مل جی" کام آئے جو "رانا سانگا" کی مدد کے لئے جودھ پور کے "راؤ گنگاجی" کی طرف سے گئے تھے۔ دوسرے سال رانا سانگا جب پھر فوج لیکر لڑنے جاتے تھے تو مقام "ایرج" ضلع بندیلکھنڈ عملداری بابر بادشاہ میں بیمار ہو کر مر گئے

اس طرح رانی میرا بائی چند ہی سال میں نہ صرف اپنی محترم ماں کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوئیں بلکہ شریک زندگی (ولیعہد سلطنت) راجہ "بھوج راج" اور باپ راجہ "رتن سین" اور چچا "راجہ رائے مل جی" اور خسر "رانا سانگاجی" جیسی مایۂ ناز ہستیوں کی شفقت و عنایت سے محروم ہو گئیں

اگر فلک کی گردش اور زمانہ کے ہاتھوں ستائی ہوئی رانی کے مصائب سرپرستوں اور عزیزوں کی اموات ہی تک محدود رہتے۔ اور مستقبل قریب میں کسی قدر سہولت و سکون میسّر آ سکتا تو بھی کسی نہ کسی طرح اس کے غمگین دل کو صبر و قرار آجاتا۔ لیکن قدرت کی مصلحت تو یہ تھی کہ "صنف نازک کا یہ شاہی فرد" کبھی دنیا کی اس کیفیت کا حامل نہ ہو سکے۔ جس کو

اہل عالم مسرت و انبساط سے تعبیر کرتے ہیں۔ مصیبت زدہ رانی کے زخم دل ابھی ہرے تھے کہ دنیا کی نیرنگی نے ایک ادر چرکہ دیا اور غم خیز بھولے ہوئے فسانہ کو پھر نئے سرسے پیش کیا یعنی رانی کے شوہر راجہ "بھوج راج" کے تین بھائی اور تھے۔ "رتن سین" "وکرم جی" "اودے سنگھ" ان تینوں بھائیوں میں سے دو بھائیوں نے حکمراں زندگی بسر کی

پہلا "رتن سین" ہے جو چیتوڑ کا مالک ہوا اور ۱۵۲۰ء میں تخت حکومت پر متمکن ہوا اور دوسرا "وکرماجیت" ہے جو قلعہ "رنتھنبور" کا مالک ہوا۔ ان دو راجکماروں کے تخت حکومت پر قابض ہونے اور تیسرے کے محروم رہنے میں کیا کیا آفتیں پیش آئیں اور کیسے کیسے جھگڑے درپیش ہوئے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں

جس زمانہ میں رانا سانگاجی کی حکومت کے حصے ہو رہے تھے اسی پرآشوب زمانے میں راجہ رتن سین "اور بوندی کے راجہ "سورج مل" سے جو "وکرماجیت" اور "اودے سنگھ" کے ماموں تھے بگاڑ ہو گیا۔ اور بالآخر اس اختلاف نے بڑھ کر جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ رانا "رتن سین" نے شکار کے بہانہ بوندی کے راجہ پر حملہ کر دیا۔ اور راج بوندی کے سرحد پر ۱۵۳۱ء میں ہنگامۂ کارزار گرم ہوا۔ راجہ "رتن سین" کے فوجی افسروں نے راجہ کو عین وقت پر دھوکا دیا جسکی وجہ سے راجہ کو لڑائی میں پوری ناکامی ہوئی اور بہادر راجہ لڑتے ہوئے میدان جنگ میں کام آیا اور اس طرح رانی "میرابائی" اپنے شوہر کے حقیقی بھائی راجہ "رتن سین" کے لطف و مدارات سے بھی محروم ہو کر رہ گئی!!

غدار سرداروں نے راجہ جی کو دغا فریب دے کر اپنا راستہ لیا اور سیدھے "رنتھنبور" گئے وہاں سے "وکرماجیت جی" کو لاکر "چیتوڑ" کے تخت حکومت پر بٹھا دیا

اس طرح رانی کا تعلق زندگی رانا "وکرماجیت" سے وابستہ ہو گیا۔ راجہ "وکرماجیت" نے "رانی میرابائی" کو بہت تکلیف دی اور ان کو طرح طرح کی اذیتیں پہونچائیں جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ رانی کی ریاضت۔ عبادت نفس کشی فقیرانہ زندگی (جس کی رانی خوگر ہو چکی تھی) راجہ کو قطعی ناپسند تھی۔ رانی (جو ایک نیک ذات اور صوفی منش ہستی تھی) کے اخلاق اور اطوار کی شہرت سن سن کر اکثر بڑے بڑے سادھو اور مہاتما لوگ ان کے پاس آتے تھے اور یہ بات راجہ "وکرماجیت" کو قطعی ناپسند تھی وہ بدنامی کے خیال سے ڈرتے تھے۔ اور ان لوگوں کی آمد و رفت روکنے کے لئے "میرابائی" پر بہت سختی کرتے تھے یا ممکن ہے کہ رانی کی ایذارسانی میں جس کو راجہ ہر طرح جائز رکھتے تھے ان کی کوئی سیاسی غرض پوشیدہ رہی ہو اور ان کا دلی مقصد اس بظاہر معقول صورت میں پورا ہوتا رہا ہو۔ بہرکیف اگر رانا کو رانی کا وجود اور انکا شاہی محل میں قیام (خواہ کسی وجہ کی بنا پر کیوں نہو) ناگوار تھا تو رانی کو بھی رانا کا یہ فعل دل و جان سے ناپسند اور سخت تکلیف دہ جسکا اظہار خود رانی نے کئی بھجنوں میں کیا ہے

بالآخر جب رانا کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی اور وہ رانی کو طرح طرح کی تکلیفیں پہونچا کر بھی اس کی جانب سے مطمئن نہ ہو سکا اور اسے اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ رانی میرا کہنا نہ مانے گی تو سادھوؤں اور مہاتماؤں کی آمد و رفت (جو رانا کی بدنامی کا سبب یا رانی کی طاقت زیادہ ہو جانے کی ذریعہ تھی) بند کرنے کی ایک نئی ترکیب سوچی اور اپنے ایک مصاحب کی صلاح سے جو

"بیجاورگ" ذات کا مہاجن تھا میرا بائی کی ہلاکت کی تجویز کی۔ پہلے پھولوں کی ٹوکریوں میں سانپ بچھو چھپا چھپا کر بھیجے۔ لیکن جب اس طرح کامیابی نہ ہو سکی تو ایک پیالہ "زہر ہلاہل" کا تیار کرکے اسی مہاجن کو دیا اور کہا کہ جاؤ اور بھاؤ ج صاحبہ کو کسی معقول بہانے سے پلا آؤ۔ کمبخت مہاجن نے رانی کی ڈیوڑھی پر جاکر کہلا بھیجا کہ تبرکاً عقیدتمندی کا جام راجہ صاحب نے آپ کی خدمت مبارک میں بطور ہدیہ کے پیش کیا ہے۔ اذیت و تکلیف دینے والے "دیور" کی طرف سے یہ عنایت و مہربانی دیکھ کر بھی بھولی بھالی رانی مکروفریب کو نہ محسوس کر سکی اور مسرور ہوکر اس کے ہاتھ سے وہ جام زہر لے لیا اور خوشی خوشی پی گئیں۔ بالآخر اس نیک سیرت رانی نے اس طرح اپنے غم و الم کا خاتمہ کردیا

لیکن بعض خوش اعتقاد تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ مقدس رانی پر زہر کا کوئی اثر نہیں ہوسکا لیکن ہر وقت کی بیجا زیادتیوں کی وجہ سے تنگ آکر وہ میرٹھ کے راجہ راؤ بیرم جی کے یہاں جو اُن کے اپنے کاکا (چچا) تھے چلی گئیں

رانی نے بقیہ ایام زندگی میرٹھ ہی میں بسر کئے۔ راجہ "ویرم جی" اور ان کے کنور "جیمل جی" ان کی بہت خاطر کرتے تھے وہ جس محل میں رات کو گردھر لال جی کے مجسمے کے سامنے گایا بجایا کرتی تھیں اور کبھی کبھی دفور جوش محبت میں ناچا بھی کرتی تھیں وہ اب تک موجود ہے اور "چتربھوج جی" کے مندر میں شامل ہے اور گردھر لال جی کی وہ مورت بھی اسی مندر میں اب تک موجود ہے۔ اور حفاظت سے ہے

رانی کی ساری زندگی کا یہ حصہ کسیقدر غنیمت گذرا ہے۔ کچھ دنوں تو ان کو میرٹھ میں کسی قسم کی تکلیف نہ تھی لیکن آخرکار سادھوؤں اور جوگیوں کی آمد و رفت کی دیکھ بھال ہونے لگی اور وہ بالکل اسی حالت کو پہونچ گئی جو چتوڑ میں تھی۔ اور یہ امر رانی کے لئے ایک بڑی مصیبت تھا جسکو وہ بالکل نہیں پسند کرتی تھیں۔ ۱۵۳۸ء سے لیکر ۱۵۶۱ء تک کا زمانہ میرٹھ کے لئے مصائب و آلام کا زمانہ کہا جاسکتا ہے اور یہی وہ وقت تھا کہ جب میرا بائی چتوڑ چھوڑ کر میرٹھ آئی تھیں۔ نہیں معلوم کہ جیمل جی کے میرٹھ چھوڑنے پر میرا بائی پر کیا گزری اور وہ کہاں رہیں نیز ان کے ایام حیات کس فضا میں اور کیسے گذرے۔!

"بھگت مال" کے مصنف "دنابھ جی" میرا بائی کے ہمعصر تھے اگر وہ صحیح صحیح حال لکھنا چاہتے تو ضرور لکھ سکتے تھے۔ اور یقیناً وہ قابل اعتبار ہوتا اور اس سے ضرور رانی کے بود و باش اور ریاضت و عبادت نیز دیگر خارجی و داخلی امور کی (جو رانی سے متعلق ہو سکتے تھے) پوری تشریح و توضیح سمجھ میں آتی لیکن نامعلوم اسباب کی بنا پر ایسا نہ ہوسکا۔ میرا بائی کا انجام تاریخی حیثیت سے تو کچھ معلوم نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی زندگی کے تمام پہلو اچھی طرح واضح ہوتے ہیں۔ لیکن بھگت اور سادھوؤں کی زبانی جو معلوم ہو سکا ہے وہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے

۱؎ گذشتہ سال الہ آباد میں ماگھ میلے کے اجتماع کے موقع پر ایک بہت مقدس اور پاک ذات فقیر صاحب کی ملاقات نے بھی اس روایت کی تاکید کی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ جلیل

کہا جاتا ہے کہ وہ "دوارکا جی" میں زیارت کے لئے تشریف لے گئی تھیں وہاں ایک روز برہمنوں کی پکٹنگ (دھرنا) پر جو رانا جی نے ان کو واپس لانے کی غرض سے قائم کی تھی یہ پد (شعر) گایا۔

मीरा के प्रभु गिरधर नागर मिल बिछुड़न कीजे ॥

اور رن چھوڑ جی کے مجسمہ میں سما گئیں۔ اس سے یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ ان کی موت دوارکا میں واقع ہوئی بعض تذکرہ نویسوں نے ان کی تاریخ فوت سنہ ۱۵۴۲ء لکھی ہے۔

"کرنل ڈاٹ صاحب" نے اپنی تاریخ "ڈاٹ راجستان" میں رانی میرا بائی کو رانا کنبھا کی رانی لکھا ہے اور اسی خیال کے ماتحت "دابو کارتک پرشاد" نے بھی سوانح عمری میں میرا بائی کو رانا کنبھا کی بیوی لکھا ہے لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے کیونکہ رانا کنبھا راجہ بھوج راج کے پردادا تھے اور میرا بائی کی پیدائش تقریباً سنہ ۱۵۰۰ء میں ہوئی تھی

رانا کنبھا میرا بائی کی پیدائش سے تقریباً پچیس یا تیس سال قبل فوت ہو چکے تھے۔ لہذا دونوں (رانا کنبھا اور رانی میرا بائی) کے ہمعصر ہونے میں کافی تامل ہے اور یہ یقین کرنا چنداں دشوار نہیں ہے کہ رانی میرا بائی رانا کنبھا کی بیوی نہیں ہے

"مارگریٹ میکنیکل" مصنف "ومین پوئٹس آف انڈیا" (Women poets of India) نے اپنی کتاب "ہندوستان کی عورتوں کی شاعری" میں لکھا ہے کہ۔

"مہا[۲] رانا کنبھا کے دو لڑکے تھے اور اُس کے دوسرے لڑکے اودیکرن نے راجہ کو زہر دیکر خود تخت پر قبضہ کیا

اور اودیکرن نے میرا بائی کو بہت تکلیف دی جس کی وجہ سے اس کو (رانی کو) چتوڑ چھوڑ دینا پڑا"

مندرجۂ بالا خیال کے بموجب کرنل ڈاٹ صاحب کی تقریر کی تائید ہوتی ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے میرا بائی رانا کنبھا کی بیوی ہو اور رانا کو زہر دینے کے بعد راجہ "اودیکرن بن راجہ کنبھا" نے اپنی ماں کو تکلیف دی ہو یہاں یہ نتیجہ نکالنا غالباً غلط نہ ہوگا۔ کہ شاید اودیکرن، رانی کا حقیقی بیٹا نہ ہو بلکہ سوتیلا بیٹا ہوگا۔ ورنہ تکلیف کیوں دیتا۔ لیکن کرنل ڈاٹ کا خیال جس کی تردید اوپر کیجا چکی کم ز کم ازادر بالکل غلط معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح مارگریٹ میکنیکل نے جو بات لکھی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے تحقیق نہیں کی اور بہت ممکن ہے کہ کرنل صاحب کی کتاب "ڈاٹ راجستان" سے اخذ کیا ہو یا کرنل صاحب نے خود اخذ کیا ہو

کیونکہ رانا کنبھا کا راجہ بھوج راج کا پردادا ہونا اور رانا سانگا و رتن سین کا ہمعصر ہونا تاریخی حیثیت سے مستند ہے۔ پھر رانی کی تاریخ پیدائش سنہ ۱۵۰۰ء کے قریب ہو۔ راجہ بھوج راج کی تاریخ فوت۔ رانا رتن سین کا جنگ میں کام آنا۔ رانی میرا بائی کا رتن سین کی بیٹی ہونا یہ سب ایسی باتیں ہیں جس سے یہی اور صرف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ رانی میرا بائی راجہ کنبھا کی بیوی نہیں ہے اور کرنل ڈاٹ و مارگریٹ میکنیکل کو سہو ہوا ہے۔

---

[۱] میرا کے ناٹک، دگر دھر لال جی، کرشن جی ملاقات کا شرف عطا فرنا، مفارقت اور جدائی کی تکلیف نہ دیجئے۔

[۲] " " کے اندر کی عبارت رسالہ "زمانہ" (مضمون جناب اختر عابدی صاحب مدیر "فسانہ") سے لی گئی ہے

پنڈت "گوپی شنکر جی" کا خیال ہے کہ چتوڑ کے قلعہ پر "کنبھ شام جی" کا مندر کنبھارانا کا بنوایا ہوا ہے۔ اسی مندر کے پاس ایک مندر اور ہے۔ جسکو لوگ میرابائی کا بنوایا ہوا بتاتے ہیں۔ ان دونوں مندروں کے پاس پاس ہونے سے یہ شبہ ہوتا ہے اور لوگ ایسا خیال کرتے ہیں کہ شاید رانا کنبھا، رانی میرابائی کا شوہر ہو لیکن یہ دھوکا ہے۔ اور صاحب نظر کیلئے یہ بات زیادہ وقیع نہیں

شاعرانہ تعارف | میرابائی کا نام ہندوستان میں اور ہندی شاعری میں خصوصاً بہت نمایاں حیثیت رکھتا ہے ان کے تصنیف کردہ بھجن جابجا گائے جاتے ہیں اور زبان زد خاص و عام ہیں۔ گو ان کے بھجنوں میں مہاتماؤں اور سادھوؤں نے تحریف کی ہے لیکن ان کی شاعری کی ہر حد بہت ممتاز ہے اور ایک مبصر کی نگاہ میں ان کے کلام کا امتیاز چنداں دشوار نہیں انکی شاعری جتنی مشہور ہے اسی قدر کمیاب اور قیمتی ہے۔ سخن شناس اور دُوررس نگاہیں ان کے بھجنوں کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کرسکتیں اور ہندی زبان اپنی اس قیمتی بضاعت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

ساری عمر مصیبت و تکلیف میں بسر کرنے کی وجہ سے کلام میں درد انگیز جذبات کا طوفان موجیں مار رہا ہے۔ ایک ایک دوہے کو برابر پڑھتے جائیے تو معلوم ہوگا گویا خود سرتاپا الم ہوے جارہے ہیں۔ محبت کی ہلکی چاشنی اور ہندی بھاشا کے نرم و شیریں الفاظ پھر لطیف و پاک جذبات کے ساتھ رنج والم کا خاکہ کلام میں چار چاند لگا دیتا ہے اور یہی جی چاہتا ہے کہ پڑھتے رہئے۔

ذیل میں دیئے ہوے چند اشعار اپنی مجموعی حیثیت سے الگ الگ لکھے جاتے ہیں جس سے ان کی دردناک اور غم خیز زندگی کا تاریک اور بھیانک پہلو کسی قدر روشن ہو سکے گا۔ اور واضح ہو سکے گا کہ انکی زندگی کا بیش بہا مشغلہ کیا رہا ہے۔ کرشن جی کی محبت کا نشہ رگ و پے میں اس طرح سرایت کر گیا ہے کہ شاعری یکسر محبت اور قطعی الفت کا درد انگیز نغمہ معلوم ہوتی ہے۔ ناظرین کی سہولت اور آسانی کا لحاظ کرتے ہوئے نظموں کو ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں لکھ دیا گیا ہے اور تمام ایسے لفظوں کی معمولی تشریح کر دیگئی ہے جو کسی قدر غیر مانوس سمجھے گئے ہیں یقین ہے کہ ذیل کی کاوش مجموعی حیثیت سے کسیقدر دلچسپی کا سبب ہو سکے گی۔

شاعری | ہم کلام کی لفظی خوبیاں اور ادبی نکات کی تشریح کی جانب اہل زبان کو توجہ مبذول کرنے کی دعوت دیتے ہوے ترجمہ سے قبل ادب اور سنجیدگی سے اتنا عرض کرنے کی جرات کرتے ہیں کہ۔ اصل اور ترجمہ میں زبان اور غیر زبان کے علاوہ اگر جو کمی رہ جاتی ہے وہ خیالات کی صحیح ترجمانی اور چست و برجستہ لفظوں کا برمحل صرف ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک لفظ کے برمحل صرف نے شعر کو شعر بنادیا ہے اور مترجم اس کے مقابلے میں اپنی زبان کا لفظ نہیں لا سکا جسکی وجہ سے ترجمہ کی خصوصیت زائل ہو گئی ہے ہم ان امور کا لحاظ رکھتے ہوے کوشش کریں گے کہ حتی الوسع اس اہم ذمہ داری سے صحیح طور پر سبکدوش ہو سکیں۔

(۱)

اخلاقی عیوب اور دنیاوی مصروفیتوں کو ترک کرنے۔ بُری صحبت سے احتراز اور نیک صحبت کے اختیار کرنے کی ترغیب دلاتے ہوئے نغمہ کی بلند آہنگی اور دلپسند ترنم کے ساتھ۔ خدا کی معرفت اور اس کی جانب مشغولیت پیدا کرنے کی تبلیغ کیسے نرم و شیریں الفاظ میں کی ہے۔ کہتی ہیں کہ

رام نام رس پی جے منواں رام نام رس پی جے	राम नाम रस पीजे मनुआँ राम नाम रस पीजे
تج کوسنگ بیٹھ ست ہر چرچا سن لی جے	तज कुसंग सतसंग बैठि नित हरि चर्चा सुन लीजे
کام ۔ کرودھ ۔ مد ۔ لوبھ ۔ موہ ۔ کون چت سے بہائے دی جے	काम क्रोध मद लोभ मोह कूँ चित से बहाय दीजे
میرا کے پربھو گردھر ناگر تاہی کے رنگ میں بھیجے	मीरा के प्रभु गिरधर नागर ताहि के रंग में भीजे
رام نام رس پی جے منواں رام نام رس پی جے	राम नाम रस पीजे मनुआँ राम नाम रस पीजे

منواں ۔ دل ۔ من ۔ تج دینا ۔ ترک کر دینا ۔ کوسنگ ۔ بری صحبت ۔ ست سنگ ۔ اچھی صحبت ۔ ہری ۔ خدا ۔ کام ۔ دنیاوی مشاغل ۔ کرودھ ۔ غصہ ۔ مد ۔ گھمنڈ ۔ لوبھ ۔ لالچ ۔ موہ ۔ دنیاوی محبت ۔ گردھر ناگر ۔ سری کرشن جی کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔

میرے پیارے دل غصہ ۔ گھمنڈ ۔ لالچ ۔ اور دنیاوی مشغولیت کو (جن سے کہ روحانیت مجروح ہوتی ہے) ترک کردے ۔ اور بری صحبت سے احتراز کرکے نیک و پاک لوگوں کی صحبت اختیار کرنا کہ تو ان سے خدائے پاک کا پاک تذکرہ سن سکے ۔ تجھ کو لازم ہے کہ تو خدا کی محبت کی شراب پی یعنی خدا کی معرفت حاصل کر۔

(۲)

ذیل کی نظم کیفیات ہجر و انتظار کی مکمل تصویر ہے ۔ ترنم اور زبان کی شیرینی تو ایک طرف ۔ تخئیل اور جذبات کی بلندی ۔ اظہار حالت اور عنوان استدعا پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا ۔ کہ گویا محبت کا فرشتہ درد و الم کا ساز بجا رہا ہے اور محبت کے شیریں نغمے گا رہا ہے

مطلوب طالب کی زندگی اور اس کے ایام حیات کی دلچسپ کڑی ہے ۔ وہی سرمایۂ راحت ہے اور اسی کے بدولت ساری دلچسپیوں اور تمام رنگینیوں کا ثبات ہے ۔ مطلوب کی دید سے محروم طالب کی نگاہ میں ساری دلچسپیاں اور تمام رنگینیاں بھیانک اور اضطراب زا ہو جاتی ہیں ۔ اسی کلیہ کے ماتحت غم نصیب میرا بائی کرشن جی کی مفارقت اور اپنی حالت کا خاکہ دلفریب اور ترنم آفریں سچی شاعری میں پیش کرتی ہیں کہ

گھڑی ایک نہیں آوڑی تم درسن بن موئے	घड़ी एक नहीं आवड़ी तुम दरसण बिन मोय
تم ہو میرے پران جی کاسوں جیون ہوئے	तुम हो मेरे प्राण जी कासूँ जीवण होय
دھان نہ بھاوے نیند نہ آوے برہ ستاوے موئے	धान न भावे नींद न आवे बिरह सतावे मोय
گھائل سی گھومت پھروں رے مرا درد نہ جانے کوئے	घायल सी घूमत फिरूँ रे मेरा दरद न जाने कोय
دیوس تو کھائے گمایو رے رین گمایو سوئے	दिवस तो खाय गमायो रे रैण गमाई सोय
پران گمایو جھورتاں رے نین گمایو روئے	प्राण गमायो झूरतां रे नैण गमायो रोय
جو میں ایسا جانتی رے پریت کئے دکھ ہوئے	जो मैं ऐसा जाणती रे प्रीत किये दुःख होय
نگر ڈھنڈھورا پھیرتی رے پریت کرو مت کوئے	नगर ढँढोरा फेरती रे प्रीत करो मत कोय
پنتھ نہاروں ڈگر بہاروں اوبی مارگ جوئے	पंथ निहारूँ डगर बुहारूँ ऊबी मारग जोय

मीरा के प्रभु कब रे मिलोगे तुम मिलयाँ सुख होय
घडी एक नहीं आवनी तुम दरसण बिन मोय
तुमही मेरे प्राणजी का सँजीवण होय

میرا کے پربھو اب رے ملوگے تم ملیاں سکھ ہوئے
گھڑی ایک نہیں آؤنی تم درسن بن موئے
تم ہو میرے پران جی کا سوں جیون ہوئے

درشن - دیدار - زیارت - پران - جان - دھان - تصور - برہ - مفارقت - گھائل - بسمل - زخمی - دیوس - دن - رین بہات - جھوشتان - افسردگی - مرجھانا - نین - آنکھ - گمایو - گنوا دینا - گذار دینا - پڑنیہ - محبت - پنتھ - راستہ - نہارنا - دیکھنا ڈگر - ڈگرا - راہ - بہارنا - صاف کرنا - ادبی - پریشان ہونا - اوبنا - مارگ - راستہ - آو نڑے - سانا -

اے میرے آقا (کرشن جی) تمھاری روح افزا دید سے محروم ہوکر مجھے میری زندگی کا کوئی لمحہ خوشگوار نہیں معلوم ہوتا - تم ہی میری روح اور میرے سرمایۂ راحت ہو تو کیسے ممکن ہے کہ میں تمھارے بغیر زندہ رہ سکوں -

تمھاری محبت کیش خادمہ تمھاری مفارقت کی وجہ سے مضطرب ہے - محبت کی ماری دیدار کی پیاسی (میرا) کو محض تصور سے کیا سکون حاصل ہوسکتا ہے - میرے (!!) محبت کی خلش مجھ نیم بسمل کو ایک جگہ قرار نہیں دیتی - تمھارے سوا میرے اس درد سے کون آگاہ ہوسکتا ہے - مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے دن دنیاوی آلودگی میں ضائع کردئے میرے مالک میری روح تمھاری مفارقت اور جدائی کے غم میں افسردہ ہے اور میری آنکھیں غم ہجر میں روتے روتے ضائع ہوا چاہتی ہیں - کاش مجھے پہلے سے علم ہوتا کہ محبت (جسکا آغاز غیر اختیاری اور بظاہر بہت آسان و پُرلطف ہوتا ہے) میں ایسی تکلیف ہوتی ہے - تو (میں خود اس سے احتراز کرتی) میں یقیناً تمام دنیا والوں کو آگاہ کردیتی کہ دیکھو کبھی کوئی کسی کی محبت میں مبتلا نہ ہو - (کیونکہ اسکی ابتدا پُرلطف اور انتہا مصیبت کی انتہا ہے) اے مالک (کرشن جی) تمھاری محبت اور تمھارے انتظار میں میرا روز و شب کا یہ مشغلہ ہے کہ میں تمھاری راہ تاکا کرتی ہوں اور آنے کی امید میں راستہ صاف کیا کرتی ہوں (کہ میرا شیام ادھر سے آئیگا) پھر بیتاب ہوکر تمھاری منتظر ہوتی ہوں اور ادھر ادھر دیکھا کرتی ہوں - میرا کے مالک کرشن جی کاش تم مطلع کرتے کہ کب ملوگے کیونکہ تمھارے ملنے سے اور صرف ملنے کی امید سے مجھ حقیر کو حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے -

فراق و انتظار کی کشمکش سے گھبراکر ایک مہجور عاشق جس متانت و ادب کے ساتھ محبوب کو اس کے حقوق یاد دلاتا ہے اور باوجود انتہائے اضطراب کے جس انکسار و عجز کے ساتھ مطلوب کو ایفائے وعدہ کی ترغیب دلاتا اور اپنی بیجی اور غم خیز حالت کو درد ناک الفاظ میں ظاہر کرتا ہے - میرا بائی اپنی حیثیت سے اس کیفیت کا بالکل سچا اور صحیح خاکہ لفظوں میں پیش کرتی ہیں اور اپنے خاص انداز میں فرماتی ہیں کہ

पिया इतनी बिनती मोरी कोई कहियेरे जाय
और न सूँ रस बतियाँ करत हो हमसे रहे चित चुराय

پیا اتنی بنتی سن موری کوئی کہیو رے جائے
اورن سوں رس بتیاں کرت ہو ہمسے رہے چت چرائے

تم بن میرے اور نہ کوئی میں سرنان گت توری
آون کہہ گیو آج نہ آیو دیوس رہے اب تھوڑی
میرا کے پربھو کب رے ملوگے ارج (عرض) کروں کر جوری
پیا اتنی بنتی سن موری کوئی کہیو رے جائے
اورن سے رس بتیاں کرت ہو ہم سے رہے چت چرائے

तुम बिन मेरे और न कोई मैं सरणागत तेरी
आवण कह गये अजहूँ न आये दिवस रहे अब थोरी
मीरा के प्रभु कब रे मिलोगे अरज करूँ कर जोरी
पिया इतनी बिनती सुन मोरी कोई कहियो रे जाय
औरन सूँ रस बतियाँ करत हो हम से रहे चित चुराय

بنتی۔ منت سماجت۔ اورن۔ اور لوگوں سے۔ دوسروں سے۔ رس بتیاں۔ رسیلی باتیں۔ پُر لطف گفتگو۔ سرنان گت۔ بس میں ہونا۔ قربان ہونا۔ کر۔ ہاتھ

کیا کوئی ایسا ہے جو میرے آقا (کرشن جی) کی خدمت میں میری یہ منت و سماجت سے بھری ہوئی استدعا پیش کرے کہ اے میرے مالک آپ غیروں سے (لطف و مدارات کے ساتھ پیش آتے ہیں) پُر لطف گفتگو کرتے ہیں۔ اور مجھ جیسی محبت کیش کو (جس کا آپ کے سوا اور کوئی پُرسان نہیں ہے اور جو بالکل آپ کے بس میں ہے لو) محروم کر رکھا ہے۔ میرے "پیا" آپ نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور وہ وعدہ آج بھی نہ پورا ہو سکا۔ آپ کی "داسی" میرا آپ کی خدمت میں عاجزی و ادب کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر عرض کرتی ہے کہ اے میرا کے مالک آپ کب ملیں گے اور کب شرف دیدار سے عزت افزائی فرمائیں گے کیونکہ میرے ایام حیات بہت کم رہ گئے ہیں۔

ایک پاکیزہ ہستی مقدس وجود کے سامنے سرتاپا عجز و نیاز بنکر پیش ہوتی ہے۔ فراق کی تکلیف۔ انتظار کی بے چینی۔ نفسانی خواہشات۔ دنیا کی بے ثباتی اور اہل عالم کے ظاہری اور تصنع آمیز تعلقات سے متاثر ہو کر دنیا کی تمام دلفریبیوں کو خیرباد کہنا چاہتی ہے اور انتہائے اضطراب میں میرا بائی کی زبان میں اس طرح پکار اٹھتی ہے کہ

مہاں رو جنم مرن کے ساتھی
تھاں نے نہیں بسروں دن راتی
تم دکھیاں بن کل نہ پڑت ہے جانت میری چھاتی
اونچی چڑھ چڑھ پنتھ نہاروں روے روے انکھیاں راتی
یو سنسار سکل جگ جھوٹو جھوٹھا کل را ناتی
دوؤ کر جوڑیاں (عرض) ارج کرت ہوں سن لیجئے موری باتی
یو من میرو بڑو حرامی جیوں مدماتو ہاتھی
ست گرو دست دھریو سر اوپر آنکس دے سمجھاتی
میرا کے پربھو گردھر ناگر ہری چرنان چت راتی

म्हारो जन्म मरन के साथी
थाँ ने नाहिं बिसरूँ दिन राती
तुम देख्याँ बिन कल न पड़त है जानत मेरी छाती
ऊँची चढ़ चढ़ पंथ निहारूँ रोय रोय अँखियाँ राती
यो संसार सकल जग झूठो झूठा कुलरा नाती
दोउ कर जोड़ियाँ अरज करत हूँ सुण लीज्यो मेरी बाती
यो मन मेरो बड़ो हरामी ज्यूँ मद मातो हाथी
सत गुरु दस्त धर्यो सिर ऊपर आँकुस दे समझाती
मीरा के प्रभु गिरधर नागर हरि चरणाँ चित राती

پل پل تیرا روپ نہاروں نرکھ نرکھ سکھ پاتی
مہاں رو جنم مرن کے ساتھی
تھاں نے نہیں بسروں دن راتی

पल पल मेरा रूप निहारूँ निरख निरख सुख पाती
म्हारी जन्म मरन के साथी
थाँने नहिं बिसरूँ दिन राती

مہاں رو - ہمارے - جنم - زندگی - مرن - موت - تھاں نے - تمکو - بسروں - بھولوں - پنتھ - راستہ - راتی - لال - سرخ - سنسار دنیا - را - کا - ناتی - تعلق - ست گرو - سچا پیر - چرناں - قدم - راتی - لگی ہوئی - نرکھ نرکھ - دیکھ دیکھ -

اے سری کرشن جی آپ ہماری موت وحیات کے ساتھ ہیں - میں آپ کو دن رات کسی وقت اسوتے جاگتے نہیں بھول سکتی - آپ کی دید کے بغیر مجھے ایک گھڑی چین نہیں آتا - اور آپکی مفارقت کی اس کیفیت کو میرا دل ہی جانتا ہے - میں اونچے اونچے مقام پر چڑھ چڑھ کر آپ کی راہ دیکھا کرتی ہوں اور آپ کی مفارقت میں رو رو کر اپنی آنکھیں لال کیا کرتی ہوں - یہ دنیا اور اس کے سارے تعلقات فانی اور باطل ہیں - میں ادب سے دونوں ہاتھ جوڑ کر عرض کرتی ہوں کہ آپ توجہ سے میری گذارش سن لیجئے کہ میرا یہ نفس سرکش مغرور ومست ہاتھی کی طرح میرے قابو سے باہر ہے - میں اپنے روحانی پیشوا (کرشن جی) کی ہدایتوں اور پاک تعلیم کا آنکس اس نفس سرکش کو لگا لگا کر راہ راست پر لانے کی کوشش کرتی ہوں میں چاہتی ہوں کہ ہمیشہ آپ کے قدموں سے لگی رہوں - اور گھڑی گھڑی آپ کے جلوۂ دیدار سے مستفیض ہوتی رہوں - کیونکہ مجھے اس طرح حقیقی مسرت نصیب ہوتی ہے

کلام پر تبصرہ | مندرجہ بالا نظموں سے جو نمونتہً پیش کی گئی ہیں اندازہ ہو سکتا ہے کہ "میرا بائی"، کس پایہ کی شاعرہ ہیں اور وہ اپنی شاعرانہ ذمہ داریوں سے کہاں تک کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتی ہیں جس جس عنوان سے انھوں نے اپنی ذاتی فضا کا دلچسپ خاکہ کھینچا ہے اور جس جس پیرایہ میں اخلاقی صفات - دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ پیش کیا ہے - اہل نظر پر مخفی نہیں ہے - حرص - کینہ - غرور کے نقصانات - نیک صحبت کی ترغیب - خدا اور اس کی معرفت کی تعلیم - مادی مشغولیت اور روحانی غفلت کے نتائج - کرشن جی کی مدح - اور اس پاک ذات سے سچی محبت کا اظہار ملنے کی تمنا - دیدار کا شوق - غم دوری کی شکایت زندگی سے بیزاری - فراق کی بیتابی - انتظار کی کیفیت اور حرماں نصیبی کا شکوہ جس زبان اور جس ادب ومتانت کے ساتھ کیا ہے کہ اسکی داد جس قدر دیجائے کم ہے سچی اور مستقل محبت طالب کے جذبات میں ایک ہنگامہ زا کیفیت پیدا کرتی رہتی ہے اور رشک محبت - بدگمانی - شوق دیدار جیسے اثرات مرتب کرتی رہتی ہے

میرا بائی پر کرشن جی کی محبت کا غلبہ تھا - لہذا لوازمات محبت وکیفیات الفت جنکا طاری ہونا یقینی اور ضروری ہے - ان پر بھی طاری ہوئے - ایسے لطیف وپاکیزہ جذبات کے اثرات کی تشریح جس نرم وشیریں زبان میں کی ہے اور جس لطیف اور نازک انداز پر اپنی شاعری کا رخ قائم کیا ہے - وہ محتاج بیان نہیں نظموں کا مطالعہ کیجئے اور دلچسپی کے ساتھ اندازہ کیجئے کہ ایفائے وعدہ کی استدعا اور دیدار سے شرف اندوز فرمانے کی آرزو - اپنی بے تابی اور انتہائے محبت کا اظہار کیسے پُرلطف طریقوں سے کیا ہے

اُن کی سچی اور مبالغہ سے پاک شاعری - ان کی بھیانک اور سراپا الم زندگی کا لازمی نتیجہ ہے درد انگیز جذبات نے کلام کو اثر سے

اور ہندی زبان کے نرم شیریں لفظوں نے ترنم سے لبریز کر دیا ہے

نغمہ کی زبان سے (جو مسرت وانبساط کی روح ہے) غم خیز جذبات (جو محبت کا انجام ہے) کا اظہار ایک ایسے اضطراب مسرت زا، کا پیش کرنا ہے - جس کو صرف محبت کے کان سن سکتے ہیں اور جس پر صرف الفت کے مارے سر دھنتے ہیں

ان کو سری کرشن جی سے عقیدت تھی یا جیسا کہ ہم اوپر بتلا آئے ہیں ان کو اُن کا عشق تھا - بہرکیف آپ نے دی ہوئی نظموں کے ترجمہ میں خاص طور سے اس بات کا لحاظ کیا ہوگا کہ کس کس انداز سے کرشن جی کو مخاطب کرتی ہیں اور آداب محبت کا لحاظ رکھتے ہوئے استدعا کے لئے کیسے کیسے عنوانات اختیار کرتی ہیں - اُن کی زندگی کے واقعات اور انکی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے جو خیال پیدا ہوتا ہے اس کا مختصراً اس طرح ذکر کر دینا ضروری خیال کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ جس طرح رانی نے اپنی زندگی کرشن جی کی محبت میں صرف کردی تھی اسی طرح اپنا سارا کلام بھی کرشن جی کے نذر کر دیا - شاید ہی کوئی نظم ہو جو اس جذبہ سے خالی ہو

مضمون کے طویل ہونے کے خوف سے ہم نظموں کی نقل اور انکی تشریح لفظی سے درگذر کرتے ہیں اور ذیل میں چند نظموں کے ترجمے پیش کرتے ہوئے مضمون کو ختم کرتے ہیں

دنیا اور اس کی دلچسپی منظر اور اس کی دلآویزیکا اقتضا ہے کہ وہ اپنی رنگینیوں میں انسان کو جذب کرے - لیکن پاک ذات سے وابستہ ہستیاں ان ظاہری نقش ونگار کا فریب نہیں کھاتیں اور انکی روحانی پاکیزگی انکو کسی مادی دلچسپی میں نہیں محو ہونے دیتی اس مفہوم کو اپنے خاص انداز سے کتنے دلچسپ طریقہ پر بیان کیا ہے - فرماتی ہیں کہ

"بادل ہر طرف سے جھوم جھوم کر آئے ہیں مگر وہ ہری (کرشن جی) کا کوئی پیغام نہیں لائے طائر اپنی شیریں نوائی سے سننے والوں کے دلوں میں جوش پیدا کر رہے ہیں - کوئل چلا رہی ہے - بلا کی تاریکی ہے بجلی چمک چمک کر ان غمگین عورتوں کو خوفزدہ کر رہی ہے جنکے شوہر باہر ہیں - معطر ہوا موسیقیت سے لبریز ہے - بارش مسلسل ہو رہی ہے - جدائی کی گھڑیاں کالے سانپ کی طرح ڈرا رہی ہیں - (یہ سب کچھ ہے) لیکن میرا کا دل (ان سب رنگینیوں اور منظر کی ان تمام دلآویزیوں سے بے نیاز ہے اور صرف) ہری (کرشن جی بھگوان) کے خیال میں کھویا ہوا ہے"

انسان کو جس سے محبت ہوتی ہے اس کی ہر بات میں لطف آتا ہے اور اس کا تذکرہ خاص طور پر مسرت زا وانبساط خیز ہوتا ہے - میرا بائی کو جس ذات سے خاص لگاؤ تھا نا ممکن تھا کہ وہ اس کی یاد سے غافل رہتیں - رانی کے لمحات زندگی کرشن جی کی یاد کے سوا کسی اور کام میں نہ صرف ہوتے تھے - اور رانی کسی وقت اس پاک ہستی کو فراموش نہ کرتی تھیں - ذیل کی نظم میں (جس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے) انھوں نے کرشن کا مجمل مگر دلچسپ اور شعریت لئے ہوئے سراپا پیش کیا ہے جو محبت کیش حضرات کی جانب سے ناظرین کی خدمت میں ایک قیمتی تحفہ کی شکل میں پیش ہے - فرماتی ہیں کہ

"ان کا جسم سراپا حسن، ہے - انکی آنکھیں کنول کا پھول ہیں انکی نظر بلا کی دلفریب ہے - ان کا تبسم بے حد شیریں ہے - جمنا جی کے ساحل پر وہ گایوں کو چرایا کرتے ہیں اور اپنی محبت بھری بانسری بجایا کرتے ہیں"

سلہ سلہ سلہ " " نشانات کے اندر کی عبارت اختر عابدی صاحب سابق مدیر افسانہ کے مضمون سے جو رسالہ زمانہ میں شائع ہوا ہی گئی ہے

مفارقت سے متاثر ہوکر انتظار و بیقراری کا اظہار اور دیدار کی خواہش کے ساتھ حصول مسرت کی استدعا کرتے ہوئے اپنی حالت اپنے محبوب شری کرشن جی کے سامنے یوں ظاہر کرتی ہیں کہ

"بیداری کی وجہ سے آنکھیں خمار آلود ہوگئی ہیں۔ اے میرے مالک جب سے تم علیحدہ ہوگئے ہو میرے دل نے قرار نہیں پایا۔ تمھاری آواز سن کر میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ تمھارے الفاظ میں شیرینی محسوس ہوتی ہے میری آنکھیں تمھارے آنے کا انتظار کر رہی ہیں۔ ہر رات مجھے نصف سال کے برابر معلوم ہوتی ہے۔ اے میرے ندیم میں تیری جدائی کی تکلیفیں کس طرح بیان کروں۔ ساری رات میرا کو بیقراری میں گذر جاتی ہے اب اے میرے آقا میں تجھے کب پاؤں گی اور تو کب میری تکلیفوں کو دور کرکے مسرت بخشے گا"

میرا بائی کرشن جی کے مجسمہ کے روبرو گایا اور کبھی کبھی وفور جوش محبت میں ناچا بھی کرتی تھیں ان کے زندگی بسر کرنے کے طریقہ پر اعزا اور اقربا کو اعتراض تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ رانی اس قسم کی (رانی کا ہمہ تن مجسمہ سے مصروف ہونا اور ان کا دیوانوں کی طرح روز و شب پریشاں رہنا نیز تمام سادھوؤں اور مہاتماؤں کا ان کو گھیرے رہنا) زندگی بسر کریں جس کی پوری تشریح ابتدائے مضمون میں ہم نے کی ہے یہاں نیچے لکھی ہوئی نظم سے ان تمام باتوں کا اندازہ ہوتا ہے اور کسی قدر اجمالی صورت میں رانی کی زندگی کا ایک پہلو روشن ہوتا ہے کہتی ہیں کہ

"میں اپنے مالک سے محبت کرتی ہوں اور اس امر کے ظاہر کرنے میں مجھے بالکل شرم نہیں معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ مجھے لوگوں نے علانیہ رقص کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ دن میں مجھے بھوک نہیں لگتی۔ رات کو نیند نہیں آتی میں ہمیشہ بیقرار رہتی ہوں۔ ان تکلیفوں کو پس پشت ڈالکر میں دوسری طرف جاؤں گی کیونکہ ایک علم مخفی نے مجھ پر غلبہ حاصل کیا ہے۔ میرے تمام اعزہ و اقربا مجھ کو شہد کی مکھیوں کی طرح گھیر لیتے ہیں اور مجھے میرے ارادے سے باز رکھنا چاہتے ہیں لیکن میرا اپنے آقا کرشن جی کی لونڈی ہے اس کو کسی بات کی پروا نہیں خواہ دنیا اس کے متعلق کچھ کیوں نہ کہے۔"

نشان کی ہوئی عبارت سے بیان کئے ہوئے ان واقعات کی تصدیق ہوتی ہے جنکا تذکرہ ہم "حالات زندگی" کی تحت میں کر آئے ہیں۔

رانی میرا بائی کی ایک دعائیہ نظم پر ہم تراجم اور نمونہ جات کلام کے سلسلہ کو ختم کرتے ہیں اور لطف ناظرین کا لحاظ کرتے ہوئے اس نظم کو بجنسہ نقل کرتے ہیں۔

یہ نظم سراسر التجا ہے جو سنجیدگی اور متانت کے ساتھ کرشن جی کی پاک خدمت میں کی گئی ہے۔ اس سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ میرا بائی کی زندگی کا نصب العین کیا تھا۔ کیونکہ مقدس ذات کے سامنے امیدوار دل کی زبان سے وہی الفاظ نکلتے ہیں۔ جس کا وہ سچائی کے ساتھ آرزومند ہوتا ہے۔ ذیل کی نظم سے یہ بات واضح ہوسکے گی۔ کہ رانی اپنے مالک سے کیا چاہتی تھی اور اس کو کیسے مؤثر اور دل پسند انداز سے اپنے آقا کے سامنے پیش کیا ہے۔ کہتی ہیں کہ

حاشیہ " " کے اندر کی عبارت اختر عابدی صاحب، سابق مدیر افسانہ کے مضمون سے جو رسالہ زمانہ کانپور میں شائع ہوا ہے اخذ کی گئی ہے۔

میرا کے پربھو سانچی داسی بناؤ	मीरा के प्रभु साँची दासी बनाओ
جھوٹے دھندوں سے میرا پھندا چھڑاؤ	झूठे धंधों से मेरा फंदा छुड़ाओ
لوٹے ہی لیت بیوک کا ڈیرا	लूटे ही लेत विवेक का डेरा
بدھ۔ بل۔ یدپ کروں بہتیرا	बुध बल यदपि करूँ बहुतेरा
ہائے رام نہیں کچھ بس میرا	हाय राम नहिं कछु बस मेरा
مرت ہوں بے بس پربھو دھاؤ سویرا	मरत हूँ बिबस प्रभु धाओ सवेरा
دھرم اپدیش نت پرتی سنتی ہوں	धर्म उपदेश नित प्रति सुनती हूँ
من کچال سے بھی ڈرتی ہوں	मन कुचाल से भी डरती हूँ
سدا سادھو سیوا کرتی ہوں	सदा साधु सेवा करती हूँ
سومیرن دھیان میں چت دھرتی ہوں	सुमिरण ध्यान में चित धरती हूँ
بھگت مارگ داسی کو دکھاؤ	भक्ति मार्ग दासी को दिखाओ
میرا کے پربھو سانچی داسی بناؤ	मीरा के प्रभु साँची दासी बनाओ
جھوٹے دھندوں سے میرا پھندا چھڑاؤ	झूठे धंधों से मेरा फंदा छुड़ाओ

داسی۔ خادمہ۔ لونڈی۔ دھاؤ۔ دوڑو۔ مدد کرو۔ سویرا۔ جلدی۔ نت۔ ہر روز۔ سدا۔ پرتی۔ ہر ایک۔ دھندوں۔ کام۔ بیبیک۔ طرح طرح کے خیالات۔ واہمہ۔ بدھ۔ عقل۔ بل۔ طاقت۔ یدپ۔ تو بھی۔ پھر بھی۔ سیوا۔ خدمت۔ دھرم اپدیش۔ مذہب کی خوبیاں۔ کچال۔ خراب چال والا۔ سادھو۔ نیک ہستیاں۔ سومرن۔ وظیفہ۔ یاد کرنا۔ بھگت مارگ۔ عبادت کی راہ۔

اے میرے آقا کرشن جی مجھ کو اپنی سچی خادمہ بننے کی عزت سے سرفراز فرمائیے۔ اور مجھے باطل پرستی سے نجات دیجئے۔ میں اپنی عقل و بساط کے بموجب پوری کوشش کرتی ہوں لیکن پھر بھی مجھے دور از کار۔ فضول اور باطل خیالات کے ہجوم پامال کرتے رہتے ہیں۔ اے میرے آقا میرا کچھ بس نہیں ہے۔ میں عاجز و مجبور بے بس و بیکس مر رہی ہوں۔ آپ (براہ کرم) میری امداد کیجئے۔ میں ہمیشہ مذہبی نیک باتیں سنتی ہوں اور اپنے نفس سرکش کے خیالات باطل سے ڈرتی ہوں اور نیک و پاک لوگوں کی خدمت کے لئے ہر وقت مستعد رہتی ہوں (یہی نہیں بلکہ) آپ کی یاد میں بھی اپنا عزیز وقت اور اپنا قیمتی لمحۂ زندگی (پوری سرگرمی کے ساتھ) صرف کرتی ہوں۔ لہذا آپ مجھ ناتواں کو سچی خادمہ بننے کی توفیق عطا فرمائیے۔ اور اپنی عبادت کی سیدھی راہ کی رہبری فرمائیے۔

عبدالجلیل سید سرانوی

آیندہ جنوری ۳۲ء کا نگار

تقریباً دو سو ۲۰۰ صفحات پر شائع ہوگا

اور

مخصوص ہوگا **مطائبات غالب** کیلئے۔ اسوقت تک غالب پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اسکی فلسفہ طرازی، معنی آفرینی، علوے خیال، بلندی مفہوم اور دشوار پسندی سے متعلق تھا لیکن یہ راز ابتک سربستہ ہے کہ غالب کی شہرت وکامیابی کا حقیقی راز ان سب سے علیحدہ صرف اس کی شوخی، شوخ نگاری، بذلہ سنجی اور مطائبات پسندی میں پنہاں ہے جنھوں نے اس کے سارے کلام کو خواہ وہ نظم ہو یا نثر، فارسی ہو یا اردو ایک نہایت ہی اچھوتی قسم کی تنقید ملیح (Criticism with a smile) میں تبدیل کردیا ہے

یہ مضمون ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے جس میں برسوں کی محنت وکاوش کے بعد اس کے اردو کلام سے اس کی فارسی تصانیف سے اس کے رقعات سے اور تمام ان واقعات وحالات سے جو تذکروں اور خود اس کی تصانیف میں ملتے ہیں **غالب** کی شوخی وشوخ نگاری پر تمام پہلوؤں سے نہایت ہی مکمل بحث کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ غالب کی شہرت وکامیابی کا تنہا راز صرف یہ تھا کہ وہ قدرت کی طرف سے نہایت شوخ وبذلہ سنج طبیعت لیکر آیا تھا۔ اور اس کی ساری زندگی اس کی جملہ تصانیف میں بھی وہ رنگ ہے جو تمام شعراء سے اسے ممتاز بناتا ہے

سب سے پہلے ایک بسیط مقدمے کے ذریعے سے مثالیں دے دے کر بتایا جائیگا کہ شوخی وظرافت کی دنیا میں کتنی قسمیں ہیں غالب سے قبل کن کن شعراء نے اسے اختیار کیا۔ ہندوستان میں اس رنگ نے کتنا نوع اختیار کیا۔ اور پھر **غالب** کے اردو فارسی کلام اور اس کے حالات وکوائف زندگی کا استقصا کرکے بتایا جائے گا کہ غالب حقیقتاً کس قدر دلچسپ انسان تھا۔ اور کیسے کیسے نوادر ادب اور لطائف انشاء وہ اپنے بعد چھوڑ گیا ہے

یہ کتاب اگر ایک طرف فن تنقید کی بہترین مثال ہو تو دوسری طرف ایسا مجموعہ لطائف ہے کہ شاید ہی اس سے بہتر ذریعہ تفریح ودلچسپی کا کوئی اور ہو۔ یہ تصنیف **غالب** کے متعلق بالکل اچھوتی چیز ہوگی اور ہر شخص کے ذوق کو آسودہ کرنیوالی۔ وہ حضرات جو غالب کا صحیح مطالعہ کرنا چاہتے ہیں انکے لئے اس کتاب کا دیکھنا ایک فریضہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کتاب صرف نگار کے جنوری نمبر میں شایع ہوگی اور اسلئے اسکے حاصل کرنیکا تنہا ذریعہ یہی ہے کہ نگار کی خریداری کو جاری رکھئے اور آپکے حلقۂ احباب میں جو حضرات اس کتاب کو حاصل کرنا چاہتے ہیں انھیں نگار کی خریداری پر آمادہ کیجئے۔ اسی کے ساتھ غالب کی ایک رنگین تصویر بھی ہوگی جو اس سے قبل کہیں شایع نہیں ہوئی۔

نیاز

قتال فی سبیل اللہ

ایک عرصہ سے میں عنوان بالا پر اپنے منتشر خیالات کے اظہار کا ارادہ کر رہا تھا، لیکن بعض مخصوص وجوہ سے کچھ نہ لکھ سکا، پچھلے دنوں کانگریس کی شرکت و عدم شرکت کے سلسلہ میں چند مقالات اور فتوے مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا، جن میں غیر اتفاقی طور پر ضمناً میرے اس عنوان پر جو قارئین کرام ان سطور کی پیشانی پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا دیکھ رہے ہیں، اظہار خیال کیا گیا تھا، اور میرے عقیدہ میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ یکسر غلط و سرتاپا صحیح نہ تھا، یعنی قتال فی سبیل اللہ کی جو تشریح کی گئی تھی، یا قتال فی سبیل اللہ کے جو شرعی و اسلامی معنی بتائے گئے تھے، وہ میرے نزدیک درست نہ تھے، ان تحریروں نے از سر نو میرے پرانے خیال کو جو امتداد زمانہ سے مردہ ہو چکا تھا زندہ کر دیا، اور میں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اگر قتال فی سبیل اللہ ایسے اہم مسئلہ کے متعلق وہ تشریح جو حضرات علماء کرام اپنی تحریروں میں بیان فرما رہے ہیں، عام مسلمانوں میں رائج ہو گئی یا عام طور پر سمجھی جانے لگی، تو دین متین کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جائیگا، یہ چند سطور حوالہ قلم کرنی ضروری خیال کیں، حق کوش اور حق فہم اصحاب سے قوی امید ہے، کہ وہ میرے ان خیالات کا بغور مطالعہ فرمائیں گے،

لغوی تحقیق | ظاہر ہے کہ قتال فی سبیل اللہ عربی زبان کا فقرہ ہے، جسکے لفظی معنی اُردو میں "اللہ کی راہ میں جنگ" ہیں، اور یہ بھی قریب قریب اتنا ہی صاف ہے کہ فی سبیل اللہ عربی زبان میں "للہ" یا "لوجہ اللہ" کے معنی میں مستعمل ہے، چنانچہ "انفاق فی سبیل اللہ" کے معنی اللہ کے لئے خرچ کرنا بیان کئے جاتے ہیں، یہ سمجھنا چاہئے کہ "سبیل" عربی میں مطلقاً "لئے" یا "واسطہ" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً اگر یہ کہنا مقصود ہو کہ زید حق کی حمایت کرتے ہوئے مارا گیا تو یوں کہیں گے، "قتل زیدٌ فی سبیل الحق"۔ اس مختصر سی لفظی تشریح کے بعد قتال فی سبیل اللہ کے معنی اللہ کے لئے، اللہ کے واسطے، یا اللہ کی غرض سے جنگ کرنا، ہوں گے

کشف معنی | یہ عرض کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ اسلامی اصول کے پیش نظر کسی کام کو خدا کے لئے کرنے یا خدا کی غرض سے کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں، کہ خدا کو اس کام سے کوئی فائدہ پہونچتا ہے۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ خدا اس سے خوش ہوتا ہے، اور محض اسوجہ سے خوش ہوتا ہے، کہ وہ کام بالفعل اپنے درجہ میں اچھا ہے، موجب خیر ہے، اور اس کے بندوں کے لئے باعث صد برکت ہے۔

قتال فی سبیل اللہ کے غلط شرعی معنی | ہمارے محترم علماء قتال فی سبیل اللہ کے معنی قتال علاء کلمۃ اللہ بیان فرماتے ہیں، یعنی کلمۂ توحید یا واضح تر الفاظ میں خدا کو ایک منوانے اور نبی عربی پر ایمان لانے پر مجبور کرنے کی غرض سے جنگ کرنا، اسکی تائید میں یہ حضرات ایک حدیث پیش کرتے ہیں۔ جس کو اصحاب ستہ نے روایت کیا ہے۔ اور جس کے ترجمے میں ذیل میں درج کرتا ہوں۔

"نبی علیہ السلام سے دریافت کیا گیا، کہ ایک شخص دلیر ہونے کی وجہ سے جنگ کرتا ہے، دوسرا غصہ آجانے کی وجہ سے کرتا ہے، تیسرا لوگ دکھاوے کو میدان جنگ میں اترتا ہے، ان میں کون مقاتل فی سبیل اللہ ہے۔ آپ نے فرمایا وہ شخص مقاتل فی سبیل اللہ ہے۔ جسکا مقصد اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا ہو۔"

حدیث کا مطلب | میرے نزدیک حضرات علمائے کرام کے بیان کئے ہوئے معنی صحیح نہیں ہیں، جیسا کہ میں ابتدائی تمہیدی سطور میں عرض کر چکا ہوں، قتال فی سبیل اللہ کے صحیح شرعی معنی بتانے سے پہلے یہ بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ یہ معنی غلط کیوں ہیں؟ نیز یہ کہ علماء جو حدیث پیش کر رہے ہیں اسکا صحیح مطلب کیا ہے؟ ان دو سوالوں میں سے دوسرے سوال کے متعلق میں عرض کرنا چاہتا ہوں، کہ مذکورہ حدیث سے یہ ثابت ہی نہیں ہوتا، کہ اللہ کو ایک منوانے کی غرض سے جنگ کرنا قتال فی سبیل اللہ ہے۔ بلکہ اس کے خلاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ حق کی حمایت کی غرض سے، اس کو حق سمجھتے ہوئے، جنگ کرنا قتال فی سبیل اللہ ہے۔ اس لئے کہ سائل نے نبی علیہ السلام سے ان تین شخصوں کے متعلق دریافت کیا ہے، جو مختلف تین اغراض سے خدا کے بندوں کا خون بہانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، ایک تو وہ جو دلیر ہے، بہادر ہے، اور جس کا دل ہمیشہ شجاعت دکھانے کے لئے اس کے پہلو میں تڑپتا رہتا ہے، دوسرا وہ جس کی قوت غضبیہ دہکتی ہوئی آگ کی طرح برابر بھڑکتی رہتی ہے، اور جو محض اپنی اس مشتعل آگ کو بجھانے کی غرض سے دوسرے کا خون پانی کی طرح بہانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ تیسرا وہ جو صرف دکھاوے کو جنگ کے میدان میں اُترتا ہے، اور شمشیر زنی کے جوہر دکھاتا ہے، یہ تینوں شخص ہو سکتا ہے کہ ایسی جنگ میں حصہ لے رہے ہوں، جو حمایت حق اور تقویت دین کے لئے کی جا رہی ہو، لیکن ان کے پیش نظر وہ اعلیٰ مقصد نہ ہو، بلکہ وہ تین پست و نا شائستہ مقاصد ہوں، جنکی تفصیل ابھی سطور بالا میں مذکور ہو چکی ہے، نبی علیہ السلام فرماتے ہیں، کہ یہ اشخاص محض اسوجہ سے مقاتلین فی سبیل اللہ کی فہرست سے خارج ہو گئے کہ انھوں نے اچھی نیت سے جنگ نہیں کی، اگرچہ وہ جنگ فی نفسہ اچھی تھی۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے، کہ اگر بالفرض جنگ کسی اچھے مقصد کے پیش نظر نہ کی جا رہی ہو، یعنی حمایت حق یا تقویت دین کے علاوہ کوئی اور برا و نا شائستہ مقصد سامنے ہو، مثلاً کسی پُرامن قوم کو شخصی یا ذاتی اغراض سے مقہور کیا جا رہا ہو، اور جنگ کرنے والا لوگوں کے دکھانے یا غصہ آجانے یا اظہار شجاعت کے لئے جنگ کر رہا ہو تو یہ صورت بدرجہ اولیٰ مذموم، اور بدرجہ غائت زشت و معیوب ہو گی۔ اور اس پر ہندی کی یہ مثل صادق آئے گی "ایک کریلا اور نیم چڑھا"

ایک کھلی غلطی | مجھے افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے، کہ ہندوستان کے ایک قابل احترام بزرگ[2] نے قتال فی سبیل اللہ کے معنی بتاتے ہوئے مندرجہ حدیث پیش کی، اور "حمیۃ" کے آگے قوسین کے درمیان لفظ حمیۃ کو واضح کرنے کی غرض سے للقوم او للوطن مثلاً ثبت فرما دیا، گویا انھوں نے حمیت کے معنی حمایت لئے اور حمایت کی توضیح کے لئے مثال پیش فرما دیں، ایک حمایت قوم دوسرے حمایت وطن

---

[1] سئل النبی صلے اللہ علیہ وسلم عن الرجل یقاتل شجاعۃ ویقاتل حمیۃ ویقاتل ریاءً ای ذالک فی سبیل اللہ فقال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ (جمع الفوائد) [2] مولوی اشرف علی تھانوی مراد ہیں (معاملہ سلین صفحہ)

میں آگے عرض کرنے والا ہوں، کہ قوم اور وطن کی حمایت کی غرض سے جنگ کرنا میرے نزدیک قتال فی سبیل اللہ ہے۔ اور یقیناً قتال فی سبیل اللہ ہے، اور اس جنگ میں مرجانے والا شخص بلا شائبہ شک وشبہ شہید ہے، ہمارے محترم بزرگ نے حمیت کے معنی غلط سمجھے یا غلط سمجھانے کی کوشش کی، حمیت میں بہ تشدید یا سمجھتا ہوں، اور اسی کو صحیح خیال کرتا ہوں، یہ اس فعل کا مصدر ہے جو سمع یسمع سے آتا ہے اور جس کے معنی انفہ یا ننگ چڑھاپن ہیں نہ کہ حمایت، حمایت ضرب سے آتا ہے امام راغب اصفہانی کی ذمہ داری پر جو پانچویں صدی ہجری کی ایک بڑے فاضل ادیب اور مفسر ہیں، میں حمیت کے معنی غضب اور غصہ کرتا ہوں، مفردات کا باب الحا ملاحظہ فرمایئے موصوف لکھتے ہیں:[1] قوت غضبیہ جس وقت بھڑک اٹھے، اور مشتعل ہوجائے، تو حمیت کہلاتی ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے، حمیتُ علی فلاں، یعنی میں فلاں شخص پر غصہ ہوا یہی معنی قرآن کی اس آیت میں بھی لئے گئے ہیں۔ حمیۃ الجاھلیۃ

علما کے بیان کئے ہوئے معنی غلط کیوں ہیں؟ علما کے بیان کئے ہوئے معنی کئی وجوہ سے غلط ہیں، اگر ان سب وجوہ کو بیان کیا جائے، تو خیال کرتا ہوں، مضمون بہت طویل ہو جائے گا، اور اسے علیحدہ ترتیب دینا پڑیگا۔ اس لئے میں اس فرصت میں صرف چند وجوہ بقدر وسعت اختصار سے بیان کرونگا، یہ تو عرض کیا ہی جاچکا ہے، کہ علما کرام قتال فی سبیل اللہ کے معنی اعلا کلمۃ اللہ اور تقویت دین بتاتے ہیں، اور میرے خیال کے مطابق ان دونوں عبارتوں کا مقصد یہ ہے، کہ اسلام کو منوانے کی غرض سے جنگ کیجائے اور کافروں کو مجبور کیا جائے کہ وہ اسلام لائیں، اور محض اس غرض سے اپنے ملک سے نکل کر خواہ وہ اپنی جگہ کیسے ہی پرامن کیوں نہ ہوں ان پر حملہ بول دیا جائے۔ انہیں مولی اور گاجر کی طرح کاٹ دیا جائے۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے اور کوئی دوسری توجیہ صحیح نہ ہو، تو اس سے قطع نظر کہ یہ چیز عقلاً صحیح نہیں ہے، عقل اس کو مذموم سمجھتی ہے، انسانی فطری قانون اسے صحیح خیال کرتا ہے، مروت اسے زشت تصور کرتی ہے، مذہباً بھی یہ جائز نہیں ہے، اس باب میں نہایت صاف اور واضح قرآن کے احکام موجود ہیں، میں یہاں چند آیتوں کے ترجمے اور حاشیہ پر اصل آیتیں درج کرتا ہوں۔ قارئین کرام انکا مفہوم سمجھنے کی سعی فرمائیں، مجھے یقین ہے، کہ وہ یہ ضرور سمجھ لیں گے، کہ قرآن معتقدات ومسلمات کے بارہ میں ہر شخص کو آزادی دیتا ہے، اور کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا، یا یوں کہئے کہ اسلام منوانے کے لئے مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت نہیں دیتا:

(۱) اگر وہ (یعنی کافر) تم سے علاحدگی اختیار کریں، اور تم سے جنگ نہ کریں، اور صلح کرنے پر تل جائیں تو خدا تمھیں ان سے لڑنے اور جنگ کرنے سے منع کرتا ہے

(۲) اگر وہ (یعنی کافر) تم سے علیحدگی اختیار نہ کریں، اور نہ صلح کرنے پر آمادہ ہوں اور برابر دست درازی کرتے رہیں تو انہیں پکڑو اور جہاں پاؤ قتل کر ڈالو۔

(۳) (نبی علیہ السلام کی زبانی ارشاد ہوتا ہے) مجھے تو تمھارے درمیان انصاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور اللہ تمھارا بھی ہے اور ہمارا بھی، ہم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں، اور ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی لڑائی نہیں ہے۔

(۴) تمھارے لئے تمھارا دین اور ہمارے لئے ہمارا۔

---

[1] وعبر عن القوۃ الغضبیۃ اذا ثارت وکثرت بالحمیۃ فقیل حمیت علی فلان اذا غضبت علیہ قال تعالیٰ حمیۃ الجاھلیۃ (مفردات صفحہ)

(۵) اے نبی مشرکوں اور کتابیوں سے کہدیجئے، کہ کیا تم اسلام لے آئے، سو اگر وہ اسلام لے آئیں۔ تو ہدایت پاجائیں گے، اور اگر ایمان نہ لائیں۔
(تو اپنا ہی کچھ بگاڑیں گے) آپ کا فرض تو سمجھا دینا ہے۔

ان آیات بینات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے، کہ کسی کافر سے محض کافر ہونے کی وجہ سے جنگ نہیں کرنی چاہیئے، اور نہ اسے اپنا مذہب منوانے کی غرض سے مارنا پیٹنا چاہیئے، چاہے وہ ایمان لائے یا نہ لائے، اب ذرا وہ آیات بھی ملاحظہ کر لیجئے، جو کافروں سے جنگ کرنے اور ان سے لڑنے کی وجوہ و اسباب بتاتی ہیں، ان میں ایک آیت تو نمبر ۲ میں مذکور ہو گئی۔ باقی آیات کے تراجم ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) اگر وہ (یعنی کافر) عہد کرنے کے بعد عہد توڑ دیں، اور تمھارے مذہب میں طعن کریں تو ان میں، سے جو بڑے کافر ہیں، ان سے جنگ کرو۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ لوگ عہد کے پکے نہیں۔

(۲) بھلا تم ایسی قوم سے جنگ کیوں نہیں کرتے، جنھوں نے عہدوں کو توڑ دیا، اور رسول کو اس کے وطن سے نکالدینے کا ارادہ کیا، اور انھوں نے ہی ابتدا کی کیا تم ان سے ڈرتے ہو۔

(۳) اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں، اور ظلم نہ کرو، اس لئے کہ خدا کے نزدیک ظلم کرنیوالے محبوب نہیں۔

(۴) اگر وہ باز آجائیں، (تو انھیں کچھ نہ کہو) اس لئے کہ جنگ تو ظالموں سے کی جاتی ہے۔

میں نے یہ چند آیات پیش کی ہیں، اور بھی بہت ہیں، لیکن میں انہی پر اکتفا کرتا ہوں، اور یہ خیال رکھتا ہوں کہ یہی آیتیں ہمارے علماء کے خیال کو غلط ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں، قارئین ان جملوں کو زیادہ توجہ سے مطالعہ فرمائیں، جن پر میں نے خطوط کھینچ دئے ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ یہ کہا جا سکتا ہے، کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مطلقاً کافروں کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم ہے، یعنی وہاں یہ مذکور نہیں ہے، کہ اگر وہ جنگ کریں تو تم بھی جنگ کرو، یا اگر وہ تمھیں تمھارے گھروں سے نکال دیں تو تم انہیں قتل کر ڈالو، سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم عام نہیں ہے، یعنی اس کا یہ مطلب نہیں ہے، کہ ہر زمانہ میں ایسا کرنا چاہیئے، اور پرامن و غیر مقاتل کافروں کو سوچے سمجھے بغیر موت کے

حاشیہ صفحہ ۶۹ (۲) فان لم یعتزلوکم ویلقوا الیکم السلم ویکفوا ایدیهم فخذوهم واقتلوهم حیث ثقفتموهم۔

(۳) امرت لاعدل بینکم، اللہ ربنا وربکم، لنا اعمالنا ولکم اعمالکم، لا حجة بیننا وبینکم۔

(۴) لکم دینکم ولی دین

(۵) قل للذین اوتوا الکتاب والامیین ءاسلمتم، فان اسلموا فقد اهتدوا وان تولوا فانما علیک البلاغ۔

---

(۱) وان نکثوا ایمانهم من بعد عهدهم وطعنوا فی دینکم فقاتلوا ائمة الکفر انهم لا ایمان لهم۔

(۲) الا تقاتلون قوما نکثوا ایمانهم وهموا باخراج الرسول وهم بدءوکم اول مرة، اتخشونهم۔

(۳) قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا۔ ان اللہ لا یحب المعتدین۔

(۴) فان انتهوا فلا عدوان الا علی الظالمین۔

گھاٹ اتار دینا چاہیئے، بلکہ وہ زمانہ نبوت کے ساتھ خاص ہے اور اس وجہ سے خاص ہے کہ اس زمانہ کے کافر جنگ جو تھے، مفسدہ پرداز تھے، اسلام کو فنا کر دینا چاہتے تھے، میں اس کی وجہ یہ سمجھتا ہوں، کہ وہ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا، اسلام اسوقت ایک بچہ تھا جو قریش کے ایک چھوٹے سے قبیلہ بنو ہاشم کے گھر میں پیدا ہوا تھا، اور مکہ کے دو بڑے ذیجاہ و ذی عزت سردار عبد المطلب اور ابو طالب کی گود میں تربیت پا رہا تھا، اس بچہ کی پیشانی سے نجابت و شرافت کے آثار نمایاں تھے ؎

بالائے سرش ز ہوشمندی می تافت ستارۂ بلندی

مکہ والوں کو یہ خوف تھا کہ کہیں یہ بچہ بڑا ہو کر ان کے ہاتھوں سے ریاست و سرداری کی باگ نہ چھین لے، اور کہیں اس بچہ کے زیر اقتدار انہیں بذلت آمیز زندگی بسر کرنی نہ پڑے، اس لئے اور محض اس لئے سب سے پہلے مکہ والوں نے اس بچہ کا بچپن ہی میں گلا دبانے کی فکر کی، اور آخر میں مکہ والوں کے خطرات کا دائرہ بچہ کی روز افزوں گوناگوں ترقیوں کے ساتھ ساتھ وسیع تر ہوتا گیا، یہانتک کہ تھوڑے ہی دنوں میں تمام جزیرہ نمائے عرب میں گھٹنیوں چلنے والے بچہ سے لیکر خمیدہ پشت بوڑھے تک ہر مرد و زن اس ہونہار بچہ کے خون کا پیاسا ہو گیا، یہ سب کچھ فطری و غیر متبدل قانون کے ماتحت ہونے والا تھا اور ہوا، یہ ضروری نہیں ہے کہ اب بھی ہو، یا اب ہے، آیندہ کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر میں اس مقام پر پہنچکر دو چار ایسی آیات درج کردوں جن سے زمانہ نبوت کے مشرکین کے حالات آئینہ ہو جائیں تو بیجا نہ ہوگا۔

(۱) وہ تو تم سے اسوقت تک لڑتے رہیں گے، جب تک اگر یہ ممکن ہو انھیں تمہارے دین سے نہ پھیر دیں

(۲) ان کے متعلق کیا پوچھتے ہو، اگر وہ تم پر غالب آجائیں تو بالیقین نہ کسی عہد ہی کا خیال کریں اور نہ کسی قرابت کا یہ زبان کی لپالپی ہے، اُنکے دل میں کھوٹ ہے۔

قتال فی سبیل اللہ کے صحیح شرعی معنی | میں سمجھتا ہوں کہ یہ قریب قریب صاف ہو چکا، کہ قتال فی سبیل اللہ کے وہ معنی جو علماء بیان فرماتے ہیں، اور جو سطور فوق میں لکھے جا چکے ہیں، کلیتہً نا درست و یکسر غلط ہیں، اب جو میں صحیح سمجھتا ہوں وہ قارئین کے سامنے رکھتا ہوں۔ یہ تو میں قتال فی سبیل اللہ کی لفظی و لغوی تحقیق کے ضمن میں بیان کر ہی چکا ہوں، کہ اس کے معنی ہیں اللہ کی خوشنودی کے لئے جنگ کرنا۔ یہاں اتنا اور اضافہ کئے دیتا ہوں، کہ جن اعمال و افعال کو خدائے بزرگ و توانا نے ناروا قرار دیا ہے یا جو بداہتہً ناروا ہیں۔ انکو روکنے اور منع کرنے کے لئے جنگ کرنا یا اس سے زیادہ واضح اور جامع الفاظ میں حق کی حمایت کے لئے جنگ کرنا۔ اللہ کی راہ میں جنگ ہے۔ اس لئے کہ اللہ حق کا حامی ہے۔ ظلم و جور کو برا سمجھتا ہے، جو شخص حق کی حمایت اور ظلم و جور کو مٹانے میں جان و مال سے سعی کرے گا۔ وہ یقیناً اللہ کو راضی کرے گا۔ میں نے اپنی تشریح میں یہ الفاظ "جو بداہتہً ناروا ہیں" اس وجہ سے بڑھا دیے ہیں، کہ بعض وہ بری چیزیں جو بداہتہ یا ضرورۃً بری ہیں، مذموم ہیں، قبیح ہیں، اور محض اسوجہ سے کہ وہ جلیاً بری ہیں قرآن اور اس کے بعد حدیث میں تفصیل کے ساتھ بیان نہیں

(۱) ولا یزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا۔

(۲) کیف وان یظھروا علیکم لا یرقبوا فیکم الا ولا ذمۃ ... یرضونکم بافواھھم وتابی قلوبھم۔

ہوتی ہیں، ہماری تعریف میں بری بنکر آجائیں، اور کسی شخص کو ان کے بُرے ہونے میں کلام نہ رہے، میری بیان کردہ تشریح کے مطابق قتال فی سبیل اللہ ٹھیک اسی طرح ایک مسلمان کے ساتھ بھی ہو سکیگا۔ جس طرح ایک کافر کے ساتھ، کفر اور اسلام باعث تفاوت نہ ہوگا۔ فرض کر لیجئے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا مال و متاع چھین لینا چاہتا ہے۔ اور وہ دوسرا مسلمان مال کی حفاظت کی غرض سے جنگ کرتا ہے۔ میں اس جنگ کو قتال فی سبیل اللہ کہوں گا، اور اگر یہ مسلمان لڑتا ہوا مارا جائیگا، تو میں اسے شہید خیال کروں گا۔ علی ہذا۔ ملک، قوم، مال، نفس، عزت، حرمت، آزادی اور ایسے ہی تمام حقوق و اشیاء کی حفاظت و نگہداری کی غرض سے جنگ میرے نزدیک خالص اسلامی شرعی جنگ ہے۔

تاریخ اسلام کا ایک اہم واقعہ اس سلسلہ میں تاریخ اسلام کے ایک اہم واقعہ کی طرف اشارہ کرنا کچھ نامناسب نہ ہوگا۔ نبی علیہ السلام کے وفات پا جانے کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تخت خلافت پر متمکن ہوتے ہیں، عرب کے کئی قبائل زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیتے ہیں، اور نہایت صاف الفاظ میں یہ کہدیتے ہیں، کہ ہم نماز تو پڑھیں گے، لیکن زکوٰۃ نہیں دیں گے، صحابہ میں آپس میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ خلیفۂ اعظم ادبی و مذہبی جرأت کا ثبوت دیتے ہیں، اور کھولکر فرما دیتے ہیں، کہ اگر یہ لوگ[1] اونٹ کا ایک بندھن دینے سے بھی انکار کریں گے، تو میں ان سے جنگ کروں گا، بالآخر یہ اسلام کا پرشکوہ خلیفہ ایک چھوٹی سی جمعیت کیساتھ مرتدین پر حملہ آور ہوتا ہے اور خارجہ ابن حصن اور منظور ابن زبان کی کمان میں غطفان کا ٹڈی دل شمشیریں برہنہ کرکے معرکہ میں کود پڑتا ہے، گھمسان کی لڑائی ہوتی ہے، اسلامی جرنیل کو فتح نصیب ہوتی ہے، اور مرتدین بے حواس ہوکر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، حضرت عبداللہ ابن مسعود ارشاد فرماتے ہیں، نبی علیہ السلام کی وفات کے بعد اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہماری امداد نہ کرتے تو ہم کبھی کے برباد ہو جاتے۔[2] تاریخی واقعہ میرے آگے آنے والے دلائل کے سلسلہ کی ایک کڑی خیال کرنا چاہئے۔ فیہا عبرۃ لاولی الالباب۔

قرآن کا فیصلہ قرآن میں کئی جگہ قتال فی سبیل اللہ کا انہی الفاظ میں ذکر آیا ہے، آپ ان آیتوں کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کو بغور دیکھئے اور بانصاف فیصلہ کیجئے، آپ یقیناً اسی نتیجہ پر پہونچیں گے جس پر میں اب سے کئی ماہ پہلے پہنچ چکا ہوں یعنی یہ کہ قتال فی سبیل اللہ اسی وقت ہوگا۔ جبکہ آپ کے حقوق خطرہ میں ہوں، اور آپ کو تباہ و برباد کیا جا رہا ہو، آپ کا ملک آپ سے چھین لیا گیا ہو اور آپ کو غلام بنا لیا گیا ہو، آپ کے بچوں اور عورتوں کو نہایت بیدردی و بے شرمی کے ساتھ آنکھوں کے سامنے ذبح کیا جا رہا ہو، اور آپ کو لوٹا جا رہا ہو، مختصر یہ کہ آپ کے ذہنی، جسمانی، و روحانی پھیل جانے والے پودوں کو نوچا جا رہا ہو ملاحظہ فرمائیے۔ قرآن حکیم کیا فرماتا ہے:

(۱) ان لوگوں سے اللہ کی راہ میں جنگ کرو، جو تم سے جنگ کریں اور ظلم نہ کرو۔

(۲) تمھیں کیا ہو گیا، تم اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے (یعنی) ان کمزور مردوں، عورتوں، اور بچوں کی اعانت نہیں کرتے (جو مکہ میں محبوس ہیں)

---

(۱) لو منعونی عقالاً لقاتلتھم۔ (فتوح البلدان بلاذری صفحہ ۱۰۱ مصر)

(۲) لقد قمنا بعد رسول اللہ مقاماً کدنا نھلک فیہ، لولا ان اللہ من علینا بابی بکر (فتوح البلدان ص ۱۰۱ مصر)

اور گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہے ہیں، کہ خدایا تو ہمیں اس شہر (یعنی مکہ) سے نکال، جس کے باشندے بڑے ہی ظالم اور جفاکار ہیں، اور کسی خدا کے بندے کو ہماری امداد کے لئے بھیج۔

(۳) کیا تمھیں بنی اسرائیل کی اس جماعت کی خبر نہیں،..... جنہوں نے اپنے نبی سے کہا تھا، کہ آپ ہم پر کسی بادشاہ کو مقرر کردیجئے، تاکہ ہم اس کے ماتحت خدا کی راہ میں جنگ کریں،..... اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا، کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کیوں نہ کریں گے، حالانکہ ہم اپنے شہروں سے نکال دیئے گئے ہیں، اور اپنے بچوں سے جدا کردیے گئے ہیں

پہلی آیت کی تشریح اب میں تینوں آیتوں کی ترتیب مختصراً تشریح کرتا ہوں، پہلی آیت کے متعلق مجھے یہ عرض کرنا ہے، کہ اس سے نہایت وضاحت کے ساتھ یہ پتہ چلتا ہے، کہ قتال فی سبیل اللہ ان ہی کافروں کے ساتھ ہوسکتا ہے، جو ہمیں یعنی مسلمانوں کو کچل دینا چاہتے ہوں یا کچل رہے ہوں۔ اور یہ قتال اس وجہ سے قتال فی سبیل اللہ کیا جائیگا، کہ یہ جان و مال اور عزت و ناموس کی حفاظت کی غرض سے ہوگا، وجہ استدلال یہ ہے، کہ عربی کا مشہور قاعدہ ہے، کہ اگر کوئی حکم کسی قید کے ساتھ مقید ہو، تو وہ قید اس حکم کی علت ہوتی ہے۔ مثلاً اگر ہم یوں کہیں "اکرمنا رجلاً عالماً" یعنے ہم نے ایک عالم شخص کی عزت کی تو عزت کرنے کی وجہ اس کا علم ہوگا، یا یوں کہئے کہ اس جملہ سے یہ سمجھ میں آجائیگا کہ اس شخص کی عزت اس کے علم کی وجہ سے کی گئی ہے، یہاں آیت میں بھی ایسا ہی ہے، خدا فرماتا ہے تم سے جو جنگ کریں تم اُن سے جنگ کرو، گویا جنگ کرنے کی وجہ انکا تمھارے ساتھ جنگ کرنا ہے، یہ نہیں کہ وہ کافر ہیں، اور کافر کے ساتھ ہر حال میں جنگ کرنا ضروری ہے، میں سمجھتا ہوں۔ کہ یہ آیت بکمال وضاحت میرے خیال کی تائید کررہی ہے۔

دوسری آیت کی تشریح یہ آیت ان غریب مسلمانوں کے بارہ میں نازل ہوئی ہے، جو مکہ میں قید کرلئے گئے تھے: اور ہزاروں کوششوں کے بعد بھی مدینہ ہجرت کرکے نہیں آسکتے تھے، تاریخ کے اوراق بتلاتے ہیں، کہ ان بے کس اور بے بس مسلمانوں پر مکہ کی سرزمین میں سخت سے سخت مظالم توڑے جاتے تھے، انھیں مارا جاتا تھا، بھوکا رکھا جاتا تھا، اور مجبور کیا جاتا تھا۔ کہ وہ اسلام ترک کردیں، لیکن یہ اسلام کے سچے شیدائی ساری مصیبتیں جھیلتے تھے، اور ایک لمحہ کیلئے بھی، اسلام اور پیارا اسلام ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے، خدا اپنے ان پیارے بندوں کے مصائب یاد دلاکر مدینہ میں بسنے والے مسلمانوں سے کہتا ہے، کہ تم اپنے ان کمزور بھائیوں کی اعانت کی غرض سے جنگ کرو، اور انھیں اہل مکہ کے وحشیانہ سخت پنجوں سے چھڑا کر لاؤ، تمھاری یہ جنگ قتال فی سبیل اللہ

حاشیہ صفحہ ۷۲: (۱) فقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا۔

(۲) ومالکم لاتقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من هذه القریة الظالم اهلها، واجعل لنا من لدنک ولیا، واجعل لنا من لدنک نصیرا۔

(۳) الم تر الی الملاء من بنی اسرائیل..... اذقالوا لنبی لهم ابعث لنا ملکا نقاتل فی سبیل اللہ..... قالوا ومالنا ان لانقاتل فی سبیل اللہ وقد اخرجنا من دیارنا وابنائنا۔

ہوگی (یعنی اللہ اس سے خوش ہوگا، اور تمھیں اگر تم وفات پاگئے، شہیدوں کا درجہ دیگا۔ اس آیت سے میں صرف اسقدر ثابت کرنا چاہتا ہوں، کہ کمزوروں اور تباہ حالوں کی حمایت واعانت کے لئے جنگ کرنا قتال فی سبیل اللہ ہے، یہ بالکل اتفاقی امر ہے، کہ مکہ میں جو لوگ ظلم اٹھارہے تھے، وہ مسلمان تھے، اگر کہیں کسی اور مذہب سے تعلق رکھنے والوں پر ظلم کیا جاتا، اور مسلمان ان کی امداد کرسکتے، تو مجھے یقین ہے کہ یہی آیت نازل ہوتی، اور مسلمانوں کو کمزوروں کی حمایت واعانت کے لئے آمادہ کرتی، خدا اپنے بندوں کی تعریف میں فرماتا ہے۔ وتواصوا بالصبر وتواصوا بالمرحمۃ

یارب تو کریمی و رسول تو کریم　　　صد شکر کہ ہستیم میان دو کریم

تیسری آیت کی تشریح | تیسری آیت پر حاصل تشریح چاہتی ہے، بنی اسرائیل پر ایک جفاکار بادشاہ جالوت ظلم توڑتا ہے، انھیں ان کے شہروں سے نکال دیتا ہے، بچوں کو ماں اور باپ سے جدا کردیتا ہے، بنی اسرائیل جنگلوں اور بیابانوں میں مارے مارے پھرتے ہیں، صبر کا پیمانہ لبریز ہوجاتا ہے، اور یہ اپنے نبی سے درخواست کرتے ہیں، کہ انہیں کسی بادشاہ کی زیر قیادت جالوت سے جنگ کرنے کی اجازت دی جائے، طالوت بادشاہ بنائے جاتے ہیں، جالوت اتنا جرار لشکر لیکر طالوت کے مقابل ہوتا ہے، آخر میں شکست کھاتا ہے اور داؤد علیہ السلام کے ہاتھ سے قتل ہوجاتا ہے، یہ واقعہ قریب قریب انھی الفاظ میں قرآن کریم میں مذکور ہے، میں نے قصہ کا ماحصل بامعنی بیان کردیا ہے، بعض لفاظ غیر ضروری ہونے کی وجہ سے ترک کردیے ہیں، یہ آیت میں اگر میں غلطی نہیں کررہا ہوں، تو اس باب میں پچھلی دو آیتوں سے زیادہ صاف ہے، کہ اس میں بوضاحت ملکی اور خالص ملکی جنگ کو قتال فی سبیل اللہ کہا گیا ہے، غور کیجئے بنی اسرائیل کے نبی فرماتے ہیں، کیا اب تو نہیں ہوگا کہ تمھیں قتال کا حکم دیا جائے اور تم قتال نہ کرو، اسی جنگ بزدل بنے بیٹھے رہو" بنی اسرائیل جواب دیتے ہیں "یہ کیسے ہوسکتا ہے، کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کریں، حالانکہ ہم اپنے شہروں سے نکال دئے گئے ہیں، اور اپنے بچوں سے جدا کردیئے گئے ہیں" گویا اللہ کے لیے جنگ کرنے کی وجہ ان کا اپنے شہروں سے نکالا جانا، اور بچوں سے جدا کیا جانا ہے۔ **وذالک ما ینبغی۔**

بحث کا خلاصہ | مضمون بہت طویل ہوگیا، اور ابھی مجھے اور چند چیزیں عرض کرنی ہیں، اس لئے میں اس مضمون کو یہیں ختم کئے دیتا ہوں، ان شاء اللہ کسی دوسری فرصت میں چند مفید اور ضروری چیزیں تحریر کروں گا، جو اس وقت مضمون طویل ہوجانے کی وجہ سے رہی جارہی ہیں، بحث کا خلاصہ صرف اتنا ہے، کہ قتال فی سبیل کے معنی پرامن کافروں سے محض اپنا مذہب منوانے کی غرض سے جنگ کرنا نہیں، بلکہ حق کی حمایت کی غرض سے جنگ کرنا ہے۔ میں تین آیتیں اپنے مقصد کی تائید میں پیش کرچکا ہوں جو میں قتال فی سبیل اللہ مذکور ہے، اور حمایت حق کے معنی میں ہے، اعلاء کلمۃ اللہ یا تقویت دین کا تذکرہ تک نہیں۔ یہ سب کچھ ایک دماغ کا نتیجہ ہے اور حق کوش دماغ کا نتیجہ ہے ؎

نگاہ مرد خرد مند، بر حقیقت کار　　　فقیہ مدرسہ درماندہ اصول و فروغ　　(نظیری)

سید شوکت علی سنبرواری

ستاروں کی روشنی
اور
قدرت کی اعجوبہ کاریاں

(۱)

اگر سائنس کے کارناموں کو خوردبینی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو طبیعت گھبرا جاتی ہے۔ دماغ پریشان ہو جاتا ہے۔ ہر چیز میں روز افزوں پیچیدگی اور تنوع پیدا ہو جاتا ہے۔ پتھروں کو دیکھئے یا ستاروں کو، ذرات کو دیکھئے یا سالمات (Atoms) کو انسانو کو دیکھئے یا باریک خوردبینی حیوانات کو، ہر چیز میں نئی نئی قسمیں، اور نئے نئے تعلقات پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ اور اگر سائنس کو علمی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں تو کچھ اور ہی کیفیت دکھائی دیتی ہے جو منظر اول سے قطعی جداگانہ اور مختلف ہے۔ ہر طرف عجیب و غریب قوانین قدرت جاری و ساری نظر آتے ہیں۔ اور جملہ قوانین میں اسقدر ہم آہنگی معلوم ہوتی ہے کہ کسی قسم کے تضاد و تباین کا امکان ہی نہیں

یہ رفتہ رفتہ منکشف ہونیوالا اتفاق و اتحاد اور یہ ہمدوشوں کھلنے والا توافق و تطابق سائنس کے کسی دوسرے شعبہ میں نظر نہیں آتا جسقدر کہ شعبۂ طبیعیات (Physics) میں نظر آتا ہے۔ حضرت عیسیٰ سے پانچ چھ سو برس پیشتر حکماء یونان نے سائنس کے میدان میں قدم رکھا۔ اور مختلف قسم کے تجربے کرنا شروع کردئے کسی نے میکانیات (mechanics) کی طرف توجہ کی تو کسی نے اداد کی جانب کسی نے حرارت کے متعلق نظریے قائم کئے تو کسی نے روشنی کے کسی نے برقی قوت کی طرف خیال دوڑایا تو کسی نے مقناطیس کی طرف اول اول سائنس کے یہ تمام شعبے قطعی جداگانہ سمجھے جاتے تھے۔ اور ان کو ملانے والی کوئی کڑی بظاہر دکھائی نہیں دیتی۔

آرشمیدیس (Archimedes) نے قوانین میکانکی اور پانی میں اشیاء کے ابھرنے کی تفتیش کی۔ فیثاغورس (pythagoras) نے علم الصوت (sound) کی تحقیق و تدقیق کی اور یہ معلوم کیا کہ کسی تنے ہوئے ڈورے اور اس آواز میں کیا تعلق ہے جو بوقت اہتزاز پیدا ہوتی ہے ہیرو (Hero) ساکن اسکندریہ نے علم الحرارت (heat) کے بعض اسرار معلوم کئے۔ مسیح سے چھ سو برس قبل تھالیس (Thales) کو سکونیات برقیہ (Electrostatics) اور مقناطیسیت (magnetism) کے کچھ حوادث معلوم تھے۔ عیسیٰ سے ساڑھے تین سو برس قبل ارسطو اور اس سے ۵۰۰ برس بعد اسکندریہ کے بطلیموس (ptolemy) نے روشنی کے متعلق اپنے بعض مشاہدات لکھے لیکن انکی حقیقت اور آپس میں تعلقات ان کو معلوم نہ ہوسکے۔ اس بات کا سہرا تھالیس اور ہیرو کے سر رہا۔

اسطرح ماضی بعید میں علم کے چھ چشمے جاری ہوئے جو امتداد زمانہ کے ساتھ طول و عرض میں بڑھتے چلے گئے۔ لیکن زمانہ قدیم کے بڑے بڑے مفکرین کی الہامی آنکھیں بھی یہ بات نہ دیکھ سکیں کہ یہ چھ چشمے کسی دن ایک دریائے ذخار کے معاون ثابت ہونگے یعنی سب مل جل کر ایک عظیم الشان نہایت عمیق، نہایت وسیع اور نہایت عریض دریا بنائیں گے جس کا نام دریائے طاقت (Energy) ہے۔

ان میں سے دو چشموں کا اتصال غیر محسوس طور پر اس وقت ہوا جب رفتہ رفتہ یہ راز کھلا کہ آواز قطعی طور پر حوادث میکانکی میں داخل ہے۔ اور میکانکی ہی کے ذرائع سے پیدا ہوتی ہے یعنی درحقیقت آواز نام ہے ذرات مادی کے دھڑکنے کا۔ اس طرح گویا یہ دو چشمے گلیلیو (Galileo) اور نیوٹن (Newton) کے زمانہ سے قبل ہی مل گئے تھے۔ ان دونوں عظیم الشان مفکرین نے علم پر جو احسانات کئے ہیں۔ ان کی وجہ سے سترہویں صدی میں اسقدر طغیانی پیدا ہوئی کہ وہ بالآخر ایک سیل رواں بنگیا۔

اسی اثنا میں بقیہ چشمے بھی عرض و طول میں بڑھتے بڑھتے دریا بنگئے۔ لیکن ہر دریا نے انیسویں صدی تک اپنی انفرادیت یا جداگانہ حیثیت قائم رکھی۔ لیکن جب کولامب (Coulomb) وولٹا (Volta) گوش (Gauss) اورسٹڈ (Oersted) ایمپیری (Ampere) اوہم (Ohm) اور فاراڈے (Faraday) نے حیرت انگیز انکشافات کئے تو جہاں تک برقی اور مقناطیسی قوتوں کا تعلق تھا، یہ سب دریا مل کر ایک عظیم الشان دریا بنگئے، یعنی "برقی و مقناطیسی طاقت کا دریا" ہو گیا (Electro magnetic energy) فاراڈے کے معاصرین کارنو (Carnot) اور جاول (Joule) طاقت میکانکی اور حرارت کا تعلق باہمی معلوم کرتے رہے۔ اس طرح سب دریا باہم ہو گئے اور میکانکی طاقت کا وہ عظیم الشان دریا اب تک بہتا چلا آیا۔ جس میں ہیمہولٹز (Helmholtz) قلاسیوس (Clausius) کیلون (Kelvin) بولٹزمان (Boltzman) گبس (Gibbs) اور پلینک (Planck) کے کارناموں نے مزید طغیانی پیدا کر دی۔

اب سنئے کہ دریائے نور کا کیا ہوا۔ نور ہی وہ چیز ہی جو قدرت کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اور نور ہی وہ چیز ہے جو آج تک حکما، اور علماء کے لئے مرکز اسرار بنا ہوا ہے۔ نور کا چشمہ بھی ترقی کرتے کرتے نیوٹن (Newton) اور ہائجنس (Huygens) کے زمانہ حیات میں اچھا خاصہ دریا بنگیا تھا۔ اور جوں جوں فرانہوفر (Fraunhofer) فرینل (Fresnel) فوکالٹ (Foucault) اور کرشہوف (Kirchhoff) کی طرف سے اس شعبۂ علم میں انکشافات ہوتے گئے اس دریا کا پانی زیادہ زیادہ بڑھتا گیا۔ لیکن جب ۱۸۷۵ء کے قریب جیمس کلارک میکسویل کی طرف سے تحقیق و تدقیق عمل میں لائی گئی تو دریائے نور کا بھی برقی مقناطیسی طاقت کے دریا سے اتصال ہو گیا۔ نور کی نسبت جو برقی و مقناطیسی نظریہ میکسویل نے قائم کیا۔ اس کی وجہ سے سائنسدانوں کی توجہ فوراً اس طرف منعطف ہو گئی کہ کوئی ایسا اصول اخراج طاقت (Radiation) تلاش کیا جائے جو روشنی سے تو ملتا جلتا ہو۔ مگر غیر مرئی ہو اور اس کی امواج کا طول بھی بہت زیادہ ہو۔ اسی سلسلہ میں سر اولیور لاج نے جو پر جوش جد و جہد دکھائی تو بہت سے علماء اس تلاش میں مصروف ہو گئے لیکن اس میں کامیابی حاصل کرنے کا سہرا ہرٹز کے سر

رہا جس نے سب سے پہلے ۱۸۸۸ء میں "لاسلکی" امواج معلوم کیں۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ امواج حرارت کا تعلق بھی ایک ہی قسم کی برقی مقناطیسی امواج یا اہتزاز سے ہے۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ اس کی امواج کا طول ہرٹز کی معلوم کردہ امواج کے طول سے بہت کم ہے مگر اشعۂ مرئی کے تموج کے طول سے زیادہ ہے۔ اس طرح رونٹجن کی معلوم کردہ پُراسرار اشعہ (عکس ریز (X Rays) بھی برقی و مقناطیسی امواج میں داخل ہو گئیں

الغرض اس طرح میکانکی طاقت کے دریائے بے پایاں کا پانی بھی برقی مقناطیسی طاقت کے دریا میں آملا۔ اور اس کے بعد طاقت اور مادہ کی نسبت وہ وہ جدید اکتشافات ہوئے کہ اس دریا کے پانی میں بھی طغیانی آگئی۔ اور انیسویں صدی کا خاتمہ سرِ جے جے ٹامس کے اکتشافِ برق پارہ (Electron) پر ہوا جو مادّہ کا اقل ترین ذرّہ معلوم ہے۔ ریڈایشن (Radiation) کے عمل کی نسبت جو کام موسیو بکریل اور موسیو و مادام کیوری نے جاری کیا تھا اس کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اور جب موجودہ صدی شروع ہوئی تو رودرفورڈ نے نظریۂ سالمات قائم کیا اور یہ راز منکشف کیا کہ جملہ عناصر مادی کی تکوین دو چیزوں سے ہوئی ہے جن میں سے ایک کا نام الکٹرون (برقپارہ Electron) اور دوسری کا نام "پروٹون" (Proton) ہے۔ رودرفورڈ کے تجربات پر بوہر (Bohr) کا نظریۂ سالمات قائم ہوا جس میں یہ بتایا گیا کہ سالمہ کے اندر کچھ ایسے کل پرزے ہیں جن سے بصورت اشعۂ عکس ریز، نور یا کسی دوسری صورت میں برقی و مقناطیسی طاقت کا اخراج ہوتا ہے۔ اس نظریہ کا اصل الاصول یہ ہے کہ کائنات میں ایک عظیم شے موجود ہے جسے "طاقت" (Energy) کہتے ہیں اور یہی ایک چیز مختلف صورتوں میں اپنے جلوے دکھا رہی ہے اسی خیال کو اپنے طور پر لورنٹز (Lorentz) اور اینسٹین (Einstein) نے لیا۔ اور انھوں نے ظاہر کر دیا کہ مادّہ اور طاقت میں باہمی تعلق کیا ہے۔ خود مادّہ یا اس کے اجزائے مفردہ یعنی "الیکٹرون" اور "پروٹون" کائنات کی بنیادی چیز یعنی طاقت (Energy) کے عظیم الشان مرکز ہیں۔ ابھی تک یہ راز نہیں کھلا کہ اس طاقت پر انسان قابو پا سکتا ہے یا نہیں کیونکہ طاقت کو ایک مرکز پر قائم کرنے کا راز جس کے ذریعہ سے مادّہ وجود میں آتا ہے اور مادہ کے حدوث کا راز جس کے ذریعہ سے خلائے بسیط میں طاقت منتشر ہوتی ہے ابھی تک قبضۂ قدرت میں نہیں ہے

(۲)

تکوین کائنات کے سنگ بنیاد یعنی طاقت یا "شکتی" کے حوادث پر جب ہم غور کرتے ہیں تو اس کے جلوے مختلف صورتوں میں ہر طرف نظر آتے ہیں۔ کہیں وہ مادہ کے اندر جاری و ساری ہے۔ کبھی وہ علیحدہ ہو کر نور سے نار بن جاتی ہے۔ اور کہیں وہ نار سے قوت میکانکی بن جاتی ہے۔ کبھی وہ برقی طاقت کی صورت میں نظر آتی ہے اور کبھی کیمیاوی طاقت کی شکل میں جلوہ دکھاتی ہے۔ ان جملہ مشاہدات کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین کی یہ تمام طاقت یا شکتی کہاں سے آتی ہے؟ زمین جس پر ہم چلتے پھرتے ہیں، ہوا جو ہم آلات تنفس کے ذریعہ سے اپنے اندر لیتے ہیں، اور خود ہمارے جسم اسی طاقت یا شکتی کے عظیم الشان مرکز ہیں، پھر یہ شکتی کہاں سے آتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ "ستاروں کی خاک" سے۔

خود ہماری زمین کسی زمانہ میں آفتاب کے سطحی مادہ میں شامل تھی۔ اور ہمارا سورج کروڑوں بلکہ اربوں ستاروں میں ایک ستارہ ہے جو نہ تو سب سے بڑا ہے نہ سب سے چھوٹا۔ نہ سب سے زیادہ گرم ہے نہ سب سے زیادہ سرد۔ الغرض سطح آفتاب سے کچھ مادہ الگ ہوا اور اس سے ہمارا سیارہ یعنی زمین بن گئی اور جہاں تک انسان کے نظام جسمانی کا تعلق ہے وہ خاک سے پیدا ہوا اور خاک مل جائیگا۔ اس لئے وہ بھی اسی مادہ سے پیدا ہوا جس سے وہ بڑا ستارہ یعنی سورج بنا ہوا ہے۔

جب ہم یہ بات معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ زمین کی غیر محدود طاقت یا شکتی کہاں سے پیدا ہوئی تو ہم جانتے ہیں کہ اسکی کشش ثقل اور کچھ مقدار حرارت کی خود اس کے اندر موجود ہے۔ لیکن وہ طاقت جو زمین کی سطح کا ٹمپریچر ایک معقول درجہ حرارت تک قائم رکھتی ہے، اور وہ طاقت جو سطح زمین پر موالید ثلاثہ یعنی حیوانات، نباتات اور جمادات بلکہ خود حضرت انسان کا وجود ممکن بنا دیتی ہے وہ باہر سے آتی ہے۔ یہ تمام طاقت زمین سورج اور ستاروں کی روشنی سے حاصل ہوتی ہے۔ اور چونکہ سورج خود ایک بڑا ستارہ ہے اس لئے یہ کہنا کافی ہوگا۔ کہ اس تمام عظیم طاقت کا منبع و مخرج وہی ہے۔ اگر علم النجوم کو ستاروں کا علم سمجھا جائے تو علم طبیعیات النجوم کو ستاروں کے نور کا علم سمجھنا چاہئے۔ پہلا علم قدیم ترین اور موخر الذکر جدید ترین ہے۔ لیکن باوجود نو زائیدہ ہونے کے بھی اس علم نے چند برسوں کے اندر ان کے علم و عرفان کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ کیونکہ نور النجوم کی طاقت کے مسئلہ پر جسقدر غور کیا جاتا ہے۔ اسیقدر حیرت انگیز جدید انکشافات ہو رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ زمانہ قدیم کے ماہرین فلکیات نے حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے تھے۔ انھوں نے آسمانوں کا نقشہ بنایا۔ انھوں نے یہ معلوم کرلیا کہ آسمان کے ستارے ہمارے لئے قدرتی گھڑی کا کام دیتے ہیں۔ انھوں نے یہ معلوم کیا کہ ستاروں کے ذریعہ سے ہمکو صحیح سمت معلوم ہوسکتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی معلوم کرلیا کہ سبع سیارگان یعنی سورج چاند اور پانچ بڑے دیگر سیارے جو ہم کو خالی آنکھ کے ذریعہ سے دکھائی دیتے ہیں اپنے اپنے مقررہ راستوں پر پوری پوری صحت کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔ یہ سب باتیں ان کو معلوم تھیں، اگرچہ وہ ان کے اسباب و علل نہیں بتا سکتے تھے۔ اور نہ ان کو انکی طاقت کی حقیقت پوری طرح معلوم تھی۔ انکی معلومات صرف ظاہری مشاہدات تک محدود تھی۔

ارسطو نے بھی اس نظریہ کی تائید و حمایت کی تھی کہ زمین کی تمام چیزیں اربع عناصر یعنی آب و آتش، باد و خاک کا مجموعہ ہیں۔ اور اجرام فلکی کی ترکیب ایک پانچویں عنصر سے ہوئی ہے جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل واقع نہیں ہوسکتا۔ اور یہی باعث ہے کہ زمین کے خلاف تمام اجرام فلکی ہمیشہ غیر متبدل رہتے ہیں۔ اس نظریہ میں بھی ستاروں کی روشنی کی طاقت کا کہیں پتہ نہیں۔ کیونکہ نظریہ طاقت کی رو سے ہر اس چیز میں جس سے طاقت کا اخراج ہوتا ہو تغیر و تبدل کا ہونا لازمی ہے۔ الغرض سب سے بڑی ضرورت اس بات کی تھی کہ عوام کے اذہان سے ارسطو کا مغالطہ انگیز نظریہ نکال دیا جائے۔ اس کے بعد علم طبیعیات النجوم پیدا ہوسکتا ہے۔ سترہ سو برس تک دنیا کو ارسطو کے نظریہ سے نجات نہ ملی۔ لیکن بالآخر گلیلیو نے ان زنجیروں کو توڑا۔ اس نے اپنی عظیم الشان دوربین کا منھ سورج کی طرف پھیرا اور معلوم کرلیا کہ اس میں تغیر و تبدل کی شہادتیں کثرت سے موجود ہیں۔ یعنی اس کی سطح کی درخشانی میں بھی تغیر ہوتا ہے، اس میں سیاہ دھبے بھی موجود ہیں۔ الغرض اس سے اور دیگر شہادتوں کے ذریعہ سے گلیلیو نے ثابت کردیا کہ تمام کائنات قانون تغیر و تبدل کے ماتحت ہے۔

اس کے بعد ستاروں کی روشنی کا مطالعہ کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔ لیکن ابھی تک روشنی کے تجزیہ کرنے کا کوئی طریقہ معلوم

نہ تھا۔ مگر جب سر آئزک نیوٹن مثلثی شیشہ کے ذریعہ سے روشنی کی شعاع کا اس کے مختلف اجزا میں تجزیہ کر لینے میں کامیاب ہوگئے تو یہ کمی بھی پوری ہوگئی۔ اگر ستارہ کی روشنی کی ایک شعاع کسی مثلثی شیشہ سے گذاری جائے تو وہ ایک شعاع کی صورت میں خارج نہیں ہوتی بلکہ بہت سی مختلف اللون شعاعوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور مختلف طاقتوں کے رنگ علیحدہ علیحدہ بالترتیب ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اس طرح ہر رنگ کی شعاع کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کیا جاسکتا ہے

اس طرح علم طبیعات النجوم کا راستہ صاف ہوگیا۔ اور جب اس سلسلہ میں فراؤنہوفر اور کرشاف نے تحقیق و تدقیق کی اور ستاروں کی روشنی کے طیف ([illegible]) کا بغور مطالعہ کیا تو یہ جدید علم وجود میں آگیا

(۳)

اگر ستارہ کی روشنی کو دوربین میں ایک اسپکٹراسکوپ (یعنی [illegible]) لگا کر دیکھا جاتا ہے تو رنگین روشنی کی ایک نظم دکھائی دیتی ہے جس کی حالت قوس قزح جیسی ہوتی ہے مگر تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر یہ رنگین روشنی سیاہ خطوط سے منقطع ہوتی ہے ستاروں کی روشنی کے طیف میں جو سیاہ خطوط ہوتے ہیں وہ گویا سربستہ علامتیں ہیں جنکے ذریعہ سے ہم ان ستاروں کے راز معلوم کرسکتے ہیں۔ اور ان کے متعلق طول امواج کی جو پیمائش ہے وہ گویا ان سربستہ علامات کی کلید ہیں۔

علم طبیعیات کا ہر ماہر بخوبی واقف ہے کہ ہر عنصر کے سالمات کی شناخت انتشار حرارت و نور ([illegible]) سے ہوسکتی ہے۔ مثلاً جب کسی ستارہ کی روشنی کے طیف میں ہائیڈروجن کے سالمات کا طول امواج پایا جائیگا تو ہم سمجھیں گے کہ وہاں ہائیڈروجن موجود ہے۔ اسی طرح کاربن، نائٹروجن، کیلشیم، لوہے وغیرہ کا وجود ستاروں میں ملتا ہے

ستاروں کی روشنی سے ایک بیش قیمت معلومات اس بارہ میں بھی حاصل ہوتی ہے کہ ستارہ کی گردش کیسی ہے جس طرح قریب آنیوالے انجن کی سیٹی کسیقدر تیز اور دور جانیوالے کی کسی قدر [illegible] ہوتی ہے اسی طرح جو ستارہ طلوع ہوتا ہے اسکی روشنی کے طیف میں سیاہ خطوط بنفشی رنگ کی شعاعوں کے قریب اور مائل بہ غروب ستارہ کی روشنی کے طیف میں سیاہ خطوط سُرخ روشنی کے قریب ہوتے ہیں

(۴)

ستاروں میں طاقت کہاں سے آتی ہے۔ اس سوال کے مختلف جوابات دیئے گئے اور وہ سب ناکافی اور غیر طمانیت بخش ثابت ہوئے۔ کیلون کا قول تھا کہ ستارہ بتدریج سکڑتا ہے۔ اس لئے اس کے اندر سے یہ قوت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ انتشار نور و حرارت کے ذریعہ سے یہ طاقت پیدا ہوتی ہے۔ اب یہ بتانا چاہئے کہ مختلف عناصر کی ترکیب باہمی کی وجہ سے یہ طاقت پیدا ہوتی ہے بعض ستارہ کو ایک جلتا ہوا کرۂ ہوا سمجھنا چاہیئے جس میں ہائیڈروجن کے سالمات ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔ اور ان کے باہم ملنے سے اور زیادہ پیچیدہ عناصر یکے بعد دیگرے وجود میں آرہے ہیں جن کا سالماتی وزن بڑھ رہا ہے۔ اور اسطرح مقناطیسی طاقت آزاد ہوتی جاتی ہے۔ مگر اس کے علاوہ ایک اور حیرت انگیز نظریہ یہ پیش کیا جاتا ہے۔ کہ کسی ستارہ کے اندر جب کوئی مادہ دفعتہً فنا ہوتا ہے تو اس سے یہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جب کسی ستارہ کے اندر الکٹرون اور پروٹون کا باہمی تصادم ہوتا ہے تو اس سے ایک دوسرے کی طاقت آزاد ہو جاتی

ہے۔ اس طرح وہ دونوں خود مادی صورت سے معدوم ہو کر طاقت کی صورت میں فضا کے اندر منتشر ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنے سورج کو لیجئے۔ سورج سے اسقدر طاقت خارج ہوتی ہے۔ کہ اگر اس کے جرم سے چالیس لاکھ ٹن مادہ فی سکنڈ فنا کیا جائے تو اسقدر طاقت پیدا ہو۔ اور سورج اسقدر طاقت کروڑوں برس سے ہر وقت صرف کر رہا ہے۔ اسی طرح ستاروں کی یہ طاقت بہت زبردست ہے مگر اس کی بھی کوئی حد ہے۔ اس لئے ایک طبیعی کی اصطلاح میں یہ سلسلہ "انحطاط و استقرار طاقت" کہلاتا ہے۔ اور ایک فلسفی کے نزدیک یہی چیز "تفضیح مادیات" اور استعلاء روحانیت ہے۔ کائنات میں ستاروں کے نور کی طاقت سے الکٹرون اور پروٹون بن رہے ہیں۔ پھر یہ دونوں چیزیں باہم مل کر سالمات، اور سالمات باہم مل کر سدیم (Nebula) بناتے ہیں اور سدیم میں پھر انجماد پیدا ہو کر ستارے وجود میں آتے ہیں۔ اور پھر ان ستاروں کا مادہ فنا ہو کر طاقت بنجاتا ہے اور اسی طرح قدرت کی عظیم طاقتوں کا ایک وسیع نظام قائم ہے۔

(۵)

نور نجوم کے مطالعہ سے ہم کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ اگرچہ آفتاب، نظام شمسی کا مرکز ہے مگر وہ کائنات کا مرکز نہیں ہے۔ ہمارا سورج لاکھوں کروڑوں ثوابت میں سے ایک ہے۔ اور ان ستاروں سے بھی آگے ذرات نور کی سیکڑوں پیچدار کہکشائیں موجود ہیں۔ اور یہ ہر کہکشاں لاکھوں کروڑوں ستاروں کا جھرمٹ ہے۔

اب اس عظیم الشان کائنات میں انسان اپنی حالت پر غور کرے کہ وہ اس وسیع اور لاانتہا کائنات کے مقابلہ میں کیا حقیقت رکھتا ہے۔ قدرت نے خلائے بسیط میں کروڑوں ستارے اس طرح بکھیر دئے ہیں جیسے کوئی کسان اپنے کھیت میں تخم ریزی کرتا ہے۔ لیکن یہ انتشار نجوم فضول اور رائیگاں نہیں ہے۔ قدرت کی لغت میں لفظ "فضول" معدوم ہے، کائنات کا ہر ستارہ خلاق ازل کی عظیم الشان قدرت کی ایک روشن نشانی ہے۔ جو ہر وقت ہم کو خدائے قدوس کے نہ سمجھ میں آنے والی قدرت و حکمت اور عظمت و جلال کا یقین دلاتی رہتی ہے۔

نیاز

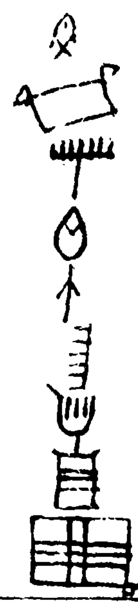
آثار و تاریخ

آثار قدیمہ کے ماہرین جو خدمت تاریخ کی انجام دے رہے ہیں، وہ اسقدر اہم ہے کہ شاید ہی اس سے زیادہ عظمت کسی اور چیز کو دی جاسکتی ہے۔

اب سے چند سال قبل کون کہہ سکتا تھا کہ بابل اور ہندوستان کی تہذیب عہد قدیم میں ایک تھی یا کون یہ دعوے کرسکتا تھا کہ قدیم ہند کی آبادی کا وہ حصہ جو دراوید (Dravidian) کہلاتا ہے براہ بلوچستان بابل ہی کی طرف سے آیا تھا۔ لیکن اب ارض بابل اور ارض ہند کے آثار سے جو نقوش برآمد ہوئے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ مسیح سے ۶۰۰۰ سال قبل ان کا باہمی تعلق کیا ہے۔ ذیل کے نقشے سے آپ کو ان کے اتحاد کا کافی علم ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کے لئے تقریباً ایک ہی نام خط دونوں جگہ جاری تھا۔

شے	تلفظ	تاریخ استعمال	بابلی نقش	ہندی نقش
مچھلی	خا	۲۸۰۰ سال قبل مسیح		
۳۶۰ (عدد)	سار	۲۹۰۰ "		
بڑا	غال	۳۰۰۰ "		
دل	ساغ	۳۰۰۰ "		
مردہ	باد	۲۸۰۰ "		
طرف	کو	۳۰۰۰ "		
ہاتھ	صو	۲۸۰۰ "		
ڈھکنا	اوص	۲۸۰۰ "		
گھر	اِی	۳۰۰۰		





عورت اہل فارس کے نزدیک

قدیم ایرانیوں میں عورت کی تہذیب و تربیت کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔ اور اسی لئے وہ اپنی عفت و پاکیزگی اور بلندی اخلاق کے لحاظ سے بڑے مرتبہ کی چیز سمجھی جاتی تھی ـــ صحیفۂ اوستا اور شریعت زردشت میں عورت کے حفظ ناموس کی بڑی تاکید کی گئی ہے، چنانچہ اسی تعلیم و ہدایت کا نتیجہ تھا کہ ایران کی بعض عورتوں نے سیاست و حکومت کے خدمات کو صد درجہ خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ ہمای بنت بہمن کے سی سالہ دور حکومت اور خسرو پرویز کی لڑکیوں پوراندخت اور آزرمیدخت کی کامیاب حکمرانی سے کون واقف نہیں ہے۔

قدیم ایرانیوں میں عورت کے حسن ظاہری اور حسن باطن دونوں کے لئے کچھ اصول علم فراست و قیافہ کے لحاظ سے مقرر تھے۔ اور وہ نہایت احتیاط سے ان اصول پر ایک عورت کے حسن و اخلاق کو جانچتے تھے۔ چنانچہ شیریں (فرہاد کی محبوبہ) کے متعلق مشہور ہے کہ ۴۰ صفات جمال میں سے ۳۹ صفات اس میں پائی جاتی تھیں اور حسن و اخلاق و وفا شعاری کے لحاظ سے بھی وہ اسقدر بلند مرتبت تھی کہ جب اس کا شوہر خسرو پرویز قتل کیا گیا اور شیرویہ فرمانروا ہوا تو اس نے خودکشی کرلی اور شیرویہ کے ساتھ رشتۂ ازدواج کو منظور نہ کیا۔

ایرانی عورتیں اپنی عفت و عصمت کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتی تھیں۔ چنانچہ عہد عباسیہ میں جب بغداد کے بازار میں مختلف ملکوں کی کنیزیں لائی جاتی تھیں تو ایران کی کنیزوں کی تعریف میں جو بات کہی جاتی تھی وہ ان کی عفت و عصمت اور حفظ شرف و ناموس سے متعلق ہوتی تھی۔

جب ملوک فارس کسی بیوی کا انتخاب کرتے تھے تو خواجہ سرا بھیجے جاتے تھے کہ وہ خود دیکھ کر معلوم کریں کہ اس میں تمام شرائط پائی جاتی ہیں یا نہیں، جب کوئی لڑکی پسند کرلی جاتی تھی تو اسے قصر شاہی میں لے آتے تھے اور وہاں اس کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی تاآنکہ وہ بادشاہ کی بیوی بننے کی اہل ہوجائے۔ یہ طریق کار کسرائے نوشیرواں کے عہد تک جاری رہا۔

ـــ ایرانیوں نے ۱۴ سال کی عمر سے لے کر ۲۰ سال تک۔ عورت پر جو تنقید کی ہے وہ خالی از لطف نہیں۔ چنانچہ ان کا بیان ہے:

چودہ سال کی عمر میں ایک عورت "اس برگ پوش گلاب کی طرح ہے نہ جس کا رنگ ابھی ظاہر ہوا نہ خوشبو"

پندرہ سال کی عورت ان کے نزدیک "سرو کا درخت ہے جسے نسیم کا ہلکا جھونکا بھی جھکا دیتا ہے۔"

سولہ سال کی عورت "ایک چشمہ ہے جو تنکوں اور پتیوں سے ڈھکا ہوا ہے لیکن اس کے نیچے شفاف پانی ہے"

سترہ سال ـــــ "ماہ کامل ہے عشوہ و ناز سے آراستہ"

۱۸ سال ـــــ "دوپہر کا چڑھتا ہوا آفتاب ہے جو آنکھوں کو خیرہ کردیتا ہے"

۱۹ سال ـــــ "پختہ رنگین سیب ہے کہ اگر کوئی اس کا توڑنے والا نہیں ہے تو زمین پر آرہتا ہے"

۲۰سال ——— "آفتاب ہے مائل بہ انحطاط"

۲۱سال ——— "سایہ دار صنوبر کا درخت ہے جس کے سایہ میں لوگ راحت پاتے ہیں"

۲۲سال ——— "ایک رباب ہے جس کے تاروں سے نغمے نکال کر لوگوں کو مست کر دیتے ہیں"

۲۳سال ——— "ہرنی ہے جسے صیّادوں نے گھیر رکھا ہے"

۲۴سال ——— "ایک قصیدہ ہے کہ کسی شاعر نے ایسا قصیدہ نہ کہا۔ اور جو مطلع سے مقطع تک بالکل ریں گلو بند معلوم ہوتا ہے"

۲۵سال ——— "نسیم سحر ہے جو بد مستوں کو جگا دیتی ہے"

۲۶سال ——— "گلاب کا پھول ہے جو پوری طرح کھل چکا ہے اور دیکھنے والا چاہتا ہے کہ اس کو توڑ کر اپنے سر و سینہ سے لگا لے"

۲۷سال ——— "بدر کامل ہے جو گھٹنے والا ہے"

۲۸سال ——— "ایک باغ ہے جس میں خزاں کے آثار شروع ہو گئے ہیں"

۲۹سال ——— "ایک اچھی آواز ہے جو تاریک رات میں دور سے سنائی دے اور کانوں کو بھلی معلوم ہو"

۳۰سال ——— "قدیم روایت ہے جس کا کسی وقت بڑا شہرہ ہو چکا ہے"

۳۱سال ——— "معطر پھولوں اور پختہ پھلوں سے لدا ہوا درخت ہے لیکن آخیر موسم کا"

۳۲سال ——— "شمع ہے جو اپنی عمر ختم کر چکی ہے اور جس کی روشنی بھی مضمحل ہو چلی ہے"

۳۳سال ——— "ایک کتاب ہے جس کا شیرازہ بکھر گیا ہے اور اوراق منتشر ہیں"

۳۴سال ——— "ایک مینا ہے جو کسی وقت عطر سے لبریز تھا لیکن اب اس میں صرف آثار خوشبو کے باقی رہ گئے ہیں"

۳۵سال ——— "ایک ضعیف سی روشنی ہے جو غروب شمس کے بعد ہی نظر آ سکتی ہے"

۳۶سال ——— "ستارۂ صباحی ہے جو جلد غروب ہونے والا ہے"

۳۷سال ——— "کسی معقفل مکان یا حمام کے اندر کی آواز ہے"

۳۸سال ——— "گرم پانی کا پیالہ ہے جو گرمی میں کسی پیاسے کو دیا جائے"

۳۹سال ——— "پرانا قصر ہے جس میں سوائے مٹے ہوئے نقوش کے اور کچھ باقی نہیں"

۴۰سال ——— "ایک ایسا حمام ہے جس میں ہوا کے لئے کوئی منفذ نہیں اور اگر انسان اس کے اندر آ جائے تو دم گھٹ کر مر جائے"

نیاز

بابُ الاستفسار

ظالم نیرون

(جناب عبدالغفار صاحب - حصار)

تاریخ روم میں شاہ نیرو بڑا ظالم و خونخوار بادشاہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ میں ممنون ہوں گا
اگر آپ مختصراً اس کے حالات و واقعات مظالم پر روشنی ڈالیں،

(نگار) اس میں کلام نہیں کہ نیرو فطرتاً نہایت ظلم پسند شخص تھا اور ایک عیش پرست، خود غرض اور سفاک بادشاہ ... ہے اس نے سب کیا، لیکن اس کے حکایات مظالم کو زیادہ ابھارنے والی چیز اس کی مخالفت مسیحیت تھی۔

یہ شخص وفات مسیح کے ۳۷ سال بعد پیدا ہوا۔ جب اس کی ماں نے شاہ کلاڈیس سے شادی کر لی تو ... اور جب ۵۴ء میں کلاڈیس مرا، تو یہ تخت نشین ہوا اور کلاڈیس کا حقیقی بیٹا برٹانکس جو پہلی بیوی سے تھا محروم ... مشیروں کی وجہ سے سلطنت کا نظم و نسق معقول طور پر چلتا رہا، لیکن بعد کو اس کی فطری برائیاں ابھر آئیں اور ... اور ستم رانی کی پوری داد دی۔ اس نے نہ صرف اپنے بھائی اور سلطنت کے حقیقی دعویدار برٹانکس کو قتل ... خوش کرنے کے لئے اپنی ماں اور منکوحہ بیوی دونوں کو قتل کرا دیا۔ اس نے پیروان مسیح کو نہایت بے رحمی سے قتل ... مسیحیت کے محو کرنے کے لئے اس نے اٹھا نہیں رکھا۔ اس کی بیرحمی اور سفاکی کی بڑی مشہور مثال وہ ہے کہ جب ... شہر روما کے دو تہائی حصہ سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے، وہ اپنے قصر میں دور سے تماشا دیکھتا ہوا اس ... اشعار گن گنا رہا تھا جو شہر ٹرائی کے جلنے کے متعلق ہومر نے لکھے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ... تھا اور اس میں شک نہیں کہ وہ قدرت کی طرف سے اس کا اچھا ذوق لیکر آیا تھا ...

ہوئی اور اس نے خودکشی کی تو اس کے آخری الفاظ یہ تھے کہ

"آج کتنا زبردست صاحب فن دنیا سے اُٹھ رہا ہے۔"

اس کے مظالم کی نوعیت کا اندازہ ذیل کے ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے:۔

نیرون (شہنشاہ روما) پورے ملوکانہ جاہ و حشم کے ساتھ اپنی گاڑی پر سوار جا رہا ہے، غلاموں کی ایک جماعت اس کے گرد سر جھکائے ہوئے ساتھ ساتھ ہے اور دربار کے امراء صف در صف دست بستہ جلو میں چل رہے ہیں۔ ناگاہ اسے ایک شخص نظر آیا جو اپنی شکل وصورت کے لحاظ سے ایسا مکروہ تھا کہ نیرون کی نگاہ سے کبھی ایسا مجسمہ بدصورتی کا نہ گزرا تھا۔

نیرون نے گاڑی روک دی اور اپنے غلام کو حکم دیا کہ اس شخص کو سامنے لایا جائے فوراً تعمیل ہوئی اور جب وہ بدشکل، پستہ قامت، مکروہ صورت انسان حضور میں آیا تو نیرون نے پوچھا ——— "تیرا کیا نام ہے" ——— اس نے جواب دیا "مجھے مرکوس۔ اسمنبا کہتے ہیں" ———

نیرون۔ "دیکھو اے مرکوس اسمنبا کل جلسہ کے بعد میرے محل میں حاضر ہو" مرکوس نے سر جھکا کر تعمیل فرمان کا وعدہ کیا اور چلا گیا۔

نیرون اپنے قصر میں بیٹھا ہوا ہے اور اس کا نہایت ہی محبوب و مقرب امیر اسکستوس سامنے مؤدب ایستادہ ہے۔

نیرون ——— "تیری جمیل لڑکی کلودیا کا کیا حال ہے؟"

اسکستوس نے نیرون کے منہ سے اپنی لڑکی کا نام سنا تو اس کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ لیکن اس نے ضبط سے کام لیکر عرض کیا۔ کہ "شہنشاہ کے جاہ و اقبال سے وہ اچھی حالت میں ہے"

نیرون نے کہا "اچھا کل جلسہ کے بعد اس کو میرے پاس بھیجدو" ——— اس کی آنکھوں سے جہنم کے شرارے نکل رہے ہیں

یہ سننے کے بعد اسکستوس پر جو گزر گئی اس کا اندازہ مشکل ہے، خوف و اضطراب سے اس کا برا حال تھا۔ ساری رات اس نے اسی درد و کرب میں بسر کردی اور مطلق اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ بادشاہ نے ٹھیک اسی وقت جبکہ وہ بدصورت انسان طلب کیا گیا تھا، اس کی لڑکی کو کیوں بلایا۔

دوسرے دن وقت معینہ پر اسکستوس اپنی بیٹی کو لیکر قصر شاہی پہونچا۔ کلودیا کے حسن و جمال اور تہذیب و شائستگی کے متعلق مشہور تھا کہ تمام مملکت روما میں اس کا نظیر و مثیل نہ تھا۔ قصر شاہی میں آنیکا یہ بالکل پہلا موقعہ تھا اور وہ خود بھی فرطِ حیا سے عرق عرق ہوئی جا رہی تھی۔

نیرون اپنے امراء و اراکین سلطنت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ کلودیا داخل ہوئی، نیرون نے اسے غور سے دیکھا اور بولا کہ اے لڑکی اس وقت تک میں نے تیرے حسن کا صرف ذکر ہی سنا تھا لیکن میں آج اسے آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، حقیقت یہ ہے کہ تو بہت حسین ہے

اور تیری نگاہیں ضیاء سحر سے زیادہ جمیل و روشن ہیں،،

اس کے بعد وہ اُس کے باپ سے مخاطب ہو کر بولا "اے سردار تیری لڑکی کی شادی کا وقت آگیا ہے اور چونکہ میں اپنی تمام رعایا کے لئے باپ کی سی حیثیت رکھتا ہوں اس لئے مجھے اختیار ہے کہ اس کے لئے شوہر کا انتخاب کروں،،

——یہ کہکر اس نے اشارہ کیا اور دروازہ سے وہی بدصورت، پستہ قامت مرکوس نکلا جو بادشاہ کو راستہ میں ملا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر سارا دربار دہشت زدہ ہو گیا۔ نیرودن فوراً کھڑا ہو گیا۔ اور بولا "سنو، بادشاہ کا اولین فرض عدل کرنا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ میں حسن و جمال میں بھی سب کا حصہ برابر نہ قرار دوں۔ اور ایک جمیل ترین عورت کو قبیح ترین مرد کے ساتھ وابستہ کر کے آئندہ نسل کو معتدل شکل و صورت کا نہ دیکھوں،،

مرکوس یہ سنکر بادشاہ کے قدموں پر گر پڑا اور بولا کہ "اے آقا، میں اس نعمت کا ہرگز مستحق نہیں ہوں،،

نیرودن نے غضبناک ہو کر کہا "کوئی شخص میرے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ دو ہفتہ کے اندر اگر تم دونوں کا نکاح نہ ہو گیا تو تمہاری اور اس کی دونوں کی خیر نہیں،، چنانچہ ان دونوں کو مجبوراً نکاح کرنا پڑا اور نیرودن کا یہ جذبہ ستم کہ وہ ایک جمیل عورت کو قبیح مرد کے پہلو میں زندگی سے بیزار دیکھے، پورا ہو کر رہا۔

مہاتما گاندھی کس فلسفہ کے متبع ہیں۔

(جناب محمد اصغر حسین خاں صاحب۔ بروچ)

مہاتما گاندھی نے یہ تو بارہا ذکر کیا کہ وہ (Optimist) ہیں یعنی مایوسی ان کو کبھی لاحق نہیں ہوتی اور وہ ہمیشہ اُمید و کامیابی کے روشن پہلو کو دیکھتے ہیں لیکن اس سے صرف انکی فطری شگفتگی ظاہر ہوتی ہے نہ کہ ان کی عملی زندگی کا فلسفہ جو غالباً اس کے منافی ہے۔ اس لئے اگر زحمت نہ ہو تو مطلع فرمائیے کہ ان کی موجودہ سیاسی جد و جہد کس فلسفہ کی تحت میں رکھ سکتے ہیں

(نگار) سوال نہایت دلچسپ ہے گو اہم نہیں۔ دلچسپ اس لئے کہ نظریات (Theorems) کی دنیا میں عقلی و خیالی گفتگو جب کہ انسان کو اپنی کرسی چھوڑنے کی بھی زحمت گوارا کرنا نہیں پڑتی ہمیشہ دلچسپ ہوا کرتی ہے اور غیر اہم اس لئے کہ وقت کا اقتضاء یہ نہیں ہے کہ مہاتما گاندھی کے فلسفہ پر گفتگو کی جائے بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک بار آمادہ ہو کر اس پر عمل شروع کر دیا جائے بغیر اس خیال کے کہ وہ کوئی فلسفہ ہے یا نہیں اور ہے تو کیا اور کس طرح ؟

اگر آپ خود گاندھی جی سے یہ سوال کرتے تو غالباً وہ اس کا جواب یہی دیتے کہ "عمل کا کوئی فلسفہ سوائے اس کے نہیں کہ عمل کیا جائے،، لیکن چونکہ مجھے بھی باتیں ہی بنانا زیادہ آتا ہے اس لئے میں آپ کو یہ جواب نہ دوں گا۔ اور غور کروں گا کہ گاندھی جی کی اس جد و جہد کو کھینچ تان کر کس فلسفہ سے ملایا جا سکتا ہے۔ جب سے انسان روئے زمین پر آیا ہے اسی وقت سے حسب استعداد وہ کوشش کر رہا ہے کہ دنیا میں امن و سعادت کے ذرائع دریافت کرے، لیکن فرق یہ ہے کہ اول اول انسان جب جاہل تھا، وحشی و ناتراشیدہ تھا،

اُس کے اس خیال نے کوئی علمی شان پیدا نہیں کی تھی۔ اور بعد کو جب آہستہ آہستہ انسانی زندگی کے تمام مظاہر علم و فلسفہ سے متعلق کئے جانے لگے تو اس خیال نے بھی علمی صورت اختیار کی اور ماہرین علم و فلسفہ غور کرنے لگے کہ امن و سعادت کی ماہیت کیا ہے اور اس کے حصول کی کیا کیفیت ہے۔

اس جستجو میں سب سے پہلے انھیں طبیعت انسانی پر غور کرنا پڑا کہ اس کا کیا اقتضار ہے اور وجود انسانی کی غایت کیا ہے۔ اور اس طرح گویا علم النفس وجود میں آیا اور اسی پر تمام فلاسفہ نے اپنی تحقیق کی بنیاد قائم کی۔

اچھا اب غور کیجئے کہ طبیعت انسانی کیا ہے۔ زندگی کی غایت کیا ہے، انسان دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں کیوں امتیاز رکھتا ہے؟ ان سوالات کے جواب مختلف لوگوں نے مختلف دیئے ہیں۔ ابیکورس اور اس کے متبعین کہتے ہیں کہ "انسان بھی دوسری حیوانات کی طرح ہے کہ جب تک لذت جسمانی کی خواہش اسے مجبور نہ کرے وہ حرکت و عمل کو پسند نہیں کرتا اور عقل انسانی صرف ایک وسیلہ ہے جس کے مدد سے ہم اس تلذذ کو متعین کرتے ہیں۔ اور لذت و اذیت کے درمیان خط فاصل کھینچتے ہیں"

اس فلسفہ کے متبعین کا خیال ہے کہ سعادت نام ہے اس لذت کا جو کم سے کم حرکت و عمل کے بعد حصول غذا سے متعلق ہوتی ہو۔ کھانے کی لذت کو انھوں نے سب سے اعلیٰ مقام رکھا ہے کہ وہ اولین فطری ضرورت ہے جس سے کسی جاندار کو مفر نہیں۔ انھوں نے لذت کی تین قسمیں قائم کی ہیں (۱) جو فطری ہو اور ضروری ہو جیسے غذا (۲) جو فطری ہو لیکن ضروری نہ ہو جیسے محبت (۳) جو نہ فطری ہو نہ ضروری جیسے ہوس۔

لیکن ایک جماعت بالکل اس فلسفہ کے مخالف ہے اس فلسفہ کا نام انگریزی میں (Stoicism) ہے اور اسکے متبعین کو (Stoics) کہتے ہیں۔ عربی میں اس فلسفہ کو وہ "فلسفۃ التجلد" کہتے ہیں اور ان لوگوں کو "رواقیون"۔ انھوں نے انسانی عقل و حیات معنوی کو جسمانی زندگی سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ ان کی نظر میں انسان دوسری جاندار مخلوق کی طرح نہیں ہے بلکہ ارادہ اور قوۃ فکر کی وجہ سے وہ اس کو سب سے ممتاز سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ سعادت کا حصول حیات معنوی پر منحصر ہے نہ کہ حیات بہیمی پر۔ ان کے نزدیک سعادت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب عقل انسانی مادی زندگی کے قیود و روابط سے علیحدہ ہو جائے۔ ذیل کے واقعہ سے آپ کو ان کے فلسفہ کا علم اچھی طرح سے ہو جائے گا:۔

اس جماعت کا ایک بڑا فرد ابکتاتوس نامی تھا جو اول اول روم کے کسی رئیس کا غلام تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ دوسرے غلاموں نے اس پر چوری کا جھوٹا الزام عاید کیا۔ جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے انکار کیا۔ مالک نے حکم دیا کہ

"اس کے پاؤں پر کوڑے لگائے جائیں تاکہ یہ اعتراف جرم کرے"

ابکتاتوس باوجود سخت تکلیف و اذیت کے خاموش رہا اور اس نے کوئی فریاد بلند نہیں کی۔ آخر میں اس نے اپنے مالک سے پاؤں کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ "اے میرے آقا، میرا پاؤں ٹوٹنے ہی والا ہے اور اگر وہ ٹوٹ گیا تو میں بیکار ہو جاؤں گا اور آپکا نقصان ہوگا"

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ فلسفۂ تجلد کے پیرو کس خیال کے لوگ تھے۔ انھوں نے اشیا و حوادث کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے ایک وہ جنکا تعلق انسان کے ارادہ سے نہیں ہے۔ مثلاً صحت و مرض، حیات و موت وغیرہ، دوسرے وہ جنس کا تعلق عقل و

وجدان سے ہے۔ جیسے حزن و مسرت۔ لذت والم وغیرہ، بس ان کے نزدیک حکیم وہ ہے جو قسم اوّل کی باتوں سے اعراض کرکے صرف قسم ثانی کی طرف توجہ کرے اور استقلال فکر سے کام لیکر اپنی ذات کو امن وسعادت کی اشاعت کے لئے وقف کردے۔

ابکتاتوس کے اقوال ذیل سے اس کے فلسفہ پر کافی روشنی پڑتی ہے:۔

(۱) جو چیز گم ہوجائے اس کی نسبت یہ نہ کہو کہ میں نے اسے ضائع کردیا بلکہ یہ کہو کہ میں نے اسے واپس کردیا۔

(۲) جس وقت موت آئے گی تو میں اپنی زندگی اس طرح اس کے سپرد کردوں گا گویا کہ وہ میرے پاس امانت تھی۔

(۳) اگر تو اُن زاہدوں میں سے ہے جو جسم کو تکلیف میں رکھتے ہیں تو غرور نہ کر۔ اگر تجھے کبھی شدید پیاس محسوس ہو تو شیریں پانی منہ میں لے کر کُلی کرلے، لیکن یہ سب کچھ خلوت میں کر جہاں کوئی دیکھنے والا موجود نہ ہو۔

میں نے جہاں تک گاندھی جی کی زندگی اور ان کے مقاصد پر غور کیا ہے۔ ہمیں انھیں اسی فلسفۂ تجلد کا پیرو پاتا ہوں، خواہ وہ اس کو محسوس کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں۔

نیاز

مطبوعات موصولہ

روحِ جذبات | مختصر سا مجموعہ ہے حضرت اکبر حیدری کے بعض نظموں غزلوں اور قطعات کا جسے اڈیٹر نیرنگ دہلی نے شائع کیا ہے۔

حضرت اکبر حیدری کا کلام ملک میں اسقدر معروف ہو چکا ہے کہ اس پر تقریظ و تنقید لکھنا یا ملک سے اسکو روشناس کرانے کی زحمت اختیار کرنا تحصیل حاصل سے زیادہ نہیں۔ کوئی رسالہ ایسا نہیں جس میں ان کا کلام کبھی نہ کبھی شائع نہ ہوا ہو اور شاید ہی کوئی ادبی صحبت ملک میں ایسی برپا ہوئی ہو جس میں کسی نہ کسی صورت سے جناب اکبر کا کلام موضوع گفتگو نہ قرار پایا ہو۔ جناب اکبر حیدری کی شاعری کا آغاز اس زمانہ میں ہوا جب اُردو شاعری بالکل جدید دور سے گزر رہی تھی اور یہ واقعہ ہے کہ اس دور کے اساطین شعر کا جب ذکر کیا جائیگا تو سخت سے سخت نقاد بھی اکبر حیدری کو نظر انداز نہیں کر سکتا

جناب اکبر حیدری کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ آغاز ہی میں وہ اپنے جذبات کی ایک فضا پیدا کر دیتی ہے۔ اور پڑھنے والا مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اس فضا میں ہو کر شاعر کے ساتھ ساتھ پرواز کرے۔ اور پھر چونکہ ان کی شاعری کی فضا بہت بلند و لطیف ہے اسلئے تھوڑی دیر کے لئے انسان یہ سمجھنے پہ مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اس دنیا سے علیحدہ کسی اور عالم میں پہونچ گیا ہے۔ پھر انکا یہ رنگ کسی خاص صنف کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ غزل ہو یا رباعی، قطعہ ہو یا مثنوی ہر جگہ یکساں قوت کے ساتھ نظر آتا ہے اور شاعر کی انفرادی خصوصیت کو اس طرح نمایاں کرتا رہتا ہے۔ ذیل کے بعض اشعار سے غالباً میرے اس قول کی تصدیق ہو سکتی ہے:۔

بے تکلف تجھے خدا کہنا ہائے۔ اس سادگی کا کیا کہنا

تیری عنایتیں ہیں کہ دنیا بدل گئی ورنہ یہی زمین یہی آسمان تھا

جہانِ زیست میں جسکو کبھی سکوں نہ ملا خبر نہیں اسے مرنے کا حکم کیوں نہ ملا
خبر نہیں یہاں اندازِ گفتگو کیا ہے دیارِ عشق میں کوئی بھی ہمزباں نہ ملا

سادگی ہے اور تیرا اعتبار دل نہ ٹوٹے لے تسلی رکھنا

کبھی تو سجدۂ بے احتیاج بھی کر لے ہزار سجدے روا ہیں اگر ضرورت میں

جب دیکھو ذکرِ عشق ہی وردِ زباں گیا اک جیتے جی شہید انھیں تھا دیوانہ بن گیا

اک تبسم ہے انکے ہونٹوں پر یا مری گم شدہ جوانی ہے

ضرورت ہے کہ ملک کے نوجوانوں اور طلبہ کے سامنے نظم کی جو کتابیں پیش کی جائیں وہ بلند ذوق کی ہوں اور ایسی کتابوں کے سلسلہ میں "روح جذبات" کو جس کا زیادہ صحیح نام (جذبات روح) ہو سکتا ہے اولین فہرست میں شامل ہونا چاہئے۔

یہ مجموعۂ دلنواز ایک روپیہ میں اڈیٹر نیرنگ دہلی سے مل سکتا ہے

مثنوی ناسخ | شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی کی ایک مثنوی میلاد و مناقب کی کمیاب تھی، اب اس کو حبیب اللہ خاں صاحب ام اے ریسرچ اسکالر الہ آباد یونیورسٹی نے بالکل جدید اصول ترتیب کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اور کتابستان الہ آباد نے ٹائپ کے حروف میں شائع کیا ہے۔ کتابستان الہ آباد کا جدید لیکن نہایت ہی مہذب و آراستہ دار الاشاعت ہے جس نے ٹائپ میں اشاعت کا انتظام کیا ہے۔ اور ضرورت ہے کہ پبلک اس کی ہمت افزائی کرے۔ یہ کتاب ۱۲؍ میں مل سکتی ہے۔

نیاز

محبت

اے دوست! فضائے ہستی میں تا چند یہ سعی بے حاصل　　ہر عشرتِ دوراں بے معنی، ہر کشمکشِ دنیا باطل
دنیا کہ ہجومِ کاوش سے تاریک ہے جس کی پیشانی　　مجروح ہیں جس کے سایہ میں اجزائے حیاتِ انسانی
دنیا کہ بایں اندازِ جنوں، دانش کے ترانے گاتی ہے　　اک تلخ و گراں گمراہی میں آسائشِ منزل پاتی ہے
دنیا کہ گدازِ باطن کے احساس کی لذت یاب نہیں　　تا حدِ بیاں ہے سوزشِ پنہاں، روح مگر بیتاب نہیں
دنیا کہ رہینِ بیتابی ہے تیغِ جفا کے سائے میں　　ہر وقت جو لرزاں رہتی ہے خطراتِ فنا کے سائے میں
دنیا کہ سرشکِ ماتم سے تعمیرِ تبسم کرتی ہے　　نالوں کی فضا میں ترتیبِ اجزائے ترنم کرتی ہے
دنیا کہ جہاں مقصودِ عبادت اصل میں ہے تکمیل ریا　　ہوتی ہے حریمِ نفس کی تاریکی میں نمازِ روح ادا

دنیا کہ بنا لیں ہیں جس کی اک ضبط شکن نادانی پر
اوہام کے دھندلے پردے ہیں ایوانِ حیاتِ فانی پر

اے دوست نکل جائیں، اب آ، اس دائرۂ آلام سے ہم　　تا چند فریبِ ہستی میں بیگانہ رہیں انجام سے ہم
مایوس نہ ہو! ہم باطل کی تاریکیوں کو کھو سکتے ہیں　　ہاں! قیدِ حیاتِ فانی میں ہم پھر بھی رہا ہو سکتے ہیں
اوہام کے اس تاریک فضا کو حسنِ عمل سے چمکا دیں　　گمراہ و غلط بیں دنیا کو اسرارِ محبت سمجھا دیں
اک آگ لگا دیں روحوں میں ایسی کہ تڑپ جائے دنیا　　آ، گائیں محبت کے نغمے، بستی بستی، صحرا صحرا
ہر سانس ہجومِ سوز دروں سے ایسے شعلے بھڑکائے　　ہو خاک زمانہ جل بجھ کر، اور خاک ہوا میں اڑ جائے
کیا غم جو ضمیرِ خوابیدہ اس طرح سے بھی بیدار نہ ہو　　انسان، سرودِ سازِ محبت سننے پر تیار نہ ہو
پروانے کی صورت تڑپیں گے اور دنیا کو تڑپائیں گے　　کچھ بھی نہ سہی، اس آگ میں ہم خود جل کے فنا ہو جائیں گے
آئیگی بہارِ جاں پرور، ہر غنچۂ دل کھل جائے گا　　انسان کو پتہ تو اس فردوسِ راحت کا مل جائیگا
مقبولِ سماعت جس میں نہیں افسانۂ عقل و نادانی　　آئینِ محبت پر مبنی ہے نظمِ حیاتِ انسانی
ہر صبح جہاں عشرت کے شگفتہ پھول کھلائے جاتے ہیں　　ہر شب جس میں صہبائے طرب کے جام پلائے جاتے ہیں
احساسِ عناد و سعیٔ جفا کا دخل نہیں اس جنت میں　　خود کام جہاں انساں نہیں تعمیرِ حریمِ راحت میں

ذرہ ہے جہاں آسائش دل، کاہش و الم کا نام نہیں
اک عشرتِ سرمد ہے ہستی خطراتِ فنا سے کام نہیں

علی اختر (از حیدرآباد دکن)

کہسارِ مسوری

(۱)

کاشانۂ راحت ہے کہسارِ مسوری میں !
میخانۂ عشرت ہے کہسارِ مسوری میں !
فردوسِ مسرت ہے کہسارِ مسوری میں !
میرے لئے جنت ہے
کہسارِ مسوری میں

(۲)

ہر وادیٔ نسریں کو فردوسِ حسیں کہئے
ہر غنچۂ سیمیں کو خورشیدِ جبیں ——— کہئے
ہر لالۂ رنگیں کو ——— اک شمعِ مبیں کہئے
رعنائیٔ فطرت ہے
کہسارِ مسوری میں

(۳)

وہ دامنِ مشرق میں انوار کی رخشانی
وہ "ابرِ بہاریں" کی ——— فردوس بدامانی
رشحاتِ دُر افشاں کا اندازِ دُر افشانی
"تنویرِ صباحت" ہے
کہسارِ مسوری میں

(۴)

وہ صبحِ بہارستاں وہ ابرِ خرامیدہ !
وہ کیفِ نشاط آگیں، وہ مستیٔ پاشیدہ !
وہ خلدِ سکوں پرور ——— وہ جنتِ خوابیدہ !
"خاموش مسرت" ہے
کہسارِ مسوری میں

(۵)

ہر بزم میں اک ایسی تصویر نظر آئی
"اللہ جمیل" کی تفسیر ——— نظر آئی
یا ——— خوابِ زلیخائی تعبیر نظر آئی
بتخانۂ الفت ہے
کہسارِ مسوری میں

(۶)

ہر گوشے میں عشرت کا میخانہ نظر آیا !
ہر قصرِ مسرت کا کاشانہ نظر آیا !
دیکھا جسے، وہ غم سے بیگانہ نظر آیا !
ہر گام پہ راحت ہے
کہسارِ مسوری میں

(۷)

اک نور ابلتا ہے ہر چشمۂ سیمیں سے
اک حسن ٹپکتا ہے ہر جلوۂ رنگیں سے
اک کیف برستا ہے ابرِ طرب آگیں سے
طوفانِ لطافت ہے
کہسارِ مسوری میں

(۸)

جب کوہ پہ مصروفِ گلگشت نظر آئیں
گجرات کی لیلائیں، کشمیر کی سلمائیں
مدہوش نہ پھر کیوں ہوں معصوم تمنائیں
نو بادۂ فطرت ہے
کہسارِ مسوری میں

(روش صدیقی)

شامِ گورستان

وقت کی رفتارِ بے آواز کتنی تیز ہے   شش جہت میں روئے شب کا عکس ظلمت ریز ہے
آگئی نظارہ ہائے شام پر کالی نقاب   چھپ گیا آغوشِ مغرب میں نگارِ آفتاب
سوگئی گہوارۂ ظلمت میں دن کی زندگی   رات کے کالے پردوں سے گر رہی ہے تیرگی
جم گیا ہے قالبِ ہستی میں ہنگاموں کا خون   تھم گیا ہے شورشِ عالم کا سیلابِ جنون
نیند یعنی موت کی محویتوں کا ایک خواب   موت کے دامن میں استغراقِ راحت کا سراب
نیند یعنی بے حسی کا بربطِ خواب آفریں   مستی کے بادۂ سیال کا کیفِ حزیں
نیند گہری نیند، بیداری کی مرگِ ناگہاں   بن گئی ہے پاسبانِ انتظامِ دو جہاں
رات کے تاریک پردے میں نہاں ہے کائنات   محوِ حیرت ہوں کہ کتنی بے زباں ہے کائنات
چھا گیا ہے محفلِ ہستی پہ افسونِ ممات   ڈھونڈ شمعِ دیدۂ بینا سے آثارِ حیات

آہ یہ وقت، اور گورستان کا رنگِ سکوت   بہ رہی ہے نیستی کے گھر میں اک گنگِ سکوت
کیا جنوں آموز ہے شہرِ خموشاں کی فضا   کس قدر دلدوز ہے شہرِ خموشاں کی فضا
سوچ میں ڈوبا ہوا ہے موت کا محکم وقار   زندگی کی بے بسی ہر سمت سے ہے آشکار
عشق کا خالق تھا جن کے حسنِ تاباں کا گداز   جنکے پاؤں پہ ہوا کرتے تھے سجدے سرفراز
جنکی تدبیرِ جہانبانی پہ حیراں تھی شکست   جنکی پیہم یورشوں سے خانہ ویرانی شکست
جنکے محکم عزم سے لرزاں تھے تقدیروں کے دل   جنکے نعروں سے دہل جاتے تھے شمشیروں کے دل
جنکے ہر ذرے میں اک آتشکدہ مستور تھا   جنکا ہر بے خود نفس اک نعرۂ منصور تھا

سو رہے ہیں یوں لحیراں ہے جمودِ قبر تک
یہ گماں ہوتا ہے چونکیں گے نہ روزِ حشر تک
دیکھ غافل رونقِ ایوانِ ہستی کا مآل
خوں رُلاتا ہے جہاں کی بستی بستی کا مآل
کیا خبر ملتا ہے کن کن ہستیوں کو خاک میں
تیر باقی ہیں ہزاروں ترکشِ افلاک میں

موت کے بے رحم پنجے سے نہیں ممکن نجات
آہ اس خونیں شکنجے سے نہیں ممکن نجات
حشمتِ جمشید ہو، یا بختِ دارا کا عروج
ملتِ بیضا کے دن ہوں یا نصاریٰ کا عروج
عالمِ فانی میں کوئی طاقتِ گردوں وقار
رہ نہیں سکتی ہمیشہ بامُراد و کامگار
رخصتِ دورِ خزاں ہے آمدِ فصلِ بہار
اور ہوتی ہے بہار آخر خزاں سے ہم کنار
جلوۂ مہرِ درخشاں موت ہے ظلمات کو
کانپتے رہتے ہیں ننھے ننھے تارے رات کو
چاند کی تکمیل دیتی ہے اُسے درسِ زوال
آہ تمہیدِ تنزل ہے کہ تحصیلِ کمال

زندگی کی کشمکش سے کچھ ملے فرصت اگر
بیٹھنے دے چین سے افکار کی کثرت اگر
رُوح کو محبوس کر دوں پیکرِ تحریر میں
خونِ دل سے رنگ بھر دوں شعر کی تصویر میں
رُوح زندہ ہے تو چشمِ رائگاں کا کیا ملال
جو زیانِ عارضی ہو، اس زیاں کا کیا ملال
"یہ مری ہستی کہ ہے اک شعلہ زارِ آرزو"
جس کے ہر ذرّے میں رخشاں ہے شرارِ آرزو
گو کسی دن لقمۂ جورِ قضا ہو جائے گی
خاک میں مل جائے گی یکسر فنا ہو جائے گی
پر مری آواز جو اک نالۂ پُر جوش ہے
جس کی ہر لَے میں شرارِ زندگی رُوپوش ہے
غلغلہ افشاں رہے گی گنبدِ افلاک میں ؛
حشر تک لرزاں رہے گی گنبدِ افلاک میں

عدم

سحرِ مری

صبا بر دوش خوشبو آرہی تھی شوخ نکہت کی   طرب انگیز تھی آہنگ نوائی ساز فطرت کی   ابھی پردے سے کر تھا نا شناسِ ذوقِ عریانی   نہاں تھی پردۂ شب میں شفق کی شعلہ سامانی
کہیں کوئل بھی آموں پر اڑاتی رس بھری تانیں   پپیہا کی کہیں پی پر فدا تھیں سیکڑوں جانیں   مسلط خواب تھا اک اک نہالِ صحنِ گلشن پر   گہر شبنم نے برسائے تھے ہر سو گل کے دامن پر
کہیں شاخوں کے نغموں سے عیاں تھی "لرزشِ آبی"   کہ جس سے کنج کی ہر شاخ پر تھی محویت چھائی   شرابِ "نیم شب" کی مستیاں چھائی تھیں فطرت پر   "خمارِ نوم" کے پردے پڑے تھے گل کی خلوت پر
صدائیں فاختہ کی تھیں سرور افزا بہار افزا   ادائیں تھیں کبوتر کی غرور افزا خمار افزا   صبا کے بھی خرامِ ناز میں تھا درسِ بیداری   تبسم میں بھی تھا غنچوں کے بھی انداز فسونکاری

غرض قسمت جھلکتی تھی فضائے حسنِ فطرت کی   کہ ناگہ ایک دوشیزہ سرِ صحن نظر آئی
صدا ہر سو سے آتی تھی لطافت ہی لطافت کی   تمناؤں میں ہنگامہ ہوا ظالم کدھر آئی!؟

سحر کا ہر تبسم تھا بطرزِ خود شباب آگیں   چمن پر تھی وہ کیفیت خمار آگیں شراب آگیں   ادائے زلف برہم سے نظامِ صبر میں لغزش   جبینِ ماہ پیکر سے محیطِ ہوش میں لرزش
شعاعیں مہر کی نکلی تھیں فضائے حسنِ گلشن سے   ہوائیں کھو سی تھیں خود دنگ کر اپنے ہی دامن سے   سحر کی سیم زائی، غرق، غرقِ ناز میں اس کے   کرن کا نور وابستہ ادائے زلف برہم سے
"عروسِ صبح" پر چھایا ہوا تھا منظرِ رعنا   جسے کہتے ہیں اہلِ ذوق "طوفانِ تلاطم زا"   شہادت لوٹ اس کے ابروئے خمدار و نازک پر   غضب آلودہ مژگاں میں نہاں تھے سیکڑوں نشتر
نئے جلوے نظر آتے تھے جو گلزارِ فطرت میں   وہ خود ڈوبے ہوئے تھے بادۂ حسن و لطافت میں   ہلاکِ چشم تھی خود ہی تبسم کی فسونکاری   غزالِ شرم و غیرت آسماں کی [illegible]

پیامِ حسن تھا پیہم چمن مینائے عشرت سے   لرز جاتیں فضائیں، اس کی ادنیٰ سی جسارت پر
نگاہِ "حسن پیما" کے لئے، گلزارِ جنت سے!   برس پڑتیں شرابیں شوق کے حسنِ ارادت پر!!

لبوں میں بجلیاں تھیں بجلیوں میں شعلہ سامانی   تکلم پر تصدق تھی عنادل کی غزلخوانی
شہابی رنگ تھا لب کا جواب لالۂ رعنا   بظاہر لعلِ یمانی بباطن لولوے لالا
گلِ عارض پہ اک تل تھا نشانِ فطرتِ مضطر   حریمِ حسن کی آغوش میں اک کفر کا منظر
بنا گوش میں اک پارۂ نیلم ضیا افشاں   بساطِ حسن پر یا قطرۂ سیمابِ لرزاں سا

صباحت گرد اس کی طرحِ قیامت کی
نزاکت میں لطافت تھی، لطافت پر ست تھی

ڈھلے تھے نور میں شانے، بلا کا نور کی ان پر   کنارِ صدرِ یمن میں شبابِ حسن خود مضطر
کھلے شانوں تلک اسکے تازگی ساعدِ سیمیں   عبارت بس انھیں سے بیگماں تھا خوشۂ پروین
حنا سے بے خبر ہاتھوں میں پوشیدہ گلستاں تھا   قدم کی شوخیوں میں حشرِ خاموش پنہاں تھا
صباحت پر فدا کیفِ ضیائے صبح کافوری   لطافت پر تصدق جلوہ ہائے حسنِ ناطوری

غرض وہ کارگاہِ رنگ و بو میں شاہکارِ فطرت تھی
بساطِ خاک پر اک پیکرِ حسن و لطافت تھی

وہ چل پڑتی تو دنیائے تمنا گرد ہو جاتی   جو رک جاتی تو نبضِ شوق بالکل سرد ہو جاتی
نقوشِ برق ہوتے رونما اسکے تبسم پر   تمنا (محبت) کروٹیں لیتی ادائے ہر تکلم پر
اگر خاموش لب ہوتے تو آنکھیں گفتگو کرتیں   نگاہیں منجمد ہوتیں تو شرحِ آرزو کرتیں
فضائیں کانپ اٹھتیں اگر تیور بدل جاتے   نظر جب شرمگیں ہوتی تو صد ہا دل مچل جاتے

بہارِ پیکرِ رنگیں میں پنہاں شوخِ فطرت تھی
یہی کہئے نہ کیوں اسکو قیامت ہی قیامت تھی!

ادائیں اپنے حلقے میں لئے یوں قامتِ زیبا   کہ جیسے چاند کے چاروں طرف ہو چاند کا ہالا
بچھا تھا تختۂ سبزہ حدودِ موجِ دریا تک   لپکتے تھے گلِ خودرو کنارِ ریگِ صحرا تک
یہیں سے سلسلہ تھا آبشارِ کیف پرور کا   یہی آغاز بھی تھا کوہسارِ چرخ پیکر کا
کہیں ذرے چمکتے تھے تہِ آبِ مصفا میں   کہیں سبزے لپکتے تھے فرازِ کوہ و صحرا میں

کہیں تھے جھاڑیوں کے کنج گویا حجلۂ عشرت
کہیں آبی تصادم سے چھڑا تھا نغمۂ عشرت!

اسی انداز دوشیزہ جو پانی میں اتر آئی   تو کی نیلے عشرت نے لبِ ساحل نظارائی
حباب بحر تک کہنے لگی ہو ہو کے شیدائی   ادائے کمسنی پھر اس پہ ہنگامہ آرائی
طبقِ دلکش سے چھنکر کا نور پانی میں   بڑھیں جیسے بساطِ نور تک حسن و روانی میں
معاذ اللہ زلفِ منتشر کی کیف سامانی   خمِ گردوں میں جیسے مضطرب امواجِ پانی

غضب تھا حسن کا عالم نگاہِ حشر ساماں میں
شعاعیں برق کی لہرا رہی تھیں آبِ حیواں میں

ملی جب غسل سے فرصت تو لیکر اک انگڑائی   سمٹ کر شرم در آغوش دریا سے نکل آئی
ہلالِ چرخِ گرداں ابر میں اک جیسے پنہاں تھا   نکل کر ہو گیا محوِ تماشائے تحیر زا
شعاعیں اسپہ جب آکر پڑیں دزدیدہ دزدیدہ   مجو کر رہ گئی وہ مثلِ برگِ شاخِ لرزیدہ
نہ اسپر بھی جو صبر آیا تو گیسوئے پریشاں کو   سر و سینہ پہ بکھرا کر چھپایا حسنِ عریاں کو

بڑھیں عریانیاں کچھ اور بھی ذوقِ حفاظت پر
شعاعِ فتنہ ساماں چھا گئی حسن و لطافت پر

نہ دیکھی جا سکی فطرت سے یہ طرزِ تصادم زا   ہوئی وہ مائلِ ختمِ تماشائے تلاطم زا
مچلکر ہو گئی دوشیزہ غائب کنجِ فطرت میں   نگاہیں غرق ہو کر رہ گئیں دریائے حیرت میں
"سحر" نے کروٹیں لیں اور پلٹی ہوئی پیدا   شعاعِ مہر سے تاباں ہوا، ہر ذرۂ صحرا
قدم کے کچھ نشاں آئے نظر جو "انقلابی" تھے   مگر جب غور سے دیکھا تو وہ "نقشِ گلابی" تھے

نگاہیں جذب ہو کر رہ گئیں حافظ فضاؤں میں
ادائیں دیکھ لیں میں نے، نکلتے جب ہواؤں میں!!!

حافظ غازیپوری

بسم اللہ

نگار

جلد ۲۰ فہرست مضامین نومبر ۳۱ء شمارہ ۵

نگار

جلد ۲۰ نومبر ۱۹۳۱ء شمارہ ۵

ملاخظات

منم کہ بردل ودین خود اعتمادم ہست
بہ نیم غمزہ ہم ایں رار بلاے وہم آں را ——— (غالب)

انسان کی زندگی میں بعض ساعتیں ایسی بھی آتی ہیں جب وہ محو خواب ہوتا ہے لیکن انسانیت آپ ہی آپ بیدار ہوتی رہتی ہے، اس کے قوا بظاہر بیکار نظر آتے ہیں لیکن روح اپنا کام کرتی رہتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس کے جوارح ظاہری درد و تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن قلب و دماغ آہستہ آہستہ ،،سکون جاں،، کی منزل سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اخلاقیات پوری طرح آنکھ کھول کر مسکرانے لگتی ہے، روح ایک فاتحانہ مسرّت کے ساتھ اچھل پڑتی ہے، قلب و دماغ نشۂ کامیابی و نشاط سے سرشار ہو جاتے ہیں اور ——— اور۔ پھر آخر کار خود انسان بھی چونک پڑتا ہے، اس کے اعضا بھی بیدار ہو جاتے ہیں اور وہ منزل سامنے آجاتی ہے جسے "آشتیٔ جسم و روح،، سے تعبیر کرنا چاہئے۔ اسی کا دوسرا نام دنیائے عمل ہے، اسی کو عالم تگ و دو" کہتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جسے شاعرانہ زبان میں "شک زمیاں رفت و یقیں جلوہ کرد" سے تعبیر کرنا چاہئے۔

ابتدائے آفرینش سے لیکر تا ایندم، کرۂ ارض کی زندگی پر کوئی صدی، کوئی قرن، کوئی دن، کوئی ساعت، بلکہ میں تو کہوں گا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا ہے، جس میں قدرت کے اس نظامِ فطرت کے اس اصول اور خدا کی اس نہ تبدیل ہونے والی سنت پر کشود کار کا انحصار نہ رہا ہو جواہر فرد اور قوت کا باہمی تعلق، مادہ کی مختلف صورتیں، ایتھر بلکہ ماورا ایتھر میں عناصر آفرینش کا نواۃ اور برقپاروں کی صورت اختیار کرنا، لطخات سحابیہ کا رفتہ رفتہ منجمد ہو کر مختلف کروں، سیاروں، چھوٹے چھوٹے ستاروں، چاندوں، اور شہاب ثاقب میں تبدیل ہو جانا۔ یہ کیا ہے۔ کیا یہ سب اسی بیداری کا نتیجہ نہیں، کیا مادہ کا تفاعل اس کی بیداری نہیں کیا برقپاروں کی گردش ان کا نشاطِ عمل نہیں، کیا آفتاب کے طلوع و غروب، چاند کے ایاب و ذہاب میں اس ابتسام خداوندی کی جھلک موجود نہیں جس کے پرتو سے تمام ملکوتی قوتیں دفعۃً جگمگا اٹھتی ہیں

ابراہیم کی بت شکنی کیا اسی بیداری کا نتیجہ نہ تھی، موسیٰ کا فرعون کی قوت قہرمانی کے مقابل میں آجانا کیا روح و جسم کے اتحاد کا نتیجہ نہ تھا، عیسیٰ کا صلیب پر چڑھ جانا کیا اس احساس کے علاوہ کچھ اور تھا، مہاتما بودھ کا شاہانہ جاہ و جلال کی زنجیروں کو توڑ کر پھینک دینا کیا کسی اور قوت کا کرشمہ تھا، رام چندر جی کی صحرا نوردیاں کیا کسی جذبۂ غیر روحانی سے متعلق تھیں، کرشن جی کی معرکہ آرائیاں کیا کوئی اور منظر پیش کرنے والی تھیں، کنفوشیوس کی ذات کیا کسی غیر صادق کیفیت کا مظہر تھی، زردشت کی زندگی میں کیا کسی اور شعلہ کی جھلک پائی جاتی تھی، سرزمین عرب سے پیدا ہونے والے سب سے بڑے انسان کا کوہ فاران پر چڑھ کر کفار عرب کو پیام خداوندی پہونچانا کیا کسی اور احساس کا نتیجہ تھا حسینؑ کی عظیم الشان قربانی کیا کوئی اور رد داد عمل تھی۔ منصور کے ساتھ دار و رسن کا معاملہ بھی اسی معمہ کی گرہ کشائی تھی اور منصور کے حلقوم پر تیغ کی روانی بھی اسی حقیقت کا اعادہ تھا

لیکن جس طرح قدرت صدیوں تک محو خواب رکھنے کے بعد نوع انسانی کو بیدار کرنے کے لئے اس کے کسی ایک فرد کا انتخاب کر لیتی ہے، اسی طرح وہ یہ بھی کرتی ہے کہ وہ قرنوں تک بیدار رکھنے کے بعد دوبارہ آہستہ آہستہ نیند طاری کر دیتی ہے۔ پھر تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی قوم کے لئے یہ نیند موت کی نیند میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے فنا —— اور کبھی یہ نیند پھر ایسی بیداری اختیار کر لیتی ہے جیسے مردہ میں از سر نو جان پڑ جائے

کہا جاتا ہے کہ اصلاح کی بنیاد انسان کے جہل سے شروع ہوتی ہے اور علم کی روشنی میں اس کا اختتام ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ جو چیز جہل کے دور کرنے کے لئے آئے گی اس کی ابتدا، عہد تاریک ہی سے ہوگی اور یقیناً جب علم کی ترقیاں انسانی دماغ کو منور کر چکیں گی تو دور اصلاح ختم ہو جائے گا اگر اس کا مقصود انسان کو کسی محدود منزل تک پہونچا کر ٹھہر جانا ہے لیکن اگر کوئی خیال دنیا میں ایسا ہے یا ہو سکتا ہے، جس کے دائرۂ عمل سے تعین منزل کا سوال خارج ہے یا جس نے لانہایت کو اپنی تگ و دو کا جولانگاہ مقرر کیا ہے یا جس کا مدعا عقول انسانی کو ہر وقت اور ہمیشہ منور کرتے رہنا ہے یعنی اگر کوئی تعلیم ایسی ہے جو اخلاق ہی کی ترقی کو منتہائے نظر قرار دیتی ہے، جس کی دعوت عالم انسانی کے ہر ہر فرد کو ایک شیرازہ سے وابستہ کر سکتی ہے اور

جو تمام ظاہر پرستیوں سے بلند ہو کر انقیاد فطرت کا مفہوم صرف روح کے جھک جانے کو ... قرار دیتی ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ علم و حکمت کی ترقی کے ساتھ ایسی تعلیم کو ختم ہو جاتا ہے

میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک تعلیم اخلاق کا سوال ہے اس وقت تک جتنی اصلاحیں دنیا میں بروئے کار آئیں ان سب کا مقصود ایک ہی تھا سب نے یہی تعلیم دی کہ اچھے کام اچھے اور برُے کام برُے ہیں، لیکن اس تعلیم کے عملی پہلو کے لحاظ سے جو اصول و قواعد انھوں نے مقرر کئے وہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے ضرور مختلف تھے اور انھیں مختلف ہونا چاہئے تھا کیونکہ انکا عقول انسانی کے مطابق ہونا ضروری تھا، اور عقول انسانی کی ترقی ہمیشہ سے جاری ہے اور رہے گی — لیکن جس وقت ہم تقابلاً ان کا مطالعہ کریں گے، اُن کے مقاصد تعلیم اور اُن کے اصول اصلاح اور ان کے اس پیغام پر غور کریں گے جو انھوں نے نوع انسانی تک پہونچایا تو ہم کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ان تمام تعلیمات میں صرف ایک ہی تعلیم ایسی ہے جس کے نصب العین کی بلندی ازل سے لیکر ابد تک تمام کائنات کا احاطہ کر لینے والی ہے اور جس نے اگر ایک طرف اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ تعلیم دی کہ نوع انسانی کے تمام افراد کو ایک ہی مرکز پر جمع ہو کر اپنا جنس کی خدمت کرنا چاہئے تو دوسری طرف علوم کی ترقی کے لحاظ سے اس نے تمام مظاہر فطرت کو انسانی کے تصرف میں دے کر گویا یہ بتا دیا .... کہ انسان حقیقتاً نام ہے اس قوت عمل کا جو لانہایت تک برابر اسباب ترقی کا ساتھ دیتی چلی جائے — یقیناً اصلاحی تحریکوں کی تاریخ ارتقاء میں یہ تبلیغ ایک آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے اور زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے اس کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتا

اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی مسلک کا حقیقی پیام یہی ہے جو بیان کیا گیا تو دنیا کے افراد اس کے ماننے سے کیوں احتراز کرتے ہیں اور اس کے متبعین کے زوال و انحطاط کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔ غیر جماعتیں اس سبب کو اس کی تعلیمات میں [illegible] ہیں اور میں اس کی تاریخ میں پاتا ہوں۔ یعنی وہ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ شاید اس کے اصول تعلیم ہی ایسے ناقص و ناکمل ہیں کہ اس کے متبعین زمانہ کا ساتھ نہ دے سکنے کی وجہ سے پستی کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں اور میرا دعویٰ یہ ہے کہ [illegible] کا سبب ہی یہ ہے کہ انھوں نے تعلیم کی اصل روح کو نظر انداز کر دیا جس کے بہت سے اسباب تاریخ میں مل سکتے ہیں۔

جس وقت آپ نوع انسان کی ذہنی یا اخلاقی ترقی کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ جب تک کسی قوم یا جماعت کا کوئی مُصلح ان کے اندر موجود رہتا ہے ایک عام انقیاد و اطاعت اور اقدام عمل کے سوا کوئی صورت اختلاف کی پیدا نہیں ہوتی، لیکن جس وقت وہ اٹھ جاتا ہے تو رفتہ رفتہ قوائے عمل کی حرکت مضمحل ہونے لگتی ہے اور اسی کے ساتھ اختلاف آرا پیدا ہونے لگتا ہے جو اجتماعی روح کے لئے سم قاتل سے کم نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اخوت و ہمدردی، عدل و مساوات کا جذبہ ضعیف ہو کر ملوکیت و استبداد کی بنیاد پڑنے لگتی ہے اور انسانی برتری کا معیار، اخلاق نہیں بلکہ جاہ و ثروت، [illegible]

نمود و نمایش قرار پاجاتا ہے اور آخر کار ہر ہر فرد خود غرضی، نفسانیت اور ذاتی آسائش جسم و جان کو زندگی کا حقیقی مقصود سمجھنے لگتا ہے۔ یعنی ایک وقت تو وہ ہوتا ہے جب روئے زمین پر ہر سانس لینے والے انسان کے سامنے تعلیم اخلاق و اصلاح پیش کی جاتی ہے اور ہر شخص آزادی کے ساتھ سوچنے سمجھنے کے بعد شمع یقین اپنے دل میں روشن کرنے کے لئے آزاد ہوتا ہے۔ اور پھر دوسرا وقت وہ آتا ہے جب خود اپنے افراد کو بھی اس کے اندر پناہ لینے کی جگہ نہیں ملتی، اور اپنی کمزوریوں، اپنی نااہلیوں کا اندیشہ اسقدر غالب آجاتا ہے کہ ان کا ذکر سننا بھی گوارا نہیں ہوتا، یہی وہ منزل ہے جس کی طرف غالب نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ

نارواں بود بہ بازار جہاں جنسِ وفا
رونقے گشتم و از طالع دکاں رفتم

یہی سبب ہے کہ آج ہماری قومی و اجتماعی حیات، ہماری مذہبی و اخلاقی زندگی، ہمارا اقتصادی و معاشرتی نظام، الغرض ہماری ہر ہر چیز خواہ وہ کسی شعبۂ حیات سے متعلق ہو اور کسی نظام زندگی سے وابستہ، بالکل ویسی ہی ہے جیسے اندھوں کی وہ نزاع تنقیدی جب ان میں سے ہر ایک نے ہاتھی کے مختلف اعضاء کو ٹٹولنے کے بعد اس کی ماہیت کا اندازہ لگایا، اور ہر ایک نے اپنی جگہ اپنے آپ کو سچا باور کرکے دوسرے کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا، درانحالیکہ ہاتھی کی حقیقت کو ان کے اعتقاد و یقین سے دُور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔

آج جس چیز کو ہم یقین کی صورت سے پیش کر رہے ہیں وہ محض وہم و گمان ہے، آج جن باتوں کو ہم حقایق و مسلمات کہکر بیان کر رہے ہیں وہ صرف مزخرفات و ترہات ہیں۔ دُنیا نئی ہے اور اس کے اصول نئے، زندگی نئی ہے اور اس کے امیال و عواطف نئے، پہلے سانس لینے کا طور اور تھا، اب جینے کی راہیں اور ہیں، اب سے ایک صدی قبل جو انسان پیدا ہوتا تھا اب نہیں پیدا ہوتا اور پہلے عقل انسانی کے جو جو خزانے مقفل نظر آتے تھے، اب بالکل کھلے ہوئے ہیں، ذہن و دماغ جن زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے وہ اب ٹوٹ رہی ہیں، فراست انسانی آزاد ہے، اور اب اسی شخص کو یہاں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے، جو آزادی کے ساتھ سوچ سکتا ہے، جو آزادی سے بول سکتا ہے، جس نے آزادی ہی کے لئے مرنا اور جینا اپنا شعار قائم کر لیا ہے، اور جو دنیا کی آزاد فضا میں آزادانہ مسرور سانس لے رہا ہے ۔۔۔۔

پھر کیا انسان کی یہ مسرّت اس لئے ہے کہ وہ مذہب و اخلاق کی بندشوں سے چھوٹ کر بہیمانہ اخلاق اختیار کرنے کے لئے آزاد ہو گیا ہے۔ کیا یہ جذبۂ سرور اس بناء پر ہے کہ خونخواری و درندگی سے باز رکھنے کے لئے اس کے ناخن و چنگال کو قطع کرنے والی قوت کوئی باقی نہیں رہی ۔۔۔۔ نہیں ۔۔ یہ مسرّت صرف اِس لئے ہے کہ آج بالکل پہلی مرتبہ وہ خدا کو بے نقاب دیکھ رہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جس نے آزادی کی پوجا کی اس نے خدا کی پرستش کی کیونکہ قدرت کا یہی منشا ہے

جو انسان کو انسان اعلیٰ (Superman) یا خدا کا نائب و خلیفہ بنا دینے والا ہے

پھر آج ہندوستان جس دَور سے گزر رہا ہے وہ اسقدر نازک و اہم ہے کہ شاید ہی کبھی اس سے قبل ایسا دَور اس پر آیا ہو۔ اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے لئے کہ ان کے تو حیات و ممات کا سوال سامنے ہے ـــــ اس لئے کیا حقائق بالا کو سامنے رکھ کر اب بھی کوئی راہ عمل نہ ڈھونڈھی جائے گی

ملک کی بڑی آبادی حصول آزادی کے لئے جنگ کر رہی ہے اور اس کے اکثر افراد جن میں تقریباً ہر طبقہ و جنس کے لوگ شامل ہیں ایک متحدہ قوت کے ساتھ اس فطری حق کا مطالبہ کر رہی ہے۔ پھر چونکہ ہمیشہ اس نوع کی بیداری کا ایک ہی نتیجہ ہوا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ موجودہ تحریک ناکامی پر ختم ہو۔

مسلمانوں کی جماعت ممکن ہے اپنی فکر و خیال سے اس تحریک کی ہمنوا ہو، لیکن عملاً وہ اس میں کوئی حصہ نہیں لے رہی ایسا کیوں ہے؟ کیا مسلمان ملک کی آزادی کو پسند نہیں کرتے، کیا وہ نہیں چاہتے کہ ملک کے نظم و نسق کا موجودہ آئین بدل جائے اور وہ خود اپنے ملک کی دولت کا صحیح مصرف سوچ سکیں ـــــ یقیناً وہ ایسا چاہتے ہیں اور کون ہے جو اپنے فلاح و بہبود کی تمنا نہیں کرتا۔ لیکن وہ اس میں عملی حصہ اس لئے نہیں لیتے کہ اس تحریک کو وہ بالکل فرقہ وارانہ تحریک سمجھتے ہیں اور انھیں اندیشہ ہے کہ حکومت کو چھوڑ کر اس خیال کو تقویت پہونچانا کہیں آسمان سے گر کر کھجور میں اُلجھ جانا نہ ہو۔

یہ صحیح ہے کہ اس قسم کا اندیشہ بالکل بے وجہ نہیں، اور ہندوؤں کی اجتماعی و اقتصادی، علمی و سیاسی قوت جتنی بڑھتی جاتی ہے اتنی ہی زیادہ اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے مسلمانوں کی پروا کرنے کے لئے تیار نہیں اور وہ یقیناً ایسا ہی نظام چاہتے ہیں جس کا مفہوم ہندو راج ہو سکتا ہے ـــ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان حالات میں مسلمانوں کی موجودہ روش اس فتنہ کو روک سکتی ہے، کیا ان کا "کرتے چڑھائے ہوئے پائنچے اٹھائے ہوئے" چلنا اس سیلاب کے خطرہ کو دُور کر سکتا ہے؟

اس وقت مسلمانوں کی بعض کارکن جماعتیں یہ اعتقاد و یقین رکھتی ہیں کہ اگر انھوں نے گول میز کانفرنس کو اپنے اختلاف سے ناکام بنا دیا اور حکومت کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا تو وہ اس نازک وقت سے محفوظ نکل آئیں گی، اور ہندوؤں کا خواب آزادی بے معنی ہو کر رہ جائے گا

مجھے اس کے ماننے میں تامل ہے کیونکہ نگاہ غائر نے اس حقیقت کو معلوم کر لیا ہے کہ "گاندھی، اِرون" مفاہمت کا واقعہ حقیقتاً شیر برطانیہ کی طرف سے اولین اعتراف تھا "فیل ہندوستان" کی قوت کا اور انجام بین نگاہیں اسی وقت سے صلیبی پرچم کو آہستہ آہستہ ستون سے نیچے اُترتا ہوا دیکھ رہی ہیں۔ اس لئے اگر تاریخ عالم اور خصوصیت کے ساتھ حکومت برطانیہ کی تاریخ کا یہ کوئی نیا واقعہ نہیں کہ اس نے ہمیشہ قوت کے سامنے اپنے سر کو جھکا دیا ہے، تو پھر سوال یہ ہے کہ کیا

ہم کو اپنی ہستی تسلیم کرانے کے لئے اس کے علاوہ کسی اور نظریہ کو استوار کرنے کی ضرورت ہے۔

کیا اس کی تدبیر یہی ہونا چاہئے کہ عبد المجید خاں کو دوبارہ خلیفہ بنا کر خلافت کے فتنہ کو پھر تازہ کیا جائے (جواب عملاً بالکل ناقابل عمل ہے) اگر یہی ہے تو اسی کی کوشش کرو اور دیکھو کہ مصر و شام، ترکی و فلسطین، عرب و عجم، شرق و غرب سب کی نگاہیں تمھیں کس ذلت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور یہ جو "پان اسلامزم" کے مکر و فریب کو عفریت کی شکل دے کر پھر پیش کیا جا رہا ہے وہ کیسی شرمناک ناکامی ثابت ہوتا ہے

یہ نہیں تو کیا دوسری تدبیر یہ ہے کہ اپنی قسمت کا فیصلہ حکومت کے ہاتھ میں دے دیا جائے ـــــ بہتر ہے یہ بھی کر دیکھو، زمانہ تم کو خود بتا دے گا کہ نتیجہ کیا ہوا اور اعتبار و اعتماد کی دنیا میں شاید ہی کسی ایسی ذلیل پامالی کی مثال مل سکے جو اس طرح قائم ہونے والی ہے۔

اگر مسلمان اپنے آپ کو نصاریٰ کی حمایت میں دے دینے کے بعد اپنی فلاح کا یقین رکھتا ہے تو اس سے زیادہ نامعقول ولایعنی، اس سے زیادہ مہلک و سفیہانہ اور اس سے زیادہ واقعات تاریخ اور تجربات ماضیہ کو جھٹلانے والا یقین شاید ہی کسی دل میں پیدا ہوا ہو۔

گزشتہ ربع صدی کی تاریخ ایسی کہنہ و فرسودہ نہیں جو فراموش ہو جائے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہندوستان میں اصلاح حکومت کا سوال کب اور کن حالات کے ماتحت پیدا ہوا اور آہستہ آہستہ ملک کا مطالبہ کس قدر شدید ہوتا گیا پھر اگر آپ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ حکومت کو آخر کار ہر مطالبہ پورا کرنا پڑا، تو کوئی وجہ نہیں کہ جس طرح برسوں کا مطالبہ کل پورا ہوا ہے، اسی طرح آج کا مطالبہ برسوں نہ پورا کیا جائے۔

ہر چند یہ اعتراض ... کہ ملک کے یہ مطالبے صرف اس وقت پورے ہوئے جب کہ مسلمان بھی اس میں برابر کے شریک تھے، کوئی اہمیت و صداقت نہیں رکھتا، لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو صحیح مان لیا جائے تو بھی اصل مسئلہ کی اہمیت بدستور اپنی جگہ قائم رہتی ہے اور کوئی معقول وجہ نہیں پیش کی جا سکتی کہ جب ملک کے مطالبۂ آزادی سے مسلمانوں کو انکار نہیں تو وہ کیوں اب ہندوؤں کا ساتھ چھوڑ دیں۔

اگر مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہے کہ ہندو آزاد ہو کر انھیں فنا کر دیں گے تو اس کے متعلق اگر میں یہ نہ کہوں کہ اب حکومت کی امداد بھی اس کا مداوا نہیں ہو سکتی، تو کم از کم مجھے مسلمانوں کی اس غیرت و خود داری پر ضرور ماتم کرنے دیجئے کہ ایک وقت وہ تھا جب ایک مسلمان اپنے آپ کو سو پر بھاری سمجھتا تھا یا اب وہ زمانہ آیا ہے کہ آٹھ اور بائیس کی نسبت بھی اس کے جسم میں کپکپی پیدا کر رہی ہے،

اچھا آئیے تھوڑی دیر کے لئے دنیائے شرم و غیرت کے اس احساس کو بھی نظر انداز کیجئے اور معاملہ کو معاملہ ہی کی طرح سمجھنے دیجئے تو بھی اس کا کیا جواب ہے کہ آپ ہندوؤں سے علیحدہ ہو کر کیوں اس مقصد کو حاصل نہیں کرتے جس کا

اعلان آپ متعدد بار کر چکے ہیں ۔ جب سوال ڈومی نین ہوم رول کا تھا تو آپ نے نہایت ہی کبر و غرور کے ساتھ اس سکندرانہ جذبہ کا اظہار فرمایا کہ آزادی کامل سے کمتر چیز ہمارے یہاں " بجوے نمی ارزد" لیکن آج جب خود گاندھی جی اس آزادی کامل پر اتفاق و اتحاد کی دعوت دیتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست

—— ہمیں تو ڈومی نین ہوم رول چاہئے اور حکومت برطانیہ کا ظل ہمایوں کہ نجات کا اصل راستہ یہی ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت گاندھی جی کی صرف ایک سیاسی چال نے ان کے چہروں کے ایک ایک خط و خال کو دنیا کے سامنے بے نقاب کر کے رکھ دیا اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ اب وہ کون ہے جو ان کے خلوص نیت پر اعتماد کرے گا۔

گاندھی جی کا مسلمان نمایندوں سے یہ کہنا کہ وہ ان کے تمام مطالبات ماننے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ وہ کانگرس کے اغراض سے متفق ہو جائیں اسی علم و یقین کی بنا پر تھا کہ وہ اس کے لئے آمادہ نہ ہوں گے ۔ اور اس لئے اس سے بہتر صورت ان کے بطون کی حقیقت پر روشنی ڈالنے کی اور کوئی نہ ہو سکتی تھی۔

بہرحال اب وقت نہ ماضی کی داستانوں پر تبصرہ کرنے کا ہے اور نہ آیندہ کے لئے صبر و انتظار کا ۔ جو فیصلہ ہونا تھا ہو چکا دست خدا کو جو کچھ لکھنا تھا، لکھا جا چکا اور —— یقیناً تباہی ہے اس جماعت و قوم کے لئے جو اس فیصلہ سے روگردانی اختیار کرے ——

اگر مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنا نہیں چاہتے ، تو بہتر ہے وہ اپنا عزم و ثبات خود علیحدہ قائم کریں ، اپنی راہ عمل خود متعین کریں ، کیونکہ جب منزل مقصود ایک ہو تو پھر دو جماعتوں کا دو مختلف راستوں سے وہاں تک پہونچنا ، قابل اعتراض امر نہیں —— لیکن معاف فرمائیے اگر آپ کا مقصود اس اختلاف سے صرف راستہ میں ناہمواریاں پیدا کرنا ہے ، تو یاد رکھیئے کہ آج تک دنیا میں کوئی سیلاب اس ترکیب سے روکا نہیں جا سکا بلکہ ان عارضی بندشوں نے ہمیشہ اس کو اور زیادہ پرشور بنا دیا اور آخر کار تمام موانع اس طرح نیست و نابود ہو کر رہ گئے گویا وہ کبھی پیدا ہی نہ ہوئے تھے

اگر مسلمان واقعی ملک کی آزادی کے متمنی ہیں تو اس کا طریق کار اگر یہ نہیں ہے کہ وہ ہندوؤں کے دوش بدوش کام کریں تو یقیناً اس کی تدبیر یہ بھی نہیں ہو سکتی کہ وہ حکومت کے سامنے دست سوال دراز کریں اُس حکومت کے سامنے جس کا مفاد اب بھیک دینے میں نہیں بلکہ ایسے حقیر و ذلیل بھکاریوں کو ٹھکرا دینے ہی میں پنہاں ہے ۔

پھر میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ مسلمان میدان عمل میں آجائیں اور ہندوؤں سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ لیکن اسی امن و سکون کے ساتھ جس کی جستجو گیتا رہی ہے اور اسی مصلحانہ جذبہ ایثار و فدویت کو لئے ہوئے جو خونریزی کا دشمن ہے، جو امن شکنی کا مخالف ہے اور جو کسی کو ایذا پہونچانا مذہبی و اخلاقی گناہ سمجھتا ہے ، یہ جنگ ہے بیدست و پائی صاحب عظمت و جبروت کے مقابلہ میں ، ایک بے سرو ساماں کی صاحب برگ و ساز کے مقابلہ میں یہ جنگ ہے صرف اخلاق کی جس میں صرف جان دیجاتی ہے

(بقیہ ملاحظات صفحہ ۹۵ - ۹۶ پر)

کاروبار کی موجودہ سرد بازاری کے اسباب

اور اُن کا علاج

ہر دوکان دار اور کاریگر کو آج اس بات کی شکایت ہے کہ اس کے مال کی نکاسی کم ہو گئی ہے۔ اسٹاک بھرا پڑا ہے روپیہ پھنسا ہوا ہے۔ دوکان کا کرایہ نہیں نکلتا، قرض خواہ کا سود بڑھ رہا ہے۔ مزدوری گراں ہو گئی ہے۔ جنگی کا ٹیکس، بجلی کا بل ادا کرنا دشوار ہے۔ پھر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ حالت صرف ایک شہر یا صوبہ یا ملک تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ وبا عالمگیر ہے۔ یورپ وامریکہ کے لاکھوں آدمی بے روزگار ہو گئے ہیں اور کارخانے بند پڑے ہیں۔ حکومتوں کے بجٹ پر بھی اس کا بہت بڑا اثر پڑا ہے۔ اس لئے ملازموں کی تخفیف اور اضافۂ محاصل کی تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔ بنکوں کے بھی دوالے نکل گئے ہیں یہ سب آخر کیوں ہے۔ کیا اس کے کوئی مستقل اسباب ہیں یا یہ سب ناقابل فہم اسرار ہیں۔

ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے یہاں کی تمام آبادی زمین سے پیداوار حاصل کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ اور زمین ہی کی آمدنی پر انحصار کرتی ہے۔ کاشتکار ہی زمین دار کو لگان، ساہوکار کو بیاج اور سرکار کو مالگذاری و آبیانہ ادا کرتا ہے۔ وہی مقدمے لڑ کر اسٹامپ اور کورٹ فیس داخل کرتا ہے۔ وکیلوں، مختاروں، کارندوں، عرائض نویسوں، پیشکاروں، اہلکاروں، پٹواریوں جیبیں بھرتا ہے۔ نمک و شراب کا استعمال کر کے سرکار کی آمدنی بڑھاتا ہے۔ جاترا و تشنان کو جا کر ریل کی آمدنی میں اضافہ کرتا ہے ڈاکخانہ و تارگھر کی رونق بھی اُسی کے دم سے قائم ہے۔ میلوں اور نمائشوں کی آبادی کا بھی وہی سبب ہے۔ اُس پر اگر کوئی آفت آتی ہے۔ تو ساری قوم پر آفت آجاتی ہے وہ خوش حال رہتا ہے تو ساری قوم خوش حال رہتی ہے۔ زمیندار و ساہوکار، حکام و تجار، بڑے بڑے شہروں میں عیش و مسرت کے لطف اٹھاتے ہیں۔ ہر شخص کے دل میں امنگ و ولولہ ہوتا ہے۔ روپیہ دل کھول کر خرچ کیا جاتا ہے۔ محل و مکانات تعمیر ہوتے ہیں، مکان کی آرائش و زیبائش میں روپیہ صرف ہوتا ہے۔ کپڑوں کے جوڑے پر جوڑے تیار ہوتے ہیں۔ زیور بنتے ہیں۔ سواری ایک سے ایک بہتر رکھی جاتی ہے۔ خوشیاں و شادیاں منائی جاتی ہیں۔ سفر کئے جاتے ہیں ہوٹل آباد ہوتے ہیں۔ غرضکہ ایک کاشتکار کے دم سے ہر طرف چہل پہل نظر آتی ہے اور دنیا کی رونق اسی کی ذات پر منحصر ہے۔

گذشتہ چند سال سے اس غریب کاشتکار کو (جس کے کمزور شانے شہروں کی تمام تہذیب و شائستگی کے وزن کو سنبھالے ہوئے تھے) پے در پے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ۱۹۲۸ء میں خشک سالی رہی۔ ۱۹۲۹ء میں ٹڈی دل اور سیلاب نے فصل خراب کر دی اور ۱۹۳۰ء میں جب پیداوار ذرا اچھی ہوئی تو قیمتیں گرنا شروع ہو گئیں۔ اور ۱۹۳۱ء میں تو قیمتوں کے زوال کا یہ عالم ہوا کہ لوگوں کو یہ اندیشہ ہونے لگا کہ یہ برابر گرتی چلی جائیں گی اور انھیں ٹھہرنے کے لیے کوئی ٹھوس جگہ نہ ملے گی۔

کاشتکار ایک طرف اپنی لاگت و محنت پر نظر کرتا تھا، زمیندار، ساہوکار اور سرکار کے شدید تقاضوں کو سنتا تھا اور دوسری طرف قیمتوں کی گری ہوئی حالت دیکھتا تھا۔ اور خاموش تھا۔ غلّہ کے انبار اس کے کھلیان میں لگتے جا رہے تھے۔ اور تھوک بازاروں اور آٹا پیسنے والی ملوں میں آسٹریلیا کے غلّہ کی یورش تھی۔ اور اسی تناسب سے غلّہ کی قیمت برابر گھٹتی چلی جا رہی تھی۔ یہ سب آخر کیوں تھا۔ ۱۹۲۷ء و ۱۹۲۸ء میں تو آسٹریلیا کا غلّہ اس لئے بہت ہندوستان میں آیا کہ یہاں خشک سالی کی وجہ سے غلہ کی مانگ زیادہ تھی اور غلہ نسبتاً گراں تھا۔ لیکن ۱۹۳۰ء میں تو غلہ کی پیداوار یہاں بھی اچھی تھی۔ اور نرخ سستا تھا۔ پھر آسٹریلیا سے غلہ آنے کا کیا سبب ہوا تھا۔ ہم تو خود اپنا غلہ اور زرعی پیداوار باہر بھیجتے تھے۔ اور دنیا میں اس کی مانگ رہتی تھی۔ اب دنیا کی مانگ کو کیا ہو گیا کہ وہ اپنا زاید از ضرورت غلہ خواہ مخواہ ہمارے سر منڈھ رہی ہے۔ دنیا کی آبادی میں کمی نہیں ہوئی بلکہ دس فیصدی کا اضافہ بتلایا جاتا ہے پھر کیا سبب ہوا؟

اس کا سبب ایک نہیں، متعدد اسباب بتائے جاتے ہیں اور اُن میں سے ہر ایک تفصیل کا محتاج ہے پہلے میں اجمالی طور پر نمبروار اُنھیں درج کرتا ہوں اور پھر اُن کی تفصیل بیان کروں گا۔

(۱) زرعی پیداوار کی آسٹریلیا، کنیڈا، ارجنٹائن، امریکہ اور بالشوک روس میں زیادتی۔
(۲) صنعتی و حرفتی پیداوار کی ہر ملک میں زیادتی
(۳) مال کی آمد و رفت پر امتناعی محاصل اور صنعت و تجارت میں ایک کی دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش
(۴) سونے کی رسد میں کمی
(۵) گورنمنٹ کی اکسچینج پالیسی
(۶) گورنمنٹ کے اخراجات و محاصل میں زیادتی
(۷) جرمنی کے تاوان جنگ کا مسئلہ
(۸) مال کی نکاسی میں کمی اور لوگوں کی طلب میں کمی
(۹) چین و ہندوستان میں بے امنی و خانہ جنگی۔ قومیت کا ارتقا۔ اور تمام قوموں میں مزدور پیشہ جماعت کی تعلیم۔ سرمایہ داروں اور بنکوں کی بے اطمینانی و بے توجہی۔

(۱) زرعی پیداوار کی آسٹریلیا وغیرہ میں زیادتی کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ وہاں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے۔ آسٹریلیا - کنیڈا - ارجنٹائن امریکہ یہ سب نئی آبادیاں ہیں۔ یورپ، ایشیا و افریقہ کے شمالی ممالک کی طرح اُن کی آبادی بہت پُرانی نہیں ہے۔ بالشوک روس گو یورپ و ایشیا میں شامل ہے۔ لیکن وہ ایک سخت انقلاب انگیز فلسفہ کے ماتحت اپنی قومی زندگی کو ترتیب دے رہا ہے اور اس لئے وہاں کی حالت بھی دیگر قدیم ممالک کی طرح نہیں ہے۔ پہلے ہم نوآبادیوں کی زیادتی پیداوار کے اسباب بیان کریں گے۔ اس حقیقت کا ہر شخص کو تجربہ ہے کہ اگر زرخیز زمین افتادہ پڑی رہی تو اس کی زرخیزی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ نوآبادیوں میں ایسی ہی زرخیز زمین سالہا سال سے افتادہ وغیر آباد پڑی ہوئی تھی جیسے صاف وہموار کرکے یورپ کی نوآبادی بسانے والوں نے قابل زراعت بنایا۔ پھر یہ کہ ابتدا میں کاشت کرنے والے اور دعوے دار کم تھے۔ اور زمین لامحدود تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص کی جوت میں رقبہ بہت کافی آگیا۔ بڑے بڑے فارم بن گئے۔ جن پر سرمایہ خوب لگایا جا سکتا تھا۔ اور مشینری اور موٹر ٹریکٹر سے کام کرنا ممکن تھا۔ پھر جب آبادی بڑھی تو صنعت و حرفت میں ترقی شروع ہو گئی اور اس طرح زرعی زمین پر آبادی کا دباؤ بہت نہ بڑھ سکا۔ صنعت و حرفت کی ترقی سے سرمایہ میں اضافہ ہوا اور یہ سرمایہ زرعی زمین کی حالت بہتر بنانے میں بھی صرف ہوا۔ جن لوگوں نے نوآبادیاں بسائیں اور اپنا قدیم وطن چھوڑ کر سمندر پار لاکھوں میل کا سفر اختیار کیا۔ اور ایک نئے ملک میں جن مصائب، پریشانیوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُنہیں برداشت کیا، ظاہر ہے کہ وہ آدمی غیر معمولی مستقل مزاج، جفاکش اور محنتی ہوں گے۔ پھر ان میں سے بہت سے اُن دلیر اور راسخ العقیدہ لوگوں کی اولاد ہیں جنہوں نے اپنے ملک سے ہجرت گوارا کرلی۔ لیکن اپنے اُن عقائد کو ترک نہیں کیا جن کے چھوڑنے پر وہ مجبور کئے جا رہے تھے۔ عملی تعلیم اور تمدن و تہذیب کی خوبیاں وہ اپنے ساتھ لے گئے اور بُرائیاں اپنے وطن میں چھوڑ گئے۔ فطرت کی فیاضیوں نے اُن کے حوصلے بڑھائے ہر محنت کا اُس سے کئی گنا انہیں صلہ ملا۔ اور انہیں دنیا میں کسی چیز کا امکان محال نظر نہ آیا۔ اس لئے ایجادیں بڑھتی رہیں اور اب ترقی دادہ اصول زراعت ان کے یہاں اس لائق ہو گئے ہیں کہ وہ اپنے ملک کی ضرورت سے بہت زیادہ پیدا کرتے ہیں۔ اور اپنی پیداوار برآمد کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ سنہ ۲۹ء و سنہ ۳۰ء سے غلہ کے اسٹاک تمام منڈیوں میں بہت زیادہ جمع ہیں اور حکومتوں کے لئے یہ ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے کہ ان کی کس طرح نکاسی کی جائے۔

بالشوک روس کی حالت نوآبادیوں سے مختلف ہے۔ روس میں جنگ عظیم کے دوران میں ایک بڑا انقلاب ہو گیا۔ جس کی وجہ سے وہاں شخصی سلطنت کا اقتدار ختم ہو گیا۔ زمیندار و سرمایہ دار فنا یا شہر بدر کر دیے گئے۔ اور اب صرف مزدوروں کے مفاد کی نمایندگی کرنے والی ایک جماعت ملک کی تمام زمین و جائداد و املاک کی مالک ہے۔ کسی شخص کو یہ آزادی نہیں ہے کہ وہ جو کام اپنے لئے مناسب سمجھے اختیار کرے بلکہ حکومت ہر شخص کو کام سپرد کرتی ہے۔ اور اس کے اخراجات کی کفیل ہوتی ہے۔ حکومت نے ایک پنج سالہ اسکیم بنائی ہے۔ جس کا منشا یہ ہے کہ روس کی صنعتی و زراعتی پیداوار کو

پانچ سال کے اندر اندر اسقدر ترقی دے دی جائے کہ وہ یورپ و امریکہ کے مہذب ترین ممالک کی مجموعی پیداوار سے اگر بڑھ نہ سکے تو کم از کم برابر ہو جائے۔ جو لوگ روس کی تاریخ سے واقف ہیں۔ انھیں اس اسکیم کی خام خیالی پر ہنسی آتی ہے۔ روس یورپ کے تمام ممالک میں سب سے زیادہ غیر مہذب اور غیر ترقی یافتہ ملک تھا۔ اس کے باشندے سخت مفلس اور تباہ حال رہ چکے ہیں۔ ایسے ملک کے لئے ایسا پروگرام بنانا کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن یہ پروگرام بن گیا ہے اس پر عمل ہو رہا ہے۔ یہ اسکیم کا تیسرا سال ہے اور زراعتی و صنعتی پیداوار میں حیرت انگیز اضافہ ہو چکا ہے۔ لیکن روس کے لیے ایک بڑا مشکل مسئلہ مشینری فراہم کرنا ہے جسے وہ خود ابھی تک بنانے سے قاصر ہے۔ روپیہ اس کے پاس نہیں ہے۔ غیر ممالک اُسے قرض دینے پر آمادہ نہیں ہیں۔ اس ... لئے اس کے پاس بس ایک ہی تدبیر رہ گئی ہے، وہ یہ کہ اپنی منڈی پیداوار کے معاوضہ میں مشینری حاصل کرے۔ لیکن یورپ کے سرمایہ دار ممالک اس سے ایک سطح پر رہ کر تجارت ...... کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ اس لئے لامحالہ اسے اپنا مال دوسروں کے مقابلہ میں کم داموں پر یورپ کی منڈیوں میں داخل کرنا پڑتا ہے۔ جس سے مال کی قیمتیں گر جاتی ہیں۔

نو آبادیوں اور بالشوک روس کے علاوہ دنیا کے تقریباً تمام ممالک زراعت کو قومی زندگی کا جزو لاینفک سمجھ کر ترقی دینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اور اپنی زرعی پیداوار بڑھا رہے ہیں۔ ہندوستان میں بھی یہ ترقی رونما ہے۔ جیسا کہ محکمۂ زراعت کی رپورٹوں سے ثابت ہوتا ہے۔ اس تمام زیادتی پیداوار کا یہ نتیجہ ہے کہ دنیا کی تمام منڈیوں میں زراعتی پیداوار کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ اور ان کی قیمت گرتی جارہی ہے۔

(۲) صنعتی پیداوار کا بھی یہی حال ہے۔ جنگ عظیم سے پہلے برطانیہ کو صنعت و تجارت میں سب ممالک پر فوقیت حاصل تھی۔ دنیا کے بہت سے ممالک جس میں امریکہ بھی شامل ہے اس کے مقروض تھے۔ جرمنی نے ہمسری کا دعوےٰ کرنا چاہا۔ اور تجارت میں مقابلہ شروع کیا۔ جس کا نتیجہ جنگ کی صورت میں رونما ہوا۔ جنگ کے دوران میں مصروف پیکار قوموں کی تمام وہ مشینیں جو پہلے امن و عافیت کے سامان دنیا کے لئے فراہم کرتی تھیں۔ تباہی و غارتگری کے اوزار بنانے لگیں۔ تندرست مزدور جو پہلے کارخانوں میں کام کرتے تھے وہ فوج میں بھرتی ہو کر جنگ کے میدانوں میں ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ لیکن تمام قومیں جنگ میں شریک نہ تھیں۔ غیر جانبدار قوموں کی بن آئی۔ انہوں نے موقعہ غنیمت جان کر اپنی صنعت و تجارت کو ترقی دینا شروع کی اور وہ خلا جو انگلستان۔ جرمنی۔ فرانس۔ آسٹریا وغیرہ کی مصروفیت جنگ سے پیدا ہوا تھا۔ اُسے پُر کرنا شروع کیا۔ امریکہ و جاپان کی صنعتوں کو ترقی ہوئی۔ امریکہ مقروض کی جگہ قرضخواہ ہو گیا۔ علاوہ ازیں ایشیا کے وہ ممالک جو یورپ کی اشیا خریدتے تھے۔ انہوں نے یہ محسوس کر کے کہ دوسرے ممالک پر اپنی ضرورت کی چیزوں کے لئے انحصار کرنا۔ نادانی ہے اپنی صنعتوں کو ترقی دینا شروع کی۔ ہندوستان میں بھی صنعت کو خوب ترقی ہوئی۔ جب جنگ ختم ہوئی اور فاتح قوموں نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو انھیں معلوم ہوا

کہ اُن کی تجارت پر دوسروں کا قبضہ ہے۔ لیکن اس سے وہ ذرا بھی ہراساں اور دل برداشتہ نہیں ہوئے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ سے یہ سمجھتے آئے تھے کہ انھیں صنعت وتجارت میں قدرتی منافع اسقدر حاصل ہیں کہ ان کی کامیابی یقینی ہے، اس لئے انہوں نے اپنی صنعت وتجارت کی رفتار اسی پیمانہ پر جو جنگ سے پہلے تھی شروع کر دی۔ نظام سرمایہ داری میں صنعت وتجارت کی تنظیم کچھ اس ڈھنگ پر ہوتی ہے۔ کہ اس کے اثرات فوراً رونما نہیں ہوتے اور کئی سال کے بعد نفع ونقصان کا اندازہ ہوتا ہے۔ جب چند سال گذر گئے۔ اور ۱۹۲۱ء کی سرد بازاری کے ایام میں برطانیہ کو معلوم ہوا کہ اس کے حریف ایسے حقیر نہیں رہے ہیں۔ جیسا کہ اس کا خیال تھا بلکہ انہوں نے جنگ کے دَوران میں اپنی طاقت کو خوب بڑھا لیا تھا۔ تو بھی برطانیہ کے ماتھے پر شکن نہ آئی۔ اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ گو مقابلہ سخت ہے اور برطانیہ کو اپنی تمام تر کوششیں صنعت وتجارت کی ترقی پر صرف کرنا ہے۔ لیکن صورت حال مایوس کن نہیں ہے۔ عزم، استقلال ایثار ومحنت کی ضرورت ہے۔ فتح اخیر میں برطانیہ کی ہے۔ پھر کام شروع ہوا۔ نقصانات کی پرواہ نہیں کی گئی پیدا وار میں ترقی ہوتی رہی حتے کہ ۱۹۲۹ء و ۱۹۳۰ء کی عالمگیر سرد بازاری سے اب ہم دوچار ہیں۔ دنیا کے اور دوسرے ممالک نے بھی صنعت کی ترقی کی رفتار میں کمی نہیں کی۔ امریکہ، جاپان۔ فرانس۔ بلجیم۔ کنیڈا۔ آسٹریلیا۔ جرمن واسٹریا۔ مصر وہندوستان ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر قائم رہنا چاہتا ہے۔ اور دنیا کی پیداوار میں اس طرح اضافہ ہوتا چلا گیا ہے۔ اور اب ہر جگہ تھوک وخردہ بازار میں صنعتی چیزوں کے انبار لگے ہوئے ہیں جن کا خریدار کوئی نہیں ہے۔ کارخانوں کو مجبوراً اپنی پیداوار بند کرنا پڑی ہے۔ جس کی وجہ سے عالمگیر بے روزگاری ہے۔ حتے کہ امریکہ بھی اس بے روزگاری میں برابر کا شریک ہے۔ سوتی و اونی وریشمی کپڑا، لوہا واسٹیل، مشینری۔ موٹر، چینی وشیشہ کے ظروف، جنرل اسٹورس جوتے وغیرہ وغیرہ۔ ہر چیز کی رسد مانگ سے زیادہ ہے۔ اور بڑے چھوٹے سب دوکان دار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

(۳) مزدور، دوکاندار، کارخانہ کے مالک، زمیندار، کاشتکار جب سب پر آفت ہے اور مصیبت عام ہے تو افراد، اجتماعی صورت پر اپنی مشکلات کا حل چاہتے ہیں اور حکومت سے مدد کے خواستگار ہوتے ہیں۔ اس مصیبت سے قبل، حکومت سے ایک دوسری شکل میں مدد چاہی گئی تھی۔ گورنمنٹ سے کہا گیا تھا کہ قوم کی صنعت وحرفت خطرہ میں ہے اس لئے ضرورت محافظت کی ہے۔ محافظت کی صورت یہ ہونا چاہیے کہ (الف) ملک کا بازار ملک کی بنی ہوئی اشیاء کے لئے محفوظ رہے۔ اور یہ امتناعی محاصل سے ممکن ہے (ب) ایسی اشیاء کی پیداوار میں سہولت بہم پہنچائی جائے۔ جن کا برآمد کرنا۔ ہم دوسرے ممالک میں اپنی تجارت کی ترقی کے لئے ضروری سمجھیں۔ اور یہ ریل کے کرایہ کی کمی اور براہ راست مالی اعانت (مثلاً گرانٹ، سبسڈی اور باؤنٹی) دیے جانے سے ممکن ہے (ج) گورنمنٹ اس طرح بھی مدد کر سکتی ہے کہ وہ اپنی ضروریات کی چیزیں ملکی کارخانوں سے زیادہ دام دے کر خریدلے۔ جہاں قومی حکومتیں تھیں۔ وہاں یہ سب طریقے اختیار کئے گئے۔ اور ملک کی صنعت وتجارت کو محفوظ کیا گیا۔ امریکہ و دیگر نوآبادیا

اور جرمنی عرصہ سے اس پالیسی پر کاربند ہیں۔ لیکن انگلستان کے تجارتی و صنعتی طبقہ نے اس قسم کی حکومت کی امداد کو حتی الوسع ناپسند کیا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر تمام دنیا میں اس وقت تجارت کی آزادی ہو جائے اور حکومتوں نے اپنی پالیسی سے جو تجارت میں رکاوٹیں و بندشیں پیدا کر دی ہیں، وہ اگر اٹھا دی جائیں تو انگلستان اب بھی صنعت و تجارت میں تمام ممالک پر فوقیت حاصل کر سکتا ہے۔ اس لئے اس قسم کی محافظت، بقاء ذاتی کے نقطۂ نگاہ سے اِن ملکوں کے لئے قطعاً ناگزیر تھی۔ لیکن حکومتوں کی ان تمام کوششوں کے باوجود جس میں اب انگلستان کی حکومت بھی شریک ہوتی جا رہی ہے۔ آج دنیا کا کوئی ملک اپنی صنعت و تجارت کے قائم رکھنے میں کامیاب نہیں ہے۔ گو اس میں شک نہیں کہ ہر ایک کو یہ اطمینان ہے کہ اگر میں کامیاب نہیں ہوں تو میرا حریف بھی کامیاب نہیں ہے۔ اور اب اس جنگ نے ایک منتظرہ شکل اختیار کر لی ہے۔ ہر ملک یہ دیکھ رہا ہے۔ کہ میرے حریف میں کتنا دم ہے۔ اور کہاں تک سختی جھیل سکتا ہے۔ جس کا کم دم ہے وہ بازی ہار جائیں گے۔

(۴) اسی سے ملتا جلتا اور حکومتوں کی پالیسی پر بڑی حد تک انحصار کرنے والا مسئلہ سونے کی رسد اور کسی ایکسچینج کے نرخ کا ہے۔ یہ مسئلہ اسقدر پیچیدہ اور دلچسپ ہے کہ یہ ایک مستقل مضمون علیحدہ چاہتا ہے۔ لیکن جسقدر مختصر طریقہ پر بیان کیا جا سکتا ہے یہاں اس کے بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ سونے کو بین الاقوامی مارکٹ میں ایک بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ سونا ایسی دہات ہے جسے زنگ نہیں لگتا جو جلد نہیں گھستی۔ اور ایک دفعہ پیدا ہو جانے کے بعد بہت کم فنا ہوتی ہے۔ اسوجہ سے سونے کا اسٹاک دنیا میں بہت جمع ہو گیا ہے۔ اور اس کی قیمت کا جو تناسب عالم کی تمام اشیاء کے مقابلہ میں قائم ہو گیا ہے اُس میں معتدبہ تبدیلی اس کی پیداوار کی کمی و زیادتی کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ اگر ایک دریا میں ایک نالے کا پانی آگر گرے تو اُس کی سطح اس نئے پانی کے اضافہ سے بلند نہیں ہو جاتی۔ اسی طرح دنیا کی تمام کانوں سے جو سونا نکلتا ہے وہ دنیا کے سونے کے اسٹاک میں مختصر مدت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ اس کی رسد نہ تو بہت مختصر ہے نہ بہت زیادہ۔ ہر شخص تھوڑا بہت سونا رکھ سکتا ہے۔ لیکن ہر شخص کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کا ایک کثیر ذخیرہ رکھ سکے۔ اس لئے ہر شخص اسکا متمنی رہتا ہے۔ حکومتوں نے لوگوں کی سونے کی اس عالمگیر تمنا کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ تمام اشیاء کی قیمتوں کے تعین کے لئے ان کا مقابلہ سونے کے ایک مقررہ وزن سے کیا جائے۔ جیسے ۔ ۔ ۔ گز لوہے کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ اور اس سے لاکھوں گز کپڑا ناپا جاتا ہے یا سیر لوہے کا ایک وزن ہوتا ہے۔ اور اس سے لاکھوں کروڑوں من چیز تولی جاتی ہے۔ اسی طرح سونے کے ٹکڑے کا کوئی خاص وزن لے کر اس کا سکہ بنا دیتے ہیں۔ اور اس سے لاکھوں کروڑوں روپیہ کے کاروبار کا سودا ہوتا ہے۔ اور سکہ بنانے کا کام۔ جو اس بات کی گارنٹی ہے کہ سکہ میں کھرا سونا مقررہ وزن کا ہے۔ گورنمنٹ اپنے ذمہ لے لیتی ہے۔ جیسے گز اور سیر اور دوسرے پیمانے مقرر کرنا گورنمنٹ کا فرض ہے۔ اس سے صورت حال یہ ہو جاتی ہے کہ ایک طرف تمام عالم کی

چیزیں ہوتی ہیں اور دوسری طرف انہیں چیزوں میں کی ایک چیز ہوتی ہے - جس کی قیمت انھیں کی طرح طلب ورسد کے اصول پر متعین ہوتی ہے - فرق یہ ہو جاتا ہے کہ اس کی طلب کا انحصار تمام عالم کی اشیا کی رسد پر منحصر ہوتا ہے - اگر یہ رسد زیادہ ہے تو اس کی قیمت (دوسرے اثرات کو ہم یہاں نظر انداز کرتے ہیں) زیادہ ہوتی ہے اور اگر یہ رسد کم ہے تو اسکی قیمت کم ہوتی ہے - خود سونے کی رسد سے جو قیمتوں میں تبدیلی ہوتی ہے - جس طرح گز اور سیر کی چھوٹی تقسیمیں فٹ، انچ، اور ادھ سیرا، پوا اور چھٹانک میں کی جاتی ہیں اسی طرح سونے کے سکے کی تقسیم کی جاسکتی ہے - لیکن سونا چونکہ بہت زیادہ ہر دلعزیز چیز ہے اس لیے اس کے استعمال میں ذرا کفایت شعاری سے کام لیا جاتا ہے - اور اس کی صورت یہ اختیار کیگئی ہے کہ سونے سے ادنےٰ درجے کی دھاتیں مثلاً چاندی وغیرہ کے سکے انھیں شرائط پر جن پر سونے کے سکے بنائے جاتے ہیں بنائے گئے اور اُن سے کام چلایا گیا - جب تک لوگ غیر مہذب تھے - اور حکومتوں میں جلد جلد انقلاب ہوتے رہتے تھے - سکے اپنی دھات کے وزن کی قیمت پر بازار میں چلتے تھے - لیکن جب امن وامان قائم ہوا - حکومتیں شخصی کی جگہ قومی اور اس لئے پائدار ہوگئیں - علاوہ ازیں چاندی اور دیگر دھاتوں کی پیداوار میں اس قدر زیادتی ہوگئی کہ انکی قیمتیں روز بروز بے انتہا گھٹنے لگیں - اور صورت حال ایسی ہوگئی کہ جیسے ایک رتیلے پتھر کا ادھ سیرا بنالیا جائے اور اس سے سودا تولا جائے اور وہ برابر گھستا چلا جائے تو اس سے کاروبار پر بہت برا اثر پڑنے لگا - خریداروں و قرضخواہوں کو بڑا نقصان ہوتا تھا -

رائج الوقت سکہ میں لوگوں کی آمدنیاں، مزدوری، تنخواہ، لگان سود - مالگزاری اور گورنمنٹ کے اور تمام محاصل سب ایک مدت کے لئے جس کا معاہدہ ہو جاتا ہے - مقرر کردیے جاتے ہیں - لیکن اگر چاندی کی پیداوار اور رسد میں غیر معمولی اضافہ ہو جائے - اور لوگ اس چاندی کا سکہ بنوالیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا - کہ سکہ کی رسد تمام اشیاء کے مقابلہ میں زیادہ ہو جائے گی - اور سکہ کی قیمت کم ہو جائے گی جس کے معنی یہ ہوں گے کہ اشیا کی قیمت گراں ہو جائے گی - اور جن لوگوں کے مقررہ مطالبات ہیں انھیں نقصان رہے گا - اس گتھی کو سلجھانے کے لئے گورنمنٹ نے یہ فیصلہ کیا کہ لوگوں کو جو چاندی کے سکہ بنوانے کی آزادی حاصل تھی اُسے سلب کرلے - اور قیمتوں کو پائداری دینے کے لئے سکہ کی ایک مقررہ رسد مہیا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے - جو نہ تو اتنی زیادہ ہو، کہ چیزوں کی قیمتیں گراں ہو جائیں نہ اتنی کم - کہ اس کی قیمتیں گھٹ جائیں - بلکہ قیمتوں کو ایک مقررہ سطح پر رکھے، تاکہ کاروبار اور گورنمنٹ بجٹ میں بے اطمینانی، گڑبڑ اور جوئے و سٹے کی کیفیت پیدا نہ ہو - لیکن چونکہ ملک کے باہر کی قیمتوں پر گورنمنٹ کو کوئی اختیار نہیں اور بین الاقوامی قیمتیں آخر میں سونے کی اندرونی اور ذاتی قیمت سے متعین ہوتی ہیں - اس لیے گورنمنٹ نے اس بات کی ذمہ داری لی - کہ بیرون ملک کے مطالبات کی ادائیگی کے لئے ایک تناسب سونے اور رائج الوقت چاندی کے سکے میں مقرر کیا کرے گی - اور اس پر جب تک ممکن ہوسکے گا - ضرور کاربند رہے گی - اور

اس مقررہ تناسب کے مطابق ہمیشہ ہر شخص کو سونا دیا کرے گی۔ اور اس کے لئے اس کے اسٹاک میں ہمیشہ سونا رہے گا۔ اور یہ سونا اس فرق سے خریدا جائے گا۔ جو رائج الوقت سکہ کی اصلی و اندرونی اور ظاہری و قانونی قیمت میں ہوگا۔ پھر جب گورنمنٹ پر لوگوں کا اعتماد اور بڑھا تو گورنمنٹ نے یہ خیال کیا کہ چاندی کے سکہ کے لئے روپیہ خرچ کرنا فضول خرچی ہے۔ جب چاندی کا سکہ محض گورنمنٹ کے قانون و ساکھ کی وجہ سے اور اس اطمینان کی بنا پر جب چاہیں اسے سونے میں تبدیل کرا سکتے ہیں۔ اپنی اصلی قیمت سے زیادہ قیمت پر بازار میں چلتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ گورنمنٹ کا وہی ساکھ ایک کاغذ کے پرزے سے وہی کام نہ لے جو وہ چاندی سے لیتا ہے۔ گورنمنٹ کو اس پالیسی کے اختیار کرنے میں بنکوں اور صرافوں کی ہنڈیاں دیکھ کر اور زیادہ تقویت ہوئی۔ گورنمنٹ نے سوچا کہ ہمارا ساکھ یقیناً بنکوں اور صرافوں سے زیادہ ہے۔ ہمارے پاس قانون کا ہتھیار ہے جس کے ذریعہ سے ہم اپنا ساکھ بنکوں سے مقابلۃً زیادہ دیر تک قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے کاغذ کے نوٹ چلا دیے۔ تاریخی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ گورنمنٹ سے پیشتر بنکوں نے اپنے نوٹوں کا اجرا کیا تھا۔ اور حکومت نے محض بنکوں کی تقلید کی۔ بہرحال، نوٹوں کی قدر و قیمت بھی موجودہ زمانہ میں ..... اسی اطمینان پر قائم ہے کہ انھیں جب چاہیں سونے میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اور چیزوں کی قیمتوں اور ہر قسم کے مطالبات کی ادائیگی میں گورنمنٹ کے قانون کے زیر اثر ہر شخص انھیں قبول کرنے پر مجبور ہے۔ گورنمنٹ نوٹوں کو سونے میں بدلنے کے لئے اپنے خزانہ میں ہمیشہ ایک مقررہ تناسب سونے کا رکھتی ہے۔ تاکہ اگر نوٹوں کو سونے میں بدلنے کا مطالبہ ملکی یا بیرونی ضرورت کے لئے ہو تو گورنمنٹ اس کو پورا کر سکے۔ اسی طرح ہر بنک و صرّاف اپنے اپنے خزانہ میں سونا رکھتا ہے تاکہ وہ سونے کے مطالبات کو پورا کر سکے مگر نوٹوں کے اجرا میں گورنمنٹ اس بات کا خیال رکھتی ہے کہ نوٹوں کی رسد اس قدر زیادہ یا کم نہ ہو جائے کہ انکی وجہ سے اشیاء کی قیمتیں گراں یا ارزاں ہو جائیں۔ بہرحال یہ صورت حال کم و بیش تمام ممالک میں ہے اور اسی فرق مراتب سے جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ سونے کو دنیا کے کاروبار میں کیا اہمیت حاصل ہے۔ اور گورنمنٹ اور بنکوں کے نوٹوں دھات کے سکوں، ہنڈیوں، سرخطوں اور دیگر ایسی دستاویزات میں کمی یا زیادتی جن کے ذریعہ سے خرید و فروخت کی جا سکتی ہے...... کس قدر گورنمنٹوں اور بنکوں کے خزانوں میں سونے کے اسٹاک کی موجودگی پر منحصر ہے۔ اگر سونے کا اسٹاک ان جگہوں میں کم ہو جائے گا۔ تو اسی تناسب سے ان تمام آلات تبادلہ کی رسد کم ہو جائے گی۔ اور ان کی کمی کا اثر اشیاء کی قیمتوں پر ہوگا۔ جو لامحالہ گھٹ جائیں گی۔ گذشتہ چند سالوں سے اسی تجارتی مسابقت اور حریفانہ تگ و دو کے سلسلہ میں جو برطانیہ، امریکہ، فرانس اور دیگر ممالک میں جاری ہے۔ امریکہ اور فرانس اپنے حصۂ رسد سے زیادہ سونا، دنیا کے خزانوں سے کھینچ کھینچ کر اپنے خزانوں میں جمع کر کے مقفل کر رہے ہیں۔ اور اس سے فی الحال کوئی کام سوائے اس کے نہیں لے رہے ہیں کہ اپنے حریفوں کو تنگدست بنائیں۔ دنیا کی قیمتوں پر اس سونے کی رسد کے کھچاؤ کا یہ اثر ہوا ہے۔ کہ قیمتیں گرتی جا رہی ہیں۔

(۵) اسی سے متعلق مسئلہ شرح مبادلہ یا ایکسچینج ریٹ کا ہے - اور یہ ہندوستان کے حالات کے لئے مخصوص دلچسپی رکھتا ہے - جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا - چاندی کی گرتی ہوئی قیمت کو دیکھ کر حکومتوں نے قیمتوں کے قائم رکھنے کے لئے چاندی کی قانونی وظاہری قیمت کو اس کی اصلی اور اندرونی قیمت کے مقابلہ میں ایک قانونی تناسب مبادلہ قائم کرکے اُبھری ہوئی حالت پر قائم کر دیا تھا -

ہندوستان میں اندرون ملک ... چونکہ کاروبار زیادہ تر حقیر رقوم کے ہوتے ہیں - اس لیے حکومت نے سونے کا سکہ یہاں چلانا مناسب خیال نہیں کیا - اور چونکہ ہندوستان کی بیرونی تجارت بیشتر انگلستان سے یا انگلستان سے گزر کر دوسرے ملکوں سے ہوتی ہے - اس لئے یہاں کی حکومت نے بیرونی مطالبات کی ادائیگی کے لئے یہ مناسب خیال کیا کہ یہاں کا چاندی کا سکہ دیگر سکے، برطانیہ کے سکے سے منسلک کر دیے جائیں - اور ایک قانونی تناسب تبادلہ انیسویں صدی کے اخیر کی چاندی کی قیمت پر نظر کرکے ایک روپیہ = ایک شلنگ چار پنس قائم کر دیا گیا - جنگ سے پہلے پہلے یہ صورت حال کسی کے لئے موجب شکایت نہیں ہوئی - کیونکہ برطانیہ کا ساکھ دنیا میں اس قدر بلند تھا کہ برطانیہ کے سکے اور سونے میں کوئی فرق نہ سمجھا جاتا تھا - لیکن جنگ کے دوران میں جنگ کے بعد سونے اور رائج الوقت کاغذی سکوں میں بُعد بڑھتا گیا - اور یہ صورت حال تقریباً تمام ممالک میں رونما ہوگئی - رائج الوقت سکہ آسانی سے سونے میں منتقل نہیں ہو سکتا تھا -

اس لئے اب ہندوستان کے سکہ کی قسمت انگلستان کے سکہ کی انقلاب پذیر قسمت سے وابستہ ہوگئی - اور سٹہ کی گرم بازاری ہوئی اور لوگوں نے بلا جائز ضرورت کے روپیہ کو مختلف ملکوں کے سکوں میں بدلنا شروع کیا - گورنمنٹ کے سونے کے اسٹاک جو ولایت میں رہتے تھے خالی ہونے لگے - اس لئے اس نے اپنی اس ذمہ داری سے دست برداری کر لی - کہ وہ ایک مقررہ شرح تبادلہ پر تمام روپیوں کے عوض انگلستان کی کرنسی مہیا کرے گی - ایسی صورت میں کوئی مقررہ شرح تبادلہ باقی نہ رہی اور تجارت اور دوسرے اسباب کے مطابق شرح تبادلہ بدلتی رہی - لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ حکومت ہند نے اپنی کرنسی پالیسی کو بھی بدل دیا -

جہاں تک کرنسی کی رسد کا تعلق تھا - اس کو انہوں نے اس طریقہ پر قابو میں رکھا - کہ قیمتوں پر ان کا کوئی اثر نہ پڑسکے - اور وہ اپنے قدرتی اسباب کی بنا پر متعین ہوں - لیکن بعد میں انگلستان اور دیگر ممالک کی کرنسی پالیسی اور اشیاء کی قیمتوں کی حالت کا مطالعہ کرکے اور ان کی اس حالت کو نسبتاً پائدار سمجھ کر گورنمنٹ نے شرح مبادلہ ایک روپیہ = ۲ شلنگ مقرر کر دی - لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ فیصلہ قبل از وقت کیا گیا - اور گورنمنٹ کو نظر ثانی کرنی پڑی - جس کی بنا پر شرح تبادلہ ایک روپیہ = ۱ شلنگ ۶ پنس ہے - لیکن گورنمنٹ پر اب بھی یہی اعتراض ہے کہ فیصلہ میں کوتاہ نظری اور قوم فروشی سے کام لیا گیا ہے اور یہ کہ شرح مبادلہ کو وہی ہونا چاہیئے تھا - جو جنگ سے بیشتر تھی -

ہندوستان کی ایک جماعت یہاں کی سرد بازاری کی بڑی ذمہ داری اسی شرح مبادلہ پر عاید کرتی ہے - اور

کہتی ہے کہ اس کی وجہ سے یہاں کی زراعتی و صنعتی و برآمد کرنے والی آبادی کو بیرونی ممالک کے مقابلہ میں ۱۲ ½ فیصدی کم آمدنی ہوتی ہے - اور بیرونی ممالک کو یہاں کے مقابلہ میں ۱۲ ½ فیصدی زاید آمدنی ہے - اور اسی تناسب سے یہاں کی زراعت، صنعت و تجارت کو دوسرے ممالک کے مقابلہ میں نقصان پہنچ رہا ہے - اور دوسرے ممالک کو ہندوستان کے مقابلہ میں فائدہ ہو رہا ہے - اور اس بین الاقوامی تجارتی مقابلہ میں ہندوستان ۱۲ ½ فیصدی کا بوجھ گلے سے لگائے ہوئے دوڑ رہا ہے - اس کی مزید تشریح اس طرح پر کی جاتی ہے کہ ہندوستان کا ہر کارخانہ دار، مزدوری سود، لگان وکرایہ دوکان، محاصل اور اشیاء خام کی قیمت کی ادائیگی میں بمقابلہ غیر ممالک کے ۱۲ ½ فیصدی کا نقصان برداشت کر رہا ہے - اور اسی تناسب سے اسے غیر ملکوں میں اپنا مال بیچنے میں نقصان ہے - اور غیر ملکوں کو اس کے ملک میں سامان بیچنے میں فائدہ ہے - یہ سخت پیچیدہ اور غیر مرئی نقصان و نفع ہے - اور ایک غیر ماہر شخص کے لئے اس کا سمجھنا آسان نہیں ہے - اور جس طرح اس کا اندازہ . . . . . کیا جاتا ہے وہ ایک مستقل مضمون اور اصطلاحی بیان کا محتاج ہے جو فی الحال ملتوی کیا جاتا ہے -

(۶) حکومتوں پر بھی ایک اور انداز سے موجودہ سرد بازاری کا الزام عاید کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ . . . . ان کے اخراجات و محاصل میں بہت زیادتی ہوگئی ہے جس کا بوجھ سنبھالنے سے زراعت، اور صنعت و تجارت قاصر ہے - جنگ کے زمانہ میں حکومتوں کے اخراجات بہت بڑھ گئے تھے - ان کو پورا کرنے کے لئے حکومتوں کو نئے نئے ٹیکس لگانا پڑے - اور لوگوں نے حب الوطنی کے جذبہ میں عارضی ایثار سمجھ کر ان کو برداشت کر لیا - علاوہ ازیں سکوں کی زیادتی کی وجہ سے یہ بار کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوتا تھا آمدنی سکوں کی شکل میں زیادہ ہوتی تھی اس لئے انھیں سکوں میں پہلے کی بہ نسبت زیادہ ٹیکس دینا ناگوار نہ تھا - لیکن جب جنگ ختم ہوئی - اور اخراجات کی زیادتی کا کوئی عذر باقی نہ رہا - دوسرے صنعت و زراعت نے اپنی نئی تنظیم شروع کی اور حکومتوں اور بنکوں نے سکوں کی تعداد میں کمی کر کے کرنسی کو قبل از جنگ کی حالت پر لانے کی کوششیں کیں تو گورنمنٹ کے ٹیکس صاف طور پر بہت زیادہ معلوم ہونے لگے - حکومتوں نے تخفیف کی کمیٹیاں بٹھائیں لیکن حکومتوں کے اخراجات جنگ کے دوران میں دو طرح سے بڑھے تھے - ایک تو وہ جو جنگ کی . . . . ضرورت کے لئے کرنا پڑے - اور دوسرے وہ جنھیں انھوں نے جنگ کی مصیبت کے دوران میں آبادی کے مختلف طبقات مثلاً مزدور پیشہ و دیگر جماعتوں کی دلداری کے لئے برداشت کیا، جنگ عظیم کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ ہر ملک میں مزدور طبقہ کا اقتدار بڑھ گیا - اور حکومتوں کے انتظام میں اس کی بڑی آواز ہوگئی - اس لئے حکومتوں کو اس کے منفعت و آرام کے مختلف اسباب فراہم کرنا پڑے - مثلاً بے روزگاری کے زمانہ میں وظیفہ، بڑھاپے کی پنشن، مکانات، پارک، اور دیگر حفظ صحت کی تدابیر وغیرہ جنکے اخراجات کی یہ مد مستقل ہوگئی - علاوہ ازیں دوران جنگ میں حکومتوں کو اپنے ملک والوں اور دیگر ممالک

کے افراد اور حکومتوں سے بہت کثیر رقوم کے قرض لینا پڑے جن کے سود اور اصل کی ادائیگی بجٹ بنانے والوں کے لیے ایک خاص مسئلہ بن گئی۔ پھر جرمنی اور دیگر مفتوح قوموں سے تاوان جنگ کی امید نے حکومتوں کو، معاملات کی تلخی محسوس کرنے سے عرصہ تک باز رکھا۔ اور بجٹ بڑی نیک تمناؤں اور نیک ارادوں کے ساتھ بنتے رہے۔ اور وہ آرزوئیں اور تمنائیں اکثر و بیشتر ناکام ثابت ہوتی رہیں۔ اور کہیں حکومتوں کے قرضے بڑھتے رہے اور کہیں ٹیکس۔ اور دونوں صورتوں میں صنعت و تجارت پر اس کا بہت برا اثر ہوا۔ کیونکہ ٹیکس کا بار ملک کی صنعت و تجارت پر ہی پڑتا ہے۔ اور جب گورنمنٹ بازار میں بڑی شرح سود کے ساتھ قرض لینے کے لئے آجاتی ہے تو صنعت و زراعت کو معقول شرح سود پر قرض ملنا دشوار ہو جاتا ہے۔

(۷) اسی سلسلہ کی ایک کڑی جرمنی کے تاوان جنگ کا مسئلہ ہے۔ جب جنگ ختم ہوئی تو جنگ کا الزام مفتوح جرمنی پر عاید کیا گیا۔ اور اسے ان نقصانات کی تلافی کے لئے جو جنگ سے مختلف قوموں کو برداشت کرنا پڑے تاوان جنگ ادا کرنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ اور چونکہ فرانس کی سرزمین جنگ کا محاذ رہی۔ اس لئے اس تاوان جنگ میں سب سے بڑا حصہ فرانس کو ملا۔ لیکن صورت حال یہ تھی کہ امریکہ کا برطانیہ سب سے زیادہ مقروض تھا۔ برطانیہ کی مقروض فرانس واٹلی وغیرہ تھے۔ اور فرانس کو جرمنی سے سب سے زیادہ تاوان جنگ لینا تھا۔ اس لئے اس بین الاقوامی قرضے کے سلسلے کی آخری کڑی جرمنی تھی۔ اگر جرمنی سے تاوان جنگ وصول ہو تو امریکہ کا قرض ادا ہو۔ اور کل قومیں ایک دوسرے کے قرض کے بارسے سبکدوش ہوں۔ تاوان جنگ بہت بڑی مقدار کا عاید کیا گیا تھا۔ اور اس کی ادائیگی اس صدی کے اخیر تک ہر سال ادا ہونا طے پائی تھی۔ اور انتظام یہ کیا گیا تھا کہ تھوڑی رقم سے شروع ہو کے جیسے جیسے جرمنی اپنی صنعت و زراعت کو ترقی دے۔ یہ تاوان بڑھتا جائے اور پھر گھٹنا شروع ہو حتےٰ کہ بیسویں صدی کے آخری سالوں میں جرمنی بالکل آزاد ہو جائے۔ جرمن قوم اپنی محنت، مستقل مزاجی اور صبر و ضبط میں اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ اور یوں روپیہ کے قرضے کے اس بوجھ کے خیال سے غیر قوم والوں کو تکلیف ہوتی ہے لیکن جس قوم کو اپنی محنت و مزدوری سے اس کو ادا کرنا تھا۔ اس کو تو چاہیئے تھا۔ کہ اپنی قومی ترقی کی طرف سے بالکل مایوس ہو جاتی۔ لیکن نہیں جرمنی کا ہر فرد مستعدی کے ساتھ اس قومی تاوان کی ادائیگی میں مصروف ہو گیا۔ اور اپنے اخراجات میں انتہائی کمی کر دی۔ اور زیادہ سے زیادہ محاصل جو وہ حکومت کو دے سکتا تھا۔ اس کے دینے کے لئے آمادگی کا اظہار کیا۔ جب غیر قوموں نے جرمنی کے اس عزم و مستعدی کو دیکھا تو انہوں نے جرمنی کو اپنی صنعت و تجارت کے ترقی دینے کے لئے روپیہ قرض دینا شروع کیا۔ اور جرمنی کی صنعت ترقی پانے لگی۔ چند سال تک جرمنی باقاعدگی کے ساتھ تاوان جنگ ادا کرتا رہا۔ گو یہ صحیح ہے کہ جتنا تاوان جنگ وہ ادا کر رہا تھا۔ اسی مقدار میں وہ دوسرے ممالک سے قرض بھی لے رہا تھا۔ اور ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ جرمنی کے مدبرین اور سیاسین نے

تاوان جنگ کی ادائیگی کا یہ ایک اچھا حیلہ نکالا تھا جس سے اس کے ملک کی دولت اس کے ملک ہی میں رہتی تھی - اور دوسرے ممالک اس کا تاوان ادا کرتے تھے - لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے - چونکہ اگر یہ واقعی جرمنی مدبرین کی پالیسی تھی - تو سخت کوتاہ اندیشی پر مبنی تھی - قرض کی ادائیگی کے لئے ایک قوم تاوان جنگ سے زیادہ پابند ہے - تاوان جنگ معاف ہوسکتا ہے - لیکن قرضے کے معاف ہونے کی کوئی صورت نہیں - واقعہ یہ ہے کہ جرمن مدبرین اور سیاسئین اپنے ملک کی صنعت کو ترقی دینا چاہتے تھے - اور جنگ میں جسقدر سرمایہ وہ ضایع کرچکے تھے - اس کے بعد ان کے پاس سوائے اس کے کوئی ذریعہ نہ تھا کہ وہ غیر ممالک سے سرمایہ قرض لیں - اور یہ اس وقت تک ناممکن تھا - جب تک جرمنی اپنی دیانت و امانت کا ثبوت نہ دیدے - چونکہ جرمنی اپنے آپ کو تاوان جنگ کی ادائیگی کے لئے پابند کرچکا تھا - اس لیے اگر وہ تاوان جنگ ادا نہ کرتا تو بدعہد اور بد معاملہ کہلاتا - اور کوئی قوم اسے قرض دینے سے آمادہ نہ ہوتی - دوسری پالیسی اس میں یہ تھی کہ جب کسی شخص یا قوم سے قرض لیا جاتا ہے تو اُسے مقروض شخص یا قوم کی خوشحالی سے کم از کم اس حد تک دلچسپی و تعلق ہوجاتا ہے - جس حد تک کہ اس کا روپیہ وسود مارا نہ جائے اس اصول پر جرمنی یہ توقع قائم کرسکتا تھا - کہ قرضخواہ قوم کے وہ افراد اس کی صنعتی و تجارتی کی ضرور طرفداری کریں گے جنکا روپیہ اس کے ملک میں کاروبار میں پھنسا ہوا ہے - بہرحال جو کچھ بھی اسباب ہوں - ۱۹۲۹ء تک تو قرض لینے کا یہ سلسلہ جاری رہا - لیکن ۱۹۳۰ء میں کاروبار کی سرد بازاری دیکھ کر قرض دینے والی قوموں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا - اور اب جرمنی کو پہلی دفعہ بلاکسی بیرونی امداد کے تاوان جنگ کی ادائیگی کے مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا - صنعت و تجارت کی سرد بازاری اور بے روزگاری دوسرے ممالک کی طرح جرمنی میں بھی بڑھی ہوئی تھی - جرمن قوم کے صبر و ضبط کا پیالہ لبریز تھا - اس کے مزدور اور سرمایہ دار جو ممکن قربانی تھی کرچکے تھے - اور نئی نسل میں اس الزام کے خلاف کہ جرمنی جنگ عظیم کی ذمہ دار ہے سخت شورش تھی - ایک طرف فیسسٹ پارٹی ترقی پاتی جارہی تھی اور دوسری طرف بالشوک اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جرمنی عاجز و تنگ آکر بالشوزم کی گود میں پناہ لے گا جرمنی کے بالشوک ہوجانے کے معنی یہ تھے کہ وہ اپنے تمام قرضوں اور تاوانوں سے انکار کردے گی اور امریکہ اور یوروپین اقوام کی حکومتوں کے تمام ان حسابات میں فرق آجائے گا - جس کی بنیاد پر ان کے بجٹوں کی ترتیب ہوئی تھی - بہت سے بنک فیل ہوجائیں گے - اور تمام دنیا میں . . . . . . کھلبلی مچ جائے گی - سرمایہ دار اپنے روپیہ کے طلبگار ہوں گے اور جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا جائیگا - بڑی سرمایہ دار قومیں ایک طرف ہوجائینگی - اور دوسری طرف معلوم نہیں کون کون قومیں اس کے علاوہ . . . . . . خود سرمایہ دار ممالک میں جہاں مزدور پیشہ جماعت کا اقتدار بڑھتا جارہا ہے - خانہ جنگی کا احتمال تھا - اس اندیشہ کے خیال سے کاروبار میں بے اطمینانی و بےچینی کی کیفیت تھی اور مال کی درآمد و برآمد کی کمی کیوجہ سے ایسی اشیا کی قیمتیں جو برآمد کیجاتی ہیں گری ہوئی تھیں - جرمنی دنیا کی پیداوار کی ایک بڑی گاہک ہے - اور جب ایک بڑے گاہک کی حالت دوالیہ سے قریب تر ہو تو اسکا اثر تجارت پر پڑنا لازمی ہے - (باقی آیندہ)

محمد عاقل، ایم - اے

موسمِ بہار کی ایک رات

سنہ ۱۶ء کے موسم بہار کی ایک رات ہے، قصرِ وہائٹ ہال کی سیڑھیوں کا منظر ہے، محل کی گھڑی گیارہ بجاتی ہے۔

شاہی محل کا پہرہ دار ٹہل رہا ہے۔ ایک لبادہ پوش اجنبی محلسرا کے دروازے پر پہونچتا ہے۔

پہرہ دار۔ خبردار، ادب قاعدہ نگہدار! آج کے "الفاظ راز"؟

اجنبی۔ بالکل بھول گیا، پہرہ دار صاحب!

پہرہ دار۔ پھر تم کسی طرح محل میں داخل نہیں ہو سکتے۔ تم کون ہو؟ تمھیں کیا کام ہے؟ بظاہر تو کوئی شریف اور سچے آدمی معلوم ہوتے ہو!

اجنبی۔ بالکل خلاف پہرے دار صاحب! میں دو دن بھی ایک بات پر قائم نہیں رہ سکتا۔ آج انسان ہوں، کل فرشتہ پرسوں بھوت!

پہرہ دار۔ (ڈرتے ہوئے) بھوت!؟ ——— رحمت کے فرشتے اور حکومت کی محافظِ امن جماعت مجھے اس خطرہ سے بچائے۔!!

اجنبی۔ خوب کہا! پہرے دار صاحب سبحان اللہ! ——— تمھاری اجازت سے میں ان الفاظ کو نوٹ بک میں نقل کئے لیتا ہوں۔ میری یادداشت نہایت خراب ہے (نوٹ بک نکال کر لکھنے لگتا ہے)

میرے خیال میں یہ نہایت ہی خوب منظر ہے کہ تم رات کی خاموش اور سنسان فضا میں پہرے پر ٹہل رہے ہو۔ اور میں ایک بھوت کی طرح چاند کی دھندلی روشنی میں تمھارے پاس پہونچتا ہوں . . . . تم تعجب سے مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ . . . . واقعہ یہ ہے کہ میں آج رات ایک نقاب پوش نازنین کے انتظار میں یہاں کھڑا ہوں۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میں پہرہ دار کا نذرانہ دیکر باہر آجاؤں گی، میں نے اُسے اس مصرف کے لئے تھیٹر کے چار ٹکٹ دیدیئے ہیں۔

پہرہ دار۔ خدا اُسے سمجھے، اس نے مجھے صرف دو ٹکٹ دیئے ہیں

اجنبی۔ (اپنی نوٹ بک کا ایک ورق پھاڑتے ہوئے) لو میرے دوست یہ پرچہ لو۔ جس روز شکسپیر کے کھیل شروع ہوں گے۔ اس روز اس پرچے کے ذریعے سے تمھیں نہایت اعزاز کے ساتھ خوش آمدید کہا جائے گا۔ تم اپنی بیوی بچوں دوستوں سمیت بلا لحاظ تعداد ان میں شرکت کرسکتے ہو۔ جس قدر جی چاہے آدمی لاؤ، تھیٹر میں کافی جگہ ہے۔

پہرہ دار۔ مجھے ان نئے ڈراموں سے مطلق دلچسپی نہیں ہے۔ کوئی شخص ان کا ایک لفظ تک نہیں سمجھ سکتا۔ نہ گانا ہے۔ نہ ساز ہے۔ شروع سے آخر تک گفتگو ہی گفتگو ہے۔ آپ اپنے تحفہ کو اپنے پاس ہی رکھیے۔ ہاں اگر "ہسپانی خون" کا پاس" آپ مجھے دے سکیں تو آپ کی بڑی عنایت ہو۔

اجنبی۔ "ہسپانی خون"، ——— میرے دوست "ہسپانی خون" دیکھنے کے لیے دام خرچ کرنے پڑتے ہیں ...... اس کی ترکیب یہ ہے۔ (وہ اپنی جیب سے ایک سونے کا سکہ نکال کر پہرہ دار کے حوالہ کرتا ہے)

پہرہ دار۔ (نہایت تعجب سے سکہ کو دیکھ کر) خدا آپ کو سلامت رکھے۔ سرکار، اُس نقاب پوش نازنین سے کہیں زیادہ فیاض ہیں۔!

اجنبی۔ میرے دوست عورتیں مردوں کی بہ نسبت کفایت شعار ہوتی ہیں۔

پہرہ دار۔ بے شک آپ نے سچ کہا۔ مرد ہر چیز گراں قیمت پر خریدتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس نقاب پوش نازنین کو تو یوں بھی قریب قریب ہر رات پہرہ داروں کو کچھ نہ کچھ نذر کرنا ہی پڑتا ہے۔ آپ خود خیال کیجیے۔ اس صورت میں اگر وہ کفایت شعاری نہ کرے تو کیونکر کام چلے۔

اجنبی۔ (تعجب و حیرت سے) کیا کہا؟ ——— میں کبھی یقین نہیں کرسکتا۔

پہرہ دار۔ یقین نہ کیجیے، مجھے قسم کھانے کی ضرورت نہیں۔ ہاں یہ ضرور عرض کروں گا۔ کہ کم ازکم آپ اس قسم کے "عشقیہ کھیل"، سال میں دو مرتبہ سے زیادہ کھیلنے کی جرأت نہ کریں۔

اجنبی۔ بدمعاش کہیں کا .... کیا تو یہ کہنے کی جرأت رکھتا ہے کہ میری نقاب پوش نازنین اسیطرح روز چھپ چھپ کر محل سے آتی ہے اور دوسرے آدمیوں سے بھی ملتی رہتی ہے؟

پہرہ دار۔ خدا آپ کی سادگی پہ رحم کرے۔ کیا جناب کا اس سے یہ مدعا ہے کہ دنیا میں صرف آپ ہی ایک حسین اور سجیلے نوجوان ہیں؟ اچھا اب آپ جائیے، میں آئندہ اس کا لحاظ رکھوں گا۔ کہ وہ اس فیاض نوجوان کو دھوکا نہ دے جس نے اپنی معصوم محبت کے لئے مجھے زندگی میں سب سے پہلے سونے کا سکہ دیا۔ آپ بالکل اطمینان رکھیں۔

اجنبی۔ پہرہ دار! کتنی حیرت انگیز بات ہے؟ ہم سب اس حقیقت کو جانتے ہیں۔ کہ دنیا کی تمام عورتیں فریب کار،

دغاباز اور حیلہ ساز ہوتی ہیں، سب کو اس بات کا یقین ہے، لیکن جب ہم اپنی محبوبہ میں اس صفت کو پاتے ہیں۔ اور کوئی اتفاق ہماری آنکھیں کھولتا ہے۔ تو ہمیں ایسا تعجب ہوتا ہے گویا کوئی نہایت ہی غیر ممکن بات تجربہ میں آرہی ہے۔ اکثر ہم خود کو جھٹلانے لگتے ہیں اور بیشتر اپنی ہی آنکھوں کو فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

پہرہ دار۔ سب کے لئے آپ ایسا نہیں کہہ سکتے، جناب اکثر ان میں نیک بھی ہوتی ہیں۔

اجنبی۔ (اظہار برہمی کے ساتھ) ہرگز نہیں، کوئی نہیں، سب کی سب دغاباز ہوتی ہیں۔ اور تمام کی فطرت میں قدرت نے فریب تخلیق کیا ہے۔ اگر تمھیں اس سے انکار ہے تو یقیناً تم خود کو فریب دے رہے ہو۔

پہرہ دار۔ معاف کیجئے آپ نے زیادہ تر غالباً کلکسراکی عورتوں کے تجربہ پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ یہاں کے متعلق بے شک آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں فریب کا دوسرا نام عورت ہے۔

اجنبی۔ (نوٹ بک نکالتے ہوئے) جزاک اللہ، اپنے الفاظ کو پھر دُہرانا —— وہی الفاظ جو تم نے عورت کے لئے استعمال کئے ہیں —— ہاں وہی روح پرور راگ!

پہرہ دار۔ کون سا راگ جناب —— خدا کی قسم میں بالکل گانا نہیں جانتا!

اجنبی۔ گانا تمھارے خمیر میں موجود ہے، راگ تمھاری فطرت ہے۔ تمھاری گفتگو سے اس کا اظہار ہو رہا ہے . . . . . . ہاں (لکھتا ہے)

—— "فریب تیرا نام عورت ہے"۔ . . . . (جھوم کر دُہراتا ہے) "فریب تیرا نام عورت ہے!" —— آہ!!

پہرہ دار۔ جناب مجھے حیرت ہے کہ ان چار لفظوں میں کیا ہے۔ جس پر آپ جھوم رہے ہیں؟ کیا آپ "گدڑے الفاظ" ہیں۔

اجنبی۔ "گدڑے الفاظ"! . . . . (تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر) غیر فانی —— مطلق غیر فانی اصطلاح ہے!! (جھکتے ہوئے منہ ہی منہ میں) یہ پہرہ دار مجھ سے کہیں زیادہ قابل ہے!

پہرہ دار۔ معلوم ہو گیا۔ آپ بھی ہمارے درباری شاعر کی طرح مدہوش رند ہیں۔

اجنبی۔ کیوں؟ —— میں اسے جانتا ہوں وہ میرا عزیز دوست ہے، اس کی مدہوشی سے تمھارا کس طرف اشارہ ہے۔؟

پہرہ دار۔ چاندنی رات میں غزلیں —— —— اور اسی نقاب پوش نازنین کے لئے لکھنا جس کے لئے آپ نے زحمت گوارا فرمائی ہے —— ؛

اجنبی۔ اچھا؟ . . . . . . کیا صورت حال یہ ہے؟ اور میں اُسے اپنا دوست سمجھتا ہوں!!

پہرہ دار - ایسا ہی ہوتا ہے!

اجنبی - اور شاید ایسا ہی ہوتا آیا ہے ——— (غصہ سے) شیطان کی صورت میں دوست! خدا کی پناہ!!

پہرہ دار - کیا واقعی ہمارا شاعر اسی قابل ہے جیسا آپ فرماتے ہیں؟

اجنبی - (اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کسی حقیقت کو سمجھ کر) کسی قابل؟ . . . . نہیں میاں پہرہ دار ——— یہ انسانیت سے بعید ہے، واقعہ یہ ہے کہ جب ہم غصہ میں ہوتے ہیں اور آپس میں کوئی وجہ شکایت ہوتی ہے، تو ہم سمجھدار انسان بھی اکثر ایک دوسرے کو بلا سوچے بچوں کی طرح گالیاں دینے لگتے ہیں - یہ انسان کی فطرت ہے . . . . . . صرف اتنی سی بات ہے -

پہرہ دار - محض الفاظ کی نوٹ پھیر ہے - صرف الفاظ کی، لیکن افسوس! یہ الفاظ ہوائی قلعے ہیں ——— محض ہوا - آپ بھی جانتے ہوں گے کہ ہوا سے ہمارے پیٹ نہیں بھر سکتے -

اجنبی - کیا خوب تنقید ہے! . . . . . . اجازت ہے (یہ کہکر وہ اپنی نوٹ بک میں لکھنے لگتا ہے)

پہرہ دار - اور یہ تنقید کیا بلا ہوتی ہے؟ . . . . . . میں نے اپنی زندگی میں اس لفظ کو نہیں سنا -

اجنبی - (مسکراتے ہوئے) پنی تلی بات کہنا، بے لاگ محاکمہ کرنا تنقید کہلاتا ہے -

پہرہ دار - آپ کی گفتگو بھی عجیب ہے - معاف کیجئے، میری سمجھ میں تو آتی نہیں - لیکن یہ ضرور ہے کہ آپ نہایت ہی با اخلاق آدمی معلوم ہوتے ہیں، آپ کے الفاظ میں ایک غریب آدمی کو اپنی طرف کھینچنے کی کشش موجود ہے اور جب آپ گفتگو کرتے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے گویا آپ کے دل میں اُس کے خیالات و جذبات کے ساتھ پوری ہمدردی موجود ہے -

اجنبی - میری زندگی کا مقصد ہی یہ ہے - لیکن افسوس زمانہ میرے ساتھ نہیں ہے - دنیا میرے جذبات کا احترام کرنے کے لئے ابھی تیار نہیں . . . . . . (محلسرا کا دروازہ اندر سے کھلتا ہے اور روشنی کی شعاعیں اگلی سیڑھیوں پر پھیل جاتی ہیں)

پہرہ دار - وہ لیجئے آپ کی محبوبہ آگئیں، اب میں گشت کے لئے دوسری طرف جاتا ہوں - آپ اپنے کام سے لگئے - میں اپنا کام دیکھتا ہوں - جس وقت تک میرا محافظ نہیں آتا اس وقت تک بظاہر میری واپسی کی بھی کوئی اُمید نہیں - محافظ سست آدمی تو ضرور ہے لیکن اتنا ہی سخت بھی ہے - اس سے ذرا ہوشیار رہیے - اچھا شب بخیر! . . . . . . (مسکراتے ہوئے) اور بھی سب کچھ بخیر! (چلا جاتا ہے)

اجنبی - سُست بھی ہے اور سخت بھی (دل ہی دل میں) "سخت سست کہنا" تو محاورہ تھا - لیکن اس پہرے دار نے محاورات کی لغت میں آج ایک نیا اضافہ کیا ہے - واہ! (نوٹ بک میں لکھ لیتا ہے)

(ایک لبادہ پوش عورت اٹھلاتی ہوئی محل سے نکلتی ہے، اور ایک بہکے ہوئے سے انداز میں سیڑھیوں سے اتر کر بائیں باغ میں ٹہلنے لگتی ہے۔ اُس کے انداز سے یہ معلوم ہورہا ہے کہ وہ نیند میں اٹھ کر چلی آئی ہے۔ اور خواب ہی میں ٹہل رہی ہے۔)

نازنین - (اپنے دونوں ہاتھوں کو اس طرح ملتے ہوئے گویا انھیں صابن سے دھو رہی ہے) چھوٹ، ناپاک نشان چھوٹ، اب بھی ٹھیک نہیں ہوا۔ ابٹن نے اسے اور نمایاں کردیا ہے۔ مگر . . . . خدا نے تیرا رنگ روپ کچھ اور بنایا ہے اور تو اُسے کچھ اور بنانا چاہتی ہے . . . . عورت!! نادان مخلوق ——— ابھی اپنی قبر کا بھی خیال کرلیا کر، ہمیشہ خوبصورتی کے خیال میں الجھے رہنا ہی سب کچھ نہیں ہے۔ وادیٔ کشمیر کی تمام خوشبوئیں اور سرزمین شام کے جملہ معطر ابٹن بھی مل کر اس داغدار ہاتھ کو خوبصورت نہیں بنا سکتے . . . . "

اجنبی - " وادیٔ کشمیر کی تمام خوشبوئیں " . . . . . . کیسی حسین اور نازک بات ہے! کتنا پیارا خیال ——— ایک نظم کا مکمل عنوان! اور ایک عنوان میں مکمل نظم!! ——— کیا ہی میری پیاری "میری" ہے۔ (نازنین سے) تم ایسی نامانوس اور اجنبی آواز میں کیوں بول رہی ہو؟ اور سلام دعا سے قبل اس شاعری کا کیا موقعہ ہے، میری! تمھارے دل کو کوئی درد تو نہیں پہونچا؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ (زیر لب) خداوندا یہ مردوں کی طرح کیوں ٹہل رہی ہے؟ (ذرا اونچی آواز سے کان کے قریب منہ لے جاکر) "میری!" ——— "پیاری میری"!!

نازنین - (اسی کے الفاظ بازگشت کرتے ہوئے) "میری!" ——— "میری!!" ——— کسے خیال تھا کہ اس عورت میں اتنا خون ہوگا؟ کیا یہ بھی میرا قصور ہے کہ میرے مشیر کا ہی اب اس کے خون کا الزام میرے سر تھوپ رہے ہیں۔ خدا کی پناہ! . . . . میری اگر تو عورت تھی تو بہ نسبت خون کے تجھ میں چالاکی اور ذہانت زیادہ ہونی چاہئے تھی۔ یہ کیا کہ تمام فرش کو بدتمیزی سے خون آلود کردیا . . . . دیکھو اس کا سر اس طرح مت اٹھاؤ، یہ قول فراموش ہے، جھوٹی ہے! . . . . . . کہہ تو رہی ہوں کہ میری مرچکی ہے، اُسے دفن بھی کردیا گیا، وہ قبر سے باہر نہیں آسکتی . . . . مجھے اب کوئی خطرہ نہیں۔ ——— یہ بلیاں ——— عورت کی صورت میں طمع کی بلیاں، جنکے لیے ایک مرد کی آغوش سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہوسکتی، تخت شاہی پہ چھلانگ مارنے کی جرأت کرتی ہیں، ایسی گستاخ جرأتوں کی سزا سوائے گردن مارنے کے اور کیا ہوسکتی ہے؟ اب جو ہوگیا وہ ہوچکا، اور جو ہوچکا وہی ٹھیک تھا . . . . چھوٹ ناپاک نشان چھوٹ . . . . واہ! ملکہ اور داغوں کے نشان ——— ! واہ!"

اجنبی - (نازنین کا شانہ ہلاتے ہوئے) "میری" ــــــــ سنو تو! کیا سو رہی ہو؟
(نازنین جاگتی ہے، گھبرا کر چونکتی ہے اور پھر اُس پر ایک غشی سی طاری ہو جاتی ہے۔ اجنبی اُسے اپنی آغوش میں سنبھال لیتا ہے)

نازنین - (کچھ دیر بعد چونک کر) میں کہاں ہوں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو، کون ہے؟

اجنبی - (گھبرا کر) معزز خاتون مجھے معاف کرنا ابتک بڑا مغالطہ رہا، میں تمھیں اپنی محبوبہ میری سمجھ رہا تھا۔

نازنین - (برہمی سے الگ ہٹ کر) شریر انسان! تجھے یہ جرأت کیسے ہوئی؟

اجنبی - ناراض نہو، معزز خاتون، میری محبوبہ بھی نہایت حسین ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ تمھاری طرح شاعرانہ اور فصیح گفتگو نہیں کرسکتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ! "وادیٔ کشمیر کی تمام خوشبوئیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " یہ تم نے خوب کہا اور نہایت ہی دلکش انداز میں کہا۔

نازنین - تو کیا میں یہاں تم سے گفتگو بھی کر چکی ہوں؟

اجنبی - ہاں! حسین خاتون، کیا تم اتنی جلد بھول گئیں؟

نازنین - میں خواب کی حالت میں تھی۔

اجنبی - حسین خاتون! خدا کرے تم ہمیشہ اسی طرح خواب دیکھتی رہو، اس لئے کہ اس حالت میں جو الفاظ تمھاری زبان سے نکلتے ہیں وہ شہد سے زیادہ شیریں اور نغمہ سے زیادہ مترنم ہوتے ہیں!

نازنین - (ایک شاہانہ انداز سے) تمھاری گفتگو کسقدر بیباک ہے؟ ــــــــ تمھیں معلوم ہے۔ کہ تم کس سے مخاطب ہو؟!

اجنبی - (لاپروائی سے) مجھے معلوم نہیں، نہ معلوم کرنے کی ضرورت ــــــــ میرے خیال میں تم شاہی باغ کی کوئی تتلی ہو، جن کی دو قسمیں ہیں ــــــــ ایک وہ جو اپنے نرم و نازک لہجے سے فضا کو مترنم بنائے رکھتی ہیں، اور دوسری وہ جو خاموشی سے خود کو پھولوں کی آغوش میں دے دیتی ہیں۔ تمھاری آواز میں ایک قدرتی نغمہ اور ایک فطری کشش موجود ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس طرح نہ دیکھو! میں رشک نہیں کر رہا ہوں، نہ مجھ میں اس کی جرأت!"

نازنین - تم میں کس قدر جسارت ہے؟ میں حیران ہوں! خیر، آپ کی توصیف و شناحد سے تجاوز کر چکی ہے۔ اب براہ کرم اس قصیدے سے گریز کیجئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اجنبی - (گفتگو روکنے کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہوئے) "قصیدے سے گریز کیجئے!"

نازنین - گستاخ اجنبی! کیا تو میرے روبرو میری نقل اتار رہا ہے؟ اتنی جرأت؟!

اجنبی - یہ نغمہ ہے! اس کا نام راگ ہے۔ کیا تمھیں علم نہیں کہ جب کوئی اچھا مغنی کوئی نئی چیز گاتا ہے تو ہم بلا ارادہ اُسے چپکے چپکے دُہرانے لگتے ہیں تاکہ اس کے لہجے اور اس کی دُھن کا چربہ ہمارے گلے میں اتر آئے۔ کسی راگ کو مع اتار چڑھاؤ کے ہم اسی طرح سیکھتے ہیں اور صرف یہی اس کے سیکھنے کا ایک طریقہ ہے۔ . .

. . . . "قصیدے" کے ساتھ "گریز" کا لفظ کسی زبردست شاعر ہی کی زبان سے ادا ہو سکتا تھا۔ لیکن تم نے جس شیرینی سے اُسے ادا کیا ہے۔ وہ شاعر کی زبان میں کہاں؟——
قصیدے کے ایک لفظ میں ان تمام جذبات کی دنیا آباد ہے جو مرد عورت کی طرف سے اپنے دل میں پرورش کرتا رہتا ہے اور گریز کی ایک اصطلاح میں ان جملہ خصوصیات نسوانی، اس تمام "استغنائے حسن" کی تصویر ہے جو عورت مرد کے لئے اپنے اندر پیدا کرتی ہے۔! . . . . ہاں کیا کہا تھا تم نے خاتون

. . . . . . اپنی قصیدہ گوئی میں. . . . .

نازنین - عجب پراگندہ دماغ ہے! میں نے کہا اور اب پھر کہتی ہوں کہ اس قصیدے سے گریز کیجئے۔

اجنبی - (جلدی سے) آہا ہا —— "قصیدے سے گریز کیجئے" —— "قصیدے سے گریز" —— "قصیدے سے . . . ."

لعنت میری یادداشت پر! بلا لکھے کام نہ چلے گا۔ (لکھنا شروع کرتا ہے مگر پھر بھول جاتا ہے) . . .
ہاں اے "ملکۂ شعر" میرے پراگندہ دماغ سے تمھیں کیا شکوہ تھا؟ تم نے بالکل صحیح کہا، خود میری سماعت نے محسوس کیا کہ میں غلط دہرا رہا ہوں۔

نازنین - تم نے "قصیدہ گوئی" کی میں نے کہا "قصیدہ سے گریز کیجئے"۔

اجنبی - (کاٹ کر صحیح لکھتے ہوئے) جزاک اللہ! . . . . اچھا چونکہ تمھارا حکم ہے کہ یہ قصیدے کا موقعہ نہیں ہے، اس لئے میرے خیال میں "گریز" کی بھی ضرورت نہیں۔ لو بس اب تم صرف میری ہو جاؤ، میری ملکۂ شعر!

نازنین - بڑھ چلا، نفس کا غلام بڑھ چلا، (خود ہی، زیر لب) خیر آج یہ تماشہ بھی سہی۔ (اجنبی سے مخاطب ہو کر) "کیا یہ ایک اتفاق ہے کہ آپ کے دریائے محبت میں سیلاب آگیا ہے یا عادت سے مجبور ہو کر آپ ایسا کر رہے ہیں؟

اجنبی - نہیں۔ محبت نہ اتفاق کا نام ہے نہ کوئی عادتاً اسے اپنے دل میں پیدا کر سکتا ہے۔ اس کی ذمہ دار خود تمھاری ذات ہے۔ تم تے ہی میرے دل میں محبت پیدا کی اور اب میں اسے اپنے جذبات کا جامہ پہنا کر تمھارے ہی قدموں پر نثار کر رہا ہوں۔ اس لئے اب یہ سوال بعد از وقت ہے کہ مجھے محبت کی عادت ہے یا یہ اتفاق

ہے - میری روح کی مالکہ میرے خیال کی ملکہ !! میں اب تیرا ہوں .... نہیں، یہ الفاظ میں اس سے قبل بھی کہہ چکا ہوں، اب میری محبت کے لفظی لباس کو زیادہ آتش ساماں ہونے کی ضرورت ہے .... ''

نازنین - تم بہت طویل گفتگو کرتے ہو، تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میں کسی کا طول طویل لیکچر سننے کی عادی نہیں ہوں، بلکہ میرے کان اپنی آواز اور اپنے احکامات سننے کے زیادہ عادی ہیں -

اجنبی - تمھیں پر کیا منحصر ہے - وہ سب جن کی گفتگو شیریں ہوتی ہے، اسی طرح اپنی گفتار پر ناز کیا کرتے ہیں - بلاشبہ تمھاری زبان ستاروں کی زبان اور تمھارے نغمے فرشتوں کے گیت ہیں ! ...... مگر تمھیں بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ میں '' الفاظ کا بادشاہ '' کہلاتا ہوں ! ....

نازنین - بادشاہ ! ہا ہا ہا ! ....

اجنبی - بیشک، بادشاہ سے کسی طرح کم نہیں، ہر چند کہ ہم ایک ادنیٰ مخلوق ہیں، ہم مرد و عورت !

نازنین - عورت !؟ ایں ؟ کیا تو مجھے صرف '' عورت '' کے لفظ سے مخاطب کر رہا ہے !

اجنبی - اس سے زیادہ حسین اور موزوں خطاب تمھارے لیے کیا ہو سکتا ہے ؟ تمھیں بتلاؤ اور کس خطاب سے میں تمھیں رام کر سکتا ہوں .... وہ اور کونسا نام ہے جسے محبت محبوب کیلئے تجویز کرتی ہے ..... تمھاری برہمی بھی ایک حد تک درست ہے، جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ ہم محض ایک ادنیٰ مخلوق ہیں، لیکن پھر بھی ایک جوہر ہمارے اندر پوشیدہ ہے جو اگر کسی طرح جلا پا جائے تو ہمیں فرشتوں سے بہتر بنا سکتا ہے

نازنین - ختم کیجئے ! اس حکیمانہ وعظ کو ختم کیجئے !! میں خود اپنے کو بہتر سمجھتی ہوں -

اجنبی - یہ حکیمانہ وعظ نہیں بلکہ ناقابل انکار حقیقت ہے، وہ '' جوہر '' جس کا میں نے تذکرہ کیا ہمارا نفس شاعر ہے - جوہر فانی نہیں ہوتا - دنیا یقیناً ایک فریب فانی ہے - اور ہماری حقیقت حقیر حشرات الارض سے زیادہ نہیں مگر صرف نفس شاعر کو بیدار کرنے اور محبت کا سحر آفریں جامہ پہنانے سے ہم اپنی روح کو غیر فانی حقیقت میں تبدیل کر سکتے ہیں، اس حد تک کہ تمام کائنات '' حقیقت عریاں '' بنکر شگفتہ ہو جائے اور اپنے دامن میں صدہا فردوس ہمارے لئے مہیا کر دے -

نازنین - تم اپنے دریائے فصاحت میں اپنی فردوس کو بہائے دے رہے ہو - بہت ناعاقبت اندیش ہو - مبالغہ کی کوئی حد بھی ہونی چاہیئے -

اجنبی - اس وقت تمھاری تنقید میں نیاس کا رنگ ہے -

نازنین - کون ناآس ؟ . . . . . . یہ کون صاحب ہیں؟

اجنبی - ایک خشت انداز، ایک ناسمجھ معمار! جو یہ خیال کرتا ہے کہ آسمان وہیں ہے - جہاں تک اس کی سیڑھی کی رسائی ہے، اور محض اس کی بنا پر میری بلند پروازی کو مبالغہ سمجھتا ہے - تم یاد رکھو! پیاری تتلی! دنیا میں ابھی تک کوئی لفظ ایسا اختراع نہیں ہو سکا ہے اور کوئی راگ ایسا نہیں گایا جا سکا ہے جو مبالغہ تو درکنار اس حقیقت کی ادنیٰ سے ادنیٰ ترین ترجمانی بھی کر سکے جو محبت کا احساس قلب میں پیدا کر دیتا ہے - اس سے انکار کرنا واقعات کو جھٹلانا ہے ——— ! کیا تمھیں علم نہیں کہ ابتدائے آفرینش بھی صرف ایک ہی لفظ کی رہین منت ہے، اور وہ لفظ خدا کے ساتھ وابستہ تھا ——— نہیں بلکہ وہی لفظ خدا تھا ———!

نازنین - خبردار! اجنبی انسان، ذرا سوچ سمجھ کر! مذہب کے متعلق اسقدر بیباکی سے گفتگو! کیا تو نہیں جانتا کہ ملکہ مذہب کی محافظ اور علمبردار ہے! ؟

اجنبی - اور میرے نزدیک ملکہ تم ہو، اس لئے تم ہی مذہب کی علمبردار ہو، ابھی کیا، جب ابتداء میں تم نے "وادیٔ کشمیر" والا نغمہ چھیڑا ہے، اسی وقت میں نے تمھیں اپنے مذہب محبت کا علمبردار بنایا تھا - مگر کیا ملکۂ انگلستان بھی ان الفاظ کو کہہ سکتی ہے؟ میں نے تو یہ سنا ہے کہ اس کے راگ صرف گرجا کی کنواریوں کے لئے مخصوص ہیں، اگر یہ درست ہے تو آج بجائے اُن کے میں اس عزت کا مستحق ہوں، میں تمھاری دست بوسی کر کے اظہار عقیدت کروں گا - لیکن جب تک مقدس راگ کے شروع ہونے کا وقت آئے تب تک تم میرے "دل کی ملکہ" ہو ——— میں ان لبوں کو بوسہ دوں گا جنھوں نے میری روح پر نغموں کی بارش کی ہے . . . . (یہ کہکر وہ نازنین کو اپنی آغوش میں کھینچ لیتا ہے)

نازنین - (آغوش میں تڑپتے ہوئے) حد سے زیادہ گستاخی! . . . . . . اپنی زندگی عزیز ہے تو فوراً میرے جسم سے ہاتھ ہٹا - ! . . . . فوراً !

(ایک نقاب پوش نازنین چکور کی طرح دبی ہوئی تیزی سے محلسرا کی سیڑھیوں سے اترتی ہے اور چپکے سے دونوں کے پیچھے آکر چھپ جاتی ہے - ان کی گفتگو سنکر بپھری ہوئی شیرنی کی طرح جھپٹ پڑتی ہے مگر پھر سنبھلتا ایک طرف سایہ میں چھپ رہتی ہے -)

اجنبی - (نقاب پوش نازنین سے بےخبر) اگر تمھاری یہی خوشی ہے تو میرے ہاتھوں میں جو ایک نئی زندگی کی رو دم دوڑا رہی ہو اُسے روک دو - تم تو خود ہی مجھے کہربا کی طرح کھینچ رہی ہو - تمھاری آغوش سے وابستہ ہونے

میں میرے ارادے کو مطلق دخل نہیں ہے اور اب جبکہ ہم جذب و کشش سے لذت آشنا ہو چکے ہیں۔
ہماری ہستی علیحدہ نہیں کی جا سکتی، ہم دونوں ایک ہیں، کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔!

نقاب پوش نازنین۔ اس دعوے کے ثبوت کی ضرورت ہے، دغاباز اور فریبی حیوان! لے یہ تیرے اور تیری کتیا کے عہد و پیمان پر ایک مہر توثیق . . . .

(ان الفاظ کے ساتھ وہ اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر پوری قوت سے دونوں کے دو ہتڑ مارتی ہے، اور وہ چونک کر علیحدہ ہو جاتے ہیں)

پہلی نازنین۔ (غیظ و غضب سے سُرخ ہو کر، لبادہ اتار کر پھینکتے ہوئے) حملہ آور نازنین سے) ——— انتہائی نمک حرامی!!!

نقاب پوش۔ (پہچان کر، خوف سے لرزتے ہوئے نازنین کے قدموں پر گر کر) آہ تقدیر! میں کہیں کی نہ رہی اب کون بچا سکتا ہے؟ میں نے ملکۂ عالم کے ساتھ گستاخی کی ہے!!!

اجنبی۔ (ایک فخریہ انداز سے تنکر) نہ صرف اسقدر بلکہ " ولیم شیکسپیر " کے ساتھ بھی گستاخی کی ہے!!!

ملکۂ الزبتھ۔ (ادب سے گردن جھکا کر) میری! بڑا ستم ہو گیا تو نے ولیم شیکسپیر کی خدمت میں گستاخی کر دی!!! انتہا ہو گئی!! مگر مجھے اُن تمام بدمست ہرنیوں، ان سب محبت کی بھوکی کنواریوں، اور ان جملہ اندھیرے میں اُڑنے والی عصمت فروش چمگادڑوں کی قسم جنہوں نے میرے محل کی فضا کو گناہوں سے آلودہ کر رکھا ہے، مجھے اتنا بتادے، صرف اتنا کہ یہ حضرت ولیم شیکسپیر صاحب دام اقبالہٗ کون ہیں؟ اور کس سرزمین کے بادشاہ ہیں؟!

نقاب پوش۔ صرف ایک ایکٹر، ملکۂ عالم! . . . . آہ! خدا میرا ہاتھ اٹھنے سے پہلے ہی کیوں نہ کاٹ دیا۔

ملکہ الزبتھ۔ اگر تیری یہی تمنا ہے تو اس کا پورا ہونا کچھ مشکل نہیں، لیکن یہ اور زیادہ آسان ہے۔ کہ ہاتھ ہی کے ساتھ تیرا سر بھی قلم کرا دیا جائے۔

نقاب پوش۔ ولیم! . . . . بچالے! خدا کے لئے مجھے بچالے!!!

الزبتھ۔ بچالے، اور یہ!! واقعی یہ اسی قابل ہے کہ تجھے بچالے گا!
میرا قیاس تھا کہ یہ شخص کم از کم کوئی خاندانی رئیس یا سردار ضرور ہوگا، اس لئے کہ مجھے اپنے محل کی ادنیٰ ترین خادمہ کے متعلق بھی یہ گمان نہیں تھا کہ وہ کسی حقیر خاندان کے آدمی سے مل کر دقارِ شاہی کی ذلت کرے گی۔

شیکسپیر - (برہمی سے زمین پر قدم مار کر) حقیر خاندان!! . . . . . کیا کہا؟ . . . . میں شیکسپیر آف اسٹریٹ فورڈ!——— میں! جس کی ماں اردانی نسل کا چشم و چراغ تھی - اور حقیر خاندان ——— ملکہ شاید بہک رہی ہے، یا خود فراموشی کے عالم میں ہے!!!

الزبتھ - اپنی جسارت! . . . . . . ذلیل انسان ——— ! بیشک میں نے تجھے حقیر کہا - اور تجھے بتائے دیتی ہوں . . . . "

نقاب پوش - (الزبتھ کے قدموں سے اٹھ کر خود کو دونوں کے درمیان ڈالتے ہوئے) ولیم! خدا کے لئے، ملکہ کو زیادہ برہم نہ کرو، اسے غصہ دلانا موت کے مترادف ہے - (ملکہ سے مخاطب ہوکر) اس کی باتوں پر نہ جائیے!

شیکسپیر - میری تم اپنی زندگی کے متعلق استدعا کر سکتی ہو، میرے لئے کچھ نہ کہو، میری نظر میں اس ملکہ کی کوئی وقعت نہیں ہے . جو میرے خاندانی اعزاز سے غافل ہے . . . . . . مجھے اس سے انکار نہیں کہ میرا باپ نہایت غریب آدمی تھا، لیکن یہ بھی اس وجہ سے ہوا کہ اس کا شریف خون اسے دوسرے غریبوں کے لئے بے دریغ روپیہ خرچ کرنے پر مجبور کرتا تھا - اس نے مرتے دم تک اپنے قرضوں سے انکار نہیں کیا - اب یہ اور بات ہے کہ اسے اپنی زندگی میں ادائیگی کی استطاعت نہ ہو سکی - تاہم اس کی نیک نیتی اسی سے ظاہر ہے کہ اس نے مرتے دم اپنے قرضخواہوں کی ایک ایک پائی تسلیم کر کے دستاویزات پر دستخط کئے، جنکی بدولت بعد میں ادائیگی ہوئی ورنہ ہم کسی کا ایک ادا کرنے کے ذمہ دار نہ تھے -

الزبتھ - (طنز سے) تمھارے اسی باپ کا بیٹا اب شہنشاہ ہنری ہشتم کی لڑکی سے اپنا جائز انعام پائے گا -

شیکسپیر - (غیر معمولی افتخار سے تنکر) اُس وحشی انسان کا نام اسٹریٹ فورڈ کے عالی خاندان بزرگ کے ساتھ نہ لو - جان شیکسپیر (میرے باپ) نے شریف عیسائیوں کی طرح صرف وہی ایک شادی کی جس کی مذہب نے اجازت دی ہے - ہنری ہشتم نے چھ عورتوں سے شادی کی! تمھیں اس کا نام لیتے ہوئے شرم آنی چاہئے!

نقاب پوش } دونوں ساتھ ساتھ چلاتے ہوئے ←—— ولیم خدا کے لئے!!!
الزبتھ - } ←—— گستاخ کتا!!!

شیکسپیر - (دونوں کی گفتگو قطع کرتے ہوئے) اچھا! تمھارے پاس کیا ثبوت ہے کہ ہنری ہی حقیقتاً تمھارا باپ تھا ———؟!!

الزبتھ - ——— باجی! (غصہ سے دانت پیسنے لگتی ہے)

نقاب پوش - (دونوں ساتھ ساتھ) ——— خداوندا! . . . . میں کیا دیکھ رہی ہوں . . . . . مجھے بازاروں میں کوڑے لگائے جائیں گے . . . . آہ موت! ایسی شرمناک موت! میرے اللہ!!

شیکسپیر - خاتون! اپنی اصلیت کو ذرا اور تحقیق کر کے معلوم کرو - اس میں ہرج ہی کیا ہے؟ میں تو اپنے بارے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں خود شریف ہوں اور شریف و ایماندار والدین کی اولاد ہوں - میں نے حال ہی میں "خلعت فاخرہ" کے لئے حکومت پر اپنا حق ظاہر کیا ہے اور درخواست بھی بھیجدی ہے - قانوناً میں اس کا مستحق ہوں، وہ مجھے ملنی چاہئے اور یقیناً ملے گی - کیا تم بھی اسی فخر اور یقین کے ساتھ اپنے متعلق کچھ کہہ سکتی ہو؟

الزبتھ - (غصے سے بیتاب ہو کر) خاموش کتے! خبردار! دوسرے لفظ کے ساتھ مجھے خود اپنے شاہی ہاتھوں سے وہ کام شروع کرنا پڑے گا جسے جلاد ختم کرے گا ———!

شیکسپیر - (اطمینان کے ساتھ) تمہاری رگوں میں ایک سچے ٹیوڈر خاندان کا خون نہیں معلوم ہوتا (نقاب پوش کی طرف اشارہ کر کے) یہ گناہوں کی ناکارہ پوٹ بھی تخت شاہی کو ویسی ہی زینت دے سکتی تھی - جیسی تم - مجھے حیرت ہے کہ وہ کونسی خصوصیت ہے جو انگلستان کے تخت پر تمھیں متمکن کئے ہوئے ہے - اور وہ کون سی چیز ہے جس نے دنیائے عیسائیت کے لبوں پر مہریں لگا رکھی ہیں ——— تمھاری مشہور ذہانت، یا دانشمندی؟!

میرے خیال میں تو دونوں میں سے ایک بھی بات تم میں نہیں ہے - یہ محض ایک اتفاق ہے - جو ایک گوالن کے لئے بھی اسی طرح ممکن تھا - جس طرح تمھارے لئے - ہاں ایک خصوصیت ضرور ہے - فطرت نے تمھیں حسین بنایا ہے، اور ایک دلکش آواز عطا کی ہے - ایسی آواز جو عورت سے بلا سلطنت بھی حکومت کرا سکتی ہے! . . . .

(الزبتھ مارنے کے لئے ہاتھ بلند کرتی ہے جو یکایک کسی خیال کے ماتحت
گر جاتا ہے - شکسپیر بدستور اپنی تقریر جاری رکھتا ہے)

. . . . غالباً یہی صفت ہے جس نے تمام انسانوں کی جگہ تمھارے قدموں میں تجویز کی ہے اور تمھارا تخت تمھارے مغرور و متکبر قلب کی اس ناقابل تسخیر چٹان پر قائم کیا ہے - جو جذبات کے سمندر میں ایک سنگین جزیرے کی مانند ہے . . . . آہ!

قدرت بھی کتنی دشوار پسند ہے -؟! . . . . . . ان ناتراشیدہ مگر سیدھے سچے الفاظ میں تمھارا صحیح مرقع

بالکل فطری حالت میں میں نے پیش کر دیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب میں حاضر ہوں جو انتہائی سزا میرے لئے تجویز ہو!

الزبتھ - (شاہانہ وقار سے) ماسٹر شکسپیر! یہ تمھاری خوش قسمتی ہے کہ میں ایک رحمدل اور خدا ترس شہزادی ہوں یقین کرو کہ تمھاری عدم واقفیت اور جاہلانہ طرز گفتگو ہی مجھے بجائے سختی کرنے کے ہنسنے پر مجبور کر رہی ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ بہت سی باتیں ہیں جو بظاہر صحیح ہوتی ہیں مگر انھیں زبان پر لانا گناہ ہوتا ہے (میرا ادعا یہ نہیں کہ صرف ملکہ کے حضور میں اس کا لحاظ ضروری ہے، اس لیے کہ تم مجھے ملکہ ہونے کا تو اہل ہی نہیں سمجھتے) بلکہ ایک دوشیزہ کے وقار عصمت کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی ہر شریف آدمی کا فرض ہے کہ سوچ سمجھ کر بات کرے۔

شکسپیر - (اسی لاپروائی کے انداز سے) آپ کا دوشیزہ رہنا میرا قصور نہیں ہے، ہاں میں اسے اپنی بدقسمتی سمجھ سکتا ہوں!!

نقاب پوش - (پھر خوف سے لرز کر) رحم! ملکۂ عالم رحم!! اس کے ساتھ زیادہ گفتگو نہ کیجئے۔ اس کی زبان اسی قسم کے گستاخانہ مذاق کی عادی ہے۔ آپ نے سنا نہیں اس نے ابھی ابھی مجھے گناہوں کی ناکارہ پوٹ کہا تھا۔

الزبتھ - ہاں! تمھارے متعلق میری "سدابہار دوشیزہ" مجھے ابھی معلوم کرنا باقی ہے کہ اتنی رات گئے تمھاری وہ کونسی ضرورت تھی جس نے تمھیں خلاف قانون شکنی پر مجبور کیا اور اس ایکٹر سے تمھارے وہ کون سے تعلقات ہیں جن کی بنا پر تم نے ۔ ۔ ۔ اپنی ملکہ پر ہاتھ اٹھایا ۔ ۔ ؟

نقاب پوش - جہاں پناہ! قصوروار ہوں، میری زندگی پر رحم!

شکسپیر - (طنز سے) اسی قابل ہو!

نقاب پوش - (برہمی سے، کیوں؟ کیا دنیا میں صرف تمھاری ہی زندگی قیمتی ہے، اور محض تمھیں کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ملکۂ عالم، جان کی امان! واقعہ یہ ہے کہ میں خطاوار ہوں۔ لیکن اس وقت اس شخص سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کرنے کے لئے آئی تھی۔ آہ! ملکۂ عالم اگر آپ رنج و غم اور مسرت و انبساط کی حقیقت معلوم کرنا چاہیں تو اس شخص سے گفتگو کر دیکھیں جو کبھی انسانیت کے درجے سے بلند ہو کر فرشتہ نظر آنے لگتا ہے اور کبھی صرف الفاظ کے ردّ و بدل سے حیوان مطلق معلوم ہونے لگتا ہے ۔ کبھی فرطِ مسرت سے روح کو مخمور کر دیتا ہے اور کبھی دل توڑ کر خون کے آنسو رلوا دیتا ہے، پھر اس میں یہ قدرت بھی موجود ہے کہ دل کے انھیں ناقابل اندمال زخموں کو بات کی بات میں خوشامدانہ الفاظ اور پیاری نگاہوں کے طلسم سے اس طرح مندمل کر دیتا ہے کہ کوئی عورت اس کے

فریب سے نہیں بچ سکتی. . . . . اس کے پاس محض الفاظ ہیں، مگر یہ واقعہ ہے کہ یہ "الفاظ کا بادشاہ . . . ہے۔!

شیکسپیر۔ سب مغالطہ میں ڈالنے کی باتیں ہیں۔ (ملکہ کے سامنے دو زانو ہو کر) ملکۂ محترم میں اپنا معاملہ شاہی حضور میں پیش کرتا ہوں، مجھے تسلیم ہے کہ میری زبان میں خطرناک حد تک صاف گوئی اور ترش بیانی شامل ہے، مجھ سے شاہی آداب بھی نہیں آتے، اور مجھے شاہی حضور میں گستاخی کرنے کا اعتراف ہے۔ لیکن ملکۂ عالم انصاف کریں کہ میں خوشامد اور تعریف بیجا کرنے والوں میں تو نہیں ہوں۔

الزبتھ۔ بالکل اس کے برعکس، تعریف تو بڑی بات ہے میرے نزدیک تو تم سے زیادہ صاف گو اور ترش بیان شاید ہی دنیا میں کوئی ہو۔

(شیکسپیر اظہار تشکر کے بعد اٹھتا ہے)

نقاب پوش۔ ملکۂ عالم یہ اپنے انداز گفتگو سے اس وقت بھی آپ کو مغالطہ دے رہا ہے۔

الزبتھ۔ کیا واقعی؟

شیکسپیر۔ نہیں ملکہ، اس کا رشک اس سے یہ الفاظ کہلوا رہا ہے۔ خدا نہ کرے کہ میں اپنے ضمیر کے خلاف کوئی بات کہہ کر کسی کو دھوکا دوں۔ آپ نے ابھی کہا تھا کہ میں ایک رحم دل شہزادی ہوں لیکن یہ کہاں کی رحم دلی تھی کہ آپ نے اپنی شخصیت کو پردۂ راز میں رکھ کر حسن بے محابا کے آزاد حربوں کو میری جان ناتواں کے ساتھ کھیلنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اب حقیقی حسن کا مشاہدہ کرنے کے بعد یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں خود کو اس سیاہ چشم، سیاہ گیسو اور سیاہ پوش نازنین کی بے معنی محبت میں گرفتار رکھ سکوں جس کی ہر بات فریب ہے۔

نقاب پوش۔ (غصہ اور خجالت سے بیتاب ہو کر) ملکہ! اس نے اب سے قبل کم از کم دس مرتبہ مجھ سے اسکا اظہار کیا ہے کہ انگلستان میں ایک دن آئے گا۔ جب سیاہ چشم و سیاہ گیسو نازنینیں تمام یوروپ سے خراج تحسین وصول کریں گی۔ اور دنیا میری طرح ان کی تعریف و توصیف کے راگ گائے گی۔ (شیکسپیر کی طرف برہمی سے دیکھکر) انکار کر اگر انکار کی جرأت ہے. . . . . خدا کی پناہ ملکۂ عالم جھوٹ اور فریب اس شخص کے خمیر میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ یہ کبھی توصیف و ثنا کر کے مجھے عرش پر پہونچا دیتا ہے۔ اور کبھی اظہار حقارت سے تحت الثریٰ میں ڈال دیتا ہے۔ میں ان رات دن کے دھوکوں سے عاجز آگئی ہوں۔ اور شرم و غیرت سے زمین میں گڑ جاتی ہوں۔ جب یہ خیال کرتی ہوں کہ میں نے محبت کے لئے ایسے شخص کو پسند کیا ہے۔ جسے میرا باپ میرے جوتے تک اٹھانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ جو تمام دنیا کو

میری محبت کے فسانے سنا کر میرا راز طشت از بام کرتا ہے۔ . . . . . . جو تھیٹروں کے اسٹیج پر میرے دوشیزہ جذبات کی تشریح کر کے مجھے وہاں حجاب سے گردن جھکا دینے پر مجبور کرتا ہے . . . . . . جو اپنی نظموں اور غزلوں میں میری عریاں تصویریں کھینچ کر میرے وقارِ نسائیت کی توہین کرتا ہے ــــ ــــ اس نے مجھے پامال کر دیا ہے . . . . . . مجھے معلوم نہیں میں جہاں پناہ سے کیا کہہ رہی ہوں اور رنج و غم کی رَو میں کدھر بہی جا رہی ہوں۔ آہ! میں دنیا میں سب سے زیادہ تباہ حال اور خستہ نصیب ہوں۔!

شکسپیر۔ کیا خوب! حزن و ملال نے آخر تیری زبان سے بھی ایک شعر کہلوا دیا . . . . . . "تباہ حال"! "خستہ نصیب"! ــــ اچھوتی ترکیبیں ہیں . . . . . (لکھنے لگتا ہے)

نقاب پوش۔ ملکۂ عالم! خدا کے لئے مجھے جانے دیجئے میں اس وقت اپنی ہستی سے بھی شرم محسوس کر رہی ہوں اور . . . . . . "

الزبتھ۔ جا! (نقاب پوش نازنین اس کے ہاتھ چومنے کی کوشش کرتی ہے) اس کی ضرورت نہیں۔ جا!! (نقاب پوش چلی جاتی ہے)

الزبتھ۔ (شکسپیر سے مخاطب ہو کر) تم نے اس نادان لڑکی کو بہت ستایا، ماسٹر شکسپیر!

شکسپیر۔ میں کسی کو نہیں ستاتا، بلکہ دنیا مجھے ستانے کے لئے بنی ہے، تم نے جوپیٹر اور سمیلی کی داستان سنی ہے؟ اگر میں اس وقت ان بجلیوں کا رُخ اُدھر نہ پھیر دیتا تو خود جل جاتا!

الزبتھ۔ تمہیں اپنی شخصیت کا بہت غرور ہے، ماسٹر شکسپیر اور یہ غرور تمہاری ملکہ کو پسند نہیں ہے۔

شکسپیر۔ ملکہ! کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں بھی عام شاعروں کی طرح جھوٹے عجز و انکسار سے اپنے جائز وقار کو پامال کر دوں اور اس الہامی معجزے کو مٹی میں ملا دینے کی کوشش کروں جو تمہارے زمانۂ حکومت کا ایک "یادگار کارنامہ" ہے۔ میں خود پیشین گوئی کر چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ "کسی پرشکوہ قصرِ مرمریں یا کسی شاندار مقبرۂ شاہی کو اتنا قیام اور اتنی زندگی نصیب نہ ہو سکے گی جتنی میرے الفاظ کو، جن سے میں دنیا کو حسبِ مرضی "بہشت مسرت" اور "دوزخ آلام" بنا دینے کی قدرت رکھتا ہوں۔ اور اگر ملکہ میری ایک درخواست منظور کر لے تو پھر میری شخصیت اور اس کی اہمیت اور بھی سوا ہو جائے۔

الزبتھ۔ میں یقین کرتی ہوں کہ وہ درخواست ایسی نہ ہو گی جسے ایک کنواری ملکہ کے سامنے پیش کرنے سے اس کے وقارِ دوشیزگی کی توہین ہو۔ یہ جملہ کہنے کی اس وجہ سے ضرورت ہوئی کہ میں آپ کی صاف گوئی سے کافی چونک گئی ہوں۔ آپ یہ بھی ذہن سے فراموش نہ کریں کہ میں آپ جیسے مرتبہ کے آدمیوں کو (اگر مرتبہ کے لفظ سے

آپ کے بد بزرگوار کی کوئی توہین نہیں ہوتی ہے۔) اخلاقی حدود سے متجاوز دیکھنا پسند نہیں کرتی۔

شکسپیر۔ مطلق نہیں ملکہ عالم اب یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ میں خود کو فراموش کر کے آپ کی یا آپ کے وقار دوشیزگی کی اہانت کروں۔ حالانکہ میں بآسانی تمھیں اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتا ہوں۔ تمھارا وقار شاہی اور تمھاری معصوم دوشیزگی صرف اتنی دیر میں افسانۂ ماضی بن سکتی ہے جتنی دیر میں بجلی کی شعاع دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہونچ جاتی ہے۔ لیکن چونکہ تم قوم کی ناموس اور انگلستان کی ملکہ ہو اس لئے نہ میری ملکیت ہو سکتی ہو نہ شاہ اسپین کی نہ اور کسی فانی انسان کی۔ یہی سوچکر میں قناعت کر چکا ہوں اور آپ سے آپ کو نہیں مانگتا بلکہ کچھ زمین چاہتا ہوں!

الزبتھ۔ (تعجب سے) زمین! ——— واہ ماسٹر شکسپیر! آخر تم بھی عام درباریوں کی طرح زمین ہی کے طالب ہوئے۔ تمام دنیا ایک ہی مرض میں مبتلا ہے۔

شکسپیر۔ " دنیا ایک ہی مرض میں مبتلا ہے "۔ . . . . . کیا جملہ ہے! ——— ملکۂ عالم کی اجازت سے! (نوٹ بک نکال کر لکھنے لگتا ہے)

الزبتھ۔ (شکسپیر کے ہاتھ سے نوٹ بک جھٹک کر) تمھاری نوٹ بک نے مجھے پریشان کر دیا ہے! . . . . اسے رکھو، میں یہاں تمھیں ڈرامے لکھوانے کے لئے نہیں آئی ہوں!

شکسپیر۔ بے شک لکھواتے کے لئے نہیں بلکہ القا کرانے کے لئے اور "روح الہام" بننے کے لئے آئی ہو۔ خدا نے آپ کے ملکوتی مجسمہ کو تخلیق ہی اس وجہ سے کیا ہے۔ خیر، یہ بطور معترضہ تھا . . . . وہ زمین جو میں حکومت سے چاہتا ہوں۔ کچھ اپنی ذات کے لئے اس کا متمنی نہیں ہوں بلکہ ملکۂ عالم سے یہ گذارش ہے کہ لندن میں ایک شاندار اسٹیج تعمیر کرایا جائے، ایسا اسٹیج جو بجا طور پر انگلستان کا قومی اسٹیج کہا جا سکے۔ اور صحیح طور پر ملکۂ انگلستان کے شاہی وقار کے شایان شان ہو۔ اس اسٹیج کے ساتھ ایک اسکول چلایا جائے جس میں باقاعدہ اصولی طور پر ایک آرٹ کی حیثیت سے ڈرامائی تعلیم دی جائے اور اس کے بلند ترین نکات سے آگاہ کیا جائے۔

الزبتھ۔ تھیٹر تو اب بھی شہر میں کافی ہیں لیکن تمھاری درخواست نامنظور نہیں کی جا سکتی۔ آرٹ کی حیثیت سے ڈرامائی تعلیم میں نہیں سمجھ سکتی کہ قوم کے لئے سودمند ہوگی یا نہیں بہرحال یہ کام تمھارے مشورہ کے مطابق ہوگا ضرور۔ . . . . . . (گھڑی ایک بجاتی ہے، اور پہرے دار اپنی ڈیوٹی پر واپس آتا ہے۔) . . . . . . اچھا تو اب وقت کا تقاضہ یہ نہیں ہے۔ کہ کنواری ملکہ اتنی رات گئے۔ خوابگاہ چھوڑ کر بائیں باغ کی تنہا تاریکی میں اپنی رعیت کے شریر ترین اور لاابالی شخص سے گفتگو کرے۔ (اسٹر ہیوں

پر چڑھ کر) ہوشیار!! آج قصر شاہی کی حفاظت پر کون پہرے دار ہے؟!

پہرہ دار۔ (سلامی اتار کر) ملکۂ جہاں پناہ زندہ باد!!

الزبتھ۔ دیکھو! آئندہ اپنی ذمہ داری کا پورا احساس رکھو! تم نے آج سلطنت کے خطرناک ترین نوجوان کو شاہی خوابگاہ کے دروازے تک پہونچ جانے دیا۔ اور غافل رہے . . . . . دیکھو یہ موجود ہے (شکسپیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اب تم اسے بحفاظت تمام باہر پہونچا دو۔ اور جس وقت تم پورا اطمینان کر کے پھاٹک کو مقفل کر دو، مجھے فوراً واپس آکر اطلاع دو۔ اس لئے کہ میں خوابگاہ میں اس وقت تک اپنا لباس اتارنے سے بھی ڈرتی ہوں۔ جس وقت تک مجھے یہ یقین نہ ہو جائے کہ محل کے آہنی دروازے ہمارے اسکے درمیان حائل ہو چکے ہیں۔

شکسپیر۔ (ملکہ کے ہاتھ کو بوسہ دیکر) ملکۂ عالم! میرا جسم آہنی دروازہ سے باہر تاریکی کی سپرد ہو رہا ہے۔ مگر میرا خیال ملکہ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔

الزبتھ۔ ایں؟ . . . . کیا میری خوابگاہ میں بھی؟

شکسپیر۔ نہیں ملکۂ عالم! تمھاری دعاؤں میں اور تمھاری یادداشت کے ساتھ . . . . . مجھے اُمید ہے کہ اسٹیج کی درخواست فراموش نہ کی جائے گی۔

الزبتھ۔ مجھے خوب یاد ہے میری دعائیں بھی تمھارے عمل کی شریک ہیں۔ خدا کو فراموش نہ کرنا اچھا! شب بخیر، ماسٹر "ولیم"!!

شکسپیر۔ (جھک کر) شب بخیر! الزبتھ اعظم، خدا ملکہ کو سلامت رکھے!!

الزبتھ۔ آمین!

(دونوں چل دیتے ہیں، ملکہ اپنی خوابگاہ کی طرف، اور شکسپیر پہرہ دار کی حفاظت میں بیرونی پھاٹک کی طرف)

(برنرڈ شا)

طالب باغپتی

عہد اسلام میں کنیزوں کا اثر و اقتدار

ایک انسان کا دوسرے انسان کو غلام بنا کر رکھنا تاریخ انسانی کی نہایت قدیم یادگار ہے۔ اور اس کی ابتدا کا سراغ اس وقت سے چلتا ہے جب دو افراد انسانی میں سے ایک نے اپنے کو قوی اور دوسرے نے ضعیف محسوس کرنا شروع کیا۔ غلامی نام ہے صرف قوت کے اعتراف کا اور قوت کا محبوب ترین مشغلہ یہی ہے کہ وہ مغلوب دکمزور پر حکومت کرے۔ اس کو ستائے اور خدمت و چاکری کی صورت میں برابر اس سے اپنی قوت کا اعتراف کراتا رہے۔

اس لئے دنیا میں غلامی کی ابتدا اسی وقت سے ہوئی جب اول اول انسان میں قبائلی زندگی کا آغاز ہوا اور سرداران قبیلہ نے جنگ و مقابلہ کے بعد فتح و نصرت کا خراج انسانی خدمت کو قرار دیا۔ پھر چونکہ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ حرب و جنگ بھی ترقی کرتی رہی، اس لئے دنیا میں اسی نسبت سے غلامی کا رواج بھی وسیع ہوتا گیا۔ اول اول اسیران جنگ کو غلام نہیں بناتے تھے۔ بلکہ قتل کر ڈالتے تھے، البتہ عورتیں محفوظ رکھی جاتی تھیں۔ اور ان سے ہر طرح کی خدمت لی جاتی تھی۔ بعد کو یہ رواج اسقدر وسیع ہوا کہ زمانہ امن و صلح میں بھی لوگ غلام بنائے جانے لگے۔ اور دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں تھا جہاں یہ رسم قائم نہ ہوئی ہو۔ چنانچہ قدیم مصریوں، اہل اشوریہ، ہندوؤں، چینیوں، یہودیوں، یونانیوں اور رومیوں وغیرہ تمام اقوام مشرق و مغرب نے مستقل بازار بردہ فروشی کے قائم کئے جہاں دوسری اجناس کی طرح انسان کی خرید و فروخت بھی ہوتی تھی۔

اہل عرب عہد جاہلیت میں اسیران جنگ کو بھی غلام بناتے تھے۔ اور ان کو بھی جنھیں وہ پڑوس کی قوموں سے خریدتے تھے، چنانچہ غلاموں کے تاجر حبش وغیرہ کی طرف سے لونڈی غلاموں کی ایک جماعت ہر موسم میں عرب لے جاتے تھے۔ اور وہاں کے بازاروں میں فروخت کرتے تھے۔

قریش اس باب میں زیادہ مشہور تھے اور غلاموں کی تجارت اسیطرح کرتی تھی جیسی دوسری چیزوں کی، چنانچہ اس قبیلہ کا سردار عبداللہ بن جدعان عہد جاہلیت میں نہایت مشہور تاجر غلاموں کا مانا جاتا تھا۔ (المسعودی صفحہ ۲۸۲ جلد ۱)

وہاں غلام بطور ہدیہ کے بھی دیے جاتے تھے اور دوسری ملکیت کی طرح وراثت میں بھی منتقل ہوتے تھے۔ جب کوئی شخص غلام خریدتا تھا تو اس کی گردن میں جانور کی طرح رسی ڈال کر گھر کو لے جاتا تھا۔ (المعارف لابن قتیبہ ص ۱۱۲)

قمار بازی کے سلسلہ میں بھی بعض لوگ غلام بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک بار ابولہب اور عاصی بن ہشام نے آپس میں جوا کھیلا اور شرط یہ قرار پائی کہ جو ہارے گا وہ دوسرے کا غلام ہو جائے گا۔ چنانچہ ابولہب جیتا اور اس نے عاصی بن ہشام کو غلام بنا کر اونٹ چرانے کی خدمت اس سے لی (الاغانی ص ۱۰۰ ج ۱)

جب اسلام کا آغاز ہوا تو بردہ فروشی کا عرب میں انتہائی عروج تھا۔ اور دنیا کی تمام دوسری قوموں کی طرح یہ بھی پوری طرح اس لعنت میں مبتلا تھے۔ ظاہر ہے کہ کسی قوم کا رسم و رواج جو صدیوں سے چلا آ رہا ہے دفعتہً نہیں مٹایا جا سکتا۔ بلکہ آہستہ آہستہ رفتہ رفتہ اس میں اصلاح ہوتی ہے اس لئے اسلام فوراً اس کو بند تو نہ کر سکتا تھا، لیکن اس نے بعض اصول و قوانین ایسے پیش کئے جن پر عمل کرنے سے اس مذموم رواج کا کم ہو جانا اور غلاموں کی حالت میں اصلاح کا رونما ہونا لازم تھا چنانچہ بردہ فروشی کے دائرہ کو تنگ کرنے کے لئے اسلام نے صرف انھیں لوگوں کو غلام بنانے کی اجازت دی جو اسیران جنگ کی حیثیت سے ہاتھ آئیں اور جو نہ مسلمان ہوں، نہ جزیہ ادا کریں۔ ہر چند یہ صورت بردہ فروشی کی وسعت کو کم کرنے والی تھی۔ لیکن پھر بھی مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ ساتھ اس کو وسیع ہونا تھا۔ اور ہوئی، چنانچہ بعض جنگوں میں ایک ایک سپاہی کو سو سو غلام اور سو سو کنیزیں تقسیم ہوئیں اور امراء و سرداران کو ہزار ہزار۔ خلیفہ ثالث حضرت عثمان ہزار غلاموں کے مالک تھے۔ اور واقعہ ارکتہ کے بعد ایک ایک درہم میں لونڈی غلاموں کو فروخت کیا گیا۔ غلاموں کی کثرت کا ایک سبب عہد اسلام میں یہ بھی تھا کہ بربر وغیرہ کے بعض ذمی، جزیہ کے عوض غلاموں ہی کو پیش کرتے تھے۔

اسلام نے ایک طرف غلامی کا دائرہ تنگ کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف ان کی تعلیم و تہذیب کی ہدایت کر کے سوسائٹی میں ان کے مرتبہ کو بلند کرنا چاہا۔ چنانچہ رسول اللہ کا ارشاد ہے:-

من کانت لہا جاریۃ فعلمہا واحسن الیہا وتزوجہا
کان لہا اجران ۔۔۔۔ اجر بالزواج والتعلیم
واجر بالعتق۔

(یعنی اگر کوئی شخص اپنی کنیز کو تعلیم دے گا، اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا۔ اور شادی کرلے گا تو اس کے لئے دو اجر ہیں۔ ایک اجر نکاح و تعلیم کے عوض میں، دوسرا آزاد کرنے کے صلہ میں۔)

چنانچہ اسی تعلیم کا اثر تھا کہ غلاموں کو بلاد اسلامیہ میں وہی حقوق حاصل تھے جن سے آزاد لوگ متمتع ہوتے تھے۔ اور معاملات میں اتنی رعایت ملحوظ تھی۔ کہ ایک غلام کو بہ نسبت آزاد کے نصف سزا ملتی تھی۔

لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنے اور ان کو آزاد کر دینے کی ہدایت کرنا، اسلام کی بڑی زبردست حکمت تھی۔ اور عربوں

کے حالات و اقتضاء طبیعت کو دیکھتے ہوئے اس سے بہتر طریقہ اس رسم قبیح کے انسداد کا کوئی اور ہو ہی نہ سکتا تھا، چنانچہ تاریخ اسلام میں کثرت سے ایسے واقعات ملیں گے کہ لونڈیوں سے نکاح کرنے کے بعد ان کی اولاد نے سوسائٹی میں کتنا عظیم مرتبہ حاصل کیا اور لوگوں نے کس قدر کثرت کے ساتھ غلاموں کو آزاد کیا ــــــــ

جہاں تک اسلام کی تعلیم کا تعلق ہے، کوئی شخص یہ نہیں کہ سکتا کہ اس نے اس رسم کے دور کرنے کی پوری کوشش نہیں کی، البتہ سلطنت اسلامی نے اس ہدایت کی غایت کو نظر انداز کیا اور بردہ فروشی کا سلسلہ امارت و سیادت کی اور بہت سی ناجائز خواہشات کی طرح، بدستور قائم رہا۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ باوجود اس رسم کے قیام کے اس کی نوعیت بہت کچھ بدل گئی اور کنیز جو عہد اسلام سے قبل ایک جنس ناکارہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کی ذہنی دماغی و معاشرتی ترقی کس حد تک پہونچ گئی۔

گزشتہ بیان سے معلوم ہوا ہو گا کہ عربوں میں بعد آغاز اسلام کنیزوں کی کثرت کا سبب فتوحات کی وسعت تھی۔ کہ باوجود ہزاروں کی تعداد میں آزاد کر دینے کے بھی ایک کثیر تعداد ان کے پاس رہتی تھی۔ جب امارت و حکومت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے تمدن و معاشرت، عمران و تہذیب، جاہ و حشمت، شوکت و جلال میں ترقی ہوئی تو امراء و خلفاء کے حضور میں کنیزوں کے پیش کئے جانے کا دستور قائم ہوا، گویا کہ وہ بھی زر و جواہر کی طرح ایک چیز ہدیہ کے قابل سمجھی جاتی تھی۔ اگر معلوم ہوتا تھا کہ کس امیر کو صناعت کی طرف توجہ ہے تو اس کے سامنے صناع کنیز پیش کی جاتی تھی۔ اور اگر جمال و غنا کی طرف کوئی خلیفہ مائل ہوتا تھا تو انھیں خصوصیات کی حامل کنیز ڈھونڈھی جاتی۔ رفتہ رفتہ یہ دستور بہت وسیع و عام ہو گیا۔ اور عہد بنی عباس میں تو اس کے تمام جمالیاتی پہلو کھل کر رہ گئے ــــــ کنیزوں کے ساتھ جب خلفا عہد نکاح کر لیتے تھے تو انھیں آزاد کر دیتے تھے۔ اور پھر ان کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ متوکل کے پاس ۴۰۰۰ کنیزیں تھیں۔ (المسعودی ص ۲۷۹ ج ۲-) اور ہارون الرشید کے پاس ۲۰۰۰، جن میں سے ۳۰۰ ارباب نشاط میں شامل تھیں۔ اور گانے بجانے کی ماہر تھیں (الاغانی ص ۸۸ ج ۲) محض زینت و آرائش اور نمائش جاہ و جلال کے لئے بھی کنیزوں کو رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ زبیدہ اور ام جعفر برمکی کے پاس ہزاروں کنیزیں صرف اس لئے تھیں کہ ان سے شان و شوکت کا اظہار ہو۔

جب فتوحات کا سلسلہ محدود ہو گیا اور لڑائیاں بند ہوئیں تو کنیزوں کی فراہمی بھی کم ہونے لگی، لیکن چونکہ لوگ ان کے رکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اس لئے ایک جماعت بردہ فروشوں کی پیدا ہو گئی جو بلاد ترک و صقالبہ، ہند، آرمینیا، روم، اور افریقہ وغیرہ سے نوجوان لڑکیاں کسی نہ کسی طرح لاتے تھے اور یہاں فروخت کرتے تھے۔

اس تجارت کے لیے یہاں بڑے بڑے بازار قائم تھے جہاں کنیزوں کی خرید و فروخت نہایت کثرت سے ہوتی تھی بغداد کا بازار اس باب میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ یہ بہت کھلے ہوئے میدان میں تھا۔ اور اس کا نام "سوق الرقیق" یا "سوق النخاسین" تھا۔ اس میں متعدد مکان، دوکانیں اور احاطے تھے۔ جہاں مختلف ملکوں کی کنیزیں، عمر و رنگ،

زبان و لباس، تہذیب و علم کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ رکھی جاتی تھیں - یوں تو یہاں سرکیشیا، روم، جارجیا، صقلبیہ، ایران، ارمنیا اور حبش وغیرہ تمام اطراف ملک کی کنیزیں آتی تھیں، لیکن سب سے زیادہ قیمتی وہ کنیزیں ہوتی تھیں جو مدینہ، طائف، بصرہ، کوفہ، بغداد و مصر سے حاصل کی جاتی تھیں، کیونکہ یہ نہایت ہی شیریں کلام اور حاضر جواب ہوتی تھیں۔

اس بازار کا ایک حصہ صرف ان کنیزوں کے لئے وقف تھا جو بالکل تازہ وارد ہوتی تھیں اور غیر تربیت یافتہ حالت میں فروخت کردی جاتی تھیں۔ بالکل عریاں حالت میں لائی جاتی تھیں - اس حال میں کہ ان کے بال کھلے ہوتے تھے - اور زینت و آرایش کا کہیں نام نہ ہوتا تھا - اس سے مقصود یہ تھا کہ ان کا طبیعی حسن جو صنعت آرایش سے علیحدہ ہو، ہر شخص کو معلوم ہوسکے - بڑے بڑے تاجران کی شکل و صورت، رعنائی و دلکشی کا اندازہ کرکے مختلف داموں میں خرید لیتے تھے - اور پھر ان کے فطری ذوق کے لحاظ سے ان کو تعلیم و تہذیب سے آراستہ کرکے بہت گراں قیمت پر فروخت کرتے تھے - چنانچہ عہد اسلام کی بہت سی مشہور ماہر موسیقی، صاحب علم و فضل اور سیاست داں عورتیں انھیں کنیزوں سے تعلق رکھتی تھیں۔

اول اول جب یہ بازار میں آتی تھیں تو ان کی وحشت و خشونت کا وہی عالم ہوتا تھا جو ایک نوگرفتار ہرنی کے اضطراب کا، لیکن جب تعلیم و تربیت کے بعد، مکلف لباس سے آراستہ، اور فن دلربائی کی گھاتوں سے واقف ہوکر، ہاتھ میں رباب، زبان پر نغمۂ شیریں[ا؎]، نگاہوں میں دلربایانہ افسوں اور جسم میں حرکات رقصیہ کا لوچ لئے ہوئے نکلتیں تو طبقۂ امرا میں تہلکہ مچ جاتا - اور وہی کنیز جو چند درہموں میں خریدی گئی تھی، لاکھوں میں فروخت ہوتیں۔

اگر نفس بردہ فروشی کی کراہت سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا - کہ اہل عرب کنیزوں کے ساتھ جو سلوک کرتے تھے - وہ ان کے قوائے ذہنیہ کو تباہ کرنے والا نہ تھا بلکہ ان کو مہذب و شائستہ بنانے والا تھا - اس سلسلے میں جسقدر وحشی و ناتراشیدہ عورتیں زیور علم و فضل سے آراستہ کی گئیں - ان کا شمار مشکل ہے اور انھیں کنیزوں میں جیسی جیسی صاحب علم و فضل عورتیں ہوئیں - اور خود ان کے بطن سے جیسے جیسے خلفاء عظام، اور علماء کرام پیدا ہوئے، ان کے حالات سے تاریخ عرب کے صفحات مالامال ہیں۔

ان بازاروں میں کنیزیں علی العموم نیلام کی صورت سے فروخت کی جاتی تھیں - یعنی جب کنیزوں کے خریدار خواہ وہ امراء ہوں یا تجار جمع ہوجاتے اور بازار مختلف ممالک کی کنیزوں سے بھر جاتا تو کنیزیں فروخت کرنے والے کھڑے ہوجاتے اور نہایت بلند آواز سے اپنی کنیزوں کی تعریف ان الفاظ میں کرتے :-

---

ا؎ ان کے تعزل و غنا کا صحیح رنگ کیا تھا اس کا اندازہ اس وقت کے گیتوں سے ہو سکتا ہے - صاحب اغانی نے جابجا ان گیتوں کا ذکر کیا ہے - ان میں سے دو نہایت مشہور و محبوب وہ تھے - جنکی ابتدا ان فقروں سے ہوتی ہے "من کان لنا انا لہ" (یعنی جو ہمارا ہے ہم اسکے ہیں) "وضع الخد للھوی عز" (فرط محبت سے گال پر گال رکھ دینا کسقدر پیاری بات ہے)

یا تجار، یا ارباب الاموال، ما کل مدورۃ جوزۃ، ولا کل
مستطیلۃ موزۃ، ولا کل حمراء لحمۃ، ولا کل بیضاء شحمۃ، ولا کل
صہباء خمرۃ، ولا کل سمراء تمرۃ، یا تجار، ھذہ الدرۃ
الیتیمۃ التی لا تغنی الاموال لھا بقیمۃ بکم تفتحون
باب الثمن"

(اے تاجرو، اے دولتمندو، نہ ہر گول چیز اخروٹ ہوتی ہے نہ ہر مستطیل چیز کیلا، ہر وہ چیز جو سرخ ہے گوشت نہیں کہلاتی اور نہ ہر سپید چیز چربی، اسی طرح نہ ہر صہبا شراب ہوتی ہے اور نہ ہر زرد چیز کھجور۔ اے تاجرو، یہ ایک بے بہا موتی ہے کہ زر خطیر بھی اس کی قیمت نہیں ہو سکتا۔ پھر بتاؤ کہ تم کیا قیمت اس کی لگاتے ہو)

اس آواز پر لوگ چاروں طرف سے گھیر لیتے اور بولی شروع ہو جاتی۔ کوئی چار ہزار دینار کہتا تو کوئی پانچ ہزار، کسی طرف سے چھ ہزار کی آواز آتی اور کہیں سے ۸ ہزار کی۔ الغرض اخیر میں سب سے زیادہ قیمت لگانے والا۔ وہ دُرِ بے بہا پا جاتا اور اپنے گھر کو چلا جاتا۔

یہ بھی قاعدہ تھا کہ (قدیم اہل روما کی طرح) غلاموں اور کنیزوں کو کسی بلند جگہ پر کھڑا کر دیتے اور لوگ آ آ کر انھیں دیکھتے اور ہاتھوں سے چھوتے۔ چونکہ یہ لوگ لونڈی غلاموں کے عیوب کو بالکل اسی طرح چھپاتے تھے، جیسے گھوڑوں کے عیوب چھپائے جاتے ہیں، اس لئے خریدار کو یہ حق بھی حاصل ہوتا تھا کہ وہ ان کو بالکل عریاں حالت میں دیکھ سکے۔

اہل عرب نے مختلف ممالک کی کنیزوں کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات متعین کر کے اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر نجابت کی جستجو ہے تو فارس کی لونڈیاں لی جائیں، اگر خدمت مقصود ہے تو نوبہ کی کنیزیں تلاش کی جائیں، اسی طرح کھانا پکانے کے لئے حبش کی کنیزیں، اور بچوں کی تربیت و رضاعت کے لئے آرمینیا کی لونڈیاں مخصوص سمجھی جاتی تھیں۔ حسن ظاہری کے لحاظ سے چہرہ ترکی کا، جسم روم کا، آنکھیں حجازی، اور کمر یمن کی پسند کرتے تھے۔

حال ہی کی بات ہے کہ بردہ فروشی کے انسداد سے قبل آستانہ، دمشق، قاہرہ وغیرہ کے بازاروں میں سرکیشیا کی کنیزیں عام طور پر بالکل عریاں حالت میں فروخت کی جاتی تھیں۔ بعد کو جب ایک بین الاقوامی قانون اس تجارت کے خلاف ہر جگہ نافذ ہو گیا تو لوگوں نے خفیہ طور پر اپنے گھروں میں اس تجارت کو جاری رکھا۔

قدیم زمانہ میں بھی کوئی قوم بردہ فروشوں کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتی تھی۔ لیکن اسلام نے جس قدر اس پیشہ کی حقارت کی ہے شاید کسی نے نہیں کی۔ رسول اللہ کا ارشاد تھا کہ "التجارۃ فی الرقیق ممحقۃ" (یعنی

بردہ فروشی قوم کو تباہ کر دینے والی ہے) کتاب الولید میں بردہ فروش اور شیطان کو ایک مرتبہ میں رکھا ہے۔ اسی لئے عساکر اسلامیہ کے ساتھ ان تاجروں کے رہنے کی سخت ممانعت تھی تاکہ وہ دشمن کے بچوں کو پکڑ کر غلام نہ بنائیں اور ان کی عورتوں کو اہل لشکر کے سامنے پیش نہ کر سکیں جیسا کہ اہل روما کا دستور تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، بغداد اس تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اور جمیل ترین کنیزیں یہیں کے بازار میں آتی تھیں۔ اور نہایت گراں قیمت میں فروخت ہوتی تھیں۔ ان کنیزوں کی تعلیم و تربیت کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا تاجر اور خصوصیت کے ساتھ اس عہد کے مشہور مغنی، کسی کنیز کو اس کا ذہین قیافہ دیکھ کر خرید لیتے، پھر اس کو قرآن حفظ کراتے ادب و نحو کی تعلیم دیتے، منزلی تہذیب سکھاتے، اشعار یاد کراتے، موسیقی کا ماہر بناتے۔ اور پھر بازار میں لاکر سو کے ہزار وصول کرتے۔ خوبصورت کنیزوں کو موسیقی کی تعلیم دینے کا بہت رواج تھا۔ کیونکہ وہ کنیزیں جن میں ان دونوں کا اجتماع ہوتا بیش بہا چیز سمجھی جاتی تھیں۔ علی الخصوص مولدات (یعنی مکہ و طائف وغیرہ کی کنیزیں) کہ ان کی گرانی کی تو کوئی انتہا نہ تھی۔

ایک مرتبہ ہارون الرشید نے ایک کنیز کی قیمت ایک لاکھ دینار ادا کی (ابن خلکان ص ۱۰۶ ج ۱) اسی طرح سلیمان بن عبد الملک کے بھائی سعید نے اپنی مشہور کنیز زلفار کی قیمت ستر ہزار دینار ادا کی، (الطبری ص ۳۴۳ ج ۲)، جعفر برمکی نے ایک کنیز ۴۰ ہزار دینار میں خرید کی (العقد الفرید ص ۳۰۳ ج ۳) ہارون الرشید نے عنان خلافت ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلا حکم یہ نافذ کیا کہ فلاں کنیز ایک لاکھ دینار میں خرید کر لی جائے۔ اس کے وزیر یحییٰ بن خالد نے عذر کیا، رشید اس پر برہم ہوا تو یحییٰ نے بیت المال کی تمام چیزوں کو فروخت کر کے ۱۵ لاکھ درہم کی صورت میں اس کمرہ کے اندر رکھوا دیا۔ جہاں سے خلیفہ گزرا کرتا تھا اس ترکیب سے خلیفہ کو معلوم ہوا کہ اس نے کنیز کے خرید کرنے میں کتنا بیجا صرف کیا تھا۔

ایک بار امین نے جعفر بن ہادی کو حکم دیا کہ ایک کنیز جس کا نام بذل تھا خرید لیا جائے۔ جعفر نے انکار کیا۔ تو امین نے برہم ہو کر دوسرا حکم دیا کہ سونے کے برابر اس کو وزن کر کے قیمت ادا کی جائے۔ چنانچہ اس کی تعمیل ہوئی۔ اور ۲ کرور درہم ادا کئے گئے۔

عہد بنی امیہ و بنی عباس میں کنیزوں کا مرتبہ اسقدر بلند ہو گیا تھا۔ اور اتنا زبردست اثر انکا خلفاء پر قائم تھا کہ حکومت و سلطنت گویا انھیں کے ہاتھ میں تھی،

چنانچہ یزید بن عبدالملک کا عشق حبابہ کے ساتھ اور رشید کا ذات الخال کے ساتھ جیسی تاریخی شہرت رکھتا ہے سب پر ظاہر ہے۔ رشید کی ماں خیزران خود کنیز تھی، اسی طرح خلیفہ مقتدر کی ماں سیدۃ النفر کیہ لونڈی تھی۔ لیکن جو اثر ان کا سیاسیات وقت پر تھا وہ کسی سے مخفی نہیں۔

الغرض عہد اسلام میں کنیزوں کے اثر و نفوذ اور قوت و اقتدار کا یہ عالم تھا۔ کہ ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ خلفاء کی لونڈیاں تھیں درست نہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ خود خلفاء اُن کے غلام تھے ـــــــ

نیاز

"جب" کی ترقیاں "اب" کے مقابلہ میں

یعنی

مشرق قدیم اور مغرب جدید کی ذہانت کا فرق

(۱)

سنہ ۱۹۲۵ء ہے اور فروری کا مہینہ منطقہ شمالی کے ایک بندرگاہ پر کچھ لوگ جمع ہیں۔ ساکت پانی پر سفید سفید برف تیرتی پھر رہی ہے۔ اور جہازوں کے مستول ہلکے ہلکے نیلگوں آسمان کے "پس منظر" پر تصویر کی طرح دلکش نظر آرہے ہیں۔ تمام بازار، شہر کے عقب کی پہاڑیاں، برف سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ اور . . . . تمام بے برگ و بار درختوں پر یہ سفید گالے اس طرح نظر آتے ہیں۔ گویا کسی بوڑھے آدمی کے سفید بکھرے ہوئے سر کے بال ہیں۔

جب آفتاب کے طلائی طشت پر آہستہ آہستہ ایک سیاہ پردہ پڑنے لگا۔ اور روشنی رفتہ رفتہ کم ہوئی۔ تو برف کی درخشانی بھی خود بخود ماند پڑ گئی۔ اس کے بعد کسوف مکمل یا "سرب گرہن" ہو گیا۔ اس وقت سورج کی کرنیں اوس سیاہ پردہ کے اطراف سے اس طرح نکلنے لگیں۔ جیسے اس کے حاشیہ میں درخشاں لعل جڑ دیے ہوں۔ داہنی طرف کسی قدر فاصلہ پر تاریک آسمان میں عطارد، زہرہ، مشتری وغیرہ درخشاں ساروں کا ایک جھرمٹ جھلملا رہا تھا۔ اور نظام شمسی کے گویا تمام مخفی خزائن دفعتاً ظاہر ہو گئے تھے۔

سورج گرہن تو ہوا لیکن اس سے زیادہ تاریکی نہ ہوئی جیسی شام کو دھندلکے کے وقت ہوا کرتی ہے۔ تمام بازار اور مکانوں کی چھتیں آدمیوں سے بھری پڑی تھیں۔ ان میں بہت سے وحشی تھے جو بچوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اور بظاہر ہر شخص مرعوب نظر آتا تھا۔ قمریوں اور فاختاؤں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں ادھر ادھر اڑتی پھرتی تھیں۔ خوفزدہ ہو کر نہیں بلکہ غالباً دنیا کی اس غیر معمولی حالت پر متحیر ہو کر گھبرا رہی تھیں۔

اس کے بعد وہ سیاہ پردہ آفتاب سے رفتہ رفتہ اٹھا۔ اور وہ سنہری شعاعیں جو پردہ کے اطراف سے تیروں کی

طرح نکل رہی تھیں پھر ترکش میں آگئیں - نور آفتاب چاروں طرف پھیل گیا - آسمان روشن ہوگیا - سیارے جو کچھ دیر پہلے جگمگا رہے تھے - نظروں سے غائب ہوگئے، اور برف پوش دنیا پھر سورج کی روشنی میں جگمگا اٹھی -

لیکن قلب انسان پر اس منظر کے جو تاثرات پیدا ہوئے تھے باقی رہ گئے - ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر حیران تھا - اور اپنے روز کے فرائض کو قریب قریب ہر شخص بھول گیا تھا - آفتاب اور سیاروں کے پرشوکت منظر نے ان کے قلب منور کر دیے تھے - اور اب سب سے پہلے انھوں نے سوچا کہ وہ صرف اسی بند رگاہ یا اسی دنیا کے باشندے نہیں، بلکہ وہ کائنات کے باشندے ہیں - اور اس خیال سے ان کے دلوں پر ایک قسم کا رعب سا چھا گیا -

یہ علم کہ ہم صرف اسی کرۂ ارض کے باشندے نہیں - بلکہ ایک وسیع کائنات کے باشندے ہیں - علم انسانی کا جائز ورثہ ہے - جہاں تک ہمارا خیال ہے دنیا کے تمام جانداروں میں صرف انسان ہی کو یہ درثہ ملا ہے - بہت سے جانور صرف نور آفتاب سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور یہی ان کی تمنا کی انتہا ہے - آشیانہ بدوش فصلی جانور مختلف موسموں کے لحاظ سے گردش آفتاب کے ساتھ ساتھ ہجرت کرتے رہتے ہیں - اور اس سے زیادہ سعی و کاوش ان کے بس کی بات نہیں - ابھی صبح کا ستارہ اپنی منزلیں طے کرتا ہی ہوتا ہے کہ چنڈول اور آگن - شاما اور آلال اپنے دلکش نغمے چھیڑ دیتے ہیں، اور یہی ان کے لیے کافی ہے، جانور ان صحرائی جو رات کو شکار کی تلاش میں نکلتے ہیں - صبح ہوتے ہی اپنی پناہگاہوں کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں - لیکن انسان کے سوا . . . ان جانوروں میں کوئی ایسا نہیں ہے - جو دنیائے ارضی کے علاوہ بیرونی وسعتوں پر بھی نظر ڈالتا ہو - اس لئے طیور و وحوش تو یقیناً اسی دنیا کے باشندے ہیں - لیکن انسان وہ مخلوق ہے - جس کو اپنا وطن بجائے کرۂ ارض کے "کائنات" کو بنانا چاہیئے -

پھر جو حال وسعت مکانی کا ہے وہی حال وسعت زمانی کا بھی ہونا چاہیئے - انسان جس طرح آگے دیکھتا ہے، اسی طرح وہ اپنے . . . . . ماضی کو بھی دیکھتا ہے - لیکن دیگر ذوی الارواح (اگرچہ ان میں سے بعض کی عقل حیوانی آیندہ کے لئے خوراک کا اندوختہ رکھنے پر مجبور کرتی ہے) دراصل تمام عمر اپنے "حال" ہی میں زندگی بسر کرتے ہیں - ایک طائر کی تمام قوت شعور کا اظہار صرف اس کے وقتی چہچہوں تک محدود ہے، جو جانور ابھی ابھی موت کے منہ سے نکلتا ہے وہ چند منٹ کے بعد پھر مطمئن اور مسرور ہو جاتا ہے - نہ اس کا دل دھڑکتا ہے - نہ اس کا دماغ کچھ سوچتا ہے - لیکن انسان اپنے ماضی و مستقبل پر غور کرتا رہتا ہے - خواہ اس سے اس کو کسی قسم کی مسرت و دانش حاصل ہو یا نہ ہو -

اگر ہم آج (یعنی حال) کا مقابلہ چند روز یا سال یا صدیوں (مثلاً پانچ چھ صدی) پیشتر کے زمانہ سے کریں تو ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ مکان و زمان کے متعلق ہمارے خیالات بہتر بلکہ نہایت حد تک وسیع ہوگئے ہیں -

زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ مغربی مفکرین کے نزدیک زمانہ کی ابتدا صرف چار ہزار اور چار سال قبل از مسیح ہوئی تھی لیکن جب ایک عجائب خانہ میں ایک مصری بت دیکھا گیا جس پر ۴۵۰۰ قبل مسیح درج تھا تو لوگ حیران رہ گئے، کیونکہ جب زمانہ

کی ابتدا صرف چار ہزار چار سال قبل مسیح ہوئی تو یہ ڈیڑھ سو برس کا اور زاید زمانہ کہاں سے آگیا۔ اسی طرح زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ لوگوں نے "وسعت مکانی" کو بھی نہایت مختصر کر دیا تھا۔ بڑے بڑے مفکرین میں سے ڈانٹے (Dante) ہی کو لیجئے کہ جو دنیا اس نے بیان کی ہے وہ کسقدر مختصر ہے۔ گو اسکی متعین کی ہوئی کائنات میں کرۂ ارض کو کس قدر نمایاں اور مرکزی حیثیت ضرور حاصل ہے۔ لیکن اس کے چاروں طرف وہ فضا کا ایک تنگ حلقہ بناتا ہے۔ جس میں شمس و قمر اور دیگر چھوٹے چھوٹے سیارے تیزی سے گردش کرتے ہیں۔ اور یہ سب ہماری مرکزی دنیا کے تابع ہیں۔ اس مرکز ارضی والی چھوٹی سی کائنات کی تکوین کا زمانہ صرف چھ ہزار برس خیال کیا گیا تھا۔ گویا اس سے پیشتر زمانہ تھا ہی نہیں۔ اور جس کے فنا ہونے کے بعد بھی زمانہ نہیں رہے گا۔ مگر اب وہ زمانہ ہے کہ ہم اپنی دنیا کی عمر کم از کم ایک کروڑ برس سے کم خیال نہیں کرتے۔ اور اسی تناسب سے ہم اس کائنات کی عمر بھی شمار کرتے ہیں۔ جس میں تمام ثوابت و سیارگان منتشر ہیں گویا ہمارے خیالات جو عرصۂ دراز سے گھٹے ہوئے سے تھے۔ اب آزاد ہو گئے ہیں۔ اور کائنات کی شاندار وسعتوں کا راز فاش ہو گیا ہے۔

بایں ہمہ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ زمانۂ حال میں جو اسرار کائنات ہم کو معلوم ہوئے ہیں وہ ہمارا ہی حصہ تھے۔ کیونکہ اب سے بیشتر جب اسقف اعظم تو شر ——————— قدیم عبرانیوں کی روایات پر اعتماد کر کے یہ نتیجہ نکال رہا تھا۔ کہ تخلیق کائنات صرف چار ہزار چار سال قبل مسیح ہوئی تھی، اس وقت مشرق کی قدیم قومیں اُس اسقف اعظم سے زیادہ وسیع الخیال نظر آتی تھیں۔ چنانچہ جب حکیم سولن ملک مصر میں گیا۔ اور وہاں اس نے مندروں کی سیر کی تو اسے بتایا گیا کہ ملک یونان کی تاریخ صرف ایک ہزار سال سے نہیں بلکہ دس ہزار سال سے شروع ہوتی ہے۔ مگر یونانی اپنی تاریخ کو بھول گئے ہیں۔

جو حال زمانہ کا تھا وہی حال، مرکز ارضی والی دنیا کا تھا۔ ڈانٹے نے بطلیموس کا اتباع کیا جس نے دوسری صدی عیسوی میں نظام شمسی کا گھروندا بنا کر کھڑا کیا۔ مگر بطلیموس سے بھی بہت پہلے حکیم فیثا غورث اور اس کے تلامذہ دنیا کو یہ سکھا چکے تھے کہ کرۂ ارض آزاد طور پر اپنے فلک پر معلق گردش کرتا ہے اور اس ... کا مرکز بہت دور ہے۔ ان لوگوں نے دنیا کو یہ بھی بتایا تھا کہ آفتاب بھی فضا میں حرکت کرتا ہے۔ کاپرنیکس اور گلیلیو ہی جدید نظام شمسی کے قائم کرنے والے تھے بلکہ ان سے پیشتر ساسیان اعظم حرکت شمسی کا راز دنیا کو بتا چکا تھا۔

ایام بلیکس نے بیان کیا ہے کہ فیثا غورث نے بھی ملک مصر میں علم حاصل کیا تھا۔ جہاں وہ مندروں کی تنہائیوں میں بیس برس تک فلکیات اور جیومیٹری کا مطالعہ کرتا رہا تھا، اور انہی مندروں میں گوشہ نشین ہو کر وہ اسرار ربانی سے آگاہ ہوا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ جب کمبی سوس کی فوج فیثا غورث کو گرفتار کر کے بابل لے گئی تو وہاں اس نے نہایت خوشی سے مجوسیوں کے علوم و فنون کا مطالعہ کیا۔ اور وہیں اس نے بارہ برس رہ کر علوم ہندسہ اور موسیقی پر عبور حاصل کیا۔ وہ مجوسیوں کے مقدس علوم دینی میں بھی کامل ہو گیا۔ اس طرح وہ حکیم فیثا غورث جس نے مغربی دنیا کے لئے اصطلاح "فلسفہ"

وضع کی قدما کا رہین منت تھا۔ اور ابھی حال میں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مشہور بابلی نجومی کدینو استقبال فلکی، اور اعتدال ربیعی کے راز سے بھی واقف تھا۔ اب تک اس راز کا جاننے والا ہپارکس کو سمجھا جاتا تھا۔ لیکن درحقیقت یہ راز پہلے ہی کھل چکا تھا۔

(۲)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ ماضی کی وسعت خیال کو رفتہ رفتہ کس قدر زوال ہو گیا تھا۔ متاخرین کی تنگ خیالی سے قدما کی وسیع کائنات سکڑ کر کتنی مختصر رہ گئی تھی، اور دنیا کی چھ ہزار سال کی عمر کا خیال ذہن انسانی پر کس قدر حاوی ہو گیا تھا۔

اب سے ڈیڑھ سو برس قبل جب انگلستان کے مفکرین سنسکرت کے علوم و فنون کا مطالعہ کرنے ہندوستان پہونچے تو ان کے ذہن بھی اسقف اعظم ائوشر کی گرفت میں جکڑے ہوئے تھے۔ جہاں تک وسعت زمانہ کا تعلق ہے۔ سر ولیم جونس، چارلس ولکنس اور اُن کے قابل رفقاء کے دماغ میں بھی وہی اسقفی تقویم موجود تھی۔ یعنی سب یقین رکھتے تھے کہ کائنات کی ابتداء، چار ہزار چار سال قبل مسیح ہوئی ہے۔ پھر چونکہ اس وقت تک مصری ہیروغلیفی، مصری تقویم اور ان طویل صدیوں کا راز جو بابل و نینوا کی الواح پر خط میخی میں درج ہیں۔ دنیا کو معلوم نہ ہوا تھا۔ اس لئے انگریز محققین جس وقت ہندوستان میں آئے تو انھوں نے ہندوستان کی تقویم مہ و سال کو اسی "شش ہزاری گز" سے ناپنا شروع کیا۔ جو اسقف اعظم نے مقرر کر دیا تھا۔ اور جس میں طوفان نوح کا وقت ۲۳۴۹ سال قبل مسیح رکھا گیا تھا۔ حتےٰ کہ میکس میولر جیسے فاضل نے بھی اسی کا تتبع کیا۔ اور آج بھی جو کتابیں ہندوستان کے متعلق لکھی جاتی ہیں۔ ان میں اسی اسقفی تعلیم کا تتبع کیا جاتا ہے۔ اور ان میں ظاہر کیا جاتا ہے کہ آریا لوگ ہندوستان میں "اندازاً اڑھائی ہزار مسیح سے پیشتر" داخل ہوئے تھے۔ حالانکہ جس طرح اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ نوح کا طوفان ۲۲۴۹ سال مسیح سے پیشتر آیا تھا۔ اسی طرح اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں۔ کہ آریا لوگ ہندوستان میں ۲۵۰۰ سال مسیح سے قبل داخل ہوئے تھے۔

جب اہل مغرب نے ہندوستان میں آکر اپنا کام شروع کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ ہندوستان میں ایک ایسا سنہ جاری ہے۔ جو پانچ ہزار سال کے قریب پہونچ گیا ہے۔ اور جس کی ابتدا مسیح سے ۳۱۰۱ سال قبل ہوئی تھی۔ (اس سنہ کا نام کلجگ تھا۔ از روئے روایات ہند یہ سنہ جنگ مہابھارت کے بعد شروع ہوا تھا۔) یہ دیکھتے ہی انھوں نے حکم لگا دیا کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اور ان لوگوں نے تقویم ہند کی "تصحیح" کا فرض انجام دینا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہندوستان کی ہزارہا سال کی تقویم کو مختصر کر کے صدیوں میں تبدیل کر دیا۔ اگر ان لوگوں کو مصر و بابل کی قدیم تاریخ کا کچھ بھی حال معلوم ہوتا تو غالباً وہ زیادہ احتیاط سے کام لیتے اور اسقدر بیدردی سے ہندوستانی عہد تاریخ کو مختصر نہ کر دیتے۔ ابھی چند روز کی بات ہے کہ شہر اُور کلدانی میں پُرانی قبروں برآمد ہوئی تھیں جن کی نسبت یہ رائے قائم کی گئی۔ کہ وہ ولادت مسیح سے ۲۱۰۰ برس پہلے کی ہیں۔ اور ان قبروں کے نیچے سیکڑوں برس پُرانی ایک اور تہ ہے اس وقت کسی نے نہ کہا کہ یہ ناممکن ہے کیونکہ اسطرح

یہ طوفان نوح سے پہلے کی قبریں ثابت ہوتی ہیں۔

دانشمندان ہند تاریخ ماضی کو چند صدی نہیں بلکہ ہزارہا سال پیشتر سے دیکھتے تھے۔ اور انھوں نے نہایت غور و خوض سے کام لے کر آفرینش انسان بلکہ آفرینش کائنات کی مدت کا بھی تعین کر لیا تھا جسے وہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں سال کے پیمانہ سے ناپتے تھے۔ ان کے نزدیک کائنات زمان و مکان کے اعتبار سے غیر محدود تھی۔

اسقدر وسیع حساب کے لئے قدماء ہند کے پاس ایک خاص طریقہ تھا جسے اہل مغرب نے ان سے حال ہی میں حاصل کیا ہے۔ یوروپ میں پہلے... رومی ہندسے رائج تھے جن کے بجائے اب "عربی ہندسے" جاری ہوئے ہیں۔ درحقیقت یہ ہندسے "عربی" نہیں بلکہ "ہندی" ہیں۔ اور انھیں پالی یا سنسکرت زبانوں کے حروف ابتدائی سے اخذ کیا گیا تھا۔ ان قدیم آریوں کی وسعت خیال کا اندازہ اس بات سے ہوسکے گا۔ کہ بدھ مت والوں کی مقدس کتاب "ابھیدھما" میں پہلے بڑے عدد کو "لاکشا" لکھا گیا ہے جس سے جدید ہندوستانی لفظ "لاکھ" نکلا ہے۔ اس کے بعد دوسرے عدد کو "کوٹی" لکھا ہے جو اس زمانہ کا "کرور" ہے "کوٹی" سے اوپر جس قدر اعداد آتے ہیں، وہ سابقہ عدد سے ایک کرور گنا بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ گویا وہ کرور کے عدد کے مربع...... وغیرہ ہیں۔ ایک کروڑ کے بیسویں درجہ تک جتنے اعداد آتے ہیں ان سب کے لئے علیحدہ علیحدہ نام رکھے گئے ہیں۔ آخری عدد وہ ہیں جس میں ایک سو چالیس صفر آتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے ماہرین فلکیات نے جو زبردست فاصلے ستاروں اور سیاروں وغیرہ کے متعلق معلوم کئے ہیں وہ قدیم سنسکرت کے ہندسوں میں بآسانی درج کئے جاسکتے ہیں۔ ہم دس کرور نوری سال کو جس سے فی الحال کائنات کی وسعت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ قدیم ہندوستانی ہندسوں میں بہ آسانی ظاہر کرسکتے ہیں۔ اور پھر بھی ہندوستان کے بہت سے اعداد بیکار رہ جائیں گے۔

آریا قوم کے ریاضی دانوں کے لئے یہ بڑے بڑے اعداد کوئی تفریحی مشغلہ نہیں تھے۔ بلکہ مکان و زمان کی نسبت جو ان لوگوں کا خیال تھا۔ یہ اس کی پیمایش کے گز تھے۔ مثلاً پیدایش انسان کے لئے انھوں نے اسقدر وسیع زمانہ مقرر کیا تھا کہ اب سے دس بیس سال پیشتر مغرب کے سائنسدان اس کو اسی طرح غلط کہہ بیٹھتے جس طرح پرانے سنسکرت دان مستشرقین نے خاتمہ جنگ مہا بھارت کی بالکل معقول تاریخ (سنہ ۳۱۰۱ء قبل مسیح) کو غلط قرار دیدیا تھا۔

مگر اب مغربی ماہرین حیاتیات کسی قدر دلیر ہوتے جاتے ہیں۔ تقریباً پندرہ سال گذرے کہ سر آرتھر کیتھ نے قدامت بشر پر اپنی نفیس کتاب ان الفاظ پر ختم کی کہ انھیں کوئی وجہ ایسی نظر نہیں آتی جن کی بنا پر انسان کا وجود دنیا میں چالیس پچاس لاکھ سال پیشتر نہ مانا جائے۔ اور ابھی دو تین سال گذرے ہیں کہ ہنری فیرفیلڈ اوسبرن نے آفرینش انسان کی تاریخ ایک کروڑ ساٹھ سال معین کی ہے۔

کوئی چالیس پچاس سال پیشتر ہندوستان میں برہمنوں کا لگایا ہوا حساب شایع ہوا تھا جس میں موجودہ عالم انسانی کی تخلیق ایک کروڑ اسی لاکھ برس بتائی گئی تھی

علم طبقات الارض کے ماہرین نے زمانہ کی پہلی چار بڑی تقسیمیں کی ہیں - اور پھر ان کو چار چار تحتی تقسیموں میں منقسم کیا ہے جس سے کائنات کی آفرینش کروڑوں سال سے زیادہ قرار پائی ہے -

لیکن غالباً یہ امر حیرت سے سنا جائے گا کہ قدیم ہندوستان میں بھی اسی سے ملتا جلتا ایک نظام قائم تھا جو "کلپوں" اور "جگوں" پر مشتمل تھا - اور پھر ان کی بھی چار چار میں تقسیم کی گئی تھی - مثلاً ایک "جگ" کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا - اور یہ چاروں حصے مل کر ۴۳ لاکھ ۲۰ ہزار سال کی مدت ہوتے ہیں - جسے ایک "مہا جگ" کہا جاتا ہے - لیکن یہ تو گویا زمانہ کی ابتدا ہے کیونکہ ایسے ایسے دو ہزار مہا جگوں سے مل کر ایک "کلپ" بنتا ہے - جو گویا ۸ ارب ۶۴ کروڑ سال کا ہوتا ہے - لیکن یہ وسیع زمانہ بھی برہما کا ایک دن اور ایک رات ہے - اور برہما کی عمر ایسے ایسے دنوں اور راتوں کے سو سال کے برابر ہوتی ہے -

یہ کہنا دشوار ہے کہ آریوں کے ان زمانوں کی بنیاد طبقات الارض پر قائم ہے یا جوتش پر لیکن قیاس غالب یہ ہے کہ ان کی بنیاد طبقات الارض پر رکھی گئی ہے - قدیم آریوں نے اوتاروں (یعنی مدارج ارتقا) کا ایک سلسلہ قائم کیا تھا ان کے یہاں ایک اوتار "مچھ اوتار" (مچھلی) دوسرا اوتار "کشیپ اوتار" (کچھوا) نرسنگھ اوتار (آدمی اور شیر) وغیرہ ہیں - اس کے بعد آدمی کی صورت میں اوتار ہوئے - اس سلسلہ سے ... ظاہر ہوتا ہے کہ ذوی الحیات نے کس طرح مدارج ارتقا طے کئے - اوّل مچھلی ہے - پھر پانی کے دوسرے جانور ہیں، پھر جانوران شیر دار ہیں پھر انسان ہے -

(۳)

مغرب میں کائنات کی وسعت اور زمانہ کا خیال تیس تیس سال قبل لکوریل اور میڈم کیوری کے اکتشافات سے شروع ہوتا ہے - جب ریڈیو کی سرگرمی کے واقعات مسلم ہو گئے تو ماہرین طبقات الارض کو معلوم ہوا - کہ کائنات کی عمر کا حساب ان واقعات سے لگانا بہت ممکن ہے - اس طرح وہ ماہرین طبقات الارض جو ریڈیو کے اعمال کے قائل ہیں کہتے ہیں کہ زمین کے بعض طبقات کی عمر دس ارب بلکہ سولہ ارب سال تک ہو سکتی ہے - اور یہ وہ عہد و قرون ہیں جو قدیم آریہ لوگوں کے "جگوں" اور "کلپوں" کے مطابق ہوتے ہیں - ریڈیو کے ایک اور ماہر فریڈرک ساڈی نے یہ بیان کیا ہے کہ ریڈیو کی گرمی کسی دن حرارت سے تمام زمین کو پگھلا دیگی - اور وہ منور گیس کا گولہ بن جائے گی ہوسیوجولی کا خیال ہے کہ ایسا بارہا ہو چکا ہے - اور کوئی وجہ نہیں کہ اس کا پھر اعادہ نہ ہو - ایک ایسی دنیا کے اندر حرارتی طاقتوں کا جمع ہو جاتا جس میں ایسے حدوث پذیر عناصر موجود ہیں - یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ کسی دن ضرور وہ پھر مشتعل ہو کر منور حالت میں آجائے گی اور تغیر و تبدل کا یہ دور اس وقت تک جاری رہے گا - جب تک عناصر مذکورہ بالکل فنا نہ ہو جائیں - لیکن ابھی یہ "قیامت" اربوں بلکہ پدموں برس دور ہے - ساڈی کا قول ہے کہ زمانہ تکوین میں عہد طبقاتی اور عہد تنویری اسی طرح یکے بعد دیگرے آتے ہیں - جیسے رات کے بعد دن آتا ہے - کیا یہ خیال وہی نہیں جو قدیم آریوں نے برہما کے شب و روز کے

متعلق ظاہر کیا تھا؟

وقتِ قیامت کی تصویر بھی قدیم و جدید سائنس میں یکساں ہے۔ مثلاً بُدھ مت کی کتاب "شودھی مارگ" میں لکھا ہے کہ جب آگ کے ذریعہ سے دنیا کی عمر تمام ہوتی ہے تو یہ بالکل نیست و نابود ہو کر آسمان میں غائب ہو جاتے ہیں۔ اور یہ آگ اس وقت تک نہیں بجھتی جب تک دنیا میں ایک سب چیز بھی باقی رہتی ہے۔ لیکن جب سب چیزیں فنا ہو جاتی ہیں تو یہ آگ راکھ یا خاک چھوڑے بغیر اسی طرح فرو ہو جاتی ہے۔ جیسے تیل کی آگ۔ بعد فضائے بسیط کے علوی و سفلی طبقات ایک ہو جاتے ہیں، اور کامل تاریکی چھا جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ چیز جسے "دنیا" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر منجمد ہونا شروع ہوتی ہے۔ اوّل اوّل ایک ابر سا چھا جاتا ہے۔ جو کچھ عرصہ بعد نہایت باریک تہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ پھر یہ تہ پھیل کے پانی بنجاتی ہے۔ اس کے بعد ایک ہوا چلتی ہے۔ جو پانی کو ایک تختہ بنا دیتی ہے۔ جو قطرۂ آب کی طرح گول بنجاتا ہے۔ بعد ازاں یہ گول اور آبی چیز منجمد ہونا شروع ہوتی ہے۔ اور دنیا ہمیشہ اسی تکوینی چکر میں رہتی ہے۔

بدھ مت کی مذہبی کتاب میں خود بدھ کا ایک قول ہے۔ جس میں ایک جگہ "دس کھرب دنیائیں" لکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ قدیم آریاؤں نے یہ اعداد و شمار کہاں سے حاصل کئے؟ کیا تاروں بھری رات میں آسمان کی طرف دیکھ کر؟ مگر فلکیات کے متعلق جو اس زمانہ کی کتابیں ہیں ان سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ رات...... صاف ہو تو انسان کو صرف پانچہزار کے قریب تارے نظر آسکتے ہیں۔ ممکن ہے مصر و عرب کے ریگستان میں آسمانوں کا قدیم مشاہدہ کرنے والے اس سے دُگنی تعداد ستاروں کی دیکھ سکتے ہوں۔

لیکن دس ہزار اور دس کھرب میں تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پھر ان قدیم مشاہدہ کرنے والوں کو کیونکر معلوم ہوا کہ آسمان میں منور بادل کا جو ایک بند (کہکشاں) نظر آتا ہے وہ دنیاؤں سے بنا ہوا ہے؟ ہم نے جو کچھ معلوم کیا وہ بڑی بڑی دوربینوں کے ذریعہ سے معلوم کیا۔ مگر ہم سے دو ہزار برس پیشتر قدیم آریاؤں کو ان آنکھوں سے کیونکر معلوم ہو گیا تھا؟ مہابھارت میں لکھا ہے کہ:-

"اگرچہ فاصلہ کی وجہ سے ستارے ہم کو چھوٹے نظر آتے ہیں۔ مگر در حقیقت وہ بہت بڑے ہیں"

اس سے ناظرین کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ مکان و زمان کے متعلق ہم کو اس وقت جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ نئی بات نہیں بلکہ بہت پرانی بات ہے۔ مرکزِ ارضی والی شش ہزار سالہ دنیا گویا پرانی وسعتِ خیال کا ایک زمانۂ انحطاط تھا۔ جو ختم ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس سکڑی ہوئی دنیا کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ لیکن زمانہ کی وسعت کے متعلق اہلِ مغرب بہت عرصہ تک غلطی میں مبتلا رہے۔ اور اب ڈیڑھ سو برس کے بعد ان کے خیال کی رسائی اس حد تک پہونچی ہے۔ جہاں ہزار ہا سال پیشتر قدیم آریوں کے خیالات پہونچ چکے تھے یعنی ۱۹۲۷ء میں ماہرین حیاتیات کو یہ توفیق نصیب ہوئی کہ

وہ قدامت انسان کی مدت کا تعین اسقدر کر سکیں جو ہزارہا سال پیشتر برہمن لوگ کر چکے تھے۔

(۴)

پھر جب اہل مغرب ... ہزارہا سال پیشتر آریا مفکرین وہ باتیں معلوم کر چکے تھے جو اب سے ڈیڑھ سو سال قبل اہل مغرب کے نزدیک ناقابل قبول تھیں، تو کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کی کتب قدیمہ میں فرہنگ و دانش کے اور بہت سے خزانے بھرے ہوں۔ اور وہ ایسی باتیں ہوں جہاں ہماری فکر کی رسائی ابھی نہ ہوئی ہو۔

کم از کم ایک مسئلہ تو ان کے یہاں کا ضرور ایسا ہے۔ جو اس سلسلہ میں قابل غور ہے اور وہ (Continuity of Consciousness) تسلسل شعور کا ہے مغربی ماہرین طبقات الارض و حیاتیات کے سامنے ہمیشہ یہ پیچیدہ مسئلہ رہتا ہے کہ ہمارے کرۂ ارض پر زندگی کی ابتدا کب سے ہوئی۔ ایک شخص نے تو پریشان ہو کر یہاں تک کہدیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذوی الارواح کے جراثیم کسی شہاب ثاقب پر چمٹے ہوئے دنیا پر آگرے ہونگے۔ مگر قدیم آریاؤں نے اس مسئلہ کا نہایت نفاست سے حل کر دیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ زندگی کی کوئی ابتدا ہی نہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگی۔ مادہ جو مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے۔ اور جن سے زندگی کے وجود کا اظہار ہوتا ہے۔ ان صورتوں کی بیشک ابتدا و انتہا ہوتی ہے یہی حال شعور کا ہے۔ شعور بحالت مستور، جو ابھی تک ہمارے فہم و ادراک سے باہر ہے، ہمیشہ سے ہے۔ اس کی وسعت بھی لانہایت ہے۔ بس "جیو" جو "خون یا چولے" بدلتا ہے انھیں کی ابتدا و انتہا ہوتی ہے۔ قدیم آریاؤں کے مطابق اسی طریقے سے ہماری نجات ہوتی ہے اور اسی طریقہ سے ہم کو بقا حاصل ہوتی ہے۔ ہم کو اپنی فطرت بتدریج، شعور ابتدائی کے مطابق کرنا چاہیئے۔ اور اسی شعور ابتدائی کے اندر ابدیت، دانش و فرہنگ اور خوشی و مسرت شامل ہیں۔

اس طرح گویا نیکی جس چیز کو کہتے ہیں وہ دانش کی ایک وضع یا صورت ہے۔ اور اس کے معنی ہیں عقلمندی سے اپنے اعمال و خیالات کو "حقیقت الحقائق" (Real of Reals) سے مطابق کرنا۔ یہ اپنشد کی تعلیم ہے۔

شعور کے اس وسیع تصور کی بعض مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمارا ذاتی شعور یعنی ہمارے موجودہ اجسام کا شعور ازلی و ابدی نہیں ہے۔ بلکہ وہ عظیم شعور ازلی لافانی ہے۔ وہ بحر بے پایاں جس میں سے ہم نے اپنی زندگی کا قطرہ حاصل کیا۔ اور جس میں جا کر ہماری زندگی کا دریا پھر شامل ہو جائے گا۔ وہیں سے ہم آئے تھے۔ اور وہیں ہم جا پہونچیں گے۔ بایں‌ہمہ ہمارے ذاتی شعور میں بھی ازلیت و ابدیت کا ایک تخم موجود ہے۔ اور یہی وہ جوہر ہے۔ جو ہمارے فہم و ادراک کو اکسا کر "عہد طبقاتی"، کی وسیع گہرائیوں کی تھاہ لگانے اور مستقبل کے راز معلوم کرنے بھیجتا ہے۔ ایک مادہ پرست ماہر طبقات کے نزدیک ہماری زندگی اور ہمارے شعور کی ابتدا جوہر حیات کے ایک باریک ذرہ میں ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کاربن آکسیجن، اور نائٹروجن کے ایک ذرہ میں ازلیت و ابدیت کا فوری احساس کہاں سے آیا؟ تا وقتیکہ اس میں شعور کا مادہ بھی نہ ہو۔ یعنی شعور ابتدائی یا ازلی کا ایک ننھا سا شعلہ۔ یہی وہ ازلیت و

ابدیت شعور کی ہے۔ جو ہم سے ماضی کی وسیع تاریکیوں کی پیمائش کراتی ہے۔ ورنہ وہ کون سی چیز ہے جو ہم کو ماضی کا یقین دلا سکتی ہے۔ ایک ماہر طبقات الارض سمندر کے کنارہ کسی پہاڑی پر کھڑا ہوا اس کے مختلف طبقات کو "آج" دیکھ رہا ہے مگر اس کے اندر جو عقل خداداد ہے وہ اس "اب" کے معنی ہزاروں لاکھوں سال بتاتی ہے جس میں قرنہا قرن تک سمندر نے کام کرتے کرتے چھوٹے چھوٹے بحری جانوروں کی استخوانوں کی تہیں جما دی تھیں۔

نیاز

"تذکرہ جمیل"

(اُردو شاعرات کا تذکرہ)

میں نے اُردو شاعرات کا تذکرہ مرتب کیا ہے۔ جس کی ادب اُردو میں بہت سخت ضرورت تھی۔ چنانچہ چندہ اوّلین شاعرہ سے لے کر ۱۸۹۹ء تک کل شاعرات کا تذکرہ جمع کر لیا گیا ہے۔ اور کتابت ہو رہی ہے۔ اب میں ناظرات سے بصد ادب درخواست کرتا ہوں کہ وہ دور حاضرہ کی شاعرات (سنہ ۱۹۰۰ء سے سنہ ۱۹۳۱ء) کے حالات و نمونے شاعری کے مجھے سرفراز فرمائیں۔ تاکہ یہ تذکرہ کسی حد تک مکمل ہو سکے۔ کتاب کی اشاعت کی عجلت ہے۔ اس لئے قوی امید ہے۔ کہ ۲۵ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ء تک مجھکو شاعرات اپنے حالات اور اپنے نمونۂ کلام سے مطلع فرمائیں گی

قادری محمد مشیر احمد علوی ناظر بی۔ اے (علیگ)
نائب وائس پریسیڈنٹ۔ انجمن معیار الادب۔
اورنٹیل پبلشنگ ہاؤس ۱۲ امین آباد پارک۔ لکھنؤ۔

فراست التحریر مکمل

یعنی اردو اور انگریزی رسم خط اور انداز تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت، چال چلن، مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن اُردو میں بالکل پہلی کتاب، اردو حصہ علاوہ محصول ۸ر انگریزی حصہ علاوہ محصول ۸ر ہر دو حصے مع محصول عہ ر

منیجر نگار لکھنؤ

عمرِ برق خرام

اگر کوئی شخص خوش قسمت ہو تو ایسا جیسے ہمارے دوست پروفیسر جیبرن ہیں کہ ہاتھ ڈالیں مٹی پر تو بجائے سونا میں نے اکثر محققین کا حال سنا ہے۔ جنھوں نے دنیا میں بڑے بڑے نمایاں کام۔ کیے ہیں، مگر جو کارنامہ ہمارے دوست کا ہے۔ اس کی نظیر کہیں ملتی ہی نہیں۔ انھوں نے ایک ایسی چیز دریافت کی ہے جس سے حیاتِ انسانی میں انقلابِ عظیم پیدا ہو جائے گا۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ چیز ان کو اتفاق سے اس وقت حاصل ہو گئی جبکہ ان کا ارادہ محض ایک مقوی اعصاب نسخہ تجویز کرنے کا تھا۔

——میرا گھر فاکسٹون میں ہے۔ اور پروفیسر جیبرن صاحب میرے ہمسایہ ہیں۔

تقریباً سال بھر کا عرصہ گذرا کہ مجھ سے پروفیسر صاحب کی ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے کہ "میں ابھی ان چھوٹی چھوٹی ایجادوں سے ہرگز مطمن نہیں ہوا۔ کیونکہ یہ ادویہ یا تو اعصاب پر اثر کیے بغیر مرکزی طاقت کو بڑھا دیتی ہیں یا دہ نظام عصبی کے مادۂ موصلیت (Conductivity) کو کم کرکے جسم کی بچی ہوئی طاقت کو بڑھا دیتی ہیں، اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اگر معدہ اور قلب کے فعل کو تقویت دیتی ہے۔ تو دماغ کو مختل چھوڑ دیتی ہے یا اگر سٹیمپین شراب کی طرح دماغ پر اثرانداز ہوتی ہے تو وہ دیگر اعضائے رئیسہ کو چھوڑ دیتی ہے۔ مگر میں کچھ ایسی چیز چاہتا ہوں۔ جو تمام اعضا پر اثر ڈالے۔ اور ایسا معلوم ہو گویا آپ میں دو تین آدمیوں کی طاقت آگئی ہے۔

میں:۔ لیکن ایسی دوا تو انسان کو تھکا کر اور کمزور کر دے گی۔

پروفیسر۔ قطعی نہیں۔ بلکہ اس کے استعمال کے بعد آپ دوچند، سہ چند غذا کھائیں گے۔ اب ذرا غور کیجئے کہ یہ چیز کیسی ہوگی۔ (ایک سبز شیشی اپنی جیب میں سے نکال کر) ایسی ہوگی۔ اور اس بیش بہا شیشی کے اندر وہ طاقت ہوگی۔ کہ اس کے استعمال کرنے سے آپ دوگنا سوچیں گے۔ دوگنی تیزی سے حرکت کریں گے۔ اور ایک مقررہ وقت میں اوروں سے دوگنا کام کریں گے "

میں۔ مگر ایسی چیز ممکن بھی ہے ؟

پروفیسر- میرے خیال میں ضرور ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اپنا ایک سال اس فکر میں کیوں ضائع کرتا۔ مثلاً ہائپوفاسفیٹ کے مختلف مرکبات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کی کوئی نہ کوئی چیز ضرور تیار کی جاسکتی ہے - دوگنی نہیں اگر ڈیوڑھی قوت کی بھی دوا تیار ہوگئی تو ہمارا مقصد پورا ہو جائے گا۔

میں - مقصد پورا ہو جائے گا؟ کیونکر

پروفیسر- فرض کیجئے کہ آپ ایک سیاست داں اور مدبر ہیں - آپ کا وقت گذرا جارہا ہے - اور کام ابھی تک نہیں ہوا اور وہ کام بہت ضروری ہے - تو ایسی حالت میں کیا ہونا چاہئے؟

میں - پرائیوٹ سکرٹیری کو دوا کی ایک خوراک دیدینی چاہئے۔

پروفیسر- اور اس طرح دوچند کام لینا چاہئے۔ اور غور کیجئے مثلاً آپ کوئی کتاب ختم کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی ڈاکٹر ہے، جس پر سکرات موت طاری ہیں، اور وہ چاہتا ہے کہ اٹھ بیٹھے - اور کسی مریض کے معاملہ میں غور کرے یا کوئی بیرسٹر ہے۔ یا کوئی ایسا شخص ہے جو امتحان دینے کے لیے کتابوں کا کیڑا بنا ہوا ہے۔

میں - ایسے لوگوں کے لئے آپ کی دوا یقیناً بڑی بیش قیمت چیز ہوگی۔

پروفیسر- یا کوئی جنگ ہو رہی . . . . . ہے جس میں کامیابی کا انحصار اس امر پر ہے کہ جلد سے جلد پستول کی لبلبی دبائی جائے۔

میں - یا پٹہ بازی - یا پھری گدکا ہے -

پروفیسر- الغرض اگر میں کوئی ایسی دوا ایجاد کرلوں تو اس میں سوائے اس کے اور کوئی نقصان ہوگا، کہ آپ ایک نہایت خفیف حد تک بڑھاپے کے قریب ہو جائیں گے - لیکن آپ کی زندگی اور دن کے مقابلہ میں دوچند ہو جائیگی

میں - کیا واقعی آپ کے خیال میں ایسی دوا ایجاد ہو سکتی ہے؟

پروفیسر صاحب نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا - اور پھر اس سبز شیشی سے اپنی میز کا کنارہ کھٹ کھٹا کر بولے :- میں خیال کرتا ہوں کہ میں یہ دوا معلوم کر چکا ہوں -

مجھے یاد ہے کہ اس کے بعد بھی اس دوا کے متعلق ہم دونوں میں کئی بار گفتگو ہوئی - اور جب کبھی وہ اس کے متعلق گفتگو کرتے تھے - ان کے لب ولہجہ سے بہت زیادہ یقین ظاہر ہوتا تھا - دنیائے حیات میں اس جدید دوا کے استعمال سے جو غیر متوقع نتائج پیدا ہونے والے تھے - ان کی نسبت گفتگو کرتے ہوئے وہ کبھی کبھی گھبرا جاتے تھے - اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ ملول و حزیں نظر آنے لگتے تھے - اور کبھی کبھی وہ اس بارہ میں بھی گفتگو کرنے لگتے تھے - کہ اس دوا کی ایجاد سے کس قدر منافع حاصل ہو سکے گا، اکثر ایسا ہوا کہ ہم دونوں اس بات پر طویل بحث کرتے - ہے کہ تجارتی طور پر اس عجیب دوا سے کیونکر فائدہ حاصل کیا جائے -

وقت گذر گیا مگر مجھے جو دلچسپی اس ستم ایجاد دوا سے پیدا ہو گئی تھی۔ وہ بدستور قائم رہی۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی پروفیسر جیبرن کوئی ایسی چیز تیار کر رہے ہیں۔ جس سے انسان کی زندگی پر بڑا اثر پڑے گا۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص نے اس دوا کو بار بار استعمال کیا۔ تو اس میں شک نہیں۔ کہ اس کی زندگی نہایت سرگرمی سے گزرے گی۔ لیکن گیارہ ہی برس کی عمر میں وہ جوان، پچیس برس کی عمر میں ادھیڑ، اور تیس برس کی لگ بھگ...... اس کا انحطاط شروع ہو جائے گا۔

اگست کے مہینہ کی سات تاریخ ہوگی یا آٹھ کہ پروفیسر صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ کچھ ۶ صہ سے دوا تیار کر رہے ہیں۔ اور اسی پر ان کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار ہے۔ ۱۰ اگست کو جوان سے میری ملاقات ہوئی تو وہ فرمانے لگے۔ کہ اب "جدید اکسیر حیات"، کا مادی وجود دنیا میں آگیا ہے۔ جس روز پروفیسر صاحب سے میری یہ ملاقات ہوئی۔ اس روز میں غالباً کسی کام سے فاکسٹون کی طرف جا رہا تھا۔ دیکھ کر جھپٹے ہوئے آئے۔ میرے خیال میں شاید وہ مجھ سے اپنی کامیابی کا حال بیان کرنے میرے گھر آرہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ آج ان کی آنکھیں غیر معمولی طور پر روشن تھیں۔ ان کے چہرے پر سُرخی دوڑ رہی تھی۔ اور ان کی رفتار میں تیزی اور لچک بھی تھی۔ پروفیسر صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور جلدی سے بولے۔ ہو گیا جناب کام ہو گیا۔ بلکہ ضرورت سے بھی زیادہ ہو گیا۔ آپ میرے یہاں تشریف لائیں۔ اور دیکھیں۔

میں۔ واقعی؟

پروفیسر۔ جی ہاں واقعی۔ آپ میرے یہاں تشریف لائیں۔ اور دیکھیں۔

میں۔ اور وہ اسی طرح دو چند کام کرتی ہے؟

پروفیسر۔ اس سے بھی زیادہ بلکہ بہت زیادہ۔ میں تو اس دوا کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ آئیے اور خود اس دوا کو ملاحظہ فرمائیے بلکہ خود چکھ کر اس کا تجربہ کیجیے۔ دُنیا میں اس سے زیادہ حیرت انگیز چیز کوئی نہ ہوگی۔

پروفیسر صاحب نے میرا بازو پکڑ لیا۔ اور مجھے پہاڑی کی طرف لے چلے۔ موسم بہت صاف اور روشن تھا۔ ہر چیز چمکدار اور منور نظر آرہی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ہوا کسی قدر تیز چل رہی تھی۔ جس سے میرا جسم کسی قدر ٹھنڈا اور پسینہ خشک ہو رہا تھا۔ میں نے شور مچایا کہ "پروفیسر صاحب خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔ رحم"۔ اس پر پروفیسر صاحب نے اپنی رفتار کسی قدر دھیمی کر دی۔

پروفیسر۔ میں تیز کہاں چل رہا ہوں۔

میں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے وہ دوا کسی قدر پی لی ہے۔

پروفیسر۔ نہیں۔ بالکل نہیں۔ مگر ہاں یہ ضرور ہوا کہ جس گلاس میں سے دوا کے چند قطرے باقی تھے۔ اس کو دھونے کے بعد پانی کا ایک قطرہ میں نے ضرور چکھ لیا تھا۔ ہاں بیشک کل رات میں نے وہ دوا ضرور چکھی تھی۔ مگر اب تو وہ پرانی بات ہو گئی۔

میں۔ اور اس کا اثر دہی دوگنا ہے ؟
پروفیسر۔ جی دوگنا کیسا ہزار گنا کہئے۔ ہزار گنا
اب ہم پروفیسر صاحب کے مکان پر پہونچ گئے۔ اور انھوں نے پرانی وضع کا لکڑی کا پھاٹک کھولا۔ میں بھی ساتھ ہی اندر داخل ہوا۔ اور انھوں نے فرمایا میں نہیں کہہ سکتا اس میں کتنا زبردست اثر ہے۔ اس کے پیتے ہی نظام عصبی کے علم پر عجیب قسم کی روشنی پڑنے لگتی ہے۔ نظریہ رویا کو وہ ایک جدید صورت میں پیش کرتی ہے۔ . . . . . خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے ہزار گنا . . . . خیر یہ باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی۔ فی الحال اس دوا کا امتحان کرنا ہے
میں۔ دوا کا امتحان کرنا ؟
اب ہم پروفیسر صاحب کی نشستگاہ میں پہونچ گئے۔ اور پروفیسر صاحب نے فرمایا
پروفیسر۔ جی ہاں۔ وہ دیکھئے اس سبز شیشی میں وہ دوا موجود ہے۔ بشرطیکہ آپ ڈریں نہیں
میں فطرتاً بہت محتاط آدمی ہوں۔ کسی معاملہ میں بغیر سوچے سمجھے ہاتھ نہیں ڈالتا۔ میں خود ڈرتا تھا۔ مگر دوسری طرف کسی قدر اپنی شان کا بھی خیال تھا۔ بالآخر میں نے کہا۔ آپ تو فرماتے ہیں کہ میں اس کا امتحان کر چکا ہوں
ہاں میں نے اسے ضرور چکھا ہے۔ اور مجھے اس سے کوئی نقصان نہیں پہونچا۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔ کہ مجھے کوئی نقصان پہونچا ہے ؟
میں۔ (کرسی پر بیٹھ کر) اچھا تو لائیے مجھے بھی وہ دوا دیجئے
میں آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور پروفیسر صاحب اپنی میز کے آگے کھڑے ہوئے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرہ سے اس وقت فخر و ناز ٹپک رہا تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو ایک بہت بڑا ماہر طب سمجھتے تھے۔
پروفیسر۔ دیکھئے یہ عنابی رنگ کی دوا ہے۔ مگر میں آپ کو ایک بات سمجھائے دیتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ جونہی یہ دوا آپ کے حلق سے نیچے اترے آپ فوراً اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اور پھر احتیاط کے ساتھ ایک دو منٹ میں آپ آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ کیونکہ پتلی کو ایک قسم کی تکلیف ہوتی ہے۔ اور آنکھیں کھولنے کے وقت چکر سا آنے لگتا ہے۔ اس لئے آپ آنکھیں بند رکھیں۔"
میں۔ آنکھیں بند رکھوں ؟ خوب !
پروفیسر۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ بالکل ساکت رہیں۔ کسی قسم کی حرکت نہ کریں۔ کیونکہ آپ یہ دوا پینے کے بعد کئی ہزار گنا تیز ہو جائیں گے۔ آپ کا دل، دماغ، پھیپھڑے اور عضلات وغیرہ ہر چیز ہزاروں گنا تیز کام کرے گی۔ اور آپ کو صرف اسقدر محسوس ہوگا۔ کہ دنیا بمقابلہ پیشتر کے ہزاروں گنا سست رفتار سے چل رہی ہے۔ بس یہی اس دوا میں عجیب و غریب اثر ہے۔

میں۔ اللہ اللہ! کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ . . . . "
پروفیسر۔ مطلب وطلب کچھ نہیں۔ بس آپ خود دیکھ لیں۔
یہ کہہ کر پروفیسر نے ایک چھوٹا سا پیمانہ اٹھایا۔ میز پر جو چیزیں رکھی تھیں۔ ان کی طرف دیکھا اور بولے: "گلاس بھی ہیں۔ پانی بھی ہے۔ سب چیزیں یہیں موجود ہیں۔ لیکن پہلی مرتبہ زیادہ مقدار میں نہ پینا چاہیئے۔"
چھوٹی سی شیشی نے "قلقل" سے کمرہ کی فضا میں ترنم پیدا کیا۔ اور پیمانہ میں ایک سرخ سرخ سی چیز نظر آنے لگی۔ اس کے بعد پروفیسر صاحب نے وہ پیمانہ ایک گلاس میں خالی کر دیا۔ اور فرمایا:-
"جو کچھ میں نے سمجھا دیا ہے وہ ہرگز نہ بھولنا۔ اپنی آنکھیں خوب کس کر بند کر لو۔ اور دو منٹ تک بالکل بے حس وحرکت اور ساکت بیٹھو۔ پھر آپ مجھے بولتے سنیں گے۔"
اس کے بعد پروفیسر صاحب نے دونوں گلاسوں میں ایک ایک انچ کے قریب پانی ڈالا۔ اور فرمایا:-
ہاں اتنی بات اور بھی سُن لیجئے۔ یعنی اپنا گلاس نیچے نہ رکھیں۔ ہاتھ میں لیئے رہیں۔ اور اپنا ہاتھ زانو پر رکھ لیں ہاں۔ ہاں۔ اس طرح۔ اور اب . . . . . . "
پروفیسر صاحب نے اپنا گلاس اٹھایا۔ اور ادھر میں نے اپنا گلاس ہاتھ میں لے کر کہا:-

"جدید اکسیر حیات"

اس کے بعد ہم دونوں نے اپنے گلاس ایک دوسرے کے گلاس سے ٹکرائے اور پی لیئے۔ اور میں نے اپنی آنکھیں فوراً بند کر لیں۔ پروفیسر صاحب نے بھی میرے الفاظ دہرائے۔
جس طرح کوئی شخص گیس سونگھنے کے بعد دنیا ومافیہا سے قطعی بے خبر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہماری حالت بھی نہ معلوم کتنی دیر تک یوں ہی رہی۔ اس کے بعد میں نے پروفیسر جیبرن کی آواز سنی جو مجھ سے بیدار ہونے کو کہہ رہے تھے۔ میں نے بھی ہاتھ پاؤں ہلائے۔ اور آنکھیں کھول دیں۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کہ پروفیسر صاحب ہاتھ میں گلاس لئے ہوئے۔ وہیں کھڑے ہیں۔ جہاں وہ پیشتر سے کھڑے ہوئے تھے۔ فرق صرف اسقدر تھا کہ اس وقت ان کا گلاس خالی تھا۔
میں۔ کیسے جناب کیا حال ہے؟ . . . . پروفیسر۔ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔
میں۔ کوئی بات نہیں؟ کچھ تو ہو گا۔ کم از کم یہ تو محسوس ہوتا ہو گا۔ کہ سانسیں ٹھنڈی آرہی ہیں۔
پروفیسر۔ کچھ آوازیں سنتے ہو؟ . . . . میں۔ بالکل سکوت طاری ہے۔ خدا کی قسم ہر چیز ساکت ہے۔ ہاں کچھ "پٹ پٹ" کی آواز آرہی ہے۔ گویا بارش کے قطرے مختلف چیزوں پر پڑرہے ہیں۔ یہ کیا بات ہے؟
میرا خیال ہے کہ میرے جواب میں پروفیسر صاحب نے کہا کہ "تجزیہ شدہ آوازیں ہیں" مگر مجھے ٹھیک طور پر

یاد نہیں کہ یہی کہا تھا یا کچھ اور اس کے بعد پروفیسر صاحب نے کھڑکی کی طرف دیکھا اور بولے۔

آپ نے کبھی یہ بھی دیکھا ہے۔ کہ کسی کھڑکی میں پردہ اس طرح آویزاں ہو جس طرح سامنے لٹکا ہوا ہے؟
جس طرف وہ دیکھ رہے تھے میں نے بھی دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پردہ کا ایک سرا بہت تیزی کے ساتھ ہوا میں اُڑ رہا ہے۔ اور پھٹ پھٹا رہا ہے۔

میں - نہیں میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ بالکل عجیب بات ہے۔ پروفیسر - اور یہ بھی دیکھئے۔

یہ کہہ کر پروفیسر صاحب نے اپنا داہنا ہاتھ کھولا۔ جس میں گلاس تھا۔ میں سمجھا تھا کہ گلاس میز پر گر کر ٹوٹ جائیگا۔ مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ گر کر ٹوٹنا تو درکنار وہ گلاس حرکت کرتا بھی نظر نہ آتا تھا۔ وہ ہوا میں بالکل ساکن اور معلق تھا۔

پروفیسر - ان عرض البلاد میں ہر چیز پہلے سکنڈ میں سولہ فٹ زمین کی طرف گرتی ہے۔ چنانچہ یہ گلاس بھی ۱۶ فٹ فی سکنڈ کے حساب سے گر رہا ہے۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں۔ کہ ابھی وہ ایک سکنڈ کا ہزارواں حصہ بھی نہیں گرا۔ اس سے آپ کو میرے "جدید اکسیر حیات" کی رفتار کا کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا"

گلاس جو آہستہ آہستہ گر رہا تھا۔ پروفیسر صاحب نے اس کے اوپر نیچے اور چاروں طرف اپنا ہاتھ گھمایا۔ اور بالآخر انھوں نے گلاس کا پیندا پکڑ لیا۔ اور نیچے گھسیٹ لیا۔ اور احتیاط کے ساتھ میز پر رکھ دیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر فرمایا "دیکھا" اور ہنسنے لگے۔ . . . . میں - بہت ٹھیک!

اس کے بعد میں نے نہایت احتیاط کے ساتھ اپنی کرسی پر سے اٹھنا شروع کیا۔ میں اپنی حالت پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ طبیعت نہایت ہلکی اور مطمئن تھی۔ میرے تمام اعضا میں تیزی محسوس ہوتی تھی۔ مثلاً میرا دل فی سکنڈ ایک ہزار کے حساب سے دھڑک رہا تھا۔ مگر اس بات سے مجھے کوئی تکلیف یا گھبراہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ میں نے کھڑکی سے گردن باہر نکال کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص بائیسکل پر سوار ہے۔ مگر کوئی حرکت نہیں کرتا۔ سر نیچے ہے اور پاؤں اوپر۔ اور بائیسکل کے پہیوں کے پیچھے گرد و غبار کا ایک بادل ہے۔ وہ ایک تیز رفتار موٹر لاری کو پکڑنا چاہتا ہے۔ جو بظاہر ساکن نظر آ رہی ہے۔ میں یہ عجیب و غریب منظر دیکھ کر بے حد متعجب ہوا۔ اور پکار کر کہا:-

میں - جیبرن! اس ملعون دوا کا اثر کب تک باقی رہے گا . . . . پروفیسر - خدا معلوم کب تک رہے گا۔ پچھلی مرتبہ جب میں نے یہ دوا استعمال کی تھی۔ تو میں فوراً اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ اور سوتے سوتے اس کا اثر زائل ہو گیا تھا۔ میں صاف کہتا ہوں کہ میرے دل میں کسی قدر خوف ضرور پیدا ہوا تھا۔ اگرچہ میری یہ حالت چند منٹ رہی ہوگی۔ مگر وہ مجھے گھنٹوں معلوم ہوتی تھی۔ لیکن کچھ دیر بعد یہ حالت رفع ہونے لگی اور پھر دفعتاً ختم ہو گئی۔
مجھے اس بات پر تو ناز ہے کہ مجھ پر کسی قسم کا خوف طاری نہیں ہوا۔ ممکن ہے۔ اس کا سبب یہ ہو کہ ہم اسوقت دو آدمی تھے۔

میں - جیسن! چھوڑ دو اس کتے کو - ایک تو ویسے ہی سخت گرمی ہو رہی ہے - دوسرے تم نے دوڑتے دوڑتے مار ڈالا - خدا کی پناہ اس قدر تیزی کہ دو تین میل فی سکنڈ کے رفتار سے دوڑ رہے ہو - ہوا کی رگڑ مارے ڈالتی ہے -

پروفیسر (کتے کی طرف دیکھتے ہوئے) - کیا؟ . . . . میں - ہوا کے تھپیڑے! ہوا کی رگڑ!! آپ بیحد تیز دوڑ رہے ہیں - گویا فضاء بسیط میں شہاب ثاقب ٹوٹ رہا ہے - اوہو! سخت گرمی محسوس ہو رہی ہے - اگر آپ اسی طرح دوڑتے رہیں گے تو آپ کے کپڑوں میں آگ لگ جائے گی - دیکھئے آپ کی پتلون کا کپڑا بھورا ہوتا جا رہا ہے - میں اس وقت سر سے پاؤں تک پسینہ پسینہ ہو رہا ہوں - تمام جسم میں چیونٹیاں سی کاٹ رہی ہیں - وہ دیکھو مجمع میں کسی قدر حرکت شروع ہو گئی ہے - میرے خیال میں اب ہماری دوا کا اثر زائل ہونے لگا ہے - پروفیسر اس کتے کو نیچے ڈال دو -

پروفیسر - کیا؟ . . . . میں - دوا کا اثر غالباً زائل ہو رہا ہے - اس وقت سخت گرمی معلوم ہو رہی ہے - دیکھو میں پسینہ میں بھیگ گیا ہوں -

پروفیسر صاحب میری صورت کو تکنے لگے - پھر انھوں نے بینڈ باجہ کی طرف دیکھا - جو یقیناً اب زیادہ تیزی سے بج رہا تھا - اس کے بعد انھوں نے نہایت تیزی سے ہاتھ ہلا کر کتے کو پھینک دیا - جو ایک بے جان کی طرح ہوا میں اڑتا چلا گیا - اور چند آدمیوں کی جماعت جو چھتریاں لگائے ہوئے کھڑے تھے - اُن کے سروں پر معلق ہو گیا پروفیسر صاحب نے میرا بازو پکڑ لیا اور بولے :-

پروفیسر - واقعی شدت کی گرمی ہے - اور جسم میں چیونٹیاں سی کاٹ رہی ہیں - دیکھو وہ آدمی اپنا رومال بار بار حرکت میں لاتا دکھائی دیتا ہے - چلو یہاں سے جلدی نکل چلو -

مگر بدقسمتی کہیے یا خوش قسمتی، ہم جلدی نہ جا سکے - کیونکہ اگر ہم دوڑتے تو ہمارے جسم میں ضرور شعلے بھڑکنے لگتے - اور ہم پیکر کاغذی کی طرح جلنے لگتے - دوا پیتے وقت ہم کو اس بات کا خیال تک نہ آیا تھا . . . . . . بہرحال قبل اس کے کہ ہم دوڑنا شروع کریں اس دوا کا اثر زائل ہو گیا - بس یہ سب کچھ ایک سکنڈ سے بھی کم عرصہ میں ہو گیا - اس جدید "اکسیر حیات" کا اثر اس طرح ختم ہو گیا - جیسے کوئی پردہ یک لخت اٹھ جاتا ہے - اتنے میں میں پروفیسر صاحب کی آواز سنی جو خوف زدہ اور گھبرائے ہوئے کہہ رہے تھے :- "بیٹھ جاؤ! بیٹھ جاؤ!!" آواز سنتے ہی میں فوراً زمین پر بیٹھ گیا - مگر گرمی کے مارے جھلس گیا تھا - اور جس جگہ میں بیٹھا تھا - وہاں کی گھاس اس طرح جلی کہ آج تک وہ اتنی جگہ گھاس سے خالی ہے - اب وہ جمود و سکون جو دنیا بھر پر چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا ختم ہو گیا - تمام دُنیا و مافیہا بیدار ہو گئی بینڈ جو اب تک ہم کو بے سُرا اور بیہودہ معلوم ہوتا تھا - اب اس کی سُریلی آوازیں کانوں میں آنے لگیں - جو لوگ ساکن نظر آ رہے تھے - اب وہ چلتے ہوئے دکھائی دینے لگے - کاغذ اور جھنڈیاں پھڑ پھڑانے لگیں - لبہائے تبسم آمیز سے باتیں نکلنے لگیں - آنکھ سے اشارہ کرنے والے کا اشارہ ختم ہو گیا - اور وہ خاموش نکلا ہوا چلا گیا - اور جسقدر آدمی کرسیوں

اور بچوں پر ساکت وساکن بیٹھے ہوئے تھے - وہ حرکت اور باتیں کرنے لگے -

اب گویا تمام دنیا زندہ ہوگئی تھی - اور جو رفتار اس کی تھی وہی اب ہماری تھی یا یوں کہئے کہ اب ہم دنیا سے زیادہ تیز رفتار نہیں تھے - یہ حالت بالکل ایسی تھی جیسے اسٹیشن میں داخل ہوتے ہوئے ایک ٹرین سست ہوتے ہوتے دفعتاً رک جاتی ہے - میری طبیعت میں اس وقت سخت امتلا پیدا ہوا - کیونکہ میرے نزدیک دنیا پھر چکر کھا رہی تھی - اور اب وہ کتا جو بے جان چیز کی طرح ہوا میں معلق نظر آتا تھا - ایک لیڈی کی ریشمی چھتری پر گرا جس کے صدمہ سے چھتری میں سوراخ ہوگیا - اور وہ کتا لیڈی صاحب کے منہ پر اسی طرح پڑا جیسے بندوق کی گولی کسی چیز سے پار ہوکر لگتی ہے - اس غیر متوقع واقعہ سے اسقدر شور وغل مچا - اور اسقدر چہل پہل ہوئی کہ عیاذاً باللہ - کتے نے شور مچاتے ہوئے آسمان سر پر اٹھا لیا - اور سچ پوچھئے تو کتا بیچارہ اس قدر تیزی سے پھینکا گیا تھا - کہ ہوا کی رگڑ سے اس کے بال تک جھلس گئے تھے - اسوقت تہلکہ مچ گیا - لوگ ادہر اُدہر بھاگے پھرتے تھے - بیسیوں کے پاؤں کچل گئے - بیسیوں کرسیاں اُلٹ گئیں - پولسمین وہاں تعینات تھا - وہ دوڑا ہوا موقعہ پر پہونچا - یہ تو معلوم نہیں کہ معاملہ کیونکر رفع دفع ہوا - کیونکہ ہم دُور ہی کھڑے رہے - جب ہم نے دیکھا کہ ہماری حالت بہت کچھ درست ہوگئی ہے - تو ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور مجمع سے الگ ہی الگ رہتے ہوئے ہم نے پروفیسر صاحب نے گھر کا راستہ لیا - لیکن مجمع میں جو کچھ شور وغل ہو رہا تھا - اس میں ہم نے ایک شخص کی آواز سنی جو ٹوٹی ہوئی چھتری والی لیڈی صاحبہ کے پاس کھڑا تھا - وہ پارک کے ایک خادم کو بُری بُری گالیاں اور دھمکیاں دے رہا تھا - اور کہتا تھا کہ "اگر یہ کتا تم نے نہیں پھینکا تو اور کس نے پھینکا" اور وہ بیچارہ دم بخود کھڑا ہوا - ان صاحب کی صورت کو تک رہا تھا -

چیخ پکار کی وجہ سے بلکہ درحقیقت اس خوف سے کہ کہیں ہم لوگ کسی آفت میں نہ پھنس جائیں - سیدھے گھر کی طرف چلے - اب اس بائیسکل سوار کا کہیں پتہ تھا نہ اس "گاڑی" کا کہیں نشان تھا - جب ہم مکان پہونچے تو ہم نے یہ بھی حیرت انگیز بات دیکھی کہ جس کھڑکی میں سے ہوکر ہم نکلے تھے وہ بھی کسی قدر جھلس گئی تھی - اور راستہ میں بچھے ہوئے سنگریزوں پر ہمارے پاؤں کے نشانات غیر معمولی طور پر گہرے تھے ---

(ایچ - جی - ولز)

آیندہ جنوری ۳۲ء کا نگار

تقریباً دو سو ۲۰۰ صفحات پر شایع ہوگا۔

اور

مخصوص ہوگا **مطائبات غالب** کیلئے اسوقت تک غالب پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اس کی فلسفہ طرازی معنی آفرینی، علوئے خیال، بلندی مفہوم اور دشوار پسندی سے متعلق تھا۔ لیکن یہ راز ابتک سربستہ ہے کہ غالب کی شہرت وکامیابی کا حقیقی راز ان سب سے علیحدہ صرف اس کی شوخی، شوخ نگاری، بذلہ سنجی اور مطائبات پسندی میں پنہاں ہے جنھوں نے اس کے سارے کلام کو خواہ وہ نظم ہو یا نثر، فارسی ہو یا اردو ایک نہایت ہی اچھوتی قسم کی تنقید ملیح (WITTY CRITICISM) میں تبدیل کر دیا ہے۔

یہ مضمون ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے جس میں برسوں کی محنت وکاوش کے بعد اس کے اردو کلام سے اسکی فارسی تصانیف سے اس کے رقعات سے اور تمام ان واقعات و حالات سے جو تذکروں اور خود اسکی تصانیف میں ملتے ہیں، غالب کی شوخی وشوخ نگاری پر تمام پہلوؤں سے نہایت ہی مکمل بحث کیگئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ غالب کی شہرت وکامیابی کا تنہا راز صرف یہ تھا کہ وہ قدرت کیطرف سے نہایت شوخ و بذلہ سنج طبیعت لیکر آیا تھا۔ اور اسکی ساری زندگی، اسکی جملہ تصانیف میں یہی وہ رنگ ہے جو تمام شعراء سے اسے ممتاز بناتا ہے سب سے پہلے ایک بسیط مقدمہ کے ذریعہ سے مثالیں دیدیکر بتایا جائیگا۔ کہ شوخی وظرافت کی دنیا میں کتنی قسمیں ہیں۔ غالب سے قبل کن کن شعراء نے اسے اختیار کیا۔ ہندوستان میں اس رنگ نے کتنا نوع اختیار کیا۔ اور پھر غالب کے اردو فارسی کلام اور اسکے حالات وکوائف زندگی کا استقصار کرکے بتایا جائیگا۔ کہ غالب حقیقتاً کسقدر دلچسپ انسان تھا۔ اور کیسے کیسے نوادر ادب اور لطائف انشاء وہ اپنے بعد چھوڑ گیا ہے۔ یہ کتاب اگر ایک طرف فن تنقید کی بہترین مثال ہے تو دوسری طرف ایسا مجموعۂ ادب ہے کہ شاید ہی اس سے بہتر ذریعہ تفریح ودلچسپی کا کوئی اور ہو۔ یہ تصنیف غالب کے متعلق بالکل اچھوتی چیز ہوگی۔ اور ہر شخص کے ذوق کو آسودہ کرنیوالی۔ وہ حضرات جو غالب کا صحیح مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ انکے لئے اس کتاب کا دیکھنا ایک فرض ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کتاب صرف نگار کے جنوری نمبر میں شایع ہوگی اور اسلئے اسکے حاصل کرنیکا تنہا ذریعہ یہی ہے۔ کہ نگار کی خریداری کو جاری رکھئے اور آپ کے حلقۂ احباب میں جو حضرات اس کتاب کو حاصل کرنا چاہتے ہوں انھیں نگار کی خریداری پر آمادہ کیجئے۔ اسی کے ساتھ غالب کی ایک رنگین تصویر ہوگی، جو اس سے قبل کہیں شایع نہیں ہوئی۔

نیاز

شبنمستانِ کا قطرۂ گوہریں

قصر بلوریں، جس میں ہر وقت مینا بازار کی سی چہل پہل رہتی تھی - آج بالکل سنسان نظر آرہا ہے - وہ قصر بلوریں جس کے ہر گوشہ سے رقص و سرود کی آوازیں آتی رہتی تھیں - جس کے ایوانخانہ میں کنیزوں کے ریشمی ملبوس کی سرسراہٹ ہمیشہ محسوس ہوتی رہتی تھی - جس کے کمروں میں نقرئی گھونگرؤں کی آواز کے ساتھ ہلکے ہلکے قہقہوں کا لحن ملا ہوا - ہر وقت گونجتا رہتا تھا ——— آج وہی قصر بلوریں ایک مقبرہ کی طرح سنسان ہے - جس کے اندر ملکۂ ناہید پھولوں سے لدی ہوئی سیج پر اس طرح خاموش و ساکت پڑی ہوئی ہے، گویا کہ وہ کسی قدیم ملکۂ مصر کی حنوط شدہ لاش ہے -

ایک نوجوان کنیز جس کا زرکار سینہ بند، آب رواں کی ہلکی چادر کے نیچے ایسا نظر آتا ہے، جیسے شفاف موجوں کے نیچے سورج کی تڑپتی ہوئی کرنیں، ہاتھ میں پھولوں کا پنکھا لئے ہوئے اس طرح خاموش کھڑی ہے، گویا کہ وہ کوئی سنگ مرمر کا بنا ہوا مجسمہ ہے جسے بہ لحاظ حسن و جمال ملکہ کی سیج کے قریب جگہ دی گئی ہے ———

دوسری کنیز جس کے عریاں شانہ و دوش پر بکھرے ہوئے سنہرے بال ایسے معلوم ہوتے ہیں - جیسے آئینہ میں دور سے کسی آبشار زریں کا نظارہ - قدموں کے پاس سر جھکائے خاموش بیٹھی ہے - اور بنفشہ کے اُن پھولوں کو دیکھ رہی ہے - جن سے ایک ساعت قبل وہ اپنی ملکہ کے تلوے سہلا رہی تھی - خوابگاہ کے ایک بعید گوشہ میں رقاص کنیزیں جن کی جھکی ہوئی نازک کمر، بکھرے ہوئے بڑے بڑے بال، ایک ہی حال میں قائم ہو کر رہ گئے تھے، خوابگاہ کے مختلف گوشوں میں اس طرح خاموش و ساکت نظر آتی تھیں گویا یہ کسی عجائب خانہ کی مومی تصویریں ہیں - کسی کی اونگلی تار کو چھوتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، لیکن چھو نہ سکی تھی، کسی کا ہاتھ دف سے علیحدہ ہو کر ہٹا ہی تھا کہ وہیں رہ گیا، کوئی رقص کرتے کرتے کمر کو لچکا کر ہاتھ سے فرش کو چھونا ہی چاہتی تھی، کہ اسی حال میں قائم ہو گئی، کسی نے نقرئی گھونگھرؤں میں آواز پیدا کرنے کے لئے اپنی ...... گلاب کی کلی کی طرح رنگین و خوبصورت ایڑی کو اٹھا کر پنجہ سے فرش پر ٹھوکر مارنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ اسی حال میں مجسمہ بنکر رہ گئی، عود دانوں سے مشک و عنبر کا دھواں بل کھاتا ہوا اٹھا تھا، وہ بھی ایک جگہ قائم تھا - اور جس آخری نغمہ کو سنتے سنتے ملکۂ ناہید محو خواب ہوئی تھی - وہ بھی فضا میں اسی طرح گونجتا ہوا رہ گیا تھا ———

یہ قصر بلوریں کی طلسم بند فضا کا اثر تھا کہ جب ملکۂ ناہید سونے کو ہوتی تو غفلتِ خواب کے اولین لمحہ میں جو چیز

جس حال میں ہوتی، اسی طرح قائم و منجمد ہو کر رہ جاتی۔ اور جب وہ بیدار ہوتی تو سب میں آثارِ حیات دفعۃً پیدا ہو جاتے۔ اور جس حالت میں ان پر کیفیت خواب طاری ہوتی وہیں سے پھر اپنے مشغلہ کو شروع کرتے۔

ملکۂ ناہید صبح ہی سے کچھ برہم تھی۔ اور اسی کیفیت کے ساتھ اس کی آنکھ لگی تھی۔ اس لئے جب سہ پہر کو وہ بیدار ہوئی۔ اور خوابگاہ کی تمام کنیزیں خود بخود چونک کر اپنے اپنے مشاغل نشاط میں لگ گئیں، تو اس نے ایک ہاتھ سے اپنی دکھتی ہوئی پیشانی کو پکڑتے ہوئے دوسرے ہاتھ کے اشارہ سے سب کو منع کر دیا۔ اور آواز کو ایسے حزن وملال کے ساتھ جیسے بانسری کا کوئی درد بھرا سُر ہو، اس نے حکم دیا کہ "نسرین" کو بلایا جائے۔

ملکۂ ناہید تمام آسمانی مخلوق میں وہی حیثیت رکھتی تھی۔ جو جواہرات میں الماس اور پھولوں میں گلاب کو حاصل ہے۔ اس کا حسن وجمال، اس کی رعنائی اور سب سے زیادہ اس کی نزاکت وخوش ادائی ایک ایسی حقیقت تھی کہ آفتاب کے طلوع سے تو کسی وقت انکار ممکن بھی ہے۔ لیکن اس کے وجود سے انکار محال تھا۔ جب کبھی وہ صبحخانہ باغ کی روشوں پر ٹہلتی ہوتی اور آفتاب طلوع ہوتا تو یہ تمیز کرنا دشوار ہو جاتا کہ آیا آفتاب اس پر طلوع ہوا ہے یا یہ آفتاب پر اور سورج کی کرنیں، اس کے چہرہ کو منور کر رہی ہیں یا اس کے جسم کی شعاعیں آفتاب کو۔ مشہور تھا کہ کوئی متنفس ملکۂ ناہید کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اور اگر کسی نے دیکھ لیا تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس بجلی کی پھانس اس کے دل سے بہ آسانی نکل گئی ہو۔ اس کا رنگ جسم یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ نسترن زار فردوس کی صباحت میں ہلکا سا رنگ شفق ملا کر بلوری جلد کے نیچے دوڑا دیا ہے۔ آنکھوں کے سکر وخمار کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کبھی کوئی پوری نگاہ کسی پر ڈال دی تو یہ معلوم ہوا کہ کوئی سیلاب ہے، جو "ابدیت" کی طرف بہائے لئے جا رہا ہے ——

شبنمستان کی سلطنت میں جو تمام اطراف وجوانب میں اپنی تازگی وشگفتگی کی وجہ سے بہت مشہور تھی۔ عرصہ سے نسائی حکومت واقتدار قائم تھا۔ لیکن جو پیچیدگی ملکۂ ناہید کی تخت نشینی کے بعد پیدا ہوئی وہ کبھی رونما نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ اس سے قبل کوئی ملکہ ایسی نہ تھی جو شادی سے قبل تخت نشین ہوئی ہو۔ اور اس کی شادی کا مسئلہ ملکی مسئلہ قرار پایا ہو ——

ملکۂ ناہید کی ماں اس میں شک نہیں کہ عمر طبعی پوری کرنے سے قبل ہی مر گئی، اور وہ اپنی بیٹی کے لئے کسی شوہر کا انتخاب نہ کر سکی، لیکن اس میں کچھ ضد ملکۂ ناہید کی بھی شامل تھی۔ جو کسی طرح اپنے آپ کو دوسرے کے قبضہ واقتدار میں دینا پسند نہ کرتی تھی۔ اس لئے وہ ماں کے انتقال کے بعد حسب دستور سلطنت ناہید کی تخت نشین تو ہو گئی لیکن امراء واکابر سلطنت کے سامنے ایک بڑا اہم سوال یہ آ گیا کہ نظم حکومت میں کسی مردانہ دل ودماغ کو شریک کرنے کی طرف کیونکر ملکۂ ناہید کو مائل کیا جائے۔

ملکۂ ناہید سیاہ کتاں کی باریک چادر میں جو ایک طرف شانہ سے ڈھلک کر کہنی تک پہونچی ہوئی تھی، اور دوسری طرف ہر جنبش قدم کے ساتھ ساتھ زمین پر لوٹتی تھی، نہایت افسردگی کے عالم میں آہستہ آہستہ ٹہل رہی تھی - وہ کسی فکر میں مبتلا تھی، اس کے چہرہ سے حقارت آمیز غصہ کے آثار بھی پیدا تھے، پیشانی پر بار بار لٹک پڑنے والی زلفوں کو جس وقت وہ ہاتھ سے اوپر کرتی تھی، تو اس میں بھی برہمی ملی ہوئی نظر آتی تھی، ابروئیں کچھ اس طرح تن رہی تھیں۔ گویا غیر معمولی قوت کے ساتھ کمانوں کو کھینچا جارہا ہے - اور پیشانی کی ہلکی ہلکی شکنیں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے بہال کا کافور سمٹ کر . . ایک جگہ جم آگیا ہے - اور اس میں پسینے کے قطرے گویا ہیرے ہیں جو بے ترتیبی سے ادھر اُدھر جڑ دئے گئے ہیں - اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں پر پڑی رہنے والی سیاہ لانبی پلکیں جو مشکل ہی سے کبھی پتلیوں کو پورا نظر آنے دیتی تھیں، اس وقت اور زیادہ مضمحل ہو کر اس طرح نیچے کی طرف مائل تھیں، گویا کسی طائر نے تھک کر اپنے بازو لٹکا دئے ہوں - اس کے پھڑکتے رہنے والے باریک نتھنوں کی نازک رگیں اس وقت سُرخ ہو کر ایسی نظر آرہی ہیں جیسے بلور میں کسی نے عقیق کے ریشے دوڑا دئیے ہوں ——

"نسرین" جو تعلقات قلبی کے لحاظ سے ایک طرف ملکۂ ناہید کی نہایت ہی راز دار، بے تکلف اور قابل اعتماد سہیلی تھی، اور خدمات سلطنت کی حیثیت سے دوسری طرف ایسی کاتب خصوصی کہ جس کی وساطت بغیر محکمۂ وزارت کا بھی کوئی کاغذ پیش نہ ہوسکتا تھا۔ سامنے کا زرلفتی پردہ ہٹا کر دروازہ میں آکر اس طرح ٹھہری - گویا کہ وہ خود کوئی زرکار پردہ ہے - اس نے تھوڑی دیر وہیں کھڑے کھڑے ملکۂ ناہید کی حالت کا اندازہ کیا - اور پھر تیزی لیکن پوری احتیاط ادب کے ساتھ آگے بڑھی - اور ملکہ کے سامنے جُھک کر مُسکراتے ہوئے عرض کیا کہ " ملکۂ عالم" اُس دن کا واقعہ آپ کو یاد ہے جب منصور کے کاغذات حضور میں پیش کئے گئے تھے - اور آپ کو معلوم ہے - کہ خود کشی کرتے وقت اس نے کیا کہا تھا" ملکہ نے کہا "مجھے نہیں معلوم، بتا اس نے کیا کہا تھا۔ نسرین بولی "اس کے آخری الفاظ جو سمع مبارک تک نہیں پہونچ سکے یہ تھے کہ " اے ملکۂ جاں ایک بار تجھے اس عالم میں دیکھنے کے بعد کس کافر کو پھر زندہ رہنے کی تمنا ہوسکتی ہے، تجھ سے محبت کرنے کے جُرم میں، جلاد کے تیشہ سے تیری غیبت میں ہلاک ہونا اگر ناکامیٔ عشق کی انتہا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ تیری برہمی کو آسودہ کرنے کے لئے تیرے ہی حضور میں خود اپنے ہاتھ سے جان دیدینا۔ محبت کی کامیابی نہ سمجھی جائے" اسی لئے میں کہتی ہوں - کہ اے ملکۂ عالم خدا کے لئے . . . . . آپ کبھی برہم نہ ہوا کریں - کہ پھر . . . . . کوئی انسان عقل و دماغ کے توازن کو قائم نہیں رکھ سکتا - خوف و اندیشہ سے نہیں بلکہ جذبۂ ایثار و محبت سے - دنیا اگر آپ سے محبت کرلی ہے تو کرنے دیجئے۔ آپ اس کے مٹانے کے پیچھے کیوں پڑی ہیں - آپ کہاں تک اُس آفت کا مقابلہ کریں گی - جو قدرت نے آپ کے سراپا میں ودیعت کر کے اس وقت تمام شبنمستان پر نازل کی ہے - مرد کے نام سے آپ کو جتنی نفرت ہوتی جاتی ہے، مرد اتنا ہی زیادہ آپ پر مائل ہورہا ہے - اور محبت سے آپ جسقدر بیزار ہوتی جارہی ہیں اتنی ہی شدت

سے یہ چیز آپ کے سامنے پیش ہو رہی ہے - پھر نہ آپ کو اس کا خیال کہ مقررہ آئین سلطنت کے لحاظ سے ایک مردانہ دماغ کی شرکت آپ کے ساتھ کس قدر ضروری ہے - نہ اس کا اندیشہ کہ یہ جو آپ کو دیکھ کر ہر شخص دیوانہ سا ہو جاتا ہے - اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے - اب رہا یہ کہ جب کائنات کی ہر چیز دو مل کر ایک ہو جانے کیلئے بیتاب ہے تو آپ میں کیوں یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی - سو اس کے متعلق میں کیا عرض کر سکتی ہوں - خدا ہی اس کو بہتر جانتا ہے کہ یہ صرف آپ کے ضبط کی انتہا ہے یا کچھ اور . . . ."

ملکۂ ناہید نے جو ہمیشہ نسرین کی اس قسم کی گفتگو سے بہت لطف لیا کرتی تھی - مسکرا کر نسرین کا ہاتھ پکڑا - اور بولی "سچ بتا کیا واقعی تجھے یقین ہے کہ اس وقت کی تیری گفتگو سے میرے اندر مرد کی جنس کا کوئی خیال عزت پیدا ہوا ہو گا - اے میری حسین ناصح، میں نے تجھے اس وقت دفتر وعظ و پند کھولنے کے لئے نہیں بلایا تھا، بلکہ ایک نہایت اہم امر میں مشورہ کرنے کے لئے، جس نے مجھے کل صبح سے بیتاب بنا رکھا ہے - پرسوں رات کو میں نے ایک خواب دیکھا ہے - اور مجھ پر اس کا اتنا گہرا اثر ہوا ہے - کہ یا تو اپنے ملک سے چُن کر ایک ایک مرد کو باہر نکال دوں یا خود میں اس سرزمین سے نکل کر باہر رہوں جبتک ایک مرد بھی یہاں سانس لینے والا باقی ہے "

نسرین - "ملکۂ عالم، آپ کے دشمن اس ملک کو چھوڑیں جس پر حکومت کرنا آپ کا فطری و موروثی حق ہے، یہ کمبخت مرد ہی نہ نکل جائیں، جنھوں نے اپنی انتہائی بدقسمتی سے آپ کو اپنی طرف سے اس قدر بیزار کر دیا ہے - مگر میں سنوں تو سہی کہ وہ کیا خواب ہے " یہ کہہ کر "نسرین" نے اپنی چادر سے ایک شیشہ نکالا - اور اس کے اندر سے سنہرے رنگ کی ایک سیّال شے جام بلوریں میں بھر کے ملکہ کے سامنے پیش کی ——————

ملکۂ ناہید - یہ کیا ہے - کیا کوئی نئے قسم کا افشردۂ انگور ہے - مگر اس میں تو یہ رنگ پیدا نہیں ہو سکتا - ؟

نسرین :- "ملکۂ عالم، یہ ایک خاص قسم کا شربت ہے - جس کے مزہ میں ہلکی سی تلخی لیکن کیفیت و اثر میں بڑی شیرینی ہے - میں نے نہایت محنت سے اس کو "ملکۂ عالم" کے لئے تیار کیا ہے - اور میں چاہتی ہوں - کہ آپ اس کو چکھیں تاکہ یہ اضمحلال و افسردگی دور ہو "

اس وقت تک ملکۂ ناہید نے کبھی شراب نہیں پی تھی - اور نہ شبستان والے اس چیز سے واقف تھے، لیکن جب وزراء نے دیکھا کہ ملکۂ ناہید کے جذبات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی تو اُنھوں نے ملک کے اطباء و حکماء سے مشورہ کیا - اور اُنھوں نے بہت غور کے بعد کہا کہ ایک تدبیر جذبات میں ہیجان پیدا کرنے کی یہ بھی ہے کہ ملکہ کو شراب کا استعمال کرایا جائے، چنانچہ مہینوں کی محنت سے اس کو تیار کیا گیا - اور نسرین سے کہا گیا کہ وہ ملکہ کے سامنے پیش کرے -

(باقی)

نیاز

بابُ الاستفسار

ترکی زبان

(جناب احمد کریم صاحب - مزگاؤں بمبئی)

میں نے بعض احباب سے سُنا ہے کہ ترکی زبان بہت لطیف ہے، چنانچہ سجاد حیدر صاحب یلدرم نے جو ترجمے اس زبان سے کئے ہیں اور آپ نے ایک آدھ بار "نگار" کے ابتدائی زمانے جو نمونے اس زبان کی لطافت کے پیش کئے تھے۔ اُن سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ میں عرصہ سے خواہشمند ہوں کہ یہ زبان حاصل کروں لیکن یہاں اس وقت تک کوئی شخص ایسا نہیں مل سکا جس سے سیکھ سکتا۔ کیا آپ مطلع فرماسکتے ہیں کہ اس زبان کے وہ کیا خصوصیات ہیں جنھوں نے اس کو اسقدر لطیف بنادیا ہے۔ اور اس کے حاصل کرنے کی کیا تدبیر ہے۔"

(نگار) میں اس زبان کا ماہر نہیں کہ کوئی ماہرانہ جواب دے سکوں۔ البتہ ایک ناقص و ناکمل حد تک میں نے اسے ضرور حاصل کیا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ میرا جواب ویسا ہی ہوگا۔

ترکی انشاء کی تین قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جس کا تعلق بالکل عامیانہ و بازاری گفتگو سے ہے، دوسری علمی و مذہبی کتابوں کی انشا اور تیسری وہ جو بلند شاعرانہ خیالات کی حامل ہوتی ہے۔ اور جسے وہ اپنی اصطلاح میں "انشاء عالیہ" کہتے ہیں۔

قسم اوّل سے بحث کرنا بیکار ہے، کیونکہ اس کا علم وہیں جاکر ہو سکتا ہے۔ اور نہ غیر ملک والا اس [illegible] ذخیرہ علم و ادب کا پا سکتا ہے، دوسری قسم کی انشا میں کوئی خاص بات قابل لحاظ نہیں سوائے اس کے کہ ایک تقریباً ۵۰ فی صدی الفاظ عربی و فارسی کے استعمال ہوتے ہیں، البتہ جہاں تک مصادر و افعال کا سوال ہے وہ اکثر و بیشتر خالص ترکی زبان کے پائے جاتے ہیں۔

ترکی زبان کا لٹریچر جس چیز کو کہتے ہیں۔ وہ حقیقتاً اس کی تیسری قسم " انشاء عالیہ " کی ہے۔ اور اس میں کلام نہیں کہ وہ خیال کی نزاکت، مفہوم کی لطافت، شاعرانہ بلندی، اسلوب ادا، ندرت بیان اور پاکیزگی ذوق کا ایسا نمونہ پیش کرتی ہے۔ کہ مشکل ہی سے کسی دوسری زبان میں اس کی نظیر مل سکتی ہے۔ چونکہ ترکی سلطنت کی تاریخ اس کا ماحول اور اس کا جغرافیہ ایک زمانہ تک عرب، فارس اور سرزمین یوروپ سے بیک وقت متعلق رہا ہے، اور ان تمام قطعات زمین کی تہذیب و شائستگی سے اس کو متاثر ہونا ضروری تھا۔ اس لئے اگر ان کے لٹریچر میں عربی کا جوش، فارسی کی نزاکت خیال اور فرانسیسی زبان کی شیرینی و لطافت پائی جاتی ہے تو حیرت نہ کرنا چاہیے۔ پھر اسی کے ساتھ آپ خود ترکی قوم کی ذہانت، قومی احساس، جذبات حریت اور ذوق جمالیات کے نشو و نما کی اہلیت کو بھی ملا لیجئے۔ اور غور کیجئے کہ جب یہ تمام باتیں کسی قوم میں مجتمع ہو جائیں گی تو اُن کے لٹریچر کا کیا رنگ ہوگا۔ اور وہ کون سی خوبی ہے جو اُن کی انشاء میں نہ پائی جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ ترکی قوم، معاشرت و تمدن کے لحاظ سے نہایت ہی خود دار۔ اور مہذب و شائستہ ہے۔ (گو علوم و فنون کے لحاظ سے ترقی یافتہ نہ ہو) اس کا ثبوت آپ کو ان کے لٹریچر سے بہ آسانی مل سکتا ہے۔

چونکہ خود داری و غیرت ان کے خمیر میں داخل ہے اس لئے جب وہ دوسرے سے خطاب کرتے ہیں تو ہمیشہ اس کی عزت کا پورا لحاظ کرتے ہیں۔ تاکہ وہ بھی اسی احساس کے ساتھ کلام کرے۔ چنانچہ دو بے تکلف دوست بھی جب باہم گفتگو کریں گے تو یہی معلوم ہوگا کہ وہ حد درجہ تصنّع سے کام لے رہے ہیں، حالانکہ وہ تصنّع نہیں ہے۔ بلکہ اُن کی زبان کی تہذیب میں داخل ہے۔

وہ کبھی ایک دوسرے کی مزاج پرسی اس سادگی سے نہیں کریں گے کہ " آپ کیسے ہیں،، یا " آپ کا مزاج کیسا ہے،، بلکہ وہ یہ کہیں گے۔ " مزاج عالیلرنگز نصلدر،، یعنی لفظ مزاج کے ساتھ صرف لفظ عالی کی نسبت کافی نہیں سمجھی گئی۔ بلکہ اس میں بھی علامت جمع لر کا اضافہ کر کے گویا یہ مفہوم پیدا کر دیا کہ " آپ کا مزاج گرامی جو اپنے بلند و عالی ہونے کے لئے بہت سے اسباب رکھتا ہے کیسا ہے،،

وہ انگریزوں کی طرح صرف " گوڈ مارننگ یا گوڈ ایوننگ،، پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ اس کو بہت بڑھا کر حد درجہ عزت و احترام کا مفہوم لئے ہوئے یوں کہتے ہیں:-

صباح شریفلر خیر لر اولسون - یا - آقشام شریفلر خیر لر اولسون

صباح یا آقشام (شام) کی ایک صفت شریف قرار دی اور پھر اس میں اور خیر دونوں میں علامت جمع لر بڑھا کر یہ معنی پیدا کئے کہ " جناب کی صبح یا شام جو نہایت موزوں ہے، خدا کرے بہت سی برکات اپنے ساتھ لائے "۔

یہاں ہندوستان میں قاعدہ ہے کہ جب اپنے کسی بے تکلف دوست کی بیوی کا حال دریافت کرتے ہیں۔ تو پوچھتے ہیں "گھر میں کیا حال ہے، بیگم کا مزاج کیسا ہے" اور حد درجہ بے تکلفی میں یہ بھی کہتے ہیں کہ "بھابھی جان کیسی ہیں"

ترکوں میں جب کسی کی بیوی کا حال دریافت کریں گے تو ہمیشہ یوں کہیں گے کہ " ہمشیرہ نصلدر" (ہماری بہن کیسی ہیں) ۔ ظاہر ہے کہ بھابھی (یعنی بھائی کی بیوی) کہنے اور بہن قرار دینے میں کسقدر تفاوت ہے۔ اور ان دونوں سے علیحدہ علیحدہ جن جذبات کا پتہ چلتا ہے، وہ باہمدگر کسقدر مختلف ہیں۔

مزاج پرسی کے جواب میں وہاں صرف "شکریہ" کہہ کر نہیں ٹال دیتے۔ بلکہ اس کا اظہار اس اہتمام سے کرتے ہیں کہ:۔ "حسن توجہکنزہ تشکر ایدرم افندم" (اے میرے سردار میں آپ کے حسن توجہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں)

کیسا ہی بے تکلف دوست اُن کے پاس آئے لیکن وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور اگر دن میں سو دفعہ آئیگا تو سو بار اس کا خیر مقدم ان الفاظ سے کریں گے۔ "خوش گلدیکز۔ صفا گلدیکز آفندم" یعنی آپ خوب آئے اور میرے لئے مسرت و پاکیزگی لے کر آئے"۔

الغرض ترکوں کی معاشرت و معیشت اور تہذیب و شائستگی کی جان ان کی فطری خودداری ہے جو اُن کے لٹریچر سے بھی ہر جگہ ظاہر ہوتی ہے۔ اور جس سے اس امر کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جو قوم روز کی معمولی باتوں میں اسقدر رکھ رکھاؤ کی پابند ہوگی۔ وہ جذبات محبت یا دنیائے حسن و عشق میں کتنی بلندی خیال کا اظہار کرتی ہوگی۔ یہی سبب ہے کہ ان کی انشاء عالیہ بہت دقیق ہوتی ہے۔ اور تخیل کی نزاکت سے جو پیچیدگی عبارت میں پیدا ہونا چاہیئے وہ ان کے یہاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ ان کی زبان میں "تعلیقات" کا اتنا زبردست سلسلہ ہوتا ہے۔ کہ بعض بعض جملے آٹھ آٹھ، دس دس سطر میں بھی ختم نہیں ہوتے، اور بسا اوقات یہ معلوم کرنا دشوار ہوتا ہے کہ فلاں فقرہ کس فقرہ سے متعلق ہے۔ اور فلاں لفظ کو کس لفظ سے رابطہ ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ چونکہ وہ اپنے بلند اور پھیلے ہوئے خیالات کو مختصر الفاظ میں ظاہر کرنا چاہتے ہیں اسلئے ان کو خاص خاص ترکیبیں استعمال کرنی پڑتی ہیں اور اسی لحاظ سے ان کی گرامر (صرف و نحو) میں بھی بہت وسعت پائی جاتی ہے۔ میں ان کی زبان کے اختصار اور اسی کے ساتھ اس کی وسعت کی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

تمام دنیا کی زبانوں میں جب کسی فعل لازم یا متعدی کا تعدیہ کیا جاتا ہے تو اس کا درجہ ایک تعدیہ سے آگے نہیں بڑھتا۔ مثلاً لکھنا کہ اس کا تعدیہ لکھانا یا لکھوانا ہوگا۔ اور اس کے آگے پھر کوئی تعدیہ مزید نہ ہوگا۔ لیکن ترکی زبان

میں تین تین بار تعدیہ ہوتا ہے۔ مثلاً

"بیلمک" جاننا کے معنے میں آتا ہے اس کا ایک تعدیہ کر کے وہ "بیلدیرمک" (علم کرانا یا بتانا) کہیں گے لیکن جب کسی اور شخص کے ذریعہ سے دوسرے کو کسی بات کا علم کرائیں گے تو "بیلدیرتمک" کہیں گے۔ اور جب دو واسطوں سے علم کرائیں گے تو "بیلدیرتدیرمک" کہیں گے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کسی زبان میں وسعتِ مفہوم کا اسقدر خیال صرف ونحو میں کیا جاتا ہو ۔۔۔۔۔۔۔۔ دوسری مثال ملاحظہ کیجئے۔

ہم جب کسی شخص کے آنے کی خبر دیتے ہیں تو کہتے ہیں "وہ آیا"۔ اس کو ترکی میں کہیں گے "گلدی"۔ لیکن اگر "آنے" کا حال کسی اور ذریعہ سے معلوم ہوا ہے تو پھر وہ بجائے گلدی کے "گلمش" کہیں گے۔ جس کے معنی یہ ہوں گے کہ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ آیا"۔ اسی لئے ان کے یہاں ماضی کی ایک نئی صورت پیدا ہو گئی ہے جسے وہ ماضی نقلی کہتے ہیں۔ اور اس سے بہت سے مشتقات پیدا کرتے ہیں۔ یہ بات آپ شاید کسی زبان کی صرف ونحو میں نہ پائیں گے۔

الغرض اسی طرح کی اور بہت سی خصوصیات اس زبان کی ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑے مفہوم کو وہ کسقدر مختصر طور پر ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی گرامر (صرف ونحو) بہت کچھ اردو سے ملتی جلتی ہے۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مستثنیات بہت کم ہیں۔ اس سے زیادہ تفصیل سے لکھنا بیکار ہے۔ کیونکہ جب تک کسی کو ان کا علم نہ ہو یا کوئی سیکھنا نہ چاہے مشکل سے بتایا جا سکتا ہے۔

اس زبان میں علاوہ مشتقات کے ایک بڑا ذخیرہ حماسیات (قومی شاعری) کا بھی ہے، جو شروع ہی سے بچوں کو سکھایا جاتا ہے۔ چنانچہ وہاں کی ریڈروں کی حکایتیں، نظمیں وغیرہ سب اسی جذبہ سے لبریز نظر آتی ہیں۔ اور اسی حریت خیال کا نتیجہ ہے کہ آج ترکی پھر باوقار آزادانہ زندگی بسر کر رہا ہے۔

اس وقت مجھے ایک نظم کے کچھ اشعار یاد آگئے جو وہاں کی کسی ریڈر میں میری نگاہ سے گزرے تھے۔ اس نظم کا عنوان "کوچوک عسکر" (ننھا سپاہی) ہے۔ جذبات ملاحظہ ہوں:-

کوچوک عسکر سلاح الدہ	ننھا سپاہی ہاتھوں میں اسلحہ لئے ہوئے
قہرمانجہ ایلرلہ یور	ایک ہیرو کی طرح آگے بڑھتا جا رہا ہے۔
قارشیسندہ بوتون بلدہ	سارا شہر اس کے آگے آگے یہ نعرہ لگا رہا ہے کہ
"قہرمانم یاشا" دیور	"ہمارا ہیرو خدا کرے زندہ رہے"
کوچوک عسکر، کوچوک عسکر	اے ننھے سپاہی
وطن سندن خدمت استیر	وطن تجھ سے خدمت کا طلبگار ہے

مینی مینی اوموز لرک — یہ تیرے ننھے ننھے بازو
طاشیہ جق یارین توفک — کل بندوق اٹھائیں گے
توفک دگل وطن یارین — لیکن یہ بندوق نہ ہوگی بلکہ وطن ہوگا
اوادموزہ یوکلنہ جاک — جسے تو اپنے شانوں پر اٹھائے ہوئے ہوگا
کوچوک عسکر کوچوک عسکر — اے ننھے سپاہی
وطن سندن غیرت الیستر — وطن تجھ سے غیرت کا طلبگار ہے۔

اسی طرح کی ایک اور نظم "ترکی جھنڈے" کو مخاطب کرکے لکھی گئی ہے۔ جس کا عنوان "عثمانلی بیراغی" ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے:-

ارطغرلک اجاغندہ اویاندک
شہید لرک قانلرایلہ بویاندک
نیجہ دشمن قلعہ سنہ اوزاندک
سنسز توتماز عثمانلی اجاغی

(تونے خاندان ارطغرل میں آنکھ کھولی، خون شہداء سے اپنے آپ کو رنگ کر کیسے کیسے دشمنوں کے قلعوں پر تو لہرایا — (حقیقت یہ ہے کہ) تو نہ ہو تو کسی ترکی گھرانے کا چولھا روشن ہو ہی نہیں سکتا۔)

ترکی نظموں میں اب سے قبل اُسی عروض کی پابندی کی جاتی تھی، جو فارسی میں رائج ہے۔ لیکن اب کچھ زمانہ سے جدید عروض پیدا ہوئی ہے جسے "عروض ملی" کہتے ہیں اور جو بالکل انگریزی نظموں کی طرح الفاظ کے ٹکڑوں (Syllables) کے وزن پر قائم کیجاتی ہے۔ چنانچہ یہ دونوں نظمیں جو اوپر لکھی گئی ہیں، "عروض ملی" میں ہیں۔

میں نے ایک نہایت بسیط کتاب ترکی صرف ونحو پر مرتب کی ہے، لیکن اس کو اس لئے شائع نہیں کرسکا کہ لوگوں میں اس زبان کے مطالعہ کا شوق بہت کم ہے، بہرحال اگر آپ واقعی اس زبان کے سیکھنے پر مُصر ہیں تو میں مختلف اسباق کے ذریعہ سے آپ کو کم ازکم اس کے صرف و نحو پر ضرور عبور کرا سکتا ہوں اب رہا زبان کا آنا سو اس کو آپ کتابیں اور اخبارات دیکھ کر لغت کی مدد سے حاصل کرسکتے ہیں۔ اصل چیز اس کا صرف ونحو جاننا ہے اور اس کے بتانے کی ذمہ داری بیشک میں اپنے سر لے سکتا ہوں۔

نیاز

عورت کی آزادی کی انتہا غلامی ہے

اس وقت متمدن دنیا میں ترقی کی جو صورتیں پیدا ہو رہی ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں اور خصوصیت کے ساتھ عورتوں نے جس بے جگری و عزم مردانہ کے ساتھ زندگی کے ہر شعبہ میں اقدام شروع کیا ہے اس پر تو آج ہر شخص کی نگاہیں پڑ رہی ہیں لیکن غور طلب یہ ہے کہ کیا عورت اپنی آزادی کی آخری منزل کو حاصل کر چکی ہے، اگر نہیں تو وہ منزل کیا ہے اور پھر یہ کہ اس منتہا تک پہونچنے کے بعد وہ اپنی موجودہ آزادی و ترقی پر اظہار ندامت و افسوس تو نہ کریگی؟

عورت کی آزادی کی تاریخ اب سے ایک صدی قبل شروع ہوتی ہے جب اس نے سب سے پہلے اپنے لئے حق انتخاب مردوں سے طلب کیا، چنانچہ وہ نہ اس مطالبہ میں کامیاب ہوئی اور مردوں کے ساتھ تمام حقوق میں اس کو مساوی سمجھ کر پارلمنٹ کے انتخاب میں، مجالس بلدیہ میں، عدالت گاہوں میں بھی جگہیں دی گئیں۔ یہ تو خیر زندگی کے وہ شعبے تھے جنکا تعلق تمدن کے امن و سکون سے ہے، لیکن عورت جو آزادی کی لذت سے آشنا ہو چکی تھی اس پر قناعت نہ کر سکتی تھی، اس نے حریصانہ ایک قدم اور بڑھایا اور اس نے اُن اعمال حیات پر بھی قبضہ کرنا چاہا جو مردوں ہی کے لئے زیادہ موزوں تھی یعنی فوج و پولیس کی ملازمت، دفاتر و صیدلیات کا تعلق، عسکری ریاضتیں، شمشیر زنی، نیزہ بازی، جہاز رانی، طیران ہوائی، شہسواری، الغرض وہ کونسی محنت و مشقت ایسی ہے جو عورت کے نرم ہاتھوں اور نازک اعضا نے برداشت نہیں کی صرف اس دُھن میں کہ وہ مردوں سے پیچھے نہ رہے، صرف اس نشۂ آزادی میں کہ کیوں اسے دوسری مقابل جنس سے ضعیف و کمزور سمجھا جائے۔

جہاں تک نیت کا سوال ہے، کون ہے جو عورت کی اس جد و جہد پر نکتہ چینی کرے گا، لیکن گفتگو اس میں ہے کہ آزادی کے لئے عورت کی یہ بڑھی ہوئی خواہش کہیں اُسے پھر تو غلام بنا دینے والی نہیں ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ عورت یقیناً اپنے ان جذبات کے ماتحت رجعت قہقری کر رہی ہے اور اس کی موجودہ آزادی ایک ایسی زنجیر تیار کر رہی ہے جس سے خود اس کے ہاتھ پاؤں جکڑے چلے جا رہے ہیں۔ اس کا فیصلہ کرنے کے لئے آئیے پہلے عورت کے اس عہد پر غور کیجئے جسے عہد تاریک سے تعبیر کرتے ہیں

اُس وقت عورت کی کیفیت یہ تھی کہ سوائے صید و جنگ کے کوئی کام ایسا نہ تھا جو عورت کے سپرد نہ ہو۔ مرد

اور خاندان کی خدمت کا تمامتر بار اسی پر تھا، وہی زراعت کرتی تھی، وہی کھیتیاں کاٹتی تھی، وہی مکان بناتی تھی، وہی کنوؤں سے پانی کھینچتی تھی اور وہی باربرداری کی خدمت انجام دیتی تھی، یہانتک کہ اگر ہم چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ روئے زمین پر خچروں اونٹوں، ہاتھیوں کی باربردارانہ قطار میں تاریخ سب سے پہلے جس بارکش جانور کا پتہ دیتی ہے وہ عورت ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ پہلے کشتی بنانے والے اپنی کشتی کے سرے پر ہمیشہ عورت ہی کی صورت بنایا کرتے تھے اور آج بھی باربرداری کے سب سے بڑے ذرائع جہاز اور ریل کے الفاظ یورپ کی زبانوں میں مونث ہی استعمال ہوتے ہیں۔

پھر دیکھو کہ خود یورپ میں جہاں ہر عورت کو کسی وقت مریم کی سی عزت دی جاتی تھی، آج اس کی حالت کیا ہے۔ کیا وہ حقیقتاً اب بھی باربرداری کی خدمت انجام نہیں دیتی جو کسی وقت قرون مظلمہ میں اس کے سپرد تھی۔ اگر اس میں کسی کو گفتگو ہو تو وہ یورپ کے کسی شہر میں چلا جائے اور سڑک پر کھڑے ہو کر دیکھے کہ عورت کس حال میں اس کے سامنے سے گزرتی ہے

تم دیکھو گے کہ ایک تسمہ کے ذریعہ سے بہت بڑا مخروطی شکل کا ٹوکرا اس کی پشت سے بندھا ہوا ہے جس میں غلہ، روٹی، برتن، پانی سے بھرا ہوا ظرف اور خدا جانے کیا کیا وزن رکھا ہوا ہے جسے عورت اپنی نازک پیٹھ پر لادے ہوئے سر کے سہارے سے سنبھالے ہوئے چلی جا رہی ہے، کہیں اگر تم یہ بار پشت پر نہ دیکھو گے تو پہلو میں دیکھو گے اس حال میں کہ ایک کاندھے پر اس کا بچہ بیٹھا ہوا ہے اور دوسری طرف لکڑی کا بوجھ بندھا ہے —— پھر یہی نہیں کہ عورت سے صرف باربرداری کا کام لیا جاتا ہو بلکہ وہ اور بھی بہت سے جفاکشانہ کام انجام دیتی ہے، چنانچہ افریقہ میں وہ زمین جوتتی ہے، مویشی چراتی ہے، بازار کا کام کرتی ہے اور مکان بناتی ہے۔ امریکہ کی قدیم ہنود آبادی کا بھی یہی عالم ہے کہ جب یہاں کوئی جانور شکار کیا جاتا ہے تو عورت اس کا گوشت پوست اپنی پیٹھ پر لاد کرلے جاتی ہے، کھال کی دباغت کرتی ہے اور گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ان کو خشک کرتی ہے درختوں کا کاٹنا، ایندھن جمع کرنا، نہروں اور کنوؤں سے پانی لانا، آگ روشن کرنا، کھانا پکانا، گھر کے تمام فرائض انجام دینا، مردوں بچوں کے لئے کپڑے سینا بھی اسی کے سپرد ہے۔ اور جب مکان بدلا جاتا ہے تو وہی اسباب باندھتی ہے، اور اپنی پیٹھ پر لاد لاد کر دوسری جگہ پہونچاتی ہے درانحالیکہ اس وقت مرد کی پشت پر سوائے ایک ہلکی بندوق کے اور کوئی بوجھ نہیں ہوتا۔ اگر دریا کا سفر ہوتا ہے تو مرد ایک چھوٹی کشتی پر بیٹھ کر روانہ ہو جاتا ہے اور عورت بڑی کشتی پر تمام سامان لاد کر اسے اپنے عرق پیشانی کے ساتھ کھینچ کر منزل تک پہونچاتی ہے۔ اٹھارہویں صدی کے اخیر میں جب سموئیل ہیرن نے شمالی کناڈا کی سیاحت کی اور بہت سی مشکلات سے سامنا پڑا تو اس نے کہا کہ یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ ہمارے قافلہ کے ساتھ کوئی عورت نہ تھی کیونکہ مرد کے لئے ان تمام باربرداریوں کے بعد شکار اور قطع مسافت بہت دشوار ہے۔ اس نے یہ بھی ظاہر کیا کہ عورت فطرت کی طرف سے بہت ہی متحمل و جفاکش واقع ہوئی ہے اور جتنا بوجھ دو مردوں سے نہیں اٹھ سکتا اُسے وہ تنہا لے جاتی ہے۔ الغرض عورت کی زندگی عہد تاریک میں بالکل یہی تھی جو بیان

کی گئی اور جس کی یادگاریں اب بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہیں۔

جنگ عظیم سے قبل یورپ کی عورت تمام اعمال شاقہ کی طرف سے مطمئن تھی، نہ وہ بوجھ اٹھاتی تھی، نہ محنت و جفاکشی کی خدمات اس سے لیجاتی تھیں، اور اس قسم کے قوانین وضع ہو گئے تھے کہ ان سے شدید محنت کے کام نہ لئے جائیں گویا تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ مرد نے اس کی نازک ساخت کا لحاظ کر کے اس کی رعایت ملحوظ رکھی۔ لیکن جب جنگ شروع ہوئی اور ضرورت نے مجبور کیا کہ عورتیں ان مردوں کی جگہ لیں جو میدان قتال کو گئے تھے تو پھر حالت بدلی اور یہ عورتیں۔۔ تمام مشاغل حیات میں اپنی پہلی جفاکشی کے ساتھ کام کرتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ موٹر اور ٹرام وہ چلانے لگیں، دفاتر میں وہ ملازم ہوئیں، دوکانوں اور کارخانوں میں انھوں نے ملازمتیں اختیار کیں اور ایسے ایسے کام شروع کئے جو حد درجہ محنت چاہتے تھے ——— پھر جب جنگ ختم ہوئی تو معلوم ہوا کہ یوروپ میں عورتوں کی تعداد مردوں سے ۱۰ لاکھ زیادہ ہو گئی ہے اس لئے ان کے لئے ضرور ہوا کہ وہ کسب معاش کے سلسلہ کو قائم رکھیں اور چونکہ وہ آزادی کے ذوق سے آشنا ہو چکی تھیں اس لئے پھر انھوں نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ گھروں کے اندر بیٹھ کر چولھا چکی کا کام کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ بیکار مردوں کی جماعت بڑھنے لگی چنانچہ آج انگلستان، جرمن اور امریکہ میں جو بیکار مردوں کی تعداد لاکھوں سے کروروں تک پہونچ گئی ہے اس کا سبب صرف یہی نہیں ہے کہ اُن کی جو جگہیں دوران جنگ میں عورتوں نے لے لی تھیں ان پر وہ ہنوز قابض ہیں اور مردوں کو اجازت نہیں دیتیں کہ اپنی اصل جگہ پر واپس آئیں۔ بلکہ بڑا سبب یہ ہے کہ عورتیں اور بھی تمام مشاغل زندگی میں مردوں کے خدمات کو اپنے سر لیتی چلی جا رہی ہیں اور جہاں تک تکمیل کا تعلق ہے وہ حقیقتاً مردوں سے کسی طرح کم نہیں ہے ——— پھر اس نسائی آزادی کی رو کا جو سب سے زیادہ خراب اثر نظام تمدن پر پڑنے والا ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ فی الحال مردوں کو فرصت مل گئی ہے کہ وہ گھروں میں بیٹھ کر آرام کی زندگی بسر کریں، اس لئے اگر چند دن بعد انھیں پھر میدان عمل میں آنا پڑا تو اُن کے قوا رجواب دے چکے، اور عادی نہ رہنے کی وجہ سے اُن سے کوئی کام نہ ہو سکے گا۔ پھر اگر آج ہی فیصلہ ہو جائے کہ آیندہ سے عورت ہی مردوں کے فرائض انجام دے گی اور مرد، قدیم عورت کی طرح صرف اہلی ذمہ داری اپنے سر لینے پر قناعت کرے گا، تو اس میں شک نہیں کہ مردوں کے لئے اس میں ایک حد تک سہولت ضرور ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کہیں ان جذبات کے ماتحت عورت اپنی۔۔۔ ذمہ داریوں کو اس حد تک تو نہیں بڑھا رہی جب اس آزادی کے شوق میں اُسے آخرکار پھر اپنی خدمات و مشاغل کا غلام ہو جانا پڑے گا اور عہد تاریک سے۔۔۔۔۔ سوائے اِس کے کوئی فرق نہ رہیگا کہ اگر اُس زمانہ میں وہ صرف اپنے شوہر کی بیوی تھی تو اب اُسے ساری دُنیا کی بیوی بننا پڑے گا اور اگر پہلے اس کے پاؤں میں صرف ایک زنجیر تھی تو اب سیکڑوں زنجیریں خود اپنے ہاتھ سے بنا بنا کر اپنے آپ کو مجبور و پابند بنا رہی ہے ؟

لیکن یہ واقعہ ہے کہ اب یہ آزادی کی رَو کسی طرح رُکنے والی نہیں اور زمانہ جو عبارت ہے اس نوع کے مدوجزر سے جب تک ایک بار مرد کو عورت اور عورت کو پوری طرح مرد نہ بنالے گا چین نہیں لینے دیگا

نیاز

چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کیساتھ | مصنفہ حضرت نیاز فتحپوری (اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا کے امن وسکون کا راستہ معلوم کریں تو اس کو ملاحظہ کیجئے)

مادئین کا مذہب | مصنفہ حضرت نیاز (وجود باری کے ثبوت میں بے مثل مضمون)

حرکت کے کرشمے | مصنفہ حضرت نیاز (اگر آپ قدرت کے کرشموں کی تفصیل دیکھنا چاہتے ہیں تو اسے ملاحظہ فرمائیں) تینوں ایک ہی جلد میں ضخامت ۲۰۰ صفحات علیحدہ علیحدہ نہیں ملسکتیں

قیمت معہ محصول عہ

منیجر نگار

فراست الید - مولفہ نیاز فتحپوری جسکے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی غیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے قیمت علاوہ محصول عہ

جذبات بھاشا - جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کیساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے قیمت علاوہ محصول ۱۲/

شاعر کا انجام - جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نغمہ کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں ۱/

نگارستان (دوسرا اڈیشن) حضرت نیاز کے اور متعدد مضامین اور افسانے شامل کئے گئے ہیں نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبولیت حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے قیمت . . . عمار

گہوارۂ تمدن (دوسرا اڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکۃ آرا کتاب جسمیں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیا تہذیب و شائستگی اسکی کسقدر ممنون ہے - اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے قیمت علاوہ محصول . . . عار

شہاب کی سرگذشت حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے - اس زبان کی اسکی تخئیل اسکی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالسحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے قیمت . . . عہ

تذکرۂ خندۂ گل - مولفہ عبدالباری آسی جس میں ۳۰ سے زائد اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع ان کے لطائف و ظرائف و انتخابات کلام کے درج ہیں قیمت معہ محصول عمار

منیجر نگار

جدید جرمنی کی رجعت عہد اسپارٹا کیطرف

بارہ سال قبل جب جرمنی جنگ عظیم کی مصیبت سے آزاد ہوا تو اس کی کیفیت ایک ایسے شکستہ ناخن و فرسودہ بال طایر کی سی تھی جو دست صیاد میں اپنی آخری سانسیں لے رہا ہو۔ اجتماعی نظام برباد تھا، اقتصادی توازن درہم برہم ہوچکا تھا، اندرون ملک کی مختلف الخیال جماعتوں نے عمرانی امن و سکون کو مضطرب کر رکھا تھا، اور کامیاب دشمن اس کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے تقسیم کرنے پر تُلا ہوا تھا۔

اگر یہ حالت کسی اور ملک کی ہوتی تو کیا ہوتا؟ وہ ہاتھ پاؤں ڈال دیتا، آنکھ بند کرکے یاس کے عالم میں ان دشواریوں کے سامنے سر عجز خم کردیتا اور ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے مٹ جاتا۔ لیکن جرمن قوم اس راز سے واقف تھی کہ انسان نام ہے صرف تفاؤل و نشاط کا، امید و توقع کا، سعی و عمل کا اس لئے اس نے نہایت صبر و ثبات سے اس مصیبت کا مقابلہ کیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ افق سے بادل چھٹنے لگے، ملکۂ اقبال و ظفر نے اپنے چہرہ سے نقاب الٹنا شروع کیا اور [illegible] ال کے اندر انسانی جد و جہد کا ایسا عدیم المثال نمونہ اس نے پیش کیا کہ شاید ہی کوئی دوسری نظیر اس کی تاریخ عالم میں پیش کی جاسکے۔ پھر آج کون اس سے بے خبر ہے کہ اس نے تاوان جنگ کس پابندی و فراخدلی سے ادا کیا، ملکی صنعت و تجارت کو کس حد تک فروغ دیا، علوم و فنون کی ترقی میں وہ کہاں سے کہاں پہونچ گیا اور اقتصاد و تمدن کی تمام بازاروں اور منڈیوں پر سایۂ شاہین کی طرح کیونکر چھا کر رہ گیا

وہی جرمنی جس پر بعد از جنگ تمام دول مغرب اس طرح نگاہیں ڈال رہی تھیں گویا وہ کسی کے سکرات کا تماشہ ہے کہ اس کے ختم ہوتے ہی اس کی لاش کو لے جاکر کسی جگہ دفن کردینا ہے، ہاں وہی جرمنی جس کو کرگسان یوروپ نے بوٹیاں نوچ نوچ کر ہڈیوں کے ایک مضمحل ڈھانچہ میں تبدیل کردیا تھا۔ آج پھر وہی عفریت پیکر جرمنی ہے جو اس سے قبل کبھی پایا جاتا تھا، وہی اس کا طنطنہ ہے اور وہی اس کی عظمت و جلال، وہی اس کے عزائم ہیں اور وہی لرزہ براندام کردینے والی اس کی ترقیاں۔ ایشیا حیران ہے کہ یہ کیا معجزہ تھا، یہ کون سی مافوق العادت کرامت تھی، یہ کیا سحر وافسوں تھا، لیکن یوروپ کا ایک ایک فرد واقف ہے کہ یہ معجزہ تھا اس کی پامردی کا، یہ کرامت تھی اس کے عزم و ثبات کی اور یہ سحر وافسوں تھا اس جد و جہد کا جس کو انھوں نے ایشیا سے سیکھا اور پھر ایشیا ہی کے خلاف استعمال کیا اور کر رہے ہیں۔

آئیے آج کی صحبت میں جرمنی کے میدان عمل میں اس ایک منظر پر نگاہ ڈال لیں جس کو خصوصیت کے ساتھ ہم لوگوں

نے نظر انداز کر دیا ہے اور جس کی طرف خود جرمنی کو بھی پہلے کوئی خاص توجہ نہ تھی اور وہ منظر اس کی ریاضت بدنی کا ہے۔ پھر اس سے مقصود اس کا خود اپنی انفرادی صحت نہیں ہے بلکہ یہاں بھی وہی قومیت کا خیال ساتھ ساتھ ہے کہ اس طرح آئندہ نسل صاحب عزم و ارادہ پیدا ہوگی اور ملک پر اگر پھر کوئی مصیبت پڑی تو زیادہ پامردی کے ساتھ اس کا مقابلہ کر سکے گی۔

چنانچہ اس وقت اگر کوئی شخص وہاں جائے تو یہ دیکھ کر وہ حیران رہ جائے گا کہ جسمانی ریاضت و ورزش کی طرف وہاں کے مرد و عورت کس شدت کے ساتھ متوجہ ہوئے ہیں اور اسی کے ساتھ اقتصادی خیال نے انھیں کس قسم کی تہذیب جدید پر مائل کر رکھا ہے۔

اس وقت جرمنی کی اُن خصوصیات ظاہری میں سے جن کو آج بہ اول نظر ہر شخص دیکھ سکتا ہے تین ہیں۔ ایک تو عریانی کا خیال ہے کہ جس قدر کم سے کم کپڑا ممکن ہو استعمال کیا جائے، دوسرے ان کے ورزشی مشاغل ہیں جن میں ہر فرد انتہائی جوش نشاط کے ساتھ منہمک نظر آتا ہے اور تیسرے وہاں کا جدید طرز عمارت ہے جس نے ملک کے ملک کو بالکل نئے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ سچ ہے جنگ صرف جسم انسانی ہی کو ہلاک نہیں کرتی بلکہ وہ قوموں کے ذوق و معاشرت میں بھی عظیم انقلاب برپا کر دیتی ہے، چنانچہ عریانی کا خیال صرف اقتصادی مجبوری ہی کے ماتحت ان میں پیدا ہوا ہے کہ کیوں ضرورت سے زیادہ کپڑا صرف کیا جائے یہاں تک کہ اسی خیال کے ماتحت اب وہ داڑھی کے ساتھ اُسترے سے خود ہی اپنا سر بھی مونڈ لینا پسند کرتے ہیں۔

آج جرمنی کے باغوں، تفرج گاہوں، میدانوں، سڑکوں اور گلیوں میں ہر جگہ تم دیکھو گے کہ لوگ جانگھیا پہنے ہوئے پھر رہے ہیں، دھوپ اور ہوا میں ورزشیں کر رہے ہیں پیراکی کی مشق میں مصروف ہیں اور اس طرح ریاضت بدنی میں مصروف ہیں گویا کہ سب سے بڑا فرض انسانی یہی ہے۔ ایک جماعت وہاں ایسی بھی ہے جو برائے نام ستر پوشی کو بھی پسند نہیں کرتی اور بالکل عریاں رہنا اس کا مسلک ہے۔ چنانچہ اس جماعت کے جوار جرمنی میں بہت سے کلب ہیں جہاں حماموں اور حوضوں میں مرد و عورت بالکل مادر زاد عریاں حالت میں نہاتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔

جرمنی کی عورت کے متعلق قبل از جنگ مشہور تھا کہ وہ گھر میں بیٹھے رہنے اور بُننے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی، لیکن اب یہ عالم ہے کہ دنیا کا کوئی کھیل، کوئی مظاہرۂ قوت و ورزش ایسا نہیں ہے جس میں وہ ممالک یورپ کی نہ صرف عورتوں بلکہ مردوں کے ساتھ برابر کا حصہ نہ لے رہی ہو۔ پھر لطف یہ ہے کہ اس سے مقصود صرف تفریح نہیں ہے بلکہ مدعا یہ ہے کہ اُن کی نسل پر اچھا اثر پڑے اور اسی لئے اُن کی ورزش کے طریقے تمام یورپ سے مختلف ہیں، اور حکومت بھی اس مقصد میں ہر طرح ان کی مدد کرتی ہے۔

جب ان لوگوں کو فرصت ملتی ہے یہ لوگ جنگلوں میں، باغوں میں، پہاڑوں پر پیادہ پا پہونچ جاتے ہیں، اور

تہذیب جدید و تمدن حاضر کے تمام تکلفات سے بری ہو کر نہایت ہی سادہ و پُر لطف تفریح و ورزش میں اپنا وقت بسر کرتے ہیں۔ یہاں سیکڑوں ہوٹل، قہوہ خانے روز نئے نئے پیدا ہوتے جاتے ہیں جہاں نہایت قلیل اُجرت پر مردوں اور عورتوں کو جگہ دی جاتی ہے اور یہاں یہ لوگ جمع ہو کر کھیلتے کودتے ہیں، ریاضت بدنی کرتے ہیں اور باہم دگر مسائل حاضرہ پر گفتگو کرتے ہیں۔ گویا کہ اس وقت وہاں کا ہر ہوٹل ایک کلب ہے اور وہاں کا ہر فرد اس کلب کا ممبر جو اپنی پوری قوت اس بات پر صرف کر رہا ہے کہ جرمنی قوم دنیا پر چھا جائے اور سارے عالم پر اس کے تصرف و اقتدار قائم ہو جائے۔

کیا ان واقعات میں ہمارے لئے کوئی سامان بصیرت و عبرت پنہاں ہے یا نہیں اور کیا ہم بھی کبھی اس راز کو سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا نام ہے صرف حرکت و عمل کا مگر "ایسی زود پشیمانیاں" ہمارا حصہ کیوں ہونے لگیں؟

نیاز

فضا کی مملکت میں

دس میل کی بلندی پر انسانی تصرف و تنفس کی پہلی مثال

سوئٹزرلینڈ کا مشہور عالم آگسٹ پکرڈ، براسلز یونیورسٹی میں طبیعیات کا پروفیسر پہلا شخص ہے جس نے گزشتہ جون میں ۵۱۴۵۸ فٹ یا تقریباً دس میل کی بلندی تک پرواز کی - یہ الومنیم کے ایک کُرہ یا بہت بڑے گیند کے اندر جو چاروں طرف سے بند تھا بیٹھا اور اس کُرہ کو ایک بڑے غبارہ سے باندھ کر اس نے اپنا ہوائی سفر شروع کیا۔ جس بلندی تک یہ پہونچا اس وقت تک کوئی انسان نہیں پہونچ سکا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ اس سے قبل بعض غبارے اس سے بھی زیادہ بلند جا چکے ہیں، چنانچہ ۱۹۱۲ء میں جو غبارہ سواحل گرین لینڈ سے اڑایا گیا تھا وہ ۲۴ میل کی بلندی تک پہونچا اور اسی طرح جرمنی کا وہ غبارہ جو گزشتہ سال کے ستمبر میں شہر ہمبرگ کے پاس سے اڑا تھا بائیس میل بلند ہو گیا، لیکن یہ دونوں غبارے انسانی وجود سے خالی تھے۔

اس وقت تک انسان فضا کے اتنے بلند حصوں تک نہیں پہونچ سکا اور نہ علم بشری تا ایندم ان تمام طبقات ہوا کی دبازت کا اندازہ کر سکا جو کرۂ زمین کو محیط ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جس قدر ہم زمین سے بلند ہوتے جاتے ہیں ہوا کی لطافت بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک جگہ پہونچ کر یہ لطیف ترین ہوا بھی ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد وہ خلا شروع ہو جاتا ہے جس کے حدود اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہاں ایک مادۂ اثیری بھرا ہوا ہے لیکن اس کا کوئی علمی ثبوت اس وقت دریافت نہیں ہو سکا۔

سر جیمس جینز جو اس زمانہ کا مشہور عالم ہے کہتا ہے کہ ۳۲۰۰ کیلومیٹر (کیلومیٹر ایک میل سے کچھ زاید ہوتا ہے) کی بلندی پر ہوا اس قدر لطیف ہو جاتی ہے۔ کہ اس کے ایک مکعب سنٹی میٹر (ایک گز سے کچھ زاید ہوتا ہے) میں صرف تین لاکھ دقائق ہوا کے پائے جاتے ہیں درانحالیکہ زمین سے متصل ان کی تعداد . . . . ۳۰ (تین مہاسنکھ) تک پہونچتی ہے۔ اب سے قبل مدرسوں میں یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ ہوا کا کرہ صرف ۱۰۰ میل کا ہے، لیکن اب جدید تحقیقات سے اس کی تکذیب ہوتی ہے۔

علمار نے ہوا کے دو طبقے کئے ہیں ایک وہ جو کرۂ زمین سے متصل ہے جس کا نام (   )
طبقۂ ادنےٰ ہے اور دوسرے کا نام (   ) طبقۂ اعلیٰ ہے۔ طبقۂ ادنےٰ میں ہم جس قدر
ہم بلند ہوتے جاتے ہیں درجۂ حرارت گھٹتا جاتا ہے لیکن طبقۂ اعلیٰ کا درجۂ حرارت قائم ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی
ان دونوں طبقوں کے درمیان حد فاصل قطبین کے اوپر ماورا رخط استوار واقع ہے یعنی ۵۰۰۰ ہزار فٹ خط استوار سے
اور ۲۰ ہزار فٹ قطبین سے بلند ہے،

طبقۂ اعلیٰ کا درجۂ حرارت قائم ہے اور سطح زمین پر جو درجۂ حرارت پایا جاتا ہے اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یہ طبقہ اور دوسرے طبقات پر مشتمل ہے جو اس سے زیادہ لطیف ہیں لیکن ان کی تعداد معلوم نہیں۔ گمان کیا جاتا ہے کہ یہ طبقات تین ہیں جن کے اندر ریڈیو (لاسلکی کہربا) کی لہر گزر جاتی ہے لیکن پھیلتی نہیں اور پھر کرۂ زمین پر واپس آجاتی ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ پروفیسر پیکر نے یہ تجربہ اس لئے کیا تھا کہ اتنی بلندی سے وہ چاند کو رصد کرے گا لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ دو ماہ قبل جب پروفیسر پیکر نے پرواز کی ہے، چاند ہم سے تین ہزار میل زیادہ قریب تھا اور علمار نے اسی وقت اس کو یہاں رصد کر لیا تھا۔ الغرض پروفیسر پیکر کی یہ پرواز مطالعۂ قمر سے متعلق نہ تھی بلکہ اس کے مقاصد کچھ اور تھے اور منجملہ ان کے ایک یہ تھا کہ وہ فضار بلند اور برقی لہر کے تعلق کو معلوم کرے اور اسی کے ساتھ یہ بھی تحقیق کرے کہ فضائی شعاعوں کے کیا خواص ہیں اور جوہر فرد اور اس کے اندر چھپی ہوئی عظیم قوتوں کی کیا کیفیت ہے کیونکہ اس وقت علما فضائی شعاعوں اور اُن کی لاانتہا قوت کے تو قائل ہیں لیکن ابھی تک یہ نہیں معلوم کر سکے کہ یہ شعاعیں کیوں اور کہاں سے پیدا ہوتی ہیں۔

یہ درست ہے کہ یہ کوشش اپنی قسم کی پہلی کوشش نہ تھی، جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے دو بار پہلے زیادہ بلندی تک غبارے پہونچ چکے ہیں لیکن وہ انسان سے خالی تھے۔ جو مہیں انسان غباروں کے اندر بیٹھکر کیگئی ہیں ان میں سے قابل ذکر صرف یہ چار ہیں:-

(۱) ۱۸۶۲ء میں انگلستان کے دو شخص گلیشیر اور کاکسول غباروں کے ذریعہ سے اُڑے اور ۲۷ ہزار فٹ تک بلند چلے گئے، لیکن آکسیجن کی کمی سے یہ لوگ ہلاک ہوتے ہوتے بچے اور مشکل سے نیچے اُتر سکے۔

(۲) ۱۹۰۱ء میں جرمنی کے دو شخص برسون اور رستوریرنگ نے کوشش کی اور ۳۵۴۳۵ فٹ سے زیادہ نہ جاسکے۔

(۳) ۱۹۲۷ء میں کپتان گرے ۴۲۴۷۰ فٹ یا ۸ میل سے زاید بلندی تک پہونچ گیا لیکن جب یہ چھتری کے ذریعہ سے اُترا تو مر گیا۔

(۴) ۱۹۳۰ء میں امریکہ کا ایک شخص لفٹنٹ سوسیکٹ ۴۳۱۶۶ فٹ تک پہونچا۔

لیکن پروفیسر بکر ان سب پر سبقت لے گیا کیونکہ اس کی پرواز ۵۸۵۱۴ فٹ تک پہونچ گئی اور پھر صحیح سلامت واپس آگیا۔

پروفیسر بکر نے اخبار کے نمایندوں کو جو بیان دیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے :-

"جو آلات اپنے ساتھ ہم لے گئے تھے انھوں نے کام دیا لیکن بعض فضا کے اثر سے بیکار ہوگئے - ہم کو اپنی تحقیق علمی میں اس ذریعہ سے خلاف توقع بہت کامیابی حاصل ہوئی - ہمارا غبارہ اس قدر تیزی سے اُڑا کہ ۲۵ منٹ میں ۱۵۰۰۰ مٹر کی بلندی تک پہونچ گئے اور یہ وقت ، بجے کے ۵۴ منٹ صبح کا تھا -"

ہم نے پرواز کے دوران میں مناظر طبیعی کی طرف بالکل توجہ نہیں کی بلکہ اپنے علمی آلات کی طرف متوجہ رہے غبارہ کی کم سے کم رفتار ۱۵ مٹر فی ثانیہ تھی -

مقام انسبروک سے ہم کو کہربائی اشارے کھینچے گئے لیکن وہاں ہم اُتر نہیں سکے ، کیونکہ ہم گیس کے خزانہ کو آہستہ آہستہ نہ کھول سکے کہ غبارہ رفتہ رفتہ اُتر سکتا اور دفعتہً کھول دینا گویا ہلاکت کا مترادف تھا -

ہوا کے طبقۂ اعلیٰ میں گرمی ناقابل برداشت ہے کیونکہ ۵۰ سے ۶۰ درجہ سنٹی گراڈ تک پہونچتی ہے - لیکن اندر درجۂ حرارت ۱۲ تک تھا -

رات کو قصبۂ گیرگل کے قریب ایک ایسے پہاڑ پر اُترے جو بالکل برف پوش تھا ، اور ۲۷۰۰ مٹر سطح بحر سے بلند ہے - ہم فضا میں ۱۶ گھنٹے رہے اور اس دوران میں مطلق کوئی خوف ہم پر طاری نہیں ہوا اور ہماری آرزو ہے کہ آیندہ اس سے زیادہ بلند پہونچ کر علمی تفتیش کریں -

---

اس وقت تک خیال کیا جاتا تھا کہ طبقۂ اعلیٰ سے اوپر بالکل خلا ہے ، لیکن پروفیسر بکر کی اس مہم سے معلوم ہوا کہ وہاں بھی ہوا ہے اور اس میں بھی وہی عناصر پائے جاتے ہیں جو کرۂ ارض کی ہوا میں موجود ہیں -

یہ ہیں کارنامے ایک زندہ قوم کے زندہ افراد کے - لیکن ہمارے یہاں کے اکابر کو اُن نقوش قدیمہ سے ہٹنے کی کہاں فرصت ہے جو عہد مظلمہ کی علمی دنیا نے ان کے دلوں پر کندہ کر دیئے ہیں - (ترجمہ)

اعتبارات

کسی شہر میں ایک بادشاہ تھا بڑا صاحب اقتدار اور غیر معمولی عقل و فراست رکھنے والا ــــ اس شہر کے وسط میں ایک کنواں تھا جسکا صاف و شیریں پانی سے شاہ و وزیر اور تمام شہر والے فائدہ اٹھاتے تھے کیونکہ وہاں صرف یہی ایک کنواں تھا

ایک رات ساری بستی سو رہی تھی کہ کوئی ساحرہ چپکے سے آئی اور کنوئیں کے اندر سات قطرے کسی دوا کے ڈالکر بولی کہ "جو شخص اس کنوئیں کا پانی پئے گا، دیوانہ ہو جائیگا"۔ صبح ہوئی سب نے حسب معمول کنوئیں کا پانی پیا اور ساحرہ کے قول کے مطابق سب دیوانے ہو گئے۔ لیکن بادشاہ اور اس کے وزیر نے پانی نہ پیا

جب یہ خبر تمام شہر والوں کو معلوم ہوئی تو وہ ہر ہر گلی میں دیوانہ وار پھر پھر کر یہ آواز بلند کہنے لگے کہ "ہمارا بادشاہ اور وزیر دیوانے ہو گئے ہیں اب حکومت کی اہلیت باقی نہیں رہی، اس لئے ہمیں چاہیے کہ ان کو معزول کر دیں"

شام کو جب یہ خبر بادشاہ کے کانوں تک پہونچی تو اسنے حکم دیا کہ اُس کنوئیں کا پانی لایا جائے۔ چنانچہ ایک کاسۂ زریں وہ پانی لایا گیا۔ بادشاہ نے پیالہ لیکر اپنے ہونٹوں سے لگالیا اور جو پانی بچا تھا وہ وزیر کو پلا دیا۔

شہر کی تمام آبادی مسرور ہے کہ ہمارا بادشاہ رہ راست پر آگیا اور اب وہ ہم پر حکومت کرنے کا اہل ہے

گزشتہ رات میں نے قدیم خیال کے دو عالم دیکھے جن میں سے ہر ایک دوسری کی تکفیر کرتا تھا۔ ان میں سے پہلا کافر تھا، اور دوسرا مومن۔

ایک بار یہ دونوں شہر میں جمع ہوئے اور اپنے اپنے انصار کے سامنے خدا کے وجود و عدم وجود پر جنگ کرنے لگے جب مسلسل گھنٹوں تک لڑتے رہنے کے بعد وہ تھک گئے تو ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی راہ لی،

اسی دن شام کو وہ کافر ہیکل میں گیا اور قربانگاہ کے سامنے اپنی دیوی کے حضور میں اپنے تمام گناہوں سے تائب ہو کر مومن ہو گیا

اسی وقت اس مومن عالم نے اپنی کتاب مقدس کی غلط تعلیم پیش کر کے لوگوں کو یہ یقین دلایا کہ اس کا مذہب حد درجہ تنگ نظر ہے اور کافر و زندیق ہو گیا۔

"درسِ عمل"

انسان تک رسائیِ دستِ فنا نہیں — تحلیلِ زندگی ہی اساسِ حیاتِ نو
اعمالِ زشت و خوب نہ جائیں گے رائیگاں — تیار ہو رہا ہے لباسِ حیاتِ نو

تکلیفِ دست و پا سے کسی کو مفر نہیں — آسودگیِ دل ہی مگر جنتِ حیات
آلودۂ گناہ نہ ہو دامنِ خیال — پاکیزگیِ روح سے ہی نزہتِ حیات

بیکار کارزارِ جہاں میں نہیں گذر — مردانہ وار راہِ طلب میں ہو گام زن
دار العمل میں کوششِ پیہم ضرور ہے — ناکامیوں کا رنج نہ ہو حوصلہ شکن

ہر لمحۂ حیات ہو صرفِ تلاشِ حق — ہر حال میں ہو پیشِ نظر اسوۂ سلف
حسنِ عمل سے دے وہ پیامِ نشاطِ روح — دنیا تجھے بعجز کہے ارشدِ خلف

تیرا وجود ہو سبق آموزِ زندگی — تیری حیات گرمیِ ہنگامۂ عمل
کہتے ہیں جس کو اہلِ نظر راہِ مستقیم — سب مان لیں کہ ہے وہ ترا جادۂ عمل

عقلِ سلیم، فکرِ رسا، مایۂ یقیں — عزمِ صمیم، جوشِ عمل، ہمتِ بلند
طغرائے امتیاز ہیں طغرائے امتیاز — قومیں انھیں سے ہوتی ہیں عالم میں ارجمند

کوکب

”پُرانی یادگاریں“

تو عقل کے دھوکے میں، صرفِ تکمیل رہِ نادانی ہی تا چند یہ جوشِ خوابِ گراں، اے دوست! یہ دنیا فانی ہی
تاریک ہی شب، غم کی لہریں بیچین ہیں قلبِ دوراں میں اِک تو کہ رہینِ آسائش ہی، بیخبری کے ایواں میں
مصروف ہی تیری کاوشِ دل احساسِ غمِ انسانی میں اور رات کا گہرا سناٹا ہی، قصرِ حیاتِ فانی میں
خوابیدہ ہی نبضِ موجِ صبا، جنبش سی نمایاں خاک میں ہی تو لالہ و گل کا طالب ہی اور دام خس و خاشاک میں ہی
تا چند اُمیدِ آسائش اس صبر شکن جانکاہی میں ملتا ہی سکونِ منزل بھی، اے دوست! کہیں گمراہی میں

ممکن ہو تو درسِ بینش لے، مجروح فریبِ بینائی!
کیا چیز ہی عجزِ خاک نشینی، ہو کہ غرورِ دارائی

یہ اُجڑے ہوے بام و گنبد، یہ سقفِ کہن، تھرائی ہوئی ایامِ سلف کی عظمت ہی اسوقت بھی جن پر چھائی ہوئی
بکھرے ہوئے ملتے ہیں انمیں ذراتِ مہ کامل ابتک سینوں میں دھڑکتے ہیں انکے کچھ حوصلہ پرور دل ابتک
اس رہگذرِ برباد سے گزرا، قافلۂ سلطانی بھی، ہاں اس خاک پریشاں سے اُٹھے، سادات بھی، خاقانی بھی
ڈوبی ہوئی نبضوں میں انکی دھیما سا ہی اب بھی جوش وہی نغمے نہ سہی، جلوے نہ سہی، احساس وہی ہی، ہوش وہی
ہر چند کہ شب کے سائے میں ظلمت کے علم لہراتے ہیں اس بزم کے بے قیمت ذرے خورشید سے ٹکر کھاتے ہیں
کھلتا ہی ضمیرِ انساں پر اس خاک کی دھیمی آہوں سے اک قافلۂ اربابِ کرم گزرا تھا کبھی ان راہوں سے

غلطاں ہیں یہاں، ذروں میں، بہار رفتہ کے گرم آنسو ابتک　　آتی ہی ہوا کی لہروں سے بھینی بھینی، خوشبو اب تک
اک کیف سا ابتک پنہاں ہی، اس روح شکن خاموشی میں　　بیمثل تھی اس میخانہ کی صہبائے عمل سرجوشی میں
اللہ، یہ کس سرور کی یاد حسن تبسم آتی ہے　　کچھ بات تو ہے ابتک جو یہاں اک برق سی لہرجاتی ہے

صدیوں سے چمکتا ہی سورج ان اوج نشاں ایوانوں پر　　برسوں سے لرزتے ہیں تارے ان سر بفلک میناروں پر
کڑکی ہی پرافشاں برق، ہوائیں تیز و پریشاں گزری ہیں　　اس عالم آب و خاک میں ان پر یونہی، صدیاں گزری ہیں
دنیا نے ہزاروں مرتبہ انکے سامنے پہلو بدلا ہے　　اچھوں کو بگڑتے پایا ہی، بگڑوں کو سنورتے دیکھا ہے
پنہاں نہیں ان ویرانوں سے اسرار حیات انسانی　　اب بھی تو ہجوم سوز دروں سے گرم ہی انکی پیشانی
آفاق میں انکی آنکھوں نے سو طرح کے منظر دیکھے ہیں　　ادبار کے نشتر کھائے ہیں، اقبال کے تیور دیکھے ہیں
کس درجہ فروتر ہیں یارب انسان کی فانی تدبیریں　　آئینہ ہیں کس شوق و ارماں کا آہ یہ اُجڑی تعمیریں
ہلتی ہی بنائے دشت و جبل، امواج ہوا بے پروا ہیں　　انسان کی ہستی کیا شئے ہے انساں کی تمنائیں کیا ہیں
آدیکھ! مقام عبرت ہی، ای بندۂ نفس و نادانی!　　تا چند ملال ناکامی، کب تک طلب عیش فانی
تا چند درون قلب غم ایام کے نشتر کھائے گا　　آلام کی رو تھم جائیگی، عشرت کا سماں مٹ جائے گا

مقصود ہی گر تعمیر چمن، پروائے خس و خاشاک نہ کر
عرفاں کی بلندی کو ناداں! اوہام زبوں سے خاک نہ کر

علی اختر (از حیدر آباد دکن)

تاروں بھری رات

تاروں سے بھر گیا ہے دامن عروس شب کا — کیا بن سنور گیا ہے، دامن عروس شب کا
افلاک کی جبیں پر تارے چمک رہے ہیں — یا نیلگوں قبا میں موتی دمک رہے ہیں
یا دل دھڑک رہے ہیں دنیائے آسماں کے — یا منتشر ہیں جلوے انوارِ بیکراں کے
یا رات کی جوانی، جوبن دکھا رہی ہے — دل کو لبھا رہی ہے، دل میں سما رہی ہے
یا پھر زمیں کے جلوے، گردوں میں آ گئے ہیں — لمعات جگنوؤں کے رفعت پہ چھا گئے ہیں
جا کر یہ کون پوچھے، پُر نور آسماں سے — یہ ننھے ننھے جلوے آئے ہیں کس جہاں سے
یہ رات کے نظارے، یہ آسماں کا جوبن — یہ نور پوش تارے، یہ آسماں کا جوبن
خاموشیوں کی لے میں جادو بھرا ہوا ہے — نغموں کا سحر، نیندیں، بن بن کے چھا رہا ہے
اک محویت ہے طاری، ارض و سما کے دل پر — مُلکِ فنا کے دل پر، مُلکِ بقا کے دل پر
سرمست ہیں ہوائیں، سرشار ہیں فضائیں — پھیلی ہوئی ہیں شب کے انوار کی قبائیں
دنیا کی محفلیں سب خاموش ہو گئی ہیں — راحت کے جام پی کر بے ہوش ہو گئی ہیں

یا رات کی نگاہیں، نیندوں سے بیخبر ہیں
یا میری سرد آہیں نیندوں سے بیخبر ہیں

عدم

انقلاب

عبرت آموز ہے گلکاریٔ ایوانِ جہاں جس کا ہر نقش تغیر کا پتا دیتا ہے
حیرت افزا ہی عجب شاہدِ فطرت کا طلسم کہ جو انسان کو مبہوت بنا دیتا ہے
خاکِ صحرا سے نکلتا ہے ہوا کا جھونکا چرخ پہ ابر کا اک فرش بچھا دیتا ہے
جلوۂ برق وہ رکھتا ہے نہاں سینے میں موتی پیشانیٔ عالم پہ گرا دیتا ہے
صحنِ بستاں میں نسیمِ سحری کا انداز غنچہ کو خوابِ پریشاں سے جگا دیتا ہے
دیدۂ مہرِ جہانتاب مژہ سے اپنی پردۂ شب رخِ گیتی سے اٹھا دیتا ہے
دورِ باطل میں جو اٹھتا ہے کوئی شیرِ خدا نعرۂ حق سے وہ دنیا کو ہلا دیتا ہے
آہ جانسوز سے ظلمت کدۂ عالم میں جلوۂ برقِ جہانتاب دکھا دیتا ہے
زلفِ دوراں میں وہ مشاطۂ قدرت بنکر اک لڑی گوہرِ مقصد کی بڑھا دیتا ہے
اس کا ہر تارِ نفس بادِ تمنا بن کر دل شگوفہ کی طرح سب کے کھلا دیتا ہے
صفحۂ دل پہ جو ہوں جور پرستی کے نقوش صورتِ حرفِ غلط ان کو مٹا دیتا ہے

دردِ ملت کا جو آنکھوں سے ٹپکتا ہے لہو
رخِ گیتی پہ عجب غازہ چڑھا دیتا ہے

(محمود اسرائیلی)

نوائے پریشاں

صبح کی انتہا ہوئی　　شام کی ابتدا ہوئی
رنگ شفق دمک چکا　　بزم سکوں بپا ہوئی
کم ہوئی گرمیٔ زمیں　　رقص میں پھر صبا ہوئی
کشمکش حیات میں　　مائل التوا ہوئی
چشم ستارۂ فلک　　نور سے آشنا ہوئی

اُف یہ سوادِ شام ہے
ہجر کا یا پیام ہے

بحر فلک میں کشتیاں　　کرتی ہیں نور پاشیاں
لوٹ رہے ہیں قمقمے　　کوند رہی ہیں بجلیاں
محفل اخضری میں پھر　　ہوتی ہیں کیف باریاں
دیں گی مجھے فریب کیا　　میری نظر فریبیاں
حسن سکوتِ شب کی یہ　　خاص فریب کاریاں

محشرِ خامشی ہے یہ!
منظرِ بے ہشی ہے یہ!!

جلوۂ حسن طور ہے　　جنت رنگ و نور ہے
تابشِ کہکشاں نہیں　　جلوہ گریٔ حور ہے
ہے "جو سکوتِ متصل"　　اصل میں نا صبور ہے
جلوۂ بے خودی نہیں　　"فلسفۂ شعور" ہے
جو ہے جمودِ کیف میں　　اصل سے ابھی دور ہے

حسن اگر خموش ہے
عشق تو نا کوش ہے!

منظرِ آب کا سماں　　غیرتِ موج گلستاں
خندۂ ماہِ نو میں ہے　　"سیل" جمال کی رواں
بحر کے ہر حباب میں　　"شوق" کی ایک داستاں
کھل گئے راز ہائے دل　　اُف رے "سکوت بے زباں"
رمزِ خفی ہے آشکار　　لاکھ کرے کوئی نہاں

ہر طرف اک جمال سا
بعد میں اتصال سا!!

حسن چمن میں ہے نمو　　گل میں ہے حسن رنگ و بو
شبنم کیف پاش سے　　کرتے ہیں پھول بھی وضو
شب کی سیاہ زلف کو　　پھیلنے کی ہے آرزو
نکہتِ گل ہے بے قرار　　جیسے حریصِ جستجو
شمع کی ضو فشانیاں　　وجہ جمالِ شمع رو

حسنِ سکوں کہیں نہیں
ٹھہری ہوئی زمیں نہیں!

کیف میں ہے خمار سا　　پھول چمن میں خار سا
دل کو سکون ہے مگر　　پھر بھی ہے بے قرار سا
نرگسِ نیم باز میں　　کچھ نہ کچھ انتظار سا

جبر کے جزو جزو میں　　رنگ ہے اختیار سا
ذرّے ہیں جمع کو بکو　　پھر بھی ہے انتشار سا
شوق نہیں تو کچھ نہیں
ذوق نہیں تو کچھ نہیں!

غیر ہیں خوش ہمیں نہیں　　چین سر زمیں نہیں!
کہتی ہے گردشِ فلک　　کون ہے جو حزیں نہیں؟
سجدے سے ہے جو دور تر　　کام کی وہ جبیں نہیں
"ذکرِ عمل" سے لطف کیا　　ذوق نہیں یقیں نہیں!
عرصۂ روزگار میں　　لطفِ سکوں کہیں نہیں!!
ان کی ہمیں خبر نہیں
نالوں میں کچھ اثر نہیں
آج کی بھی خبر نہیں　　دوش پہ بھی نظر نہیں
بڑھ گئی خواہشِ عدم　　دہر میں اب گذر نہیں

صبح نہ ہو جو کیف زا　　شام ہے وہ سحر نہیں!
ہو جسے شور و شر سے کام　　کچھ ہو، مگر بشر نہیں!!
طول ہے غم کی داستاں　　قصّہ مختصر نہیں
اٹھ کے شرر فشاں ہو تو
دہر میں پھر عیاں ہو تو
دل میں یہ غور کر ذرا　　چلتی ہے کون سی ہوا
درد، جگر کا کیا مٹے　　جب نہیں درد کی دوا
اپنے خیال میں ہے مست　　اچھا کوئی ہو یا بُرا
جب نہ قبول وہ کریں　　پھر ہے عبث یہ التجا
حافظ "طالبِ حیات"　　آئے گی ایک دن قضا
غیر کا آسرا نہ کر
درد کو لا دوا نہ کر!!

حافظ

اب کوئی خضاب نہ لگائیے

اگر آپکے بال پکنے لگے ہوں۔ دانت ہلتے ہوں۔ پائیریا۔ دانتوں سے خون و پیپ آتا ہو۔ مسوڑھوں میں درد۔ یا آنکھوں کی روشنی میں کمی۔ یا دماغ کمزور ہو کر سر چکرا تا ہو۔ تو اس فقیری منجن ہزار ا کو جو ہزاروں آدمیوں پر آزمائش کر لیا گیا ہے۔ ۴۰ یوم استعمال فرما کر قدرت خدا کو ملاحظہ کریں دانت مثل موتی کے چمکیلے اور آبدار ہونگے بڑی خوبی یہ ہے کہ بالوں کا سفید ہونا ایکدم بند ہو جائیگا اور جو بال سفید ہو چکے ہیں رفتہ رفتہ کل سیاہ ہو جائینگے ہزاروں بوڑھے جوان ہو چکے ہیں حسب فقیری منجن سے ہلتے ہوئے دانت جڑ جائیں اور بالوں کا سفید ہونا بند ہو جائے اسکے دیگر معمولی فوائد کیا بیان کئے جائیں کل شکایتیں دور ہو جائینگی۔ بوڑھے جوان اور عورت بچوں کو مفید ہے جلد منگوا کر فائدہ اٹھائیے غلط ثابت ہو تو حلفیہ بیان آنے پر دوگونی قیمت واپس ہوگی ۴۰ یوم کیلئے رعایتی قیمت معہ محصولڈاک (۲ روپے)

مینیجر مفید عام دواخانہ نمبر ۸ دربھنگہ (بہار)

ایک غلطی درست کر لیجیے

حضرت نیاز کی ڈائری میں صفحہ ۸۴ کے بالکل اختتام پر ایک حصّۂ عبارت کا حسب ذیل چھوٹ گیا ہے۔

"جو نگاہ مجھ پر پڑے وہ شیریں کی افضال پر نہ ہو بلکہ ایک مالکہ کی خادم پر ہو۔ یہی سبب ہے کہ میں اس کے جذبۂ تفوق کی جو قدر تا اس کے دل میں ...."

جن حضرات کو یہ کتاب پہونچ چکی ہے وہ اس میں درستی فرمالیں یہاں باقی جلدوں میں درستی کر دی گئی ہے۔

مینیجر

معلومات

مستقبل کی جنگ اور عورت تاریخ ماضی کا یہ نہایت نادر واقعہ ہے کہ عورت نے کبھی میدان جنگ میں مرد کی طرح قتل وخونریزی سے کام لیا ہو۔ لیکن گزشتہ جنگ عظیم میں عورتوں نے جو خدمات انجام دی ہیں اور اس کے بعد سے جو دنیائے عمل میں جو میلان ان کے اندر پایا جاتا ہے وہ عورت کے جس مستقبل کی پیشین گوئی کر رہا ہے بہت عجیب وغریب ہے۔

گزشتہ جنگ میں انھوں نے صرف اس حد تک خدمات انجام دی تھیں کہ زخمیوں کی تیمارداری یا اسی طرح کی کوئی اور خدمت ان کے سپرد کی گئی تھی جو ان کی فطرت کے لحاظ سے موزوں ہو، لیکن اب جو آثار ظاہر ہو رہے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ آیندہ جنگ میں عورت، مرد کے دوش بدوش توپ وتفنگ سر کرے گی، خندقوں کی تکلیف دہ زندگی میں مساویانہ طور پر شریک ہوگی، نیزہ وشمشیر سے حریف کا مقابلہ کرے گی، ہوائی جہازوں سے بم گرائے گی زہریلی گیس سے دشمن کو ہلاک کرے گی اور وہ سب کچھ کرے گی جسے اس وقت تک صرف مرد ہی کر سکتا تھا۔

چنانچہ روس، بولونیا، اور جاپان میں باقاعدہ فوجوں میں عورت کی بھرتی شروع ہو گئی ہے، ان کے لئے جنگی مدرسے قائم کئے جا رہے ہیں، وردیاں تیار ہو رہی ہیں اور ہلکے ہلکے ہتھیار ڈھالے جا رہے ہیں۔

انیمیا یا کمی خون کا بہترین علاج یہ مرض اب بہت عام ہو گیا ہے اور مختلف طریقوں سے اس کا علاج کیا جاتا ہے، چنانچہ اس سے قبل ہم نگار کے صفحات میں اس کا ایک علاج یہ تحریر کر چکے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو کچا گوشت یا خام کلیجی استعمال میں رہے، لیکن اب ایک اور بہت زیادہ مفید طریق علاج یہ معلوم ہوا ہے کہ لوہے اور تانبہ کا ایک ایک باریک ورق یا پترے کر دودھ میں ڈال دیا جائے اور کامل ۱۲ گھنٹے کے بعد اس دودھ کو صاف کرکے پی لیا جائے۔ دودھ کے مزے میں اس سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا اور نہایت ہی خفیف سا حصہ تانبہ اور لوہے کا دودھ میں مل جاتا ہے۔ اگر گرمی کی وجہ سے دودھ کے پھٹ جانے کا اندیشہ ہو تو چاہئے کہ اسے برف میں لگا کر رکھیں۔

آواز اور حیات انسانی متعدد تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ آواز حیات کی دشمن ہے کیونکہ پریشان آوازیں خلایا اور خون کے سرخ ذرات کو تباہ کر دیتے ہیں۔

اس کا تجربہ یوں کیا گیا کہ زندہ جراثیم اور سُرخ ذرات خون کے پہلے ایک مقفل ظرف میں رکھے گئے ۔ اس کے بعد وہ حوض میں ڈالے گئے اور موجوں میں جنبش دے کر آواز پیدا کی گئی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نصف جراثیم اور ذرات اسی طرح ہلاک ہو گئے اور باقی نصف بھی بہت مضمحل حالت میں تھے ۔

اس کے علاوہ اور تجربات بھی کئے گئے جنھوں نے ثابت کیا کہ شور و غوغا حیات انسانی کے لئے بہت مضر ہے ۔ اس لئے ضرورت ہے کہ جہاں تک ممکن ہو متمدن شہروں میں اس کا انتظام کیا جائے اور ایسے مقامات میں سکونت اختیار کی جائے جو شور و ہنگامہ سے بالکل علیحدہ ہوں ۔

مصنوعی انسان

گزشتہ سال اخباروں میں ہنگامہ پیدا ہوا تھا کہ اہل مغرب نے ایک مصنوعی انسان بنالیا ہے جو آدمی کی طرح بعض خدمات انجام دیتا ہے ، لیکن چند دن کے بعد پھر خاموشی چھا گئی اور کچھ پتہ نہ چلا کہ یہ مصنوعی انسان مر گیا یا ہنوز زندہ ہے ۔

اب امریکہ کی نمایش گاہ سنٹ لوئی میں پھر ایک جدید مصنوعی انسان پیش کیا گیا ہے جو ٹیلی فون کے پیغامات سنتا ہے ، ان کے مطابق عمل کرتا ہے ، سیٹی بجاتا ہے ، گاتا ہے ، بجلی کے قمقمے روشن کرتا ہے اور انھیں گل کرتا ہے ۔

ٹیلی فون دینے کے لئے صدر مقام کو مخاطب کرکے جہاں گفتگو کرنا ہوتی ہے وہاں کا نمبر بتاتا ہے اور اسی طرح کی بہت سی خدمتیں گھر کی انجام دیتا ہے اس کا نام ... اور کوشش کی جا رہی ہے کہ اس ایجاد کو اور زیادہ مکمل کیا جائے ۔ صحیح ہے جب عورت اہلی زندگی سے بیزار ہو جائے گی تو مرد اس کی تلافی اسی طرح کرے گا ۔

سورج اور قوت کہربا

جرمنی کے ایک نوجوان شخص ڈاکٹر بروولانگ نے جن کی عمر صرف ۲۸ سال کی ہے حال ہی میں ایک ایسا کہربائی آلہ ایجاد کیا ہے کہ اس کے ذریعہ سے آفتاب کی شعاعوں کو قوت کہربائی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے ۔

ڈاکٹر موصوف کا بیان ہے کہ اس سے زیادہ بدبختی ایک انسان کی ادا کیا ہو سکتی ہے کہ یوم آفرینش سے لے کر اس وقت آفتاب اپنی کہربائی قوت کی دولت تمام دنیا کے لئے وقف کئے ہوئے ہے اور کوئی اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا ۔ اگر ڈاکٹر موصوف کی یہ ایجاد بروئے کار آگئی تو اس میں شک نہیں کہ دنیا کے نظام اقتصاد و عمل میں بڑا انقلاب پیدا ہو جائے گا ، اور وہ گرم ممالک جہاں آفتاب سال کے اکثر حصہ میں نظر آتا رہتا ہے اس سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے اگر اُن کو اس کی توفیق ہو ۔

دنیا کا سب سے بڑا غبارہ

اس وقت دنیا کا سب سے بڑا غبارہ اکرون ہے جسے امریکہ نے بنایا ہے ۔ اس کا رقبہ ۶۵۰۰۰۰۰ مکعب فٹ ہے اور لمبائی ۷۸۵ فٹ ۔ اس کے اندر ہلیوم گیس بھری ہوتی ہے جو مشتعل نہیں ہو سکتی اور ۹۰ ٹن بوجھ اس غبارہ سے اٹھایا جا سکتا ہے ۔ اس کے موٹر سے ۴۴۸۰ گھوڑوں کی قوت پیدا ہوتی

ہے اور ۴۸ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کرسکتا ہے۔ لیکن اگر یہ صرف ۵۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کرے تو بھی ۵۸۰ میل تک بغیر ایک مرتبہ کے سامان پرواز اڑ سکتا ہے

عورتوں کا دشمن جرمنی کا مشہور فیلسوف نیتشے، جنس لطیف کی دشمنی کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتا تھا چنانچہ اس کا ایک قول ہے کہ "مرد جنگ کے لئے پیدا ہوا ہے اور عورت تاوان جنگ کے لئے، مرد کو چاہئے کہ جب عورت کے پاس جائے تو اس کے ہاتھ میں کوڑا ہو"

لیکن ہڈی میں ایک شخص حال ہی میں ایسا پیدا ہوا تھا جو نیتشے سے زیادہ عورتوں کا دشمن تھا۔ اس کا نام مسٹر لڈیک تھا۔ اس نے مرتے وقت وصیت کی کہ اس کے ترکہ سے ۶ ملین ڈالر صرف کرکے ایک کتب خانہ قائم کیا جائے لیکن اس دروازہ پر یہ ہدایت جلی حروف میں کندہ کرادی جائے کہ "عورتیں اندر نہیں آسکتیں"

اس نے اپنی وصیت میں تاکید کی ہے کہ کتاب خانہ کے اندر نہ کسی عورت کی تصویر آویزاں کی جائے اور نہ کوئی نسائی تصنیف اس میں جگہ پائے۔ اس نے ایک بیٹی چھوڑی لیکن ترکہ میں اس کا حصہ صرف پانچ ڈالر تھا۔

نقش برہوا اس سے قبل جب کسی شخص کے فعل عبث یا ناپائدار و ناممکن بات کا ذکر کیا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ نقش برآب ہے یا نقش برہوا۔ لیکن اب علوم کی ترقی چونکہ ہر ناممکن کو ممکن بناتی جارہی ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ "نقش برہوا" بھی محال رہے

جرمنی کے ایک ماہر برق نے ایک ایسا قمقمۂ بجلی کا بنایا ہے جو فضا میں نصف میل تک روشنی کو پھینکتا ہے اور آیندہ اس کے ذریعہ سے روشن حروف پیدا ہوتے ہیں اس قمقمہ سے ایک ارب ۵۰ کرور بتیوں کی روشنی پیدا ہوتی ہے اور برلن میں رات کے وقت اشتہارات فضائی کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اہل امریکہ بھی اس کی تقلید کرنا چاہتے ہیں لیکن ابھی تک کامیاب نہیں ہوئے

حصول شہرت کا عجیب ذریعہ حال ہی میں امریکہ کا ایک صاحب ثروت مرا تو علاوہ اور تمام مال و اسباب کے جو اس نے اپنی اولاد کے لئے چھوڑا، ستر پتلون بھی تھے جن کے متعلق اس کی وصیت تھی کہ یہ چار چار شلنگ میں فروخت کئے جائیں۔ جب یہ پتلون فروخت ہوئے تو ایک خریدار نے اس کے جیب میں استر کے اندر سلا ہوا ایک نوٹ سو گنی کا پایا اور اسی کے ساتھ یہ تحریر کہ "میں نے اپنی ساری زندگی حصول شہرت میں صرف کی اس لئے میں چاہتا ہوں کہ مرنے کے بعد بھی باقی رہے" جب یہ خبر شایع ہوئی تو پتلونوں کے خریداروں نے اپنے اپنے خرید کئے ہوئے پتلونوں کو ٹٹولا تو سب کو جیبوں کے اندر سے اتنی دولت ملی جس کا انھیں خیال بھی نہ ہوسکتا تھا ـــــــ

بقیہ ملاحظات بسلسلۂ صفحہ

لی نہیں جاتی یہ جنگ ہے صبر و تحمل، ضبط و ایثار کی جس کا حربہ صرف محبت و رافت ہے، اور جہاں

شرط اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

گول میز کانفرنس میں جو نمایندے مسلمانوں کی طرف سے منتخب کئے گئے ہیں ان میں تقریباً سب وہ ہیں جنھیں مسلمانوں کے مفاد سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی - ان میں ایک جو بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں وہ بہت زیادہ غیر مسلم ہیں، کیونکہ ان کے عقائد و شعائر، ان کے اصول و معتقدات جمہور مسلمین سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے اور نہ ہمارے اُن کے درمیان کسی قسم کے معاشرتی تعلقات قائم ہو سکتے ہیں - یہ اپنی زندگی کا بڑا حصہ یورپ میں بسر کرتے ہیں اور ان کی بڑی خصوصیت صرف یہ ہے کہ وہ محل شاہی میں ملک معظم کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں، ان کے گھوڑے ہر سال دوڑ میں بازی لے جاتے ہیں، اور جب حکومت کو ضرورت ہوتی ہے تو اُن کے نام سے (جو بدقسمتی سے مسلمانوں کا سا ہے) فائدہ اٹھا کر پیروان اسلام کو مرعوب کرنے کے لئے انھیں آگے بڑھا دیتی ہے -

ان کے بعد دوسرا درجہ ہندوستان کے اس بڑے مقنن کا ہے جو اس وقت مسلمانوں میں سب سے زیادہ سنجیدہ و ذی شعور سیاست داں سمجھا جاتا ہے، حالانکہ جہاں تک نفس اسلام کا تعلق ہے ان کی یہ حالت ہے کہ جب ایک غیر مسلم خاتون کے ساتھ اُن کی شادی کا وقت آتا ہے اور اُن سے کلمہ پڑھنے کو کہا جاتا ہے تو وہ گھبرا جاتے ہیں اور آخر کار سروجنی نائڈو "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" ان کی زبان سے ادا کرا کے از سر نو مسلمان بناتی ہیں -

ان کے بعد وہ بزرگ ہیں جنھیں میں ہمیشہ "طبل بلند بانگ و در باطن ہیچ" کہتا ہوں - ان کے گزشتہ کارناموں پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں، ان کی تازہ تقریریں، و تحریریں کافی ثبوت اس امر کی ہیں کہ وہ اس وقت صرف انگریزوں کے ساتھ چاہتے ہیں، ان کے جلسوں میں بار پانا ہی اتنی بڑی نعمت سمجھتے ہیں کہ اگر وہ بجائے ڈاسن اور بوسٹک کے خود اپنی کھال کے جوتے انکو پہنا دیں تو شاید انکے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے انھوں نے عزم کر لیا ہے کہ اب ہندوستان آکر وہ زمین جیک خود اپنے ہاتھ میں لیں گے اور مسلمانوں کو اس کے نیچے جمع کر کے بتائیں گے کہ غلامی کتنی بڑی نعمت ہے اور اس کے قائم رکھنے کے لئے انھیں کس کس طرح حکومت نصاریٰ کا ساتھ دینا چاہئے -

ایک اور صاحب جو الہ آباد سے تعلق رکھتے ہیں ان کی ہمدردی بھی مسلمانوں کے ساتھ بہت بڑھی ہوئی ہے اور اسی احساس اسلامی کی بنا پر وہ یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کو اپنا روپیہ برطانوی مال اور برطانوی بڑے کی خریداری میں لگا دینا چاہئے، کیونکہ نجات اب اسی میں ہے اور یہی وہ سیدھا راستہ ہے جو مکہ کو جاتا ہے - سو خیر بدقسمت مسلمان اس سے فائدہ اٹھائیں یا نہ اٹھائیں، لیکن اُن کو تو اس کا معاوضہ پبلک سروس کمیشن میں چار ہزار روپیہ ماہوار کی جگہ پا کر، مل ہی گیا وھذا ما کنا نبغی

پنجاب کے جو مسلم حضرات نمایندگی کر رہے ہیں، اُن کے متعلق اظہار رائے کی ضرورت نہیں کہ اُن کا تمام سرمایہ حیات وعمل ہی خوان حکومت کی زلہ ربائی کا ممنون ہو، اس لئے جب ہر مسلمان واقف ہے کہ گول میز کانفرنس میں اُس کی صحیح نمایندگی نہیں پائی جاتی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کا اظہار نہ کر دیا جائے اور آیندہ کے لئے پھر ان لوگوں کو "دخل در معقولات" کا موقعہ دیا جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں میں قوم پرست جماعت کے افراد جو روز روشن میں اس ظلم وغارتگری کو دیکھ رہے ہیں، کوئی کروٹ نہیں لیتے اور وہ اس طرح خاموش ہیں گویا کہ اُن کی زبان حلق کے اندر سے کھینچ کر باہر پھینک دی گئی ہے

افق صحافت پر ایک نئے آفتاب کا طلوع

روزنامہ "ناخدا"

جو دسمبر ۱۹۳۱ء کے پہلے ہفتہ سے بہ ادارت

مولانا نیاز فتحپوری

محض قوم ووطن کے حصول آزادی میں حصہ لینے کے لئے جاری ہو رہا ہے

اور جو

اپنی انشاء بلند، مقالات علمیہ، تحقیقات تاریخی، تنقیدات عالیہ، معلومات عامہ، منظومات نادرہ اور فکاہات لذیذ کے لحاظ سے گویا یوں سمجھ لیجئے کہ

رسالہ نگار کا روزانہ اڈیشن ہوگا

بہت بڑے سائز کے نفیس کاغذ پر معہ تازہ ترین برقی خبروں کے جو براہ راست حاصل کی جائینگی آپ کی خدمت میں روز حاضر ہوتا رہے گا۔ صرف پہلا پرچہ بطور نمونہ مفت مل سکے گا لیکن انھیں حضرات کو جو طلب فرمائیں گے۔

پہلا پرچہ ۱۰ ہزار شائع ہوگا اس لئے اشتہار دینے والوں کو خاص موقعہ حاصل ہے

سالانہ چندہ	ششماہی	سہ ماہی	ایک ماہ
۱۲	۷	۴	۱۸

منیجر روزنامہ ناخدا

روز نامہ سنا خدا کو اجرا ابکا انتظام مستور بسم اللہ ہمارے پہ جتنی اور انتظار فرمائیے

نگار

جلد ۲۰ فہرست مضامین ماہ دسمبر ۱۹۳۱ء شمارہ ۶

نگار

جلد ۲۰ دسمبر سنہ ۱۹۳۱ء شمارہ ۶

ملاحظات

اے بہ خلاو ملا خوئے تو ہنگامہ زا
باہمہ در گفتگو، بے ہمہ در ماجرا

اے خدا، اُس وقت بھی کہ قرون مظلمہ کی دنیا تجھے صرف غصہ کی آگ برسانے والا دیوتا سمجھ رہی تھی، مجھے تیرے دونوں ہاتھ لطف و رافت کے پھولوں اور عطوفت کے ہاروں سے لدے ہوئے نظر آتے تھے

اول دن سے میں ڈرایا جا رہا تھا کہ میں نے ایسا کیا تو، تو خفا ہو جائے گا، ایسا نہ کیا تو، تو برہم ہو کر مجھے آگ میں ڈال دے گا، لیکن میں نے تجھے قلب کی گہرائیوں، اپنی روح کے اعماق میں ہمیشہ مسکراتے ہی دیکھا

ٹھیک اس وقت کہ لوگ تیرے غصہ کے اندیشہ سے کانپتے ہوتے تھے، مَیں تیری محبت و شفقت کے حضور میں سکون کے ساتھ تیری تعریف کے گیت گایا کرتا تھا۔ وہ روتے تھے میں ہنستا تھا، وہ تیرے سامنے جھکتے تھے تجھ سے ڈر کر، اور مَیں تیرے حضور میں سر بہ سجود ہوتا تھا تیری محبت سے بیتاب ہو کر

دلے دارم خراب از التفات چشم بیمارت
ہمہ از جور می ترسند و من از لطف بسیارت

ایک زمانہ گزر گیا کہ اس کارگاہ عالم میں، اُن کا خوف اور میری محبت دونوں اسی طرح متوازی چلتے رہے نہ اُن

میں یہ جرأت کہ میری محبت کی آنکھوں سے تیرے متبسم و درخشاں چہرے کا نظارہ کرتے، نہ مجھ میں اس کا ہوش کہ اُن کے آئینۂ خوف میں تیری پیشانی کی شکنوں کو دیکھتا۔ دن گزرتے گئے، آفتاب کے طلوع و غروب کے نہ جانے کتنے مناظر میرے دل میں تیرے حسن مجرد کے نقوش قائم کرتے رہے، چاند کے عروج و زوال کی مختلف منزلوں میں تو ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نے تجھے کس کس آن میں دیکھا، بہار و خزاں کی متضاد کیفیات میں، کسے خبر ہے کہ میں نے تیری شیریں نکہت کو کس کس طرح سونگھا، دریاؤں کی روانی میں، پہاڑوں کے سکوت میں، آبشاروں کے شور میں، جنگل کے سناٹے میں، قصرِ دولت کے مخملیں فرش پر، غربت زدہ جھونپڑوں کی بوسیدہ چٹائیوں پر، خواجگان کبار کی جبین ابرو میں، کاسہان ضعیف کی عرق آلود پیشانی میں، امیروں کے زرکار لبادوں میں، کسانوں کے تار تار کرتوں میں۔ الغرض اے اعداد و شمار سے باہر، اے زمان و مکان کی قید سے آزاد، مَیں نے ہر جگہ تجھی کو کار فرما دیکھا اور جہاں دیکھا شفقت و رافت کے لاکھوں پھول برساتا ہوا

مَیں حیران تھا کہ دنیا والے تجھ سے ڈرتے کیوں ہیں، محبت کیوں نہیں کرتے، تیری ہیبت کیوں اُن کے دلوں پر طاری ہے، تیری رحمت سے الفت کرنے پر کیوں مجبور نہیں ——— اس حال پر بھی ایک زمانہ گزر گیا، اور میں خاموش پروانہ وار تیری شمع حسن کا طواف کرتا رہا ——— ایک دن ناگہاں تجھ سے ڈرنے والوں میں سے ایک ڈرنے والا میرے پاس آیا اور بولا کہ "چل ہمارے معبد میں ہمارے خدا کی تجو کر" میں بولا "تمھارا معبد! تمھارا خدا! کیا وہی معبد جسے آسمان کا صاعقہ، زمین کا زلزلہ مسمار کر دیسکتا ہے کیا وہی خدا جس کے تصور کی ابتدا خوف و ہراس سے ہوتی ہے مجھے نہ بہ چاہئے نہ وہ ——— میرا معبد میرے دل کے اندر ہے جسے کوئی چیز تباہ نہیں کرسکتی میرا خدا میری روح کے اندر محبت کا زریں نقاب ڈالے ہوئے جگمگا رہا ہے ———

پھر ایک طویل زمانہ گزر گیا اور ایک بے آب و گیاہ قطعۂ زمین سے رونما ہونے والی ہستی نے مجھ سے کہا کہ "چل ہماری پرستش گاہ میں، خدا کی پرستش کر ——— میں نے پوچھا "وہ پرستشگاہ کیسی ہے اور وہ خدا کیسا ہے"۔ جواب ملا "وہ معبد کسی مکان میں مقید نہیں، بلکہ انسان کے ہر سجدہ کے ساتھ از خود پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ خدا یکسر محبت و شفقت ہے جو میرے ذریعہ سے تمام دنیا کے بسنے والوں کو اپنی رحمت کا پیام دینا چاہتا ہے ———

مَیں فرط مسرت سے اچھل پڑا، لاکھوں برس کے انتظار کے بعد وہ آواز کان میں آئی جس کے لئے روح بیتاب اور دل دیوانہ تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا اس کے سامنے اپنا دل ڈال دیا، اس کے دامن سے اپنا دامن باندھ دیا۔ اس نے مسکرا کر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا اور میری ہستی اس کی ہستی کا ایک جزو ہو کر سکون کے شیریں خواب میں محو ہو گئی

ہر بات کے کہنے کا ایک محل ہوتا ہے، ایک مخصوص ہستی ہی اس کو کہہ سکتی ہے اور مخصوص زبان میں ۔۔۔ دنیائے اثر و تاثر میں کامیابی کا انحصار انھیں تین چیزوں پر ہے اور اگر ان میں سے کسی ایک چیز کی بھی کمی ہوئی تو سمجھ لو کہ ناکامی یقینی ہے ۔۔۔۔۔۔ میخانہ میں ایک رند کی طرف سے صلاح و تقویٰ کی گفتگو ویسی ہی بے معنی ہے جیسے مسجد میں ایک زاہد مرتاض کی جانب سے دعوت جام و سبو نہ اس طرح وہاں حلقۂ تسبیح و تہلیل قائم ہو سکتا ہے اور نہ یہاں بزم نشاط برپا۔ بالکل یہی حال روح انسانی کے اُن رازوں کا ہے جو وقتاً فوقتاً زبان پر بے اختیارانہ آجاتے ہیں لیکن ان میں بعض ایسے ہوتے ہیں جو صرف محراب مسجد ہی میں کہے جا سکتے ہیں اور بعض وہ جو

بر دار تواں گفت بہ منبر نہ تواں گفت

اس لئے اگر کوئی شخص محراب و منبر سے جدا رہنا چاہتا ہے تو وہاں کی بات باہر کیوں کہے اور جو دار پر چڑھا دئے جانے سے ڈرتا ہے وہ اس کے راز کو کیوں منہ سے نکالے

دنیا اس دور آزادی میں مذہبی پابندیوں، اخلاقی بندشوں سے علیحدہ ہو کر محض اپنے ذہن و دماغ کی پرستش کرنا چاہتی ہے، صرف اپنے سمجھے ہوئے اصول اخلاق کی پابندی پسند کرتی ہے، لیکن جس طرح عالم کا نظام اجتماعی اس انفرادی سرکشی کو برداشت نہیں کر سکتا، اسی طرح یہ "ذہنی انفرادیت" بھی اب آسانی سے انقیاد و اطاعت قبول نہیں کر سکتی ۔۔۔۔۔۔ یہ ہے وہ عظیم الشان جنگ، جو اس وقت انسانوں کے قلوب کو غیر مطمئن بنائے ہوئے ہے، جس نے ذہنی توازن کے سکون کو تباہ و برباد کر رکھا ہے اور کون کہہ سکتا ہے اس کا نتیجہ "استرداد حیوانیت" کی صورت میں ظاہر ہوگا یا قیام "انسانیت کبریٰ" کی شکل میں۔

قانون انسانی کا اقتدار و اثر انسان کے صرف ظاہری اعضا تک محدود ہوتا ہے، لیکن خدائی قانون دلوں پر حکومت کرتا ہے۔ اس لئے یہ اضطراب کسی ملکی آئین سے دور ہو نہیں سکتا، اس کا علاج اگر کوئی ہے تو وہی ضابطۂ خداوندی جو خوف و جبر سے نہیں بلکہ محبت و رافت کے ساتھ سب کو ایک مرکز پر جمع کرنا چاہتا ہے اور انفرادی اغراض کو دل سے نکال کر، اجتماعی فلاح کی بنیاد پر روح انسانی کو رواداری کے درد اور ایثار کے جذبہ سے معمور کر دیتا ہے ۔۔۔۔۔۔ پھر آج ہے کوئی مذہب ایسا جو دنیا کے اس دماغی، روحانی، اور اخلاقی ہیجان پر قابو حاصل کر سکے ۔۔۔ کوئی نہیں ۔۔۔ آپ کو معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوگا ۔۔۔ اخلاقی زنجیریں ٹوٹ جائینگی، مذہبی بندشیں یکسر فنا ہو جائینگی، درندگی و خونخواری کا نام تہذیب انسانی قرار پائیگا، ہر فرد کا ہاتھ دوسرے فرد کے خون سے رنگین نظر آئیگا، اور آخر کار جب انسان تھک کر خستہ و درماندہ ہو کر ہانپنے لگیگا، ایک جگہ گر پڑیگا، تو افق سے ایک روشن ستارہ طلوع کرتا ہوا اُسے نظر آئیگا، جسکی روشنی اسے راحت و سکون معلوم ہوگی، جسکی تیز کرنیں اسکے دُکھے ہوئے اعضا اور زخمی ہاتھ پاؤں پر مومیائی کا سا کام کرینگی اور افراد نوع انسانی پھر ایکبار اسی کے درخشاں فضا میں ایک دوسرے سے بغلگیر ہونگے ۔۔۔۔ اور یہی ہے وہ حقیقت جس کو

غالب نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ ــ ملتیں جب مٹ گئیں اجزاء ایماں ہوگئیں ــــ پھر یہ بات نہ محراب و منبر کی ہے کہ مجھ سا رندِ معصیت کوش اسے نہ کہہ سکے، نہ حدیث دار و رسن ہے کہ میرا ضعیف قلب اسکے اظہار سے خائف ہو۔ یہ ایک ایسے واقعہ کی پیشین گوئی ہے جسکو میری نگاہیں ابھی سے دیکھ رہی ہیں۔ اور ہر چند اسوقت میں نہ ہونگا، لیکن جو ہوگا وہ دیکھ لیگا کہ آخرکار نوعِ انسانی اس ایک مرکز پر جمع ہو کر رہی جسے آجکل کی اصطلاح میں نہیں بلکہ مستقبل کی اصطلاح میں پیچے مذہب کے نام سے پکاریں گے کیونکہ وہ عبارت ہوگا محض انسانیت سے جسکی سب سے پہلے اسلام نے دعوت دی اور آخر میں بھی وہی اسکو انجام تک پہونچانے والا ثابت ہوگا۔

دنیا میں کوئی چیز، بذات خود نہ بُری ہے نہ بھلی۔ اس سے اچھائی یا برائی کا تعلق اسوقت پیدا ہوتا ہے جب اُس کا استعمال کیا جائے پھر اگر اس سے خیر و فلاح کا کام لیا جاتا ہے تو اسکی تعریف کیجاتی ہے، ورنہ برائی۔ ایک زنگ خوردہ لوہے کا ٹکڑا کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن اگر اسی سے زخم پہونچایا جانے لگے تو لوگ اسکو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں گے تیغ و تفنگ اپنی جگہ بے حقیقت چیزیں ہیں، لیکن انکے استعمال کی تاریخ اسقدر خونیں ہے کہ لوگ اسکو دیکھتے ہی خائف ہو جاتے ہیں۔ درانحالیکہ اگر ان سے انسان کا خون نہ بہایا جاتا، تو آج لوگوں کو یہ یقین کرنے میں بھی تامل ہوتا کہ بندوق کی گولی انسانی سینہ کے اندر داخل ہو سکتی ہے اور تلوار کی دھار انسان کے اعضاء کو قطع کر سکتی ہے۔ بالکل یہی حالت دنیا کی ان تمام تحریکوں کی ہے جنکو اصطلاح نوعِ انسانی اور قیام امن و سکون کے لئے بروئے کار لایا گیا۔ پھر جبتک ان سے مقصد اصلاح پورا ہوتا رہا لوگ متوجہ رہے اور جب انکی حقیقی روح مفقود ہو گئی تو لوگوں نے ان سے روگردانی اختیار کر لی اور وہ مردہ ہو کر رہ گئیں ــــ دنیائے اصلاح اخلاق میں سب سے بڑا امر تبہ مذہب کا سمجھا جاتا ہے، یعنی کوئی تحریک دنیا میں قیام امن و سکون کے نام سے ایسی پیش نہیں کیگئی جسکا نام مذہب نہ رکھا گیا ہو۔ لیکن جب آپ اسکی تاریخ کا مطالعہ کرینگے تو معلوم ہوگا کہ مذاہب عالم خواہ اپنی تعلیم کے لحاظ سے کتنے ہی امن پسند کیوں نہ ہوں، لیکن تاریخی حیثیت سے، انکی خونریزیاں و خوں آشامیاں، نوعِ انسانی کے مصائب کی نہایت دردناک داستانیں ہیں۔ یقیناً اس سے زیادہ حیرتناک امر اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو مذاہب یہ دعوے کرتے ہیں کہ وہ دنیا سے قتل و غارتگری، وحشت و درندگی مٹانے آئے ہیں اور دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انھیں کے متبعین نے دنیا میں خونریزیاں کیں اور مذاہب ہی کا نام لے لے کر قتال و جدال کا بازار گرم کیا گیا۔ یقیناً ایک سوچنے والے دماغ کے لئے یہ مسئلہ بڑی الجھنیں پیدا کر دینے والا ہے اور وہ حیران رہجاتا ہے کہ اس سے وہ کس نتیجہ پر پہونچے آیا یہ کہ مذہب کا خیال ہی دنیا میں ایک لغو خیال ہے یا یہ کہ واقعی دنیا نے مذہب کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ــــ اس حقیقت پر نگار کے صفحات میں بارہا روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ مذہب کا خیال بالکل فطری چیز ہے اور نوعِ انسانی کی ترقی کے لئے کسی ایسے نظام کا قائم ہونا جو امن و سکون کی بقا اور اخلاق کے قیام کا ضامن ہو، خود انسان کی فطرت کا اقتضا تھا خواہ اس کا نام مذہب رکھا جاتا یا کوئی اور۔ اسلئے اس پر بحث کرنا صرف لفظی نزاع ہوگی کہ اس کا نام مذہب کیوں رکھا گیا، کسی اور نام سے کیوں نہ موسوم کیا گیا۔ بہرحال فی نفسہ مذہب کی ضرورت

یا اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے لامحالہ ہمکو دوسری صورت پر غور کرنا پڑیگا کہ کیا واقعی دنیا نے مذہب کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ـــــ لفظ مذہب کا مفہوم طریق حیات یا طریق عمل ہے جو اپنی جگہ کسقدر معصوم معلوم ہوتا ہے، لیکن جب ہم اس کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ یہی معصوم لفظ دنیا میں کتنی خونریزیوں اور معصیت کوشیوں کا سبب بنا اور وہی چیز جس کو پیام امن و نجات کی صورت سے ہمیشہ پیش کیا گیا، اسے کتنا ہنگامۂ فتنہ و فساد عالم میں برپا کیا۔ لیکن آپ جس وقت جنگوں کی حقیقت پر غور کرینگے تو معلوم ہوگا کہ اسوقت تک حقیقتاً دنیا میں کوئی ایک جنگ بھی ایسی نہیں ہوئی جسے مذہب کے نصب العین سے منسوب کیا جاسکے یا کسی مذہب نے اسے روا رکھا ہو۔ بلکہ تمام لڑائیاں صرف ہوس ملک گیری کی بنا پر قائم ہوئیں، یا خود غرضی یا نفسانی خواہشات پر۔ پھر یہ تو ہوا کہ بعض اہل مذہب نے محض مدافعت و حفاظت کے لئے واقعی خلوص وصداقت کے ساتھ اسلحہ اٹھائے، لیکن جارحانہ جنگ کوئی ایسی نہیں ہوئی جسے مذہبی ضرورت کی صورت میں پیش کیا جاسکے۔ تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں کہ اسنے اپنی عسکریت کی نمائش اسی وقت کی، جب مدافعت وحفظ نفس کے خیال نے ان کو اس کے لئے مجبور کردیا، یا طاغوتی قوتوں نے دنیا کے امن وسکون کو خراب کرنا چاہا، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ دنیاوی اغراض کے لئے اسلام نے کسی کا خون بہایا ہو، پھر جب حقیقت یہ ہے تو کیا انسانی خود غرضی اور نفس پرستی کی اس سے زیادہ کوئی مکروہ مثال مل سکتی ہے کہ اس نے جنگ تو کی ہمیشہ اسباب عیش وتنعم فراہم کرنے کے لئے، جاہ وثروت، دولت وحکومت کی خواہش پورا کرنے کی غرض سے، دشمنوں سے قبائلی وذاتی عناد کا انتقام لینے کے لئے، لیکن منسوب کیا اسے مذہب سے اور مذہب ہی کا نام لیکر اس نے ہمیشہ لوگوں کی جانیں لیں ـــــ تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مذہب کا اولین دور ہمیشہ اس نوع کے جذبات سے صاف و پاک رہا ہے، لیکن جب بعد کو اس میں ایک جماعت دنیا پرست لوگوں کی پیدا ہوئی تو جنگ وجدال کشت و خون سبھی کچھ ہوا، اور لوگوں نے غلطی سے اس کو مذہب کی تعلیم سے منسوب کیا۔ پھر جب حقیقت یہ ہے تو خدا کے لئے آج باہم نوع انسانی کے افراد میں مذہبی تفریق کو استخوان جنگ نہ بناؤ اور مذہب کو بدنام نہ کرو کیونکہ مذہب پیام امن وسکون ہے اور وہ فساد کو کبھی پسند نہیں کرتا۔ اس لئے میرے نزدیک سب سے زیادہ مضرت رساں تحریک دنیا میں وہ ہے جو قومیت اور وطنیت کے رشتہ کو مذہب کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور بڑا ظالم تھا وہ جس نے اول اول اس بدعت کو رواج دیا۔ آج ہندوستان اسی لعنت میں گرفتار ہونے کی وجہ سے ہنوز غلام نظر آرہا ہے درانحالیکہ اس سے بہت چھوٹے چھوٹے ملک کبھی کے آزاد ہوکر ترقی کی راہوں پر لگ گئے ہیں۔ غضب خدا کا کسی ایک ملک میں رہتے ہوئے صدیاں گزر جائیں، وہاں کی آب وہوا کا اثر پشتہا پشت سے ہمارے ذوق ومزاج پر ہوتا چلا آرہا ہو، ایک ہی قسم کی بہار وخزاں میں ایک زمانۂ نامعلوم سے یکساں طور پر زندگی بسر ہورہی ہو، لیکن پھر بھی بیگانگی کا یہ عالم کہ باہم ملکر کھانا بھی نہ کھا سکتے ہوں، محبت و رافت کے ساتھ ایک رات بھی کسی جگہ نہ بسر کرسکیں

مذاہب کا شعائر و مراسم کے لحاظ سے مختلف ہونا عیب نہیں لیکن ان کی وجہ سے باہم گر نفرت و احتراز، بغض و عناد پیدا ہونا یقیناً مذاہب کی توہین ہے، کیونکہ یہ کھلی ہوئی ہلاکت نوع انسانی کی ہے اور دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس کا مقصد انسان یا انسانیت کو ہلاک کرنا ہو اسلئے ہمکو شرم کرنا چاہیئے کہ ہم مذہب کا کتنا غلط استعمال کر رہے ہیں اور انسانیت کی قربانی اپنے اغراض نفسانی کے دیوتا پر چڑھا کر، اسے مذہب کا تراج سمجھتے ہیں

اس وقت اندرون ملک کا سب سے بڑا ہنگامہ جو بہت زیادہ نازک صورت اختیار کرتا جاتا ہے، ہنگامۂ کشمیر ہے، سب سے آخری مرتبہ جب یہ اضطراب وہاں نمودار ہوا، میں وہیں تھا اور وہ سب کچھ میرے ہی سامنے ہوا جو قوت و حکومت ہمیشہ ضعیف و بیدست و پا افراد کے ساتھ کیا کرتی ہے۔ لیکن میں نے مسلمانان کشمیر کی اس غیر معمولی جوش و خروش کی قدر کرنے کے باوجود کبھی پسند نہیں کیا کہ وہ اس وقت اس نوع کے مظاہروں سے کام لیں۔ یہ ناپسندیدگی اس لئے نہیں تھی کہ میں ان کی خواہش آزادی کو پسند نہیں کرتا، بلکہ صرف اس بنا پر تھی کہ کوئی ان کا صحیح قاید و رہنما نہیں تھا اور وہ اپنے بڑھے ہوئے جوش کی وجہ سے بیدردانہ قتل ہو رہے تھے، علاوہ اس کے میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ملک کی موجودہ حالت اس کی مقتضی نہیں کہ اس قسم کا ہنگامہ پیدا کیا جاتا

اس میں شک نہیں کہ حکومت کشمیر بڑی حد تک مجبور ہو گئی ہے کہ وہ مسلمانان کشمیر کے مطالبات کو پورا کرے، لیکن معلوم نہیں مجھے کیوں یہ اندیشہ پیدا ہو رہا ہے کہ اس وقت اہل کشمیر کی یہ کامیابی کوئی ایسا ردعمل نہ اختیار کرے جو خود ان کے اور عام مسلمانوں کے لئے ناخوشگوار نتائج اپنے اندر رکھتا ہو ——

بہر حال اب معاملہ اس حد سے گزر گیا ہے کہ اس کے اثرات کو آسانی سے محو کر دیا جائے، اس لئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ آیندہ نہایت احتیاط سے قدم اٹھائیں اور کوشش کریں کہ یہ مسئلہ کہیں ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلہ نہ بن جائے کہ اس کا مستقبل نہایت خطرناک ہے۔

گول میز کانفرنس میں، ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنیکے لئے، جو گفتگوئیں ہو رہی ہیں، اُنسے نتیجہ نکالنا اب ہر شخص کیلئے آسان ہے اور شاید ہی کوئی دماغ ایسا ہو، جو اس کانفرنس کی کامیابی کی پیشین گوئی کر سکے۔

حکومت کا مقصود یہ ہے کہ کم سے کم جو کچھ دیا جا سکتا ہے، وہی دیا جائے اور ملک کی آزادی چاہنے والے کہتے ہیں کہ ہمیں وہ سب ملنا چاہیئے جسکے بغیر ایک ملک کو آزاد نہیں کہہ سکتے۔

حکومت کہتی ہے کہ فی الحال صوبوں کی وسعت اختیارات پر قناعت کرنا چاہیئے اور ارباب وطن کا استدلال یہ ہے کہ جبتک مرکزی حکومت اختیار کامل نہ دیدیا جائے، اس لطف و عطا کے کوئی معنی نہیں۔

ہندوؤں کی جتنی جماعتیں ہیں، اُن سب کے نمایندے اس اصولی بحث میں متفق ہیں، لیکن وہ حضرات جو اپنے آپ کو مسلمانوں کا نمایندہ کہتے ہیں، ان میں سے بعض تو یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو برطانیہ کی حمایت درکار ہے اور اسی کے ظل عاطفت میں ہمیں جینا مرنا ہے،

بعض کا اصرار ہے کہ ہم فیصلہ صرف دست حکومت کے سپرد کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ مالک ہے، آقا ہے، جو اسکے جی میں آئے کرے جو چاہے دے اور جو چاہے ہم سے چھین لے۔ ہم بندگان مجبور کی فکر بیش و کم کیا فائدہ پہونچا سکتی ہے۔

بعض ہستیاں ایسی ہیں جو پہلے ہی سے اپنا حصہ اور بیش از بیش حصہ متعین کرانا چاہتی ہیں، کیونکہ وہ خائف ہیں کہ اگر انکے حقوق کا سوال ابھی سے طے نہ ہوا، تو پھر انکا پامال ہو جانا یقینی ہے۔ حالانکہ کوئی ان سے سوال کرے کہ آج یہ مسئلہ اگر انکی خواہش کے مطابق طے بھی ہو جائے اور کل کو وہ زبردست جماعت جسکی قوت کو مسلمان نمائندے صرف اس کی تعداد پر منحصر کرتے ہیں عہد سے منحرف ہو جائے تو کون شخص اسکی ذمہ داری لیتا ہے ۔۔۔۔ بہرحال ان حضرات کے دلائل جیسے بھی ہوں، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جس وقت مستقبل میں ہندوستان کی تاریخ لکھی جائیگی اور اسمیں انعقاد کانفرنس کا اہم ترین واقعہ زیب قرطاس ہوگا، تو مسلم نمائندوں کی اس پاکیزہ ذہنیت، اس وطن پرستی، اور اس فداکارانہ جذبۂ ملی کو یقیناً مخصوص قلم اور مخصوص سیاہی سے نہایت نمایاں طور پر درج کیا جائیگا، تاکہ آنیوالی نسلیں دیکھیں کہ اسلام کے بعض وہ افراد جنکی حقیقی عظمت کا اندازہ بہت کم لوگوں نے کیا تھا، کیسا زرّیں کارنامہ صفحات تاریخ پر چھوڑ گئے ہیں سچ ہے ۔۔۔۔ کیست کز کوشش فرہاد نشاں باز دہد مگر آں نقش کہ از تیشہ بخارا ماند

یاد رکھئے کہ اگر کانفرنس ناکام ثابت ہوئی جسکا یقین کیا جاتا ہے، تو ملک میں پھر ایک نئے جوش کیساتھ وہی تمام ذرائع اختیار کئے جائینگے جو اس سے قبل اختیار کئے گئے تھے اور وہ وقت سخت آزمائش و ابتلا کا وقت ہوگا ۔۔۔۔ اگر مسلمان ہندوؤں سے علیحدہ ہو کر ملک و وطن کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں یا کسی کو کیا عذر ہو سکتا ہے لیکن کم از کم ہمیں یہ تو معلوم ہو جانا چاہئے کہ انھوں نے کیا طریق کار پسند کیا ہے اور وہ کن ذرائع سے مقصود تک پہونچنا چاہتے ہیں اگر واقعی کوئی مقصود متعین کیا گیا ہے۔ اگر آج مسلمانوں کی تمام جماعتیں حقیقتاً اسی امر پر متفق ہو جائیں کہ حکومت کی موافقت اور کانگرس کی مخالفت کے علاوہ کوئی صورت مسلمانوں کی فلاح کی نہیں ہے تو کوئی حرج نہیں یہی نصب العین سامنے رکھئے اور اسی پر اپنی تمام کوششیں صرف کر دیجئے، لیکن اسی کیساتھ یہ بھی سوچ لیجئے کہ اگر کسیوقت حکومت کو کانگرس کے تمام مطالبات منظور کرنے پڑے، تو پھر آپ کیا کرینگے اہل حکومت تو حکومت سے دستبردار ہونیکے بعد بھی ایک ترقی یافتہ جماعت کیطرح یہاں اپنا پورا اثر و اقتدار قائم رکھ سکیں گے، لیکن آپکے پاس کونسی ایسی چیز باقی رہ جائیگی جو آپکی حیات کی ضامن ہو سکے۔ دنیا میں صرف ایک ہی چیز ہے جو ایک قوم کو زندگی بخشتی ہے اور وہ غیرت ملی ہے۔ پھر آپکو اختیار ہے خواہ اسکا استعمال آپ اب کیجئے جبکہ تھوڑا بہت وقت باقی ہے، یا اسوقت جب تیر از کمان جستہ کیطرح وہ آپکی دسترس سے بالکل باہر ہو ۔۔۔۔

اسمیں کلام نہیں کہ بہ حالت موجودہ ہندو مسلمانوں کے درمیان کشمکش و افتراق کے متعدد اسباب پیدا ہو گئے ہیں اور یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ ہندو جماعت اب کسی رواداری کیلئے آمادہ نظر نہیں آتی، لیکن اگر غور و تامل سے کام لیا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ "وہ جفاکار سہی کچھ تو خطا اپنی بھی ہے" اسکے اسباب پر غور کیجئے، اور اگر وہ دور ہو سکتے ہیں تو انھیں دور کر کے دیکھئے، ممکن ہے یہ دشوار یاں آسان ہو جائیں۔ یاد رکھئے دوسرے سے ایثار و رواداری کی توقع جبھی ہو سکتی ہے جب ہم بھی اسکے لئے تیار ہوں، ورنہ یونہی سوال صرف سر پھوڑنے کا رہجاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس غرض سے کسی "سنگ آستاں" کی تخصیص نہیں ہوا کرتی، آپکو اختیار ہے جہاں جی میں آئے اسے لڑائیے، زمانہ کو اتنی بھی فرصت نہیں کہ وہ پلٹ کے اس منظر کو دیکھیگا اور آپ پر دو آنسو بہانے کی تکلیف گوارا کریگا

افسوس ہے کہ ماہ گزشتہ کے نگار میں معذرت نامہ سہو کاتب سے بطور ضمیمہ شائع کرنا پڑا اور دفتری کی غلطی سے غالباً بعض پرچوں میں چسپاں نہ ہو سکا۔

نیاز

ضمیمۂ نگار

(آپ اس کی خانہ پُری کر کے منیجر نگار کو بیرنگ بھی بھیج سکتے ہیں)

منیجر صاحب نگار۔

(۱) میں حسب ذیل خریدار نگار کو دیتا ہوں۔ جنوری ۱۹۳۲ء کا نگار جو تقریباً ۲۰۰ صفحات پر مطالبات غالب کے لئے وقف ہے معہ جدید سہ رنگی تصویر غالب کے ذریعۂ وی پی بھیجکر سالانہ چندہ معہ محصول پانچروپیہ چار آنہ وصول کر لیجئے[۱]

(۲) حسب ذیل کتابیں بھی علاوہ محصول رعائتی قیمت پر جو اُن کے نیچے درج ہیں ساتھ ہی ذریعۂ وی پی بھیجدیجئے۔

ظریف شاعروں کا تذکرہ (اصل قیمت للعہ) رعائتی قیمت ۶ر

جذبات بھاشا مصنفہ نیاز فتحپوری (اصل قیمت ۱۲ر) رعائتی قیمت عہ ر

فراست التحریر ہر دو حصے (اصل قیمت عصر) رعائتی قیمت ۸ر

جدید خریداروں کا نام و پتہ ذیل میں درج ہے۔

(الف) . . . .

. . . .

(ب) . . . .

. . . .

نوٹ ۔ اگر رعائتی کتابیں نہیں لینا تو (۲) کو قلم زد فرما دیجئے یا جو کتابیں لینا ہوں اُن کو باقی رکھ کر بقیہ کو کاٹ دیجئے۔

راقم . . . .

. . . .

---

[۱] یہ واضح رہے کہ وی پی وصول کرنے میں آپ کو پانچروپیہ چھ آنے ڈاکخانہ کو ادا کرنا پڑیں گے اور اگر آپ نے منی آرڈر پانچروپیہ کا بھیجدیا تو فیس منی آرڈر صرف دو آنے صرف ہوگی۔ گویا منی آرڈر بھیجنے میں آپ کو ہر کا نفع ہے۔ اب آپ کو اختیار ہے خواہ نگار کا چندہ اور کتابوں کی رعایتی قیمت ذریعۂ منی آرڈر روانہ کریں یا وی پی طلب فرما کر اپنا نقصان برداشت کریں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ اگر کتابوں کے لئے بھی رقم آپ بھیج رہے ہیں تو کم از کم ۵ر اور زیادہ محصول کے لئے روانہ کرنا ضروری ہیں۔

(نوٹ) کتابوں کی رعائتی قیمت سے ہر خریدار خواہ وہ جدید ہو یا قدیم، اسکا چندہ ختم ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ **منیجر**

مسلمانوں کے قومی انتشار و فلاکت کا اصل راز

اور

عزت و برتری کا غلط معیار

دنیا میں حقیقت کے خلاف جہاں بہت سی سینہ زوریاں ہیں، وہاں نسبی شرافت اور نسلی فخر و مباہات کا تخیل بھی ہے، ٹھنڈے دل سے غور کرنے والا ایک انسان جب علوم و معارف کی روشنی میں، نسل کے بننے بگڑنے اور عروج و زوال کا مطالعہ کرتا ہے، تو یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوتی ہے کہ انسان محض اپنی دریدہ ذہنی یا مغالطہ کی بنا پر حقیقت کے خلاف کیسی منہ زوریاں کر رہا ہے، دنیا میں شاید ہی کوئی انسان ہو جو مراتب اور ماحول کے لحاظ سے شرافت و نجابت کا خلل دماغ نہ رکھتا ہو، ایک بڑے سے بڑا مصلح تمدن جب دردمند قوم بنکر اسٹیج پر کھڑا ہوتا ہے تو قوم کے ہر فرد کے ساتھ وہ ایسا ہی رشتۂ اخوت جوڑتا ہے، جیسے اسے خونی و نسلی علاقہ ہو لیکن اللہ رے کایا پلٹ یہی اپنی خلوت کی صحبتوں میں اپنی برادری و قوم کے سوا دوسروں کو ہیچ سمجھتا ہے، ایک واعظ ممبر پر چڑھ کر نبی اکرم کی حدیثیں پڑھتا ہے، آپ کا درس اخوت سناتا ہے، خود روتا ہے، دوسروں کو رلاتا ہے، لیکن یہی صاحب جب پند و وعظ کہکر گھر میں جاتے ہیں تو پھر مت پوچھئے وہی آپ ہیں اور آپ کی انانیت، الغرض کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس نے اپنی شرافت و نجابت کے مقابلہ میں عام انسانوں کو جن کی نسلی شرافت دنیا میں تسلیم نہیں کی جاتی ہے، اپنے عمل یا اپنی گفتار سے اشارۃً یا کنایۃً فروتر نہ بتایا ہو یا ان سے غیر مساویانہ سلوک نہ کیا ہو انسان ایسا کیوں کرتا ہے یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے جس پر آیندہ سطور میں روشنی ڈالی جاویگی یہاں مجھے دکھانا صرف یہ ہے کہ تخیل نسب کے باب میں انسان کس قدر فریب خیال میں مبتلا ہے، ؟ جہاں تک یہ تخیل کس قوم میں زیادہ ہے وہیں تک وہ اجتماعی ترقی اور قومی منزلت سے دور ہے،

غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نسب کا تخیل انسان کے اندر سیاسیات کے اثر سے پیدا ہوا ہے، اور محض سیاسی انقلابات نے انسان کو اصطلاحی شرافت کا مدعی یا نسلی پستیوں میں مبتلا کر دیا ہے، تاریخ اسلام ہی کو لے لیجئے اور مختلف

خاندانوں کے عروج و زوال کے واقعات پڑھ جائیے، آپ کو معلوم ہو جاوے گا کہ دولت و جاہ کے ساتھ انسان کا نظریۂ شرافت و نجابت بدلتا رہتا ہے، بہت سے مدعیان نجابت نے ایسے ایسے گھرانوں سے نسلی علاقہ قائم کر لیا جنکے پاس دولت و حکمرانی نہوتی تو وہ کبھی ایسا نہ کرتے، قطب شاہیہ خاندان کا بانی غلام تھا لیکن صفویہ (جنکا نسب شیخ صفی الدین اردبیلی کے سلسلہ سے حضرت موسیٰ کاظم تک منتہی ہوتا ہے) اور سادات طباطبائی (حسنی سید) نے ان سے ازدواجی تعلقات قائم کئے اسی طرح مغلیہ کا دور حکومت آیا تو صفویہ نے اپنے خاندان کی لڑکی مغل شاہزادہ سے بیاہ دی اسی طرح حصول حکومت یا حاکمانہ اثر جمانے کے لئے مختلف خاندانوں نے اپنا سلسلۂ نسب قدیم شاہی خاندانوں سے قائم کر دیا کون نہیں جانتا سلطنت بھمنیہ کا بانی علاء الدین حسن ایک برہمن کا نوکر تھا لیکن شعراء کے تخیلات نے اس کا شجرۂ نسب سلاطین فارس سے جوڑ دیا، اسی طرح عادلشاہیہ کا بانی یوسف عادل خاں بہ روایت بحر المواج ایک جرکسی غلام تھا جسے محمد شاہ بہمنی نے خریدا تھا لیکن فرشتہ اور بساتین السلاطین کی روایات کے مطابق لوگوں نے اسے سلاطین روم (عثمانی خاندان) سے جا ملایا اور اس پر ایک نہایت پُر لطف افسانہ بھی بیان کیا گیا، قطب شاہیہ کا زور ہوا تو اس کا سلسلۂ نسبی بھی ترکستان کے حکمرانوں سے جوڑا گیا اسی طرح نظام شاہیہ برید شاہیہ وغیرہ کے بانی غلام تھے، لیکن حکومت حاصل کرنے کے بعد مقامی اثر پیدا کرنے کے لئے انھیں برہمن وغیرہ کہا گیا فرشتہ کئی صدیاں گزرنے کے بعد بھی علمائے انساب کے دلائل کی بنا پر علویہ مصر کو اہل بیت سے نہیں تسلیم کرتا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ بہت سے حضرات نے محض سیاسی اغراض کے لئے اپنا نسب نامہ بنالیا ہے جسکی صراحت آپکو آیندہ صفحات میں ملے گی، اس لئے تاریخی شواہد کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی اغراض کے حصول اور سیاسی اثر پیدا کرنے کے لئے نسب گڑھ لیا جاتا ہے، اسی طرح جاہ و منصب دولت و حکومت نسلی اختلاط کا موجب بنجاتی ہے، اور اس طرح ایک ذلیل قوم محض دولت و ثروت کی بنا پر شریف و نجیب بن بیٹھتی ہے، سیاسی تغیرات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ شرافت و نجابت در اصل کوئی شے نہیں ہمارے حالات زندگی کے ساتھ یہ بھی انقلاب پذیر رہی ہے، کوئی کہہ نہیں سکتا آج جو شریف و نجیب بنے بیٹھے ہیں وہ چند صدیاں قبل بارگاہ نجابت کے حاشیہ نشین تھے بھی یا نہیں؟ اسی طرح آج جو حقیر و ذلیل خیال کیا جا رہا ہے، کل اپنے مساعی و اولوالعزمی، اپنی قوت ارادی و کمالات صوری و معنوی کی بنا پر شرافت نسبی کا مدعی نہ بن بیٹھے گا؟ یہ تو کلیہ ہے کہ تاریخ اپنے واقعات کا اعادہ کرتی ہے، جب آپ حقیقت کے خلاف اپنی اصلیت کو پیش کر رہے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کل آپ کی کمزوریوں اور اپنی جفاکشی سے فائدہ اٹھا کر دوسرا آپ کے مقابلہ میں اپنی برتری کا دعویٰ دار نہ ہو جائے،

ماہرین علم الانسان نے نسل انسانی کے اختلاط کے متعلق جو نظریات قائم کئے ہیں وہ اس قدر محکم اور معقول ہیں کہ کوئی صاحب ہوش ان سے انکار نہیں کر سکتا آپ کو آیندہ صفحات سے پتہ چلے گا کہ دنیا کی تمام زندہ قومیں مخلوط النسل ہیں اس لئے نہ منقولات کی روشنی میں کسی انسان کا دعویٰ نجابت قابل تسلیم ہے نہ معقولات کی روشنی میں،-

انسانی نفسیات کی یہ ہنگامہ آرائیاں کچھ کم حیرت زا نہیں کہ ہم ایک ہی شے کو ایک خاص ماحول میں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اسی شے کو جب دوسرے ماحول میں دیکھتے ہیں تو اس سے روحانی وابستگی کر لیتے ہیں ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ہماری یہ ذہنی انقلاب پذیری ہماری کمزوریوں کی بہت کچھ آئینہ دار ہے، کون نہیں جانتا حضرت خواجہ حسن بصریؒ حضرت ام المومنین بی بی ام سلمہ کی لونڈی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے، حضرت ذوالنون مصریؒ کے والد ماجد قریش کے ایک نوبی (حبشی) غلام تھے، ولید بن عبداللہ سقا زنگی تھے، حضرت معروف کرخی کے والد علی بن موسی رضاؒ کے غلام تھے اور دربانی کی خدمت پر مامور تھے، حضرت بایزید بسطامیؒ کے دادا گبر (آتش پرست) تھے پھر مسلمان ہو گئے، ابو محمد حداد ابوعبداللہ مہدی، ابوحفص حداد، ابوجعفر حداد وغیرہم لوہاری کا پیشہ کرتے تھے، حضرت جنید بغدادی کو "قواریری" کہتے ہیں اس لئے کہ آپ کے والد ماجد شیشہ بیچتے تھے، حضرت عبدالملک اسکاف چماری کا پیشہ کرتے تھے حضرت مالک دینارؒ اپنے والد کی غلامی کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے، (دیکھو نفحات الانس جامی اور جواہر الاسرار مصنفہ حسین بن حسن سبزواری)

نجابت و شرافت کے دعویدارو! ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر ان واقعات پر غور کرو، اگر پیشہ کی وجہ سے کوئی شخص ذلیل ہو سکتا ہے، تو اکابر صوفیہ جنھوں نے تصوف اسلامیہ کی بنیاد قائم کی اسی ذلیل پیشہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اگر تم انکے سامنے نیایش و عجز کرنے پر مجبور ہو تو کوئی وجہ نہیں آج ایک مسلمان کو صرف اس وجہ سے ذلیل سمجھو کہ وہ ایسا پیشہ کرتا ہے، جسے تم ذلیل سمجھتے ہو زیادہ سے زیادہ پیشہ کو فروتر کہہ سکتے ہیں انسان کی شرافت کو اس سے کیا تعلق؟ لطف تو یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں پیشہ سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی انسان کے جسم میں اس پیشہ کی ذلت خون کی طرح جاری و ساری رہتی ہے،

نسلی عصبیت نے سیاسیات اسلامیہ کو کس قدر نقصان پہونچایا! ایک دلدوز تاریخی حقیقت ہے، بنی حمیر اور آل مضر کی قدیم قبائلی نزاع نے عرب سے باہر ممالک عجم میں تاریخ کے جو عبرتناک صفحات چھوڑے ہیں وہ ہمیں سبق دینے لئے کافی ہیں ہسپانیہ کے اندر عرب نسل کے لوگوں نے مولدین اور مقامی باشندوں کے ساتھ جیسا حقارت آمیز سلوک کیا اس کی داستان اسقدر غمناک اور اس کا نتیجہ اسقدر درد انگیز ہے، کہ اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے آج بھی دل مسوس لیتے ہیں مشہور مورخ امیر علی (مرحوم) نے اپنی تاریخ عرب کے اندر ان واقعات پر نہایت عاقلانہ طور پر رائے زنی کی ہے جس کا اقتباس حسب ذیل ہے،

عرب میں بہتیری دفعہ مختلف قومیں آباد ہوئیں، لوگوں کا خیال ہے کہ قدیم باشندے اسی نسل سے تھے جس نسل سے قدیم کلدانی ہیں انھوں نے بہت بڑی تمدنی ترقی کر لی تھی جس کے آثار ہنوز جنوبی عرب میں پائے جاتے ہیں خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی حکومت مصر اور دیار بحر تک پھیلی ہوئی تھی انھوں نے بڑی بڑی عمارتیں اور معابد بنائے اور مشہور تالاب جو ہنوز عدن کے نزدیک پائے جاتے ہیں ان کے تعمیری کارناموں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔

اس قدیم قوم کو ایک سامی الاصل قبیلہ نے تباہ کر ڈالا، جو دریائے فرات کے مشرقی جہت کے بعض مقام سے رونما

ہوا، اور یمن اور حضر موت کے بعض حصوں میں آ گیا انہیں قحطان (جنھیں جقتان بھی کہا جاتا ہے) کی اولاد کہتے ہیں اس قحطان کے ایک لڑکے کے نام پر جسے "یعرب" کہتے تھے، ملک اور قوم کا نام پڑ گیا اس خاندان کے بادشاہ یعرب کے پوتے عبدالشمس ملقب بہ "صبا" کے نام پر صابیین کہلاتے ہیں قحطانی بادشاہ بڑے فاتح اور شہروں کے بنانے والے گزرے ہیں اور انکی حکومت یمن اور عرب کے دوسرے حصوں میں ساتویں صدی عیسوی تک باقی رہی،

آخری آباد ہونے والے بنی اسمٰعیل کہلاتے ہیں اسمٰعیل یہودیوں کے جدامجد حضرت ابراہیم کے بیٹے تھے وہ مکہ کے نزدیک آباد ہوگئے اور ان کی اولاد نے حجاز کو بسایا اور فی الحقیقت یہی عربی عظمت کے باقی ہیں . . . .

محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے زمانہ میں جو آبادی تھی وہ دو مختلف نسلی انتساب کی دعویدار تھی ایک تو بنی قحطان دوسرے بنی اسمٰعیل، آخری زمانہ میں بنی قحطان کو ان کے قدیم بادشاہ عبدالشمس کے ایک لڑکے کی نسبت سے "حمیری" کہنے لگے گو عرب محققین ان کی ابتدائی سکونت کے لحاظ سے انھیں "یمنی" کہتے ہیں وہ قبیلہ جو یمن نے دارالسلطنت مریب یا "سبا" کے اطراف میں آباد تھا، بنواز د تھا، از د قحطان کی اولاد سے تھا دوسری صدی عیسوی میں بنواز د شمال کی طرف بڑھے، دوسرے قبائل کو ان کے لئے جگہ خالی کرنی پڑی، بنواز د کا ایک حصہ "خزاعہ" کے نام سے مکہ کے نزدیک بطن مرہ میں آباد ہوا جہاں وہ بعثت نبوی کے زمانہ میں بھی تھے دوسری شاخ یثرب میں پہونچی اور امتداد زمانہ نے اسے دو قبائل "اوس" اور "خزرج" کی صورتوں میں ترقی دی دوسرے شام اور عراق میں پہونچے، جو شامی علاقوں میں آباد ہوئے انھیں بنوغسان اور جو اطراف عراق میں پہونچے انھیں بنوکلب کہتے ہیں ایک دوسرا ٹکڑا ہمدان میں پہونچا اور ایک بڑی تعداد نے مشرقی سمت مرکز عمان اور خلیج فارس کے سواحل پر اپنی سکونت اختیار کی مختصراً آن حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے وقت حمیری عربوں کی سکونت و مقبوضات کی یہ حالت تھی

عرب کے اسمٰعیلی قبائل کو بعض اوقات بنو معد مگر اکثر بنو مضر کہتے ہیں، مضر، معد کے ایک پوتے تھے، گو عربی تاریخوں میں یہ عام لقب ماتحت قبائل بنی قریش، بنی قیس، بنی بکر، بنی تغلب اور بنو تمیم پر بھی مشتمل ہے قریش لوگ مکہ اور اس کے اطراف و جوانب میں آباد ہوئے دوسرے قبائل بہ استثنائے یثرب (یا مدینہ) تمام حجاز اور وسط عرب میں پھیل گئے،

ان دونوں قوموں بنی حمیر اور بنی مضر میں ایک زبردست مستقل مخالفت قائم تھی جو دشمنی کی حد تک پہونچی ہوئی تھی وہ شخص جو اس مسئلہ کو یوروپی تاریخ کے نقطۂ نظر سے دیکھے گا، اس کا پتہ نہیں لگا سکتا، سکیسن کے ساتھ کلٹ انگریزوں کیساتھ آئرش کی اور "یول" کے ساتھ "رس" کی عداوت کی تفدیہ صدیوں کا ظلم اور بدنظمی حکومت ہی جنکے ماتحت کمزور قوم مبتلائے مصیبت رہی یورپ میں محاورات ورسوم اور اکثر معتقدات کا اختلاف دو قوموں کے اختلاط میں جو زبردستی اندھی حکومت کے زیر اقتدار آجاتی ہیں، رکاوٹ کا سبب ہے، لیکن عام طور سے چند ہی صدیوں کی دوادوش

انھیں باہم مخلوط بنا دیتی ہے

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل عربوں کا یہ معاملہ نہ تھا، پیغمبرؐ کی بعثت کے بہت قبل حمیری زبان جو سامی اور مقامی زبانوں کے اختلاط سے پیدا ہوئی تھی خالص عربی زبان بن چکی تھی، بنی مضر یہی زبان بولتے تھے، جس نے ایک علمی فوقیت حاصل کر لی تھی اور جزیرہ نمائے عرب کے تمام باشندے مکالمہ کے خفیف اختلافات کے ساتھ ایک ہی زبان بولتے تھے، انکا رسم و رواج، ان کے خیالات و جذبات یکساں تھے اور پھر بھی دونوں قوموں کے درمیان ایک شدید اور بین تقسیم تھی ہم لوگوں کو اس کا سبب دریافت کرنے کے لئے گہری جستجو کرنی چاہیئے، بعثت اسلام سے کئی صدیاں قبل حمیریوں نے ایک عظیم الشان تمدنی ترقی کر لی تھی وہ جہاں کہیں بھی آباد تھے ایک منظم حکومت رکھتے تھے، اس میں شک نہیں یہ قدیم طرز کی ہوتی تھی، پھر بھی ان کی شہری زندگی کے معمولی مقاصد کے لئے کافی طور پر باضابطہ تھی، وہ فن تحریر سے واقف تھے، اور خصوصیت کے ساتھ زراعت کا پیشہ کرتے تھے، بنی مضر (باستثنائے قریش جو قصی کے زمانہ سے ایک حد تک متمدن ہو گئے تھے) خانہ بدوش اور صحرا نورد تھے، ہر قبیلہ مفاد اور ہمدردی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف تھا اور اپنا اپنا سردار ایک قسم کی رائے عامہ سے منتخب کرتا تھا اس تقسیمی حالت نے انھیں ملوک حمیر کی اطاعت کے لئے مجبور کر دیا اور وہ (بنی مضر) پیہم جنگ و جدل کے باوجود پانچویں صدی عیسوی تک انھیں خراج دیتے رہے، بنی حمیر اور بنی مضر کی پیہم لڑائیوں نے جنکا مقصد ایک طرف جبروت و اقتدار حاصل کرنا اور دوسری طرف خود مختاری حاصل کرنا تھا بغض و عداوت کا ایک سخت احساس پیدا کر دیا تھا اور دونوں میں مخالفت کی ایک آگ مشتعل تھی جسے ہر دو طرف کے مغنی اور شعرا ان ایام کی یاد دلا کر جبکہ کندہ نے بنی تمیم کا تعاقب کیا اور بنی قیس بنی ازد پر ٹوٹ پڑے، بربار کھتے تھے۔ محمدؐ کی تبلیغ نے نسلی عداوت کو مٹانا اور مغنیوں کا اثر زائل کرنا شروع کیا۔ اگر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو آپ کی تعلیم اور آپ کی عجیب و غریب شخصیت ان کو ایک قومی رشتہ میں منسلک کر دیتی دس سال کی رسالت کا زمانہ گو پر جوش تھا لیکن قومی عصبیت کے زہر کو جو صدیوں عربوں کے خون میں سرایت کر چکا تھا، بجھانے کے لئے بہت کم زمانہ تھا مدینہ میں جہاں آپ کا اثر مستقل اور مسلسل تھا یہ اختلاط مکمل پایا جاتا ہے،

حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کے زمانہ میں موج فتوحات قبایل عرب کو دنیا کے مختلف حصوں میں لے گئی، بنی مضر بصرہ میں آباد ہوئے، بنی حمیر خصوصیت کے ساتھ کوفہ میں بسے، فلسطین اور صوبہ دمشق میں بنی مضر صاحب اقتدار تھے۔ شام کے شمالی حصہ پر شمالی عرب کی طرح بنی حمیر قابض ہوئے، مشرقی صوبوں میں بھی کم و بیش مصر و افریقہ کی طرح برابر پھیل گئے، لیکن جہاں کہیں وہ گئے، اپنی قدیم مخالفت ساتھ لیتے گئے، عمر اعظمؓ کے زمانہ میں یہ جبریہ مخالفت دبی رہی اگر حضرت علیؓ امن کے ساتھ حضرت عمرؓ کے جانشین ہو جاتے تو غالباً دونوں قبیلے ایک قومی صورت اختیار کر لیتے لیکن حضرت عثمانؓ کی حکومت میں بنی امیہ نے اپنی غرض کے لئے ختم ہو جانے والی دشمنی کی اس آگ میں جو خاکستر کے اندر دبی ہوئی تھی، پھر

اشتعال دے دیا یہاں تک کہ اس نے ایک شعلۂ ملتہب کی صورت اختیار کرلی جو اسی خوفناک طریقہ سے ہسپانیہ اور صقلیہ میں دہک رہا تھا اس طرح افریقہ کے ریگستانوں، خراسان کی وادیوں اور کابل کے دشت زاروں میں ملتہب تھا۔ اس افسوسناک دشمنی نے عرب، بَربر اور جرمن دروتی قوموں کی قسمت پر جنکے ساتھ عرب مبارزت میں الجھے ہوئے تھے گہرا اثر کیا اس نے ان کے فتوحات کی راہ اس وقت مسدود کردی جبکہ مغرب ان کے قدموں پر تھا اور ان کے ممالک محروسہ کا ایک حصہ ضائع کردیا مسلمانوں کی ہسپانوی سیاسیات کے متعلق مؤرخ موصوف مفصلۂ ذیل تبصرہ کرتے ہیں

خلیفہ ہشام نے ۱۸۰ھ میں انتقال کیا اس کا لڑکا حکیم ملقب بہ المختصر اس کا جانشین ہوا، ابن اثیر اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ عاقل شجاع اور باکمال بادشاہ گزرا ہے، اور ملوک اندلس میں وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنے چاروں طرف شان و شوکت کے سامان جمع کرلئے لیکن اس کی حکومت میں اندرونی مشکلات کے باعث برابر بے امنی رہی۔ فقہا جیسا چاہتے کرتے، وہ مزاج کے اعتبار سے ایک راہب کی زندگی گزارنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا اس کی طبیعت نشاط پسند تھی وہ شکار کا شایق تھا، اور فقہا و علمائے دین کی صحبت سے سکون پذیر نہ تھا اس نے اپنے یہاں شعرا، مغنی اور علما کی جماعت پیدا کرلی تھی، ان سب باتوں سے فقہا اس سے ناخوش ہوگئے ہشام کی فیاضانہ کو غلط حکمت عملی سے ملک میں فقہا کا اقتدار قایم ہوگیا تھا حکم بھی گو ان کے ساتھ توجہ کے ساتھ سلوک کرتا تھا اور عدالت کے فیصلوں کے مطابق عمل کرتا تھا لیکن اس نے ان کو معاملات حکومت سے بالکل جدا کردیا تھا انھوں نے دیکھا کہ ان کی امید اقتدار پر پانی پھر گیا وہ دینی عالم ہونے کے فخر میں چور تھے، انھوں نے منبر پر اسے ملحد اور لامذہب کہا اور اس کی روح کی نجات کے لئے دعا کی اس صورت سے انھوں نے مسلم اہل ہسپانیہ کی مذہبی عصبیت کو ابھارا جن پر ان کا لامحدود اثر تھا تمام جزیرہ نما میں آبادی کا بڑا حصہ نومسلموں پر مشتمل تھا خاص خاص شہروں مثلاً قرطبہ اشبیلیہ، طلیطلہ اور میڈرڈ وغیرہ میں نومسلم اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے عربوں، بربریوں اور مسلم اہل ہسپانیہ میں بالخصوص شمالی صوبوں میں شادی بیاہ کا رواج تھا ایسی شادی بیاہ سے جو اولاد ہوتی تھی اسے "مولد" کہتے تھے خالص نسل کے عرب "بلادیوں" (ہسپانیہ کے اصلی باشندے) اور "مولد" کو حقارت سے دیکھتے تھے ان کے ساتھ متکبرانہ سلوک کرتے اور عہد اموی میں فارس کی طرح انھیں حکومت کے اعلیٰ مناصب سے محروم رکھتے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے جواب میں دونوں ان سے نفرت کرتے نومسلم اہل ہسپانیہ نے بیا پے عربی حکومت کے خلاف غضبناک ابغاوتیں کیں فقہا اس سخت نسلی اختلافات کو دبانے کی بجائے دیسی باشندوں کے ساتھ شریک ہوگئے اور ان کو بادشاہ کے خلاف بغاوت انگیز رویہ اختیار کرنے میں ترغیب دی

مسلمانو! عبرت حاصل کرو، ایک وہ زمانہ تھا جبکہ نبی اکرمؐ غیروں سے اپنا رشتہ جوڑتے تھے آپ نے بنی حمیر اور بنی مضر کی قدیم نزاع مٹادی، کیا تاریخ کا یہ معمولی واقعہ ہے، کہ انصار (آل حمیر) اور مہاجرین (بنی مضر) میں مدینہ کے اندر مواخاۃ کا رشتہ قائم ہوگیا اسلام نے صرف یہی نہیں کہ قریش کی نسلی عصبیت کا ایک حد تک خاتمہ کردیا بلکہ

ان کے خون کے ساتھ عجمی بربری، نوبی شامی خون ملا دیا اور اس طور سے ان کے پندار کا دروازہ ہی بند کر دیا عہد نبوت پر ایک سرسری نظر کیجئے، آپ کو پتہ چلے گا کہ وہ مسلمان جو اسلامی عقائد کے مطابق تمام مسلمانوں سے زیادہ محترم ہیں تعداد میں بہت کم تھے، مہاجرین اور انصار کا اختلاط نسلی تاریخ اسلام کی کھلی ہوئی حقیقت ہے، اگر آپ اپنی قریشیت و ہاشمیت میں کسی حیثیت سے دوسراخون شامل ہونا تسلیم نہیں کرتے تو خدارا خود کو ان افضل المسلین سے نہ جوڑئیے جنھوں نے توسیع مذہب کے لئے وطن چھوڑا، بال بچے چھوڑے، بیویوں کو طلاق دی وہ تو مجبور تھے کہ جدید تحریک کا ساتھ دینے کے لئے دوسرے خاندان اور اجنبی نسل کے لوگوں کو اپنے اندر جذب کریں اگر آپ اپنی اصلیت اور شرافت نسبی کے ایسے ہی مدعی ہیں تو ان مسلم آزار قریشیوں سے رشتہ جوڑئیے جو فتح مکہ تک اسلام نہ لائے، اس کے بعد بھی فارس و شام مصر و بربر، ہسپانیہ و روم، ہند و چین میں عربوں نے ہجرت کی اور وہاں مقامی باشندوں کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کئے اس لئے کوئی مسلم ہرگز یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ماں اور باپ دونوں طرف سے وہ عہد اسلام سے آجتک قریشی یا ہاشمی ہے، موجودہ ہاشمیوں اور قریشیوں میں (میری مراد ان سے ہے جو عہد جدید میں خواہ مخواہ نہیں بن بیٹھے) بہت سے ایسے بھی ہوں گے جنکا آبائی سلسلہ فارس اور بربر، حبش و شام کے مسلم غلاموں تک منتہی ہوگا مادری سلسلۂ نسب کی حفاظت تو مسلمانوں کا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے، اور اگر ان کا دعویٰ صحیح بھی ہو تو بھی جن حضرات کا سلسلۂ نسب پدری جانب سے ہاشم یا قریش تک مستند و معتبر ہے خواہ ان کا مادری نسب کسی قوم سے کیوں نہ ملتا ہو کسی طرح نجابت و شرافت کے دعویداروں سے فروتر نہیں ہو سکتے کیا آپ اہل بیت اطہار کے مادری سلسلۂ نسب سے واقف نہیں، ؟ آپ کو آیندہ سطور سے پتہ چلے گا کہ کس طرح نوبی، رومی، بربری ایرانی لونڈیاں خاندان رسالت میں جذب ہوئیں اور کس قدر کثیر اولاد انھیں لونڈیوں کے بطن سے پیدا ہوئی، اسلامی دنیا کا کون انسان ہے جو حضرت موسیٰ کاظمؑ امام رضا، علی نقی، محمد تقی، حسن عسکری، محمد مہدیؑ کی نجابت کو تسلیم نہیں کرے گا لیکن یہ تمام حضرات لونڈیوں ہی کے بطن سے تھے، حضرت علیؑ، حضرت حسنؑ اور امام زین العابدینؑ کی کثیر اولاد جو لونڈیوں کے بطن سے پیدا ہوئی سادات نجیب کے نام سے دنیا میں پھیلی پس ہمارے ہندوستان کے "منہ زور" شیوخ و سادات خواہ مخواہ پندار کو راہ دیکر کیوں اپنی برادری کے ان افراد کو "خارج" (OSTRACISED) کر دیتے ہیں جو غیر قریشی ماؤں کے بطن سے ہوں، ابھی وقت ہے کہ شیوخ و سادات اس "افسانۂ درد" کو سنکر توجہ کریں اور اپنی روایاتی عظمتوں کی لاج رکھ لیں ورنہ وہ دن زیادہ دور نہیں جبکہ ہندوستان کے قریشی الاصل مسلمان جنکو شیوخ و سادات محض اس بنا پر اپنی برادری میں شامل نہیں کرتے کہ وہ غیر قبیلہ کی ماؤں کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں اپنا ایک نظام الگ قایم کرلیں کیونکہ ہندوستان کے بعض خاص مقامات میں ایسے افراد کو جو معاشرانہ دقتیں لاحق ہوتی ہیں ان کی داستان اس قدر دلخراش ہے - کہ پیروان اسلام کی طرف منسوب کرنے کو جی نہیں چاہتا، ابھی میں ان عملی تجاویز کو پیش کرنا نہیں چاہتا، جنکے ماتحت

قریشیوں کا نظام درست ہو سکتا ہے، اور یہ کہ غیر قریشی مسلمانوں کے ساتھ ان کے کیا مخصوص تعلقات ہونا چاہئیں جنھیں عام طور پر شیوخ و سادات نے نظر انداز کر دیا ہے۔ اس وقت مقالہ ہذا پیش کر کے میں ہندوستانی مسلمانوں کو ان کی کمزوریوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں یہ خیالات صرف شیوخ و سادات ہی کے لئے مفید نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے مفید ہیں خواہ ہیئت اجتماعیہ میں وہ ممتاز حیثیت رکھتے ہوں یا فروتر سمجھے جاتے ہوں کیونکہ تمام قبایل (ذات) کے یہاں نسب میں مادری سلسلہ کو یکساں اہمیت دی جاتی ہے، اور ہر قبیلہ کا ایک ایسا فرد جو غیر قبیلہ کی عورت کے بطن سے پیدا ہوا ہو اسی طرح "خانماں برباد" ہوتا ہے جس طرح آل قریش و آل ہاشم۔

سبب تالیف جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے مقالہ ہذا اپنی نوعیت کے لحاظ سے اُردو زبان میں بالکل جدید چیز ہے لیکن ناانصافی اور ناقدر شناسی ہوگی اگر میں اسی کے ساتھ یہ اعتراف بھی نہ کر لوں کہ اس موضوع پر جناب ہوش بلگرامی کا ایک مختصر سا مضمون "واسطی النسل مسلمان" کے عنوان سے غالباً اواخر ۱۹۲۷ء یا ابتدائے ۱۹۲۸ء میں "نگار" کے اندر شائع ہوا تھا ہرچند اس کے اندر مقامی رنگ تھا اور مقالہ ہذا کی ترتیب و مباحث کو اس سے علاقہ نہیں لیکن جناب نواب سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی کی اخلاقی جرأت قابل صد عظمت ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے اندر پہلے پہل ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا جس پر آج تک کسی نے اظہار خیال نہیں کیا اور یہ میرے خیال میں ارباب علم کی.. اخلاقی جرأت کے فقدان اور رسمیات کے ساتھ لغو و مہمل سازگاری کا نتیجہ ہے میں نے جناب ہوش کا وہ مضمون اس وقت پڑھا تھا جب مجھے اخباری دنیا سے مطلق لگاؤ نہ تھا کیونکہ ستمبر ۱۹۲۸ء سے میری اس زندگی کی ابتدا ہوئی پھر بھی آج تک مجھے آپ کا وہ نوٹ یاد ہے جس کے تحت آپ نے بعض ارباب وطن کی سفیہانہ نکتہ چینیوں اور حاسدانہ رویہ کا گلہ کیا تھا جناب ہوش ملک کے مشہور ادیب ہیں ایک بلند پایہ شاعر شمار کئے جاتے ہیں، لوگ آپ کے وطنی تعلقات سے بھی واقف ہیں (جہاں فطرت کی فیاضیاں صرف ادیب و شاعر، عالم و فاضل ہی پیدا کرتی ہیں) اور حیدرآباد نیز آپ کے اعلیٰ فوجی منصب سے بھی لیکن میرے دل میں جناب ہوش کی جو حقیقی عظمت ہے وہ نہ تو آپ کی ادبیت و شاعرانہ بصیرت کے باعث ہے نہ واسطی الاصل اور امیر العسکر ہونے کی وجہ سے، آپ کے مسطورۂ بالا مقالہ نے میرے دل پر آپ کی اخلاقی جرأت کا ایک ایسا نقش جمیل بٹھا دیا ہے، جس کی دردمند تفسیر حزیں لاہجی کے اس شعر سے بہتر نہیں ہو سکتی ؎

صید از حرم کشد خم جعد بلند تو — فریاد از تطاول مشکیں کمند تو

حزیں کی طرح میں بھی جناب ہوش کے "تطاول ادبی" کا فریادی ہوں کیونکہ صوبہ بہار کا ایک دور افتادہ طالب العلم دکن کے اس ادیب رعنا کے مقابلہ میں "صید حرم" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، ناظرین یہ جانکر سخت تعجب کریں گے کہ میں جناب ہوش کو بس اسی قدر جانتا ہوں جس کا اظہار میں نے سطور بالا میں کیا ہے ورنہ ممدوح کو تو یہ بھی خبر

نہیں کہ کوئی "دل شوریدہ" بقول غالب " ایک عمر سے حسرت پرست بالیں ہے"

بہرحال مقالہ ہذا اردو صحافت میں "ثانوی" حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ یقیناً اس میدان کے اولین ہیرو جناب ہوش ہیں مقالہ ہذا جن جذبات کے تحت لکھا گیا ہے وہ مجھے سالہا سال تک بے چین کر چکے ہیں یہ جذبہ مجھ میں اس وقت پیدا ہوا جب میں نے غالباً آٹھ یا نو سال کی عمر میں اپنے والد مرحوم سے ایک سوال کیا تھا مرحوم کو کیا خبر تھی کہ جس سوال کا جواب وہ اس آسانی اور غیر اہمیت کے ساتھ دے رہے ہیں وہ آگے چل کر میرے دماغ کا بے چین کرنے والا مرکزی خیال ہو جاوے گا جس کے ڈانڈے جنون سے ملتے ہیں مسلسل بیس اکیس سال تک اس جذبہ کی پرورش کرنے کے بعد آج میں اس کا اظہار کرنے بیٹھا ہوں اس عرصہ میں روح کے اندر جیسی دردمندی و فتادگی خیال کے اندر جیسی حیات فرسا سلسلہ جنبانیاں ہوتی رہیں انھوں نے میری نفسیات پر گہرا اثر کیا ایک مدت تک دل کی حالت ایسی تھی کہ "تکاد تمیز من الغیظ" میری آنکھوں کے سامنے ایسے مناظر تھے جنھیں دیکھ دیکھ کر میرا دل دکھتا تھا، قلب بے چین تھا آنکھیں نم تھیں گویا دنیا التعبیر تھی آتشکدہ سے اور اس کی جلن سوز جہیم سے کم نہ تھی نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ (وہ اللہ کی آگ ہے۔ سلگائی ہوئی۔ جو دلوں تک جا پہونچے گی)

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینہ کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اگر ایک طرف جناب سید ناظر الحسن کی جرات اخلاقی نے مجھے بھی اس میدان میں حوصلۂ خامہ فرسائی بخشا تو دوسری طرف جناب خواجہ نذیر حسن مرحوم کی زندگی نے مجھے اس کا موقعہ دیا کہ میں آپ کی زندگی کے مد و جزر کا مطالعہ کرنے کے بعد دنیا کے سامنے اپنی "حدیث درد" پیش کروں نذیر حسن کا نام آتے ہی میں خیال کی ایک ایسی بسیط فضا میں جذب ہو جاتا ہوں جہاں ہستی تعبیر ہے ایک گہرے سوز دروں سے جہاں پہونچ کر ہماری حسیات زندگی کا مقصد محض درد و الم بتاتی ہیں اہل دنیا کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کی جدائی پر پرسوز مراثی کہتے ہیں مرنے والے کے نقوش وفا پر دلآویز پیرایہ میں روشنی ڈالتے ہیں اور اس طور سے خود روتے ہیں دوسروں کو رلاتے ہیں دنیا کے اندر فطرت کی فیض بخشیوں میں سے اولاد بھی ہے جو اس فرض کو انجام دیتی ہے لیکن آہ! نذیر اس سے بھی محروم رہے ان کی زندگی کے وہ واقعات جن کا تعلق "نہاں خانہ خلوت" سے ہے اور جن کی حقیقت سے اولاد، بیوی اور قریبی رشتہ داروں کے سوا کوئی دوسرا باخبر ہو ہی نہیں سکتا معمولی سطح کی چیزیں نہیں ہیئت اجتماعی کا نظریہ تقدس و محبت ہی جداگانہ ہے وہ عبائے زرّ اور دستار و جبہ کی پرستش کرتی ہے، وہ جان دیتی ہے تو ظاہر فریب تقدس پر اس کی نگاہوں میں عزت ہوتی ہے ارباب جاہ و ثروت کی وہ اپنے جذبات لطیف کا اظہار کرتی ہے تو ان کے ساتھ جن کے افراد قبیلہ کثیر تعداد میں ہیں، خواہ کسی کے فضل و کمال کے اندر اخلاقی تہی مایگی ہو، خواہ ارباب جاہ کے اندر خبیث قسم کا پندار ہو، خواہ

کسی کو رفقا کی کثرت نے صدر، جمہوریہ بنادیا ہو لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہیئت اجتماعی کا تعلق محبت و احترام وابستہ ہوتا ہے تو انھیں افراد کے ساتھ یا کم از کم ہیئت اجتماعی موقعہ اور "نظرِ التفات" کی تاک میں رہتی ہے، اور جب کبھی یہ موقع ہاتھ آجاتا ہے تو وہ ان عجزیہ تخیلات کا اظہار کردیتی ہے، جسے نفسیات کی روشنی میں ایک برتر و ارفع ہستی کے مقابلہ میں ایک فروتر ہستی کی درماندگی (　　) سے تعبیر کرسکتے ہیں، یہیں انسان اپنی پیدائشی شرافت کھو بیٹھتا ہے۔ اور یہیں سے کفر و اسلام، شرک و توحید کی منزل شروع ہوتی ہے، میرے خیال میں مذاہب عالم اسی تفریق کو مٹانے کے لیے آئے اور شرک کی ابتدا اسی "انسانیت پرستی" سے ہوئی اسلام کا پہلا درس انسانی مساوات اور عالمگیر اخوت ہے، جس نے اس درس کو نہ سمجھا اس نے گویا اسلام کے مفہوم ہی کو نہ جانا، کسی انسانی ہستی کے سامنے خود کو فروتر سمجھنا شرک کی پہلی خطرناک منزل ہے "أرباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار" اسی طرح کسی انسان سے اپنی ذات کو بالاتر سمجھنا "توحید" کی بیخکنی ہے، اس تمہید کے بعد کہنا یہ ہے کہ خواجہ نذیر حسن علوم رسمیہ سے بہرہ ور نہ تھے دولت مفقود تھی عزیز و اقارب کی بڑی تعداد مٹ چکی تھی جو باقی تھے انھیں سوسائٹی ایک خاص منزلت کی نگاہ سے دیکھتی تھی، دولت ان کے پاس، رفقا ان کے ساتھ علوم و معارف سے وہ بہرہ ور اس لئے نذیر حسن کے ساتھ ان کی کم نگاہیاں کسی غیر معمولی نفسیات کا نتیجہ نہ تھیں نذیر نے دنیا میں قدم رکھا تو سب کچھ تھا عہد طفولیت ایک ایسے شفیق باپ کے آغوش محبت میں گزرا جو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے آپ کے والد سید خواجہ وزیر علی آرہ کے ان روسائے عظام میں تھے جن کو خدا نے خاندانی سیادت کے ساتھ دولت کی فراوانی بھی عطا کی تھی سید خواجہ وزیر علی کا خاندان آرہ میں غالباً آج سے دو صدی قبل محلہ مہادیوا میں آباد ہوگیا تھا خواجہ وزیر علی ماں اور باپ دونوں طرف سے ہاشمی سید تھے، آپ کے دادا جناب سید خواجہ محمد مہدی کی بنائی ہوئی مسجد آج بھی آرہ میں "خواجہ کی مسجد" کے نام سے موجود ہے۔ [۱]

۱؎ یہاں پر میں خواجہ نذیر حسن کے بعض ان تعلقات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جنکی خبر مجھے کبھی نذیر حسن مرحوم نے تو نہ دی کیونکہ "غم روزگار" میں وہ ایسے پھنسے رہتے تھے کہ اس نوع کی گفتگو کم کرتے البتہ آپکی والدہ محترمہ جو آجتک زندہ ہیں کبھی کبھی اس عہد ماضی کا افسانہ سناتی ہیں، صوبہ بہار کے مشہور رہنما مسٹر مظہر الحق صاحب (بیرسٹر) نے جنکا انتقال ہوگیا اپنے ایک طویل مراسلہ کے ذریعہ مجھے ان واقعات سے مطلع کیا مسٹر مظہر الحق مرحوم کے والد جناب احمد اللہ صاحب فاروقی (سیوان) اور نذیر حسن مرحوم کے والد سید خواجہ وزیر علی حقیقی ممیرے پھوپھیرے بھائی تھے، نذیر حسن مرحوم کے آبائی سلسلہ میں مجھے صرف چار بزرگوں کے حالات معلوم ہوسکے

خواجہ نذیر حسن بن خواجہ وزیر علی بن خواجہ نثار علی بن خواجہ محمد مہدی بن سید خواجہ مقبول ' جناب مظہر الحق مرحوم کے بیان کے بموجب

خواجہ نذیر حسن کے رشتہ دار بہپورہ پٹنہ، سیوان وغیرہ میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن آرہ میں وہ جس افتادگی و بیچارگی کی زندگی بسر کرتے تھے اس کا احساس کچھ انھیں حضرات کو ہو سکتا ہے، جو انھیں اچھی طرح جانتے تھے مروح نے وہ بھی زمانہ دیکھا تھا جب آپ کے والد کے قبضہ میں، بیریا، رسول پور، ہردی چھپرہ، کوئلپور وغیرہ کی وسیع جائدادیں تھیں، گھر میں خدمتگار تھے، لونڈیاں تھیں، مامائیں تھیں، عیش و عشرت کا سامان تھا گویا وہ تمام حوصلہ افزا سامان تھے جنکا وجود انسان کو مستقبل سے بے نیاز کر دیتا ہے، نذیر حسن عہد شباب کی تمام بے راہرویوں، دولت و جائداد کی بربادی اور رفقا و عزیزوں کے مٹنے کے باوجود اگر صرف تعلیم ہی حاصل کر لیتے تو زندگی کی ان صعوبتوں میں کچھ ضرور تخفیف ہو جاتی جنکی یاد آج بھی کم از کم میرے دل میں اس قدر ہجوم تاثرات پیدا کر دیتی ہے کہ بے اختیارانہ اشک کے

بقیہ نوٹ صفحہ ۱۸ ۔ خطوط (بہ زبان انگریزی) میرے پاس محفوظ ہیں انکا پہلا خط ۱۵ر اگست ۲۷ء کو مجھے موصول ہوا تھا جس میں انھوں نے مفصلۂ ذیل باتیں لکھی تھیں۔

آشیانہ ڈاکخانہ آندر
ضلع سارن　　　　عزیزم مسٹر عبدالمالک

تمہارا خط مرقومہ ۳۱ر جولائی پاکر بہت محظوظ ہوا تمھیں کسی پس و پیش کی ضرورت نہیں۔ . . . . خواجہ وزیر علی . . . . . جو میرے چچا اور قریبی رشتہ دار تھے، موصوف ہمارے والد اور والدہ کے حقیقی ماموں زاد بھائی تھے، اور میں نے اکثر اپنے والدین کو ان کا تذکرہ کرتے سنا ہے، مجھے بھی ان کی یاد اچھی طرح باقی ہے، چونکہ طفولیت میں انھیں میں نے دیکھا تھا اسلئے دیکھو . . . . . بہت ہی قریبی رشتہ سے میرے بھانجہ . . . . . میں فرط مسرت کے ساتھ خاندان کے متعلق مفصلۂ ذیل حالات لکھتا ہوں

خواجہ محمد مہدی کو صرف ایک لڑکے نثار علی نامی تھے، خواجہ نثار علی کی ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہوئیں، لڑکیوں میں ایک کی شادی حکیم کاظم حسین صاحب عظیم آبادی اور دوسری لڑکی کی شادی خواجہ امداد سے ہوئی، خواجہ مہدی صاحب کی چار لڑکیاں اور تھیں جن میں سب سے بڑی میری جدۂ مادری تھیں جنکی شادی حکیم حامد علی صاحب سے ہوئی تھی، انھیں تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں میں سب سے بڑی لڑکی کا فرزند ہوں، خواجہ محمد مہدی کی دوسری صاحبزادی کا عقد میر دائم علی ساکن حسینپورہ ضلع سارن سے ہوا تھا تیسری صاحبزادی کا عقد مولانا ابوالحسن سے ہوا تھا جو ہندوستان کے بڑے (مشہور) منطقی گزرے ہیں ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جنکی شادی سید محمد اسمٰعیل سے ہوئی جنکے صاحبزادہ پٹنہ کے وکیل نور الحسن صاحب ہیں خواجہ محمد مہدی کی سب سے چھوٹی صاحبزادی ہماری جدۂ مکرمہ تھیں، میری ایک ہمشیرہ ہیں جنکی چھوٹی صاحبزادی کا عقد ڈاکٹر سید محمود سے ہوا، کرسی نامہ کے اندر اور بھی اسما ہیں جو اسوقت موجود نہیں ضرورت ہوگی تو روانہ کرونگا، میں امید کرتا ہوں کہ تم آیندہ برابر خطوط لکھا کروگے اور اگر ممکن ہو تو ملاقات کروگے میرے مکان پر سیوان ریلوے اسٹیشن سے بہت اچھی طرح آسکتے ہو۔

تمھارا چاہنے والا
مظہر الحق

چند قطرے ٹپک پڑتے ہیں یہاں پہونچ کر انسان قسمت کے نہ مٹنے والے واقعات کا معتقد ہو جاتا ہے، خواجہ وزیر علی مرحوم نے نذیر کو تعلیم دلانے کا سامان کیا، ڈیوڑھی پر میاں جی رکھے گئے لیکن کہیں اکلوتا بیٹا لاڈ پیار میں "جور استاد" کا متحمل ہوتا ہے، نتیجہ وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے، نذیر جاہل رہ گئے، جائدادیں برباد ہو گئیں، والد کا انتقال ہوا، عہد شباب معصیت کوشیوں میں بسر ہوا، آنکھیں کھلیں تو منزل سے دور جا چکے تھے بہنوں کی پرورش، ان کی شادی بیاہ، بھائی کی تعلیم والدہ کی خدمت الغرض سارے گھر کا بار ان کے سر پڑ گیا۔ علم و فن سے بے بہرہ تھے کرتے کیا سڑک پر بیٹھ کر روئی (پنبہ) بیچی، غلہ کی تجارت کی، تیل بیچا الغرض وہ سب کچھ کیا جو شکم کی مجبوریاں انسان سے کراتی ہیں، میں نے ان کی والدہ محترمہ سے یہ بھی سنا تھا کہ جب وہ گھوڑے پر نکلتے تو خدمتگار لگام پکڑے ساتھ رہتے اور ایک زمانہ میں یہ پر افسوس نظارہ بھی دیکھا کہ سڑک پر بیٹھے روئی بیچ رہے ہیں، یہ ہیں زمانہ کی نیرنگیاں، اور یہ ہے قسمت کا لکھا ہوا جسے ہم اعمال بد کی داستان عبرت سے تعبیر کرتے ہیں، بہرحال نذیر حسن کے آبائی رشتہ داروں سے چھوٹنے کی ایک وجہ تو ان کی عسرت و ناداری، جہل و فقدان تربیت ہے، لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ہے یہی ایک وجہ نہیں مرحوم کی پر افسوس زندگی کی ضامن بڑی حد تک خود ہماری سوسائٹی کی لغو و مہمل رسمیات ہے یہ تو لکھا جا چکا ہے کہ خواجہ نذیر حسن کے والد ماں اور باپ دونوں طرف سے ہاشمی سید تھے لیکن ان کی والدہ کو نہ تو سید خاندان سے تعلق تھا نہ صدیقی یا فاروقی نسل سے خواجہ نذیر کے نانا اکبر علی خاں افغانی نسل سے تعلق رکھتے تھے، آپ کا موطن "زمانیا" تھا جہاں کے باشندے اپنی نسلی خصوصیات کے باعث ہندوستان میں نہایت معزز و مشہور ہیں خواجہ نذیر کی والدہ کے خالو مہاراجہ صاحب ڈومراؤں کے یہاں ایک معزز عہدہ پر فائز تھے نذیر کے خالہ زاد ماموں میوہ خاں بہت مشہور شخص گزرے ہیں جنکے رشتہ دار ابھی تک ڈومراؤں وغیرہ میں موجود ہیں؛ الغرض ماں کی طرف سے نذیر نہ سید تھے نہ صدیقی نہ فاروقی، جہاں تک میں نے خواجہ نذیر مرحوم کی نکبت و پستی پر غور کیا اِس کا اصل راز ان کی جہالت کے ساتھ اس حقیقت میں مضمر ہے کہ آپ کی والدہ غیر برادری کی عورت تھیں، ہندوستان کے قرشی الاصل مسلمان اپنی جماعت کے اس فرد کو عضو معطل کی طرح برطرف کر دیتے ہیں جس نے غیر برادری میں شادی کی ہو واقعہ یہ ہے کہ جو افکار میں اس مقالہ کے اندر پیش کرنا چاہتا ہوں وہ بڑی حد تک خواجہ نذیر ہی کی زندگی سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہیں،

میرا قاعدہ ہے خواہ آپ اسے کم مایہ سمجھیں کہ میں پہلے نہ کفر کو دیکھتا ہوں نہ اسلام کو، نہ کسی کے تقدس ظاہری سے متاثر ہوتا ہوں نہ کسی کی خاندانی عظمت و ثروت سے بلکہ سب سے انسان کی رفتار و گفتار، حرکت و سکون کی اندر "صورت حال" کا مطالعہ کرتا ہوں میرے والد مرحوم کی وفات اسوقت ہوئی جبکہ میں دس سال سے کچھ ہی بڑا تھا خواجہ نذیر مرحوم والد مرحوم کی زندگی میں بھی میرے ہی یہاں رہتے تھے اور ممدوح کی وفات کے بعد مجھے

مسلسل بیس سال تک آپ کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، میں نہیں کہہ سکتا اس انسان کے سینہ میں کیسا دل تھا، مزاج نہایت نیک، طبیعت حد درجہ ملنسار گفتار و کردار کے ہر پہلو میں محبت و دلجوئی، وسعت قلبی کا یہ عالم کہ سب کی بھلائی کے خواہاں، اور ان تمام محاسن اخلاقی سے بڑھ کر آپ میں دردمندی کی صفت تھی اپنے بیگانے سب کی مصیبت میں برابر کے شریک رہا کرتے آج ہزاروں انسان اپنے علم و فضل اپنی قومی و ملی خدمات اپنی خاندانی و ذاتی بزرگی کے لحاظ سے عوام میں عزیز اور محترم بنے بیٹھے ہیں لیکن ذرا ان کی پرائیوٹ زندگی پر غور کیجئے، بچے ناخوش، بیوی نالاں، خدمتگار فریادی پڑوسی بدگمان ملنے والے شاکی، احباب سے پوچھئے تو سارے تقدس، عبادت و ریاضت قومی دردمندیوں اور ملی خدمت گزاریوں کی حقیقت کھل جائے، نذیر کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس افتادگی و بیچارگی کے اندر صفت ملکوتی کا وجود بھی ہوگا، آپ کی زندگی سنائی کے اس نظریہ کی تصدیق کرتی تھی "مایۂ دل ز آب و گل نبود"، نہ وہ صوفی صافی تھے نہ زاہد شاغل، سطور بالا میں عرض ہی کر چکا ہوں طفولیت عیش و نشاط اور ناز و نعم میں گزری، عہد شباب معصیت کوشیوں کی "نذر ہوا" وسط عمر سے لے کر ضعیفی تک "غم روزگار" میں چور رہے، باایں ہمہ وہ سینہ میں ایک ایسا دل رکھتے تھے جس کی روشنی مدت کی عبادت و ریاضت کے بعد بھی شاید خاص ہی خاص سینوں میں دمک سکتی ہے سنائی کا فلسفہ ہے

از درتن کہ صاحب کلہ است
تا بدل صد ہزار سالہ رہ است

آپ کی زندگی کے واقعات بہت ہیں لیکن مجھے یہاں سے بحث نہیں میں تو یہاں پر صرف سوسائٹی کے اس "نقش باطل" پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جس نے نذیر جیسے خلیق اور "دل والے" انسان کو افتادہ و ہیچ بنائے رکھا اور انھوں نے عمر کی خطرناک اور دشوار گزار وادیاں طے کر کے اسی کس مپرسی میں، اپنی اکثر امیدوں کے خون ہونے کے بعد پورے ایک سال تک مرض سرطان کی پذیرائی در کرتے کرتے ۱۳ دسمبر بروز سنیچر ۳۰ء بوقت دس بجے دن ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں، آہ نذیر! تم دنیا میں نہ رہے لیکن تمھارا افسانہ درد دنیا میں باقی رہیگا تمھاری ہمدردی کو دنیا باوجود کوشش بھی نہیں بھلا سکتی ہر مصیبت کے وقت تم یاد آؤ گے آنکھیں تمھیں... ڈھونڈھیں گی لیکن نہیں پائیں گی مجروح حسیات تمھارا ماتم کریں گی مگر تمھیں کیا خبر کہ تمھارے بعد تمھارے لئے بہت سی رونے والی آنکھیں ہیں بہت سے دردمند دل ہیں جو زندگی میں بھی تمھارے قدردان تھے اور بعد مرگ بھی تمھاری جدائی میں خونبار ہیں، اے مرغ سدرہ نشین! عالم ملکوت کا نشیمن مبارک، تم دنیائے آب و گل میں فطرت کے مظالم سہتے رہے، سب کے درد دکھ میں شریک رہے، یتیموں اور بیکسوں کی دستگیری کی، دل میں بہت سی سربستہ آرزوئیں رکھتے تھے، افسوس، نہ تمھاری تمنائیں نکلیں نہ دوسروں کی جو تمھاری ذات

کے ساتھ وابستہ تھیں، خیر مرنا سب کو ہے اور اس لئے تمہارا مرنا بھی جا بجا تھا کچھ دنوں اور زندہ رہ جاتے تو ہر چند "رونق ہستی" میں نہ کوئی وقیع اضافہ تھا نہ قابل ذکر خلل، لیکن فطرت کی بوقلمونیاں کب اس کو گوارا کرتی ہیں ؎

انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

فہرست ماخذ اگر ہم مطالعہ کرنا چاہیں کہ موجودہ انسانی نسلیں ابتدائے آفرینش سے اسی ایک حالت میں ہیں یا ارتقاء کی مختلف منزلیں طے کر کے مختلف قوموں کے ساتھ خلط و آمیزش اثر و تاثر کے بعد موجودہ صورت میں پائی جاتی ہیں؟ اگر ہم یہ دریافت کرنا چاہیں کہ نسب و حسب کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اور وہ کونسا نفسیاتی تہیج ہے جو ہمیں خاندانی نجابت پر فخر کرنے کے لئے بے چین کر دیتا ہے؟ تو ہمیں مختلف علوم و فنون سے مدد لینا پڑیگی در اصل ہم فلسفہ و سائنس، تاریخ و ادب کا مطالعہ کرنے کے لئے مجبور ہیں انسان کی نسلی تقسیم ان کی مختلف نسلی آمیزش، موجودہ اقوام کی نسلی خصوصیات ان کے مقامات سکونت ان کی طرز معاشرت کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ ہم علم الانسان (ANTHRAPALOGY) کا مطالعہ کریں علم الاقوام ( ) پر غور کریں، اتھناگرافی کو پیش نظر رکھیں، اسی طرح فلسفہ و نفسیات کے ذریعہ ہم اس بات کا پتہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کونسا ذہنی رجحان ہے جس کے نفسیاتی تجزیہ سے ہم انسان کے خاندانی فخر و مباہات کی حقیقت دریافت کر سکتے ہیں، تاریخ ہمیں بتلائے گی کہ سیاسیات نے کس طرح ذلیل افراد اور پست اقوام کو عزت و شرافت کے آسمان پر پہونچا دیا اور کس طرح شریف و نجیب افراد یا قومیں قعر مذلت میں گر کر فنا ہو گئیں ادب کے ذریعہ ہم انسان کے اوہام نسبی کے متعلق بہت سی پر لطف معلومات حاصل کر سکتے ہیں، میں تو یہ کہہ نہیں سکتا کہ مفصلۂ بالا علوم کی تمام کتب متداولہ کا میں نے غائر مطالعہ کرنے کے بعد اس موضوع پر قلم اٹھایا لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مجھے ان تمام علوم کے متعلق کثیر کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا

امریکن علمائے انسانی مصروفیتوں پر توجہ کرتے ہوئے سائنس کے ان دقیق مباحث کو جو انشا کی ژولیدگی اور علمی اصطلاحات کے باعث عوام کے لئے ناقابل فہم بنجاتے ہیں، نہایت شگفتہ اور سلیس عبارت میں ایک کتاب موسومہ "علوم حکمیہ بہ عہد جدید" (SCIENCE IN MODERN TIMES.) کے اندر جمع کر دئے ہیں یہ کتاب چھ جلدوں میں ہے اس کے مدون انیسورتھ (AINS WORTH) ہیں اس کتاب میں ہیئت، طبقات ارض نباتات، علم حیوانات، علم الانسان، حیاتیات، علم برق، طبیعات وغیرہ سائنس کی تمام شاخوں پر بسیط بحثیں ملتی ہیں۔ میں نے علم الانسان کے متعلق اسی کتاب سے مواد حاصل کئے ہیں عربی زبان میں بھی ہمارے علمائے اسلام نے انساب اور علم الاقوام کے متعلق قابل قدر کتابیں چھوڑی ہیں چنانچہ مورخ امیر علی نے مسعودی

کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے اہل یمن کے باشندوں کی قومیت (ETHNOLAGY) اور مختلف قبائل کے مقامات سکونت (ETHNOGRAPHY) کے متعلق بہت مفید معلومات جمع کر دیئے ہیں[1] اسی طرح علامہ ابن حزم نے "جمہرۃ الانساب" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں عرب و بربر قبائل کے انساب درج ہیں اور عربوں کی ان شاخوں کے متعلق جو مغرب میں ہیں خاص خاص حوالے ہیں ابن خلدون نے اس کی بڑی تعریف کی ہے، ایچ بنز (H. Bunz) جو مقریزی کی "تاریخ فاطمیہ" کے مدون ہیں اس کا نام کتاب الجماہر فی انساب المشاہیر" بتاتے ہیں اس کا ایک حصہ "جمہرۃ النسب" کے نام سے پٹنہ اورنٹیل لائبریری میں موجود ہے عربوں کو قدیم زمانہ سے علم الانساب سے خاص شغف تھا اسلام کے بعد بھی یہ ذوق غالب رہا اور اس فن پر کثرت سے کتابیں لکھی گئیں، ابن طباطبا، نجفی عمری، عمیدی، اہدالی، ابن میموں، واسطی اس فن کے بڑے ماہر گزرے ہیں اور ان کی کتابیں بہت مستند اور مقبول ہیں مفصلۂ ذیل علماء اور ان کی کتابیں قابل ذکر ہیں[2]

اسمار علما	نام کتاب
ابو النظام موئد الدین عبید اللہ الحسینی الواسطی	الثبت المصان
محمد ابن احمد العمیدی الحسینی	المشجر الکشاف الاصول السادۃ الاشراف
ابو عبد اللہ حسین ابن محمد طباطبائی[3]	
ابو القاسم حمزہ الدینوری	
زید بن علی بن حسین بن زید بن علی امام زین العابدین	
سید احمد عمید الدین النجفی	
عز الدین ابو الحسن علی بن محمد الاثیر الجزری	کتاب اللباب سید احمد رفاعی کے سلسلۂ نسب مناقب میں
امام تقی الدین عبد الرحمن ابو الفرج بن عبد المحسن الواسطی الشافعی	ترياق المحبين "
ابو اسحق ابراہیم محی الدین ابن شیخ ابو الفتح عمر الفاروقی گازرونی	النفحۃ المسکیہ "
قاسم بن محمد واسطی شافعی	بغیۃ الطالب "

[1] ہسٹری آف دی سراسنز [2] انسائیکلوپیڈیا آف رلجن اینڈ اتھکس ' مقالہ ابن حزم،،
[3] ان تمام مشجرات (انساب کی کتابیں) اور نسابین کا تذکرہ "صحاح الاخبار" کے مصنف علامہ سراج الدین رفاعی نے کیا ہے
[4] سادات طباطبائی کا سلسلہ یہ ہے ابراہیم طباطبا بن اسمٰعیل بن ابراہیم الغمر بن حسن مثنیٰ بن حسن بن علی بن ابی طالب

لیکن میں نے انساب اور علم الاقوام کی ان الجھنوں میں پڑنا فی الحال مناسب نہ سمجھا کیونکہ میں اس وقت جس زاویۂ نظر سے بحث کرنا چاہتا ہوں اس کے لئے "علم الانسان" کی بحث کافی ہے جس میں علم الاقوام کی بحث بھی آگئی ہے۔

نفسیات کے متعلق میں نے میک ڈاؤگل، جیمس، غزالی وغیرہ سے معلومات حاصل کئے اور انھیں کے نفسیاتی نظریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے انسان کے جذبات "انانیت" (Positive self feeling) اور "انکسار" (Negative self feeling) کے تحت فخر نسبی پر غور کیا۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مجھے تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا، چنانچہ "تخیل نسب پر سیاسیات کا اثر" والا عنوان بعض کتب تاریخ کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ یوں تو سلاطین دکن کے حالات میں زیادہ تر میں نے تاریخ فرشتہ سے مدد لی ہے لیکن عادلشاہیہ کے متعلق "البساتین السلاطین" مصنفہ محمد ابراہیم الزبیری (قلمی نسخہ پٹنہ لائبریری) اور قطب شاہیہ کے تذکرہ میں "تاریخ محمد قطب شاہ" (قلمی نسخہ پٹنہ لائبریری) سے بھی مدد لی، اسی طرح خلجیہ اور سید خاندان (دہلی) کے متعلق فرشتہ کے علاوہ "بحر المواج" مصنفہ محمد علی خاں انصاری (قلمی نسخہ پٹنہ لائبریری) اور منتخب التواریخ بدایونی سے بھی معلومات حاصل ہوئے علویہ کا تذکرہ فرشتہ نے ضمنی طور پر برہان نظام شاہ کے سلسلہ میں کیا ہے میں نے یہیں سے لیا ہے، لیکن امیر علی کی ہسٹری آف دی سراسنز میں مورخین اسلام کی روایت سے جو مخالف روایت ہے، وہ بھی نقل کر دی، صفویہ کے حالات بھی فرشتہ سے لئے ہیں "عرفات العاشقین" تقی اوحدی میں بھی شیخ صفی الدین اردبیلی کے ذیل میں صفویہ کا تذکرہ ملتا ہے مغلیہ کے حالات میں میں نے "جام جم" مرتبہ سید احمد خاں سے مدد لی ہے۔

اہل بیت کے حالات یوں تو تاریخ کی مختلف کتابوں میں ملتے ہیں امین رازی نے "ہفت اقلیم" میں اور سید نور اللہ بن سید شریف حسینی مرعشی شوستری نے "مجالس المومنین" (قلمی نسخہ پٹنہ لائبریری) میں تفصیل کے ساتھ آئمہ معصومین کے حالات لکھے ہیں اسی طرح ابن خلکان کی "وفیات الاعیان" (انگریزی ترجمہ ڈی سلین پٹنہ لائبریری) کے اندر بھی ائمہ معصومین کے حالات درج ہیں لیکن ان تمام کتابوں میں مادری سلسلۂ نسب کا تذکرہ نہیں اس لئے باوجود ورق گردانی یہاں سے واقعات نہیں ملے، آئمہ معصومین اور اہل بیت اطہار کے مادری سلسلۂ نسب کے متعلق جو حالات میں نے مرتب کئے ہیں وہ مفصلہ ذیل کتب سے ماخوذ ہیں

ترجمہ کشف الغمہ: اصل کتاب عربی زبان میں تھی اس کے مصنف ابو الحسن علی بن سعید فخر الدین عیسیٰ بن ابی الاربلی ہیں علی بن حسن الزواری نے فارسی میں اس کا ترجمہ کیا، (قلمی نسخہ پٹنہ لائبریری)

غایۃ الہم فی ذکر الصحابہ والائمہ: مصنفہ محمد علیم خیالی افضلی الہ آبادی بن شیخ محمد موسیٰ (قلمی نسخہ)

تذکرۃ الائمہ :- میر محمد باقر مجلسی اصفہانی (قلمی نسخہ)
الارشاد :- محمد بن محمد بن نعمان معروف بہ شیخ مفید (قلمی نسخہ)

سابق الذکر تینوں کتابیں فارسی زبان میں ہیں "کشف الغمہ" اور "غایت المرام" میں نہایت سنجیدہ مباحث ہیں لیکن میر محمد باقر مجلسی چونکہ شیعی عالم تھے اس لئے انھوں نے تاریخی بیان اگر ایک طرف تحقیقات سے کام لیا ہے تو اسی کے ساتھ فرقہ دارانہ عقیدتمندیاں بھی مخلوط کردی ہیں چونکہ انھوں نے ائمہ معصومین کے سلسلہ میں ہر امام کے متعلق لکھا ہے کہ زبور میں آپ کا فلاں نام ہے، توریت میں فلاں نام ہے، انجیل میں فلاں لقب ہے، آخری کتاب "الارشاد" عربی زبان میں ہے اور خوب، ائمہ معصومین کی اولاد اجداد کے حالات تفصیل سے اسی میں ملتی ہیں

مفصلۂ بالا کتابیں مجھے پٹنہ لائبریری سے ملیں حال میں اس فن کی ایک نہایت مستند اور مکمل تصنیف دستیاب ہوئی اس کا نام "صحاح الاخبار فی نسب السادۃ الفاطمیۃ الاخیار" ہے اس کے مصنف ابو المعالی محمد سراج الدین الرفاعی مخزومی ہیں ۹۳۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۲ برس کی عمر میں بغداد کے اندر ۱۰۲۵ھ میں وفات پائی، والد کی طرف سے آپ کا سلسلہ نسب حضرت موسی کاظم تک منتہی ہوتا ہے، سعدیہ بنت امیر عبدالرحمن مخزومی خالدی (حاکم نجد) آپ کی والدہ تھیں اس لئے آپ مخزومی بھی کہلاتے ہیں اپنے زمانے کے بڑے عالم اجل اور عارف باللہ گزرے ہیں، آپ نے مختلف علم و فن کے متعلق کتابیں چھوڑی ہیں، جن میں مفصلۂ ذیل تصنیفات قابل ذکر ہیں

البیان فی تفسیر القرآن — تفسیر
سلاح المومن — حدیث
النسخۃ الکبری
جلاء القلب الحزین — تصوف

ان کے علاوہ آپ نے شعر و سخن اور درود وظائف کے متعلق بھی مفید رسائل لکھے تھے،

"صحاح الاخبار" سے آپ کی کثرت مطالعہ، قوت حافظہ، دقت نظر، اور سلامت طبع پر گہری روشنی پڑتی ہے، آپ نقاد فن نسابہ گزرے ہیں اور اکثر ان مباحث کے متعلق جو نسابین کے درمیان متنازع فیہ ہیں نہایت لطیف نکتہ سنجیاں کی ہیں جو نہ صرف تاریخی تحقیقات کے اعتبار سے قابل قدر ہیں بلکہ معقولات کی روشنی میں بھی نہایت وقیع ہیں مثلاً ابن طباطبا اور اس کے شاگرد ابن معیہ (شیعی نسابہ) نے سادات رفاعی پر (جو سنی المذہب تھے اور جن میں مصنف بھی شامل ہے) جو نسبی اعتراض کیا ہے، اس کا نہایت معقول جواب دیا ہے، اسی طرح حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے ہاشمی النسب ہونے کے متعلق نسابین کو اختلاف ہے، اس مسئلہ پر بھی مصنف نے نہایت عالمانہ و محققانہ بحثیں کی ہیں کتاب کے نصف آخری حصہ میں سادات رفاعی کے

حالات مندرج ہیں اور نصف اول حصہ میں علویین، ائمہ معصومین اور ان کی اولاد امجاد کا تفصیلی تذکرہ ہے،

نسل انسانی پر عمومی نظر | ہمارا مشاہدہ بتاتا ہے کہ دنیا میں بہت سے ایسے خیالات مروج ہیں جن کا حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں لیکن وہ ہمارے ذہنی رجحانات کا مرکز بنے ہوئے ہیں اور طرفہ یہ کہ تاریخی شواہد اور عقلی دلائل کے باوجود ہم اپنے اس مرکزی خیال کو ذہن سے مسترد نہیں کرتے، ڈاکٹر ابرکراہی نے جنون کی ماہیت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ دماغ کے اندر کوئی ایسا خیال جاگزیں ہوجاتا ہے کہ اس کے حق و بطلان کے متعلق نہ ہم خارجی معلومات کی بنا پر فیصلہ کرسکتے ہیں اور نہ دوسروں کے دلائل و براہین سے اثر پذیر ہوکر اپنے مرکزی خیال میں ترمیم کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں[ل] نسلی امتیاز اور شرافت نسبی کا فخر بھی انسان کے انھیں چند ذہنی مغالطات میں سے ہے، جنھیں اصطلاح میں "جنون" کہا جاتا ہے علم الانسان ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا میں نہ کوئی خالص نسل کی قوم باقی ہے، نہ سیاسی تحریکوں اور قومی یورشوں سے کوئی قوم نسلی اختلاط سے بچ سکتی تھی، ماہرین علم الانسان نے اس سلسلہ میں جو تحقیقات کی ہے وہ حسب ذیل ہے،

کرہ ارضی کی موجودہ بسنے والی قوموں اور ان کے باہمی نسلی علاقوں کا مطالعہ اور تحقیق کے لئے یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ کونسی خصوصیات کی بنا پر قومی علامت اور نسلی تشخیص متعین ہوسکتی ہے، کسی مخلوط قوم میں (اور تمام زندہ قومیں مخلوط ہیں) نسلی خلط کی چیستاں کا سمجھنا آسان نہیں لیکن پھر بھی بہتیرے افراد کی خصوصیتوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد تحقیقی نتائج مرتب ہوسکتے ہیں، خصوصیات جسمانی کے علاوہ، عادات و خصائل، زبان و تربیت قابل لحاظ امور ہیں، ان کے علاوہ روایات اور تاریخ سے کافی مدد مل سکتی ہے، سب سے پہلے ان خصوصیات ولوازم پر غور کرنا ضروری ہے جو ماہرین علم الانسان کی تحقیقات کا موضوع ہیں

ایک معمولی محقق انسان کی ظاہری خصوصیات کے بعض عناصر کو نسلی علامت کے لئے لازم قرار دیتا ہے، جسمانی رنگ ظاہری خصوصیت ضرور رکھتا ہے، لیکن نسلی تحقیق کرنے میں اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، بال کا رنگ اور آنکھیں یورپ کے "حسینان صبیح" (FAIR WHITES) کے باہمی علاقوں کا مطالعہ کرنے میں زیادہ قابل عمل ہیں چونکہ اور جگہ عام یک رنگی پائی جاتی ہے، دوسری قوموں میں بال اور آنکھیں عموماً سیاہ ہوتی ہیں،

ایک خصوصیت جو انسان کو تین حصوں میں تقسیم کردیتی ہے، "بال" کی خصوصیت ہے، قطط الشعر (ULOTRICHI) یا "اونی بال والی قوموں" میں بہتیرے گھنے پیچدار بال پائے جاتے ہیں اس قسم کا بال لانبا ہوتا ہے جیسے، "پیپوئنس" (PEPUANS) قوم میں، چھوٹا ہوتا ہے، جیسے حبشیوں میں، اور بالکل چھوٹا ہوتا ہے جیسے "بن مانس" (BUSH NIEN) اور قصیر القامت مشابہ حبشی اقوام۔۔

[ل] ڈاکٹر ابرکراہی کے اس فلسفہ پر میں نے اپنے مضمون "مجاز و حقیقت کے دو جرعے" کے اندر بحث کی ہے دیکھئے صوفی بابت اگست ۱۹۳۱ء

(NEGRITOES) میں، مائج الشعر (CYMOTRICHI) قوموں میں لہراتا ہوا بال پایا جاتا ہے، یا یہ کم و بیش کامل طور پر مجعد اور پیچاں ہوتا ہے، سُبط الشعر (LEIOTRICHI) یا "سیدھے بال والی قوموں" میں بال عموماً سر سے سیدھا گرتا ہے، یہ قابل یادداشت بات ہے کہ قطع و برید میں "اون بال" بیضاوی اور عریض ہوتا ہے، اس کے برخلاف سیدھا بال مدور (گول) ہوتا ہے،

قامت کی خصوصیت بھی قابل لحاظ امر ہے، کسی قوم کا اوسط قد پانچ فٹ چھ انچ ہوتا ہے، جن قوموں میں اوسط چھ فٹ آٹھ انچ پایا جاتا ہے وہ دراز قامت قومیں ہیں جس قوم کا اوسط پانچ فٹ چار انچ ہوتا ہے وہ قصیر القامت کہی جاتی ہیں،

سر کی عام شکل، کاسۂ دماغ، ناک کی وضع، لب کی ہیئت اور موٹائی قابل غور ہیں، الٹی ہوئی ٹھوری، آگے نکلا ہوا جبڑا، ابروکے اونچے، حصے دبی ہوئی پیشانی وہ خصوصیات ہیں جو نوع انسان کے نیچے طبقہ کی طرف رہنمائی کرتی ہیں،

اوپر بیان کی ہوئی خصوصیات ایک حد تک بغیر کسی مساحت کے معلوم ہو سکتی ہیں لیکن طبیعات کا ماہر صرف تخمینہ پر قانع نہیں ہوتا، بلکہ وہ طول اور زاویوں کی مساحت کرتا ہے، اور مقدار و وزن کو جانچتا ہے، اکثر ماہرین علم الانسان نے تجربہ اور تحقیق کے لئے سر کے پچھلے حصہ سے آگے حصہ تک کا طول و عرض ناپا ہے، اسے "مساحت جمجمہ (CEPHALIC ORCRANIAL INDEX) کہتے ہیں ایسے افراد یا قوموں کو جن کی کھوپریوں کے عرض اور طول میں ۷۵ اور ۱۰۰ کا فرق ہے، (یعنی عرض بمنزلہ ۷۵ ہے اور طول بہ منزلہ ۱۰۰) "طویل الجماجم" (DELICOCEPHALIC) "لانبے یا تنگ سر والے" کہتے ہیں جب عرض اور طول میں ۸۰ اور ۱۰۰ کا فرق ہوتا ہے تو ایسی قوموں کو قصیر الجماجم (BRACHYCEPHALIC) یا "چھوٹے اور چوڑے سر والی" کہتے ہیں اور جب سر کے طول و عرض میں ۷۵ اور ۸۰ کا فرق رہتا ہے تو ایسی قوموں کو "وسیط الجماجم (MESATECEPHALIC) یا" اوسط سر والی" کہتے ہیں، ایک خطہ کے کثیر آدمیوں کی کھوپریاں اگر ناپی جائیں تو یا تو وہ قصیر الجماجم ہوں گے یا

ؔ حضرت انسؓ نبیؐ کا حلیہ مبارک بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کان ربعۃ من القوم لیس بالطویل ولا بالقصیر ازھر اللون لیس بابیض امھق ولا آدم لیس بجعد قطط ولا سبط رجل (آپ میانہ قامت تھے نہ بہت لنبے نہ ٹھنگنے سفید رنگ نہ ایسے بالکل سفید نہ بالکل گندم گوں (زرد رنگ) نہ سخت گھونگھر بال والے نہ بالکل سیدھے بال والے (بخاری کتاب المناقب) میں نے بال کے متعلق اصطلاحات اسی حدیث کی مدد سے وضع کی ہیں قطط الشعر، اور سبط الشعر الفاظ اسی حدیث سے ماخوذ ہیں ع۔م

طویل الجماجم یا وسیط الجماجم لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک قوم بلکہ ایک قبیلہ کے محدود دائرہ میں یہ تینوں مختلف اقسام ملتے ہیں یہ اختلاف نتیجہ ہے ایک نامکمل نسلی آمیزش کا بعض جدید محققین "مساحت جمجمہ" کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے دوسری صورت جہاں مساحت سے کام لے سکتے ہیں "جمجمہ کی وسعت" ہے اس کا قاعدہ یہ ہے کہ کھوپڑی کے خول میں چھوٹی چھوٹی گولیاں یا دانے بھر دیتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ابتداً جمجمہ کے اندر مغز کی کتنی مقدار تھی لیکن یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ "وسعت جمجمہ" کے تخمینہ سے دماغی استعداد کا صحیح معیار قائم نہیں کر سکتے۔

(باقی آیندہ)

عبدالمالک آروی

بالشویک شاہزادی

عمّارہ کی چھاؤنی میں روسی فوج کے افسرِ اعلیٰ کا دفتر، جس کے وسط میں ایک میز پر ٹیلیفون، قلمدان اور سرکاری کاغذات رکھے ہوئے ہیں۔ میز کے سامنے جنرل کے لئے ایک آرام کرسی بچھی ہوئی ہے۔ کرسی کی پشت پر ایک کھڑکی ہے۔ کھڑکی کے محاذ میں میز کے آگے ایک سادی لکڑی کی بنچ ہے۔ میز کے داہنی جانب ایک اور معمولی کرسی پڑی ہے جس کی پشت دروازے کی طرف ہے۔ دروازے کے برابر، بنچ کے آخری سرے پر ٹوپیاں اور کوٹ لٹکانے کے لئے ایک چوبی "ریک" استادہ ہے۔ کمرے میں کوئی نہیں ہے۔

جنرل فرامز، لفٹنٹ شہباز کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوتا ہے اور دونوں اپنے لبادے اور ٹوپیاں اُتار کر "ریک" پر لٹکا دیتے ہیں۔ شہباز کو ذرا دیر لگتی ہے۔ جنرل اپنی کرسی سرکا کر فوراً اُسے آواز دیتا ہے:—

"شہباز!"

شہباز۔ "جی حضور!"

جنرل۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) تم نے وہ رپورٹ گورنمنٹ کو بھیج دی؟

شہباز۔ (میز کے قریب آتے ہوئے) ابھی کہاں؟ اس میں دریافت طلب بات یہ ہے کہ آپ اُسے کون سی گورنمنٹ کو بھیجنا چاہتے ہیں؟ (یہ کہتے ہوئے وہ برابر والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

جنرل۔ اس کا فیصلہ تمھاری عقلِ عامہ پر تھا۔ جو گورنمنٹ قیاساً کل صبح برسرِ اقتدار ہونے والی ہو، اسے بھیجدو۔

شہباز ۔۔۔ اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں ۔ "مشروطی گورنمنٹ" کل تک برسر اقتدار تھی لیکن آج سنا ہے کہ وزیر اعظم نے پستول سے خودکشی کر لی اور انتہا پسند جماعت کے سردار نے باقی ماندہ وزراء کو رائفل کی گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔

جنرل ۔۔۔ خیر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بھی اچھا ہوا، لیکن یہ لوگ بالعموم نمائشی کارتوس استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے یقین نہیں آتا۔

شہباز ۔۔۔ بہرحال، نمائشی کارتوس بھی شکست دینے ہی کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اب میرے خیال میں تو "فرغول پارٹی" کے پاس رپورٹ بھیجدینی چاہئے۔

جنرل ۔۔۔ اُن سے زیادہ تو "شاوین" کی پارٹی مضبوط ہے۔ اور ان دونوں پر اگر کسی کو سبقت لے جانے کا موقعہ ہے تو وہ "سُرخ اعتدال پسند انقلابی" ہو سکتے ہیں۔

شہباز ۔۔۔ بہرنوع یہ مسئلہ اس طرح حل نہ ہوگا، میں ٹائپ رائٹر میں کاربن لگا کر چار پانچ کاپیاں رپورٹ کی تیار کئے لیتا ہوں اور ہر ایک جماعت کے پاس ایک ایک کاپی بھیجے دیتا ہوں، اب جو جماعت بھی برسر اقتدار ہو ۔۔۔ !

جنرل ۔۔۔ فضول کاغذات خراب کرتے ہیں، اس سے بہتر تو یہ ہے کہ تم مدرسے کے بچوں کے پاس رپورٹ کی کاپیاں بھیجدو ۔۔۔۔۔۔ خدا کی پناہ ! !

(وہ پریشان ہو کر میز پر اپنا سر جھکا دیتا ہے)

شہباز ۔۔۔ شاید آپ تھک گئے جنرل صاحب ؟

جنرل ۔۔۔ آہ شہباز ۔۔۔۔۔۔ شہباز ! تم کس طرح زندہ رہنا گوارا کر رہے ہو ؟

شہباز ۔۔۔ کیا اس عمر میں جناب ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تو خود اپنے سے یہ سوال کیا کرتا ہوں کہ میں کس طرح مرنا گوارا کروں گا ؟

جنرل ۔۔۔ ہاں، شہباز تم ابھی نوجوان ہو، نوجوان اور بے حس۔ تمھارے احساس کو اگر کوئی چیز گرما سکتی ہے تو وہ "انقلاب" ہے۔ جس کے معنی تم نے آزادی سمجھ لئے ہیں لیکن میرے آبا و اجداد نے ریاست عمارہ کا سات پشت نمک کھایا ہے۔ امرائے عمارہ نے اپنے درباروں میں ہمارے قدیم مراتب کا لحاظ رکھا ہمیں خلعتوں سے معزز کیا۔ ہماری دولت سے حوصلہ افزائیاں کیں۔ ہمیں ترقیوں پر ترقیاں دیں اور اس مرتبہ پر پہونچا دیا جس کی بدولت موجودہ پُر آشوب زمانے میں بھی عزت سے روٹیاں مل رہی ہیں جب میں تم جیسے نوخیز لڑکوں کو یہ کہتے ہوئے سنتا ہوں کہ تم تہذیب و تمدن کے لئے برسر پیکار ہو، غریبوں کے واسطے سر کٹا رہے ہو اور سرمایہ داروں کا خاتمہ کرنے کے لئے جانیں لڑا رہے ہو تو میں حیرت سے تمھاری

صورتیں دیکھنے لگتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک شخص الفاظ اور صرف الفاظ کے لئے کس طرح اپنا خون بہا دیتا ہے؟ ——— پھر الفاظ بھی وہ جو آوارہ و اوباش، تجارت پیشہ یا بیکار مزدوروں کے گھڑے ہوئے الفاظ ہوں! کیا زمانہ آگیا ہے؟ دنیا بھر کی عقل پہ پردہ پڑا ہوا ہے!!

(وہ فخر سے تنکر کہنے لگتا ہے)

بادشاہ کا وجود پرتو الٰہی ہے، اس لئے نعمت ہے۔ وہ ایک حقیقت ہے اس لئے قابل قدر ہے۔ تم اُسے آنکھوں سے دیکھ سکتے ہو، ہاتھوں سے چھو سکتے ہو۔ اس کے تبسم میں تمہاری مسرتیں پرورش پاتی ہیں اور اس کے غصہ میں تمہیں خدا سے خوف کرنے کا سبق ملتا ہے ——— میں اپنے آقا کے لئے اپنی جان قربان کرسکتا تھا بالکل اس طرح جس طرح میرے باپ نے قربان کردی۔

تمہارے "فاقہ مست بھائی" (مزدور) ہمیشہ ہماری ٹھوکریں کھانا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے اور ہمارے جوتوں کے پاس بیٹھ کر خوش ہوتے تھے! .... آہ اب زندگی میں کیا دلکشی باقی رہ گئی ہے؟! (مایوسانہ طور پر آہ سرد بھرتے ہوئے)

میرا آقا ——— امارت عمارہ سے اتار دیا گیا۔ اور عام قیدیوں کے گروہ میں کسی طرف بھیجدیا گیا.... فوج جو اس کا سرمایۂ افتخار و مسرت تھی، فاقہ مست باغیوں کی شر انگیز تقریریں سنتی ہے اور اُن کے اشارے پر بازاروں میں قواعد کرتی پھرتی ہے اس شان کے ساتھ کہ خود کرنل مفسدہ پردازوں کی جماعت کا صدر بننے پر مجبور ہوتا ہے اور بادشاہ کے خلاف تقریر کرنے والوں کو پبلک سے روشناس کراتا ہے۔

میں خود اپنے مختار کے حکم سے کمانڈر انچیف بنا دیا گیا ہوں۔ حالانکہ وہ خود ایک ذلیل یہودی ہے جو عیسائیت کے لئے باعث ننگ ہے! ...... آہ! کل تک یہ باتیں دیوانے کی بڑ سمجھی جاتی تھیں لیکن آج عام واقعات کی طرح نگاہوں کے سامنے ہیں۔ میں تو اب صرف اس لیے زندہ ہوں کہ دشمن کو شکست دیکر کسی نہ کسی طرح اپنے آقا کا اقتدار قائم کرا دوں اور اس ذلیل یہودی کو پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھ لوں۔ اس سے زیادہ اور کوئی تمنا نہیں ہے!

شہباز ——— ذرا سوچ سمجھ کر جنرل صاحب! آجکل ان خیالات کا اظہار کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ فرض کیجئے میں ہی آپ سے غداری کرجاؤں ———!

جنرل ——— کیا؟

شہباز ——— آپ چونکئے نہیں، میرا یہ ارادہ نہیں ہے اس لئے کہ خود میرا باپ اکثر اسی قسم کی بڑ ہانکا کرتا ہے لیکن فرض

کیجئے اگر ایسا ہو جائے تو ؟

جنرل ـــ (طنز سے مسکراتے ہوئے) تم ابھی لڑکے ہو، میں اُلٹا تمھیں کو "انقلابی جماعت" کے خلاف مغویانہ خیالات پھیلانے کے جرم میں ماخوذ کرلوں گا۔ سمجھے صاحبزادے! اس کے بعد بلا کسی بدمعی کارروائی کے تمھیں گولی سے اُڑا دیا جائے گا، بشرطیکہ تم مرنے سے قبل چلا چلا کر اپنی ماں سے آخری مرتبہ ملنے کی تمنا ظاہر نہ کرو ــــــ اس حالت میں بالکل ممکن ہے کہ ہمارے قابل جج اپنی رائے قطعی بدل دیں اور تمھیں کسی فوج میں یک لخت کرنل بنا کر بھیجدیں! . . . . کافی باتیں ہوچکیں

(وہ سینہ تان کر اٹھتا ہے) اب دفتر کا کام بھی ہونا چاہئے۔

(کاغذات میں سے ایک تار اٹھا کر پڑھتا ہے اور خوف سے لرز جاتا ہے)

"معاذاللہ!" (کرسی پر بلاارادہ بیٹھتے ہوئے) "یہ سب سے زیادہ صبر آزما بات ہے"

شہباز ـــ کیا ہوا؟ ـــــــ ہماری شکست کی خبر تو نہیں ہے؟"

جنرل ـــ خدا کی پناہ! نادان لڑکے کیا تیرا یہ خیال ہے کہ صرف شکست کی خبر مجھے اتنا پریشان کرسکتی ہے؟ مجھے ــــــ جو ابتدائے جنگ سے اب تک کم از کم تیرہ شکست کھا چکا ہے۔! ـــــــ

آہ! میرے آقا، میرے بیکس آقا!!

(شدتِ غم سے اس کے آنسو نکل آتے ہیں)

شہباز ـــ کیا مارے گئے؟!

جنرل ـــ نہیں، مارا جاتا کیسا ان کے قلب میں خنجر بھونک دیا گیا۔!!

شہباز ـــ مجھے ہمدردی ہے!

جنرل ـــ نہ صرف اُن کے قلب میں بلکہ خود میرے قلب میں بھی خنجر پیوست کردیا گیا!

شہباز ـــ اچھا! آپ استعارہ فرما رہے ہیں۔ خیریت گذری! میں تو سمجھا تھا کہ آپ کے آقائے نامدار کو واقعی کسی نے قتل کردیا ـــــــ ہاں تو کیا ہوا؟

جنرل ـــ آہ اس کی لڑکی . . . . . شہزادی زہرہ قدر بیگم . . . . . جسے میرا آقا جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا . . . . وہ . . . . وہ

شہباز ـــ خودکشی کرکے مرگئی؟

جنرل ـــ نہیں، یہی ہوتا تو بہتر تھا ــــــ آہ بدرجہا بہتر تھا!!

شہباز ـــ کیا مرتد ہوگئی؟

جنرل — (برافروختہ ہوکر) یقیناً نہیں۔ کفر نہ بکو شہباز!!
شہباز — (آہستہ لہجہ میں) کیا ووٹ مانگ رہی ہے؟!
جنرل — ووٹ!..... آہ! میں اُسے اس فعل سے باز رکھنے کے لئے دونوں ہاتھوں سے ووٹ دیتا، اگر وہ ووٹ چاہتی۔
شہباز — کس فعل سے باز رکھنے کے لئے جناب؟ صاف صاف کہئے آپ نے تو معمہ بنالیا!
جنرل — (چپکے سے) وہ انقلابی جماعت میں شامل ہوگئی!
شہباز — کونسا گناہ کیا؟ آپ بھی تو شریک ہوگئے ہیں، ہم اور سب بھی تو شریک ہوگئے ہیں۔ میرے خیال میں تو اس کی شرکت بھی اس سے زیادہ اہمیت دیے جانے کے قابل نہیں۔
جنرل — خدا کرے تمھارا خیال صحیح ہو۔ لیکن صرف اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ وہ ایک نوجوان افسر فوج کے ساتھ فرار بھی ہوگئی ہے ——— !! خیال تو کرو وہ اور ایک معمولی افسر فوج کے ساتھ فرار ہوجائے !!!
شہباز — (کوئی خاص اثر نہ لیتے ہوئے) بجا فرمایا!
جنرل — شہزادی زہرہ قدر بیگم! ——— حسن و معصومیت کا مجسمہ! ——— بہار شباب کی بولتی تصویر! ——— امیرے آقا کی ناموس! ...... (وہ شرمندہ ہوکر دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھک لیتا ہے)
ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔
شہباز — (رسیور اٹھاکر) ہاں.......... اعلیٰ جنرل کے دفتر سے...... اتنے زور سے چیخنے کی ضرورت نہیں .... بیشک میں اب جنرل نہیں ہوں...... تم کون ہو؟...... اچھا تو کیا تم بھی کرنل بنا دیے گئے۔ کیا واقعی؟...... خوب! .... ہاں میں فیلڈ مارشل کے عہدہ پر ترقی پا چکا ہوں .... نہیں چارج نہیں لیا......... تمھیں کیا کہنا ہے....... سنو تم نے گھنٹی کس لئے دی تھی، میں دفتر میں صرف تمھاری بڑ سننے کے لئے نہیں آتا ہوں....... کیا؟ ...... شہزادی زہرہ قدر!....... (جنرل فوراً چونکتا ہے)
تم نے کہاں گرفتار کیا؟.......
جنرل — (شہباز سے رسیور چھین کر) ہاں، زور سے بولو!...... میں ہی اعلیٰ جنرل ہوں....

.......ہاں ہاں مجھے معلوم ہے کہ تم کرنل ہو گئے ہو!.......لیکن تم نے اُس نوجوان سردار کو بھی گرفتار کرلیا جو اس کے ساتھ تھا.......بیحد کاہل ہو!.......تمھیں جواب دہی کرنا ہوگی.......نہیں یقیناً تم نے اُسے رشوت لے کر چھوڑ دیا.......میں باور نہیں کرسکتا، کم از کم تم نے اسے دیکھا ضرور ہوگا، وہ اپنی مکمل فوجی وردی میں ہے.......بارہ گھنٹہ سے زیادہ کی مہلت نہیں دیجاسکتی اس دوران میں بہر حال مفرور کو گرفتار ہوکر میرے پاس آجانا چاہئے.......کیا کہا؟.......یہ غیر مہذب الفاظ کس کے لئے استعمال کررہے ہو.......ایں؟

(شہباز سے مخاطب ہوکر) پاجی کا بچہ یہ کہہ رہا ہے کہ شہزادی شیطان مجسم ہے! (ٹیلیفون میں) نمکحرام! نالائق! تجھے شہزادی زہرہ قدر بیگم کی شان میں ایسے گستاخانہ کلمات کہنے کی کیونکر جرأت ہوئی!؟ میں.......''

شہباز۔۔۔۔ (ٹیلیفون چھین کر) سوچ سمجھ کر جنرل صاحب!

جنرل۔۔۔۔ سوچ سمجھ لیا.......میں اس بدمعاش کو ضرور گولی کا نشانہ بنا دوں گا۔ ٹیلیفون رکھ دو!

شہباز۔۔۔۔ لیکن شہزادی کا کیا حشر ہوگا؟ آپ نے یہ بھی سوچا!

جنرل۔۔۔۔ کیا؟ کیا؟.......

شہباز۔۔۔۔ میرا مطلب یہ ہے کہ صرف آپ کی حفاظت میں شہزادی کی جان خطرے سے محفوظ رہ سکتی ہے پہلے انھیں یہاں بلا لیجئے۔

جنرل۔۔۔۔ (رسیور کو شہباز کے ہاتھ میں دیتے ہوئے) تمھارا خیال درست ہے۔ تم ہی اُس سے مہذبانہ گفتگو کرسکتے ہو.......میرے بس کی بات نہیں (بیٹھ جاتا ہے)

شہباز۔۔۔۔ (ٹیلیفون میں) ہلو!.......کچھ خیال مت کرو.......میرا ایک بے تکلف دوست تھا.......میں ذرا باہر چلا گیا تھا.......اُس کی عادت مذاق کی ہے۔ خیر اسے بھول جاؤ اور لڑکی کو فوراً یہاں بھیجدو.......یہاں ہم خود اسے تہذیب سے گفتگو کرنا سکھادیں گے.......اچھا! کتنی دیر ہوئی؟.......تو پھر تم نے اوّل ہی کیوں نہ کہہ دیا اتنی دیر تک جھک جھک کرنے کی کیا ضرورت تھی'' (ٹیلیفون رکھ کر).......کیا مذاق ہے؟ شہزادی صبح ہی یہاں کو روانہ کردی گئی ہے لیکن گھنٹہ بھر تک ٹیلیفون پر اس لئے جھک جھک کی جاتی ہے کہ یہاں اُنکے کرنل ہونے کی خبر سب کو معلوم ہوجائے''

(ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجتی ہے شہباز پھرتی سے رسیور اٹھاتا ہے)

"اب کیا بات ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا!" (جنرل سے) نیچے کی منزل سے ہمارے ہی اسٹاف کا آدمی بول رہا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (ٹیلیفون میں) سنو جی! معمولی معمولی کاموں کے لئے بار بار ٹیلیفون استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں بیکار نہیں ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "اسے قابو میں" رکھنے کے لئے کافی آدمی نہیں ہیں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس سے تمھارا کیا مطلب ہے؟

(جنرل سے) شہزادی آ چکی ہے۔

جنرل ـــــ اُنھیں حکم دو کہ فوراً اوپر بھیجدیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (خود سے مخاطب ہو کر) مجھے بلا تعظیم و تکریم کے اس کا سامنا کرنا ہوگا۔ بلا کسی رسمی استقبال یا دست بوسی کے! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محافظ سپاہیوں کے سامنے کیونکر ضبط ہو سکے گا؟ بہرحال۔

شہباز ـــــ (ٹیلیفون میں) اسے اوپر بھیجدو! (ٹیلیفون رکھ کر) "وہ کہتا ہے کہ ہم شہزادی کو روک نہیں سکے اور وہ بلا اجازت محافظوں کو کھینچتی ہوئی اوپر چلی گئی ہے۔ آتی ہی ہوگی!"

(شہزادی یکایک کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ دو پریشان اور خستہ محافظ پیچھے پیچھے اوس کے بازوؤں کو مضبوط پکڑے ہانپتے کانپتے ہوئے برآمد ہوتے ہیں۔ شہزادی سر سے پاؤں تک سیاہ سمور کے لبادے میں ملفوف ہے اور سموری کی ٹوپی اوڑھے ہوئے ہے۔)

شہباز ـــــ (بنچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) "قیام" کے لفظ پر تمھیں اپنے قیدی کو بنچ پر بٹھا دینا چاہیے اور اس کے دونوں جانب خود بیٹھ جانا چاہیے ـــــ "قیام!" دونوں سپاہی شہزادی کو بٹھانے کے لئے پوری جد و جہد کرتے ہیں لیکن شہزادی ایک جھٹکے کے ساتھ دونوں کو اس طرح پیچھے ڈھکیل دیتی ہے کہ وہ دونوں بلا ارادہ بنچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ خود بھی اطمینان سے اُن کے درمیان بیٹھ جاتی ہے۔ داہنا محافظ ایک ہاتھ سے شہزادی کا شانہ پکڑے ہوئے دوسرے ہاتھ سے کاغذات پیش کرتا ہے۔ شہباز کاغذات کو لے کر جنرل کے آگے سرکا دیتا ہے۔ جنرل متاثرانہ طور پر کھول کھول کر اُنھیں پڑھنے لگتا ہے۔

شہباز ـــــ خاتون قیدی! جب تک جنرل صاحب تمھارے معاملے کے متعلق کاغذات پڑھیں، تمھیں صبر و سکون کے ساتھ بیٹھا رہنا چاہیئے۔ محافظ کو کیوں پریشان کر رہی ہو؟

شہزادی ـــــ (سپاہیوں سے) چھوڑو! (جنرل سے مخاطب ہو کر) ان سے کہو کہ میرے ہاتھ چھوڑ دیں ورنہ میں بنچ کو الٹ دوں گی اور ہم تینوں کے سر پھٹ جائیں گے۔

پہلا سپاہی ـــــ نہیں ننھی اماں! غریبوں پر ترس کھاؤ!

جنرل ـــ (کاغذات کو ہٹا کر، گرجتے ہوئے) خاموش !!!
شہزادی ـــ (سرخ ہوکر) کون ؟ میں یا سپاہی ؟ ؟
جنرل ـــ (سہم کر) تم نہیں خاتون، میں سپاہی سے مخاطب ہوں۔
شہزادی ـــ اُسے حکم دو کہ مجھے چھوڑ دے !
جنرل ـــ بہادر سپاہیو! خاتون اس وقت تمہاری حراست میں نہیں ہے !
(سپاہی ان الفاظ کو سنکر شہزادی کے ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک اطمینان کا سانس لے کر اپنی پیشانی سے پسینہ پوچھنے لگتا ہے، اور دوسرا اپنی کلائی چوسنے لگتا ہے)
شہباز ـــ (افسرانہ لہجہ میں) "اٹن شن !"
دونوں سپاہی مودبانہ پتھر کے بتوں کی طرح ساکت ہوکر بیٹھ جاتے ہیں۔
شہزادی ـــ نہیں سردار صاحب ! اس غریب سپاہی کو کلائی چوسنے دو۔ ممکن ہے اس میں سمیت پھیل جائے میں نے بہت زور سے کاٹا تھا۔
جنرل ـــ (تعجب و حیرت سے) ایں ؟ کیا تم نے ایک ادنیٰ سپاہی کو کاٹنا گوارا کر لیا ؟
شہزادی ـــ بیشک اس کے بعد مجھے افسوس ہوا اور میں نے زہر کی مدافعت کے لئے لوہے کے گرم گرم چمٹے سے اس کے زخم کو داغنا چاہا مگر یہ گنوار ڈر گیا۔ اور کیا ہمدردی کی جاسکتی تھی۔
شہباز ـــ خاتون ! جنرل صاحب یہ پوچھتے ہیں کہ تم نے سپاہی کے کیوں کاٹا ؟
شہزادی ـــ اس لئے کہ کسی دوسری تدبیر سے وہ میرے ہاتھ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔
جنرل ـــ تو کیا جب تم نے اس کی کلائی میں کاٹ لیا اس وقت اس نے تمھیں چھوڑ دیا ؟
شہزادی ـــ نہیں (سپاہی کی پیٹھ تھپکتے ہوئے) یہ بہت وفادار سپاہی ہے اس خدمت کے صلے میں تمھیں اس غریب کو ضرور کوئی معقول انعام دینا چاہئے۔ میں اس سے زیادہ یہی کرسکتی تھی کہ اس کا گوشت اتار لوں مگر یہ درندگی میں نے گوارا نہ کی اور چپکے چپکے اس کے ساتھ چلی آئی۔
جنرل ـــ ملزم خاتون ! . . . .
شہزادی ـــ فرام زمجھے ملزم کہکر نہ پکارو۔ میری دادی نے تمھیں اپنے پیروں میں کھلایا ہے۔
جنرل ـــ (آبدیدہ ہوکر) آہ خداوندا ! ! . . . . بالکل سچ ہے شہزادی جو کچھ تم کہہ رہی ہو لفظ بہ لفظ سچ ہے، باور کرو کہ میرا دل ابھی تک وہی ہے جو اس وقت تھا۔
شہزادی ـــ ہاں ! بلکہ تمہارا دماغ بھی ویسا ہی پراگندہ ہے جیسا اس وقت تھا ـــــــ بہرحال میں خو

تمھاری زبان سے ملزم کہلوانا پسند نہیں کرتی۔

جنرل ـــــ لیکن میں تمھاری ہی بہتری کے لئے تمھیں ان قابل احترام خطابات سے مخاطب نہیں کرسکتا جنکی تم جائز طور پر اہل ہو۔ اس حالت میں تم اور کن الفاظ سے مخاطب ہونا پسند کروگی ؟

شہزادی ـــــ "انقلاب" نے ہمیں ایک دوسرے کا "جان نثار" بنا دیا ہے۔ مجھے "جاں نثار" کہو۔

جنرل ـــــ ان لغو الفاظ سے تمھیں مخاطب کرنے کے بجائے میں مرنے کو ترجیح دیتا ہوں۔

شہزادی ـــــ تو پھر تم "زہرہ" کہو اور میں تمھیں "چھٹا" کہوں جو میری دادی کہا کرتی تھیں۔

جنرل ـــــ (جذبات سے مضطرب ہوکر) شہباز! تمھیں ان سے گفتگو کرو مجھ میں گزشتہ یادکو... تازہ کرنے کی سکت نہیں ہے۔ (ان الفاظ کے ساتھ شرم سے اپنا چہرہ چھپالیتا ہے)

شہباز ـــــ (افسرانہ لہجے میں) عمارہ کی آزاد حکومت نے تمھارے والد امیر عمارہ کو معہ جملہ اہل خاندان چند مصلحتوں کی بنا پر زیر حراست رہنے کا حکم صادر کیا تھا۔ تم پر اس حکم کی خلاف ورزی کرنیکا الزام ہے!....

جنرل ـــــ (شہباز کی گفتگو قطع کرتے ہوئے) یعنی تم...... مجھے کہنا چاہئے..... ایک سرکاری ملزم کی حیثیت میں ہو۔ اس حالت میں مجھے تمھارے ساتھ کیا کرنا چاہئے۔

شہزادی ـــــ یہ بات تو میری گرفتاری سے قبل آپ کو سوچنا چاہئے تھی۔

جنرل ـــــ آؤ ـــــ آو ـــــ ذرا آگے آؤ، ملزم خاتون (آہستہ لہجے میں) تمھیں معلوم ہے کہ اگر میں تمھیں زیادہ سخت الفاظ میں مخاطب کرنے پر مجبور ہوا تو تمھارا کیا حال ہوگا ؟

شہزادی ـــــ یہ تو مجھے معلوم نہیں ہاں یہ جانتی ہوں کہ تمھارا کیا حال ہوگا ؟

جنرل ـــــ یعنی کیا ؟

شہزادی ـــــ یا تو تمھارے گلے میں خراش ہو جائے گی، یا کھانسی اٹھنے لگے گی !

(شہباز کے منہ سے بے ساختہ رکے ہوئے قہقہہ کی آواز نکل جاتی ہے جسے وہ کاغذات کی لوٹ پلٹ میں ٹالنا چاہتا ہے لیکن جب ضبط نہیں ہوتا تو گرا ہوا کاغذ اٹھانے کے بہانے سے میز کے نیچے سر جھکا کر ہنسنے لگتا ہے۔

جنرل ـــــ (گرج کر) لفٹنٹ شہباز !!

شہباز ـــــ (سر جھکائے ہوئے ہنسی سے بھری ہوئی آواز میں) جناب! (میز اسکے جسم کے ہلنے سے لرزتی ہے)

جنرل ـــــ اوپر سر اٹھاؤ! ـــــ بیوقوف! تم نے تمام روشنائی بکھیر دی ہے! شہباز اوپر سر اٹھاتا ہے۔ اس کا چہرہ ہنسی ضبط کرنے سے سرخ نظر آتا ہے۔

جنرل ـــ ہنسو! خوب ہنسو! ! تم عالیجاہ شہزادی جہان پناہ کے مذاق سے کیوں لطف نہیں اٹھاتے؟
شہباز ـــ (یکایک متانت اختیار کرکے) مجھ میں اتنی جرأت نہیں۔ جنرل صاحب!
جنرل ـــ نہیں، فوراً ہنسو! میں تمھیں ہنسنے کا حکم دیتا ہوں!
شہباز ـــ (اور بھی زیادہ متانت سے) میں واقعی نہیں ہنس سکتا جنرل صاحب!
(بالکل فوجی انداز میں تن کر بیٹھ جاتا ہے)
جنرل ـــ (غصہ سے) اچھا! (پھر یکایک شہزادی کی طرف مخاطب ہوکر) کیا عالیجاہ شہزادی جہاں پناہ نے مجھے یہ حکم دیا تھا کہ میں انھیں "جاں نثار" کہکر پکاروں؟
شہزادی ـــ (بنچ سے اٹھ کر ایک سرخ رومال ہلاتے ہوئے) بیشک! "انقلاب زندہ باد!"
"جاں نثار" فرامرز!
جنرل ـــ (کرسی سے اٹھ کر فوجی سلام کرتے ہوئے) "اشتراکیت پایندہ باد!!" ـــ شہباز تم اٹھ کر "قومی ترانہ" گاؤ!
شہباز ـــ (اٹھتا ہے) مگر جنرل صاحب نہ میرا گلا درست ہے نہ آواز۔ میں کس طرح گا سکتا ہوں؟
جنرل ـــ اچھا بیٹھ جاؤ اور اپنی شرمندگی کو ٹائپ کی مشین میں دن رات ٹکریں مار کر دور کرو!
(شہباز بیٹھ جاتا ہے)
جنرل ـــ "جاں نثار" زہرہ قدر! تم کس نوجوان کے ساتھ فرار ہوگئی تھیں؟
شہزادی ـــ (حیرت سے) فرامرز! یہ کیا افترا پردازی ہے؟ میں مطلق نہیں سمجھی!
جنرل ـــ انکار لاحاصل ہے! تمھاری نقل و حرکت اسی نوجوان سردار کے پتہ سے معلوم ہوتی رہی ہے۔
(شہزادی پر یکایک صورت حالات روشن ہو جاتی ہے اور وہ اس سے محظوظ ہوتی ہے جنرل فرامرز بدستور اپنی تقریر جاری رکھتا ہے)
"سب سے اول وہ ہلسنیرگ میں تمھارے ساتھ ہوا۔ وہاں سے تم خفیہ پولیس کو دھوکہ دیکر نکل گئیں۔ لیکن نوجوان کو دوبارہ خفیہ پولیس نے زروبہ کے مقام پر شناخت کیا۔ وہاں تک تم اُس کے ساتھ تھیں اس کے بعد تم تنہا ماسکو کو روانہ ہوگئیں۔ معلوم نہیں اس کے بعد اُس بدقسمت نوجوان کا کیا حشر ہوا۔ کاغذات سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اب وہ کہاں ہے؟
شہزادی ـــ (بات کو اہمیت دینے کے لئے ذرا آہستہ لہجہ میں) وہیں جہاں ہمیشہ تھا!
جنرل ـــ (اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے) یعنی؟ یعنی؟!

شہزادی ــــ (مسکراتے ہوئے) یعنی تمھارے دماغ میں اور کہاں ؟ میں تنہا تھی، اور تنہا ہی آئی ہوں۔ ہانسبرگ سے ماسکو کی طرف روزانہ سیکڑوں مسافر سفر کرتے ہیں مجھے کیا علم ہو سکتا ہے کہ ان میں کون کون تھا ؟

جنرل ــــ وہ عموماً اپنے عام لباس میں سفر کرتے ہیں کوئی بھی اپنی مکمل فوجی وردی میں سفر نہیں کرتا۔

شہباز ــــ (جملہ پورا کرتے ہوئے) سوائے ان لوگوں کے جنھیں کسی شہزادی کے بھگا لیجانے کا فخر حاصل ہو ــــ اور شخص کے ساتھ شہزادیوں کا فرار ہونا ممکن نہیں۔

جنرل ــــ خاموش بدتمیز!

(شہباز نہایت ادب سے سر جھکا کر خاموش ہو جاتا ہے اور سپاہیوں کی طرف دیکھنے لگتا ہے ــــ اس طرح گویا اُسے گفتگو سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ جنرل فرامرز کاغذات پر نظر ڈالتا ہے اور پھر بدستور شہزادی سے جرح شروع کر دیتا ہے)

جنرل ــــ ہاں تو اس نوجوان نے جس کا ان کاغذات میں حوالہ دیا گیا ہے۔ تمھارا پروانہ راہداری دکھا کر سفر کیا۔ اس کا تمھارے پاس کیا جواب ہے ؟

شہزادی ــــ لاحول ولا قوۃ! کتنی لغو بات ہے ؟ ایک مرد ایک عورت کا پروانہ راہداری دکھا کر کس طرح سفر کر سکتا ہے ؟

جنرل ــــ بالکل آسان ہے۔ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ جب مسافروں کا کوئی گروہ سرحد پر پہونچتا ہے تو افسر متعلقہ ان سب کے پروانہ ہائے راہداری کی ایک جگہ جمع کر لیتا ہے پھر وہ انھیں گنتا ہے اور ان سے آدمیوں کی تعداد کا مقابلہ کرتا ہے۔ اگر تعداد درست ہوتی ہے تو اسے اطمینان ہو جاتا ہے اور پھر وہ کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتا کہ ان میں کتنے مرد ہیں اور کتنی عورتیں ؟

شہزادی ــــ پھر تمھیں یہ کیونکر معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک پروانہ راہداری میرا تھا ؟

جنرل ــــ ہانسبرگ میں ایک ہوٹل کے ملازم نے اس وقت نوجوان سردار کا پروانہ راہداری دیکھا جس وقت وہ غسلخانہ میں تھا ــــ وہ تمھارا پروانہ راہداری تھا!

شہزادی ــــ لغو !! ــــ اگر یہ صحیح ہے تو انھوں نے وہیں مجھے کیوں نہ گرفتار کر لیا ؟

جنرل ــــ جب ہوٹل کا ملازم پولیس لے کر واپس آیا تو نوجوان فرار ہو چکا تھا اور تم معہ اپنے پاسپورٹ کے موجود تھیں۔

شہزادی ــــ فرامرز ! تم ان آدمیوں کو باہر بھیجدو ، میں اس معاملہ میں تم سے تنہا گفتگو کرنا چاہتی ہوں !

جنرل ــــ (خوف سے اٹھکر) نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مجھ سے یہ گستاخی ممکن نہیں۔

کسی طرح ممکن نہیں! شاہی خاندان کی ناموس کسی مرد سے تنہائی میں گفتگو کرے! اسـ ـ ـ ایسا کبھی نہیں ہوا، خواہ وہ مرد اس کا شوہر ہی کیوں نہ ہو۔

شہزادی ۔ لیکن تم بھول گئے اس قانون میں ایک استثنا بھی ہے۔ شہزادیاں بچوں سے تنہائی میں بلا تخصیص جنسی گفتگو کر سکتی ہیں (نگاہوں میں ڈال کر) فرامرز! ادہر دیکھو! تمھیں میری دادی نے کھلایا ہے میرے دادا نے تمھیں "بچہ" کہکر پکارا ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ شاہی خطابات ہمیشہ کے لئے ودیعت ہوتے ہیں تاوقتیکہ وہ خود بادشاہ کے حکم سے منسوخ نہ کر دئے جائیں۔ اس طرح تم حرم شاہی کے قانون سے مستثنیٰ ہو۔ یوں بھی میرے نزدیک تمھاری حقیقت ایک بچے سے زیادہ نہیں۔ بہرحال میں تمھیں حکم دیتی ہوں کہ تم مجھ سے علیحدگی میں گفتگو کرو۔ ! سن رہے ہو! یہ میرا حکم ہے! ـــــ سات سو سال سے تمھارے خاندان کے کسی فرد نے شاہی خاندان کی عدول حکمی نہیں کی، کیا تمھیں اس کی جرأت ہے ؟!

جنرل ـــ (گھبرا کر) ہاں حکم نہ ماننے کے لئے بھی ایک تاویل ہوسکتی ہے وہ یہ کہ بیجان آدمی کسی کے حکم کی تعمیل نہیں کرسکتا (فوراً جیب سے پستول نکال کر اپنی کنپٹی کے پاس لے جاتا ہے)

شہباز ـــ (پھرتی سے پستول چھین کر) خدا کے لئے! جنرل صاحب، یہ کیا کر رہے ہو؟

جنرل ـــ (غصہ سے پستول واپس لینے کے لئے شہباز کی طرف جھپٹ کر) نمک حرام پاجی! پستول چھوڑ! میری خاندانی عزت پر حرف آرہا ہے۔

شہباز ـــ (شہزادی کی طرف پستول بڑھاتے ہوئے) جلدی لو، ورنہ گیا! جنرل مجھ سے کہیں زیادہ پہلوان ہے!

شہزادی ـــ (پستول چھینتے ہوئے) ہاں! اب ٹھیک ہے، تم سب سوائے جنرل صاحب کے ایک سکینڈ کے اندر کمرہ خالی کردو! فوراً !! فوراً !!! . . . . . . بجلی کی طرح!

(ان الفاظ کے ساتھ وہ بھاگتے ہوئے سپاہیوں کی طرف پستول کے دو تین فائر کرتی ہے۔ سپاہی بدحواسی سے کمرہ چھوڑ کر فرار ہوجاتے ہیں اس کے بعد وہ شہباز کی طرف مڑتی ہے۔ جسے فرامرز نے اس دوران میں فرش پر گرا دیا ہے)

شہزادی ـــ تم بھی! میں تم سے کہہ رہی ہوں (وہ شہباز کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہے۔ شہباز اٹھ کر خوف سے اوسکی صورت دیکھتا ہے) . . . . . "چلو!" (شہباز دروازے کی طرف بھاگتا ہے اور کمرے باہر پہونچ کر بھاگتے بھاگتے شہزادی سے مخاطب ہوتا ہے)

"اور فیرنہ کرنا ـ "جاں نثار"! "انقلاب زندہ باد!!

شہزادی۔۔۔ (بگڑتے ہوئے) بکومت!۔۔۔۔۔۔ حکم کی تعمیل کرو! (یہ کہکر وہ یکے بعد دیگرے دو فیر اور دروازہ کی طرف کرتی ہے)

جنرل۔۔۔۔ (شہزادی کی طرف بڑھتے ہوئے) شہزادی جہاں پناہ!!........"

شہزادی۔۔۔ خبردار! ایک قدم نہ بڑھنے پائے، ابھی ایک گولی باقی ہے، تمہنے پستول چھیننے کا ارادہ کیا اور میں نے
(یہ کہکر وہ پستول کا رُخ اپنی کنپٹی کی طرف پھیر دیتی ہے)

جنرل ۔۔۔ (پیچھے ہٹ کر اور اپنی دونوں آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر) خدا کے لئے شہزادی ایسا نہ کرو! اسے رکھدو! میں ہر حکم کی تعمیل کے لئے تیار ہوں ۔۔۔۔۔۔۔ خدا کی قسم ہر حکم کی تعمیل کے لئے!! صرف تم پستول رکھدو اور خودکشی کا ارادہ نہ کرو!!

شہزادی۔۔۔ (پستول کو میز پر پھینکتے ہوئے) لو!......اب مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تمہارے حواس درست ہو چکے ہیں!

جنرل ۔۔۔۔ (اپنی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے) خداوندا! تیرا شکر ہے!

شہزادی۔۔۔ (نرم لہجہ میں) فرامرز! تم مجھے شہزادی سمجھتے ہو، اس سے زیادہ کچھ اور تو نہیں سمجھتے؟

جنرل ۔۔۔ (گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر) تمھیں! تمھیں!! خدا جھوٹ نہ بلائے، تم میرے آقا کی نشانی ہو اگر دنیا میں میرے لئے کسی قوت یا اقتدار کی زندہ روشنی باقی ہے تو وہ صرف تمہاری ذات میں ہے میرا سر کسی طاقت کے سامنے نہیں جھک سکتا مگر تمہارے لئے میں اسے نثار کرنا اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتا ہوں۔ (یہ کہکر وہ فرط عقیدت سے اس کا ہاتھ چوم لیتا ہے)

شہزادی۔۔۔ (بدمزگی سے) بت پرست! مشرک!! فرامرز تجھے کب یقین آئے گا اور کس وقت تیری آنکھیں کھلیں گی کہ ہمارا اقتدار اور ہماری شان و شکوہ تجھ جیسی چند غلامانہ ذہنیتوں کا ایک خیالی واہمہ تھا۔

(وہ لاپرواہی سے فرامرز کی کرسی کھینچ کر اُس پر بیٹھ جاتی ہے۔ فرامرز بدستور کھڑا رہتا ہے)
"ہاں تو اب تم بتاؤ کہ میں تمھارے حکم کی تعمیل کروں یا تم میرے حکم کی تعمیل کروگے؟"

جنرل ۔۔۔ (دماغی اُلجھنوں سے پریشان ہو کر اُس زخمی ہرن کی طرح جسے ہر طرف شکاری ہی شکاری نظر آتے ہوں۔ مایوسانہ طور پر شہزادی کو تکنے لگتا ہے)

شہزادی۔۔۔ بتاؤ! فوراً بتاؤ!!

جنرل ۔۔۔ (اظہارِ کرب کے ساتھ) خداوندا، یہ کیا تماشہ ہے؟ ایک وقت میں چھ حکومتوں کے چھ متضاد

احکام اور تعمیل کرنے کے لئے تنہا میں !!! اس حال میں کہ حاکموں میں سے ایک بھی انسانیت کی صفت سے متصف نہیں!

ایک گورنمنٹ بیرونی مخالفین سے صلح کرنے کا حکم صادر کرتی ہے، دوسری بالکل اس کے برخلاف چوبیس گھنٹے میں ملک کو اُن سے خالی کرالینا چاہتی ہے!...... ایک کہتی ہے کہ سرمایہ داروں کو اضافی ٹیکس وصول کرکے معاف کردو، دوسری کہتی ہے کہ ان کے بچے بچے کو گولی سے اڑادو!!........

وزیر اعظم صاحب حکم نافذ کرتے ہیں کہ فلاں فلاں مجلس ہلی میں شریک ہوکر اعلان کرو کہ اشتراکی حکومت کسی نئی سلطنت یا ریاست کا الحاق کرنا نہیں چاہتی بلکہ روئے زمین پر آزادی کا صور پھونکنے کے لئے وجود پذیر ہوئی ہے۔ کابینہ اس حکم کو منسوخ کرتے ہوئے اعلان کرتی ہے کہ وہ مجلس خلاف قانون ہے!!

شہزادی — انھیں مرنے دو! میں کبھی ان کی بک بک پر توجہ نہیں کرتی۔

جنرل —— شہزادی جہان پناہ کے اس اظہار خیال پر مجھے بیحد مسرت ہے۔ یوروپ کو آپ کی گرانقدر رائے سے مستفید ہونا چاہیئے۔!!

شہزادی — ہاں، لیکن فرامرز تم جانتے ہو کہ تمھاری دلی تمنا —— یعنی امرائے عمارہ کی کھوئی ہوئی ریاست اور اس کے اقتدار کو از سر نو قائم کرنے کی امید —— اب بے فائدہ اور بیکار ہے۔

جنرل —— شہزادی صاحبہ آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہیئے۔ ان الفاظ کا آپ کی زبان سے ادا ہونا بھی میرے نزدیک "غداری" ہے۔ (وہ انتہائی رنج و ملال سے لڑکھڑاتے ہوئے شہباز کی کرسی پر بیٹھ کر سر پکڑ لیتا ہے)

شہزادی — خود کو دھوکہ نہ دو فرامرز! ہمارے خاندان میں سے اب کسی کے لئے از سر نو ریاست عمارہ کی گدی پر بیٹھنے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

(وہ کرسی سے اٹھ کر زور زور سے بڑبڑاتے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگتی ہے)

"ہم اس درجہ پامال ہو چکے ہیں، اتنے کمزور ہو گئے ہیں، اس حد تک افسانۂ ماضی بن چکے ہیں اور اسقدر ہمارے ظلم و ستم نے ہم سے انتقام لیا ہے کہ اب کوئی امید ہمارے ملعون اقتدار کے بحال ہونے کی باقی نہیں ہے۔

جنرل —— شہزادی! تم کفر و الحاد بک رہی ہو!

شہزادی — دنیا کی تمام اہم صداقتیں اول "کفر" ہی کی صورت میں بے نقاب ہوتی ہیں —— تمام بادشاہوں

کی متفقہ قوتیں اور متحدہ فوجیں بھی اب میرے باپ کے تخت کو واپس نہیں دلاسکتیں۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو تم شاید یہ سب سے پہلے شخص ہوتے جو اس کے لئے جہاد کرتے۔ کیوں؟ . . . . . کیا تم نہیں کرتے؟

جنرل —— اسے خدا بہتر جانتا ہے کہ میں کرتا۔

شہزادی —— یقیناً کرتے —— میرا ایمان ہے کہ تم ضرور غریبوں پر از سرِ نو عذاب نازل کرتے اور رعایا کو انھیں شرمناک جیل خانوں میں بھرنے کی انتہائی کوشش کرتے اور اسے اپنی وفاداری کا انتہائی کارنامہ سمجھتے۔ اگر تمھارا بس چلتا تو آزادی کے نورانی آفتاب کو ضرور انسانی خون کے اسی بحرِ بےپایاں میں پھر غرق کردیتے جس سے بمشکل تمام اس کی شعاعیں اُبھر سکی ہیں —— یہ تمام کس لئے ہوتا؟ —— اس غرض کے لئے کہ ان جملہ خونریزیوں اور سفاکیوں کے قابلِ نفرت ہنگاموں کے درمیان تمھیں ایک خود مختار نواب کا دربار نظر آرہا ہے جس میں جنرل کی وردی پہنے ہوئے تم ایک طرف غلاموں کی طرح کھڑے ہوئے ہو۔ تمھارے سپرد کوئی خاص کام نہیں ہے۔ کاہلی اور سستی نے تمھیں بیکار محض بنادیا ہے، دن رات تمھیں جمائیاں پر جمائیاں آتی رہتی ہیں، یہاں تک کہ ایک روز قبر تمھاری طرح جمائی لے کر اپنا خوفناک منہ کھولتی ہے اور تمھیں ہڑپ کرجاتی ہے! ——

یہ ہے وہ زندگی جس کے لئے تم ہزارہا مخلوقِ خدا کے حقوق غصب کرتے ہو، لاکھوں معصوموں کی بددعائیں لیتے ہو! —— (حقارت سے) کیا زندگی ہے؟!

جنرل —— شہزادی تمھارے دماغ میں ضرور کوئی خرابی آگئی ہے مجھے اب ذرا شبہ نہیں رہا ——

خدا کی پناہ! دربارِ شاہی کے متعلق اسقدر اہانت آمیز اور باغیانہ خیالات!!

میں نے دربار میں کبھی جمائیاں نہیں لیں ہٹ کے کتے اور فرض ناشناس سپاہی وہاں جمائیاں لیا کرتے تھے! لیکن انھیں کا اس میں کون سا قصور تھا؟ کتے جمائیاں لیا ہی کرتے ہیں۔ اُن میں نہ ذہانت و فطانت ہوتی ہے، نہ خودداری اور وقار کا مادہ ہوتا ہے، نہ وہ فرض شناس ہوتے ہیں نہ حق نمک ادا کرنا جانتے ہیں!

شہزادی —— آہ! بھولے فرامرز تمھیں دربار میں اسقدر شرکت کرنے کا اتفاق نہیں ہوا کہ تم اس سے اُکتا جاتے تم زیادہ تر فوج کی نگہداشت پر باہر رہتے تھے اور جب کبھی گھر واپس آتے تمھیں دوسرا حکم تیار ملتا۔ تمھاری مسرت مجھے اور میرے والدین کو چمکیلے اور گرانبہا لباس میں تمکنت کے ساتھ چلتے پھرتے ہوئے دیکھ لینا تھا، اور بس۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟

جنرل —— تو کیا تم مجھے اس پر ملامت کر رہی ہو؟

شہزادی —— نہیں۔ تم اسی میں خوش تھے۔ تمہارے لئے یہی کافی تھا۔ لیکن تم میرے متعلق تو خیال کرو۔ جو اس تمنا کو اپنے دل میں پرورش کیا کرتی تھی کہ تم نظر اٹھا کر دیکھو، عام آدمیوں کی طرح ہنس کر بات چیت کرو۔ یہ جانتے ہوئے کہ میں فرشتہ نہ تھی بلکہ عام کنواری لڑکیوں کی طرح ایک لڑکی تھی، تمہارا یہ طرز عمل اچھا خاصہ میرے ساتھ ظلم تھا۔ اس کے بجائے اگر تم میری جگہ ایک موم کی گڑیا یا سونے کا بت رکھ کر اپنے گھر میں پرستش کر لیا کرتے تو بہتر تھا۔ اسے احساس تو نہ ہوتا۔ لیکن مجھے —— تمھیں کیا معلوم ہے کہ مجھے کتنا گراں گذرتا تھا، اور زندگی اس ماحول میں میرے لئے کتنی عذاب تھی؟!

—— پناہ خدا !!!

جنرل —— ٹھہرو! شہزادی ٹھہرو!! ورنہ میں اس عہد و پیماں پر قائم نہ رہ سکوں گا جس کے لئے میں ابھی قسم کھا چکا ہوں۔ . . . . . . اس وضع کی خلاف اخلاق اور حیا سوز باتیں کرنے پر بیسوں عورتوں کے کوڑے لگا چکا ہوں!

شہزادی —— ان انسانیت سوز مظالم کا تذکرہ کرکے مجھے مجبور نہ کرو کہ میں تمہارے سینہ کو تمہارے ہی پستول کا نشانہ بنا دوں!

جنرل —— تمہاری فطرت ہمیشہ پست اور رکیک باتوں کی طرف مائل رہی ہے تمہاری رگوں میں امیر عمارہ کا خون نہیں ہے۔ بلکہ کسی ماما نے چالاکی سے بچہ تبدیل کر لیا ہے۔ میں نے تمہارے بچپن کی اکثر روائتیں سنی ہیں۔

شہزادی —— (قہقہہ لگا کر) ہاں، مجھے یاد ہے ایک مرتبہ جب میں پانچ چھ برس کی تھی، والدین مجھے سرکس میں لے گئے۔ وہ میری مسرت کا اولین لمحہ تھا۔ میں نے سب سے پہلی بار آزادی کی جھلک دیکھی اور بلا قصد دوڑ کر تماشہ کرنے والوں میں شامل ہو گئی۔ ملازمین نے دوڑ کر مجھے گود میں اٹھا لیا اور پھر لا کر اسی "سنہرے پنجرے" میں بند کر دیا جس سے میں اتفاقاً رہا ہو گئی تھی۔ لیکن چونکہ میں نے آزادی کا ذائقہ چکھ لیا تھا اس لئے اس کے بعد کوئی پابندی اس احساس کو میرے قلب سے نہ بھلا سکی۔

جنرل —— (ہنس کر) آزادی! —— کیا نٹوں اور بازیگروں میں شامل ہو کر اپنا تماشہ بنانا اور دنیا کو خود پر ہنسانا، آزادی؟! —— سبحان اللہ کیا آزادی ہے؟!!

شہزادی —— اپنا تماشہ بنانا تو مجھے دربار ہی میں سکھایا گیا تھا، میں اس کام کے لئے باقاعدہ طور پر تربیت یافتہ تھی۔

جنرل —— لیکن دربار میں تمھیں نیم برہنہ ہو کر کبوتریوں کی طرح قلابازیاں کرنا اور پہلوانوں کی طرح سینہ نکال کر

چلنا تو شاید نہیں سکھایا گیا تھا۔

شہزادی — بیوقوف ہو! اگر یہ باتیں مجھے میسر ہوتیں تو پھر باہر جا کر انھیں حاصل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ میں بہر صورت اپنے نفرت انگیز اور ناقابل برداشت لباس سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ اور ان سے اسی طرح انتقام لیا جا سکتا تھا کہ قلابازی اور ورزش کے ہنر سیکھوں —— آہ! قلابازی! ..... جنرل تمھیں کیا معلوم ہے کہ قلابازی میں کتنا لطف آتا ہے؟ کیسی آزادی حاصل ہوتی ہے؟ ..... میں تمھیں قلا کر کے دکھاؤں؟!

جنرل —— ہاں! تم دکھاؤ، لیکن میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اسی وقت کھڑکی سے کود کر خودکشی کر لوں گا اور سرخروئی کے ساتھ تمھارے والدین سے جنت میں جا ملوں گا۔ وہ اپنی وفاداری کے تمغے تو میرے سینے سے نہ چھین سکیں گے!

شہزادی — تم بالکل دیوانے ہو، قطعاً ناقابل اصلاح۔ تمھیں کسی طرح یقین نہیں آسکتا کہ ہم شاہی خاندان کے افراد بھی بالکل اسی طرح گوشت و پوست کے بنے ہوئے انسان ہیں جس طرح عام مخلوق۔ اور دربار کے وقت تخت شاہی پر ایک بادشاہ کے سینے میں بھی اسی طرح دل دھڑکتا رہتا ہے جس طرح ایک عام آدمی کے سینہ میں۔ میں اب تم سے دلائل کے ساتھ گفتگو نہ کروں گی بلکہ اپنی قوت استعمال کروں گی، میرے ایک ادنیٰ اشارے پر تمھارے ماتحت تم سے پھر جائیں گے۔ اسی وقت اُن میں سے نصف کے قریب تمھیں سلام کرنا اپنی ہتک سمجھتے ہیں اور تم بھی اپنے اندر اتنی جرأت نہیں پاتے کہ انھیں سزا دے سکو بلکہ تمھیں یہ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ اُن کا گستاخانہ طرز عمل تمھاری نگاہ ہی میں نہیں ہے۔

جنرل —— اگر یہ واقعہ ہے تو کم از کم تمھیں اس پر مجھے طنز کرنے کی گنجایش نہیں ہے۔ تمھیں تو خود شرم آنی چاہئے۔

شہزادی — طنز! (غصہ سے) میں طنز کرتی ہوں! —— ایک معمولی جنرل پر طنز! . . . . شاید تم اپنی ہستی کو بھول رہے ہو فرامرز!!

جنرل —— (مودبانہ گردن جھکا کر) خدا کا شکر ہے! کم از کم اس وقت شہزادی کے لب و لہجہ میں اسی تمکنت و وقار کی جھلک ہے جو میرے آقا کے شاہی خاندان میں ہونی چاہئے!

شہزادی — فرامرز —— آہ فرامرز!! تیری حالت بالکل ناقابل علاج ہے اس لئے کہ غلامی کے جراثیم تیری رگ و پے میں سرایت کر چکے ہیں، انھوں نے تجھے بے حس بنا دیا ہے —— ایسے سخت الفاظ سنکر مجھے حیرت ہے کہ تیری انسانی حمیت میں ذرا حرارت پیدا نہ ہوئی، اور میرے منہ پر تھوکنے کے بجائے تو میری تعریف کر رہا ہے!

جنرل ـــ (خوف سے کانپ کر) خدا نہ کرے مجھ سے یہ الحاد سرزد ہو!
شہزادی ـــ اچھا چونکہ تمھیں میرا غلام بننا بخوشی گوارا ہے اس لئے تم میرے احکام بھی سن لو! میں اپنے شاہی خاندان یا غوبی تخت و تاج کو از سر نو بحال کرانے کے لئے نہیں آئی ہوں بلکہ تم سے "انقلاب" کی خدمت کرانا چاہتی ہوں۔
جنرل ـــ شہزادی میں بیوقوف سہی لیکن اتنی عقل مجھ میں ضرور ہے کہ انقلابی جماعت کی جو ہمارے ملک کے لئے ایک لعنت بن گئی ہے سختی سے مخالفت کروں۔ مجھے اس کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں "انقلاب" ہمیں کیا نفع پہونچائے گا؟ ـــ دلواتے نوجوانوں کی شر انگیز فصیح و بلیغ تقریروں کے فریب میں آجانا نہایت آسان ہے، اُن کے سُرخ اشتہارات سے مرعوب ہو جانا بالکل ممکن ہے لیکن دیکھنا یہ ہے اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تہذیب و تمدن کی انہوں نے کیا خدمت کی ہے؟ اور آزادی کو عملی جامہ پہنانے میں انھوں نے کس بلند اخلاق کا مظاہرہ کیا ہے؟ . . . . . . کیا وہ پہلے کی طرح لوگوں کو پھانسیوں پر نہیں لٹکا رہے ہیں؟ گولیوں کا نشانہ نہیں بنا رہے ہیں؟ اور جیل خانوں کو اسی قدر (بلکہ شاید اس سے کہیں زیادہ) قیدیوں سے نہیں بھر رہے ہیں جس قدر شاہی زمانے میں بھرے جاتے تھے؟ کیا تمھارے خیال میں صداقت اور راستی کو اُنھوں نے اپنا اصول بنالیا ہے؟ ہرگز نہیں! یقیناً نہیں! بلکہ اگر سچ بات ان کے نزدیک مناسب و موزوں نہیں ہوتی تو وہ اس کے بجائے جھوٹ کی تبلیغ کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں اور اس حد تک کہ سچ بولنے کو جرم قرار دیدیا جاتا ہے۔
شہزادی ـــ بیشک وہ ایسا کرتے ہیں۔ اور کیوں نہ کرنا چاہیئے؟
جنرل ـــ (حیرت سے منہ کھول کر) کیوں نہ کرنا چاہیئے؟! . . . . خدا کی پناہ اس الحاد کا کیا جواب ہے؟
شہزادی ـــ بیشک اُنھیں کیوں نہ سچ بولنے کو جرم بنادینا چاہیئے، انھیں کا کیا قصور ہے جب ہم خود پہلے سے ایسا کرتے چلے آئے ہیں! تم خود اسی پر عمل پیرا رہے ہو! کیا تم نے ہزارہا عورتوں کے اس بات پر کوڑے نہیں لگائے کہ وہ اپنی اولاد کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا چاہتی تھیں؟
جنرل ـــ اشتراکی لٹریچر پڑھانا! بغاوت کا سبق دینا! تعلیم ہے؟!
شہزادی ـــ توبہ! خدا جانے تمھارا دماغ کس کوڑے کی مٹی سے بنا ہے! . . . . . بلا اشتراکی لٹریچر پڑھے ہوئے اور بلا "کارل مارکس" کا سبق حاصل کئے ہوئے "دین" و "دنیا" کی حقیقت سمجھنا کس طرح ممکن ہے؟ ـــ تم بلا دلیل کیوں تاویلیں کر رہے ہو؟ اپنے ظلم اور درندگی کا اعتراف ہی کیوں نہیں کر لیتے کیا تمھارا یہ خیال ہے کہ میں بحیثیت عورت ہونے کے عورتوں کے کوڑے لگانے کو مردوں سے زیادہ اہمیت

دیتی ہوں؟

جنرل ——— میں شہزادی کے سوال کو مطلق نہیں سمجھ سکا۔ میرے خیال میں تو آپ اپنے بیان کی خود تردید کر رہی ہیں۔

شہزادی۔ لغو! ——— میں یہ کہتی ہوں کہ اگر پبلک خود اپنے ملک کا انتظام نہیں کر سکتی تو پھر کسی دوسرے کو ان کا انتظام کرنا چاہئے ——— اگر وہ بلا کسی بیہودگی اور بے وقوفی کے خود پر حکومت نہیں کر سکتے تو پھر کسی اور شخص کو انھیں بیوقوف بنانا چاہئے اور انھیں زبردستی شور و شر سے محفوظ رکھنا چاہئے۔ . . . .
. . . . غرض کوئی طاقتور اور قابل بھروسہ جماعت ہمیشہ برسر اقتدار رہنی چاہئے۔ میری رائے صرف اسی جماعت کی موافقت میں ہے جس کے اصولوں سے مجھے اتفاق ہو ——— اس میں شک نہیں کہ " انقلاب " بھی خونریزی اور سفاکی میں ابھی شاہی زمانے پر ترجیح نہیں رکھتا لیکن اس کے اصول نہایت سودمند اور انصافانہ ہیں اس لئے میں اس کی موافقت میں ہوں۔

جنرل ——— تمھیں خود معلوم نہیں کہ تم کیا کہہ رہی ہو! . . . . یہ سب " بالشویزم " ہے حرف بحرف " بالشویزم " کیا تم خود شاہی خاندان کی رگن رگین ہو کر بالشویک بن گئی ہو؟

شہزادی۔ " بالشویک " یا " انقلابی " مجھے وہ سب کچھ بننا گوارا ہے جو دنیا کو زندان وقفس کے بجائے ایک تھیٹر یا سرکس بنادے۔

جنرل ——— آہ! تمھیں اب بھی " آفتاب سرکس " بننے کی تمنا باقی ہے!

شہزادی۔ ہاں! اور اس شان کے ساتھ کہ لوگ مجھے " بالشویک شہزادی " کے نام سے پکارا کریں ——— کوئی قوت میری اس تمنا کے راستہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ تمھارے لئے جو احکامات جاری کئے گئے ہیں وہ بالکل صاف اور واضح ہیں یعنی یہ کہ تم " انقلاب پسندوں " کی ہر ممکن مدد کرو۔

جنرل ——— کیا؟ . . . . . انقلاب پسندوں کی مدد؟ کون سے انقلاب پسندوں کی مدد؟ آجکل تو ہر شخص انقلاب پسند ہی ہے۔ لیکن وہ شخص بھی کسی اصول متعینہ کے پابند نہیں۔ ایسے ہنگامہ پسند لوگوں کی کیا مدد کی جا سکتی ہے۔ ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جدا بنا رہا ہے اور ہر فرد مختلف سمت کو دوڑ رہا ہے۔

شہزادی۔ میں تمھیں بتاؤں گی ——— صرف " جنگ " ایک " عالمگیر جنگ " ہی اس افراط وتفریط کا خاتمہ کر سکتی ہے۔

جنرل ——— " جنگ! "

شہزادی۔ ہاں جنگ ——— صرف ایک ایسی عالمگیر جنگ ہماری مختلف جماعتوں اور ہمارے متفرق

فرقوں کو متحد و متفق کرسکتی ہے جس میں ہم سب کے لئے یکساں خطرہ ہو اور روس کو من حیث القوم تباہ ہو جانے کا اندیشہ ہو!

جنرل —— شاباش! یہ ٹھیک ہے! واقعی جنگ ہی تمام فتنہ و فساد کا خاتمہ کرسکتی ہے۔ میرا ہمیشہ یہی خیال رہا ہے۔ لیکن پبلک کا متحد ہو جانا بھی بیکار ہے جب تک کوئی متحدہ فوج نہ ہو۔ میں اکیلا کر ہی کیا سکتا ہوں۔ میں جنرل ہوں۔ ایک برائے نام فوج کا جنرل۔ تقریریں میں نہیں کرسکتا۔ فتوحات میرے بس کی نہیں۔ ہر شخص خود مختار ہے۔ میں کہوں گا کہ میمنہ پر حملہ کرنا مفید ہے، میرے سپاہی کہیں گے کہ میسرہ پر دھاوا بولنا قرین مصلحت ہے۔

(وہ پھر مایوس ہو کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

شہزادی —— کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ میری رائے کو بھی ترجیح نہ دیں گے۔

جنرل —— ہاں ممکن تھا، اگر تم بجائے عورت کے مرد ہوتیں۔

شہزادی —— اور اگر میں اس کام کے لئے ایک مناسب و موزوں نوجوان بھی فراہم کردوں؟

جنرل —— (غصہ سے بھڑک کر) میں سمجھا! غالباً وہ وہی نوجوان ہوگا جس کے ساتھ تم بھاگ گئی تھیں۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ تم اس اوباش و آوارہ شخص کو میری فوج کا جنرل بنا کر مجھے خود اس کام کرنے پر مجبور کرو۔ . . . . ناممکن!!

شہزادی —— تم نے میرے ہر حکم کی تعمیل کرنے کا وعدہ کیا ہے، نہیں، بلکہ قسم کھائی!

(وہ کرسی سے اٹھ کر اس انداز سے ٹہلتی ہے گویا کوئی جنرل اپنی فوج کا معائنہ کر رہا ہے)

(" مجھے معلوم ہے کہ صرف وہی شخص فوج میں بہادری کی روح پیدا کرسکتا ہے)

جنرل　حماقت ہے۔ فریب ہے۔ غالباً وہ کوئی سرکس کا نٹ یا بازیگر ہوگا جس سے تمھیں محبت ہوگئی ہے۔

شہزادی —— میں قسمیہ کہتی ہوں کہ مجھے اوس سے محبت نہیں ہے، تم باور کرو کہ میں کبھی اس کے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔

جنرل —— تو پھر وہ ہے کون؟

شہزادی —— ہے ایک شخص! . . . . . مجھے حیرت ہے کہ تم نے نہیں دیکھا حالانکہ اس وقت بھی وہ تمھاری نگاہوں سے کچھ دور نہیں!

جنرل —— (تعجب سے چاروں طرف دیکھ کر) کہاں؟ کہاں؟

شہزادی —— کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھو!

(وہ جھپٹ کر کھڑکی کے پاس پہونچتا ہے، اس کی نگاہیں ادھر ادھر نوجوان کو ڈھونڈھتی ہیں۔ شہزادی اپنا سموری لبادہ اتار ڈالتی ہے اور ایک نوجوان فوجی افسر کی طرح مکمل وردی پہنے ہوئے نظر آتی ہے)

جنرل —— (باہر جھانکتے ہوئے) مجھے تو یہاں کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ کس طرف ہے؟

شہزادی —— اس طرف! —— بیوقوف ادھر دیکھ!!

جنرل —— (مڑکر) تم! .... تم!! خدا کی پناہ! تم واقعی "بالشویک شہزادی" ہو!

(برنرڈ شا)

طالب باغپتی

فراست الید۔ مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و زوال موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے قیمت علاوہ محصول عہ

جذبات بھاشا۔ جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونہ پیش کرکے ان کی ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے قیمت علاوہ محصول ۱۲؍

شاعر کا انجام۔ جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ جس میں حسن و عشق کی تمام نشہ کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔ قیمت ۱۰؍

نگارستان (دوسرا اڈیشن) حضرت نیاز کے اور متعدد مضامین اور افسانے شامل کئے گئے ہیں، نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے قیمت ... عہ

گہوارۂ تمدن۔ (دوسرا اڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکہ آرا کتاب جس میں تاریخ اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقار تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیا تہذیب و شائستگی اس کی کسقدر ممنون ہے اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے قیمت علاوہ محصول ... عہ

شہاب کی سرگزشت۔ حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس زبان کی اس کی تخئیل اسکی نزاکت بیان، اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے قیمت ... عہ

تذکرۂ خندۂ گل۔ مولفہ عبد الباری آسی جسمیں ۳۰۰ سے زائد اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات معہ انکے لطائف و ظرائف و انتخابات کلام کے درج ہیں قیمت معہ محصول دو روپیہ عہ

منیجر نگار

کاروبار کی موجودہ سرد بازاری کے اسباب

اور ان کا علاج

بسلسلۂ ماہ گزشتہ

(۸) یہاں تک تو اشیاء کی رسد، اور حکومتوں کی کرنسی اور فنانشل پالیسی سے بحث ہوتی رہی لیکن اب اخیر میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اشیاء کی طلب کے متعلق بھی اظہار رائے کیا جائے۔ جس وقت بازار کی سرد بازاری کے اسباب میں لوگوں کی طلب اور مال کی نکاسی میں کمی کو بھی شامل کیا جاتا ہے تو یہ خیال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ جب . . . .

. . . .

. . . . اس آبادی میں کمی نہیں بلکہ دس فیصدی اضافہ ہے تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں اشیاء کی پیداوار ضرورت اور طلب سے زیادہ ہے۔ لیکن کاروبار کی اصطلاح میں طلب کی کمی ایک نسبتی چیز ہے۔ اس کو نسبت اشیاء کی لاگت سے دی جاتی ہے۔ اگر ایک چیز کے تیار کرنے یا خریدار تک پہنچانے میں ایک شخص کی لاگت اُس قیمت سے زیادہ ہے جو خریدار دینے کے لئے آمادہ ہے یا دے سکتا ہے تو فروخت کرنے والے کو اوس کے بیچنے میں کوئی نفع نہ ہوگا اور وہ اس چیز کے بیچنے سے باز رہے گا۔ اور اگر یہی صورت زیادہ وسیع حلقہ میں پھیل جائے گی تو عام طور پر فروخت کرنے والے اپنے اشیاء کے بیچنے سے باز رہیں گے۔ جب خردہ فروش خریداروں کو فروخت نہ کرسکینگے تو وہ تھوک فروشوں سے خود بھی نہیں خریدیں گے۔ جب تھوک فروش خوردہ فروشوں کو نہ بیچ سکیں گے تو وہ صناعوں اور کاریگروں سے نہیں خریدیں گے۔ اس طرح کاریگروں میں بے روزگاری پھیلے گی۔ اور . . . . ہر جگہ جہاں جہاں مزدور، زمین و مکان کے مالک اور سرمایہ دار نظر آتے ہیں اُن سب کی اجرت و منافع میں کمی اور بے روزگاری پیدا ہوگی پھر . . . . چونکہ یہی اجرت و منافع پانے والے اپنی اپنی جگہ پر اشیاء کے خریدار بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے معاملہ کے سمجھنے میں ایک عجیب پیچ در پیچ گتھی پڑجاتی ہے جس کا سلجھانا مشکل ہوجاتا ہے کیونکہ جس طرح اس کا فیصلہ مشکل ہے کہ مرغی پہلے پیدا ہوئی یا انڈا اسی طرح یہ

کہنا کہ خریدار پہلے پیدا ہوا یا بیچنے والا بہت مشکل ہے۔ چونکہ عام طور پر ہر خریدار کسی نہ کسی شکل میں اپنی اشیار یا خدمات بیچ کر یا سود و کرایہ ادا کر کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آمدنی حاصل کرتا ہے اور اس طرح گویا وہ خود فروخت کرنے والا بھی ہوتا ہے اس لیے اشیار کی قیمتیں ان کی اُجرت پر منحصر ہیں اور ان کی اجرت اشیار کی قیمت پر۔ اگر اشیار کی قیمتیں زیادہ ہیں تو ان کی اجرت زیادہ ہوگی۔ اگر ان کی اجرت زیادہ ہوگی تو اشیار کی قیمتیں زیادہ ہوں گی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اشیار کی قیمتیں پہلے زیادہ کی جائیں یا ان کی اجرت پہلے زیادہ کی جائے۔ نتیجہ دونوں کا یکساں ہوگا۔ چونکہ سب سے بڑا گروہ خریداروں کا مزدور پیشہ طبقہ ہے اور یہ مفلس و بے روزگار ہے اس لئے خریدار من حیث الجماعت قیمت بڑھانے سے مجبور ہے۔ اب ذمہ داری سرمایہ داروں پر آتی ہے کہ یہ کیوں اُجرت بڑھا کر یا لوگوں کو روزگار سے لگا کر اپنی اشیار کے خریدار پیدا نہیں کرتے؟ دنیا کی آبادی بڑھ گئی ہے اور لوگوں میں بے روزگاری ترقی پر ہے اگر یہ سب لوگ حیلے سے لگ جائیں اور ان کی اجرتیں بڑھا دی جائیں تو مال کی نکاسی کی ایک لا محدود طلب پیدا ہو سکتی ہے پھر سوال یہ ہے کہ دنیا کے سرمایہ دار اس طلب کو کیوں پیدا نہیں کرتے؟

اس سوال کا جواب علم المعیشت کے چند نہایت اہم اور مشکل مسائل کے سمجھنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس میں تقسیم دولت، تقسیم تجارت، طریق لین دین، طرز حکومت، مختلف جگہ کے رائج الوقت سکے، شرح مبادلہ، ذرائع و وسائل آمد و رفت، طریقہ تنظیم صنعت و زراعت سے ۔ ۔ ۔ کماحقہ آگاہی کی ضرورت ہے۔ یہاں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وسائل آمد و رفت و خبر رسانی کی ترقی کی وجہ سے کوئی ملک مالدات مستغنی نہیں رہا ہے بلکہ وہ اپنی ادنے سے ادنے ضروریات کے لئے غیر ملکوں کا محتاج ہو گیا ہے اور دنیا کی کثیر التعداد اشیار برابر نہایت حقیر نفع کی اُمید میں ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل ہونے لگتی ہیں۔ لیکن جہاں تک مستقل سرمایہ کے منتقل کرنے کا سوال ہے اس میں سخت مقامی پابندیاں ہیں۔ اور آبادی کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا نہ صرف دشوار بلکہ تقریباً ناممکن ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قیمتیں بین الاقوامی اسباب سے متعین ہوتی ہیں لیکن لاگت صرف قومی اسباب سے۔ اگر کسی ملک میں آبادی زیادہ اور زمین کم ہے تو وہاں لگان و کرایہ زیادہ ہوگا، اسی طرح اصل کم اور آبادی زیادہ ہے تو شرح سود زیادہ ہوگی بشرطیکہ ہنرمند مزدور، ہشیار تاجر اور آجر کم ہیں تو ان کی اُجرت و منافع زیادہ ہوگا۔ گو اس میں شک نہیں کہ معمولی مزدور کی اجرت کم ہوگی۔ لیکن اگر یہ معمولی مزدور کمزور، دُکھیا اور بے عقل ہے تو یہ کم مزدوری بھی بعض وقت گراں گزرے گی حکومت اگر نااہل ہے یا بد دیانت ہے تو اس کی وجہ سے تجارت پر بُرا اثر ہوگا بصورت مجموعی لاگت زیادہ بیٹھے گی۔ لیکن اس کے برخلاف اگر دوسرے ملک میں آبادی کم ہے لیکن سرمایہ زیادہ، تعلیم وافر، اور آبادی مستعد، مستقل مزاج، متحمل و مضبوط، مسابقت پسند، مشینری کی کثرت، حکومت ہمدرد و قابل، تو سود، منافع، لگان، محصول کا نرخ کم ہوگا۔ مزدوری بھی بصورت مجموعی کم ہوگی اور لاگت بھی اسی تناسب سے گھٹی ہوئی ہوگی۔

بین الاقوامی منڈیوں میں دونوں ملکوں کی اشیا کی قیمتیں بیان کی جائیں گی اور جس ملک کی لاگت کم ہوگی وہ کم قیمت پر بیچنے کو آمادہ ہوگا اور جس کی لاگت زیادہ ہوگی وہ لاگت سے کم کسی صورت میں نہ اترے گا الا اُس صورت میں کہ حکومت کی پالیسی اور امداد کی بنا پر وہ اپنی اشیا کو لاگت سے کم داموں پر بھی دینے کے لئے آمادہ ہو جائے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ زیادہ لاگت والے کارخانوں اور ملکوں کا اسباب اُن کے گوداموں میں بھرا پڑا رہتا ہے اور کم لاگت والے ملکوں و کارخانوں کا مال ہر بازار میں خوب بکتا ہے۔ جب اسٹوروں میں اسٹاک زیادہ رہتا ہے یا نقصان پہنچا جاتا ہے تو اور مال پیدا نہیں کرایا جاتا اور کارخانے بند ہو جاتے ہیں اور جب مال پیدا نہیں کرایا جاتا تو بے روزگاری اور افلاس بڑھتا ہے اور اشیا کی مانگ کم ہو جاتی ہے۔ اور اس کا اثر زیادہ لاگت اور کم لاگت والے سب ہی کارخانوں اور ملکوں پر کم و بیش پڑتا ہے۔ بے روزگاری ہر جگہ ترقی کرتی ہے۔ یہاں تک کہ مارکٹ میں صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں جن کی لاگت بہت کم ہوتی ہے۔ ملکوں کی لاگت کے اور گہرے اسباب کی جب جستجو کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کچھ اسباب تو قدرتی ہوتے ہیں اور کچھ غیر قدرتی۔ لیکن سائنس کی روز افزوں ترقی نے قدرتی اسباب کو نسبتاً بے اثر کر دیا ہے۔ لہٰذا اب بڑی حد تک اسباب سماجی اور سیاسی رہ جاتے ہیں۔ آبادی جاہل ہے تو کیوں ہے۔ آبادی تنگ خیال و قدامت پرست ہے تو کیوں ہے، آبادی محکوم ہے تو کیوں ہے، آبادی کے پاس سرمایہ زیادہ نہیں کیوں ہے۔ یہ سوال رہ جاتے ہیں۔ اب اگر آبادی و سرمایہ بھی اشیا کی طرح آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتیں اور افراد آزادی سے ایک دوسرے کے ساتھ میل جول اور رسم و رشتہ پیدا کر سکتے... تو جاہل و تعلیم یافتہ، بیوقوف و ہوشیار، کفایت شعار و غیر کفایت شعار سرمایہ دار و غیر سرمایہ دار میں ہر ملک میں... یکساں تناسب قائم ہو جاتا۔ لیکن حکومتوں کے قیام و مقامی و نسلی و لسانی و مذہبی تخیلات کی بنا پر یہ ممکن نہیں ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مخصوص زمین کے حصے مخصوص قسم کی آبادی کے لئے وقف ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی لاگت اُن کے ملک کے لئے مخصوص ہو جاتی ہے۔ اور ملکی حکومتیں اپنے اغراض و مفاد کی تمنا میں دوسرے ملکوں کے اغراض و مفاد کی پروا نہیں کرتیں۔ یہ صورت حال اور حکومت کا تخیل اس زمانے کے لئے تو موزوں تھا جب ملک میں خود کفیل بالذات زندگی بسر کرتے تھے لیکن اب جب کہ اعلیٰ پیمانہ پر اشیا کی پیداوار نے بڑے سے بڑے ممکن رقبہ پر تجارت کو پھیلانے کے لئے قوموں کو مجبور کر دیا ہے۔ اور جس کے پھیلانے میں وہ کامیاب بھی ہو گئی ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ جو سامراجی حکومتیں ہیں ان کی حکومت کا تخیل اب تک تو یہ رہا کہ محکوم ملک کو اُن کی مصنوعات اپنی خام پیداوار کے معاوضہ میں خریدنا چاہیئے اور یہ خام پیداوار اب تک محکوم ممالک کسی نہ کسی صورت سے زیادہ تر اپنے ذاتی سرمایہ و محنت کی مدد سے دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں کم لاگت پر پیدا کر لیتے تھے۔ لیکن اب وہ صورت پیدا ہوئی ہے کہ دوسرے ممالک اس میدان میں بھی ان سے سبقت لے گئے ہیں۔ اب ان کے

پاس سامراجی حکومت کو اس کے مال کے معاوضہ میں دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ سامراجی حکومت کا سرمایہ دار یا ملکی سرمایہ دار یا کوئی اور غیر ملک کا سرمایہ دار انھیں کسی معقول حیلہ سے لگائے تو اوس کی انھیں اُجرت ملے اور وہ ان سرمایہ داروں کی چیزیں خریدیں۔ لیکن یہاں سرمایہ داروں کی آپس کی کشمکش اور ایک دوسرے کی طرف سے اندیشہ و بے اعتمادی رونما ہوتی ہے۔ ہر سرمایہ دار خائف ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ روپیہ تو میں لگاؤں۔ اور نفع اس سے دوسرا سرمایہ دار اٹھائے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ روپیہ کاہے میں لگایا جائے اب تک تو سامراجی حکومت نے اپنی تجارت کو ترقی دینے کے لئے زیادہ تر ریلوں اور نہروں میں روپیہ لگایا۔ آیندہ کس چیز میں روپیہ لگایا جائے خام پیداوار کی ترقی میں یا مصنوعات کی ترقی میں۔ مصنوعات کی ترقی میں روپیہ لگانے کے معنی یہ ہیں کہ مار آستین اپنے خرچ سے پیدا کیا جائے۔ اور زراعت کی ترقی کا امکان اب بہت وسیع نہیں رہ گیا ہے۔ پھر صنعتی ترقی کے لئے محکوم ممالک خود خواہش کر رہے ہیں۔ اُن کی خواہش کس طرح اور کس حد تک پامال کی جا سکتی ہے۔

(۹) اس ضمن میں قبل اس کے کوئی اور بحث کی جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آخری سبب بھی بیان کر دیا جائے یعنی چین و ہندوستان میں بے امنی و خانہ جنگی اور قومیت کا ارتقا تحریک سول نافرمانی، بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ اور سودیشی چیزوں کے رواج نے ہندوستانی بنے ہوئے کپڑے اور دیگر مصنوعات کو ترقی دی اور بیرونی ممالک میں جو ہندوستان کی مانگ کی توقع میں اشیا بنائی گئی تھیں ان کا اسٹاک بڑھا دیا۔ دوسری طرف چین کی خانہ جنگی و بے امنی نے دنیا کی مصنوعات کے لئے جو ایک بڑی منڈی تھی اس کا دروازہ بند کر دیا۔ چین و ہندوستان دنیا کی قریب قریب نصف آبادی بسائے ہوئے ہیں۔ اس لئے ان ممالک کی مانگ کے کم ہو جانے نے کاروبار پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ پھر بالشویک خطرہ اور تمام ممالک میں مزدوروں کی تنظیم بھی جو اسٹرائک کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ دنیا کے کاروبار میں بے اطمینانی پیدا کر کے خلل انداز ہے۔

تجارت کی سردبازاری کے اسباب کا بیان یہاں ختم ہوتا ہے۔ اور اب ہم جستجو کریں گے کہ تجارت کو اس کی عام سطح پر لانے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ناظرین نے غور کیا ہوگا سردبازاری کے اسباب تین گروہ میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں اول وہ جو رسد سے متعلق ہیں، دوسرے وہ جو طلب سے متعلق ہیں اور تیسرے وہ جو مبادلہ سے متعلق ہیں۔ اس لئے تجارت اگر عام سطح پر آ سکتی ہے تو وہ ان ہی تینوں اجزا کی اصلاح سے آ سکتی ہے رسد کی اصلاح کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ اسے کم کر دیا جائے اور جب رسد طلب کے مقابلہ میں کم ہوگی۔ تو قیمتوں میں اضافہ ہوگا اور کاروبار اپنی اصلی حالت پر آ جائے گا۔ یہ صورت ایسی ہے کہ جسے دنیا نے ہمیشہ سردبازاری کے زمانہ میں اختیار کیا ہے۔ اور عملی طور پر یہ صورت حال اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ اشیا کی ارزانی

کے زمانہ میں ایسی دوکانیں دکارخانہ وبنک وکاشتکار جن کی لاگت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے اور جن کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہوتا کہ وہ کاروبار کی تجدید کا انتظار کرسکیں دوالیہ ہوجاتے ہیں اور اس طرح پر بازار میں جس مال کی رسد اُن کے یہاں سے ہوتی تھی وہ بند ہوجاتی ہے۔ اور طلب ہیں رسد کے مقابلہ میں نسبتاً اضافہ ہوجاتا ہے قیمتیں بڑھجاتی ہیں اور کاروبار اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے۔ اس طریقہ کو قدرتی ترتیب جدید کا طریقہ کہتے ہیں۔ لیکن اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ہزاروں اور لاکھوں آدمیوں کو سخت نقصان اور تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے اور اس کے علاوہ ترقی کا وہ اصول کہ دولت کا اضافہ برابر جاری رہے اور قدم آگے بڑھے پیچھے نہ ہٹنے پائے فوت ہوجاتا ہے۔ جبتک دنیا میں نیم گرسنہ، نیم برہنہ، اور خانہ بدوش لوگ ہیں اس قسم کی قدرتی ترتیب جدید کو انسان کے سماجی انصاف کے تخیل کو گوارا نہ کریں گے۔ پھر اس میں ذاتی و ملکی مسابقت و حریصانہ مقابلہ کا بھی سوال آجاتا ہے۔ یہ تسلیم کرلیا جاتا ہے کہ سرد بازاری کا ازالہ کمی رسد سے ہوگا۔ لیکن ہر شخص و ہر ملک کہتا ہے کہ رسد کی یہ کمی میرے یہاں کیوں ہو اور اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اس کا بار دوسرے پر ڈال دے اور اس سے تمام پیچیدگیاں مبادلہ کی پیدا ہوتی ہیں۔ مبادلہ کی کامیابی کے لئے ہر ملک اپنے سونے کے خزانوں کو جن پر تجارت کا دارومدار ہے محفوظ رکھنا چاہتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ دوسرے ملک کا سونا اپنے ملک میں کھینچ کر اپنی قوت کو مضبوط اور اپنے حریف کی قوت کو کمزور کردے۔ یہ کہیں شرح مبادلہ کو اپنے ملک کے خلاف کرکے کیا جاتا ہے کہیں شرح بنک بڑھاکر۔ کہیں سونے کی نقل و حرکت پر پابندی عاید کرکے، کہیں دیگر ملک سے قرض لے کر۔ کہیں بجٹ کے اخراجات میں کمی اور محاصل میں زیادتی کرکے کہیں امتناعی محاصل عاید کرکے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی جاری رکھی جاتی ہے کہ جسقدر لاگت کم کی جاسکے کی جائے۔ اور بعض وقت بیرون ملک بھیجنے والے مال کی قیمت لاگت سے کم کردی جاتی ہے اور اندرون ملک رہنے والے مال کی قیمت لاگت سے بہت زیادہ کردی جاتی ہے۔ گورنمنٹ گرانٹ باؤنٹیز اور سبڈی دیتی ہے۔ الغرض کہ ہر ملک اپنے کاروبار کو ابھارنے کی ہر ممکن سعی کرتا ہے۔ اور اس طرح قدرتی ترتیب جدید، انسانی کوشش سے ملتوی ہوجاتی ہے۔ لیکن یہ صرف ملتوی ہوتی ہے۔ اور آیندہ کے لئے اس میں بڑے خطرات پوشیدہ رہتے ہیں جو بعض وقت عالمگیر جنگ کی شکل میں بھی ترقی پا جاتے ہیں۔

اس لئے بہترین طریقہ تجارت کی سرد بازاری کے رفع کرنے کا یہ ہے کہ بین الاقوامی سمجھوتہ کے ساتھ ہر ممکن طریقہ ہر طلب میں اضافہ کیا جائے۔ اور تہذیب و تمدن کی ترقی میں رخنہ اندازی نہ کی جائے۔ دنیا کی زیادتی پیداوار کنجوس فطرت کے مقابلہ میں، انسان کے عزم و استقلال، سعی و کاوش کی ایک عظیم الشان فتح ہے۔ یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ اس فتح کو شکست میں تبدیل کیا جائے۔ زرخیز زمین، مکان، دوکان سرمایہ اور ضروریات کی تمام اشیا، ہر چیز انسان کی محنت سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر انسان کو محنت کرنے کا موقع دیا جائے تو وہ انھیں سے

ہر چیز کی پیداوار میں اضافہ کرے گا۔ اور ایک چیز کی پیداوار کے اضافہ سے دوسری چیز کی مانگ بڑھے گی اور اس طرح صنعت و حرفت ترقی کرتی چلی جائے گی۔ ایک جماعت کا دوسری جماعت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش، ایک ملک کا دوسرے ملک کے ساتھ غیر منصفانہ رویہ اگر جاری رہا تو تہذیب و تمدن کے قصر شاندار کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ لیکن مزدور و سرمایہ دار، محکوم ملک و سامراجی ملک اور ایک سرمایہ دار اور دوسرے سرمایہ دار، ایک سامراجی ملک اور دوسرے سامراجی ملک میں اگر اتفاق، صلح و آشتی قائم ہو جائے تو دنیا کی ترقی کے کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ بڑی خوشی ہے کہ لیگ آف نیشن اور مزدوروں کی بین الاقوامی جماعتیں اس نصب العین کو دنیا کے سامنے پیش کر رہی ہیں۔ اور وہ زمانہ دور نہیں ہے جبکہ ہم اس دنیا کو جنت بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے اور پھر ادنےٰ ترین مزدور کے لئے بھی وہی عیش و آرام فراہم کر سکیں گے جو آج بڑے بڑے رؤسا کو نصیب نہیں۔ اور امراء اور رؤسا کی شان و شوکت و تزک و احتشام کی تو کوئی انتہا ہی نہ ہوگی۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

محمد عاقل ایم۔اے

شبنمستان کا قطرۂ گوہریں

(بہ سلسلۂ ماسبق)

ملکۂ ناہید (نسرین کی گردن میں ہاتھ ڈالتے ہوئے) "یہ کیا چیز ہے میری سرگرانی کیوں کم ہوتی جارہی ہے، میرے دماغ کا وزن کیوں ہلکا ہو رہا ہے۔ میں اپنے آپ کو کیوں سبک محسوس کر رہی ہوں، میرا جسم کیوں آپ ہی آپ مائل پرواز ہے، میرے اعضا کیوں ڈھیلے ہوتے جاتے ہیں ــــ نسرین، آج تیری آنکھیں... غیر معمولی حسین نظر آرہی ہیں، ہائیں یہ تیری پتلیوں میں نم کیسا ہے۔ تیری پلکیں اس وقت اس طرح تھرتھرا رہی ہیں جیسے باریک ریشمی جھالر کو ہوا چھو کر گزر جائے مگر یہ فانوس بھی تو تھرتھرا رہے ہیں، ریشمی پردوں میں بھی خود ہی تھرتھری پائی جاتی ہے، چھت کانپ رہی ہے، ہوا بھی لرز رہی ہے، فضا پر رعشہ طاری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا مجھ سے اس وقت کھیل رہی ہے، مسکرا رہی ہے میں اسے چھونا چاہتی ہوں اور وہ ہنس کر پیچھے ہٹ رہی ہے۔ (پہلے زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے اور پھر انتہائی سنجیدگی سے) یہ فضا کی ہر چیز پر ہلکا سا نقاب کیوں پڑا ہوا نظر آتا ہے۔ کیا ساری دنیا کے نقوش اسی طرح ہلکے ہوتے مٹ جائیں گے۔ یہ کوئی بیداری کا خواب ہے یا میرا وہم کوئی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے ــــ لا، اور دے، (نسرین کا منہ چومتے ہوئے) میری اچھی نسرین یہ شیشہ مجھے دیدے، میں اس کو ختم کرکے دیکھوں گی کہ اس کیفیت کی انتہا کیا ہو سکتی ہے"

نسرین ــ "نہیں ملکۂ عالم اس سے زیادہ مناسب نہیں۔ اور ہاں، یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ وہ خواب کیا تھا جس نے دشمنوں کی جان کو اسقدر صدمہ پہونچایا ــــ

ملکہ ــ (پیشانی پر ہلکی سی شکنیں ڈالتے ہوئے) نہیں اس وقت مجھ سے کوئی بات ایسی نہ کر جس کا جواب دینے کے لئے مجھے پوری طرح برہم ہو جانا چاہئے۔ علاوہ اس کے اب اس کا نقش یوں بھی کچھ ہلکا معلوم ہو رہا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کئی سال اس خواب پر گزر چکے ہیں اس وقت مجھے ہر چیز دور نظر آرہی ہے۔ یہ شمعدان، یہ گلدان، یہ دروازوں کے پردے، یہ دیواروں کے نقش و نگار، الغرض ہر چیز مجھ سے دور ہٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے میں انہیں پکڑتی ہوں لیکن وہ میرے ہاتھ سے اس طرح نکلی جا رہی ہے جیسے مٹھی کی ریت ــــ (نسرین کے ہاتھ سے شیشہ زبردستی لے لیتی ہے

اور ایک جام خالی کرنے کے بعد۔ دفعتہً اٹھ بیٹھتی ہے ۔ ــــــ نسرین یہ کیا تماشہ ہے ، میں تو خشکی پر تیرتی ہوئی سی معلوم ہوتی ہوں ، فرش پر پاؤں رکھنے کے کچھ دیر بعد پتہ چلتا ہے کہ میرے قدم کسی چیز کو چھو رہے ہیں ، کیا میری حس باطل ہوئی جاتی ہے ۔ لیکن کسقدر دلکش یہ حسی ہے ، کتنی پیاری بدحواسی ہے ۔ یہ مجھے آج معلوم ہوا کہ عقل و ہوش کوئی بڑی عمدہ چیز نہیں ، اور اپنے آپ کو کھو دینا بڑی لذت ہے ــــــ یہ گانے کی آوازیں کہاں سے آرہی ہیں ، یہ سرود و رباب کون بجا رہا ہے ــــــ محل سے اتنی دور کہاں جشن طرب برپا ہے ــــــ اُن کو بلاؤ ، یہاں قریب بلاؤ ــــــ میں بھی گاؤں گی ، رقص کروں گی اور ان کے سازوں پر کچھ ایسا نغمہ چھیڑوں گی ، جو اس سے قبل کبھی میں نے نہیں گایا ــــــ

یہ کہہ کر ملکۂ ناہید لڑکھڑائی ، نسرین نے مسکراتے ہوئے اُسے اپنی آغوش میں سنبھالا اور اس طرح پہلا درس محبت ختم ہوگیا۔

(۲)

صبح کا وقت ہے ، اور آفتاب کی کرنیں دریچوں کے نیلگوں ریشمی پردوں سے گزر گزر کر ملکۂ ناہید کی خوابگاہ میں پھیل رہی ہیں۔

ملکہ جو رات خلاف معمول زیادہ دیر تک جاگی تھی ابھی تک ریشمی تکیوں ، ریشمی چادروں اور سنہری کے ریشمی گدّوں کے اندر پڑی ہوئی اس طرح بے خبر سو رہی ہے جیسے تیتری تیتری بنکر اُڑنے سے قبل اپنے خانۂ ابریشم میں آسودہ رہتی ہے ، چہرہ کھلا ہوا ہے ، بال منتشر ہیں ، چادروں کے سرک جانے سے اس کے جسم کا نصف حصہ کمر تک بالکل بے حجاب نظر آرہا ہے۔

کنیزیں جو صبح کی خدمت کے لئے مامور ہیں ، ایک گوشہ میں کھڑی ہوئی خاموشی سے منتظر ہیں کہ ملکہ انگڑائی لے اور وہ دوڑ کر پاس پہونچ جائیں۔

ایک ــــ " دیکھو اس وقت ملکہ کیسی بے حس و حرکت پڑی ہوئی ہے اور کسقدر تنہا ہے ۔ جیسے کوئی سنگتراش ابھی ابھی اس مرمریں بُت کو بنا کر فارغ ہوا ہو ، یا کوئی ساحر افسوں پھونک کر چلا گیا ہو"

دوسری ــــ " آہ ، عورت کی تنہائی بھی ایک راز ہے ، جس کو مرد نے ہمیشہ سمجھنا چاہا اور ہمیشہ غلطی کی "

تیسری ــــ " ہاں ، مرد ، غلطی سے سمجھتا ہے کہ عورت کی تنہائی اس کا سوگ ہے جسے وہ صرف محبت سے دور کرسکتا ہے دراں حالیکہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پہلی ــــ " دیکھو ملکہ کی گردن کیسی خوبصورت ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھی دانت میں ہلکا سا رنگ شہاب ملا کر

کھینچ کر سانچہ میں ڈھال کر اور اس سانچہ کو توڑ کر پھینک دیا۔ اور نرمی تو دیکھو جیسے کیلے کا اندرونی حصہ۔

دوسری۔۔۔ "میری رائے میں ملکہ اگر مردسے انتقام لینا ہی چاہتی ہے تو اس کی بہتر ترکیب اس نفرت کا اعلان نہیں بلکہ اس کو مبتلائے محبت ہونے کی اجازت دے کر تباہ کرنا ہے۔

تیسری۔۔۔ "ہاں، محبت کرکے جان لینا، ایک قسم کا زہر ہے جو دیر میں اثر کرتا ہے لیکن اس کی ہلاکت یقینی اور ناقابل علاج ہوتی ہے"

پہلی۔۔۔ "دیکھو تو سہی سونے کی حالت میں ملکہ کی آنکھیں کس قدر بڑی معلوم ہوتی ہیں، اور یہ لانبی گھنی پلکیں تو دیکھو جیسے سیاہ ریشم کے باریک و نرم ریشے کسی نے سلیقہ سے جما دئے ہوں۔

دوسری۔۔۔ "میں سچ کہتی ہوں کہ یہ طلسم کسی نہ کسی دن ضرور ٹوٹ کر رہے گا"

تیسری۔۔۔ "اور یاد رکھو کہ اگر وہ اتفاقاً کبھی کسی شخص سے ملکہ محبت کرنے لگی تو رو رو کر دریا بہا دے گی"

پہلی۔۔۔ "اف، یہ بالوں کے چھلے تو دیکھو کس طرح پیشانی اور شانہ و دوش پر آسودگی کے ساتھ پڑے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں مردانہ روحیں پنہاں ہیں جو ملکہ کے جسم کے مختلف حصوں کو چوم چوم کر مست ہو رہی ہیں۔ آہ، یہ قلب کی حرکت سے سینہ کے نشیب و فراز میں مسلسل جنبش، ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی کو چھونے کی دعوت دی جا رہی ہے!

دوسری۔۔۔ (پہلی کی طرف حیرت سے دیکھ کر) "تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ ہمارے دل میں تو یہ خیال کبھی نہیں آتے، نہ ایسے جملے ہماری زبان سے ادا ہو سکتے ہیں۔ تمہارے جذبات تو بالکل مردوں کے سے ہیں۔ اول اول بار جب مجھ سے گفتگوئے محبت کی گئی تھی تو اس میں بھی یہی گرمی تھی، اسی قسم کی شیفتگی تھی تمہارا مکان کہاں ہے۔ وزیر اعظم نے تمہاری سفارش کرکے آج تمہیں ملکہ کی کنیزوں میں تو شامل کر دیا، لیکن یہ نہ بتایا کہ اس قسم کی باتیں اگر کبھی ملکہ نے سن لیں تو آفت برپا ہو جائے گی"

تیسری۔۔۔ "اس میں شک نہیں کہ تم ہم سب میں بہت تندرست و توانا ہو، لیکن آخر کار ہو تو عورت ہی۔ کیا تمہارے شہر میں عورتوں کو مرد بننے کی تعلیم دی جاتی ہے؟"

پہلی۔۔۔ "معاف کرنا میں ابھی یہاں کی تہذیب سے پوری طرح واقف نہیں۔ ہمارے ملک میں عورتیں مردوں ہی کے ساتھ تعلیم پاتی ہیں اس لئے وہ مردوں ہی کی طرح سوچتی ہیں، مردوں ہی کی طرح بولتی ہیں اور مردوں کی طرح اپنی زندگی بسر کرتی ہیں"

دوسری۔۔۔ "اور مرد؟"

تیسری۔۔۔ "وہ یقیناً عورتوں کی طرح ہو جاتے ہوں گے"

پہلی ——(ہنسکر) "بالکل تو نہیں، لیکن ایک حد تک یہ کیفیت ضرور پیدا ہو چلی ہے اور——"

دوسری ——" خاموش۔ وہ دیکھو ملکہ نے کروٹ لی۔ یہ دیکھ کر تینوں آہستہ آہستہ آگے بڑھیں اور پائنتی میں بیٹھکر دوسری اور تیسری کنیز نے ملکہ کے تلوے سہلانے شروع کئے، لیکن پہلی بدستور اسی طرح ملکہ کی صورت کو تکتی رہی

——ملکہ نے انگڑائی لیتے ہوئے آنکھیں کھول دیں اور سامنے پہلی کنیز کو دیکھ کر پوچھا:" تو وہی ہے جسے کل رات میں نے دیکھا تھا۔ وزیر نے تیری بڑی تعریف کی ہے اور میری حفاظت کے لئے تجھے میرے پاس رہنے کا حکم دیا ہے تجھے معلوم ہے میری حفاظت کے کیا معنی ہیں؟"

کنیز ——(سر جھکاکر) ملکۂ عالم، ہمارے ملک میں حفاظت کے معنی صرف ایک ہی ہوا کرتے ہیں"

ملکہ ——" وہ کیا"

کنیز ——" آقا کے لئے اپنی جان دے دینا"

ملکہ ——(خوش ہوکر) بالکل ٹھیک، لیکن صرف تمھارا جان دیدینا تو میری حفاظت نہیں۔ یوں کہو مقابلہ کرنا اور مرجانا"

کنیز ——" بجا ارشاد ہوا ملکۂ عالم۔ یہی میرا مقصود تھا"

ملکہ ——(ہنستے ہوئے) اچھا فرض کرو اس وقت میرے سامنے ایک مرد آجائے اور مجھ سے اظہار محبت کرے تو تم کیا کروگی"

کنیز ——" ملکۂ عالم میں ہٹ جاؤں گی تاکہ وہ آپ سے تنہائی میں آزادی سے باتیں کرسکے"

ملکہ یہ سن کر ہنسی سے بیتاب ہوگئی اور دیر تک ہنستے رہنے کے بعد بولی کہ——" ای بیوقوف کیا تجھے نہیں معلوم کہ مرد کی جنس سے مجھے نفرت ہے اور کسی مرد کا مجھ سے اظہار محبت کرنا اتنا بڑا گناہ ہے کہ قتل کے بعد بھی میں اپنے جذبۂ انتقام کو آسودہ نہیں دیکھتی"

کنیز ——" ملکۂ عالم، مجھے اس کا علم نہ تھا۔ دست بستہ معافی چاہتی ہوں۔ اب مجھے معلوم ہوگیا کہ میرے صحیح فرایض کیا ہیں اور اگر خدانخواستہ کبھی ایسا اتفاق ہوا کہ بدنصیب و نامراد مرد نے ملکہ سے اظہار محبت کیا، تو پھر اس کا سینہ ہوگا اور یہ میرا تیغچہ (یہ کہکر اس نے چمکتا ہوا تیغچہ اپنی کمر سے نکالا اور سر جھکاکر ملکہ کے سامنے کھڑی ہوگئی)۔

ملکہ ——" کیا تو فنون سپہگری سے واقف ہے"

کنیز ——" اب ہمارے ملک میں عورت مرد سے زیادہ فنون سپہ گری کی ماہر ہوتی ہے"

ملکہ ——" کیوں"

کنیز "اس لئے کہ اب اس کی آنکھوں میں وہ افسوں باقی نہیں رہا جو مردوں سے تاب مقاومت چھین لیتا ہے، اور اسی منظر سے گھبرا کر میں یہاں آئی تھی۔ لیکن میں بھی کیسی بدنصیب ہوں کہ یہاں ایک ملکہ کو بھی اس لحاظ سے بالکل بے دست و پا پاتی ہوں اور یہاں بھی مجھے مردوں کے خلاف وہی حربہ استعمال کرنا ضروری ہو گیا ہے جسے اپنی نسائیت ایسی عزیز چیز کھو کر محض حالات سے مجبور ہو کر میں نے اختیار کیا تھا۔

ہمارے یہاں اب سے قبل یہ دستور تھا کہ کوئی مرد کسی عورت سے یوں آزادانہ نہیں مل سکتا تھا اور ان دونوں جنسوں کے درمیان ایک حد فاصل قائم تھی جس کا نام "نسوانی غیرت و حیا" تھا۔ اس وقت عورت عبارت تھی ایک شاہانہ استغنا سے، ایک ملکوتی پاکیزگی سے، ایسے معصوم اچھوتے پن سے جو قدیم عہد روما و یونان کی حسین دیویوں میں پایا جاتا تھا، مرد کا کام محنت کرنا تھا اور عورت کا اس محنت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ لینا۔۔۔ عورت حکمراں تھی اور مرد محکوم، عورت غالب تھی اور مرد مغلوب، لیکن یہ حکومت جسم پر نہیں، دلوں پر قائم تھی اور یہ غلبہ اعضائے ظاہری سے نہیں بلکہ روح سے متعلق تھا۔

جب تک عورت نے خود اپنی نسائیت، اپنی نزاکت اور اپنی لطافت و پاکیزگی کا احترام قائم رکھا، وہ ایک ملکہ، ایک دیوی کی طرح زندگی بسر کرتی رہی، لیکن جب اس کے نازک ہاتھوں نے پھاوڑا لے کر خود زمین کھودنا شروع کی جب اس نے مرد کے دوش بدوش مادی دنیا میں درندہ قوتوں کا مقابلہ خود شروع کر دیا، تو مرد اپنے اندر کچھ تھکن سی محسوس کرنے لگا، کیونکہ شام کے وقت عورت کا وہ تبسم جو مرد کی دن بھر کی محنت کا صلہ ہوا کرتا تھا مفقود ہونے لگا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ عورت کی طرف سے مرد بھی کھنچنے لگا اور جب جب عورت مرد کی طرح دنیا میں بالکل مزدور ہو کر رہ گئی تو وہی اطوار و خصائل اس کو بھی اختیار کرنا پڑے جو محنت کی دنیا میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کے لئے مرد کو اختیار کرنے پڑتے ہیں اور آخر کار اس کشمکش نے سچی محبت و الفت کو بالکل محو کر دیا اور عورت مرد سے جدا ہو کر بالکل اسی طرح آزاد ہو گئی جیسے زمین کا ایک حصہ اس سے جدا ہو کر اب چاند کہلاتا ہے۔ لیکن چاند تو خیر جدا ہونے کے بعد بھی زمین کا طواف کر رہا ہے مگر عورت کی حالت تو اس سیارہ کی سی ہے جو فضا کی وسعت میں گم ہو رہا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ پھر کبھی نظر آئے گا یا نہیں۔۔۔

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہاں بھی مرد عورت میں یہی جنگ قائم ہے تو میں کیوں آتی اے ملکۂ عالم، سچ بتائیے کیا واقعی یہاں کی عورت بھی محبت کرنا بھول گئی ہے اور کیا یہاں کے مرد کا بھی مستقبل ریگستان کی طرح سنسان ہے"

ملکۂ ناہید جس کے سامنے اس وقت تک کسی کو اس موضوع پر گفتگو کرنے کی جرأت نہ ہوئی تھی، حیرت سے کنیز کا منہ دیکھ رہی تھی اور اس کا جی چاہتا تھا کہ کچھ دیر اور وہ ایسی ہی باتیں کرتی رہے ——— ملکہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور باقی دونوں کنیزوں کو رخصت کرنے کے بعد جب تنہائی ہو گئی، تو اس نے اس کو اپنے پاس بلایا اور بولی کہ :—

"اے حسین نووارد، ادھر آ، مجھ سے قریب ہو کر باتیں کر، تو بہت ذہین ہے، نہایت جری ہے اور اسی کے ساتھ میں دیکھتی ہوں کہ تیرے اندر کچھ ایسی عقل و فراست ہے جو ہمارے ملک میں مردوں ہی کے لئے مخصوص سمجھی جاتی ہے۔ اگر ہمارے ملک میں تجھ ایسی عورتیں پیدا ہونے لگیں، تو میں چن چن کر ایک ایک مرد کو اپنی حکومت سے نکال دوں اور تمام نظم و نسق عورتوں ہی کے سپرد کر دوں۔ ہاں، ادھر آ، میں زیادہ نزدیک سے تیرا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں، میرے پاس بیٹھ کر گفتگو کر، تیری آواز میں ہر چند وہ نرمی اور لوچ نہیں ہے جو عورت کی آواز میں ہونا چاہئے ہے لیکن اس کا وزن بھی مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے ——— گو میں تجھ سے موسیقی کی خدمت نہ لے سکوں گی لیکن تیری آواز کے ذریعہ سے میں ایک شاہانہ و مردانہ حکم تو لوگوں کو دے سکوں گی ——— اور قریب آ۔ میری خلوت میں شاہانہ آداب کی ضرورت نہیں ——— یہاں ہم اور تم دونوں عورت ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں زیادہ بے بس ہوں اور تو بڑی حد تک آزاد ——— پھر بتا تو میری کیا مدد کر سکتی ہے ——— سارے ملک میں میرے حسن و جمال کی شہرت نے مردوں کو دیوانہ سا بنا رکھا ہے اور چونکہ یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ آئین حکومت کے لحاظ سے مجھے کسی نہ کسی مرد کو اپنا شریک زندگی بنانا ضروری ہے، اس لئے طبقۂ امرا کا ہر نوجوان اس آرزو کو اپنے دل میں لئے ہوئے ہے ——— اور روزانہ مجلس وزرا مجھے مجبور کرتی ہے کہ جلد سے جلد کوئی انتخاب کر لوں ورنہ ملک میں بغاوت ہو جانے کا اندیشہ ہے ——— پھر چونکہ اس سلسلہ میں بعض مردوں کو

میرے حکم سے سزائے قتل بھی مل چکی ہے ؛ اس لئے میرے خلاف برہمی بڑھتی جارہی ہے اور حیران ہوں کہ کیونکر اپنے دل کو اس طرف مائل کروں اور کس طرح اس ذلت کو برداشت کرسکوں ——
دنیا مجھے حسین سمجھتی ہے ؛ حالانکہ میں اپنے اندر کوئی غیر معمولی بات نہیں پاتی - آئینہ دیکھتی ہوں اور گھنٹوں حیران رہتی ہوں کہ مجھ میں آخر وہ کون سی خصوصیت ہے جس کے لئے دنیا پاگل ہو رہی ہے ——
یقیناً یہ دیوانگی میرے لئے نہیں ہے بلکہ صرف امارت وسلطنت کے لئے ہے ، تخت وتاج کے لئے ہے ، مرد کی خود غرضی تاریخ کا نیا واقعہ نہیں اور اس نے جو جو مظالم عورت پر کئے ہیں وہ ایسے نہیں کہ عورت انھیں آسانی سے فراموش کردے —— پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان کا انتقام نہ لیا جائے اور وہ انتقام میرے اور میری ہی سلطنت کے ذریعہ سے نہ ہو —— آہ ، مجھے جسقدر اپنی کمزوریوں کا احساس ہوتا جاتا ہے ، میری تکلیف بڑھتی جاتی ہے اور میں دیکھتی ہوں کہ ایک دن وہ آنے والا ہے جب مجھے ملک کے اس بڑھتے ہوئے ہیجان کے سامنے اعتراف شکست کرنا پڑے گا ، خواہ وہ اعتراف کسی ظالم مرد کو اپنے اوپر مسلط کردینے کی صورت میں ہو ، یا تخت وتاج چھوڑ کر ملک سے باہر نکل جانے کی شکل میں ——— "

کنیز ——— " ملکۂ عالم ، خدا نہ کرے وہ وقت آئے جب صورت حال اتنی نازک ہو - مجھے سوچنے کا موقعہ دیا جائے ، ممکن ہے میں کوئی صورت بہتر پیدا کرسکوں "

ملکہ امید کی جھلک پاکر بے اختیارانہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کنیز کا ہاتھ پکڑ کر اس کے چہرہ کو غور سے دیکھنے کے بعد دفعۃً ہٹ گئی اور بولی :——

" یہ تیری آنکھوں میں وہ کون سی چیز ہے جو مجھے مسحور کرنا چاہتی ہے - دنیا ان آنکھوں کے لئے کیوں نہیں تڑپتی —— کتنی خوبصورت آنکھیں ہیں ، پتلی کتنی سیاہ ہے ، پلکیں کیسی لانبی اور لوکدار ہیں - ان آنکھوں سے بجلی کی رو باہر نکلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے - کیا تو نے شراب

پی ہے اور اتنی کہ آنکھوں سے اُبلی پڑ رہی ہے۔ میں نے بھی چند
دن سے اس کا استعمال شروع کیا ہے، لیکن نہ میرے ہاتھ اتنے
گرم ہوتے ہیں، نہ آنکھوں میں یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اپنے ہاتھ
میں میری کلائی لے کر دیکھ کتنا فرق ہے (گھبرا کر) یہ تو کانپ کیوں
رہی ہے، یہ تیرے جسم پر لرزہ کیوں طاری ہے (ہنستے ہوئے)
اچھا میرے ساتھ چل، آج حمام میں تیرے ہی ہاتھ سے غسل
کروں گی۔"

یہ سنکر کنیز دور ہٹ گئی اور بولی کہ

"ملکۂ عالم مجھ سے جو خدمت جی میں آئے لیجئے لیکن حمام میں نہ لیجائیے
کیونکہ میں آداب شاہی سے بالکل ناواقف ہوں، اور یوں بھی میرے
ہاتھ زیادہ سخت و کرخت ہیں جن سے ملکہ کے پھول ایسے جسم کو
ضرر پہونچ جانے کا اندیشہ ہے"

ملکہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ

"مجھے آج جسم میں خراش ہی پیدا کرنا ہے، آج جی یہی چاہتا ہے،
کیا تو میرا حکم نہ مانے گی۔"

یہ کہکر ملکہ حمام کی طرف جانے ہی والی تھی کہ نسرین گھبرائی ہوئی آئی اور بولی کہ ایک نہایت ہی ضروری امر میں ملکہ کا مشورہ حاصل کرنا ہے ——— ملکہ جو آج کل معمولی سی بات میں بھی گھبرا جاتی تھی۔ نسرین کی طرف مخاطب ہو گئی اور کنیز رخصت کر دی گئی، (باقی آیندہ)

نیاز

وقت وزمان کی حقیقت

س :- قریطو! اب کیا وقت ہے؟
ق :- سات بجکے ۲۳ منٹ آئے ہیں؟
س :- اوہو! میرے اندازہ سے کچھ زیادہ دیر ہوگئی۔ لیکن! یہ تو بتاؤ کہ "سات بجکے تئیس منٹ" کے کیا معنی ہیں؟
ق :- اس کے معنی یہ ہیں کہ دوپہر کے بعد سات گھنٹے اور ۲۳ منٹ گذر چکے ہیں
س :- معاف کیجئے، میں ابھی نہیں سمجھا مگر مہربانی کرکے یہ بتا دیجئے کہ گھنٹے اور منٹ کیا چیز ہیں؟
ق :- جناب یہ تقسیم اوقات کے آحاد ہیں ایک سکنڈ وقت کی سب سے چھوٹی اکائی ہے اور ساٹھ سکنڈ مل کر ایک منٹ اور ساٹھ منٹ ملکر ایک گھنٹہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ تو ایسی بات ہے جسے آپ اور ہم دونوں جانتے ہیں۔
س :- بالکل درست ہے۔ لیکن جس چیز کا نام آپ نے "وقت" رکھا ہے وہ کیا چیز ہے۔
ق :- یہ بتانا تو بہت دشوار ہے کہ "وقت" کیا چیز ہے۔ لیکن اس امر کا احساس کہ کچھ واقعات زمانۂ ماضی میں گزر چکے ہیں، کچھ واقعات "اب" رونما ہو رہے ہیں۔ اور کچھ واقعات ایسے ہیں جن کی نسبت ہم کو زمانہ مستقبل میں پیش آنے کی توقع ہے، وقت کی تعیین کرنے کے لئے کافی ہے۔
س :- تو کیا واقعی "وقت" کچھ اصلیت رکھتا ہے۔ اس کی کوئی حقیقت ہے۔
ق :- یقیناً! اس سے زیادہ کھلی ہوئی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ وقت ایسی ہی حقیقت رکھتا ہے جیسی ہماری اور آپ کی ہستی۔ اگر وقت معدوم ہو جائے تو اس کے ساتھ ہماری ہستیاں بھی معدوم ہو جائیں۔ ہم کو بہت سے واقعات ایسے معلوم ہیں جو زمانۂ ماضی میں گذرے تھے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ "اب" کیا ہو رہا ہے۔ اور ہم آیندہ یا مستقبل کی توقع میں جیتے ہیں
س :- مجھے یہ بات سن کر بہت تعجب ہو رہا ہے۔ سنئے! ہم وقت کی نسبت کہا کرتے ہیں کہ وہ کبھی زمانۂ ماضی تھا، آیندہ زمانہ مستقبل ہوگا اور اب زمانۂ حال ہے، ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ مستقبل زمانۂ حال کے بعد آتا ہے، اور ماضی زمانہ حال سے پیشتر گزر جاتا ہے، حالانکہ اگر ہم وقت کی نسبت یہ خیال کریں کہ وہ ہمارے ساتھ ساتھ گذرتا ہے اور اپنے

ساتھ ہمارے تجربات بھی لاتار رہتاہے، تو اس صورت میں مستقبل کو سب سے آگے ہونا چاہئے۔ لیکن اگر ہم اپنی نسبت یہ سمجھیں کہ ہم خود وقت سے گذر رہے ہیں تو ہمیں سب سے اوّل زمانۂ ماضی سے گذرنا چاہئے۔ اس کے بعد مستقبل سے۔ مگر نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ماضی اس وقت تک ہرگز ماضی نہیں ہوسکتا جب تک ہم ان واقعات کو نہ دیکھ لیں جن کا تعلق اس زمانہ سے ہے۔ اور یہ واقعات ہمیشہ زمانۂ حال میں گذرتے ہیں۔ پس یہ امر یقینی ہے کہ ہم مستقبل سے کبھی نہیں گذریں گے۔ سہولت استدلال کے لئے یہ تصور کرنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وقت ہمارے ساتھ ساتھ گذرتا ہے۔ اس صورت میں مستقبل سب سے آگے ہوگا اسی طرح جو واقعہ گزرنے والا ہے وہ ہم سے زیادہ قریب ہوتا جائے گا۔ جب وہ واقعہ رونما ہو رہا ہوگا تو وہ حال ہوگا اور جب وہ واقعہ ہوچکے گا تو ماضی۔ اب آپ بتائیے کہ حال کی نسبت آپ کیا سمجھتے ہیں؟

ق:۔ یہی کہ مثلاً ہماری گفتگو زمانۂ حال سے تعلق رکھتی ہے۔ آپ اور دونوں "اب" باتیں کر رہے ہیں۔ یعنی جسے آپ "اب" کہتے ہیں یہی ہے حال۔

س:۔ دیکھئے آپ کی زبان نے سب سے آخری لفظ "حال" ادا کیا ہے۔ تو کیا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ واقعہ اب ماضی ہوگیا ہے؟

ق:۔ یقیناً ماضی بنگیا ہے۔ اور بالکل اسی طرح وہ آخری لفظ جو میری زبان سے نکلتا جاتا ہے ہر لمحہ ماضی بنتا جاتا ہے۔ لیکن میں "حال" کا تصور زیادہ عام اور علمی معنی میں کر رہا ہوں۔

س:۔ اگر ہم علمی گفتگو کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے الفاظ بالکل "نپے تلے" ہونا چاہئیں۔ اگر آپ کسی چیز کے تصورِ عمومی پر بھروسہ کریں گے تو بتائیے کہ آپ حد فاصل کا خط کہاں کھینچیں گے؟

ق:۔ یہاں بیشک ایک مشکل پیش آتی ہے۔ آپ ہی بتائیں کہ خط کہاں کھینچا جائے گا۔

س:۔ جب ہم اپنی قوت شعور سے کام لے کر یہ تعین کرنے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں کہ مستقبل کہاں ختم ہوتا ہے اور ماضی کہاں سے شروع ہوتا ہے تو ہم کامیاب نہیں ہوتے اور اس بارہ میں کوئی خاص رائے قائم نہیں کرسکتے کہ "حال" کا زمانہ کب تک رہتا ہے اگر اس بات کا زیادہ گہری نظر سے تجزیہ کیا جائے تو ہمیں یہ صرف ایک خط فاصل معلوم ہوتا ہے جس میں "عرض" کچھ نہیں۔ اور عین جس وقت ہم پر کوئی واقعہ گذرتا ہے اس کے لمحہ بھر بعد وہ واقعہ ماضی سے متعلق ہوجاتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟

ق:۔ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہاں آپ اپنی گفتگو جاری رکھئے۔

س:۔ قریطو! کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مستقبل جو اُن واقعات سے معمور ہے جن کا ہنوز ظہور نہیں ہوا، درحقیقت کوئی وجود رکھتا ہے؟ یا ایک واقعہ جو ایک ہزار سال پیشتر گذر چکا ہے اب بھی بحیثیت واقعہ کوئی حقیقی وجود رکھتا ہے؟

ق :- نہیں! میرے خیال میں تو نہیں رکھتا۔

س :- اگر مستقبل اور ماضی واقعی یقینی حقیقتیں ہیں پھر "حال" کا وجود کہیں نہیں رہا۔ لیکن بغیر حال کے ہماری ہستی ہی غائب ہو جاتی ہے کیونکہ ہم نہ ماضی میں رہ سکتے ہیں نہ مستقبل میں اور بقول آپ کے حال ضرور ہونا چاہئے۔ لہٰذا تمام وقت "حال ہی حال" ہے کہئے آپ کا کیا خیال ہے؟

ق :- میرا تو دماغ چکرا گیا۔ اور میں از روئے منطق آپ کی بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ لیکن مستقبل، حال اور ماضی ضرور ہیں

س :- اچھا تو اب آپ اس معاملہ کو دوسرے پیرایہ میں لیجئے۔ یعنی واقعات کا مقابلہ کیجئے۔ آپ وقت کی نسبت کیا جانتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ہم کو شعوری طور پر اس کا علم حاصل ہے۔ کیا اس سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ دماغی یا ذہنی طور پر اس کے وجود کا احساس کرتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو سمجھ لیجئے کہ ہمارے قوائے احساس قطعی ناقابل اعتبار ہیں۔ چنانچہ میں ثابت کئے دیتا ہوں۔ فرض کیجئے کہ اسی گھنٹہ میں ایک شخص مسمی زید کسی ایسے شغل میں مصروف ہے جس میں اس کو بیحد لطف حاصل ہو رہا ہے۔ مثلاً شطرنج۔ اور اسی وقت دوسرا شخص بکر نہایت اضطراب کے ساتھ کسی کام کے ہونے کا منتظر ہے جس میں دیر ہوتی جاتی ہے۔ اب ان دونوں کے پاس اپنے اپنے قوائے احساس کے سوا اور کوئی طریقہ وقت شماری کا نہیں ہے تو بتائیے کہ زید کے نزدیک وہ — گھنٹہ طویل ہوگا یا قلیل؟

ق :- یقیناً قلیل ہوگا

س :- اور بکر کے نزدیک کیسا ہوگا؟

ق :- طویل!

س :- ایک ہی گھنٹہ ایک شخص کے لئے قلیل ہوگا اور دوسرے کے لئے طویل۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟

ق :- بیشک وقت تو ایک ہی ہے۔ لیکن جو فرق آپ نے بیان کیا ہے وہ ان دونوں شخصوں کے حسیات و محسوسات کا فرق ہے جو ذہن کی مختلف حالتوں سے اثر پذیر ہیں۔ اب میں تسلیم کئے لیتا ہوں کہ وقت کے متعلق ہمارے قوائے احساس ہمیشہ قابل اعتبار نہیں ہوتے۔

س :- اچھا تو اس صورت میں وقت یا تو ایسی کوئی چیز نہیں جو ہستی انسانی سے علیحدہ کوئی وجود حقیقی رکھتا ہو۔ یا ہر شخص کے ساتھ وقت کی حیثیت جداگانہ ہوتی ہے اور اس صورت میں وقت لاشئے محض قرار پاتا ہے۔

ق :- میں اس وقت آپ کے دلائل کو نہ تسلیم کرتا ہوں نہ ان کی تردید کر سکتا ہوں۔ لیکن آپ سلسلۂ گفتگو جاری

رکھیں کیونکہ آپ کا طریقہ تجزیہ بہت دلچسپ ہے۔

س :- "اسی گھنٹہ" سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ گھنٹہ کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا تھا کہ وہ وقت کی ایک "اکائی" ہے بس جبکہ ہمارے قوائے احساس اسقدر ناقابل اعتبار ہیں تو پھر ہم وقت کا اندازہ یا پیمایش کس طرح کر سکتے ہیں۔ آپ اس کا جواب غالباً یہ دیں گے کہ گھنٹہ اس حصۂ وقت کو کہتے ہیں کہ گھڑی کی منٹ والی سوئی ڈائل کی ایک گردش پوری کرے۔ لیکن اگر میں اپنے ہاتھ کی انگلی سے منٹ کی سوئی کو ڈائل کا ایک پورا چکر دے دوں تو کیا یہ وقت ایک گھنٹہ ہو جائے گا؟

ق :- یقیناً نہیں! ایسا دعویٰ کوئی شخص نہیں کر سکتا۔

س :- گویا منٹ کی سوئی کی رفتار بالکل یکساں اور اس معیار کے مطابق ہونا چاہئے جس کی پابندی تمام گھڑیاں کرتی ہیں۔ لہذا جس چیز کو ہم وقت کہتے ہیں وہ اس طریقۂ استدلال کے بموجب محض حوادث حرکاتی میں داخل ہونے والی ایک چیز ہے یا کم از کم اس کا تعلق حرکت سے ہے۔ اور ہم اس کی پیمایش حرکت اور وسعت کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ یعنی ایک مادی چیز جسے منٹ کی سوئی کہتے ہیں وہ ایک مقررہ اور یکساں رفتار کے ساتھ ایک مقررہ فاصلہ طے کرتی ہے تو ہمیں وقت معلوم ہوتا ہے۔ وقت کی پیمایش یا محسوس کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہم کو معلوم ہے۔ لیکن جس طرح حرکت و وسعت زمانی وقت نہیں ہے اسی طرح وقت بھی حرکت و وسعت نہیں۔ حرکت اور وسعت دونوں قطعی مختلف چیزیں ہیں۔ اس لئے وقت ان دونوں متضاد چیزوں کا مرکب بھی نہیں ہو سکتا۔ اب اگر ہم یہ کہیں کہ وقت (جیسا کہ ہم اس کی نسبت عموماً خیال کرتے ہیں) تجربات و واقعات انسانی سے علیحدہ کوئی وجود نہیں رکھتا کیونکہ حرکت اور وسعت ایسی چیزیں نہیں جو دونوں مل کر ایک تیسری مستقل چیز پیدا کر سکیں تو گویا ہم اس نتیجہ پر پہونچ گئے جو ہم نے پہلے اخذ کیا تھا یعنی یہ کہ وقت کوئی چیز نہیں ہے اور جو کچھ ہے وہ "حال ہی حال" ہے۔

ق :- آپ کے جو جی میں آئے کہئے میں تو اپنی اسی رائے پر قائم ہوں جو پہلے تھی۔

س :- تحقیق و تدقیق کے لئے خواہ آپ کتنے ہی مختلف طریقے اختیار کر لیں لیکن کیا آپ یہ تسلیم نہ کریں گے کہ آخر میں وہی نتیجہ نکلتا ہے؟

ق :- ہاں منطقی لحاظ سے تو یہی بات ہے۔

س :- آپ کو جو دقت پیش آ رہی ہے وہ محض اس قدر ہے کہ ہمارے دلوں میں یہ خیال نہایت پختہ ہو گیا ہے کہ وقت ایک چیز ہے جو مستقل وجود رکھتی ہے۔ اور اس کے تین حصے ماضی حال اور استقبال ایسے ہیں جو ایک دوسرے سے جدا کئے جا سکتے ہیں۔ اور اسی خیال کی وجہ سے ہم ان نتائج کو منظور نہیں کرتے

جن تک ہم اذروئے منطق پہونچتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ان منطقی نتائج کو منظور کرلیں تو اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ حالات میں کوئی تغیر ہو جائے گا

ق :- قطع کلام معاف! اگر یہ نتیجہ جو آپ نے اخذ کیا ہے صحیح ہے اور جیسا کہ آپ کا منشاء ہے اس نتیجہ سے وقت لاشئے محض رہ جاتا ہے، تو لازم ہوگا کہ انسان کے اندر ایک سرچشمۂ شباب ابدی قائم ہو جائے۔ کیونکہ اگر وقت کوئی چیز نہیں اور جو کچھ ہے وہ "حال ہی حال" ہے تو پھر کوئی شخص بوڑھا نہیں ہو سکتا ہر شخص ہمیشہ جوان رہیگا۔ پھر اس بڑھاپے کی آپ کیا علت بیان کریں گے۔ یا آپ انسان کی اس حالت سے بھی انکار کر بیٹھیں گے جسے بڑھاپا کہتے ہیں؟

س :- میں اس سے ہرگز انکار نہیں کرتا۔ اگر آپ ذرا تامل کے ساتھ اس بات پر غور کریں کہ بڑھاپا کیا چیز ہے تو میں آپ کو بہت جلد بڑھاپے کی وجہ بتادوں گا اور وہ بھی ایسے طریقہ سے جو میرے استدلال کے عین مطابق ہو۔ سنو! بڑھاپا نام ہے صرف تغیر کا جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی شخص کے چہرے میں جھریاں پڑ گئی ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ "بڑھاپا" آگیا۔ فرض کرو کہ ایک بست سالہ نوجوان کے بال کسی غیر فطری سبب سے سفید ہوگئے ہیں، اس کے چہرہ پر جھریاں پڑ گئی ہیں، چلتے ہوئے اس کے قدم رک رک کر پڑتے ہیں۔ تو محض صورت دیکھ کر ہم "بڑھاپے" کا فتویٰ دیدیں گے۔ اگر کسی کپڑے کا رنگ اڑ جائے اور وہ گھس جائے تو ہم کہتے ہیں کہ "پرانا" ہوگیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی غور کیجئے کہ ایک جوہری کی دکان میں کسی انگشتری کے اندر حال ہی میں ایک بیش قیمت ہیرا جڑا گیا ہے۔ خواہ وہ ہیرا کسی زمانہ میں بلقیس ملکہ سبا نے پہنا ہو تو کیا آپ یہ کہہ دیں گے کہ یہ انگشتری "پرانی" ہے۔ کیا آج تک کسی نے کسی ہیرے کو "پرانا" کہا ہے؟ نہیں۔ کیونکہ ہیرے میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا اس لئے وہ "نیا" ہوگا۔

ق :- مَیں نے اس بارہ میں اس طرح کبھی فکر نہیں کی۔ پھر بھی وہ ہیرا خواہ کوئی ہیرا ہو "پرانا" ہی کہلائیگا

س :- اچھا اب میں اس مسئلہ کو زیادہ واضح کرنے کے لئے ایک دوسرا سلسلۂ خیال قائم کرتا ہوں۔ ہمارے استاد نے حروف ابجد کی ترتیب اسی طرح سکھلائی ہے کہ ہم الف سے شروع کرکے ترتیب وار یا تک سلسلہ قائم کرتے ہیں۔ جب ہم حروف تہجی اپنی زبان سے بولیں گے اور یا تک پہونچیں گے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم الف کہہ آئے ہیں۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ دونوں میں کون "پرانا" ہوا یعنی الف یا یا۔ ظاہر ہے کہ ہم نے یا سے پہلے الف کہا تھا لیکن اس وجہ سے الف بمقابلہ یا کے پرانا نہیں ہوگیا اب اسی مثال کا اطلاق آپ اور جگہ بھی کیجئے۔ یعنی حالات طبعی کے ماتحت ایک چکنا اور صاف چہرہ، سیاہ بال اور لچکدار رفتار عموماً ایک جھریوں دار چہرہ، سے پیشتر اسی ایک شخص کے اندر موجود ہوتے ہیں

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کس وجہ سے اور کیوں مگر ہوتا ہمیشہ یوں ہی ہے۔ جب ہم بزاز کی دکان سے کپڑا خریدتے ہیں تو ہم کپڑے کی چمکدار اور خوشنما حالت پہلے اور اس کی خستہ اور بوسیدہ حالت بعد میں ہوتی ہے۔ لیکن جس کاریگر نے وہ کپڑا تیار کیا ہے اس نے اس کپڑے کی حالت رنگے جانے سے بھی قبل دیکھی تھی۔ اس وقت کپڑے کی مکروہ اور بدنما حالت پہلے تھی اور اس کی خوشنما اور رنگین حالت بعد میں ہوئی تھی۔ اس طرح گویا کپڑے کی یہ موخرالذکر حالت "پرانی" ہوگئی۔ اور وہ مکروہ اور بوسیدہ حالت پہلی ہوئی۔ کیا یہ بات قانونِ قدرت کے مطابق ہوگی کہ ایک شخص جھریوں دار چہرہ۔ اور سفید بال لے کر پیدا ہو اور جب اس کی دنیوی زندگی کا اختتام ہو تو اس کا چہرہ صاف روشن اور اس کے بال سیاہ ہو جائیں۔ اگر یہ حالت ہو تو جن علامات کو ہم جوانی کی علامات سمجھتے ہیں وہ بڑھاپے کی اور بڑھاپے کی علامات شباب کی نشانیاں سمجھی جائیں گی۔ لہٰذا اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وقت یا عمر سلسلۂ تغیرات کا ایک منظر ہے۔

اس مسئلہ پر زبان کے ذریعہ سے بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں "آج سے قبل" "زمانہ ہوا" "حال ہی میں" وغیرہ۔ ان سب الفاظ سے فاصلہ یا وسعت کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر جب ہم کہتے ہیں کہ "وقت بہت جلدی گذرا"۔ "چشم زدن"۔ "وقت اُڑا چلا جا رہا ہے"۔ "وقت کٹتا ہی نہیں" وغیرہ تو ان محاورات سے "حرکت" کا اظہار ہوتا ہے۔ کیا آپ وقت کی نسبت کوئی اور حقیقت بیان کر سکتے ہیں۔ جو حرکت و وسعت سے متعلق نہ ہو؟

ق :۔ کیوں نہیں! ہم روز کہتے ہیں کہ "بڑا کٹھن وقت ہے"! یا "وقت اچھا گذرا" یا "وہ اور وقت تھے" ان جملہ محاورات سے وقت کی حالت کا اظہار ہوتا ہے۔ پیمائش نہیں ہوتی۔ لیکن یہ محض استعارے اور تشبیہات ہیں۔

س :۔ اچھا تو اب اس مسئلہ پر علمی طریقہ سے غور فرمائیے۔ فرض کیجئے کہ آپ شکاگو سے نیویارک تک براہ ڈٹرائٹ سفر کر رہے ہیں۔ اگر آپ کو ڈٹرائٹ میں کوئی دیر نہ ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ونڈسر کی گھڑی کے حساب سے آپ ایک گھنٹہ اور کچھ منٹ میں ونڈسر پہونچے، حالانکہ ریل پوری رفتار سے چل رہی تھی اور فاصلہ صرف چند میل کا ہے۔ اب اپنی گھڑی کو ونڈسر کی گھڑی کے مقابلہ میں رکھ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک گھنٹہ سست ہے اور وہ ہمیشہ اتنی ہی سست رہے گی جب تک آپ ڈٹرائٹ کے مشرق میں رہیں گے یعنی یہاں آپ بہ اندازۂ ایک گھنٹہ زیادہ معمور رہیں گے۔ اور آپ کی سالگرہ ہمیشہ ایک گھنٹہ پیشتر ہوگی۔ اس تغیر کا سبب یہ ہے کہ آپ کا جسم اس رفتار سے زیادہ تیز حرکت کر رہا ہے جس رفتار سے زمین اپنے محور میں گردش کرتی ہے۔ اور اس لئے وقت پورا کرنے کے لئے آپ کو ہر پندرہ درجہ طول البلد کے بعد اپنی گھڑی ایک گھنٹہ بڑھانا پڑے گی

اگر آپ بحر الکاہل میں کسی جہاز پر ہوتے اور آپ کا سفر خط استوا کے قریب جانب مشرق ہوتا۔ اور آپ جزائر فیجی کی کسی بندرگاہ میں پہونچتے اور پھر وہاں سے شنبہ کے روز بارہ بجے بذریعہ طیارہ جزائر سامو آکو جاتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ وہاں کی جنتری کی رو سے وہ دن اتوار ہے اور وقت کے لحاظ سے شام کے تین بجے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر زمین کے گرد مغرب سے مشرق کی طرف سفر کیا جائے تو بجائے گھنٹہ کے پورا ایک دن ضائع ہوتا ہے۔ کیونکہ مسافر زمین کے مقابلہ میں ایک گردش زیادہ کرلیتا ہے۔

ق :- یہاں تک تو آپ نے صحیح فرمایا اور ان واقعات سے آپ کے استدلال کی تائید ہوتی ہے لیکن اصلی بات یعنی وقت کا مسئلہ بدستور باقی رہا۔ آپ یہ بیان فرمائیں کہ ایک ہفتہ یا ایک مہینہ کیونکر ضائع ہوسکتا ہے

س :- ہفتے اور مہینے محض تعدادی باتیں ہیں۔ یعنی ہفتہ دنوں کا مجموعہ اور مہینہ سال کا ایک حصّہ ہے۔ سات مرتبہ زمین کے گرد مغرب سے مشرق کی طرف چکر لگا لیجئے تو ایک ہفتہ ضائع ہو جائے گا۔ اور اگر یہی عمل تیس یا اکتیس مرتبہ کیا جائے تو ایک مہینہ ضائع ہو جائے گا۔ فرض کیجئے کہ ہماری زمین کی طرح کا ایک اور سیارہ ہے اور اس میں ہماری زمین کی طرح انسانوں کی بھی آبادی ہے۔ اور یہ سیارہ محور زمین کے اندر اندر آفتاب کے گرد زمین سے نصف مدت میں گردش کرتا ہے۔ لیکن اپنے محور پر زمین سے دوگنی رفتار کے ساتھ گھومتا ہے۔ اور جس طرح زمین کا محور اس کے محور سے زاویہ بناتا ہے اسی طرح اس سیارہ کا محور بھی وہی زاویہ بناتا ہے اور اس سیارہ میں بھی موسم بدلتے رہتے ہیں۔ اگر یہ صورت ممکن ہو اور میں اس سیارہ پر یکم جنوری ۱۹۲۸ء کو پہونچوں اور دیکھوں کہ وہاں کے آدمی بھی ہماری طرح وقت کی پیمایش کرتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ وہاں گھنٹہ والی گھڑی کی سوئی اتنے عرصہ میں ڈائل کے دو چکر لگاتی ہے جتنے عرصہ میں وہ سیارہ اپنے محور کے گرد گھوم کر دن اور رات پیدا کرتا ہے۔ اگر میری گھڑی اسی طرح چلتی رہی جیسے کہ وہ زمین پر چلتی تھی اور وقت بھی بالکل صحیح دے۔ اور میں اپنی گھڑی کی حرکت کی بنا پر یوم شماری کروں تو یکم جولائی ۱۹۲۸ء کو میں اس سیارہ کے فلک پر اسی مقام میں ہوں گا۔ جہاں میں نازل ہوا تھا اور اس وقت یہاں پھر موسم سرما کا وسطی زمانہ ہوگا اور بہار، گرما، خزاں اور سرما کا نصف زمانہ گزر چکا ہوگا۔ اور یہاں کے جو باشندے میرے اردگرد ہوں گے وہ اپنے حساب سے بمقابلہ میرے چھ ماہ بڑے ہوں گے۔ کیونکہ ان کے نزدیک وہ دن یکم جنوری ۱۹۲۹ء ہوگا۔ اب فرض کیجئے کہ میں بھی انھیں لوگوں کے حساب پر چلنے لگا۔ تو جب یہ سیارہ ایک پوری گردش اور طے کرے گا تو ان کے حساب سے بھر

یکم جنوری ۱۹۲۰ء ہوگا۔ اگر اس وقت مجھے کچھ ایسے ذرائع حاصل ہوں کہ میں اس زمین پر اپنے احباب سے فوراً رسل و رسائل اور نامہ و پیام کرسکوں تو وہاں سے جواب آئے گا کہ کرۂ زمین پر اس وقت یکم جنوری ۱۹۲۹ء ہے حالانکہ میرے نزدیک وہ دن یکم جنوری ۱۹۲۰ء تھا۔ کیا قریطو یہ معاملہ اسی طرح نہ ہوگا؟

ق :- ہاں ہوگا تو ایسا ہی

س :- اچھا ایک بات اور فرض کرو کہ وہ سیارہ جس پر میں جا اترا تھا، اپنے محور پر سال بھر میں صرف ایک مرتبہ گردش کرتا ہے۔ اور میں اس سیارہ پر اس طرف ہوں جو سورج کے سامنے ہے۔ تو جب یہ سیارہ اپنے فلک پر دو گردشیں کر چکے گا تو میں زمین کی طرف اس مقام کے عین بالمقابل ہوں گا جہاں سے میں روانہ ہوا تھا اور اگر میں نے آفتاب کی روشنی کے لحاظ سے وقت شماری کی ہوتی تو میرا کچھ بھی وقت ضائع نہ ہوتا۔ اور اگر اس وقت میں پھر اپنی زمین پر نازل ہو جاؤں تو اس وقت بھی میرے نزدیک یکم جنوری ۱۹۲۰ء ہوگا۔ کیوں ہوگا یا نہیں؟

ق :- ہاں میرا بھی یہی خیال ہے لیکن اگر ایک سال کا فرق اسی طرح معلوم کیا جا سکتا جس طرح کسی درخت کے تنہ کے اندر ہر سال کی لکیریں یا حلقے دیکھنے سے معلوم کیا جاتا ہے تو واقعتاً آپ ایک سال بڈھے ہوگئے ہوتے۔

س :- قریطو! میں دیکھتا ہوں کہ تم میری بات نہ مانوگے۔ جو خیال تمھارے دل میں جم گیا ہے تم اسی کے غلام بنے رہوگے۔ اور اس مسئلہ پر جو دلایل پیش کئے جا رہے ہیں وہ خالی الذہن ہو کر نہ سنوگے۔ بقول تمھارے اگر کسی شخص کی عمر صحیح طور پر صورت دیکھنے سے معلوم ہو سکتی ہے تو اس کا باعث یہ ہوگا کہ اس شخص کی صورت شکل میں کچھ تغیر واقع ہوا۔ اور یہی بات میں نے ابتدا میں کہی تھی۔ دیکھو! یہ تغیرات کیمیاوی تبدیلیوں کا نتیجہ ہوگا جو جسم کے مادی ذرات یا اعضاء جسمانی کے افعال میں ہوتا رہتا ہے۔ اگر یہ تغیرات اس دوسرے سیارہ پر دوگنی رفتار سے ہوتے تو میں ضرور بقول تمھارے بقدر ایک سال بوڑھا ہوتا یعنی اس شخص سے میری عمر ایک سال زیادہ ہوتی جو میری ہی ولادت کے روز پیدا ہوتا اگر رہتا زمین ہی پر۔ اور جس صورت میں کہ میں اس دوسرے سیارہ پر ہر وقت نور آفتاب میں تھا۔ اور وہ سیارہ اپنے فلک پر دو گردشیں پوری کر چکا اور اس وقت میرے جسم کے اندر کسی قسم کے تغیرات واقع نہ ہوتے تو میں اس شخص سے جو میری ہی ولادت کے روز پیدا ہو کر زمین پر رہا تھا بقدر ایک سال چھوٹا ہوتا۔ اگر زمین پر نظام جسمانی کے اندرونی تغیرات دوگنی رفتار سے واقع ہوا کرتے تو طبعی حالات میں ہم لوگ چالیس برس کی ہی عمر میں اسقدر بوڑھے اور ناکارہ ہو جایا کرتے جیسے کہ اب اسی سال کی عمر میں ہوتے ہیں

پس ظاہر ہو گیا کہ وقت جس کی پیمائش گھنٹوں، دنوں، ہفتوں، مہینوں، اور برسوں سے کی جاتی ہے اس کا انحصار بالکل اس میکانکی واقعہ پر ہے کہ زمین اپنے محور اور سورج کے گرد گھومتی ہے اور اگر اس زاویہ نظر سے دیکھا جائے جس میں ہم چیزوں اور آدمیوں کی عمروں کا اندازہ ان کی صورتوں سے کرتے ہیں تو جس چیز کو وقت کہتے ہیں وہ بالکل ذرات مادی کی (کیمیادی) حرکت یا سرگرمی پر مبنی ہے۔ اور ہم اس کی پیمائش کسی چیز یا شخص کے درجۂ انحطاط یا قلب ماہیت کے ذریعہ سے کرتے ہیں اور اس صورت میں ہمارے پیمانہ کی اکائی وہ چیز ہوتی ہے جو جدید ہو۔

پس ثابت ہوا کہ جہاں تک دنیا کی خارجی اور کائنات کا تعلق ہے وقت ایک لاشئے محض چیز ہے ایک ہزار برس ایک دن اور ایک ہزار سال ہو سکتے ہیں۔ اور اگر احساس کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو وقت محض ایک اعتباری چیز ہے۔ پس سمجھ لو کہ وقت کوئی چیز نہیں ہے۔ اور ہم ہمیشہ ایک ابدی "اب" یا "سرمدی حال" میں زندگی بسر کر رہے ہیں

صحافتِ مغرب کی حیرتناک داستان

نیویارک ٹائمس کی ترقی کے ساحرانہ مناظر

نیویارک ٹائمس کا سب سے پہلا پرچہ ۱۸ ستمبر ۱۸۵۱ء کو شایع ہوا، لیکن ایک ایسی حقیر کوٹھری سے نہ جس میں کھڑکیاں تھیں، نہ الماریاں، نہ ٹیلی فون تھا نہ تار، اور مقالات ادارہ ایک قدیم وضع کی ناتراشیدہ میز پر لکھے جاتے تھے جہاں ایک موم بتی سے زیادہ روشنی کا کوئی سامان نہ تھا۔

لیکن اب وہ ایک ایسی عظیم الشان عمارت سے شائع ہوتا ہے جس کی ۲۲ منزلیں ہیں اور ہر منزل کی وسعت سوائے بالائی تین منزلوں کی ۲۰ ہزار مربع گز کی ہے اور ہر منزل جدید ترین آرائش و زیبائش اور ضروریات صحافت سے آراستہ ہے

اس کی موجودہ اشاعت روزانہ تین لاکھ پچاس ہزار ہے اور ہفتہ وار اڈیشن چھ لاکھ شایع ہوتا ہے —— موجودہ اسٹاف جس میں ادارہ، تحریر، مراسلہ نگاری اور خبر رسانی کے تمام اشخاص شامل ہیں، دو ہزار نفوس سے زیادہ پر مشتمل ہے، جن کی سالانہ اجرت دس لاکھ گنی ہے

اس اخبار میں روزانہ ۱۷۴ ٹن کاغذ کا خرچ ہے، یعنی سال میں ۶۴ ہزار ٹن کاغذ جس کی قیمت گیارہ لاکھ گنی ہوتی ہے۔ روزانہ ۴ ٹن سیاہی صرف ہوتی ہے جس کی سالانہ قیمت ۵۰ ہزار گنی ہوئی۔ اخبار موٹروں، ریلوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے تقسیم ہوتا ہے جس کے مصارف دو لاکھ گنی سے زیادہ ہوتے ہیں —— اور یہ سب نتیجہ ہے ایک ایسے شخص کی فکر و محنت کا جو امریکہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا اور ٹائپ کمپوز کرنے والے کی حیثیت سے دنیا میں اول اول داخل ہوا۔ اس وقت تک دو کرور گنی وہ اس اخبار کے ذریعہ سے کما چکا ہے جس میں سے تین فیصدی کے حساب سے اس نے حصہ داروں کو تقسیم کیا، باقی اخبار کی ترقی میں لگایا۔ بہ حالت موجودہ اس کی املاک کی قیمت ۳۰ لاکھ گنی ہے۔

اس اخبار کا نظم و نسق چھ شعبوں پر منقسم ہے۔ پہلا شعبہ خبروں سے متعلق ہے جس میں سیاسی، علمی، تجارتی،

تخیلی خبریں اور وہ خبریں جو لہو و لعب، سفر و سیاحت، جرائم اور عدالت گاہوں سے متعلق ہیں فراہم کی جاتی ہیں، دوسرا شعبہ اڈیٹر اور اس کے مددگاروں کا ہے جو مقالۂ افتتاحیہ وغیرہ لکھتے ہیں، تیسرا شعبہ تجارتی ہے جس سے اشتہارات، نشر و اشاعت اور حسابات وغیرہ متعلق ہیں۔ چوتھا شعبہ میکانکی ہے جس میں مشینیں وغیرہ شامل ہیں پانچواں شعبہ ملازموں کے کام کی جانچ اور ان کی اُجرت وغیرہ سے متعلق ہے اور چھٹا شعبہ متفرق کاموں کو دیکھتا ہے۔

پہلا شعبہ جس کا تعلق خبروں سے ہے نہایت اہم ہے کیونکہ ایک اخبار کی اشاعت و ترقی کا انحصار اسی کی تکمیل پر ہے۔ یہ شعبہ ڈاک، ٹیلی فون، تار، لاسلکی وغیرہ کی مدد سے تمام دنیا کی خبریں جمع کرتا ہے اور اس شعبہ کا صدر وہی حیثیت رکھتا ہے جو میدان جنگ میں سرعسکر کی ہوتی ہے اس کے ماتحت تین سو سے زیادہ آدمی کام کرتے ہیں جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے وہاں کی خبریں روزانہ بھیجتے رہتے ہیں۔ یہ ہر وقت اپنے آدمیوں کو تار کے ذریعہ سے ہدایات بھیجتا رہتا ہے اور اس کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ دنیا کی کوئی اہم خبر شائع ہونے سے نہ رہ جائے اور سب سے پہلے نیویارک ٹائمس میں شائع ہو۔

مغرب کی صحافت میں بڑی زبردست مسابقت اسی امر میں ہوتی ہے کہ کون سب سے پہلے خبر شائع کرتا ہے۔ یہ شعبہ دو حصوں میں منقسم ہے ایک کا تعلق شہر کی خبروں سے ہے اور دوسرے کا تمام بیرونی دنیا سے۔ پہلے حصہ میں نیویارک اور اس کے چاروں طرف دو دو سو میل تک کی خبریں فراہم کی جاتی ہیں اور دوسرے میں ڈاک، لاسلکی، ٹیلی فون اور تاروں کے ذریعہ سے تمام دنیا کے حالات اکٹھا کئے جاتے ہیں۔ اس شعبہ کے اڈیٹر دو ہوتے ہیں ایک دن کو کام کرتا ہے، دوسرا رات کو، ان کے ماتحت ۷۰ مخبر کام کرتے ہیں جن میں سے ۱۲ صرف کھیل کود اور تفریحی خبروں کو فراہم کرتے ہیں

صبح کا اڈیٹر بہت تڑکے آکر تمام مخبروں کے فرائض متعین کرتا ہے کہ کس کو کس طرف جانا ہے اور اس کا ایک نقشہ بنا دیتا ہے جس کو چلتے وقت شام کی اڈیٹر کے سپرد کر دیتا ہے۔ شام ہوتے ہوتے دفتر میں شہر اور ساری دنیا کی خبریں جمع ہو جاتی ہیں اور ان کو شہری و بیرونی دو حصوں میں تقسیم کر کے متعلقہ اڈیٹروں کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو اپنے مددگاروں کو ان کے ذوق و استعداد کے لحاظ سے صحت و درستی حذف و اضافہ کے لئے تقسیم کر دیتا ہے لیکن انھیں اصل خبر میں کمی زیادتی کا اختیار نہیں ہوتا اور نہ اُن خبروں پر بُری یا بھلی تنقید کر سکتے ہیں، یہ کام صرف اڈیٹر کا ہے۔

روزانہ گیارہ بجے دن کو اخبار کا مالک و چیف اڈیٹر ایک وسیع کمرہ میں جو نہایت آراستہ ہے اور جس میں ایک بڑی مستطیل میز بچھی ہوئی ہے، اپنے تمام ماتحت اڈیٹروں کو بلاتا ہے اور تمام اہم مسائل پر گفتگو کرنے کے بعد

ہر مسئلہ میں پالیسی متعین کرتا ہے اور اسی کے مطابق دن بھر کام کیا جاتا ہے۔

یہاں کے کتب خانہ میں ۲۰ ہزار بہترین کتابیں موجود ہیں جن سے اڈیٹر کام لیتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں انھیں کتابوں کی مدد سے دلائل و شواہد کی بنا پر لکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس اخبار کا مرتبہ ملک میں بہت بلند ہے اور اس کی حیثیت ایک حکم کی سی ہے۔ امریکہ کا کوئی کالج اور کوئی یونیورسٹی ایسی نہیں ہے جہاں اس اخبار کا باقاعدہ فایل نہ ہو اور وقت ضرورت اس سے استناد نہ کیا جاتا ہو۔

کتب خانہ میں دیواروں پر بڑے بڑے رنگین شیشے لٹکے ہوئے ہیں جن پر تصاویر کے ذریعہ سے اخبار کی تمام تاریخ درج ہے، پہلے یہ دکھایا ہے کہ اخبار کس طرح ایک دستی مطبع میں چھپتا تھا، اس کے بعد رفتہ رفتہ اس نے کس طرح ترقی کی یہاں تک کہ وہ بجلی کے ذریعہ سے کمپوز ہونے لگا اور بڑی بڑی عفریت پیکر مشینوں سے کام لیا جانے لگا، اخبار کی تقسیم و اشاعت کے جو ذرائع ہیں انھیں بھی تصاویر کے ذریعہ سے بتایا ہے اور وہ قدیم و جدید طریقے فوٹوگرافی کے بھی دکھائے ہیں جن سے اخبار میں کام لیا گیا اور اب لیا جاتا ہے

اخبار کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ اشتہارات ہیں ورنہ محض اخبار کی فروخت سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ کاغذ کی قیمت سے بھی ۶ ہزار ڈالر کم ہوتی ہے۔

اشتہارات کی بابت اس اخبار کا اعتبار بہت بڑھا ہوا ہے کیونکہ یہ اس وقت تک کوئی اشتہار شایع نہیں کرتا جب تک مشتہرہ چیز کی خوبی کا اس کو یقین نہیں ہو جاتا، اس کے لئے ایک شعبہ الگ ہے جو صرف اس امر کی تحقیق کرتا رہتا ہے اور ہر ممکن کوشش سے حقیقت کا علم حاصل کرتا ہے۔

اس اخبار میں جو اشتہار شائع ہوتے ہیں ان کی ترتیب اور ان کے عنوانات اسقدر دلچسپ ہوتے ہیں کہ پبلک پر ان کا بہت اثر پڑتا ہے اور چونکہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اس اخبار میں کوئی اشتہار لغو اور جھوٹا نہیں ہوتا اس لئے مشتہرین کا مال بہت فروخت ہوتا ہے اور لوگ کثرت سے اشتہار بھی دیتے ہیں۔

اجرت اشتہار فی سطر نصف ڈالر (تقریباً عہ؍ ۱) لی جاتی ہے اور اس ذریعہ سے سالانہ آمدنی ایک کرور ۲۰ لاکھ ڈالر سے کم کسی طرح نہیں ہوتی

یہاں جتنی مشینیں اور آلات جدیدہ لگے ہوئے ہیں وہ دو حصوں میں منقسم ہیں ایک حصۂ تحریر و ادارہ سے متعلق ہے اور دوسرا طباعت کے شعبہ سے۔ عمارت کے تیسرے درجہ میں تین کمرے ایسے بنے ہوئے ہیں کہ ان سے باہر آواز کسی طرح نہیں جا سکتی۔ ایک کمرے میں نو برقی ٹائپ رائٹر رکھے ہوئے ہیں جن کا تعلق براہ راست... اسوشیئٹڈ پرس سے ہے یعنی ہر وقت وہاں سے خبریں آتی ہیں اور از خود ان ٹائپ رائٹروں میں چھپتی رہتی ہیں ہر منٹ میں ۶۰ لفظ کے حساب سے یہ آلات کام کرتے ہیں اور کوئی ایک شخص بھی یہاں موجود نہیں ہوتا نیویارک ٹائمس

نے خاص اپنے تار الگ کھنچوائے ہیں جنکا تعلق براہ راست اسوشئیٹڈ پریس کے صدر دفتر سے ہے۔
اس کمرے سے ملا ہوا دوسرا کمرہ لاسلکی کا ہے جہاں دو آدمی ہر وقت اپنے کانوں سے آلہ لگائے ہوئے ہزاروں میل کی خبریں حاصل کر کے لکھتے رہتے ہیں۔ تیسرا کمرہ خبروں اور برقیات کا ہے۔ یہاں ۶۵ کلرک تار کے ہیں۔ جو ہر وقت کم از کم ستر ہزار الفاظ کی خبریں حاصل کرتے اور نیویارک ٹائمس کمپنی کے دوسرے اخباروں (ٹریبون۔ گلوب۔ ہرلڈ وغیرہ) کے پاس بھیجتے رہتے ہیں۔ ٹائمس کے تین تار علیحدہ کھنچے ہوئے ہیں جو واشنگٹن، شکاگو اور ایلباس کے دفاتر سے براہ راست ملتے ہیں۔
ٹیلی فون کے آلات بھی اتنے ہی ہیں۔ خود عمارت کے اندر ۵۸ تار ٹیلی فون کے ہیں جو ۲۹۰ شاخوں میں تقسیم ہوکر عمارت کے ہر حصہ تک پہونچتے ہیں اس کا اکسچینج بھی یہیں ہے جہاں چودہ عورتیں ہر وقت کام کرتی ہیں۔ علاوہ ان کے پانچ تار ٹیلی فون کے بالکل علیحدہ ہیں جو دور دراز مقامات سے تعلق رکھتے ہیں۔ گرمی کے لئے ایک خاص تار اور لگا ہوا ہے جو چیف اڈیٹر کے گرمائی مقام سے متعلق ہوتا ہے۔
ایک اور وسیع کمرہ میں ٹیلی فون کی تین شاخیں ہیں جو مختصر خبروں اور روز کی معمولی گفتگو کے لئے وقف ہیں۔ ہر روز تقریباً ۵۰۰۰ آدمی اس دفتر سے گفتگو کرتے ہیں
ظاہر ہے کہ جس دفتر میں ہزاروں آدمی کام کرتے ہوں، سیکڑوں مقامات سے ہر وقت خبریں آتی رہتی ہوں، ہزاروں اعلانات و اشتہارات کا انتظام ہو، تمام دنیا کے اخبارات کے ضروری تراشے جمع ہوتے ہوں بات بات میں ادارہ کے تمام افراد کو مشورہ کی ضرورت ہوتی ہو وہاں اگر ایک دوسرے کے ساتھ ٹیلی فون کا تعلق نہ ہو تو کیونکر کام چل سکتا ہے۔ اس لئے عمارت کا کوئی حصہ، کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں تار اور ٹیلی فون نظر نہ آتا ہو۔
اس کا میکانکی حصہ یعنی وہ حصہ جس کا تعلق مشینوں سے ہے نہایت وسیع ہے۔ کمپوز کرنے کے لئے لینوٹائپ اور مونوٹائپ مشینوں کے علاوہ اور بڑی بڑی مشینیں اخبار اور تصاویر چھاپنے کی ہیں۔ اشتہارات کا حصہ کمپوز کرنے کے لئے مونوٹائپ مشین سے کام لیا جاتا ہے، کیونکہ اشتہاروں کے عنوان مختلف شکلوں کے ہوتے ہیں تاکہ لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول ہو اور ظاہر ہے کہ ان کے لئے ہمیشہ نئے ٹائپ بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لینوٹائپ مشین کے ذریعہ سے ایسے ٹائپ ہر وقت آسانی سے ڈھل جاتے ہیں
یہاں بیس مشینیں طباعت کے لئے ہیں جن سے ہر گھنٹہ میں ۴ لاکھ کاپیاں اخبار کی نکلتی ہیں جس کا حجم ۴ صفحے سے لے کر ۶۴ صفحات تک ہوتا ہے۔ یہ مشینیں بالکل نیچے کے درجہ میں ہیں اور اس کا رقبہ ۵۸۰۰ مربع گز ہے۔ جن موٹروں سے یہ مشینیں چلائی جاتی ہیں ان میں ۱۶۰۰ گھوڑوں کی برقی قوت صرف ہوتی ہے۔ جب اخبار چھپ چکتا ہے تو اشاعت کے کمرہ تک بجلی ہی کے ذریعہ سے پہونچایا جاتا ہے۔ علاوہ ان کے دس مشینیں تصاویر چھاپنے

کے لئے ہیں یہ رتو گرافری مشینیں ہیں جن کے بیلنوں پر تصاویر کھدجاتی ہیں - ان سے ہر گھنٹہ میں ۹ ہزار کاپیاں مصور حصہ کے چھپتی ہیں جس کا حجم ۸۰ صفحات کا ہوتا ہے۔

نیاز

علومِ ریاضیہ کی اہمیت

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ مسلمان بچوں کو علوم ریاضی کے ساتھ دلچسپی پیدا نہیں ہوتی اور چونکہ خود اُن کے والدین کسی وقت "مسلمان بچے" رہ چکے ہیں اور اُن کو بھی اس طرف کبھی میلان نہیں ہوا۔ اس لئے وہ بھی اس طرف اعتنا نہیں کرتے اور اس کو نہایت ہی معمولی اور غیر اہم بات سمجھ کر ٹال دیتے ہیں —— میں نے بعض ذی شعور اور ہوشمند مسلمانوں کو اس امر پر فخر کرتے سنا ہے کہ انھیں حساب و ریاضی سے کبھی مس پیدا نہیں ہوا، کیونکہ یہ بقالوں کے ذوق کی چیز ہے اور وہ تو اس حکمران مذہب کے افراد ہیں جس کا کام ہی "کرم بے حساب" اور "نوازش بے شمار" ہے —— مسلمانوں کی بدبختی کے جہاں اور اسباب ہیں، انھیں میں سے ایک یہ ذہنیت بھی ہے جو انھیں علوم وفنون کی ترقی سے باز رکھ رہی ہے۔

اگر اُن کو معلوم ہو کہ تاریخ انسانی میں علوم ریاضیہ کی کیا اہمیت ہے اور ان پر تمدن وتہذیب کی ترقی کا کس حد تک انحصار ہے تو شاید وہ بجائے فخر کے اپنے آپ سے شرم کرنے لگیں۔ کیونکہ موجودہ دور ترقی میں کسی شعبۂ حیات کا کوئی علم ایسا نہیں ہے جو علوم ریاضیہ کی مہارت بغیر کسی کو حاصل ہو گیا ہو۔ مثلاً آپ غور کیجئے کہ اس وقت علم طب نے کس قدر ترقی کی ہے اور جدید نظریۂ جراثیم نے کتنا عظیم انقلاب علاج کے قدیم نظریوں میں پیدا کر دیا ہے لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس میں کامیابی ممکن تھی اگر "خوردبین" کی ایجاد نہ ہوتی اور روشنی کے نوامیس اور نور کے انعکاس وانکسار کا حال نہ معلوم ہوتا۔ پھر کیا یہ تمام چیزیں بغیر علوم ریاضیہ کی مدد کے دریافت ہو سکتی تھیں؟

اگر لارڈ کالون مشہور ریاضی داں اُن حالات کا علم نہ حاصل کر لیتا جنکی بنا پر برقی رو کو طویل تاروں پر آسانی کے ساتھ دوڑایا جا سکتا ہے تو کیا بحری تاروں کا بچھایا جانا ممکن تھا۔

اگر پٹرول کا آلہ اصول ریاضی کے ماتحت نہ بنایا جاتا تو کیا موٹروں پر بیٹھ کر دنیا کی سیاحت کو آسان بنا لینا اور طیاروں پر سوار ہو کر فضاء آسمانی میں گردش کرنا ممکن تھا؟

افلاطون کا قول ہے کہ "عالم آفرینش کا راز اعداد میں پنہاں ہے"۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "خدا سب سے بڑا مہندس اور ریاضی دان ہے"۔ اس نے اپنے گھر کے دروازہ پر یہ کتبہ لکھ کر لٹکا دیا تھا کہ "وہ شخص

جو ہندسہ و ریاضی سے نابلد ہے اس گھر میں داخل نہ ہو" —— بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان اقوال میں بہت مبالغہ سے کام لیا گیا ہے، لیکن ہم اگر ان تمام علوم کی ترقی پر نگاہ ڈالیں جنھوں نے اسباب تمدن و معاشرت کو وسیع و آسان بنا دیا ہے تو ہم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کی تکمیل بغیر ریاضی کی مدد کے ممکن ہی نہ تھی۔

یقیناً اس وقت یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ انسان نے کب اعمال حسابی سے کام لینا شروع کیا، لیکن اس میں کلام نہیں کہ اس نے اس علم کا حصول اول اول بالکل بچہ کی طرح شروع کیا ہوگا اور پھر رفتہ رفتہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اب علوم ریاضیہ کا نشو و نما اس بڑے درخت کا سا نشو و نما ہے جس سے سیکڑوں شاخیں اور پھر ان شاخوں سے ہزاروں ٹہنیاں پیدا ہو جائیں —— اسی لئے ایک شخص کے لئے دشوار ہے کہ وہ علوم ریاضی کے فروع میں سے کس کو حاصل کرے۔ آیا وہ برق و کھربا کا حسابی علم حاصل کرے یا متوجات کا، وہ جبر و مقابلہ کو سیکھے یا حساب تفاضل و تکامل (CALCULUS) کو۔ وہ فلکیات پر نظر ڈالے یا نوامیس نور پر۔ الغرض علوم ریاضیہ کی اب اتنی شاخیں ہو گئی ہیں کہ ایک انسان کے اختیار سے باہر ہے کہ ان سب کا سرسری مطالعہ بھی کر سکے۔

زمانۂ قدیم میں کب علوم ریاضیہ نے قابل ذکر ترقی کی، اس کے تعیین دشوار ہے لیکن اب سے ہزاروں سال قبل کی تاریخ میں ان کی ترقی کی کافی شہادتیں موجود ہیں۔

چنانچہ مصر میں ہرم کبیر (Great Pyramid) کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاضی اس وقت بھی حیرت انگیز حد تک ترقی کر چکی تھی۔ اس تعمیر کے چاروں پہلو ٹھیک چاروں سمت (شرق، غرب، شمال و جنوب) پر بنے ہوئے ہیں جو سوائے اس کے کسی صورت سے ممکن نہ تھا کہ کسی ایک ستارہ کا ٹھیک ایک ہی وقت غروب و طلوع کے وقت مطالعہ کیا جاتا، لیکن اس سے بھی زیادہ ثبوت اس وقت کی ریاضی دانی کا یہ ہے کہ ہرم کی بلندی اس حساب سے رکھی گئی ہے کہ اگر اس کو ایک ارب سے ضرب کریں تو حاصل ضرب آفتاب اور زمین کے بُعد کے برابر ہوگا

اس سے بھی زیادہ حیرتناک کارنامہ قدیم مصریوں کا یہ ہے کہ انھیں محیط اور قطر کی نسبت معلوم تھی۔ اس میں شک نہیں کہ آج حساب کا ہر معمولی طالب علم بتا سکتا ہے کہ یہ نسبت ۳٫۱۴۱۶ ہے لیکن اہل مصر کو اب سے ۵ ہزار سال قبل اس کا علم حاصل تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر ہرم کے ایک جانب کے طول کو قاعدۂ ہرم سے اس کی بلندی پر تقسیم کیا جائے تو حاصل قسمت ۱٫۵۷۰۸ نکلے گا جو ۳٫۱۴۱۶ کا نصف ہوگا۔ (یعنی جو نسبت محیط و قطر میں ہے اس کا آدھا) ظاہر ہے کہ یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا

قدیم مصری کاہن اہمس کی ایک نہایت ہی پرانی کتاب جو حال ہی میں دستیاب ہوئی ہے اس کے دیکھنے

سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے لوگ حساب میں کسور وغیرہ سے بخوبی واقف تھے۔ اس کتاب میں ایک مثلث متساوی الساقین اس نے بنایا ہے جن میں سے ہر ایک ساق کا طول دس ہے اور قاعدہ کا طول چار۔ اور پھر نیچے لکھا ہے کہ اس کی مساحت ۱۶ر۱۹ ہے جو بالکل صحیح ہے

علم ہندسہ کی ابتدا سب سے پہلے مصر میں ہوئی کیونکہ ہیرو ڈوٹس کا بیان ہے کہ اس کے زمانے سے ۱۵۰۰ سال قبل مصر میں قابل کاشت زمین برابر برابر مربعوں میں تقسیم تھی تاکہ محاصل زمین کے وصول کرنے میں سہولت ہو لیکن ان مربعوں کے حدود دریائے نیل کے سیلاب سے مٹ جاتے تھے اور پھر حد بندی کی خدمت اس وقت کے مہندسین کے سپرد ہوتی تھی

اقلیدس مشہور ریاضی داں، اسکندریہ ہی کے مدرسہ میں ریاضیات کا استاد تھا اور مسیح سے تقریباً ۳۰۰ سال قبل خطوط و مثلثات پر لکچر دیا کرتا تھا، پھر اقلیدس کی مہارت اور شغف ریاضیات کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ اقلیدس کا مفہوم ہی علم ہندسہ ہو کر رہ گیا

قدیم ریاضی دانوں میں ارخمیدس بھی خاص امتیاز کا مالک تھا جس نے کثرت سے اس فن کی کتابیں تصنیف کیں۔ سب سے پہلا یہی ریاضی داں تھا جس نے ریاضی سے عملی امور میں کام لیا۔ اس نے ریاضی کے اصول پر بہت سے آلات کو منطبق کر کے ان کی حقیقت معلوم کی۔ مثلاً یہ کہ پھیہ دار گاڑی کے ذریعہ سے ہم ان اوزان کو کیوں سہولت کے ساتھ منتقل کر سکتے ہیں جو ہاتھوں سے ممکن نہیں یا یہ کہ ہم اخروٹ اور بادام کو ایک آلہ کے ذریعہ سے کیوں آسانی سے توڑ سکتے ہیں ــــ اس کو مرکز ثقل کا بھی حال معلوم تھا۔ اور اس نے بہت سے چھوٹے چھوٹے آلات ایجاد کئے جن میں سے ایک پانی اوپر اٹھانے کا آلہ تھا اور جو کہیں کہیں اب بھی رائج ہے۔ اس نے منجنیق بھی تیار کی تھی جس کی وجہ سے اہل رومہ شہر سیراقوسہ کی شہر پناہ کو توڑ کر اندر داخل نہ ہو سکے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک آتشی شیشہ ایسا تیار کیا تھا جس کا عکس ڈالنے سے اہل رومہ کی کشتیوں میں آگ لگ جاتی تھی۔ اس شخص کی موت بھی عجیب طرح ہوئی یعنی جب اہل رومہ شہر سیراقوسہ کو فتح کر کے اندر داخل ہوئے تو ارخمیدس وہیں اپنے اپنے گھر میں موجود تھا اور ریاضی کے کسی مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔ کوئی رومی سپاہی اس کے گھر میں داخل ہوا تو اس نے منع کیا کہ ہندسہ کے نقشے پر پاؤں نہ رکھے جس پر وہ غور کر رہا تھا۔ یہ سنکر سپاہی نے اس کو قتل کر دیا حالانکہ سپہ سالار کا حکم تھا کہ ارخمیدس کو کوئی اذیت نہ پہونچائی جائے

اچھا اب قدیم زمانہ کو چھوڑ کر اس عہد ترقی میں آیئے جس کی شعاعیں اطالیہ سے نمودار ہو کر ساری دنیا پر پھیل گئیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا شخص جس کا نام دنیا کے ہر لکھے پڑھے شخص کو معلوم ہونا چاہئے گلیلو ہے جس کے ساتھ دنیا نے وہی سلوک کیا جو ہر روشن خیال دشمن تقلید کا ہوتا ہے۔ یہ جامعۂ پیزا میں طب کا طالب علم

تھا، ایک دن اتفاق سے اس کمرہ میں چلا گیا جہاں ہندسہ کا درس دیا جا رہا تھا۔ اس کو اس فن سے دلچسپی ہوئی اور اسی وقت سے اس نے طب چھوڑ کر ریاضیات کو اپنا موضوع جستجو بنا لیا۔

علم الحیل (mechanics) کے وضع کرنے کا فخر اسی شخص کو حاصل ہے جس کی بنا پر زمین کی حرکت، نظام شمسی، مد و جزر، بارود کی قوت اور گولی کی سرعت کا حال معلوم ہوا ——— یہ گلیلو ہی کا طفیل ہے کہ جہاز کے ناخداؤں کو پانچ سال قبل مد و جزر کا حال معلوم ہونے لگا اور فلکیوں کو کسوف و خسوف کے اوقات کا متعین کرنا آسان ہو گیا اگر وہ نوامیس حرکت دریافت نہ کرتا تو ان امور کی تعیین کسی طرح نہ ہو سکتی۔

دوربین کا موجد بھی یہی گلیلو تھا اور اسی نے سب سے پہلے تھرمامیٹر بنایا اور ثابت کیا کہ ہوا کے دباؤ سے پمپ کا پانی ۳۰ گز سے زیادہ اوپر نہیں چڑھ سکتا

اس کے بعد نیوٹن کا زمانہ آیا اور اس وقت سے علم و تحقیق کی وسعت شروع ہوئی اور باہم اہل فضل میں بحث و مشاورت کی بنیاد پڑی ایک شخص اگر کوئی علمی مسئلہ دریافت کرتا تھا تو اس کا اعلان کرتا تھا اور دنیا کے دوسرے علماء اس پر جرح و تعدیل کرتے تھے۔

نیوٹن کے پاس سوئٹزر اسے ایک ریاضی کا مسئلہ آیا جسے فیلسوف لیبنٹز چھ ماہ میں حل کر سکا تھا۔ یہ سوال ۲۹ جنوری ۱۶۹۷ء کو نیوٹن کے پاس آیا اور دوسرے ہی دن حل کر کے بھیج دیا۔

کہا جاتا ہے کہ علوم ریاضیہ خشک ہیں اور ان میں وہ دلچسپی نہیں ہے جو طبیعی و اجتماعی مسائل میں پائی جاتی ہے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ ریاضیات کی دلچسپی سب علوم سے زیادہ ہے کیونکہ بغیر اس کے دیگر علوم بیکار ہیں۔ مثلاً ماہرین طبیعیات و علم الکیمیا کے تمام اعمال دباؤ اور مقاومت کی قوت سے متعلق ہیں، لیکن ان کا علم اسی وقت ہو سکا جب نیوٹن نے ریاضیات عالیہ کے اصول و قواعد منضبط کئے۔

فرض کیجئے ایک انجنیر پل تیار کر رہا ہے، لیکن جب تک اسے یہ نہ معلوم ہو کہ لوہے کی قوت کیا ہے اور پل کے ہر نقطہ پر کتنا دباؤ پڑ رہا ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور یہ باتیں صرف ریاضی کی مدد سے معلوم ہو سکتی ہیں، اسی طرح آپ مکان کی تعمیر، نہر کی تیاری، میناروں کی ساخت اور تمام اعمال انسانی جن کا تعلق ترقی تمدن و تہذیب سے ہے، ریاضی کے ممنون کرم ہیں۔

نیوٹن کے بعد دو صدی گزرنے پر ایک نوجوان انگریز (آڈمس) پیدا ہوا جس نے فلکیات میں نہایت حیرت ناک اضافہ کیا۔ یہ اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا اور سوائے کاغذ و قلم کے اس کے پاس کوئی آلہ نہ تھا کہ اس نے ایک نئے سیارہ نیپٹون کا انکشاف کیا۔ یہ انکشاف کیوں عجیب و غریب سمجھا جاتا ہے؟ اس کی حقیقت یہ ہے

کہ ایک سیارہ جس کا نام اورانوس ہے، آفتاب سے ۱۸ ملین میل دور ہے، لیکن علمائے ہیئت حیران تھے کہ یہ اپنے مدار پر یوں حرکت نہیں کرتا حالانکہ اس کا قطر، اس کا حجم، اس کا بُعد آفتاب سے اور اس کی سرعت معلوم کرنے کے بعد اس کا مدار حرکات متعین کیا گیا تھا — یہ مشکل نپٹون کی دریافت سے دور ہوئی جو اورانوس سے زیادہ دور ہے اور جس کی وجہ سے اورانوس کی حرکت میں یہ تغیرات واقع ہوتے تھے۔

اس طرح اگر آپ علوم ریاضیہ کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کس قدر دلچسپ و اہم ہے اور دنیا کی ترقی کس درجہ اس کی ترقی کی ممنون ہے۔ پھر حیرت ہے کہ لوگ طبیعیات سے دلچسپی لیں، ہیئت کو پسند کریں، طب کی طرف متوجہ ہوں اور دیگر علوم کو حاصل کریں، لیکن ریاضیات کو نظر انداز کر دیں جو حقیقتاً بنیاد ہے ہر علم و فضل کی کامیابی و نشر و اشاعت کی۔

بابُ الاستفسار

(جناب سید محمد ذکی صاحب ۔ پھولپور)

بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے سب سے بہتر طریقہ کیا ہو سکتا ہے
اور شروع میں ان کو کیا کیا پڑھانا چاہیئے اگر لڑکوں اور لڑکیوں
کے لئے کوئی جداگانہ طریقہ مناسب ہو تو اس کی بھی تفریق فرما دیجئے

(نگار) آپ نے جو سوال اٹھایا ہے وہ یقیناً بہت اہم ہے لیکن عرض یہ ہے کہ ہماری بے بصریوں نے زندگی کی اور راہوں کو کیا منور بنا رکھا ہے کہ اس طرف توجہ کی جاتی ذلت و پستی کے جہاں اور بہت سے اسباب پیدا کئے گئے انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ایک قوم کے عروج و زوال میں سب سے زیادہ اہمیت اسی مسئلہ کو حاصل ہے، اور قیامت یہ ہے کہ ایشیا اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانان ہند نے اسی کو ہمیشہ نظر انداز کیا۔ دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہوا ہے جس نے صحیح اصول دیمقراطی (Democracy) پیش کرکے جہل و تاریکی کی مخالفت کی اور تفکر و تدبر کی ہدایت کر کے گویا بتایا کہ مسلمان نام ہے اس ہستی کا جو وقت کے ساتھ دے سکے جو زمانہ کا نبض شناس ہو اور جو مختلف زمانوں کے مختلف حالات کے لحاظ سے اپنے آپ میں امیرانہ و فرمانروایانہ تبدیلی پیدا کرسکے ۔ یہی مدعا ہے اس غور و فکر سے جس کی ہر جگہ قرآن میں تاکید کی گئی اور یہی مقصود ہے اس جد و جہد اور سعی و عمل سے جس کا درس ہزاروں ہی جگہ قرآن مجید میں نظر آتا ہے لیکن افسوس ہے کہ بعد کو مسلمانوں نے اسلام کی اصل روح کو تو نظر انداز کر دیا اور محض ظواہر و مراسم کی پابندی کو اصل مذہب قرار دے کر راستہ سے بھٹک گئے ——— یہی وہ ذہنیت تھی جس نے ہمارے یہاں کے نصاب و

اصول تعلیم کو بھی تباہ و برباد کرکے رکھدیا

اب تو خیر اسقدر عمومیت کے ساتھ نہیں، لیکن چند سال قبل تک یہ حالت تھی کہ شاید ہی کوئی مسلمان بچہ ایسا ہو جس کے سامنے سب سے پہلے "قواعدِ بغدادی" نہ رکھا جاتا ہو۔

——— مقصود اس کا یہ ہوا کرتا ہے کہ مسلمان بچہ شروع ہی سے خط نسخ کا عادی ہو اور عربی الفاظ ادا کرسکنے کے لئے اس کی زبان ٹوٹنے لگے، کیونکہ قواعد بغدادی کے بعد ہی پارۂ عم شروع کرادیا جاتا ہے اور پھر اس کے بعد صرف کلام مجید پڑھایا جاتا ہے میرے نزدیک یہ نصاب قابل ترمیم ہے، کیونکہ اس سے بچہ کے قوائے ذہنیہ پر نہایت خراب اثر پڑتا ہے۔ اصولاً شروع میں بچوں کے سامنے ایسی چیز پیش کرنا چاہیے کہ اس سے اس کا ذہن مشوش نہ ہو اور دلچسپی پیدا ہوسکے۔ اسلئے کلام پاک کے ساتھ ہی مادری زبان [illegible] اگر آپ اول اول اس کے سامنے صرف غیر زبان ہی کی کتاب رکھ دیں گے تو وہ گھبرا جائیگا اور اس کا دماغ منحرف ہوکر آخر کار پڑھنے ہی کی طرف سے بیزار ہوجائے گا

اس کے علاوہ انسان فطرتاً جستجو پسند واقع ہوا ہے، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ہر بچہ، جب اس کے سامنے کوئی نئی چیز آتی ہے یا کوئی نئی بات بتائی جاتی ہے تو وہ "کیا" اور "کیوں" کے سوالوں سے پریشان کرڈالتا ہے جو لوگ نفسیات تعلیم سے واقف نہیں ہیں وہ ان سوالوں کا جواب منہ سے دے کر انھیں خاموش کردیتے ہیں، لیکن جو اس سے آگاہ ہیں وہ ان سوالوں کا جواب دے کر اس کی خواہش جستجو کو تسکین پہونچاتے ہیں ——— اس اصول کو سامنے رکھ کر اہل مغرب نے کنڈرگارٹن طریق تعلیم رائج کیا ہے اور جس چیز کا نام ان کے سامنے آتا ہے اس کو مجسم صورت میں پیش کرکے اس کی تفصیل و تشریح بتانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے دو فائدے ہیں ایک تو یہ کہ شروع ہی سے بچہ کی معلومات میں اضافہ ہونے لگتا ہے اور دوسرے یہ کہ کتابی علم کے ساتھ ساتھ اس میں عملی جستجو پیدا ہونے لگتی ہے جو اصل راز ہے انسان کی ذہنی و دماغی ترقی کا

اب اس اصول کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ غیر زبان کی . . . . تعلیم کا اثر ایک بچہ کے دماغ پر کیا ہوگا، جبکہ اس کو نہ کسی لفظ کے معنی بتائے جاسکتے ہیں اور نہ حقیقتاً آپ ہی کا یہ مقصود ہوتا ہے کہ اس کو کچھ سمجھایا جائے۔ اس صورت میں ایک خرابی تو وہی پیدا ہوتی ہے جو ابھی عرض کرچکا کہ بچہ کا ذہن تعلیم کی طرف سے منحرف ہونے لگتا ہے اور دوسرا نقص یہ ہے کہ کلام مجید کی صحیح عظمت کو سمجھنے سے قبل ہی اس کے دماغ میں یہ عقیدہ منقوش ہوجاتا ہے کہ قرآن پاک سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اس کی تعلیمات پر عمل ہو یا نہ ہو، محض اس کا طوطے کی طرح پڑھ لینا ہی کافی ہے ——— چنانچہ اسی خرابی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج بجائے اس کے کہ عام مسلمانوں میں قرآن مجید کے سمجھنے اور اس پر غور کرنے کا شوق پیدا ہو اس کی بالکل بُت کی طرح پرستش کی جارہی ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ وہ بہتر سے بہتر اطلس و کمخواب کے غلافوں میں، آبنوس و صندل کی بیش قیمت رحلوں پر تو ضرور نظر آتا ہے، لیکن دل و دماغ میں اس کی تعلیم کا ہلکے سے ہلکا نقش بھی نہیں اس کو جب کھولیں گے تو پہلے بوسہ دیں گے، جب پڑھ چکیں گے تو ہاتھ پر دم کرکے اس ہاتھ کو سارے جسم پر پھیر لیں گے، لیکن حال یہ ہے کہ اس کے بعد ہی مکروہ سے مکروہ معصیت میں بھی مبتلا ہونے سے کوئی عذر نہ ہوگا

چینی کی رکابیوں پر زعفران کے رنگ سے آیت الکرسی اور سورۂ یٰسین لکھ لکھ کر لوگوں کو پلائیں گے، اس کی آیات کے اعداد نکال کر نقش و تعویذ بھر بھر کر گلے میں لٹکائیں گے بازو پر باندھیں گے، دریا کی مچھلیوں کو دو دو تین چلوں تک آٹے میں لپیٹ لپیٹ کر کھلائیں گے اس کے اوراق کی ہوا دے دے کر مرض کا ازالہ چاہیں گے، الغرض وہ سب کچھ کریں گے جو منشائے قرآن کے خلاف ہے، اور کبھی ان کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ ان حرکات کو قرآن پاک کی حقیقی عظمت سے کوئی واسطہ نہیں، بلکہ یہ حقیقتاً قرآن کے مفہوم و مدعا اور اس کی اخلاقی تعلیم کی طرف سے بے پرواہ بنا دینے والا ہے

بعض خاندانوں میں یہ بھی رواج ہے کہ بچوں کو ابتدا میں قرآن صرف پڑھایا ہی نہیں جاتا بلکہ حفظ کرایا جاتا ہے ــــــــ اس سے بہت قبل جب تحریر و طباعت کا رواج نہ تھا یا تھا تو بہت کم، اس وقت تو یقیناً اس کی ضرورت تھی کہ قرآن پاک کو اتنے سینوں میں محفوظ کر دینا چاہیے کہ اس کے محو ہونے کا اندیشہ نہ رہے لیکن اب کہ طباعت کے عام ہو جانے سے لاکھوں نسخے اس کے ہر سال شائع ہوتے رہتے ہیں اور حفاظ کی تعداد بھی بہت کافی ہو گئی ہے، ہر بچہ کے دماغ پر ایسا سخت بار ڈالنے کی ضرورت نہیں البتہ اگر کوئی بچہ اپنی دماغی حالت کے لحاظ سے اس کے لئے موزوں ہے تو بیشک اس کو قرآن پاک بھی حفظ کرانا چاہیئے

قرآن مجید کے پڑھنے اور یاد کرنے کا صحیح وقت وہی ہے جب بچہ میں اخلاقی تعلیم کے لئے پوری سمجھ پیدا ہو جائے اور وہ قرآن مجید کو صرف اس لئے نہ پڑھے کہ محض الفاظ کا زبان سے ادا کرنا ہی اس کے لئے کافی ہے ــــ البتہ اگر اس کے جواب میں کوئی شخص یہ کہے کہ اس کا فائدہ اور کچھ ہو یا نہ ہو یہ کیا کم ہے کہ اس سے برکات کا نزول ہوتا ہے، تو چونکہ اس کا تعلق انفرادی سکون و اطمینان سے ہے۔ اسلئے کوئی حرج نہیں وہ ایسا کر سکتا ہے لیکن بہرحال یہ اس کا مانع نہیں کہ کلام مجید کے ساتھ مادری زبان کی کوئی کتاب اس کے سامنے پیش نہ کریں تاکہ اس کو تعلیم کی طرف سے بیگانگی نہ پیدا ہو۔

بہرحال نفسیات تعلیم و نفسیات انسانی دونوں حیثیتوں سے ضروری و مناسب یہی ہے کہ سب سے پہلے بچہ کے سامنے اس کی مادری و ملکی زبان کی کتابیں پیش کی جائیں تاکہ ان کے سمجھنے میں اس کو زحمت نہ ہو اور جب رفتہ رفتہ اس کے ذہن میں پختگی آ جائے تو پھر اس کے دماغی حالت کے لحاظ سے جو علم و فن مناسب ہو اس کی تعلیم دی جائے۔

میری رائے میں ہر بچہ کے لئے آغاز میں ایک ہی نصاب کبھی مفید نہیں ہوسکتا اور اسی لئے ابتدائی کتابوں کی تعیین بیکار ہے یہ ہر شخص یا ہر معلم کو اپنی جگہ غور کرکے دیکھنا چاہئے کہ بچہ کے ذہن و دماغ کے لحاظ سے کس قسم کی کتابیں پڑھانی چاہئے۔ اور جب یہ ابتدائی منزل گزر جائے تو پھر دنیا کے جس کام میں اس کو لگانا ہے۔ یا جس فن و مشغلہ کے ساتھ اس کی فطری دلچسپی ظاہر ہو، اسی کی تحصیل میں اس کو لگا دینا چاہئے۔

——یہ ایک ایسا اصول ہے جو لڑکا اور لڑکی دونوں پر حاوی ہے اور کسی تفریق کی ضرورت نہیں۔

اسی کے ساتھ ایک مسئلہ دوسری زبانوں کی تحصیل کا ہے سو اس کے متعلق میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان یہ چاہتا ہے کہ اپنے بچہ کو علمی یا ادبی دنیا میں لائے تو اس کے لئے انگریزی کے ساتھ فارسی اور عربی دونوں کا علم ناگزیر ہے، لیکن اگر زندگی کسی خاص صناعت یا پیشہ کے ذریعہ سے بسر کرنا ہے تو بیشک یہ ضروری نہیں، گو بلند و شائستہ سوسائٹی حاصل کرنے کے لئے اس کی اہمیت پھر بھی قائم رہتی ہے

اسی کے ساتھ ایک بات اور ذہن نشین کر لیجئے کہ آپ اپنے بچہ کو جو تعلیم جس اسلوب کے ساتھ جی میں آئے دیجئے لیکن اس کے فطری ذوق جستجو و تحقیق کو کبھی نہ محو ہونے دیجئے کیونکہ بلند نظری، وسعت خیال، تربیت ذہن، علوئے فکر، اصابت رائے، اور صحت ضمیر صرف اسی طرح پیدا ہوسکتی ہے کہ غور کرنے کی عادت ڈالی جائے اور ایک بات کی صداقت کی دلیل صرف یہ نہ پیش کی جائے کہ اس سے پہلے فلاں لوگ ایسا کہہ گئے ہیں یا ایسا کرتے تھے یہ بالکل صحیح ہے کہ ہر دماغ یہ اجتہادی کیفیت نہیں رکھتا، لیکن اگر کسی بچہ میں شروع سے یہ رنگ پایا جائے تو اس کو فنا نہ کرنا چاہئے، کیونکہ دنیا میں ایجاد و اختراع، ابداع و اجتہاد، نہضت و ارتقاء، اقدام و مسابقت اور تمام وہ چیزیں جو ایک قوم کے لئے مایۂ ناز ہوا کرتی ہیں، صرف اسی ایک فطری ودیعت کا نتیجہ ہیں، اور یہی وہ چیز ہے جس کے فقدان نے آج مسلمانوں کو پست و ذلیل بنا رکھا ہے اور جس نے ہمارے افراد کے اندر سے وہ چیز چھین لی ہے جو ایک شخص میں خاص اس کی انفرادیت (Individuality) کو بروئے کار لے کر اسے عام سطح سے بلند کر دیتی ہے -

یاد رکھئے کہ ہمیشہ وہی علم انسان کے لئے مفید ہوسکتا ہے جو کسی نہ کسی طرح ترقی انسان تک منجر ہو اور یہ اسوقت تک ممکن نہیں جب تک علم اپنے اندر فکر صحیح پیدا کرنے کی صلاحیت نہ رکھے۔ چنانچہ یہی وہ راز ہے جس نے آج مغرب کو اس منزل پر پہونچا دیا ہے اور یہی جہل ہے جس نے ہمیں اس کا غلام بنا رکھا ہے۔

اس سے غالباً کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ، انسانی ضروریات، تمدنی واجبات اور معاشی فرائض بھی بدلتے رہتے ہیں، کیونکہ قیام و بقا کے لئے متصادم قوتوں کا مقابلہ ضروری ہے اور یہ مقابلہ اسی وقت ممکن ہے جب ہمارا توازن ہر چیز میں فریق مخالف کے برابر ہو۔ پھر ظاہر ہے کہ جس طرح قدیم توڑیدار

بندوق اب میگزین رائفل کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اسی طرح قدیم علوم سے ہم علوم جدیدہ کو شکست نہیں دے سکتے کیونکہ جنگ میں کامیاب ہونے کا ذریعہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ "الف بالالف" کا مطالبہ کرنے کی ہم میں قوت موجود ہو ــــ

اس لئے اگر کسی قوم کو زندہ رہنا ہے تو اسے جدید ذہن کا درس دینا چاہیے اور اُن علوم و فنون کو داخل نصاب کرنا چاہیے جو موجودہ عہد کی تمدنی جنگ میں ہماری بقا و تحفظ کے ضامن ہو سکتے ہیں اب وہ وقت نہیں کہ صرف پُرانے دفتروں کی چھان بین فضل و کمال کا معیار قرار دی جائے، یا قدیم علوم کے قدیم ذخائر میں سر کھپا کر وقت صرف کیا جائے، کیونکہ یہ محض "گورکنی" ہے جس کا نتیجہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ آپ کسی وقت اس "کاو کاو سخت جانی" کی بدولت بعض پرانی لاشوں تک پہونچ کر ان کے وجود کو تاریخ سے ثابت کر سکیں، لیکن اس سے وقت حاضر کے کسی زندہ انسان کو آپ کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتے۔

اس وقت ترقی کی بے چینی کا یہ عالم ہے کہ اب آگے بڑھنے کے لئے وہ صدی اور قرن کا انتظار نہیں کرتی، بلکہ چند سال کے اندر وہ کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ہے، چنانچہ گزشتہ جنگ عظیم کے بعد سے علم انسانی جس سرعت کے ساتھ متواتر و پیہم قدم آگے کی طرف بڑھا رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، یہاں تک کہ اب مغرب کا انسان، برق و کہربا کے حدود سے آگے گزر کر یہ سوچ رہا ہے کہ "ماورا سرحد ادراک" کو کیونکر قابو میں لایا جائے اور وہ دن دُور نہیں جب "اشعۂ کونیہ" کی جستجو اس منزل تک بھی پہونچا دے ــــ

بہرحال اب بچوں کی تعلیم کے لئے کوئی قدیم نصاب تو کسی طرح مفید ہو نہیں سکتا، رہا جدید نصاب جو علوم حکمیہ سے مخفی ہو، سو اس کی تکمیل تو خیر بڑی چیز ہے، اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ کرنے کی بھی اہلیت ہم میں موجود نہیں اور نہ ہو سکتی ہے جب تک ہم اپنے علم، فضل اور تفوق و برتری کی بنیاد صرف اس پروپاگنڈا پر قائم کئے ہوئے ہیں کہ سوائے ہمارے تمام عالم غیر مہذب و ناشایستہ ہے اور ہم کو علوم جدیدہ کی طرف سے بالکل بے پرواہ رہنا چاہئے دنیا میں ہر شخص تارک الدنیا ہو کر صرف روحانی زندگی بسر کرنے کا اہل نہیں ہے اور نہ ہمارے مذہب نے اس طریق حیات کو پسند کیا ہے، اکثر افراد انسانی دنیا میں، دنیا والوں کے ساتھ ہی رہ کر زندہ رہنا چاہتے ہیں اور یہ نظام تمدن کا اولین اصول ہے کہ جب تک جماعتوں یا افراد کی ذہنی ترقیاں مساوی نہ ہوں گی، فرق مراتب برابر قائم رہیگا اور اسی سے عروج و زوال یا انحطاط و ترقی کی منزلوں میں حد فاصل قائم کیا جاتا ہے پھر اس سے قبل کہ دنیا میں وسائل زندگی و ترقی بہت محدود تھے ہم اپنے حال پر قانع رہ کر زندہ رہ سکتے تھے، لیکن اب کہ علوم جدیدہ نے سارے کرۂ زمین کے باشندوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا ہے اور کوئی ملک اپنے

آپ کو دوسرے ممالک سے مستغنی رکھ کر قائم نہیں رہ سکتا، ہمارے لئے ناگزیر یہ ہے کہ ہم بھی اسی سیلاب میں اپنے آپ کو ڈال دیں اور ساحل تک پہونچنے کے لئے وہی تمام تدابیر اختیار کریں جو دوسری قومیں اختیار کر رہی ہیں۔ اور وہ تدابیر کچھ نہیں ہیں مگر عقلی و ذہنی ترقیاں۔ اس لئے آپ بچوں کو جو جی میں آئے پڑھائیے، لیکن یہ کبھی نہ بھولئے کہ آئندہ چل کر انھیں نہایت سخت کشاکش کی زندگی بسر کرنا ہے اور اس کا مقابلہ کرنے کی اہلیت ان میں شروع ہی سے پیدا کرنا چاہیے۔

رسالہ نگار میں اس وقت تک اسلامی علوم و تعلیم شعائر مذہبی و اعمال اللہ تعالےٰ جل شانہٗ و حضرات انبیاء اکرام علیہم السلام و اصحاب اہل بیت رسالتمآب صلعم و دیگر بزرگان دین و آئمہ دین و علمائے سلف کے متعلق جو مضامین میرے یا دیگر مقالہ نگاروں کی طرف سے شائع ہوئے ہیں ان کو میں اپنے خیال سے اسلام کی خدمت سمجھتا تھا۔ لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرے یہ خیالات احترام اسلام و شریعت کے خلاف تھے جن پر میں منفعل ہوں اس لئے میں اعلان کرتا ہوں کہ اب میں ان تمام امور سے باز آتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ میری طرف سے ایسے مقالات نہ شائع ہوں گے جن سے مذہبی شکایت کا سبب پیدا ہو مجھے افسوس و ندامت ہے کہ ان مضامین سے مسلمانوں کو صدمہ پہونچا اور یہ یقین دلانے کے لئے کہ میں ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ سب کچھ لکھ رہا ہوں اپنے معاصی سے جناب باری میں اظہار برات و استغفار کرتے ہوئے اعلان کرتا ہوں کہ لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین استغفر اللہ الذی لا الٰہ الا ہو الحی القیوم من کل ذنب و اتوب الیہ وصلی اللہ تعالےٰ علی خیر خلقہ سیدنا محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین وعلی جمیع الانبیاء والمرسلین ومن اتبعہم باحسان الیٰ یوم الدین والحمد للہ رب العالمین۔

---

۱۲ اکتوبر کے ہمت کے اعلان اور اکتوبر کے نگار میں جو کچھ ملاحظات کے تحت میں چھپا ہے اس کو اعلان معذرت سے قبل لکھنے کے باوجود کالعدم قرار دیتا ہوں کیونکہ اگرچہ وہ معذرت نامہ پر دستخط کرنے سے لکھے گئے تھے، مگر ان کی اشاعت بعد کو بھی ہوئی اور اس معذرت نامہ کی روح کی منافی تھی نگار میں آئندہ کسی قسم کے مذہبی مضامین درج نہ کروں گا۔ واللہ علیٰ مانقول شہید

نیاز

اعتبارات

محنت وعمل :—

اوّل اوّل جب میرے لبوں میں رعشۂ نطق پیدا ہوا تو میں جبل مقدس پر گیا اور خدا کو پکارا کہ :۔

"اے میرے پالنے والے، مَیں تیرا بندہ ہوں، تیری مشیئت میری زندگی کا قانون ہے اور تیرے ہی سپرد میری کارگاہِ حیات ہے"۔

لیکن مجھے خدا نے کوئی جواب نہیں دیا اور ایک آندھی کی طرح سامنے سے گزر گیا

ایک ہزار سال بعد مَیں پھر جبل مقدس پر گیا اور یوں خطاب کیا کہ :۔ "اے خالق، تو نے مٹی سے مجھے بنایا، اپنی روح پھونک کر مجھے جلایا، بس میں سب کچھ تیری ہی مرضی پر چھوڑتا ہوں" لیکن خدا نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا اور اس طرح سامنے سے غائب ہو گیا جیسے کوئی ہزاروں پر لگا کر اڑ جائے

ایک ہزار سال اور گزر گئے۔ مَیں پھر جبل مقدس پر گیا اور مَیں نے تیسری بار خدا کو مخاطب کر کے کہا کہ :۔ "اے میرے مقدس باپ، میں تیرا محبوب بیٹا ہوں، محبت و رافت کے ساتھ تو نے مجھے پیدا کیا اور اب طاعت و عبادت ہی کی صورت میں اپنے تمام قوا تیرے سپرد کرتا ہوں" اب بھی مجھے کوئی جواب نہ ملا اور ایک ہلکے پارۂ ابر کی طرح نگاہوں سے غائب ہو گیا

ایک ہزار سال بعد مَیں پھر جبل مقدس پر گیا اور میں نے چوتھی بار خدا سے کہا کہ :۔ "اے خدائے حکیم و دانا، اے میرے کمال، اے میری شاہراہ۔ مَیں تیرا "دوش" ہوں جو گزر گیا اور تو میرا "فردا" ہے جو آنے والا ہے۔ میں زمین کی تاریکیوں میں تیرے لئے "عروق" کا کام دیتا ہوں اور تو آسمان کی روشنیوں میں میرے لئے گل و ریاحین ہے۔ کائنات میں ہم اور تو دونوں ساتھ ساتھ بڑھتے ہیں"

یہ سنکر خدا مجھ پر ایسا ملتفت ہوا کہ بالکل جھک گیا اور میرے کان میں کچھ ایسی باتیں کیں جو حد درجہ شیریں تھیں، نہایت محبت آمیز تھیں اور جس طرح سمندر اپنے اندر گرنے والے دریا کو اپنا ہی ایک جزو بنا لیتا ہے، اس طرح خدا نے مجھے اپنے اعماق میں لے لیا

پھر اس وقت سے خواہ مَیں کہیں ہوں، نشیب یا فراز، ہر جگہ خدا میرے ساتھ ہے اور مَیں اس کے ساتھ۔

ایک بات اور دو تعبیریں :۔

ایک صبح پہاڑ کی چوٹی پر یزدان و اہرمن کا اجتماع ہوا۔ یزدان نے اہرمن کو مخاطب کر کے کہا "کیسا مزاج ہے" اہرمن نے کوئی جواب نہ دیا۔ یزدان نے کہا "آج کیا مزاج بہت مکدر ہے" اہرمن نے کہا "ہاں، مَیں ملول ہوں کیونکہ اب انسان کا یہ عالم ہے کہ وہ میرے تیرے درمیان کوئی تمیز ہی نہیں کرتا اور اکثر و بیشتر مجھے تیرے ہی نام سے پکارتا ہے"

یزدان بولا:۔ "اے عزیز من، یہی تکلیف مجھے بھی ہے کہ اب لوگ اکثر مجھے تیرے نام سے پکارتے ہیں"
ایک طرف اہرمن افسردگی کے عالم میں چلا گیا اور دوسری طرف یزدآن گردن جھکائے ہوئے۔

سعی وکاوش:—

—قدیم زمانہ میں ایک انسان تھا جس کے پاس سوئیوں کا بڑا ذخیرہ پایا جاتا تھا۔
ایک دن یسوع کی ماں اس کے پاس گئی اور بولی—

"اے صاحب، میرے بیٹے کی چادر پھٹ گئی ہے، میں چاہتی ہوں کہ ہیکل میں بھیجنے سے قبل اس کی چادر سی دوں، کیا تم مجھے ایک سوئی قرض دے دوگے۔"

اس نے سوئی نہیں دی، اور کہا کہ

"بجائے سوئی کے میں ایک "نصیحت" دیتا ہوں وہ اپنے بیٹے کے پاس لیجا قبل اس کے کہ وہ ہیکل میں داخل ہو—اور وہ نصیحت یہ ہے کہ:—

"کوشش کرو اور پاؤ"

وطن

بہت عزیز ہے مجکو وطن عزیز وطن

وطن کی خاک ہے عنبر — مری نگاہوں میں
وطن کے قطرے سمندر — مری نگاہوں میں
وطن کے ذرہ ہیں گوہر — مری نگاہوں میں
وطن کے خار گل تر — مری نگاہوں میں

بہت عزیز ہے مجکو وطن - عزیز وطن

مری نگاہوں میں — وقعت ہے طور سینا کی
مری نگاہوں میں — وسعت ہے عرش اعلیٰ کی
مری نگاہوں میں — عزت ہے ساری دنیا کی
مگر ہے خاک وطن — سرمۂ چشم بینا کی

بہت عزیز ہے مجکو وطن - عزیز وطن

بلند رتبۂ گردوں سے پائگاہ وطن
بلند حوصلۂ دل سے بارگاہ وطن
کلیم دل کے لئے طور جلوہ گاہ وطن
نشاط روح کی ضامن ہے سجدہ گاہ وطن

بہت عزیز ہے مجکو وطن - عزیز وطن

مرے وطن میں ہے — گوتم کی خاک نورانی
مرے وطن میں ہے — گیتا کا فیض روحانی
مرے وطن میں ہے — گنگا کی پاک دامانی
مرے وطن میں ہے — نور ازل کی ارزانی

بہت عزیز ہے مجکو وطن - عزیز وطن

وطن کی گرد - وطن کی زمیں - وطن کی ہوا
وطن کی شام - وطن کی سحر - وطن کی فضا
وطن کے کوچے - وطن کے چمن - وطن کی ادا
ہے یاد ان کی علاج اپنے رنج غربت کا

بہت عزیز ہے مجکو وطن - عزیز وطن

قیصر

(امراؤتی)

"خدا کی جلوہ گاہیں"

وظائف، شورِ ہو حق اور تسبیح چھوڑ اے غافل بُلاتا ہے کسے تو صومعہ کی تیرہ خلوت میں
سحر خیزی سے حاصل؟ فائدہ شب زندہ داری سے؟ نہ کر یوں رائگاں وقت عمل شغل عبادت میں
صدا ناقوس کی گو آتما کو جگمگاتی ہے مگر پرماتما کو تو نہیں لا سکتی جلوت میں
اٹھو اللہ والو مسجد و مندر، کلیسا سے کہ یہ سارے مکاں ہیں حلقۂ آرام و راحت میں
خدا ان عافیت گاہوں کو کب مسکن بناتا ہے

جہاں ہنگامے اٹھ اٹھ کر پیام جوش دیتے ہیں فضا کو مرتعش کرتی ہیں جھنکاروں سے شمشیریں
زبانِ حال سے کہتی ہیں نعشیں اے جوان مردو منور کر دو نورِ عزم سے ملت کی تقدیریں
چراغ دیدۂ بسمل سے اٹھ کر پھیل جاتی ہیں ضیائے نصرت جاوید کی مسرور تنویریں
بقائے روح کا جو خواب جانبازوں نے دیکھا تھا فنا کی نیند میں پاتے ہیں مضمر اس کی تعبیریں
وہاں وہ آ کے ان کو فتح کا مژدہ سناتا ہے

جہاں باوصف خستہ حالی و درماندہ سامانی کڑکتی دھوپ کی گرمی میں دہقاں ہل چلاتے ہیں
حقیقت میں ہیں یہ وہ قوت قدرت کے آئینے جو اعمال جہاں افروز کا جلوہ دکھاتے ہیں
جب اک بال تحریک عمل سے تلملاتا ہے نوید تکمیل محنت پر خوشی سے مسکراتے ہیں
مگر جب ملک کے قزاق آ کر لوٹ لیتے ہیں اجل کو ڈھونڈتے ہیں، زندگی سے تنگ آتے ہیں
وہ آ کر اُن کو رازِ راحتِ دائم بتاتا ہے

جہاں مظلوم انسانوں کی بے تاثیر آہوں پر سرور بادۂ نصرت سے ہنستی ہے ستم رانی
نہاں ہوتی ہے فرعونی جہالت کے اندھیروں میں کلیم اللہ کے نور بصیرت کی درخشانی
خسوف ظلم و استبداد میں روپوش ہوتے ہیں مہ صبر و تحمل، نیر تہذیب انسانی
زمیں سے چرخ تک ہوتا ہے اک تاریک سناٹا مسلط جس پہ ہوتی ہے ستم کی حشر سامانی
وہ آ کر بے کسوں کو جنگ کے قابل بناتا ہے

اظہر

حدیث دوست

بزمِ انجم کی روشنی کی قسم　　صبحِ خنداں کی تازگی کی قسم
آسماں کی نگاہ شاہد ہے　　قلبِ گیتی کی آہ شاہد ہے
نصف شب کے سکونِ کامل میں　　خامشی کے فسونِ کامل میں
جب جہاں محوِ خواب ہوتا ہے　　ہر بشر گہری نیند سوتا ہے
دل میں اٹھتا ہے درد رہ رہ کر　　ہلکا ہلکا سا ، میٹھا میٹھا سا
ایک سرد آہ لب پہ آتی ہے　　روح جیسے زباں ہلاتی ہے
بے خودی کی عمیق کیفیت　　رات کی بے پناہ محویت
روح کو خواب سے جگاتی ہے　　دوست کی داستاں سُناتی ہے
ڈبڈبائی ہوئی نگاہوں سے!　　روح کی اِن لطیف راہوں سے
چپکے چپکے گزر کے آتا ہے　　اور مرے دل میں بیٹھ جاتا ہے

دل کی دھڑکن ہے گفتگو اسکی
ہر نفس میں نہاں ہے بُو اس کی

آدم

بیانِ مجبور

بزمِ ہستی میں کوئی اسقدر رنجور ہو
داستانِ غم سنانے کیلئے مجبور ہو
جس کی آنکھیں ہوں فرطِ یاس سے خونابہ بار
جسکا دل سوز و نوائے درد سے معمور ہو
آئے دن گرتی ہوں ناکامی کی جس پر بجلیاں
جس کی ہر تدبیر ممکن سعی نامشکور ہو
رات کو راحت میسر ہو نہ ہو دن کو دل
زندگی کا جسکی یہ اسلوب یہ دستور ہو
اسکے دل سے پوچھئے اسکے جگر سے پوچھئے
آج جس کی منزلِ مقصود کل سے دور ہو
بندۂ آزاد کی اللہ رے مجبوریاں
رخصتِ فریاد بھی چاہے تو نامنظور ہو
ہو اگر نورِ سحر تاریکیٔ شب کا مآل
یہ سیہ بختی کسی کی دیکھئے کب دور ہو
مفت میں ہو کر گناہِ بے گناہی کا شکار
کوئی دنیا میں نہ حیرت کی طرح مشہور ہو

(عبدالمجید حیرت (بی اے))

واردات

نہیں ذریعۂ تسکینِ دل یہاں کوئی
کہ میرے نالوں سے ہوتا ہے بدگماں کوئی
ابھی تو لذتِ جور و ستم پہ مرتا ہوں
بڑا غضب ہو جو ہو جائے مہرباں کوئی
صدائے نالۂ دل کو سمجھ رہا ہوں میں
سنا رہا ہے مجھے میری داستاں کوئی
جھکی ہوئی ہے جبینِ نیاز اس در پر
کہ جس کے آگے نہیں اور آستاں کوئی
بہار جوشِ جوانی اسی کو کہتے ہیں
اُڑا رہا ہے گریباں کی دھجیاں کوئی
یہ لوگ کیوں مری قسمت پہ رشک کرتے ہیں
ابھی ہوا بھی نہیں مجھ پہ مہرباں کوئی
خلیق عشق میں حرماں کا میں نہیں قائل
نہیں جو آج تو کل ہوگا مہرباں کوئی

خلیق (فیض آبادی)

معلومات

ایک خانہ بدوش عورت کی پیشین گوئی

۱۸۴۹ء ہے اور پروشیا کا شاہزادہ ولیم (جو بعد کو شاہنشاہ ولیم اول کے نام سے مشہور رہوا) صوبہ رین کے ایک مقام میں بالکل تنہا بغیر کسی حشم و خدم کے پہونچتا ہے۔ شہر منیز کی ایک وحشی کاہن عورت اسے ملتی ہے اور دیکھتے ہی اُسے لفظ "شاہ" سے خطاب کرتی ہے۔ یہ حیران رہ جاتا ہے، کیونکہ اس کے بادشاہ ہونے کا نہایت ضعیف امکان تھا اور وہ خود بھی اس کا زیادہ متمنی نہ تھا ــــــ

ولیم نے پوچھا ــــــ "تو مجھے بادشاہ کے لقب سے یاد کرتی ہے لیکن یہ تو بتا کہ میں کس سلطنت کا بادشاہ ہوں گا"

کاہنہ ــــــ "جرمنی کی جدید سلطنت کا"

ولیم ــــــ "یہ سلطنت کب قائم ہوگی"

کاہنہ نے کاغذ کا ایک ورق پھاڑ کر اس پر ۱۸۴۹ء لکھا۔ یعنی وہ سنہ جو اُس وقت جاری تھا اور پھر اس کے نیچے وہ ہندسے لکھے جن سے وہ سنہ مرکب ہے۔ یعنی اس طرح ۱۸۴۹ ۱ ۸ ۴ ۹ اور ان کے مجموعے جو ۱۸۷۱ء ہوتا ہے، اس نے اس سلطنت کے قیام کا سنہ ظاہر کیا۔

ولیم نے پوچھا "اچھا یہ بتا کہ میں کتنی مدت تک سلطنت کروں گا"

کاہنہ نے اب ۱۸۷۱ء لکھ کر اس کے ہندسے اس کے نیچے لکھے (اسطرح) ۱۸۷۱ ۱ ۸ ۷ ۱ اور اس کے مجموعہ ۱۸۸۸ سے ولیم کے اختتام حکومت کا سال معین کیا۔

ولیم نے دریافت کیا "یہ جدید شاہنشاہیت کب ختم ہوگی"

کاہنہ نے پھر ۱۸۸۸ء لکھ کر اس کے نیچے اس کے ہندسے حسب سابق جمع کئے اور اس طرح ۱۹۱۳ء میں اس سلطنت کے اختتام کی پیشین گوئی کی۔

چنانچہ یہ امر حیرت ـــ [illegible] کی پہلی دو پیشین گوئیاں تو بالکل صحیح نکلیں کیونکہ وہ آئیم ۱۸۹۱ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۸۸۹ء میں مرا۔

جنگ بجائے ۱۹۱۳ء کے ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی جس نے آخرکار نظام سلطنت کو ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ اس لئے تیسری پیشین گوئی میں غلطی تو ہوئی لیکن صرف ایک سال کی

پانسو روپیہ کا تربوزنا ۱۸۹۸ء میں جب جنگ اسپین کے سلسلہ میں امریکی بعض افواج مصروف پیکار تھیں، تو چند سپاہیوں نے فلوریڈا کے کسی تربوز فروش سے ایک تربوز لیکر کھایا جس کی قیمت ادا نہیں کی گئی۔ اب ۳۲ سال کے بعد حکومت امریکہ نے اس کی قیمت معہ نفع کے ۱۵۰ ڈالر (یا پانسو روپیہ) دیا جانا تجویز کیا۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ شخص تو مر گیا ہے لیکن اپنے بعد دو اولاد چھوڑ گیا ہے اس لئے ڈھائی سو روپیہ فی کس ان کو دے دئے گئے

پھل سفوف کی حالت میں جرمنی کے ایک شخص نے ایک طریقہ نکالا ہے جسکے ذریعہ سے پختہ پھلوں کو بغیر کسی دوا یا حرارت و برودت کی مدد سے سفوف میں تبدیل کر سکتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اسکا مزہ اور رنگ بدستور باقی رہتا ہے۔ اس عمل میں مطلقاً کوئی دیر نہیں لگتی اور چند منٹ میں یہ سفوف تیار ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر یہ طریقہ عام ہو گیا تو پھلوں کی حفاظت پوری طرح ہو سکے گی اور پختہ پھلوں کا قیام عرصہ تک ممکن ہو جائے گا۔

۱۴ ہزار بچوں کا باپ جرمنی کے رئیس جمہوریت وان ہنڈنبرگ کا دستور ہے کہ وہ اپنی جیب سے ہر اس خاندان کو ایک گینی دیتا ہے جسمیں ساتویں اولاد نرینہ پیدا ہوئی ہو۔ اسوقت تک ...۱۴ خاندان برلن میں ایسے ہیں جنکو ہنڈنبرگ نے اپنے عہد کے مطابق اشرفیاں تقسیم کی ہیں اور اس طرح گویا وہ چودہ ہزار بچوں کا باپ تسلیم کیا جاتا ہے۔ غرض یہ بھی ایک طریقہ ہے نسل کے بڑھانے کا اور منجملہ ان جذبات کے جو اس وقت جرمنی کی ترقی کے لئے اکابر ملک کے دلوں میں موجزن نظر آتے ہیں۔

ساٹھ روپیہ فی لفظ حال ہی میں نیویارک کی ایک صحافی کمپنی نے مارشل فوش کی ڈائری کے حقوق اشاعت ۵۰ لاکھ فرانک میں خرید لئے ہیں۔ اسی طرح مارشل برشنگ کی ڈائری کا جو معاوضہ دیا ہے وہ ۱۰۰ فرانک یا تقریباً ساٹھ روپیہ فی لفظ ہوتا ہے۔ یہ ہے مغرب کی وہ اکابر پرستی جس نے ملک کے اندر نہضت و ارتقا کی روح پھونک دی ہے اور جس کی بدولت ہر شخص جذبۂ شوق سے سرشار ہو کر والہانہ طور پر اپنی تمام قوتیں ملک و قوم کی خدمات کے لئے وقف کئے ہوئے ہے

براہ کرم ضمیمہ کی خانہ پُری فرما کر جلد از جلد دفتر نگار میں بھیجدیجئے۔ اگر آپ واقعی اس کی خدمات کو قابل تحسین جانتے ہیں

منیجر نگار